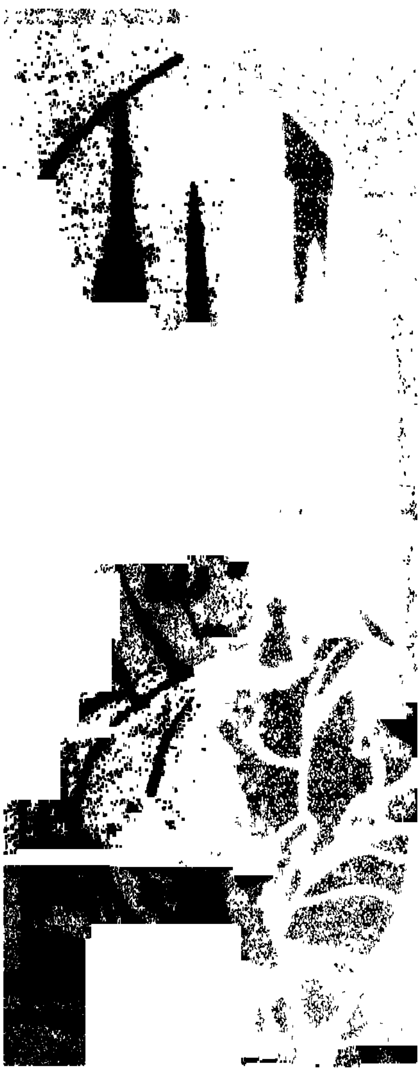






ایل نمبر : ۲۹۹۹

بیاد ... قادری زور

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد

جلد : ۴۱ شمارہ : ۱

جنوری ۱۹۷۸ء

● زرسالانہ : ۱۲ روپے ششماہی : ۷ روپے فی شمارہ : ایک روپیہ پچیس پیسے ●

پرنٹر پبلشر : سید علی اکبر ● مطبوعہ : [illegible] پرنٹنگ پریس [illegible] حیدرآباد

کُل ہند صنعتی نمائش حیدرآباد

ھندوستان کی سب سے بڑی ھمہ مقصدی نمائش!

ہر سال پہلی جنوری سے ۱۰ر فبروری تک منعقد ہوا کرتی ہے

گرام: "اگزیبیشن" ــــــــــــــ ٹیلی فون: 41553 , 42015

نمائش سے جو آمدنی ہوتی ہے وہ حسب ذیل تعلیمی اداروں پر خرچ کی جاتی ہے۔

- ۱۔ کملا نہرو پالی ٹکنک، برائے خواتین، حیدرآباد
- ۲۔ سروجنی نائیڈو ونیتا مہا ودیالیہ، حیدرآباد
- ۳۔ سردار پٹیل کالج، سکندرآباد
- ۴۔ کستوربا گاندھی کالج برائے خواتین، سکندرآباد
- ۵۔ سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف کامرس، سکندرآباد
- ۶۔ لال بہادر کالج، ورنگل
- ۷۔ سری وینکٹیشورا کالج، سوریاپیٹ
- ۸۔ سری لکشمی نرسمہا سوامی کالج، بھونگیر
- ۹۔ شنکرجی میموریل اسکول

۱۰۔ اگزیبیشن سوسائٹی ڈسپنسری اور نمائش میدان۔

اپنی بات

اردو والوں میں کتابوں اور رسالوں کو خرید کر پڑھنے کا رجحان دن بہ دن کم ہوتا جا رہا ہے جس کے سبب اردو میں اشاعتی کاروبار انجام دینے والوں کو نئے تجربے کرنے میں ہچکچاہٹ سی ہونے لگی ہے۔ ضرورت ہے کہ اردو کے قومی اور سرکاری ادارے اس جانب اپنی توجہ مرکوز کریں تاکہ مشترکہ غور و فکر سے کوئی مثبت نتیجہ برآمد ہو سکے۔

یہ درست ہے کہ آزادی کے بعد سے ملک میں دو زبانی یا سہ زبانی تعلیمی پالیسی کے سبب نئی نسل کسی بھی ایک زبان پر کما حقہ قدرت حاصل نہ کر سکی۔ مادری زبان کا المیہ بھی بے زبانی کا شکار بنا رہا، ویسے سرکاری طور پر اکیڈیمیوں کے قیام، اردو ترقی کیلئے بورڈوں کی تشکیل ضروری ہوئی مگر پھر بھی "ذوقِ مطالعہ" کا معاملہ سخن گسترانہ ہی بنا رہا ہے۔

کتابیں چھپ ضرور رہی ہیں اور رسائل بھی بکثرت منظر عام پر آرہے ہیں مگر خرید کر پڑھنے والوں کا حلقہ سکڑ رہا ہے۔ میری نسل کے افراد میں اردو کتب و رسائل کو خرید کر پڑھنے کا شوق افزوں تھا۔ آج کی نئی نسل میں یہ مفقود نظر آتا ہے حالانکہ پہلے کی بہ نسبت اردو کتابوں اور رسالوں کے لئے عصری سہولتیں آج زیادہ میسر ہیں۔

اس باب میں جہاں تک ہم نے غور کیا ہے، چند نتائج نکالے ہیں، وہ یہ ہیں کہ آج مہنگی کتابیں مارکیٹ میں آرہی ہیں، اکیڈیمیوں اور ٹرسٹوں سے امداد ملنے پر بھی مصنفین یا ناشر گراں قیمت کتابیں فروخت کر رہے ہیں۔ اردو پڑھنے والوں کی خرید بخل کا شکار ہو گئی ہے نہ ناول اور افسانے بکتے ہیں اور نہ شاعری کی قدر کی جاتی ہے، ادب اور کلچر کی کتابیں تو دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ رسائل کا حال بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ چند ایک فلمی جریدے اور ڈائجسٹ نما پرچے محدود تعداد میں فروخت ہوتے ہیں، علمی، ادبی اور دینی میگزین کی فروخت چند سو سے زیادہ نہیں ہو پاتی۔

کم قیمت میں بہتر لٹریچر عصری طریق پر پیش کیا جا سکتا ہے، اس کی مثال "نولکشور" والوں نے اب سے پہلے اشاعتی کام والوں کے لئے قائم کی تھی۔ آج انہی خطوط پر مرکزی ترقی اردو بورڈ، نیشنل بک ٹرسٹ، انجمن ترقی اردو اور مکتبہ جامعہ کو کام کرنا چاہیے۔ کتابیں کم قیمت کی چھپیں، مواد بہتر ہو اور زیادہ حلقوں میں پھیلائی جائیں۔ محض سرکاری کتب خانوں کی خریدی پر مطمئن ہونا اردو کا وطیرہ بن گیا ہے۔ اردو کے علاقوں میں کتابوں اور رسالوں کی موبائیل بک ڈپو کے ذریعہ تشہیر کی جانی چاہیے اور اس کام کے لئے شاعروں اور ادیبوں کے مختصر مختصر اجلاس منعقد کئے جائیں تاکہ عوام اپنی پسند کے مصنفوں کو سن سکیں، ان سے تبادلہ خیال کر سکیں اور ان کی مطبوعات خرید سکیں۔

"سب رس" اور ادارۂ ادبیاتِ اردو کی طرف سے ہم اس تحریک کو پیش کرتے ہوئے ناشروں، مصنفوں اور اہل قلم افراد سے خواہش کرتے ہیں کہ وہ اردو کی کتابیں اور رسالے خرید کر پڑھنے کی عادت ڈالیں اور اس باب میں اپنے مفید مشوروں سے نوازیں۔

ہم نئے سال کو اردو والوں کے لئے خوشگوار قرار دیتے ہوئے اس امر کی توقع رکھتے ہیں کہ ہماری زبان، اس کے ادب و ثقافتی اقدار کی نہایت رفعتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس زبان کی ترقی میں متحدہ طور پر سرگرم عمل ہونے کی درخواست کرتے ہیں اور عرض کرتے ہیں کہ "سب رس" کی توسیع اشاعت میں ایک ایک خریدار کا اضافہ کر کے ہمارے مقاصد کی تکمیل میں معاونت کریں۔

(غلام جیلانی)

ڈاکٹر سید ظہیر احسن

قاضی عبدالودود ـــــ تاثرات

پاٹلی پتر ـــــ عظیم آباد ـــــ پٹنہ ہندوستان کے قدیم اور عظیم شہروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ تاریخ، روایات، اور عظمت کا وارث ہے۔ اس نے علم و ادب، فلسفہ و سیاست، مذہب و معاشیات اور تہذیب و تمدن کے چراغ روشن کئے ہیں۔ یہاں کے اہل فکر و نظر نے ملک اور بیرون ملک کو عقل و دانش اور اجالا بخشا ہے۔

عظیم آباد ـــــ عظیم تاریخ ـــــ عظیم تہذیب اور عظیم تمدن کا امین ہے اس کی سیاہ بوسیدہ عمارتوں پر گرتی ہوئی دیواروں پر تاریخ اور واقعات کی داستانیں خاموشی سے مسکرا رہی ہیں۔ ان کے زبان ہوتی تو وہ کیا کچھ کہتیں، سنتیں۔

آج بھی یہ اہل علم و دانش فکر و فن کا گہوارہ ہے۔ اردو ادب کی تاریخ کو لیجئے۔ اس کی ورق گردانی کیجئے اور حق و انصاف کے جذبہ و نظر سے کام لیجئے تو دہلی اور لکھنؤ کی طرح یہ بھی ایک دبستان نظر آئے گا۔ علم دوستی، سخن سنجی، سخن فہمی، شعر پروری، شاعر پرستی اور ادب نوازی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ اور لوگوں نے خون دل و جگر سے چمن اردو کی آب یاری کی ہے۔ کتنے ہی عندلیبان سخن نے گلشن عظیم آباد میں زمزمہ خوانی کی ہے۔ آج بھی ان کی آوازیں فضائے سینے میں زندہ و سالم اور محفوظ ہیں۔ ان باکمالوں کے دم سے ہمارا وطن رشک جہاں بنا دبستان عظیم آباد جمیل، اشرف علی خاں فغاں، غلام علی راسخ، جوشش وغیرہ نے خشتنے گل بوٹے کھلائے ہیں۔ عہد متاخرین میں امداد امام اثر اور علی محمد شاد اور پھر ڈاکٹر عظیم عظیم آبادی نے میکدۂ ادب میں گلفشانی اور ضیاپاشی کی ہے

یہ اگلے وقت کے لوگ ہیں انھیں ....

ان سے نکل کر ہم بیسویں صدی میں آجاتے ہیں۔ آج بھی عظیم آباد پرورش لوح و قلم کر رہا ہے علم و حکمت، شعر و ادب، تحقیق و تنقید کا پرچم لہرا رہا ہے۔ عہد حاضر قاضی عبدالودود، کلیم الدین احمد، اختر اورینوی، جمیل مظہری، پرویز شاہدی، سہیل عظیم آبادی اور کلیم عاجز کا عہد ہے یہ چہار میں آسمان اردو کے سات سیارے ہیں۔ ان سے جہان تحقیق و تنقید، عالم شعر و ادب آباد و روشن ہے۔ پرانے چراغ جلتے ہیں۔ اور اندھیرا ختم ہوتا چلا جا رہا ہے نئی پود نئے ولولوں، منصوبوں، امنگوں اور عزم و اعتماد کے ساتھ ابھر رہی ہے۔ حال ماضی سے جدا ہوتا ہے اور حال مستقبل کا ساتھ ساتھ ہوتا ہے ....

عظیم آباد کی فضا میں عجیب تاثیر ہے جو باہر سے آتا ہے وہ اس کا ہو رہتا ہے۔ پھر بھی سر دست ہم عظیم آباد کی سرحد کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے بھی کہ یہ سیٹنگ کا عہد ہے جاننا ہمارے پیش نظر پٹنہ کا صرف ایک محلہ ـــــ لودی کٹرہ ہے

اس کی سرحد پورب میں منگل تالاب سے ملتی ہے۔ پچھم میں مغل پورہ سے۔ اُتر میں صدر گلی سے اور دکھن میں دفنا ملتی ہے۔

انقلاب کے تھپیڑوں نے اسے گرد و ناتواں کر ڈالا ہے۔ اگلی سی وہ رونق نہیں اور اس پرانوں کی تم شناسیاں کیا کہیے۔ یہ محلہ اپنی قسمت پر نازاں ہے جنہوں سے اسے سربلندی اور شوکت علاقہ ہے اور تاریخ حیات میں نئے نئے نقش و نگار بنائے ہیں جو ہیں پھیلتے

دور اور مستقبل کی نسل فخر کرے گی۔ چند نام ذہن میں آرہے ہیں آپ بھی پڑھئے!
جناب قاضی عبدالودود ، پرویز شاہد ، جسٹس خلیل احمد ، جسٹس الاد احمد ، مسٹر محمود رضا ، مسٹر رشید الظفر
قاضی صاحب پستہ قد، کشیدہ و پروقار چہرہ، خوش سلیقہ و خوش لباس، گداز بدن۔ اوسط قد و قامت، بلند پیشانی، چمکتی ہوئی تجسس آنکھیں۔
آپ سے ملئے۔ آپ ہیں قاضی عبدالودود صاحب۔ بی اے (کینٹب)، بار۔ ایٹ۔ لا ــــــــ اردو کے مستند اور با اصول محقق
جناب قاضی عبدالوحید کے بڑے صاحبزادے، منجھلے پروفیسر قاضی عبدالعزیز اور چھوٹے قاضی عبدالسعید
قاضی عبدالوحید شہر کے متمول اور باوقار اور اہل علم و فکر میں شمار کئے جاتے تھے۔ قاضی عبدالودود نے پٹنہ یونیورسٹی سے
۱۹۲۰ء میں بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ ترک موالات کی تحریک میں شریک رہے۔
۱۹۲۳ء میں انگلستان تشریف لے گئے، کیمبرج یونیورسٹی سے ۱۹۲۷ء میں اقتصادیات میں آنرز (TRIPOS) کی ڈگری
حاصل کی اور ۱۹۲۹ء میں MIDDLE TEMPLE سے بار ایٹ لا کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد ہندوستان لوٹے!
یورپ کے قیام کے دوران زیادہ تر اردو ادب کی تحقیقات میں وقت دیتے رہے وہاں کے مشہور کتب خانوں سے استفادہ
کرتے رہے دیوان جوشش کی دریافت بڑی ادبی اور تحقیقی کوشش وانہماک کا ثمرہ ہے۔
اردو زبان و ادب کے ساتھ دلچسپی اور تحقیق و تلاش کا جذبہ وقت کے ساتھ ساتھ برابر بڑھتا رہا۔ اردو ادب کی
بے لوث اور بے لاگ و بے بہا خدمتیں انجام دینے لگے۔ ادبی انہماک تیز سے تیز تر ہوتا چلا گیا۔ گھر کی طرف سے معاشی اور اقتصادی اطمینان و سکون
حاصل تھا۔ جو کسی کی زندگی میں شاید سب سے بڑا مسئلہ ہوتا ہے۔
یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ قاضی عبدالودود اگر اردو کی طرف نہ آتے تو اردو دنیا ایک مخلص اور بے لوث محقق سے محروم ہو جاتی۔ اور وہ
اگر اقتصادیات و معاشیات کی طرف متوجہ ہوتے تو وہاں بھی ایک منفرد، ممتاز اور نمایاں مقام حاصل کر لیتے۔ وہ تو اردو کی خوش نصیبی تھی۔ اور اس کے
دام گیسو کی تاثیر تھی کہ آپ نے اس کی طرف بیرونی قیام کے دوران بھی توجہ دی اور آج بھی شمع تحقیق و تنقید اور علم و ادب روشن کئے ہوئے ہیں۔
لوگوں کو ہدایتیں اور روشنی مل رہی ہے
۵۶/۱۹۵۵ء کی بات ہے کہ ایک صاحب کو تازہ تازہ عشق ہوا تھا۔ دیسی دیسی الفت تھی۔ اور تیشہ زنی کا حوصلہ پل رہا تھا۔
یہ اس زمانہ کی بات ہے جب کہ تحقیق کوہکنی اور جوئے شیر کا لانا بھی جاتی تھی۔ تحقیق کی راہ پرخار اور خاردار سمجھی جاتی ہے۔ اور اس وقت تک حسن پرستی
اور بوالہوسی میں تمیز باقی تھی۔ یہ اہل علم اور اہل نظر کی کسوٹی سمجھی جاتی تھی۔ اب تو حال ہی کچھ اور ہے۔ جہان علم دگرگوں دکھائی دیتا ہے ہر خرابہ ہر خاک
اور ہر معیار بلکہ ہر نقش فریادی نظر آتا ہے۔ کام سے زیادہ کام کرنے والے ہیں تو صلاحیتیں اور صلاحیتیں بکھر جاتی ہیں۔ وہ دن دور نہیں جب موضوعات
کی قلت اور تحقیق کام کرنے والوں کی کثرت ہوگی، وہ بھی کیا دن ہوگا ....!
ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ۵۶/۱۹۵۵ء کی بات ہے کہ کہیں میری اور ان کی ملاقات ہو گئی۔ دوران گفتگو افسانہ، شاعری، تنقید اور
پھر تحقیق کی بات آئی قاضی صاحب نے کچھ اس انداز سے تحقیق کا ذکر چھیڑا کہ میں مسحور اور متاثر ہو کر رہا۔ چنانچہ اس شام قاضی عبدالودود صاحب سے ملنے کا پروگرام
مرتب ہوا۔ شوق دیدار تھا اور تحقیق سے لگاؤ، کشاں کشاں ہم دولت کدہ پر پہنچے!..........
یہ میری قاضی صاحب سے پہلی ملاقات تھی۔ تعارف حال احوال کے بعد ادھر ادھر کی باتیں ہو رہی تھیں۔ محترم میرے لئے اجنبی نہ
تھے۔ میں بیگانہ ضرور تھا۔ ایک شہر اور ایک محلہ کی بات تھی۔ البتہ عرصے سے قاضی صاحب کی ذہانت اور ذکاوت کی باتیں کئی بار سن چکا تھا۔ مجھے یاد آیا
[illegible] قاضی صاحب کا حافظہ غضب کا ہے قرآن شریف حفظ ہے جناب قاضی عبدالوحید صاحب کا ایک مدرسہ تھا۔ [illegible]

ہم اور وہاں تقسیم ہوسکتے ہیں۔

قاضی صاحب محترم میرے ابا جان کو بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ میرے خاندان اور گھرانے سے واقف تھے۔ مجھے کوئی اجنبیت کا نہیں محسوس ہونے پائی۔ بڑی شفقت سے پیش آئے۔ ویسے بھی مہمان نوازی ان کا دستور ہے آئے دن وہ تقریبیں ہوتی رہتی ہیں۔ پہلی ہی ملاقات میں ان کی علمیت صلاحیت اور معلومات سے گہرے طور پر متاثر ہوا۔ اور میرے سر میں بھی تحقیق کا سودا کسی طرف سے داخل ہوتا ہوا محسوس ہوا .... میرے ساتھی نے اپنے موضوع سے متعلق ضروری باتیں اور معلومات حاصل کیں، ہدایتیں لیں۔ اور پھر ہم دونوں اجازت لے کر اٹھے۔ مگر ایسا محسوس ہوا کہ علم و حکمت اور شعر و ادب کی دانش گاہ سے رخصت ہو رہا ہوں۔

پہلی ہی ملاقات میں میں نے یہ اندازہ لگایا کہ قاضی صاحب کبھی رعب جمانے کی کوشش نہیں کرتے۔ علمیت کا چھاپہ نہیں چھپکتے، بہت اونچے LEVEL سے باتیں نہیں شروع کر دیتے۔ بلکہ اپنے کو مخاطب کی سطح پر لے آتے ہیں۔ اور آہستہ آہستہ اس کو اپنے ساتھ اونچا کرتے جاتے ہیں۔ اس طرح کوئی گھبراہٹ یا پریشانی پیدا نہیں ہوتی۔ بلکہ بتدریج معاملات میں اضافہ ہوتا جاتا ہے معیار بلند ہوتا جاتا ہے یہ ایک نمایاں صفت اور خوبی میں نے ان کے اندر پائی ہے وہ لوگ جو ان کی علمیت اور صلاحیت کے مقابلہ میں بونے ہیں۔ انہیں بھی عزم اور اعتماد پیدا ہونے لگتا ہے۔

دوسری بار میں تنہا قاضی صاحب محترم سے ملنے گیا۔ اس وقت تک مرض تحقیق کے کیڑے میرے سر میں داخل ہو چکے تھے، مختلف موضوعات پر تبادلہ خیال ہوتا رہا اور بات میر شیر علی افسوس (ان کا عہد، حیات، معاصرین، فورٹ ولیم کالج اور ان کی شاعری) پر آکر رکی۔ میں نے اپنے تحقیقی مقالہ کے لئے اس موضوع کو پسند کیا، اور میں نے اس موضوع پر کام کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں اس وقت تک کیا جانتا تحقیق و تنقید ——— اور مجھے تحقیق سے مرض نشاط نہ تھی۔ بلکہ ایک گونہ مصروفیت درکار تھی۔ اور اس طرح مجھے صبح و شام روزو شب ماہ و سال شرف نیاز کا موقع میسر آتا رہا۔ اس دوران مجھے اپنی کم مائیگی کا برابر احساس ستاتا رہا۔ جب قاضی صاحب کو اپنے موضوع یا کسی موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے دیکھتا تو حیرت ہوتی۔ اللہ کی پناہ۔ بحر اوقیانوس کی گہرائی اور وسعت بھی شرمسار ہو جائے اتنا سنجیدہ اور گہرا مطالعہ ادب کا ——— انگریزی، فرانسیسی، اردو اور فارسی ادب پر عبور حاصل ہے کبھی کبھی سائنس کے موضوع پر بات کرتے تو حیرت ہوتی۔ اور یقین کرنا دشوار ہو جاتا کہ مشرقی ادب ——— کے اسکالر کے سامنے بیٹھا ہوں یا کیا۔

معین الدین دردائی کی رائے کہ "قاضی صاحب کی طبیعت بہت چڑچڑی اور خود پسند واقع ہوئی ہے ان کا اپنے متعلق بہت بلند خیال ہے اور ان کی ادبی اور علمی انانیت نے غرور کی حد تک ان میں بدنمائی پیدا کر دی ہے .... ان کے معاصرین اور احباب کو ان سے اجتناب اور احتیاط کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔" یہ کذب بیانی ہے۔ قاضی صاحب کی شخصیت اتنی دلچسپ اور پرکشش ہے کہ تمام لوگوں سے علمی، ادبی اور ذاتی روابط اور تعلقات قائم ہیں۔ وہ جس بزم، نشست یا محفل میں ہوتے ہیں لوگوں کی توجہ کا مرکز بنے رہتے ہیں۔ رہی بات نا کی تو یہ درست ہے کہ وہ دو اور دو کو چار ہی لکھنے کے قائل اور عادی ہیں۔ وہ غیر ادبی، غیر معیاری چیزوں کو کسی مصلحت کی بنا پر بھی گوارا نہیں کر سکتے۔ اور ایسی ویسی باتوں کو درگزر کرنے کے قائل نہیں ہیں۔ جس کی وجہ سے ذرا سا کھٹکے کا اندیشہ بھی پیدا ہو سکے۔ وہ دوستانہ اور مصلحت بینی کی ادب میں کوئی ضرورت اور تحقیق و تنقید میں کوئی جگہ اور گنجائش نہیں پاتے۔ وہ کھری اور کھوٹ کا پرکھ بھی پسند کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک علم و فن، تحقیق و تنقید کا ایک بلند اور آفاقی معیار ہے وہ اس کا سودا کسی قیمت پر اور وقت کے سامنے بھی نہیں کر سکتے اور کسی قیمت پر کسی شخص کے ہاتھوں معیار کو پست اور پامال گوارا نہیں کر سکتے۔ وہ اپنے ضمیر کو بیچنے سے رہے۔

[illegible]

یہ بات بھی معین الدین دردائی کہتا ہے کہ "بہت سے ذہین اور قابل قسم کے لوگوں کی طرح کاظم صاحب میں ایک خاص کمزوری
ہے کہ وہ کسی کی تعریف نہیں سن سکتے اور نہ کسی کی لیاقت اور قابلیت کا اعتراف کر سکتے ہیں" اس رائے کو حقیقت سے بہت [illegible]
ہے مجھے ان سے استفادہ کرنے کا اور اپنے ادبی و تحقیقی سفر میں ان سے ملنے اور ان کی رہبری حاصل کرنے کا موقع ملتا رہا ہے اور مجھے قریب سے
ادبی تعمیر میں ان کا اہم رول رہا ہے اور ادب نوردی میں رہبری ملتی رہی ہے اور اس دوران اکثر اردو ادب کی کتنی ہی شخصیتوں پر انھوں نے
اظہار کیا ہوگا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے ان کی آوازوں کو ٹیپ نہیں کر لیا۔ ورنہ دردائی صاحب اور ان کی طرح کے دوسرے لوگوں کی غلط بیانی کا
کر سکتا۔ یا دراصل یہ ہے کہ ان کی نظر میں شام و سحر دونوں ہی ہوتا ہے اندھیرے اجالے میں فرق کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اور حق و انصاف
اور دیانت کا تقاضہ ہے میں نے خود ان کو کلیم الدین احمد صاحب کی محنت کوشش و کاوش اور صلاحیتوں کا معترف پایا ہے اور پروفیسر
کے متعلق اچھی رائے کا اظہار کرتے ہوئے سنا ہے، آل احمد سرور، احتشام حسین، خواجہ احمد فاروقی کے تعریفی جملے سنتے رہے ہیں۔

قاضی صاحب کا ذہن CUTICAL AND ANDYTIBUL ہے۔ نہ کوئی چیز آسانی سے خانۂ ذہن سے بھاگ سکتی ہے نہ نظر
گریز ہی کر سکتی ہے یہ خدا داد وصف ہے ان میں۔ سن، تاریخ اور واقعات، ترتیب واقعات کی جیسی یادداشت ان کے پاس ہے وہ شاید ہم
ان کا حصہ ہو۔ پھر علمی بصیرت اور کثرت مطالعہ نے ان کی تحریروں میں وزن اور وقار پیدا کر دیا ہے ان کی تحریریں سائنس کا ادبی روپ معلوم
ہوتی ہیں۔ منفرد، سب سے الگ۔ سب سے جدا ان میں انشائیہ نگاری کی جھک جھک نہیں ہے بلکہ وہ سیدھا مستقیم پر چل کر منزل مقصود
تک پہنچاتی ہیں۔

قاضی صاحب کی شخصیت میں رکھ رکھاؤ اور وضعداری ہے وہ بہت دور تک نباہنا جانتے ہیں۔ دوستوں میں گرم جوش، احباب میں
تکلف اور چھوٹوں میں بہت مشفق نظر آتے ہیں، راہرو ادب اور مسافر تحقیق کو بہت عزیز رکھتے ہیں۔ خاص طور پر اگر اس میں [illegible]
نظر آئیں۔ مجھے اپنے تحقیقی کام کے دوران اکثر حوصلہ شکن حالات اور مواقع سے دوچار ہونا پڑا بعض مرتبہ تو ہمت اور امید دونوں کے چھوٹ
جیسے نظر آئے۔ برسوں سارے مواد کو لپیٹ کر بکس میں بند کر دیا۔ اور پھر جب اپنی ساری محنت کو سپرد خاک یا نذر کرم ہوتے دیکھا تو پھر
سارے مواد کو سینے سے لگا لیا اور دوسرے ہی لمحہ اپنے بزرگ قاضی صاحب کو خط کے ذریعہ اپنے حالات سے باخبر کیا۔ میں نے ہر موقع پر ان کا دست شفقت
اپنی طرف بڑھا ہوا پایا ہے برابر ڈھارس بندھاتے رہے۔ یہاں تک کہ آزمائش کی تمام ساعتیں گزر گئیں۔ اور مقالہ یونیورسٹی کے حوالہ کر دیا گیا۔
پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد پٹنہ یونیورسٹی کے پوسٹ گریجویٹ سیکشن سے وابستہ و منسلک ہو گیا تھا۔ یہاں اک عرصہ تک
رہنے کے بعد مجھے انگلستان اور یورپ کے دوسرے ممالک جانے کا موقع ملا۔

وہ ساری ہدایتیں میرے کانوں میں گونج رہی ہیں۔ جو قاضی صاحب نے نہایت شفقت کے ساتھ یورپ کو روانگی کے وقت دی تھیں
اپنے قیمتی بیرونی تجربوں سے مجھے مستفیض کیا تھا میرے یورپ کے قیام کرنے کے دوران بھی مجھے ہدایتیں بھیجتے رہے اس زمانہ کا ایک خط اب تک میرے
پاس محفوظ ہے جس کی نقل درج ہے۔

عزیزی۔

میں دہلی میں دس ہفتہ ٹھہرنے کے بعد پٹنہ واپس آیا تو آپ کے خطوط ملے
گھبرانا ٹھیک نہیں ہے جمعیت سے مقابلہ پانے کی کوشش کرنی چاہیئے آپ اگر کچھ کر کے نہ آئے تو نقصان [illegible]
اور شماتت ہماری [illegible] کا معاملہ آپ کے سامنے ہوگا۔

۸ جنوری ۱۹۶۸ء

مخدومی [illegible] آباد

[illegible] صاحب کو پیام پہنچا دیجیے گا شکریہ۔ ان کا خط آیا تو جواب دوں گا۔ آپ نے یہ نہیں لکھا کہ آپ کو قیام لندن میں کب تک رہے گا۔ اگر اب تک [illegible] نہیں ملا ہے تو اس کا سبب کیا ہے؟

آپ نے ۲۰ جون کے خط میں لکھا ہے کہ "برٹش میوزیم کے مخطوطات کی ایک فہرست روانہ کی تھی"۔ فہرست میں تذکروں کے ذیل میں جن کتابوں کے نام ہیں ان میں یہ بھی ہیں: ریاض الوفاق — نکات الشعرا — تذکرہ خوش طبقات سخن۔ تذکرہ شعلہ — تذکرہ شعرائے ہند (کریم الدین)

ان میں سے ایک تذکرہ کریم الدین کا تو شاید کوئی مخطوطہ نہیں ہوگا، رہا دوسرا تو جہاں تک میرا علم ہے ان میں سے ایک بھی برٹش میوزیم میں نہیں۔ یہ کیسی فہرست ہے؟ بہرحال آپ کی فہرست کے تذکروں میں سے صرف دو اب تک طبع نہیں ہوئے۔ عیار الشعرا و طبقات سخن۔

آپ نے دواوین کی جو فہرست دی ہے ان میں گلشن حیدری اور نثر بے نظیر بھی شامل ہیں۔ گلشن حیدری جہاں تک مجھے یاد ہے ایک مجموعہ ہے جس میں ممکن ہے دیوان مجھو دیوان بھی شامل ہو — رہا نثر بے نظیر تو یہ نام ہی سے ظاہر ہے کہ نثر کی کتاب ہے۔ اس فہرست میں دیوان یکرنگ بھی ہے اس کا پہلے تو کوئی نسخہ یورپ کے کسی مشہور کتب خانے میں نہ تھا۔ کیا میوزیم نے اسے حال میں حاصل کیا ہے؟

اگر واقعی وہاں ہے تو اس کا عکس فوراً لیجیے اور اسے شائع کیجیے۔ مگر مجھے یقین نہیں کہ وہاں ہو۔ دیوان آبرو کا بھی کوئی نسخہ میوزیم میں نہ تھا۔

آپ کی فہرست میں [illegible] بھی ہے۔ تخلص کے ساتھ ...... شعرا کا نام بھی چاہیے۔ آپ اس سے واقف نہ ہوں گے کہ ایک تخلص کے ایک سے زیادہ شاعر ہو سکتے ہیں۔

میں نے آپ سے کہا تھا کہ برٹش میوزیم اور انڈیا آفس کے کتب خانوں کے اردو مخطوطات سے جن کی زبان فارسی ہے کی فہرست بنائیں جو مطبوعہ فہرستوں میں شامل نہیں۔ یہ بجائے خود ایک علمی خدمت ہوگی بالخصوص اگر ایک فہرست کے ساتھ بنائی جائے۔

یکرنگ سے قطع نظر آپ حسب ذیل کے دیوان مرتب کر سکتے ہیں۔ آصف۔ تاباں۔ دو اور شعرا بھی ہیں لیکن وہ آپ کی فہرست میں نہیں۔

آپ یا شاہ صاحب کچھ چیزوں کا عکس بھجوا سکتے ہیں؟

عکس کی قیمت کس طرح ادا ہوگی؟ معاوضہ میں کتابیں یہاں سے جا سکتی ہیں؟ قاطع برہان اور رسائل متعلقہ چھپ گئی ہے مگر ابھی شائع نہیں ہوئی۔ قاطع برہان کے علاوہ اس میں حسب ذیل رسائل ہیں!

سوالات کریم الدین، لطائف غیبی۔ نامۂ غالب۔ تیغ تیز۔

[illegible] صاحب سے ملاقات ہوتی ہے؟ اگر ملنا ہو تو میری طرف سے دریافت کیجیے کہ غالب پر جو کتاب بشرکت ڈاکٹر ضیاء الاسلام لکھ رہے تھے کس مرحلہ سے گزر رہی ہے۔ ترجمہ منتخب نظم و نثر غالب کا حال بھی پوچھیے۔

غالب سنٹینری کمیٹی کی تشکیل جدید ہونے والی ہے

ذاکر صاحب اس کے سرپرست اعلیٰ اور مسز اندرا گاندھی صدر۔ مسٹر فخرالدین علی احمد اس کے سکریٹری ہوں گے۔

[illegible] دعا کہتے ہیں اور مسعود سلام۔

نیاز مند

قاضی عبد الودود

رشید قریشی

ایک خیال دو شاعر

اُردو شاعری کو فارسی شاعری نے سنوارا نکھارا ہے۔ اسی طرح جیسے کوئی ماہر حسینہ کسی نئی نویلی دلہن کا سنگھار کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو شاعری میں کلاسیکی رچاؤ بھی ہے اور جدید دور کی حقیقت پسندی بھی۔

میں نے فارسی اور اُردو کے نامور شاعروں کے چند "ہم خیال" اشعار کا انتخاب کیا ہے۔ میرا مقصد موازنہ نہیں محض یہ دکھانا ہے کہ ایک ہی مضمون کو دو شاعروں نے کس زاویہ نگاہ سے دیکھا ہے کس دل سے محسوس کیا اور کس انداز سے پیش کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ دنیا اتنی عمر رسیدہ ہو گئی ہے اور انسان اپنی جستجوؤں میں اس قدر کامیاب ہے کہ کوئی راز راز نہیں رہا۔ کوئی دھڑکن معمہ نہیں رہی۔ کوئی مضمون اچھوتا نہیں رہا۔ دو شاعر ایک ہی موضوع پہ خیال آرائی کرتے ہیں۔ کبھی کبھی دونوں کی ذہنی پرواز ایک ہی بلندی کو نشانہ بناتی ہے۔ اور ایسا بھی اتفاق ہوتا ہے کہ دونوں کا انداز بھی لڑ جاتا ہے۔ لیکن اس توارد سے ان کی عظمت پہ حرف نہیں آتا۔ کیونکہ ہزار ہم رنگ سہی دیدہ ور دیکھ ہی لیتے ہیں کہاں شاعر کا دل خون ہوا ہے اور کہاں اس کے عکس نے رنگ کو ہلکا کر دیا ہے۔

حضرت سعدی عشق زدہ بیٹھے ہیں۔ دوست احباب اطراف جمع ہیں۔ کوئی سمجھاتا۔ کوئی سنبھالتا ہے۔ لیکن حضرت سعدی کسی بہانے نہیں بہلتے۔ دوست احباب انہی کو قصوروار ٹھہراتے ہیں کہ بیٹھے بٹھائے اپنا دل کسی کو کیوں دے آئے۔ حضرت سعدی سے رہا نہیں جاتا۔ کہتے ہیں۔

دوستو۔ دل کو جانا تھا وہ تو گیا۔ مجھے بیہودہ الزام ٹھہرانے سے کیا حاصل!! ایسا ہی تم کو محاسبہ کرنا ہے تو اس معشوق سے جواب طلب کرو کہ وہ اتنا خوبصورت کیوں ہوا ؎

دوستاں عیب کنندم کہ چرا دل بتو دادم باید اول بتو گفتن کہ چنیں خوب چرائی

اِدھر حضرت میر تقی میر بھی اسی عشق کے شکار ہوئے ہیں۔ وہ معشوق سے اپنے عشق کی داد چاہتے ہیں۔ معشوق ان کا [illegible] ہونے آپ سے عشق کی فرمائش کی تھی۔ یہ آپ کی غلطی ہے جو آپ عشق پہ دلیر ہوئے۔ اب اس کی سزا بھگتیے اور ہم سے کسی مہربانی کی توقع نہ رکھیے۔

میر صاحب اپنا مقدمہ انصاف پسند دنیا کے آگے رکھتے ہیں۔ گو ہم نے پیار کیا اسے جرم قرار دیا جا رہا ہے۔ لیکن وہ خود

پیار سے اور پیار کے قابل ہیں تو اس کے لیے کون جواب دہ ہے! شعر

پیار کرنے کا جو خوباں ہم پہ رکھتے ہیں گناہ — ان سے بھی تو پوچھئے تم اتنے پیارے کیوں ہوئے

سعدی اور میر دونوں اپنے فن کے استاد ہیں خیال ایک ہے اور پیش کش دونوں کے پاس معصومانہ اور دلکش ہے۔
عاشق کی آرزو ہوتی ہے معشوق اس کے گھر آئے۔ معشوق وعدے کرتا ہے لیکن اس کے وعدے کبھی شرمندۂ وفا نہیں ہوتے۔ وعدہ شکنی کے لیے ہر وقت کوئی نہ کوئی عذر نکل آتا ہے۔ اور عاشق پر انتظار کی قیامتیں گذرتی رہتی ہیں۔ آخر ایک دن ایسا آ جاتا ہے جب معشوق اپنے وعدے کی تکمیل پر آمادہ ہو ہی جاتا ہے اور عاشق کے گھر کی طرف چل پڑتا ہے۔ ادھر عاشق کے گھر کو بربادی پوری طرح صاف کر چکی ہوتی ہے۔

غالب نے عاشق کے گھر کی ویرانی کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے شعر

ہے خبر گرم ان کے آنے کی — آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

اس مضمون کو جوش نے یہ انداز بیان بخشا ہے شعر

اب تک نہ خبر تھی مجھے اجڑے ہوئے گھر کی — وہ آئے تو گھر بے سر و ساماں نظر آیا

غالب کا عاشق بربادی کی جس منزل میں معشوق کے استقبال کا منتظر ہے، جوش کا عاشق اس منزل سے گذر چکا ہے۔ اپنے بے سر و ساماں گھر میں وہ معشوق کا تصور باندھے دنیا و مافیہا سے بے خبر بیٹھا ہے۔ اچانک معشوق آ جاتا ہے اور اس وقت عاشق کو اندازہ ہوتا ہے کہ معشوق کی آؤ بھگت کے لیے شایانِ شان ساز و سامان نہیں۔ اس تمام عرصے میں محویت کا ایک ایسا دور اس پر مسلط تھا جس میں وہ اپنے ویران ماحول سے بے خبر رہا۔ بے سر و سامانی کا جو احساس جوش کے عاشق کو تڑپا رہا ہے غالب کا عاشق اس کی شدت سے نا آشنا نظر آتا ہے۔ غالب کے پاس ایک واقعہ ایک صورت حال ایک نقشہ ہے۔ لیکن جوش نے اس مضمون کو جذبات کی رنگ آمیزی سے زیادہ اثر انگیز اور زیادہ دل نشین بنا دیا ہے۔

اصغر گونڈوی کے پاس آلام روزگار کو آسان بنانے کا یہ نسخہ ہے۔ شعر

آلام روزگار کو آسان بنا دیا — جو غم ملا اسے غم جاناں بنا دیا

اس شعر میں غم دوراں اور غم جاناں دونوں یورش کناں ہیں۔ عاشق جو غم جاناں میں مبتلا ہے۔ آلام روزگار کا نشانہ بھی ہے۔ اس دہری مخزورگی کے مقابلہ میں عاشق کا اسلوبِ تحمل یہ ہوتا ہے کہ وہ زمانے کے ہر غم کو غمِ جاناں کی ہمہ گیر شدت سے ملا لے کر دیتا ہے۔ دنیاوی مصیبتوں کو برداشت کرنے کے لیے شاعر کا یہ نفسیاتی ردعمل ایک ایسی مدافعت کو اختیار کرتا ہے جس پر سے زمانہ کا ہر وار اچٹ جاتا ہے۔ اندوہ حیات سے دوچار ہو کر غم جاناں کو تازہ کر لینا زندگی کی تلخ حقیقتوں سے فرار نہیں ہے۔ اس کے لیے تربیت استعداد ہے۔ اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہے کہ بڑا غم چھوٹے غم کو کھا لیتا ہے۔

اور عرفی کا ادعا ہے۔ شعر

در دلِ ما غمِ دنیا غمِ معشوق شود — بادہ گر خام بود پختہ کند شیشۂ ما

یہاں عاشق پر دنیا کا غم وارد ہوتا ہے تو اس کے دل میں غم معشوق بن جاتا ہے۔ عرفی کے نزدیک غمِ دنیا ایک ناقص

محرومی ہے جو عاشق کے دل میں اتنی کڑواہٹ گھول رہی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ ظرفی عمرونیا کے ساتھ شاعرانہ بغاوت کر رہا ہے۔ اور درحقیقت وہ غم کی تلخی سے آشنا نہیں۔ اس کے برعکس اصغر آلام روزگار کے شکنجہ میں تڑپتا دکھائی دیتا ہے اور غم جاناں کا شکار ان سے اسی لذت سے چھٹکارا دلاتی ہے۔

اصغر گونڈوی کے پاس تجربہ کا کرب ہے درد کی کسک ہے۔ اور ایک ایسا درماں ہے جو درد ہی کی طرح اذیت کا ہے۔

جاں نثار اختر کا شعر ہے۔ سے

میں جب بھی اس کے خیالوں میں کھو سا جاتا ہوں   وہ خود بھی بات کرے تو برا لگے ہے مجھے

یہاں خیال کی رسائی اس مقام پر ہے جہاں عاشق اپنے محبوب کے پیکر حسن کو محبت کی رنگین فضاؤں میں جلوہ فرما دیکھتا ہے یہ دنیائے حسن و عشق۔ عاشق کی آرزوؤں سے آباد ہے اور خیال کی کارفرمائی نے ایک ایسا طلسم باندھا ہے کہ عاشق آب و گل کی حقیقتوں سے بے تعلق ہو کر رہ گیا ہے۔ بارہ گاہ حسن آراستہ ہے۔ عشق کی پرستش باریاب ہے۔ رنگ ہے نور ہے ساز ہے آواز ہے۔

ایسے وقت خود معشوق جب مخاطب ہوتا ہے عاشق کو یہ خلل اندازی ناگوار گزرتی ہے۔ کیونکہ اس آواز سے اس کا ایوان تصور لرز جاتا ہے۔ اور وہ اس اجنبی کی میزبانی پر آمادہ نہیں ہوتا۔ دیکھئے خیال کی یہی پرواز نظیری کو کہاں لے گئی ہے۔ سے

به دل طرح وصال جاودانی نقش می بندم   گرم خود دوست می آید بخلوت دشمن است
اشب

نظیری تصور جاناں میں وصال جاودانی کا نقشہ جمائے بیٹھا ہے۔ خلوت میں وصل کا اہتمام ہے۔ اور نشاط وصل کی ایسی پرکیف رات کا رہی ہے کہ اس رنگ میں بھنگ ڈالنے کو نظیری کا محبوب بھی آجائے تو وہ اسے اپنا دشمن سمجھتا ہے جاں نثار اختر اور نظیری دونوں عشق کے ایک ہی مقام پر فائز نظر آتے ہیں۔

جاں نثار اختر کے بیان میں سادگی ہے۔ لیکن عشق کا واضح تعین نہیں ہے۔ نظیری نے اپنے عشق کی صراحت کے ساتھ شاعرانہ خصوصیات کا بطور خاص خیال رکھا ہے۔ جاں نثار اختر کا لہجہ ایک بے باک سچے عاشق کا ہے اور نظیری کا اسلوب ایک سلیقہ مند عاشق کا۔ سے

اس طرح میرے جرم سے نظر بچا لو نہ لے   لگتا ہے اک سزا ہے معافی نہیں ہے یہ

جاں نثار اختر کے اس شعر میں جرم حاضر ہے۔ لیکن معشوق انجان ہو جاتا ہے نہ مواخذہ نہ سزا۔ معشوق کی اس بے تعلقی سے عاشق تڑپ اٹھتا ہے۔ معافی کو سزا سمجھتا ہے کیونکہ سزا سے جرم کا حساب بے باق ہو جاتا اور عاشق پھر سے ہنسی خوشی عشق میں مگن ہو جاتا لیکن معشوق کے تیور اس وقت ایسے ہیں کہ وہ عاشق کے جرم کا نوٹس ہی نہیں لیتا۔ ظاہر ہے کہ وہ عاشق کی اصلاح سے مایوس ہو چکا ہے۔ اور سزا کو بیکار سمجھتا ہے۔ اپنے عاشق جانے اس کا کام جانے۔ سے

ز بسوز غصہ او غم کز عذاب جور ترسم   کہ عذر ما نہ پذیرد و جرم ما بخشد

عرفی اس دنیا کے کسی منصف کے آگے داد خواہ نہیں ہے بلکہ منصف حشر کے آگے کھڑا ہے۔ اسے بخشائش کا یقین ہے کیونکہ جو اس کا جرم ہے اس کے بارے میں معقول عذر اس کے پاس ہے۔ لیکن اس کو اندیشہ ہے کہ کہیں اس کا عذر رد نہ کر دیا جائے اور صرف شان کریمی کے اظہار کے لیے اس کا جرم معاف کر دیا جائے۔ اس کا رویّہ کچھ اس طرح کا ہے کہ یہ میرا جرم ہے، یہ میرا عذر ہے۔ قابلِ قبول ہو، قبول کر لیجئے ورنہ سزا دیجئے۔ اس کو گوارا نہیں جانچ پڑتال کے بغیر صرف شانِ کریمی کے صدقہ میں اس کو بخش دیا جائے۔

دو بڑے شاعر ایک بلند مضمون کو ادا کرنے کے لیے دو جداگانہ اسلوب اختیار کرتے ہیں۔ جان نثار اختر کے شعر میں سزا کا ذکر ہے اس لیے اس کا شعر زیادہ روشن ہو گیا ہے۔ لیکن عرفی نے اپنے کردار کو خود اعتمادی کے تیور عطا کئے ہیں اور اس طرح اس کا شعر زندہ ہو گیا ہے۔

خورشید احمد جامی اپنے گھر کی پست دیواروں کو خود دفن کیے جاتے ہیں۔ کہہ رہے ہیں۔ سے

اور اونچی کر دے یہ دیواریں — حال گھر کا نہ جان لے دنیا

جامی کو دنیا کی تانک جھانک سے بڑی وحشت ہے۔ اور دنیا کی یہ پرانی عادت ہے کہ اچک اچک کر ہر گھر میں جھانکتی پھرے۔ جامی کو یہ جاسوسی اس وقت خاص طور پر ناپسند ہوئی جب بے سر و سامانی اس کے گھر میں گھس آئی۔ اب وہ جلد سے جلد ان دیواروں کو اونچا کر دینا چاہتا ہے کیونکہ اسے اندیشہ ہے دوسروں کی تباہی کے تماشے سے خوش ہونے والی دنیا نے گھر کا حال دیکھ لیا تو چار دیواروں کے اندر کی زبوں حالیاں بازار کی رسوائیاں بن جائیں گی۔

نظیری نے اپنے گھر کا جو نقشہ دکھایا ہے وہ جامی کے گھر سے ملتا جلتا ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ دیواروں کی پستی سے جامی کو ڈر ہے کہ دنیا والے گھر کا حال دیکھ لیں گے اور نظیری کی مصیبت یہ ہے کہ اس کا گھر ہوا کی گزرگاہ پر ہے اور پست دیواروں کی وجہ سے ہوا کے تیز جھونکے اس کے گھر کے چراغ کو بجھا دیتے ہیں۔ سے

خانۂ ما خاک ریزاں بر سر راہ صبا ست — شب نمی سوزد چراغ از پستیٔ دیوار ما

جامی کے شعر میں احتیاط کی آڑ ہے اور گھر کا حال ظاہر نہیں ہوتا۔ اس پردہ داری نے شعر کی اثری شدت کو بھڑکنے نہیں دیا ہے۔ اس کے برخلاف نظیری کا عکاسانہ انداز اس کے گھر کے اندھیروں کو انتہائی اندوہناک بنا دیتا ہے۔

دونوں شاعروں کی زندگی کا جائزہ لیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جامی کو نظیری کا شعر کہنا چاہیئے تھا۔ کیونکہ وہ جامی ہی تھا جو زمانہ کے ظلم و ستم کا نشانہ بنا اور نکبت و ناقدری کے بے چراغ اندھیروں میں سرگرداں رہا۔

شہروں میں زندگی کے جلوس کی دھوم دھام ہے۔ گرد و غبار کے بادلوں میں آوازوں کا شور بڑھتا جا رہا ہے۔ جامی اس جلوس کا تماشائی ہے۔ سے

وہ بھیڑ ہے کہ صداؤں کے گونجتے جنگل — نہ کوئی جسم نہ چہرہ دکھائی دیتا ہے

جامی کے ساتھ جان نثار اختر بھی اس جلوس کو دیکھ رہا ہے۔ سے

ہمارے شہر میں بے چہرہ لوگ بستے ہیں — کبھی کبھی کوئی چہرہ دکھائی دیتا ہے

اس بے چہرہ ہجوم کے آگے آئینہ بے جانے کی کوشش میں آئینہ بھی پاش پاش ہوا اور آئینہ بردار بھی روند دے گئے۔ مہاتما جانتا ہے اور فرشتہ کہ ہجوم بے کرداروں ہی چلتا ہے۔
یہ حافظ شیرازی ہیں۔ سے

مدد ے گر بہ چراغے نکند آتشِ طور   چارۂ تیرہ شب وادیِ ایمن چہ کنم

پوچھ رہے ہیں۔ "اگر طور کی آگ سے ایک چراغ بھی نہ مل سکے تو پھر وادی ایمن کی اندھیری رات کو میں کس طرح روشن کروں؟"

حافظ شیرازی چھ سو سال پہلے غزل سرا ہوئے۔ اس وقت گل و بلبل اور ساغر و ساقی کے نغموں میں مجاز اور حقیقت رنگین اجالوں کی عکاسی ہوتی تھی۔ آسمان کے تاروں کو سب ہی دیکھتے تھے۔ فلاکت کے اندھیروں میں غمزدہ انسانوں کے آنسو نظر نہ آتے تھے۔ حضرت موسیٰ کے تقاضوں کے جواب میں کوئی طور پر جلوہ فرما بھی ہوا۔ لیکن اس تجلی نے وادی ایمن کے اندھیروں کو اجالا نہ بخشا۔ حافظ شیرازی کا درد مند دل اس محدود جلوہ ریزی کا فریاد کناں ہے۔ کیونکہ موسیٰ تو تجلی یاب ہو گئے۔ لیکن وادی کا غریب چراغ سے بھی محروم رہا۔
حافظ شیرازی نے وادی ایمن اور آتش طور کی علامتوں کے توسط سے مختاروں کی اجارہ داری کا اور مجبوروں کی محرومی کا نقشہ کھینچا ہے۔ حافظ کے دل سے جو آنچ اٹھی وہ مخدوم تک پہنچتے پہنچتے بھڑکتی آگ بن گئی۔ مخدوم کے پاس دنیا چنبیلی کا منڈوا ہے۔ جس کے سایہ میں غریب پیار کی زندگی گذارنا چاہتا ہے۔ لیکن زمانہ پیار کو پروان چڑھنے نہیں دیتا اور غریب پیار کی چتا میں جل کر بھسم ہو جاتا ہے۔ سے

ایک چنبیلی کے منڈوے تلے
میکدے سے ذرا دور اس موڑ پر
دو بدن پیار کی آگ میں جل گئے

مسجدوں کے پاسبان، مندروں کے مکین، میکدوں کے رند سب پیار کی اس چتا کو جلتا دیکھتے رہے لیکن مخدوم نے پیار کا ماتم کیا اور ایک چارہ گر کے حضور میں پہنچ گئے۔

یہ بتا چارہ گر
تیری زنبیل میں
نسخۂ کیمیائے محبت بھی ہے؟
کچھ علاج و مداوائے الفت بھی ہے؟

حافظ اور مخدوم کا دل ایک ہے، درد ایک ہے۔ حافظ طور پر چمکنے والے بے غریبوں کی اندھیری رات کے لیے ایک مانگ رہے ہیں اور مخدوم پیار کی آگ میں جلنے والوں کے لیے چارہ گر سے اس چارہ گری کے طلبگار ہیں جس نے غریبوں کو گنہگار بنا دیا تھا۔ سے

زندگی درد سرہوئی حاتم   کب ملے گا مجھے پیا میرا — !

محبت کی منزلِ مراد وصلِ محبوب ہے۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ محبت اگر سچی ہو تو وصلِ محبوب مشکل اور اکثر صورتوں میں نا ممکن ہو جاتا ہے۔ ہجر کے صدمے سہتے سہتے محبوب کا تصور ایک خیالی پیکر کو تنہائیوں کا شریک کر دیتا ہے اور حقیقی وصل کے تعلق سے ایسی آرزو مندانہ منصوبہ بندی ہونے لگتی ہے کہ وصل تاخیر میں پڑ جائے تو فراق دردِ سر بن جاتا ہے۔ اس دردِ سر کے زیرِ اثر زندگی تیرہ و تاریک ہو جاتی ہے۔ اور صرف آرزو کا ایک چراغ ٹمٹماتا رہتا ہے۔

حاتم انتظار کی اس منزل میں ہیں۔ جہاں سے ابدی خاموشیوں کے غار کا سیاہ دہانہ ان کو صاف نظر آ رہا ہے۔ دوسری طرف وہ محبوب کی آمد سے مایوس بھی نہیں ہیں۔ امید و بیم کے اس دوراہے پر حاتم جب سوچتے ہیں کب ملے گا مجھے پیا میرا تو ان کے ہونٹوں پر آواز منجمد ہو کر رہ جاتی ہے اور دل اپنی کراہتی دھڑکنوں میں اس سوال کو دہرا کر چپ ہو جاتا ہے۔ اس نوبت پر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اگر وصلِ محبوب میسر بھی ہو جائے تو کیا تکمیلِ آرزو کی سکت بھی ہوگی؟ یہ بات البتہ یقینی ہے کہ وصل سے لذت یاب ہوں نہ ہوں دردِ سر سے تو چھٹکارا مل جائے گا۔

وصلِ محبوب کے انتظار میں ادھر حاتم سر تھامے بیٹھے ہیں ادھر میرؔ صاحب مچل رہے ہیں۔ ؎

وصل اس کا خدا نصیب کرے   میرؔ جی چاہتا ہے کیا کیا کچھ

وصل کے لیے تائیدِ ایزدی کو آواز دی جا رہی ہے۔ ساتھ ہی وصل کی ساری تقریبات کا طرب انگیز جائزہ بھی لیا جا رہا ہے۔ میر صاحب کا جی جو چاہتا ہے اس کی خبر اگر محبوب کو ہو جائے تو وصل سے پہلے "وصال" کا انتظام ہو جائے۔

حاتم کا شعر کسی از کار رفتہ عاشق یا کسی محبت زدہ خاتون کی آہ ہے۔ اس کے برعکس میرؔ کا شعر کسی منچلے عاشق کی مردانہ للکار ہے۔

اب آیئے غالبؔ اور داغؔ کی ہم خیالیوں پر خیال آرائی کریں۔ غالب بیمار ہیں . . . . افاقہ کے آثار نہیں . . . لیکن کوئی اچانک عیادت کو آ جاتا ہے۔ اور ان کے چہرہ پر رونق کھل اٹھتی ہے۔ بیماری کو بہانہ سمجھا جاتا ہے۔ اور عیادت کو آنے والے کا پیچھا ہوا دل پھر خلش پتھر بن جاتا ہے۔ مزاج پرسی کے بدلے بے رخی برتی جاتی ہے اور آنے والا تیوری پر بل ڈالے واپس چلا جاتا ہے . . . . غالب کے چہرہ کی رونق پر بیماری کی مردنی دوبارہ مسلط ہو جاتی ہے۔ ؎

ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق   وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

غالب کے شعر میں ایک نفسیاتی کیفیت کا مظاہرہ ہے اور بیمار کی مایوسی کا ایک ایسا دلدوز حزنیہ جس میں کچھ ادائی مضمحل دھڑکنوں کا نغم [illegible] ہے۔

داغؔ بھی بیمار ہیں ان کی عیادت کے لیے بھی کوئی آیا ہے۔ ؎

وہ عیادت کو مری آتے ہیں لو اور سنو   آج ہی خوبیٔ تقدیر سے حال اچھا ہے

داغؔ کا حال غالب سے اچھا ہے۔ جس دن کوئی عیادت کو آیا۔ ان کو افاقہ تھا وہ اپنی بدقسمتی پر کڑھتے ہیں کہ اسی دن طبیعت سنبھلنا تھی جس دن کوئی مزاج پرسی کو آیا ہے۔ اب لازمی طور پر عیادت کو آنے والا بھی سمجھے گا کہ بیماری کا ڈھونگ رچا کر

ملاقات کے لیے راستہ ہموار ہو گیا۔ حسیت دونوں بیماروں کی ایک ہی ہے لیکن غالب چونکہ درحقیقت بیمار نہیں اور صرف کسی کی آمد پر بحال ہوتے ہیں۔ ان کی بپتا زیادہ درد انگیز ہے اس طرح زیادہ گہرائی ہمدردیوں کی مقدار ابھرتی ہے۔ زوالی دونوں کے [illegible] گیا ہے۔ لیکن غالب کی بے ساختگی میں اثر کا وزن زیادہ ہے۔

یہ بھی غالب ہیں۔ حسن پرست اور خلد کی سیر میں مگن ان سے حوروں کے بارے میں پوچھا جاتا ہے تو ان کی کوئی خاص فرمائش نہ ہوتی۔ اتنی تاکید ضرور کرتے ہیں کہ حوروں سے حصول تسکین ممکن ہو نہ سہی یہ تو ہو کہ ان کی صورت دنیا کی محبوبہ سے ملتی جلتی ہو تاکہ طرح آسودگی کی صورت نکل آئے۔ ؎

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے حورانِ خلد میں تری صورت مگر ملے

داغ کا اظہارِ خیال میں کچھ زیادہ بے باک ہیں۔ لیکن ان کے انداز میں سنجیدگی کا وہ وقار نہیں ہے جو غالب کی حسن پرستی کا امتیاز ہے۔ ؎

پکارا دیکھ کر میں حور کی شکل خداوندا یہ صورت وہ نہیں ہے

داغ محبوب کی ہم شکل حور چاہتے ہیں اور غالب ان حوروں کو بھی قبول کرنے پر آمادہ ہیں جو ان کی محبوبہ سے ملتی جلتی شکلیں ہوں۔ مختصر یہ کہ داغ محبوبہ ہی کی شکل ڈھونڈ رہے ہیں۔ اور غالب کا کام مشابہت سے بھی چل رہا ہے۔ داغ کے پیش نظر غالب کا شعر رہا ہے اور توقع یہ تھی کہ وہ اس مضمون کو غالب سے بہتر انداز میں ادا کرتے۔ لیکن داغ صرف اپنی شوخی کا رنگ دے کر ہی قناعت کر گئے۔

اس موقع پر غالب اور چغتائی کی خیال آرائی کا تقابلی جائزہ بھی پیش خدمت ہے۔ زندگی کے بارے میں غالب کا شعر ہے۔ ؎

رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

انسان کی مجبوری اور زندگی کی بے ثباتی کا ایک موثر نقشہ نگاہوں کے سامنے آتا ہے۔ عمر کا گھوڑا دوڑ رہا ہے انسان اس پر ہے اس مجبوری کے عالم میں کہ نہ باگ پر ہاتھ ہے نہ رکاب میں پاؤں۔ اس گھوڑے کو وہ نہ تو کسی دوسری سمت میں موڑ سکتا ہے نہ اسے قابو کر سکتا ہے۔ اب یہ گھوڑے کی مرضی پر منحصر ہے وہ جہاں چاہے رک جائے اور جہاں وہ رکا۔۔ [illegible] غالب کے اس شعر کو عبدالرحمان چغتائی نے مصوّر کیا ہے۔ تصویر میں ایک دریا ہے دریا کے پانی پر کنول کا ایک پھول کھلا ہوا رہا ہے۔ اور کنول کے پھول میں ایک شعلہ اپنی لرزشوں میں استوار ہے۔ دریا وقت کا دریا ہے اور شعلہ لرزاں انسان کی زندگی [illegible] یک خیال کی تشریح کے لیے غالب نے انسان کو گھوڑے پر بٹھا دیا۔ نہ باگ ہاتھ نہ پاؤں رکاب میں۔۔۔ اور گھوڑا [illegible]۔ اس میں کوئی شک نہیں زندگی کا جو تجزیہ غالب نے کیا ہے وہ ذہن پر اپنا گہرا نقش چھوڑتا ہے لیکن مصور [illegible] بیان کیا گیا ہے۔ غالب کے گھوڑے کے راستے میں کوئی مزاحمت یا رکاوٹ نہیں ہے۔ [illegible] گھوڑا نہ جائے کیونکہ گھوڑا رکا۔۔۔ اور سوار گرا۔ اب ذرا مصور کی شاعری ملاحظہ ہو۔ دریا [illegible] وقت کی روانی [illegible] کنول میں شعلہ ہمسفر زندگی کا سفر ہے۔ شعلہ کے لیے یہ سفر کس قدر خطرناک ہے اس کا اندازہ اسی طرح لگایا جا سکتا ہے کہ

[illegible] کا ایک اتفاقی کروٹ اس شعر کو ہمیشہ کے لیے بچا سکتی ہے۔ زندگی کی بے ثباتی اس تصویر میں اتنی ابھر [illegible] والا [illegible] ہو کر دوام کا راستہ چھوڑ کر ہر ایک اس کے پیچھے پیچھے سرگرم سفر ہے۔ چاہے وہ جہاں لے جائے۔ چاہے وہ دنیا چھوڑ دے۔

شاعر جب حزن و ملال کا ماتم کرنے بیٹھا تو خود بھی ان کی لپیٹ میں آگیا۔

ایک خیال یہ ہے کہ یہ شاعروں کا گھر ہی ہے جو نحوست ہو کر ساری بلاؤں کو ان کے گھروں میں آباد کرتا ہے۔ دوسری طرف یہ کہا جاتا ہے کہ یہ سب شاعرانہ نقشہ کشی ہے۔ حقیقت میں شاعر مست مگن اور رنجش کی پھبتیاں اڑانے والے ہوتے ہیں۔ لیکن یہ بات مانی جاتی ہے کہ اگر صرف شاعری ہی ذریعہ معاش ہو تو پھر شاعر کے نکبت و افلاس کے تعلق سے دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ انوری کے بیان کو تسلیم کر لیں تو شاعر کا گھر دنیا بھر کی بلاؤں کا مسکن ہوتا ہے۔ ؎

ہر بلائے کز آسماں آید — گرچہ بر دیگراں قضا باشد
بر زمیں نارسیدہ می گوید — خانۂ انوری کجا باشد

ہر وہ بلا جو آسمان سے اترتی ہے زمین تک پہنچی بھی نہیں کہ پوچھنے لگتی ہے۔ انوری کا گھر کہاں ہے حالانکہ اس کو کسی اور کے گھر جانا ہوتا ہے۔ انوری کا گھر کیا ہوا بلاؤں کا گھر ہوا خود انوری کی قسمت کی بلائیں کیا کم ہیں کہ دوسروں کی بلائیں بھی اس کے گھر پڑنے لگیں۔ ہو سکتا ہے انوری کا جبیں خندہ پیشانی سے بلاؤں کا خیر مقدم کرتا ہے۔ اس کی کشش دوسری بلاؤں کو اس کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ یا یہ کہ انوری کی بلائیں اس کا قصہ ختم کرنے میں ناکام رہتی ہیں تو دوسری بلائیں ہاتھ بٹانے کو اس کے گھر کا رخ کرتی ہیں۔ جو بھی ہو بلا نصیبی میں انوری کا کوئی شریک نہیں۔ وہی سب کی بلاؤں کو بھگتنے والا ہے۔ انداز بیان اس قدر دل نشین ہے کہ شاعرانہ مبالغہ کی کارفرمائی کے باوجود اس پر رحم آ ہی جاتا ہے۔

خورشید احمد جامی کی زندگی کا بڑا حصہ ابتلا اور کشمکش میں گزرا۔ اور اگر کسی وقت آزمائش کی سخت گرفت میں اس نے محسوس کیا کہ [illegible] میں اکیلا غم کا نشانہ ہے۔ تو یہ کوئی شاعرانہ مبالغہ نہیں۔ جب نشاط کی ہوا چلتی ہے کچھ اور تیز جھونکوں پر حق جتایا جاتا ہے۔ جب بلاؤں کی آندھی اٹھتی ہے ایسی داویلا مچتی ہے جیسے آسمان ہی ٹوٹ پڑا۔ جامی کے پاس انوری کا شاکی لب و لہجہ تو نہیں ہے لیکن حسن بیان اس قدر دل پذیر ہے کہ ایک دھڑکن تڑپتی ہے دوسری جھومتی ہے۔ بلائیں انوری کا گھر ڈھونڈتی ہیں لیکن غم ایام جامی کے گھر کی تلاش میں ہے۔ جامی کو معلوم ہے غم ایام اس کا گھر ڈھونڈ رہا ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے خود جامی سے اس کے گھر کا پتہ پوچھا گیا ہو۔ لیکن جامی اس افتاد کا واضح ذکر نہیں کرتا۔ یہ کیا ہے کہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے غم ایام آخر کار اس کے گھر پر آ دھمکا۔ انوری کے گھر میں بلاؤں کا ہجوم ہے اور انوری کا ہر ہمدرد ان بلاؤں کو اس کے گھر سے باہر کرنا چاہے گا کیونکہ وہ غلط گھر میں گھس بیٹھی ہیں۔ لیکن جامی کا یہ حال ہے کہ حادثہ غم سے خبردار ہے اور دستک پر کان لگائے بیٹھا ہے۔

جامی کے ساتھ ہمدردی ابھرتی ہے لیکن یہ خیال مانع ہوتا ہے کہ اب اس بلاکش کو بچانے کی کسی بھی کوشش سے کچھ فائدہ نہیں۔ ؎

انجانا مسافر کی طرح شہر وفا میں — گھر ڈھونڈ رہا تھا غم ایام کسی کا

غزلیں

رونق دکنی سیمابی

حاملِ بوئے چمن حسن کا پیکر جیسے
جسم پابستۂ گیسوئے معنبر جیسے

وہ تذبذب کا ہے عالم کہ مرا جذبۂ شوق
رک گیا ہے حدِ ادراک تک آ کر جیسے

دل اِدھر ٹوٹ گیا نبض ہوا دشت کی طرح
آ گرا چھن سے سرِ آئینہ پتھر جیسے

اپنی ہی گرد میں الجھی ہوئی آدم کی شبیہ
یعنی ٹوٹے ہوئے لمحات کا منظر جیسے

شعلۂ خوں سے ہے تابندہ رُخِ مستقبل
یہی پیشانیٔ امروز کا جھومر جیسے

بے اثر بھی ہے دعا بختِ ہمایوں کی قسم
اب کہاں لوگ ہیں اس دور میں بابر جیسے

کوئی آ آ کے پلٹ جاتا ہے شب بھر رونق
چاپ قدموں کی دھڑکتی ہے پسِ در جیسے

نصیر پرواز

ہر اک عمل مرے لمحوں کا رائیگاں نہ ہوگا
چراغِ فکر جلاؤں گا تو دھواں ہوگا

جو پاؤں رکھوں گا یادوں کی شاہراہوں پر
قدم قدم تری آہٹ کا آسماں ہوگا

جلا رہا ہوں تجسس کی آگ میں جس کو
وہ حرفِ خاک کبھی شعلۂ بیاں ہوگا

کہاں کہاں سے سمیٹوں گا آبروئے جواب
بنامِ زیست اگر میرا امتحاں ہوگا

ترا ہی عکس ہیں دنیا میں نقش جتنے ہیں
یہ خامشی کا گہر تو بھی بے زباں ہوگا

ہر ایک لمحۂ امید حرفِ آبِ رواں
گرفتِ چشم میں آ کر بھی بے نشاں ہوگا

ترے الم کا بہت اشتیاق ہے دل کو
مری حیات میں یہ حادثہ کہاں ہوگا

میں جب بھی تیرا کتابوں میں نام ڈھونڈوں گا
طلوعِ فکر کا عالم بروئے جاں ہوگا

کھڑا ہوا ہوں صداؤں کی صف میں اے پرواز
مرا بھی نام کبھی زیبِ داستاں ہوگا

قطب سرشار

سنگ و آہن میں رہا شیشہ گروں میں کب تھا
دل کہ آوارہ و سودائی گھروں میں کب تھا

سرفروشوں کے دلوں میں رہا جذبے کی طرح
فلسفہ کی طرح لیکن میں سروں میں کب تھا

رہزنی پیشہ کیا جبر تو شیوہ ہی رہا
وہ حلف لے کے بھلا راہبروں میں کب تھا

لے اڑی چشمِ نگہدار کی رفعت ورنہ
نورِ پرواز ذہانت کے پروں میں کب تھا

تجھ کو سرشار منافق کہیں کس طرح کہ تو
سادہ لوحوں میں رہا فتنہ گروں میں کب تھا

علاؤالدین جینابڑے

ناطق و غالب : ایک تقابلی مطالعہ

واہ رے حسنِ بیاں، اللہ رے اندازِ کلام
میرزا غالب ہے ناطق، یوسفِ ثانی مجھے

مولانا ناطق گلاؤٹھوی داغ دہلوی کے شاگرد تھے۔ آپ نے داغ کے پہلے مجموعۂ کلام "آفتابِ داغ" کو پیہم مطالعہ میں رکھ کر، ابتداً اپنے کلام کی اصلاح کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بقول نیاز فتحپوری، معاملاتِ حسن و عشق کو اسی زبان میں ادا کرتے تھے جو تغزل کے لحاظ سے معیاری چیز سمجھی جاتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ناطق نے دہلی اسکول کے دیگر اساتذۂ سخن کا بھی بنظرِ استحسان مطالعہ کیا اور اُن سے اکتسابِ فیض کیا ہے۔ جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں ؎

مومن پہ بھی ایمان ہے غالب پہ بھی، ناطق
ہم ذوق کے انداز میں رہتے ہیں مگن اور

تاہم ناطق صاحب نے کسی استاد کا تتبع نہیں کیا۔ فکر اور اسلوب میں اُن کی انفرادیت مسلّم ہے اُن کا اندازِ بیان اُن کا اپنا ہے۔ یہ خیال ملاحظہ ہو ؎

کیا شان ہے جلوہ کی، یہ پوچھ اہلِ نظر سے
آئینے میں کچھ ہوتی ہے سورج کی کرن اور

اور پھر اسی غزل میں قافیوں کی ندرت بھی دیکھئے کہ یہ خاص جدت مولانا ناطق کی ہے اور اس میں غالب سے نسبت اس عنوان سے ہے کہ غالب نے قدماء کے پیش افتادہ مضامین کو سیدھے سادے انداز سے ادا کرنے کے طریقے سے ہٹ کر جدتِ خیال و ندرتِ بیان کے فکر انگیز اسلوب کو فروغ دیا۔ ناطق نے اس میں ہندی قافیوں سے نیا پن پیدا کیا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

چال اور ہے دنیا کی، ہمارا ہے چلن اور
وہ ساختہ ہے کچھ، اور ہے بے ساختہ پن اور

اُن کا ہر اک انداز ہے دنیا سے نرالا
چال اور ہے، بات اور ہے، گھات اور، پھبن اور

تقدیر سے راس آئی نہ راحت کبھی ہم کو
آسودۂ منزل ہوں تو ہوتی ہے تھکن اور

اچھوتے مضامین، نرالا اندازِ بیان اور نازک خیالی و معنی آفرینی کے ساتھ ہی نادر تشبیہات، استعارات و کنایات و تمثیلات اور شوخی و ظرافت کی وجہ سے غالب کا کلام متقدمین و متاخرین میں ممیز ہے۔ ناطق کے کلام میں ان محاسنِ شعری سے لطف اندوز ہونے کے لئے زیادہ تلاش و جستجو کی ضرورت نہیں۔ جستہ جستہ شعر ملاحظہ ہوں ؎

وہاں پہنچ کے اب ہم کر کیا بتائیں، وہ پیچ و خم ہیں کہ کچھ نہ پوچھو
یہ چالِ راہِ طلب کی دیکھو کہ چل رہی ہے مٹک مٹک کر

—

خاطرِ بستہ کی گرہ رہنِ کشادِ گل نہیں　　　کوئی عزیب کیا کرے رنگِ بہار دیکھ کر

اور پھر ملاحظہ ہو۔ شوق کی زیاں کاری کو کس کنایہ و تمثیل کے ساتھ کے دلنشین انداز میں پیش کیا ہے ؎

اے دلِ تکیہ دارِ شوق، حاصلِ سوز کیا کہوں　　　جی ہی پگھل کے رہ گیا، شمعِ مزار دیکھ کر

اسی غزل کا یہ شعر بھی دیکھئے جس میں نفسیات کی عکاسی بھی ہے اور "دلِ صد فگارِ غم" پر ایک لطیف طنز کی چوٹ بھی، محاورہ کا دل آ دینا استعمال اس پر مستزاد ہے ؎

اے دلِ صد فگارِ غم، پھولوں کی جب ہوس نہ ہو　　　کھائیے خار کس لئے، کثرتِ خار دیکھ کر

ناطق کے کلام میں ایسے سیکڑوں اشعار ملتے ہیں جنھیں پڑھ کر غالب کے مماثل اشعار یاد آئیں یا نہ آئیں لیکن بنظرِ غائر مطالعہ کرنے پر قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ محاسنِ شعری جو غالب کے کلام میں پائے جاتے جاتے ہیں، ناطق کا کلام اُن سے خالی نہیں ہے۔ جہاں تک لفظی تصرفات کا تعلق ہے، ناطق کے یہاں زیادہ ہی ملیں گے۔ ملاحظہ ہوں ؎

بت کیا بھلا کسی کا مقدّر بنائیں گے　　　خاک ان کے ہاتھ میں ہے یہ پتھر بنائیں گے

ناطق اسی طرح سے مرادیں بر آئینگی　　　اس چاند کو نصیب کا اختر بنائیں گے

غالب کی معنی آفرینی، نکتہ رسی و ندرتِ خیال و تخیل کی مثالیں غالب کے بعد کسی اور کے کلام میں ملنا مشکل ہے لیکن ناطق اُن شعراء میں یقیناً ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں جنھوں نے ان محاسن کو برتنے اور غزل کی آبرو اور روایتی شائستگی و تہذیب کو برقرار رکھنے کی سعیٔ بلیغ کی ہے۔

اسی طرح قدماء کے برتے ہوئے مضامین کو ایسے نئے انداز سے پیش کرنا کہ فکر و خیال کے نئے مہمیز بن جائیں، غالب کا خاص کمال رہا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج　　　مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

ناطق نے اسی خیال کو یوں باندھا ہے ؎

خوگر ہوئے مشکل کے، آسان ہوا جینا　　　آسان ہوئی مشکل، مشکل ہوئی آسانی

اسی طرح حافظ شیرازی کا یہ شعر ہے ؎

واعظِ شہر کہ مردم ملکش می خوانند　　　قولِ ما نیز ہمیں است کہ آں آدم نیست

ملاحظہ ہو ناطق نے اسی مضمون کو اردو میں کس خوبی سے نظم کیا ہے ؎

بحث تمام ہوگئی، شیخ فرشتہ ہی سہی　　　ہم بھی تو کہتے ہیں یہی، یعنی یہ آدمی نہیں

درج ذیل شعر میں "آشوبِ آگاہی" کی ترکیب پر غور فرمائیے تو شعر میں معنی آفرینی کا ایک جہان نظر آتا ہے ؎

جنوں پر ورہے ہم ہوش میں آشوبِ آگاہی　　　خرد کو عقل دینے کے لئے پروانہ آتا ہے

زیادہ طوالت میں نہ جاتے ہوئے ذیل میں مولانا ناطق کے چند ایسے اشعار دیئے جاتے ہیں جو یا تو غالب کی زمینوں میں کہے گئے ہیں یا اُن میں وہی مفہوم یا قریب قریب ویسا ہی مفہوم ادا کیا گیا ہے جو غالب کے اشعار میں ہے۔ ساتھ ہی غالب کے اشعار بھی درج ہیں، ملاحظہ کیجئے ؎

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے (غالب)

وہ آدم تھے جو نکلے اور وہ بے شان جنت کی
جو ہم نکلیں تو ظالم تیرے کوچے کا بھرم نکلے (ناطق)

آئے ہے بیکسیٔ عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد (غالب)

مصیبت زندگی کی کس کے گھر اب سر چھپائے گی
اجل اتنی اجازت دے کہ میں لیتا چلوں وہ بھی (ناطق)

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے
شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا (غالب)

رکھتا ہے تلخ کام، غمِ لذتِ جہاں
کیا کیجئے کہ لطف نہیں کچھ گناہ کا (ناطق)

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اسے دیکھوں، بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے (غالب)

آئے گا جلوہ نمائی کا بھی دن آجائے گا
یہ بھی دیکھا جائیگا کس کس سے دیکھا جائے ہے (ناطق)

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں (غالب)

درد سے لطف کیوں نہ لے چوٹ سے جی چرائے کیوں
غم کو نہ کھا کے بیٹھئے کھائیے غم سے ہائے کیوں (ناطق)

مولانا ناطق نے دیوانِ غالب کی شرح بھی لکھی ہے۔ جو ایک قابلِ قدر تصنیف ہے اور ۱۹۶۸ء میں چھپ چکی ہے اس میں ناطق نے کلامِ غالب کی فنی خوبیوں کی جگہ جگہ دل کھول کر تعریف کی ہے اور غالب کے متعدد اشعار کی توضیح و تشریح میں اپنے اشعار بھی پیش کئے ہیں جو قابلِ تعریف ہیں۔ ؎

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذت زخمِ سوزن میں نہیں (غالب)

درد کی لذت ہے فکرِ چارہ سازی کا سبب
زخم منہ پھاڑے ہوئے بیٹھے ہیں سوزن کیلئے (ناطق)

ہوں فشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود
قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں (غالب)

ہوا جاتا ہے بے بس اضطرابِ خاطرِ محزوں
کشاکش ہائے زورِ ناتوانی دیکھتے جاؤ (ناطق)

رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں (غالب)

سمندِ عمر رواں ہے مدار کیا غافل
چلے چلے، نہ چلے، یہ کسی کے بس میں نہیں (ناطق)

غرض یہ کہ دو نسبتوں سے غالب کے ساتھ کلامِ ناطق کا مطالعہ دلچسپی اور تسکینِ ذوق کا باعث ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ ناطق بھی غالب کی طرح فکر اور فن کے معاملے میں اپنی مخصوص انفرادیت رکھتے ہیں اور دوسرے یہ کہ ناطق غالب کے باشعور مداح اور شارح ہیں۔ اس حیثیت میں ناطق کا انفرادی آہنگ نکھر کر ابھرتا ہے جب اس میں غالب کا پَرتَو جھلکتا ہے ——

ڈاکٹر مشفق الرحمٰن خاں مشتاق

تضمین بر کلام اقبال

کیف و نشاطِ زیست کی حسرتِ خام سے گذر
ذوقِ نظر بلند رکھ، جلوۂ عام سے گذر
گرمِ سفر مدام رہ فکرِ قیام سے گذر

تو ابھی رہ گذر میں ہے قیدِ مقام سے گذر
مصر و حجاز سے گذر پارس و شام سے گذر

لذتِ سرخوشی ہے اور غم کا مزا کچھ اور ہے
کذب و ریا ہے اور شئے صدق و صفا کچھ اور ہے
حاصلِ جذب و مستئ اہلِ وفا کچھ اور ہے

جس کا عمل ہو بے غرض اس کی جزا کچھ اور ہے
حور و خیام سے گذر بادہ و جام سے گذر

رشکِ مہِ تمام ہے اس کی جبینِ تابدار
رہزنِ قلب و ہوش ہے اس کا جمالِ نوبہار
اس کی نگاہ پرخمار اس کا شباب سحرکار

گرچہ ہے دل کشا بہت حسنِ فرنگ کی بہار
طائرک بلند بال، دانہ و دام سے گذر

اصل میں بے نظیر ہے تیرا وفورِ شوق و جذب
تیرے ہی دم سے زندہ ہے نام مذاقِ جذب و ضرب
عزم کو تیرے سرنگوں کر نہیں سکتے رنج و کرب

کوہ شگاف تیری ضرب تجھ سے کشادِ شرق و غرب
تیغِ ہلال کی طرح عیش نیام سے گذر

مجھ کو ڈر ہے کہیں کثرتِ علم کا غرور
تیرا دماغ ہو نہ جائے [illegible]
کوئی [illegible] تیری [illegible]

تجھ [illegible] تیری [illegible]
[illegible] گذر [illegible] سے گذر

یادِ اقبال

وہ خودی کا پردہ ساز تھا، وہ فسونِ رنگِ مجاز
کہ فروغِ جلوۂ ناز تھا تری سجدہ گاہِ نیاز
تری فکر سوزِ پیمبری، تری سلئے نوائے سکندر
سرِ عرش تیری قلندری، تو مگر زمیں پہ نماز
تو ادا شناسِ زماں بھی تھا تو وفا شعارِ نہاں بھی
ترا دردِ حرفِ فغاں بھی تھا تو بیانِ شکوۂ ناز
کوئی ہم نوا بھی نہیں ترا کہ تو جبرئیل نفس ہے
ترا نطق ضربِ کلیم تھا ترا طورِ خاکِ حجاز ہے
تری یاد ہے کہ سلامِ نو، ترا ذکر جیسے کلامِ نو
تو سنا گیا وہ پیامِ نو کبھی اپنے لحنِ گداز سے
نہ حکایتِ گل معتبر، نہ چمن میں رونقِ دیدہ ور
تجھے ڈھونڈتے رہے بام و در تو نشیب میں فراز ہے
وہی حسرتیں وہی چشمِ نم، وہی گردشیں وہی پیچ و خم
وہی ارتعاشِ نوائے غم ابھی عرصہ ہائے دراز میں

رشید عبدالسمیع جلیل

ڈاکٹر کے۔ گوپال کرشنا راؤ

شاہکار ترجمے: تلگو سے

ہندوستان کئی زبانوں اور کئی تہذیبوں کا ملک ہے۔ شمال اور جنوب کے فاصلے اتنے طول و طویل ہیں کہ ان میں ایک دوسرے کو سمجھنے سمجھانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ ایک حد تک انگریزی نے آزادی سے قبل ایک زبان کی کڑی میں ان مختلف علاقوں اور زبان والوں کو پرونے کی کوشش کی۔ یہ حکمرانوں کے مقصد کے تحت ہوا تھا۔ مگر اس سے ہندوستانیوں کو بھی کافی فائدہ پہنچا۔ اس کے باوجود محسوس ہوتا تھا کہ کوئی ایک غیر ملکی یا ملکی زبان اس مقصد کو پورا نہیں کر سکتی کہ ہندوستان کے مختلف علاقے والے اور مختلف زبان والے ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھیں اور اپنا بہترین سرمایہ دوسرے کو دیں۔ اس کے لئے بڑے پیمانے پر تہذیبی تعاون کی کوششوں کی ضرورت تھی۔ اور ان میں سے ایک اہم ذریعہ ترجمہ ہے!

آزادی کے پہلے بھی پڑوسی زبانیں ایک دوسرے سے ترجمہ کرنے کا کام کرتی تھیں۔ مگر یہ کوشش زیادہ تر انفرادی تھیں۔ اور بجائے اعلیٰ معیار کو برقرار رکھنے کے اس کتاب کا یا مضمون یا نثر کا ترجمہ کیا جاتا جو مذہبی نقطہ نظر سے مقبول ہو یا قصہ کہانی سے۔ اکثر ترجمے ناقص ہوتے ہیں لیکن اعداد و شمار کا اندازہ کیجئے تو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ہمیں ایک دوسرے کو پڑھنے اور سمجھنے کی خواہش اتنی شدید رہی ہے کہ دوسری زبانوں کے ناقص ترجمے بھی بار بار چھپے ہیں۔ اور مقبول ہوئے ہیں۔ ترجمہ کرنے کے لئے دونوں زبانوں پر ماہرانہ قدرت درکار ہے اور کم از کم ایک زبان مترجم کی اپنی مادری ہونی چاہئے۔ ورنہ ترجمہ اصل کے ساتھ انصاف نہیں کر سکے گا۔ ذو لسانی یا سہ لسانی افراد ترجمے کا کام اچھا کر سکتے۔ آزادی کے قبل ایسے ہی افراد نے اپنی دلچسپی کے پیش نظر یا تو پڑوسی علاقوں کی زبانوں سے ترجمہ کیا ہے یا ان زبانوں سے جنہیں وہ جانتے تھے۔ لیکن کوئی باضابطہ طریقہ کار موجود نہیں تھا۔ زیادہ تر ترجمے غیر ملکی زبانوں سے سنسکرت یا دیگر کلاسیکل زبانوں سے ہوئے ہیں۔

آزادی وطن کے بعد ہر میدان میں اتنا تعمیری کام کرنا تھا۔ اور اس کے لئے اتنے وسائل اور ذرائع کی ضرورت تھی کہ اگر زبان و ادب کی طرف ہم توجہ نہ دیتے، تب بھی بجا تھا۔ مگر یہ خوش قسمتی تھی کہ اس وقت ہماری بساط سیاست پر ایسے مہرے موجود تھے جنہوں نے خود زبانوں کی اعلیٰ تعلیم پائی تھی اور مشرق اور مغرب کے ادب کا صحیح ذوق رکھتے تھے۔ اس لئے ان تعمیری کاموں کے ساتھ ساتھ زبان و ادب کے مسائل پر بھی باقاعدہ غور کیا گیا۔ ہندوستان کی بڑی زبانوں کے قدیم سرمایہ کو برآمد کیا گیا۔ اور نئے رجحانات سے واقفیت حاصل کی گئی۔ اچھے لکھنے والوں کی ہمت افزائی کے لئے مختلف ادارے قائم ہوئے، جن کی حیثیت کہیں سرکاری کہیں نیم سرکاری اور کہیں تسلیم شدہ اداروں کی تھی۔ انفرادی طور پر بھی مالی وظائف اور اعزازی اور ترغیبی انعاموں کے طور پر کئی اعلانات کئے گئے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ہر صوبہ میں ادب فروغ اور ساتھ ہی ترجمہ کو بڑے پیمانے پر کوشش کی گئی۔ آخر ان ہم دران کی تحریک کے تحت نیشنل بک ٹرسٹ (NATIONAL BOOK TRUST) نے اس کام کو نبھایا۔ اس سے پہلے ساہتیہ اکاڈمی اور اس کی شاخیں تمام ہندوستانی زبانوں کی اہم کتابوں کو ہر یا ہ بانٹیا

میں منتقل کرنے کا کام کرنے کی ضرورت تھی وسائل نے بھی اس طرف توجہ دی اور پچھلی پوری صدی اگر کام ہوا تھا وہ گویا آزادی کے بعد کے ایک دہے میں پورا ہوگیا۔ بیداری کی وجہ سے اچھے ترجمہ نگار سامنے آئے۔ مختلف زبانوں کے ورثے سے واقفیت بڑھی اور ہندوستان کو ہم آہنگی میں یکجہتی کی تلاش میں آسانی ہوگئی۔

حیدرآباد میں تلگو اور اردو کا رشتہ بہت پرانا ہے۔ اردو اور فارسی درباروں میں تلگو کی سرپرستی رہی ہے تو عوام کے طبقے تلگو کے ساتھ ساتھ اردو کی سرپرستی کا جذبہ کارفرما رہا ہے حیدرآباد پہلے بھی کئی زبانوں اور شمال اور جنوب کا سنگم تھا یہاں والوں کے لئے دو تین زبانیں پڑھنا اور تین چار زبانیں بول لینا کوئی نئی بات نہ تھی۔ چنانچہ قدیم سرمایہ کو چھوڑ دیجئے تب بھی ہمیں ماضی قریب میں ایسے کئی مضمون نگار مصنف اور شاعر مل جاتے ہیں جنہوں نے اردو سے تلگو اور تلگو سے اردو ترجمے کرکے یا تخلیق کرکے اردو اور تلگو والوں کو ایک دوسرے سے جذباتی طور پر قریب کرنے میں بڑا کام کیا ہے۔

چیدہ چیدہ کہانیوں مضامین اور نظموں کی فہرست طویل ہے ان سے قطع نظر کرکے صرف مستقل کتابوں یا افراد کا نام لوں تو بھی لیبا دینا کافی ہوا ہے۔ حال میں تلگو سے اردو میں آنے والی کتابوں اور مضامین میں مندرجہ ذیل کو اہم سمجھتا ہوں۔

شاعری۔ اس ضمن میں شری نارائن ریڈی اور گنٹور شیشیندر شرما کا نام لینا بے جا نہ ہوگا۔ نارائن ریڈی خود شاعر ہیں اور تلگو کے ساتھ ساتھ اردو پر بھی بڑی دسترس رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنی تلگو شاعری کا خود ہی بارہا ترجمہ کیا ہے اور دو لسانی شاعروں میں بہت کامیاب رہے ہیں ان کی تلگو اردو نظموں میں "مجھے زہر پینے دو" مدت تک لوگوں کو بھلائے نہ بھولے گی۔ شری شیشیندر شرما تلگو کے بہت اچھے شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ اور ان کی جمالیاتی کیفیت اور ان کا مخصوص طرز بیان انہیں سب سے الگ کرتا ہے۔ اس قسم کے شعر کے لئے تلگو سے زیادہ اردو والوں کی فضا سازگار رہی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام اردو میں ترجمہ ہو کر جب چھپا تو کافی مقبول ہوا۔ "نیلم کے پنکھ" ان کا ایسا ہی مقبول ترجمہ ہے۔ مگر ترجمہ کرنے والے وہ نہیں ہیں بلکہ ان کے خیال کو اچھے مترجم مل گئے ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر غیاث صدیقی اور اختر حسن۔ یہ انتخاب کلام تلگو میں شیشا جیوتسنا کے عنوان سے شائع ہوا ہے اور بہت ہی مقبول ہے اس کا انگریزی اور ہندی میں بھی ترجمہ شائع ہوا ہے۔

ویمنا سترہویں صدی کا شاعر تھا۔ اس کا کلام تین چار ہزار سے زیادہ رباعیوں پر مشتمل ہے ہر موضوع کو اس نے شعر میں جگہ دی ہے اخلاق ناصحانہ۔ حسن۔ عشق۔ گیان۔ دھیان۔ یوگ۔ غرض زندگی کا ہر رنگ مل جاتا ہے۔ اس کے کلام سے ۲۰۰ سے زائد رباعیاں منتخب کرکے اردو میں ترجمہ کی گئیں۔ اور آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی نے شائع کیا۔ ترجمہ میں شری دیپا اور میں دونوں رفیق تھے۔ اس کے ہندی ترجمے میں ڈاکٹر سری راما شرما جی سے مدد لی گئی ہے۔ بجائے نظم کا نظم میں ترجمہ کرنے کے ہم نے سلیس نثر میں مطالب کی ادائیگی کو مناسب سمجھا تاکہ صحیح مفہوم تک اردو والوں کی رسائی آسان ہو۔ امید کی جاتی ہے کہ یہ ترجمہ مقبول ہوگا۔

افسانہ اور ناول۔ آندھرا پردیش ساہتیہ اکاڈمی کی طرف سے تلگو کے کچھ چیدہ چیدہ افسانوں کا ترجمہ دامرتی و جناب اظہر افسر کے ساتھ مل کر کیا گیا ہے۔ دامرتی شاعر بھی ہیں اس لئے ان کی نثر بھی کبھی کبھی شاعرانہ ہو جاتی ہے۔

نیشنل بک ٹرسٹ کی طرف سے ادی ونگ نائیکے کا ناول پیاسا میخانہ اردو میں حیدرآباد ہی کی زینت ساجدہ نے ترجمہ کیا ہے۔ یہ ناول رنگ نائیکے کے دوسرے ناولوں کے مقابلہ میں زیادہ جاندار نہیں ہے مگر ترجمہ کی روانی پڑھنے والوں کو یہ محسوس کراتی ہے کہ بجائے ترجمہ یہ اردو ہی میں لکھا ہوا ناول ہے۔ یہ ناشر کے گل کے نام سے شائع ہوا ہے۔

اس کے علاوہ اہم تلگو اردو کام نیشنل بک ٹرسٹ نے ۱۹ الفاظ کا ناول کے ۲۹ منتخب کہانیوں کے ترجمہ کا کیا ہے یہ کہانیاں مختلف ادوار میں ایک تہذیب کی ثقافت کے لحاظ سے بڑے کہانی کاروں میں شامل ہیں مترجم کے ان میں موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے ہر قسم کی کہانیوں کا انتخاب

دی گئی ہے۔ قدیم انداز، ترقی پسندی کے ساتھ ساتھ نفسیاتی، تجریدی اور جدیدیت کے تجربے بھی موجود ہیں۔ اس لئے ہر رنگ کی اور ہر دور کی اس میں پوری پوری نمائندگی ہوتی ہے۔ اس انتخاب میں کئے۔ وینو گوپال راؤ۔ بچی بابو۔ کیشپ راؤ۔ رمشل بنیادیری۔ جالی رانی۔ تلادیکھیکا گرواچند۔ جیسے افسانہ نگار کے افسانے شامل ہیں۔ جن میں "تحبنکس فاردی پی ایم"۔ نیند کی گولی۔ کتے ایک لڑکی۔ سیلاب بنگلہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ نئے افسانہ نگاروں کو شامل ہیں۔ یہ ترجمہ اتفاق سے میں نے کیا ہے۔ یہ ۲۶ کہانیاں اردو والوں کو تلگو افسانے کی مختلف منزلوں اور تجربوں سے روشناس کراتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اردو والے اسے پسند کریں گے۔ جہاں تک ترجمے کا سوال ہے میں نہ لفظ بہ لفظ رکھ کر مکھی مارنے کا قائل ہوں اور نہ اتنی آزادی کا کہ اصل سے ترجمہ پہچانا نہ جاسکے، میرا راستہ دونوں کے درمیان کا ہے۔ میں زبان کے مزاج کی انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے اس طرح ترجمہ کرنا چاہتا ہوں کہ تحریر اجنبی نہ لگے۔ یہ کام اتنا آسان نہیں جتنا نظر آتا ہے حال ہی میں اردو سے غالب کو تلگو میں منتقل کرتے ہوئے مجھے لوہا ایک کرنا پڑا تھا۔ وہاں فکر کی آزمائش تھی۔ ان کہانیوں میں مزاج داں اور انتخاب الفاظ میں دقتیں ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ میں خاصہ کامیاب رہا ہوں۔ لیکن اب وہ نسل کہاں سے لاؤں۔ جو میری طرح ان دونوں زبانوں کو یکساں بولتی لکھتی پڑھتی تھی جو صحیح داد دے سکے ■

ایک تلگو نظم

شیشندر شرما

ترجمہ: اختر حسن

تم نے مجھے پکارا،
تم نہ بھی پکارتے تو یہ ہر حال میں آجاتا
تمہاری آوازوں کو ڈھونڈتا ہوا
اپنے کانوں، اپنی آنکھوں، اپنی سانسوں اور اپنے لمس سے ڈھونڈتا ہوا
اپنے پورے ہوش و حواس کے ساتھ
دنیا کی سبھی سمتوں میں ڈھونڈتا ہوا
تو میں آگیا ہوں
اس لئے نہیں کہ صرف میں ہی جانتا ہوں، تم نہیں جانتے
بلکہ اس لئے کہ ہم سب ایک ہی سمت میں چلیں
ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اور قدم سے قدم ملائے ہوئے
یہ نہیں کہ ہم ایک ہی زبان بولیں
لیکن یہ کہ ہمارے الفاظ محض الفاظ نہ ہوں
بلکہ روشنی کا ایسا شعلہ ہوں جو عوام کی راہوں پر چراغاں کر دے
اور اپنے اندر بھی ہم اسے محسوس کریں
اسی لئے تو مجھے تمہاری تلاش تھی

(تخلیص میری دھرتی میرے لوگ سے)

اسلم عمادی

حادثۂ فاجعہ

(۱۹ر نومبر ۱۹۷۷ء کے آندھرا کے ساحلی علاقوں پر طوفان کی غارت گری سے متاثر ہو کر)

ان کو کیا الزام دیں جو ناخدا ناپختہ تھے — !
کیا کوئی قوت نہ تھی جو روک سکتی موجِ مرگ
کیا کوئی قوت نہ تھی جو روک سکتی سادہ معصوموں کا قتل
ٹوٹے خوابوں کے بنگلے، غرق ہوتے، بوڑھے، بچے، عورتیں
زندگی ایسے بکھرتی جیسے روشن دانوں کے شیشوں کی کرچیں
غرق ہوتے اہلِ دل، معشوق، دلبر، نازنیں، عشاق، عاقل
غرق ہوتے بھیڑ، بکری، بیل، بھینسے، گائیں، گھوڑے، سب پرندے، سب مویشی
کتنے فن کاروں نے کس کس آرزو سے گھر بنائے ہوں گے
محلات اور ان کے کارخانے، چوب و سنگ و شیشہ و آہن کے خواب
وہ مزارع جو کہ ماؤں کی طرح سے پرورش کر سکتے تھے کتنے ہی ننگوں اور بھوکوں کی
فراہم کر جو سکتے تھے ہزاروں بے زبانوں کے لئے اشیائے خوردنی، بہہ گئے!
وہ بغیچے، باغ، گلشن، نخل سب اندھے تھپیڑے میں ہوئے نذرِ اجل

کیا کوئی قوت نہ تھی جو روک سکتی اسکے بڑھتے اُبالے کو؟

کیا یہ خطہ زمیں کے سارے حصوں میں بُرا تھا —؟ منتظمو تم ہی کہو!
آہ! کیا کیا لٹ گیا — کس کو بھلا الزام دیں
آؤ ٹوٹے آشیانے کو نئی ترتیب دیں!!

مختار شمیم

غزل

(نذرِ اقبال)

شمیم اب ڈوب جا گہرائیوں میں کر نظر پیدا
ہوا کرتے ہیں آخر کو سمندر میں گہر پیدا
کبھی دیکھے نہیں ہیں زندگی کے پیچ و خم تم نے
کبھی دل میں ترے ہوتا نہیں ذوقِ سفر پیدا
کوئی تیشہ بدست اٹھے کہ آخر ہو سحر پیدا
ہم ایسے سخت حالوں میں جہاں احساسِ شر پیدا
اسی "مردِ قلندر" کو جنوں آ وانہ لیا
کوئی اقبال سا اے کاش ہو جائے نظر پیدا
کوئی "دانائے راز" اب دو جہاں سے آئیگا
کہ جیسے تپتے صحرا میں ہو سبزہ، گل، شجر پیدا
اسی ناکامیِ دل کی بدولت عشق ہے آباد
اسی مرنے میں جینے کا کیا ہم نے ہنر پیدا
شمیم اب لفظ و معنی کو سنوارا شاعروں نے بھی
بجا ہے گر نہ ہو اشعار میں جذب و اثر پیدا

طیب انصاری

جلیس اور حیدرآباد

یوں تو ابراہیم جلیس کا آبائی وطن عثمان آباد ہے لیکن وہ مولوی احمد حسین تحصیلدار کے گھر (۱۹۲۵ء میں) گلبرگہ میں پیدا ہوئے۔ وہیں بچپن کے دن گذارے۔ ابتدائی تعلیم بھی وہیں حاصل کی۔ اس لئے گلبرگہ والوں کا حق جلیس پر ہے اور یوں بھی کہ جلیس کی "ساری خدائی" یہیں بستی ہے یعنی گلبرگہ جائے پیدائش ہونے کے علاوہ ان کی سسرال بھی ہے۔ پھر وہ بی۔ اے کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے علیگڈھ گئے علیگڈھ کے تحریکی ماحول نے جلیس کی ذہنی صلاحیتوں کو کندن بنایا وہ جب حیدرآباد لوٹے تو خاک گلبرگہ کی پاکیزگی اور علیگڈھ کی آب و تاب ان کے اندر موجود تھی۔ اور رفتہ رفتہ وہ حیدرآبادی ثقافت اور ادب سے کچھ اتنے قریب ہوگئے کہ جزو لاینفک بن گئے۔ جلیس کے تذکرے کے بغیر ثقافت، صحافت اور ادب تو کیا خود شہر حیدرآباد کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ جلیس نے جب "زرد چہرے" پر سے نقاب اٹھائی تو حیدرآباد کے جاگیردارانہ ماحول میں تہلکہ مچ گیا۔ پابندی عائد کی گئی۔ ان بے شمار چہروں کے ساتھ خود جلیس کا چہرہ بھی بے نقاب ہوگیا۔ اب وہ ترقی پسند ادیب کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ جلیس کی تحریریں حیدرآباد میں بھی مقبول رہیں۔ وہ بے چینی سے جلیس کے افسانوں اور مضامین کا انتظار کرنے لگے تھے۔ اسی زمانہ میں ابراہیم جلیس نے اپنی مشہور کہانی "دو ملک ایک کہانی" لکھی۔

"دو ملک ایک کہانی" کی تخلیق سے پہلے اور بعد ابراہیم جلیس نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک تخلیق کو شہرت نصیب ہوئی۔ بعضوں پر تو پابندی عائد ہوئی تھی۔ ابراہیم جلیس کی تصانیف میں "زرد چہرے"، "چور بازار"، "چالیس کروڑ بھکاری"، "تکونا دیس"، "غم جاناں غم دوراں"، "ترنگے کی چھاؤں تلے"، "آزاد غلام"، "پبلک سیفٹی ریزر"، "اوپر شیروانی اندر پریشانی"، "نیکی کر تھانے جا"، "ایک پیسے کی خاطر"، "واہیات باتیں" شامل ہیں۔ جلیس کا موضوع بنیادی طور پر سیاست اور ثقافت ہی رہا گو اس نے بہت سے مزاحیہ مضامین بھی لکھے ہیں۔ لیکن ان مضامین کا موضوع بھی ہمارا معاشرہ ہی ہے۔ بقول احمد ندیم قاسمی "اس کے افسانے نیند آور گولیاں نہیں۔ وہ ادب کو برف میں لگی ہوئی بیئر کی بوتل نہیں سمجھتا۔ وہ ادب کی حقیقت اور ادیب کے منصب کو پہچانتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ جب جلیس لکھتا ہے تو سارا معاشرہ اس کے قلم کے جلو میں چلتا ہوا محسوس ہوتا ہے" طفیل احمد جمالی نے جلیس کے ادبی مقام کا تعین کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ابراہیم جلیس کا شمار اردو کے ان گنے چنے ادیبوں میں کیا جاسکتا ہے جنہیں سنجیدہ اور فکاہیہ دونوں طرح کی تحریر پر پوری قدرت حاصل ہے۔ جب وہ "دو ملک ایک کہانی" لکھتا ہے تو بڑے بڑے چٹانوں جیسے دلوں سے آنسوؤں کے آبشار ابلنے لگتے ہیں اور جب اس کا قلم قہقہے بکھیرنے پر آتا ہے تو امام باڑوں کے در و دیوار پر مسکراہٹ کھل جاتی۔ جلیس کی دوہری ادبی شخصیت دراصل اس کی اصلی شخصیت کی آئینہ دار ہے۔ وہ ایک خوددار، حساس اور شریف آدمی ہے" جلیس کے قلم کی تیزی اور اس کی شرافت نے بہت جلد پاکستانی حلقوں میں مقبول

بنا دیا۔ خصوصاً آخری دنوں میں وہ پاکستانی صحافت کی آبرو بن گیا تھا سیاسی اعتبار سے بھی ان کے رسوخ بہت بڑھ گئے تھے۔ آفتاب اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ کر یکایک بدلیوں میں ہمیشہ کے لئے چھپ گیا۔ جلیس کو طلوع ہوتے اور نقطۂ عروج پر پہنچتے سبھوں نے دیکھا لیکن اس سے پہلے کہ آفتاب اپنا ضیاپاشیوں کے بعد نقطۂ زوال کی طرف بڑھتا ہماری نظروں سے وہ ہمیشہ کے لئے چھپ گیا۔ شاید جلیس کی موت اس وجہ سے بھی ہمیں خون کے آنسو رلاتی ہے۔

جلیس کی تخلیقات ان کے ذہنی اور قلبی کرب کا نتیجہ ہیں۔ اس لئے ان کی فکاہیہ تحریریں اتنی ہی سنجیدہ ہیں جتنی ان کی سنجیدہ نثر ہے۔ دراصل انھوں نے زندگی میں ہنسنے اور رونے کے اوقات کو تقسیم کر لیا تھا۔ وہ دن کو ہنستے اور رات کو رو دیا کرتے تھے۔ صوفیوں اور قلندروں کا انداز بھی یہی ہوا کرتا تھا۔ مجھے یہاں ان لوگوں سے اختلاف ہے جو جلیس کو یا تو ترقی پسند قرار دیتے ہیں یا رجعت پسند حالانکہ اصل میں وہ "بندہ نواز" کے در سے اٹھا ایک قلندر تھا! خود جلیس کو بھی آخری عمر تک یہی مغالطہ رہا ہے۔ وہ ترقی پسند تھا، پھر وہ فرقہ پرستی کے کھنڈ میں گر گیا اور "دو ملک ایک کہانی" لکھ کر اس نے اپنی ترقی پسندی کی تجدید کرائی۔ ایسا نہیں ہے۔ بعض شخصیتیں ہوتی ہیں جن کا بہت دور جا کر سرا ملتا اور بھید کھلتا ہے۔ اور دوں کے بارے میں میں نہیں کہہ سکتا لیکن بیشتر مسلمان ترقی پسندوں کے بارے میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ ترقی پسند رہتے ہوئے بھی قلندرانہ شان رکھتے ہیں۔ اس کا بہترین مثال مخدوم محی الدین، میر حسن، زینت ساجدہ، عابد علی خاں اور ابراہیم جلیس ہیں۔

"دو ملک ایک کہانی" برصغیر ہندو پاک کی سیاسی آویزش کی داستان ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی یہ ایک نایاب ادب پارہ ہے۔ جلیس کی دوسری کہانیوں کے مقابلہ میں یہ کہانی جذبات نگاری کی کامیاب کوشش اس وجہ سے بھی ہے کہ اس میں جلیس خود ایک کردار کی حیثیت سے شریک محفل ہیں۔ جلیس چونکہ اس کہانی کے راقم ہیں اور اس کا کردار بھی، اس وجہ سے ان کے تجربہ کو ہم غیر جانبدارانہ قرار دے نہیں سکتے۔ ان کے فیصلے ایک طرفہ اور جانبدارانہ ہو سکتے ہیں لیکن اس کے باوجود اس کہانی کی حقیقت یہ ہے کہ اس کے مطالعہ کے بغیر حیدرآباد کو دیکھا اور سمجھا نہیں جا سکتا۔ یہ کہانی کہانی ہوتے ہوئے بھی حقیقت ہے۔ اس کہانی میں بیسویں صدی کے نصف اول کا حیدرآباد ہچکولے لیتا، ابھرتا اور ڈوبتا نظر آتا ہے۔ اس لئے میرا خیال ہے ہم حیدرآباد کو جلیس سے الگ کر کے اور جلیس کو حیدرآباد سے الگ کر کے نہ تو دیکھ سکتے ہیں اور نہ سمجھ سکتے ہیں۔ جلیس اور حیدرآباد ایک سکہ کے دو رخ اور روشن رخ ہیں۔

×

جلیس صاحب زندگی بھر مجبوتوں سے لڑتے رہے اور ظالم کے خلاف مظلوم کی حمایت کرتے رہے۔ یہ بات انکی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

جلیس صاحب کی زندگی کے بارے میں اب سوچتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ وہ بحرانوں اور طوفانوں کے پروردہ تھے۔ زندگی میں جب کوئی بحران نہیں ہوتا تھا تو خود ایک بحران پیدا کر لیتے تھے۔ وہ بحران کے بغیر شاید زندہ بھی نہیں رہ سکتے تھے۔ ان کی زندگی کا محور یہی تھی۔ طوفان یا طغیان سے پہلے کی خاموشی۔ اس دنیا میں بہت کم لوگ ایسے جذبہ کی سچائی تک پہنچ کر زندہ رہتے ہیں۔ جلیس اس سچائی تک پہنچ کر زندہ رہے۔ جذبہ میں ان سے جو کچھ ہوا انھوں نے وہ کر دکھایا۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی کی یکسانیت کو وہ محسوس نہ کر سکے جتنا اپنے جذبہ کے ساتھ جیتے رہے۔

(مجتبیٰ حسین)

غزل

محمد شمس الدین تاباںؔ

پھولوں میں رنگ، تاروں میں تابندگی نہ تھی
جب تم ہمارے ساتھ نہ تھے زندگی نہ تھی

مجھ پر تری نگاہ کبھی تھی کبھی نہ تھی
یہ دوستی بھی کب تھی اگر دشمنی نہ تھی

جو دوست نے کیا ہے وہ دشمن نہ کر سکے
ایسا سلوک جس کی کچھ امید ہی نہ تھی

ہر صبح صبحِ عید نہ ہر شام شامِ دید
قسمت میں اپنی دن بھی نہ تھا رات بھی نہ تھی

اس کی طبیعت کے قربان جائیے
ایسا شباب پہلے کسی نے پیا نہ تھی

ہم بھی اسیرِ زندگی کے بندے تھے اور بس
تاباںؔ ہمیں کسی سے محبت کبھی نہ تھی

بانگِ درا

وقت اب بن گیا ہے بانگِ درا
کون ہے آج گوشِ بر آواز
کون حسنِ خودی کا ہے دمساز
کس کو حاصل ہے عشق کا اعزاز
کس میں شامل ہے جوہرِ اعجاز
وقت اب بن گیا ہے بانگِ درا
کون ہے آج گوشِ بر آواز

کس کو فرصت ہے اس زمانے میں
کون جانے گا دل کے راز و نیاز
کون چھیڑے گا زندگی کا ساز
کون نغمے کا جانتا ہے گداز
کس کو فرصت ہے اس زمانے میں
کون ہے آج گوشِ بر آواز

فضل افضل

غزل

خالد سعید

ابتداء شوق کی خدا لکھوں
بعد اس کے بتاؤ کیا لکھوں
آئینے پر مچلتے قطرے کو
اک مسافت کی ابتدا لکھوں

(ق)

چار سُو چہرہ ہائے لب بستہ
ان کے حق میں کوئی صدا لکھوں
اور سُلگتے ہوئے گھروں کے لئے
راہ بھٹکی ہوئی ہوا لکھوں

سبز پیڑوں میں برق دوڑاؤں
خشک پتوں پہ کچھ ہرا لکھوں
قہقہوں غرق ریت کی بابت
اندھی سانسوں کا ماجرا لکھوں

•

سالِ نو

مومن فاشوق

بادِ صبا، موسمِ گل، رنگِ شفق
صحنِ چمن، حسنِ تمام
پھر سے بدلے ہوئے آثارِ حیات
زندگی عارض و رخسار میں مہکی مہکی
صبح سج دھج کے گلے شام سے ملنے نکلے
اور شب و روز کے بازار سجے
سالِ نو، سالِ گذشتہ کی جگہ آیا ہے
اک نئے عہدِ مسرت کی خبر لایا ہے

بھارت چند کھنہ

● قندِ مکرر

مصیبت اکیلی کبھی نہیں آتی

گرمی کی چھٹیاں ہوئیں اور میں نے گرمی کی چھٹیاں ہندوستان کے کافی گرم شہر لاہور میں اپنے بہترین دوست کے ساتھ گزارنے کا ارادہ کر لیا۔ لاہور میں ہم دونوں مل کر خوب آم کھاتے۔ کاٹنے والے، چوسنے والے، آئسکریم میں ملے ہوئے، قلفیوں میں پسے ہوئے، برف میں دبے ہوئے، نہر کے ٹھنڈے پانی میں رکھے ہوئے۔ غرض کہ آموں کو ہر ممکن طریقے سے کھایا اور خوب مزے لے کر کھایا۔

آموں کو اس طرح دن رات کھانے کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ میں مہینہ ختم ہونے سے پیشتر ہی کنگال ہو گیا۔ حالت یہ تھی کہ اف لیلہ کے چور کی طرح اگر میرے کوٹ سے بھی لگاتے جاتے تو کوڑی نہ نکلتی۔ خدا خدا کر کے مہینہ ختم ہوا اور دوسرے مہینے کی پہلی تاریخ کو میری تنخواہ کا چیک میرے نام کا آگیا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ میرا حساب کتاب لاہور کے کسی بینک سے نہ تھا اس لیے میرے دوست نے چیک کی رقم وصول کرنے کا ذمہ لیا۔ انہوں نے یہ چیک ان کے ایک اور دوست نے جو ان معاملوں میں کافی تجربہ رکھتے تھے یہ کہہ کر لے لیا کہ "رقم میں وصول کر دوں گا تم خواہ مخواہ کیوں تکلیف اٹھاتے ہو۔" ان صاحب کا اسم گرامی مشرا جی تھا۔ مجھے ابھی پیسوں کی چنداں ضرورت نہ تھی کیونکہ میرے دوست میرے ساتھ ہوتے اور مجھے خرچ کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔

یہ تو کہنا میں بھول ہی گیا کہ نئے مہینے کی پہلی تاریخ کو میرے دوست نے میرے مجبور کرنے پر مکان بدل لیا۔ ہمارا نیا مکان ابھی نیا نیا ہی بنا تھا۔ بلکہ ابھی بن ہی رہا تھا کہ ہم اس میں آ گئے۔ پہلے مالک مکان کو نوٹس دے دیا تھا اس لیے پہلی تاریخ کو مکان خالی کرنا ضروری تھا۔

پہلی تاریخ کو ہفتہ کا دن تھا۔ چنانچہ ہفتہ کو ہی ہم نے مکان بدلا۔ ہفتہ کو میرے دوست نے اپنے دوست مشرا جی کو تنخواہ کا چیک روپے لانے کو دیا اور ہفتہ کو ہی ہم دونوں ایک دن کے لیے جموں چلے گئے۔ ہم نے سوچا کہ سوموار کو واپس آئیں گے تب تک نوکر مکان میں سامان وغیرہ آراستہ کر رکھیں گے اور ہم آ کر نئے مکان میں آرام سے ٹک جائیں گے۔

آموں کا اثر ریل گاڑی میں میرے دوست پر ہونا شروع ہوا۔ ان کی ران پہ پہلے تو معمولی سوجن سی معلوم ہوئی مگر رفتہ رفتہ ابھار بڑھنا شروع ہو گیا اور جب جموں پہنچے تو اس نے ایک بہت چھوٹے سے پکے ہوئے آم کی شکل اور حجم اختیار کر لیا تھا۔ بہت توں کر کے میرے دوست لنگڑاتے ہوئے تانگے تک پہنچے اور میرے سہارے سے تانگے میں بیٹھ گئے۔ بڑی مشکل سے میں ان کو اس مکان تک لے گیا جہاں ہمیں ٹھہرنا تھا۔ یہ حضرت تو وہاں پہنچ کر ایک خالی چارپائی دیکھ اس پر لیٹ گئے۔ اب رات ہو گئی تھی اس لیے ہم دونوں کھانا کھا کر (جس میں آم شامل تھے) مگر میرے دوست نے ... نہیں کیا

اپنے میزبان کے ساتھ پڑ کر سو رہے۔

یہ امید ہوئی تھا کہ جموں کی سیر کریں گے۔ اُمید تھی کہ رات کی رات میں میرے دوست کا پھوڑا یا تو پھوٹ جائے گا یا الہ دین کے جنوں کی طرح غائب ہو جائے گا۔ مگر ہم کیا آئی میرے دوست کے لیے مصیبت آگئی۔ ان کی ران کا پھوڑا نہ تو پھوٹا اور نہ ہی غائب ہوا بلکہ رات کی رات میں اور بڑھ گیا۔ وہ تکلیف سے کراہ رہے تھے۔ میں نے اور ہمارے میزبان نے ایک اُستاد جراح کو بلایا کہ وہ اس پھوڑے کا کچھ کرے۔ جرّاح نے ران دیکھ کر کہا کہ "معمولی "گرُبا" ہے ایک رات میں صاف کر دوں گا"۔ چنانچہ اس نے یہ کیا کہ اپنے نشتر وغیرہ تیز کیا اور میرے دوست کی ران دانے "مغلوبہ عضو" کو نہایت آرام سے چیرا اور پھاہا لگا کر پٹی باندھ دی اور جاتے ہوئے یہ کہہ گیا کہ "کل صبح تک اگر آپ اسی ٹانگ سے بھاگنے کے قابل نہ ہو جائیں تو اپنی مونچھیں منڈوا ڈالوں گا"۔

جموں کی سیر کیا خاک کرتے۔ میں اور ہمارا میزبان دونوں "گڈ" کی تیمارداری میں لگے رہے۔ میرے دوست کو معمولی سا بخار بھی ہو گیا تھا اس پہ دوسرے دن صبح کو جب ہمیں لاہور واپس آنا تھا، میرے دوست نے تو اُسی دن آنے کا ارادہ ترک کر دیا اور میں ان کو اُن کے میزبان کے سپرد کر کے خود لاہور واپس آگیا۔ کیونکہ مجھ کو اُسی دن اپنی ران (جس کا اندرونی muscle پھسل کر گر پڑنے سے پھٹ گیا تھا) کا باقی علاج کروانا تھا۔ آتے وقت مجھ کو میرے دوست نے احتیاطاً پچیس روپے نقد دے دیے تاکہ میں سوار کر ڈاکٹر صاحب کی سولہ روپے فیس ادا کر سکوں۔ میرے دوست کا کل کو لاہور پہونچ جانے کا خیال تھا۔

گاڑی جموں سے صبح کے چار بجے کر پچاس منٹ پر چھوٹی اور ساتھ ہی میری مصیبتوں کا آغاز ہو گیا۔ میں نے سیالکوٹ کے اسٹیشن پہ چائے پی اور اپنے سکنڈ کلاس کے ڈبے میں اکیلا ہی آکر بیٹھ گیا۔ سگریٹ جیب میں موجود تھے، میں نے سگریٹ سُلگایا اور اخبار پڑھنا شروع کر دیا۔

گاڑی سیالکوٹ کے اسٹیشن سے چلی ہی تھی کہ مجھے سخت حاجت ہوئی میں سیدھا بیت الخلا کی طرف لپکا۔ مگر جب صفائی کے لیے نل دبایا تو ٹونٹی میں سے پانی کا ایک قطرہ بھی نہ نکلا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ میں نے اس وقت ان ریل والوں کو کتنی اور کس کس قسم کی وزن دار گالیاں دی تھیں، افسوس صرف اتنا ہے کہ ان کو میں یہاں جگہ نہیں دے سکتا۔ خیر میں بڑی احتیاط سے اٹھا اور کسی شکاری کی طرح جھاڑیوں میں سے اپنے مارے ہوئے شکار کو نکال رہا ہو آدھا جھکا ہوا ایک ہاتھ میں ازار بند تھامے نکلا اور صبح کا خریدا ہوا اخبار اوپر والی نشست سے اٹھا یا پھر اُسی بے پانی کے کمرے کی طرف اسی احتیاط سے گیا اور انگریزی طریقہ سے صفائی کر کے باہر نکلا اور ایک کونے میں مار کھائے ہوئے کتے کی طرح دبک کر بیٹھ گیا۔

وزیرآباد کے اسٹیشن پر میں نے جلدی سے نل پر منہ ہاتھ دھویا اور بک اسٹال کی طرف بھاگا تاکہ ساقی کا سالنامہ خریدوں جس میں میری ایک کہانی بھی شائع ہونے والی تھی۔ ساقی کا سالنامہ بڑی شان سے بک اسٹال پر پڑا ہوا تھا میں نے جھٹ سے خریدا۔ اب جو فہرست مضامین دیکھتا ہوں تو میری کہانی کا کہیں نام و نشان نہیں، بہت مایوسی ہوئی۔ بہرحال اب میں ایک روپیہ بارہ آنے ساقی پر خرچ کر کے جو اس پلیٹ فارم پر پہونچا جہاں اپنی منحوس گاڑی کو چھوڑ آیا تھا تو وہاں بقول جوش ملیح آبادی۔ "گاڑی چلی گئی پٹری چمک رہی تھی۔"

میرے منہ سے بے اختیار نکلا :-

اے بوش یہ سزا ہے اچھوں کو چاہنے کی ۔

وہ دن وزیر آباد کے اسٹیشن پر بڑی طرح گزرا ۔ میرا آرلیہ جہت کا سامان " دانتوں کا منجن ، برش ، سر کی کنگھی اور برش اور شیو کا سامان لانگ سے بچا ہوا اخبار اور صابن کا ڈبہ کا ڈبی بیکا پڑے گئے تھے ۔ مگر ساقت سے بہت کچھ مدد ملی ۔ دن بیٹھے بیٹھے گزر گیا ۔ آخر بُری حالت میں رات کے وقت لاہور پہونچا ۔ ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کا وقت گزر چکا تھا ۔ گھر پہونچا تو میرے دوست عالم صاحب کے نوکر دونوں گھر کو تالا لگا کر کہیں گئے ہوئے تھے ۔ میں رات کے بارہ بجے تک باہر سیڑھیوں پر بیٹھا ہوا قسمت کو کوستا رہا ۔ اتنے میں دونوں نوکر پان کھاتے ہوئے اور سگریٹ پیتے ہوئے واپس آئے ۔ مجھے دیکھکر جھینپے اور جھٹ سے چھت پر پلنگ وغیرہ ڈالدیا ۔ میں اس بُری حالت میں تھا کہ ان مسخروں کو راتوں کو سینما جانے کے خلاف کچھ نہ کہہ سکا ۔ پلنگ پر لیٹا اور تارے گنتا ہوا نہ معلوم کس وقت سو گیا ۔

صبح اٹھا تو پہلے حجامت وغیرہ کرنے کا سب نیا سامان منگوایا ۔ پھر ضروریات وغیرہ سے فارغ ہوکر ڈاکٹر صاحب کو ٹیلیفون کیا اور وعدہ خلافی کے لیے معذرت پیش کی ۔ ڈاکٹر صاحب نہ معلوم کیوں بگڑے بیٹھے تھے ۔ کہنے لگے " آپ کی وجہ سے میرا بہت ہرج ہوا ۔ میں آپ کا انتظار بہت دیر تک کرتا رہا تھا ۔"

میں نے کہا ۔ " تو جناب ہرجانہ یعنی وقت ضائع کرنے کی فیس مجھ سے لے لیں ۔"

ڈاکٹر صاحب نے کہا ۔ " شرافت تو یہی ہے ورنہ میں آپ کو مجبور نہیں کرونگا ۔"

خیر میں نے بدھ کے دن ساڑھے پانچ بجے پھر ملاقات کا وقت مقرر کر لیا اور وعدہ کیا کہ سوموار کی فیس بھی ادا کر دونگا ۔ منگل کو میں نے اپنے دوست کا انتظار کیا مگر وہ نہیں آئے ۔ میرے پاس اب صرف اٹھارہ روپے باقی تھے اور کل ڈاکٹر صاحب کو بتیس روپے فیس کے (شرافت کا دعویٰ کرتے ہوئے) ادا کرنے تھے ۔ میں سیدھا راشد صاحب کے دفتر گیا اور ان سے ملا ۔ بہت دیر تک تو وہ ایک فائیل کو دیکھتے رہے ۔ پھر جب گردن اٹھائی تو آہستہ آہستہ کہنے لگے کہ " مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ کو روپوں کی جلدی تھی ۔ اس لیے میں نے خود جلدی نہیں کی ۔ خیر کل آپ تشریف لایئے تو میں آپ کو روپے دے دوں گا ۔"

میں نے شکریہ ادا کیا اور گھر واپس آیا ۔ تانگے پر آٹھ آنے ضائع ہو چکے تھے ۔ نوکروں نے سبزی ترکاری اور دودھ وغیرہ کے لیے آٹھ آنے خرچ کر ڈالے تھے ۔ غرض کہ بدھ کی صبح کو جب میں اٹھا تو میرے پاس فقط سترہ روپے تھے ۔ صبح کو میں نے محسوس کیا کہ گرمی بہت زوروں کی تھی ۔ پارہ تقریباً ایک سو دس ڈگری تک پرواز کر گیا تھا ۔ میں نے اپنے دوست کا آج بھی بے چینی سے انتظار کیا مگر وہ آج بھی نہ آئے ۔ اتنے میں نوکر خرچ کے لیے پیسے مانگنے آگیا ۔ میں نے [illegible] بتا دیا کہ دیکھو آج کل ذرا پیسوں کی تنگی ہے ۔ سنبھل کر خرچ کرنا ۔ یہ کہکر میں نے چار آنے اس کو [illegible] دیے ۔

[illegible] بجے کے قریب میں پھر راشد صاحب کے [illegible] دولت پر حاضر ہو گیا ۔ انھوں نے [illegible] [illegible] اپنا جیب میں سے چیک نکال کر میز پر رکھا اور کہنے لگے " بھائی صاحب مجھے [illegible]

[illegible] دینے کا وعدہ فرمایا تھا وہ یہ کام کرنا بالکل ہی بھول گئے تھے۔ اب میں خوش ہوں کہ آپ کو روپے ادا [illegible]۔

میرا جی چاہتا تھا کہ ماسٹر صاحب کے ایک چانٹا لگاؤں۔ مجھے روپوں کی آج ضرورت تھی اور وہ کل کی امید دلا کر ٹال رہے تھے۔ میں غصے میں آگ بگولا ہو کر وہاں سے چپ چاپ نکل آیا اور چونکہ اس امید پر گھر سے کرایہ پہلے لیا تھا کہ روپے [illegible] سوار ہو کر گھر واپس آگیا۔ آٹھ آنے کرایہ کے دے دیے۔ اب میرے پاس فقط سولہ روپے چار آنے باقی رہ گئے تھے۔

دوپہر کو میں نے کھانا زہر مار کیا اور پنکھے کے سامنے لیٹ گیا۔ ڈاکٹر صاحب کا مکان کوئی تین میل کے فاصلے پر تھا۔ تانگے کا کرایہ نہیں تھا اس لیے ساڑھے چار کے قریب پانی کے دو تین گلاس پی کر گھر سے نکل پڑا۔ اور تین میل طے کر کے ڈاکٹر صاحب کے ہاں وقت پر پہنچ گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے بذریعہ بستی آنوں کے میری راہ پیمائش کی اور جب میں نے علاج کے بعد صرف سولہ روپے پیش کیے تو ڈاکٹر صاحب نے میری طرف اسی طرح دیکھا جس طرح میں نے ساقی کی فہرست مضامین مذ پر آباد کا اسٹیشن پر دیکھی تھی۔ مگر میں نے جلدی ہی واضح کیا کہ کسی وجہ سے باقی کے سولہ روپے نہیں لا سکا۔ آئندہ مرتبہ ضرور لے آؤں گا۔ ڈاکٹر صاحب نے "بہت بہتر" کہہ کر ہاتھ ملایا اور میں پھر گھر کی طرف کڑکتی دھوپ میں واپس چل پڑا۔ آخر جب سوا سات بجے کے قریب قریب چھ میل کی مسافت طے کر کے میں گھر آیا تو گرمی اور پسینہ نے میری حالت بری کر رکھی تھی۔

آتے ہی پنکھے کو پوری رفتار سے کھول کر جب میں نے پلنگ سنبھالا تو اس کی پنکھڑیاں ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ میں نے سمجھا شاید بجلی بند ہوگی۔ مگر جب بجلی کے سوئچ کو دبایا تو قمقمے میں روشنی ہوگئی۔ اتنے میں میرے دوست کا نوکر ایک تار لے کر آیا اور یہ جتلایا کہ پنکھا اسی دوپہر کو اس کے ہاتھ سے گر کر خراب ہوگیا تھا۔

پسینے میں شرابور میں نے نوکر کو نہانے کے لیے پانی رکھنے کو کہا اور خود لفافہ چاک کر کے تار پڑھا۔ میرے دوست نے لکھا تھا کہ ان کے ایک اور رشتہ دار کا انتقال آیا تھا اور وہ ایک ہفتہ تک نہ آ سکتے تھے۔

اتنے میں نوکر نے آ کر اطلاع دی کہ نلوں میں پانی بند ہوگیا ہے عجیب حالت تھی۔ گرمی بہت زیادہ تھی۔ اس پر پنکھا بگڑا ہوا۔ نل میں پانی ندارد۔ جیب میں صرف چار آنے۔ میں نے نوکر کو گولڈ فلیک کے سگریٹ کی ایک ڈبیہ لانے کو کہا اور آخری چار آنے بھی اسے دے دیے اور خود پلنگ پر اوندھے منہ پڑ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ اتنے میں ایک آواز آئی کہ "صاحب ذرا چارپائی ہٹا لیجیے تاکہ کھڑکیوں میں شیشے لگا دوں۔"

میں کافی تکلیفیں اور ناامیدیاں برداشت کر چکا تھا خاموش چارپائی پر سے اٹھا اور دوسرے کمرے میں جا کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور آنکھیں بند کر کے سوچنے لگا کہ میں نے وہ کونسا گناہ عظیم کیا تھا جس کا بدلہ مجھ کو اس طرح مل رہا تھا۔ اتنے میں ناک پر پیچھے کسی نے بھالا مار دیا۔ بے اختیار میرا ہاتھ ناک پر گیا میری انگلیوں میں سے بھن بھن کرتی ہوئی شہد کی ایک مکھی اڑتی ہوئی نکل گئی۔

میری ناک مارے درد کے بھن بھن کرنے لگی اور جلد ہی میرے دوست کے "گڈ" کی طرح پھول کر بھی فربہ ہوگئی۔ اب جب کہ میں [illegible] ہوں تو بجائے کاغذ کے مجھ کو اپنی پھولی ہوئی ناک نظر آ رہی ہے۔

(ماہنامہ ساقی مارچ [illegible] صفحہ [illegible])

بادۂ کہن

دبستانِ دکن کی غزلیہ شاعری کا کلاسیکی سرمایہ صحتِ زبان اور قادر الکلامی سے عبارت ہے۔ حسن و عشق کی رنگا رنگی، ساقی و میخانہ کی تکرار، ثواب و عذاب کے امتزاج، تقدیسِ مسلک کی طہارت ایسے عنوانات ہیں جنھیں نصف صدی اُدھر کے دکنی سخنوروں نے اپنی شاعری میں برتا ہے۔

ایسے ہی ایک قادر الکلام شاعر صوفی شمس الحق، سجاد علی میکش (متوفی ۱۳۴۲ھ) گزرے ہیں۔ وہ شمالی ہند کے تھانہ میں پیدا ہوئے، سورج بھان نام تھا، نقیر منش برہمن تھے، عہدِ میر محبوب علی خاں (غفران مکان) میں حیدرآباد آئے اور یہاں میر امداد علی علوی ایسے صاحبِ کشف و کمال بزرگ کے معتقد ہوگئے اور اسلام قبول کیا۔ حضرت علوی نے برہمن زادہ اردو کو رموزِ انسانیت سکھائے، میکش نے اپنے اشعار میں علوی سے استفادہ کی طرف اشارے کئے ہیں، میکش صاحبِ دل اور باخدا فقیر تھے۔ ان کے حیدرآبادی تلامذہ میں رضی الدین حسن کیفی اور منشی حبیب الدین صغیر قابلِ ذکر ہیں۔ حیدرآباد میں میکش نے طرحی مشاعروں کو بامِ عروج پہ پہنچایا تھا۔ ان کی شاعری کے دو مجموعے "خانۂ خمار" اور "خراباتِ میکش" کے نام سے منشی نوبت رائے نظر لکھنوی کے زیرِ اہتمام ۱۸۹۵ء میں مطبع آصفی لکھنؤ سے شائع ہو چکے ہیں۔ ذیل میں انتخاب شائع کیا جا رہا ہے ——— (و، خ)

ہجومِ اشک تھا دل میں کہاں تک ضبط کرتا میں
خزانہ بھر گیا جس وقت فوارہ اچھل نکلا

مفلس ہوں غیر رشتۂ جاں کچھ نہیں ہے پاس
دل کا خزانہ جتنا تھا سارا لٹا دیا

ہجر کی شب عجیب موذی ہے
سانپ بن جائے تارِ بستر کا

جو سائل آئے تو سر کاٹ کر ابھی دیدیں
ہمارا دل ہے غنچے کو منہ پاس دل ہوا

دمِ گلگشت اس گل پیرہن نے وہ ہوا باندھی
زباں غنچوں کی بول اٹھی کہ اب رنگ چمن بگڑا

معلوم نہیں کون سی کمبخت گھڑی تھی
پچھتاتا ہوں کس وقت میں دل تم کو دیا تھا

مدد ہو گا اگر مجھ پر کوئی ہتھیار لوہے کا
میں ہوں وہ سخت جاں منہ پھیر دوں سو بار لوہے کا

نہیں آلات سے ممکن درستی دل شکستوں کی
یہاں پر کام کچھ آتا نہیں اوزار لوہے کا

غیر کو لکھے جاتے ہیں نامے
میری خاطر قلم نہیں اٹھتا

صبا کی دخل سے سب دانت گر گئے آخر
مزا اٹھا لیا غنچوں نے مسکرانے کا

کتابِ عشق کے اوراق ہوں ابھی درہم
جو ایک باب بھی سن لو میرے فسانے کا

تم نے ٹھہرا لیا تو دیا مجھ سے غیر کو
یہ تو بتاؤ آپ کا بھی کچھ بھلا ہوا

آنکھ بھی مشکل میں تو ہوجاتا کچھ عروج
جس کو ہو چشم بصیرت دیکھ لے آنکھوں پھر
پیکھے ہو جاتے ہیں ہار دیکھتے ہیں ہم شاعر
برہم ہو کس لیے کرو گفتار صاف صاف
وعدہ خلافیوں نے بہت تنگ کر دیا
کیا گل کھلاتی ہیں تری رنگین بیانیاں
میکش ہے ایک رنگ فقط اپنا میکشی
ہم جفاؤں کو سمجھتے ہیں وفا
دوپہروں بھی ترا عاشق نہیں لیتا ہے چین
لڑکھڑاتا میکدے سے نکلا تھا گھر کی طرف
جو دل میں اُن کے آتا ہے کر بیٹھتے ہیں وہ
مار ڈالے گا ہزاروں کو لگا و سرمہ سا
آنکھ کے تل میں سما جاتے ہیں سب ارض و سما
کیا ہی ہشیار ہو مُردہ بنا دیتا ہے یہ
دیکھ میکش کا کوئی آنکھوں کو وقت میکشی
کیا کشف ہو گئی ہے اپنر حقیقت گُل
جس وقت دل لیا تھا جان بھی نکل گئی تھی
در بانِ میکدہ بھی رکھتے ہیں اُنس اس سے
غمگین نہ ہو آخر وہ ملیں گے کبھی اے دل
تھا وہ میکش ہوں نہ ہونے دوں کبھی مینا منہ بند
نہیں آسان کسی علم کا حاصل ہونا
تیرے مستوں کے میخانے میں ساقی
ہمارا خانۂ دل کرنہ تاراج
کیا عاشقوں کو مذہب و ملت سے کام ہے
نقشِ خط باندھا تو وہ اور ہوئے دشمنِ جان
زلفیں نہ کھول اے سیمبر اک اِس طرف اک اُس طرف
عمر کے چند روز باقی ہیں

میرا غبار کیوں نہ ترے زیرِ پا ہوا
جلوہ گر رہتا ہے ہر ذرّے کے اندر آفتاب
دہن ہے نقطۂ موہوم اور کمر نایاب
منا نہ ہو تو ہم سے کہو یار صاف صاف
آنا نہ ہو تو کیجئے انکار صاف صاف
اک گفتگو میں جھتے ہیں سو سو ہزار رنگ
کس کام کے وہ لوگ جو بدلیں ہزار رنگ
حرفِ شکوہ لب پہ کب لا سکتے ہیں ہم
کرتا ہے کوچے میں تیرے لاکھوں چکر دھوپ میں
گر پڑا کمبخت میکش کھا کے ٹھوکر دھوپ میں
غالب ہے کمسنی نظرِ انجام بیں نہیں
گھر سے نکلو گے اگر سرمہ لگا کر آنکھ میں
میں ابھی کونین کو رکھ لوں اُٹھا کر آنکھ میں
نیند جب آتی ہے اپنا ہے کے نشہ کر آنکھ میں
رنگ لاتی ہے عجب صہبائے احمر آنکھ میں
حیرت ہے بُت بھی اب تو توحید بولتے ہیں
اب کیا رہا ہے باقی وہ کیا ٹٹولتے ہیں
میکش کو دیکھتے ہی دروازہ کھولتے ہیں
بیکار کسی کی بھی مشقت نہیں جاتی
رہتا ہے ہر وقت دروازہ کھلا میرے لیے
تربیت پاتا ہے انسان بڑی مشکل سے
سروں پر جھومتا ابرِ کرم ہے
ارے ظالم یہی بیت الحرام ہے
اپنا نبی تو عشق علیہ السلام ہے
کیا غضب ہے کہ اثر کر گیا اُلٹا تعویذ
پھنس جائیں گے دل اور بھی اک اِس طرف اک اُس طرف
اب تو میکش شراب پینا چھوڑ

حیدرآباد کے شاعر

(۱۲) صادق نقوی

۱۹۶۶ء میں ریاستی ساہتیہ اکیڈمی کے شائع شدہ تذکروں کا سلسلہ — ۱۲

ماضی کی سرد گرد میں جلتا ہے آدمی
دار و رسن کے سائے میں پلتا ہے آدمی
شعلے برستے رہتے ہیں آنکھوں کی راہ سے
اپنے غموں کی آگ میں جلتا ہے آدمی
کچھ مصلحت کی آڑ میں کچھ پیٹ کے لئے
چہروں کو روز کتنے بدلتا ہے آدمی
اپنی انا کی لاش لئے اپنی گود میں
خنجر کی تیز دھار پہ چلتا ہے آدمی
صادق نئی حیات کے پیغامبر بنو
دیکھو تمہاری راہ پہ چلتا ہے آدمی

درد کا بوجھ تھا سینے پہ چٹانوں کی طرح
مسکراتے رہے ہم پھر بھی غزالوں کی طرح
ایک دو گام پہ منزل تھی مگر کیا کیجے
ہم ہی پھرتے رہے آوارہ خیالوں کی طرح
کانچ کے جسم ہیں حالات کے پتھراؤ تلے
موج ساحل پہ ابھرتے ہیں حبابوں کی طرح
وقت کی دھوپ میں کرتے ہیں سائے کی تلاش
ریگ صحرا سے اٹھے ہیں تو بگولوں کی طرح
کتنے افسانوں کا عنوان بنا ہوں صادق
مسکراتے ہوئے چہرے پہ نقابوں کی طرح

ہے چہرہ بدن پاؤں میں افکار کی زنجیر
یہ شہر بھی شاید ہے ترے پیار کی زنجیر
میں چاند ستاروں سے پرے محو سفر ہوں
بجلی کی طرح ٹوٹی ہے رفتار کی زنجیر
پہرے ہیں زبانوں پہ قلم ٹوٹ گئے ہیں
اس دور کا دستور ہے فنکار کی زنجیر
حالات کے صحرا میں یہ پیاسوں کا سفر ہے
ہیں ہاتھ بندھے پاؤں میں افکار کی زنجیر
صادق ہیں اگر چاہو تو دم بھر میں پگھل جائے
پاؤں میں پڑی ہے جو ستمگار کی زنجیر

کس سے پوچھوں کہ رازِ محبت ہے کیا، کس کو سمجھاؤں دل کی زباں دوستو
یوں سلگتے ہیں سینے میں ارمان کے دانے جیسے صحرا میں ریگِ تپاں دوستو
کوئی آواز دیتا رہا دور سے، ہم بھی چلتے ہیں ٹھیرو ذرا دو گھڑی
دو گھڑی کے لئے بھی نہ روکا گیا وقت کا تیز رو کارواں دوستو
کتنی امید تھی رات گذرے گی اب، اور بیدار ہوگی سہانی سحر
رات گذری تو تاریکیاں بڑھ گئیں، کتنا جھوٹا تھا وہم و گماں دوستو
یادِ مخدوم، صادق یہ جلتا دیا، گلشن میں جیسا سہانا سما
[illegible]

صادق نقوی، ۱۱ر مارچ ۱۹۳۶ء میں حیدرآباد کے علمی و محترم گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید احمد حسین نقوی سٹی کالج میں استاد تھے۔ کئی نصابی کتابیں یادگار ہیں۔ حیدرآباد ریڈیو سے ڈرامے اور مضامین بھی نشر کئے۔ صادق کی والدہ سکینہ بیگم عفت صاحبہ شاعرہ تھیں، کلام کا مجموعہ چھپ چکا ہے۔ نقوی کے چچا مولوی سید بادشاہ حسین ہند و پاک کے مشہور ڈرامہ نویس ادیب ہیں۔ ادارۂ ادبیات اردو اور ڈاکٹر زور سے ان کے مراسم استوار رہے ان دنوں کراچی میں تصنیف و تالیف میں منہمک ہیں۔

صادق نقوی نے نظام کالج سے بی اے کیا علی گڑھ سے تاریخ میں ایم اے کی ڈگری لی۔ جامعہ عثمانیہ سے ایم فل کے لئے "علی نامہ کا مطالعہ تاریخ عادل شاہ ثانی کے آئینے میں" کے زیر عنوان مقالہ داخل کر چکے ہیں۔ حیدرآباد پبلک اسکول میں تاریخ کے معلم کی حیثیت سے کارگذار ہیں۔ ۱۹۵۰ء سے شعر کہتے ہیں، تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کا شعور رکھتے ہیں۔ ملک کے ادبی رسائل و جرائد میں کلام بھی چھپتا رہا ہے، انگریزی ادبیات کا اچھا [illegible]

شاعر [illegible] سلیقے سے [illegible]

[illegible] کلام [illegible] پاتے ہیں۔ [illegible] کلام کے انتخاب کی اشاعت میں مصروف ہیں [illegible]

سب رنگ

اس عنوان کے تحت ہند و پاک کے معیاری رسائل و کتب سے مضامین نظم و نثر کا انتخاب شائع ہوا کرے گا۔ (ادارہ)

ڈاکٹر عبدالغفار شکیل

زبان کا مستقبل

بدقسمتی سے ہر ملک میں لسانیات کے علم اور اس کے اصولوں سے واقفیت رکھنے والوں کی تعداد کم ہے۔ عموماً ہر ملک میں مسائل زبان کو حل کرنے یا ان میں دلچسپی لینے والے ارباب سیاست ہوتے ہیں یا وہ لوگ جن کا میدان کچھ اور ہی ہوتا ہے' لسانیات نہیں یہ تسلیم کہ محض لسانیات سے واقفیت مسائل زبان کا حل نہیں پیش کرتی' اس میں سیاست' معاشرت اور زندگی کے تقاضوں' ماحول اور جغرافیائی حدود سبھی کو دخل ہے' ان کو بھی نظر میں رکھنا لازمی ہوگا ورنہ صحیح نتائج اخذ نہیں کیے جا سکتے۔ چنانچہ زبان کے مستقبل کے سلسلے میں جن باتوں کو خاص طور پر قابل غور سمجھنا چاہیئے وہ یہ ہیں ؛

(۱) زبان استعمال کرنے والوں کی تعداد

(۲) زبان میں لسانیاتی تقاضوں کو پورا کرنے کی قابلیت

(۳) زبان کی تہذیبی و تمدنی حیثیت

(۴) زبان میں زمانے' ضروریات زندگی اور ماحول کے مطابق تبدیلی کی صلاحیت

(۵) زبان میں دیگر زبانوں کے بولنے والوں کے لئے ثانوی زبان بننے کے امکانات

(۶) زبان سے اس کے بولنے والوں کو محبت' عقیدت اور وقعت

آیئے اب ان پر ذرا تفصیل سے گفتگو کریں۔

(۱) لسانیاتی پیشن گوئی کے سلسلے میں زبان استعمال کرنے والوں کی تعداد کا سوال بے حد اہم ہے اور نہایت قابل غور امر ہے۔ اس میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ زبان کے بولنے والوں کی تعداد جتنی زیادہ ہوگی اتنی ہی زیادہ اس زبان میں دوسری زبانوں سے مقابلہ کرنے کی طاقت ہوگی۔ اور زبانوں کے مقابلے میں یہ تعداد جتنی کم ہوگی اتنی ہی وہ کمزور ہوگی۔ تعداد کے ساتھ ہی ساتھ زبان کی جغرافیائی حیثیت کو بھی زیر بحث لانا چاہیئے۔ زبان کے لئے ایک ایسے علاقے یا رقبے کا ہونا ضروری ہے جس کو اس کا لسانی رقبہ کہا جا سکے۔ اس لسانی رقبے میں جتنے لوگ آباد ہوں ان سب کی زبان ایک واحد زبان ہو سکتی ہے یا وہاں دو اور زبانیں بھی ہو سکتی ہیں لیکن جس زبان کے بولنے والوں کی تعداد زیادہ ہوگی وہ رقبہ یا علاقہ اسی زبان کا رقبہ کہلائے گا اور جتنی زیادہ تعداد اس [illegible] ہوگی اس کا حلقۂ اثر بھی زیادہ ہوگا۔ اکثریت کی زبان اقلیت کی زبان کے مقابلے میں ترجیح ہوگی [illegible]

زیادہ ہوگا اکثریت کی زبان اقلیت کی زبان کے مقابلے میں وقیع ہوگی اور اس کا اثر بھی دوسری زبانوں پر ہوگا۔ اس طرح
جبکہ دوسری زبان والے اس وقیع زبان کو سیکھنے پر مجبور ہوں گے۔ اس طرح اس کی تعداد بھی بڑھتی رہے گی۔

(۲) زبان میں لسانیاتی تقاضوں کو پورا کرنے کی قابلیت کا ہونا بھی ضروری ہے اس کے لئے زبان میں ایسا وافر سرمایۂ الفاظ ہو جو کم سے کم لسانی تغیرات سے گذرے۔ زبان کا لسانیاتی ڈھانچہ LINGUISTIC STRUCTURE ایسا ہو کہ وہ زبان کے بولنے والوں کے مختلف طبقوں مثلاً پڑھے لکھے، ان پڑھ اور مختلف پیشے والوں کی روزمرّہ گفتگو یا تحریر میں ان کا ساتھ دے سکے اور وہ بغیر کسی جھجھک یا رکاوٹ یا کسی اور زبان کا سہارا لئے بغیر اپنے مافی الضمیر کو دوسروں پر ظاہر کرسکیں۔ زبان کے ذاتی سرمایہ میں اسماء و افعال وغیرہ کے بے شمار مادوں STEMS، سابقوں PREFIXES اور لاحقوں SUFFIXES کا ہونا بھی ضروری ہے جن کی مدد سے ضرورت پڑنے پر نئے نئے الفاظ وضع کرکے زبان کے سرمائے میں اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ اگر زبان اس کی اہل نہ ہو تو اس کی ترقی و ترویج اور بقاء غیر یقینی ہو جاتی ہے۔ زبان میں لسانیاتی سرمایہ کا اضافہ ماضی سے ہوتا آیا ہے اس میں سابقوں لاحقوں اور مادوں کی فراوانی ہو تو اس کی یہ قابلیت مستقبل میں بھی لسانیاتی تقاضوں کو پورا کرسکتی ہے۔

(۳) کسی معاشرے میں زبان کی تمدنی و تہذیبی حیثیت دو وجہوں کی بناء پر اہم ہے۔ سب سے پہلے یہ کہ زبان کی تہذیبی و تمدنی حیثیت اگر اعلیٰ ہے تو دوسری قومیں بھی اس کو عزت کی نگاہ سے دیکھیں گی جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ زبان دوسری اقوام میں بھی معروف و مشہور ہوگی دوسرے یہ کہ کسی قوم کی تہذیب اپنی بقاء و ترقی میں بھی برابر کی شریک ہوتی رہے گی۔ یہ حقیقت ہے کہ اعلیٰ ترقی اور وقعت کو بڑھانے میں مدد دیتے ہیں۔ یونانی اور لاطینی تہذیبوں اور ان کی تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ لاطینی اور یونانی زبانوں کا کلاسیکی ادب اور دیگر علوم صدیوں سے دنیا بھر کے عظیم مفکروں اور عالموں کے لئے مشعل راہ رہے ہیں۔ انگریزی کا ادب میں شکسپیر، ملٹن، ورڈزورتھ، کولرج وغیرہ کے کارنامے انگریزی کا زبان و ادب کو ہر زمانے میں وقعت دلاتے رہے ہیں۔ انھیں کارناموں کی بدولت انگریزی زبان دنیا بھر میں مشہور ہوئی اور آج اس کی بے پناہ قوت اور قابلیت، اس کا ماضی و حال، علمی و ادبی سرمایہ سب نے مل کر اسے عالمگیر زبان بنا دیا ہے انگریزی میں مختلف علوم و فنون، سائنس، ادب وغیرہ کی بے شمار کتابیں انگریزی زبان کی وسعت، ہمہ گیری، وقعت، ترقی و ترویج کی ضمانت ہیں۔
اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ انگریزی تہذیب نے انگریزی زبان کو عالمگیر حیثیت دلانے میں بڑا کام کیا ہے آج دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جہاں انگریزی زبان نے اپنی جگہ اور اپنا جہان نہ بنایا ہو۔ مزید یہ کہ تہذیب و تمدن زبان کی لسانیاتی قابلیت کو بڑھا کر زبان کو تقویت دینے میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں زبان کا سرمایہ الفاظ اور دیگر لسانیاتی اشکال جن کی ضرورت علوم و فنون اور ادب میں ہوتی ہے اپنے آپ وجود میں نہیں آتے بلکہ وہ کسی قوم کے اہم افکار سائنس اور ثقافتی ترقی کے نتیجے کے طور پر معرض وجود میں آتے ہیں۔

(۴) زبان کے مستقبل کی پیشن گوئی کرتے ہوئے ان تبدیلیوں کے امکانات پر بھی غور کرنا چاہئے جو خود زبان کے اندر ہوتی ہیں۔ دنیا کی کوئی زندہ زبان ہمیشہ ایک حالت پر نہیں رہتی زبان کا تغیر، زبان کی ترقی اور زندگی کی علامت ہوتا ہے زمانے اور ضروریات زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے اور ان سے وابستہ خیالات کا ساتھ دینے کے لئے زبان میں نئے نئے الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے اور پھر زبان جس جس ماحول میں استعمال ہوتی ہے وہ ماحول ہر دوسرے ماحول سے بدلا ہوا ہوتا ہے۔ چنانچہ زبان کو زمانے، ضروریات زندگی اور ماحول کے مطابق تغیر پذیر ہوتے رہنا چاہئے۔ اس صلاحیت کو بعض کٹر پسند اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے لیکن یہ حقیقت ہے کہ زبان اپنے ارتقائی سفر کے دوران مختلف قسم کی تبدیلیوں سے گذرتی ہے، زمانے اور ماحول کے اثرات کی وجہ سے اس میں لسانی تراش خراش اور اصلاح بھی ہوتی

کثیر زبانوں کے اثر سے لسانیاتی لین دین ہوتا ہے جس کو روکنا کسی فرد یا جماعت کے بس کی بات نہیں، ماہرین لسانیات اس طرح کے اثرات کا مطالعہ لسانیاتی اصولوں کی روشنی میں کر کے نہایت مفید معین اور مقرر نتائج اخذ کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں ایک طرف زبانوں میں داخلی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اور دوسری طرف تعلیم، کتابوں کی اشاعت، ریڈیو، ٹیلی ویژن میں استعمال ہونے والی زبانوں کے ذریعہ زبان کے اندر ہونے والی تبدیلیوں کی رفتار کو سست یا کم کرنے کے اسباب خود بہ خود پیدا ہوتے ہیں اس طرح زبان لسانیاتی تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اپنے استحکام، اپنی استقامت اور اپنی انفرادیت کو بحال رکھنے میں کوشاں ہوتی ہے۔ اس کے برعکس اگر زبان میں ہونے والی تبدیلیاں ایسی ہوں جو داخلی اور خارجی اثرات کا نتیجہ ہوں اور ان کا سدباب وقتاً فوقتاً تعلیم، ادب، کتابوں کی نشر و اشاعت کے ذریعے نہ ہو تو زبان کی استقامت خطرے میں پڑ جائے گی، زبان کے اندر بھی اسی قدر تبدیلی گوارہ کی جا سکتی ہے جو اس کے بنیادی ڈھانچے یعنی STRUCT-URE) پر اثر انداز نہ ہو اس میں رسم خط کو بھی اور شامل کیا جا سکتا ہے۔ رسم خط کی تبدیلی زبان کے حق میں نہایت مضر ہوگی ہاں رسم خط میں اصلاح کی گنجائش رہتی ہے اور اس کو زیر غور لانا چاہئے۔ زبان کو اس کے بنیادی ڈھانچے میں غیر معمولی تبدیلیوں کے ذریعے مسخ کر دیا جائے تو وہ اپنی اصلیت اور انفرادیت کھو بیٹھتی ہے۔

زبان کے اندر ہونے والے بعد ترین تبدیلیاں ان سیاسی حالات کا بھی نتیجہ ہوتی ہیں جو ملک یا صوبے میں رونما ہوتے ہیں۔ حکومت اور ارباب سیاست کے رجحانات اور اثرات بھی زبان میں تغیر، تبدل اور زبان کی ترقی یا زوال کا باعث بنتے ہیں۔ زبان حکومت کی سرپرستی پاتی ہے تو اس کی ترقی و بقا کا تحفظ بڑی حد تک ہو جاتا ہے اور اگر حکومت زبان کی سرپرستی نہ کرے اور اس کی ترقی و ترویج کے مسائل میں مدد نہ دے تو زبان کی زندگی پر اس کا اثر پڑنا لازمی ہے اور اس میں اور زبانوں سے مقابلے کی طاقت مفقود ہونے لگتی ہے۔

زبان میں ہونے والی تبدیلیاں اس کے حق میں مفید بھی ہو سکتی ہیں اور مضر بھی، اس کا انحصار حالات پر ہے زبان کے بارے میں پیش گوئی کرتے وقت مفید یا مضر تبدیلیوں پر بھی نظر رکھنی ہوگی۔ جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے کہ کسی ملک میں ایک سے زیادہ زبانیں ہوں تو وہ آپس میں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ کچھ وہ اپنے پاس سے دوسری زبانوں کو دیتی ہیں اور کچھ دوسری زبانوں سے لیتی ہیں ایک صوبے یا علاقے کی زبان کے حدود بھی اسی صوبے یا علاقے تک محدود نہیں ہوتے۔ ایک زبان کے بولنے والے مختلف معاملات زندگی میں ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں جاتے ہیں چنانچہ تعلیم، تجارت وغیرہ کی غرض سے لوگ ایک علاقے سے دوسرے میں، ایک ملک سے دوسرے ملک میں جاتے ہیں، زبانیں بھی اپنے بولنے کے ساتھ سفر کرتی ہیں۔ ان حالات میں اس زبان کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے جو مختلف صوبوں میں عام طور سے آسانی سے سمجھ میں آ سکے اور لوگ اپنے خیالات کو بلا تکلف اس میں ادا کر سکیں اور ایک دوسرے کو سمجھ سکیں۔ بین لسانی اختلاط میں سب سے زیادہ موثر و مقبول وہی زبان ہوگی جو عام فہم ہو اور زیادہ سے زیادہ تعداد اس کے بولنے اور سمجھنے والوں کی ہو۔ اس ضمن میں ایک اور بات کی طرف بھی اشارہ ضروری ہے وہ یہ کہ زبان ایسی ہو کہ اس میں تکلف و تصنع نام کو نہ ہو۔ عام و خواص بولتے لکھتے اور ان پڑھ سب اسے ہر جگہ اور ہر موقع پر بے تکلف استعمال کر سکیں اور ضرورت کے مطابق الفاظ ان کے خیالات کی ترجمانی کر سکیں۔

(۵) مختلف علاقوں میں بولی جانے والی زبانوں میں جو زبان ایک عام فہم زبان کا کام دے سکے اس زبان کی ترقی و بقا [illegible] کچھ [illegible] کسی زبان کو ثانوی زبان کی حیثیت سے سیکھنا [illegible] اس زبان کے بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد [illegible] کا باعث بھی ہوگا اور اس طرح اس زبان کی ترقی اور زندگی کے امکانات کو روشن کرے گا یہاں سوال کیا جا سکتا ہے کہ لوگ کسی زبان

کی حیثیت سے کیوں سیکھیں؟ اس کا جواب ان محرکات میں پوشیدہ ہے جو کسی فرد کو ثانوی زبان سیکھنے پر اُبھارتی ہیں۔ یہ محرکات تجارتی اغراض و تعلقات، سیاسی مفادات اور اداروں میں ملازمت وغیرہ وغیرہ ہیں۔ ان اغراض کی تکمیل میں خاص طور پر اس زبان کی قسمت جاگتی ہے جس کے بولنے والوں کی تعداد بھی کثیر نہ ہو بلکہ لوگ اسے آسانی سے سیکھ بھی سکیں اور اس کے وسائل بھی خوب مہیا ہوں۔ اگر زبان کا لسانیاتی نظام اس کی آوازیں، الفاظ کی ترتیب اور جملوں کی ترتیب و ترکیب سیکھنے والوں کی اپنی زبان سے زیادہ مختلف اور پیچیدہ ہو تو لوگ اس کو ثانوی زبان کی حیثیت سے سیکھنے میں دلچسپی نہ لیں گے اور اگر بعض مجبوریوں یا ضرورتوں پر سیکھیں گے بھی تو ایسے لوگوں کی تعداد محدود ہوگی جس سے زبان کو کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں پہنچے گا اس سلسلے میں ایک اور بات ذہن نشین ہونا چاہئے کہ جو زبان ثانوی زبان کی حیثیت سے سیکھی جائے اگر اس کے سیکھنے والوں کی زبان سے ملتی جلتی ہے یعنی اسی خاندان السنہ سے تعلق رکھنے والی ہو تو دونوں زبانوں میں بہت سی باتیں مشترک ہوں گی۔ ثانوی جماعت کے حق میں یہ بات بہت ہی مفید ثابت ہوگی، اس سے اس کا دائرہ وسیع ہوگا اور وہ دوسری زبانوں میں بہت جلد مقبول اور مشہور ہوگی۔

(۶) اب آخری بات اس سلسلے میں زبان سے اس کے بولنے والوں کی محبت، عقیدت، اور ان کی نگاہوں میں اس کی وقعت ہے۔ ہر شخص کو اپنا وطن اور اپنا مذہب جس طرح پیارا ہوتا ہے اسی طرح اس کو اپنی زبان سے بھی محبت ہوتی ہے وہ بچپن سے جس زبان کو بولتا ہوا آتا ہے اس کو عزیز رکھتا ہے۔ ایسا شاذ ہی ہوتا ہے کہ کوئی شخص اپنی زبانِ مادر کو زبانِ دیگر پر ترجیح دے بعض غیر معمولی حالات میں اس بات کا بھی امکان ہے مگر بہت کم۔ زبان سے محبت، عقیدت اور لگاؤ جتنا گہرا ہوگا اتنا ہی زبان کی بنیادیں مستحکم و مضبوط رہیں گی۔ زبان سے محبت میں گہرائی اس کی ترقی و ترویج کے جذبے کو ابھارنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ زبان سے گہری محبت و عقیدت کا جذبہ زبان کو زندگی عطا کرتا ہے عبرانی زبان کی مثال موجودہ زمانے میں ہمارے سامنے ہے جس کے بارے میں یہ کہا جاتا تھا کہ یہ مردہ زبان ہے مگر اسرائیلی عزم نے اسے دوبارہ زندگی دے دی۔ زبان کی موت تہذیب کی موت ہے۔ تہذیب کی موت قوم کی موت ہے قوم جتنی جاندار ہوگی اتنی ہی اس کی تہذیب جاندار ہوگی اور اسی اعتبار سے اس قوم کی زبان بھی زندہ اور جاندار ہوگی۔ لسانی تعصبات ایک زبان کو دوسری زبان میں ضم کرنے یا ختم کرنے کے درپے ہوتے ہیں۔ ایسے میں جو چیز زبان کے لئے سپر کا کام دیتی ہے وہ زبان کی محبت اور عقیدت ہی ہے یہی ہے زبان کے عروج و زوال کا راز اور ان کا نقطۂ آغاز۔

ان چند امور کی روشنی میں کسی بھی زبان کا جائزہ لیا جا سکتا ہے اور اس کی موجودہ صورت حال کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے اس طرح اس کے مستقبل بعید کے بارے میں نہ سہی مستقبل قریب کے بارے میں اتنی تو پیشین گوئی کی جا سکتی ہے کہ وہ زبان کی ترقی کی منزل کی جانب رواں دواں ہے یا تنزل کی طرف۔ (ماہنامہ "نوائے ادب" بمبئی۔ اپریل ۱۹۷۷ء)

اسلوب اور کوچۂ ادب

محمد علی صدیقی

کچھ عرصے سے ایک سوال گردش کر رہا ہے۔ ہم سوالات ہی کے سہارے آگے بڑھتے آئے ہیں اس لیے مقام تعجب نہیں کہ ادب اور ... فنون سے تعلق رکھنے والے گروہ کے پیش یہ سوال کہ "آیا اسلوب خلق ہوتا ہے یا انتخاب" ایک عقدۂ لاینحل نہیں تو مشکل ضرور ہے

کیا اسلوب ادیب یا فن کار کے نقطۂ نظر سے تشکیل پذیر ہوتا ہے یا "ارادہ" اور "اظہار" کے درمیان مسافت طے کرنے کے لئے محض ایک نوع کی زادِ راہ ہے اور بس! ایک اور نقطۂ نظر بھی ہے اور وہ خاصا دلچسپ ہے اور ہمارے ملک میں ایسے بہت سے افراد موجود ہیں جو اس نقطۂ نظر کے حامی ہیں ۔۔۔۔ روایت کے ساتھ نظری اور موضوعی ہم آہنگی بدولت وجود میں آنے والا اسلوب ۔۔۔۔۔ پہلے خیال کی عمارت ۔۔۔ جیسا کہ ہماری زندگی میں نقطۂ نظر کی اہمیت سے عیاں ہے۔ ایک زبردست اخلاقی اساس پہ استادہ ہے۔ آپ اگر اپنے اظہار کے ساتھ مخلص ہیں تو اسے اپنے قارئین تک صاف اور دل نشین انداز میں پہنچانا چاہیں گے ۔۔ ارادہ اور اظہار کا معاملہ مرغی یا انڈے میں کس کی اولیت کی بحث سے مشابہ نہیں ۔۔ ہرچند کہ بعض اوقات کچھ مماثلتیں اس قدر پریشان کُن ہوتی ہیں کہ ہم غیر حقیقی صورتِ حال کے گورکھ دھندے میں پھنس کر ارادہ اور اظہار ایک دوسرے سے متصادم سمجھ بیٹھتے ہیں، اور اس ٹکراؤ سے لامحالہ طور پہ ایک دھماکہ پیدا ہوتا ہے۔

اب رہی تیسری صورت یعنی ادیب کے تصوّرِ حریّت کا اسٹائل پہ اثر تو یہ ایک حقیقت ثابت ہے کہ صرف کم بہت ادیب روایت کے بوجھ تلے کراہتے ہوئے ملتے ہیں۔ زیادہ ہوشیار اور جرأت مند ادیب روایت کے طوق کو اپنے گلے میں ڈالنے یا اُس کے جُھوے اپنی کمر خمیدہ کرنے کی بجائے اُن گوشوں کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ جہاں سے روایت کے حصار سے باہر نکلنے کا راستہ عادت یا کورانہ تقلید کے الزامات سے بچتا بچاتا طباعی اور خلاقی کی عالمتوں سے مس ہو جاتا ہے اور یہ وہ چیلنج ہے۔ جو ہر کس و ناکس کے بس کا نہیں ۔۔۔ حالانکہ دنیائے ادب دیدۂ بینا کے لئے چیلنج ہی چیلنج ہے اس چیلنج کا اظہار نت نئے طریقوں کے ذریعے ہوتا رہتا ہے "اسلوب" بھی ایک طریقہ ہے ۔۔۔ اس کے ذریعے پیچیدہ انسانی سچوایشن سے عہدہ برآ ہونے والی کیفیات کی نشاندہی ہو جاتی ہے اور میرے خیال میں کسی ادیب کا اسلوب ہی اُس کے ذہن کی انفرادیت اور طبّاعی کا برجستہ اظہار ہوتا ہے۔ خواہ برجستگی صرف دنحو کے ماہرین کی نظروں میں بُری طرح کھٹکتی ہو کہ انسانی فکر کے سفر نے لاتعداد "دھیکوں" کی میزبانی قبول کی ہے اور اُس کے بغیر وہ سب کچھ نہ ہو پاتا جو ہو چکا ہے اور ہو چکنے کے بعد بھی ہر لحظہ مائل بہ تغیّر ہے۔ الیگزینڈر پوپ نے اسٹائل کو انسانی ذہن کا مرقع قرار دیا تھا اور فی زمانہ انسانی ذہن کے بارے میں فلسفیانہ توجیہات کی کثرت سے یہ حقیقت مزید واضح تر ہو چکی ہے کہ انسان ۔۔۔۔ بعض سماجوں میں حد درجہ خود کاری (AUTOMATION) اور اُس کے نتیجے میں انسانیت کشی (DEHUMANISATION) کے باوجود ابھی تک مقیاسِ فکر اور مقیاسِ عمل سے عبارت ہے اور اگر ایک وہ تسخیرات و کائنات کے مرحلوں سے مردانہ وار گذرتا ہوا اُمید و رجا کا پیکر نظر آتا ہے تو کبھی اور جگہ اُس کی زبوں حالی اور انفعالیت صحتِ فکر ہے ۔۔۔ وحدتِ فکر اور عمل میں بہت قریبی تعلق ہے ۔۔۔ یہ نفسیات کے دائرے میں ارادہ اور اظہار کی سی نیت ہے ۔۔۔

ہم نے اب تک تین نمائندہ حالتوں پر غور و خوض کیا ہے ۔۔۔ نقطۂ نظر (کی ماہیت)، روایت (کے ساتھ برتاؤ) اور تصوّرِ حریّت ۔۔۔ ان تینوں صورتوں کا اسلوب کے سوال سے براہِ راست تعلق ہے ۔۔۔ پر کیا اسلوب بھی انسانی ہے؟ یہ ایک پیچیدہ سوال ہے ایک ہی آن میں بحث کا کہ اس موڑ پر آن رکتے ہیں کہ اسلوب کسی سچوایشن کے چیلنج سے عہدہ برآ ہونے کا ایک ایسا میکانزم ہے جس میں فکر و نظر اور عمل کے باہم دخل یا فصل کا انکشاف ہوتا ہے ایک ایسے دور میں جب ادیب اہلِ اقتدار کی خوشنودی کی خاطر قلم اٹھاتے تھے اس کی حقیقی ذات تصنع کے جال سے ۔۔۔

نکل سکتا تھا کہ اسلامی ادب کے لیے جذبۂ بغاوت کی پذیرائی کس طور ہو سکتی تھی اور جب ادیب اولی الامر کی سرپرستی کے تنگ دائرے سے نکل کر عوام اور ان کی جمہوریت کا بادہ پیمانے اور وہ عوامی اُمنگوں سے ہم آہنگ ہو کر اتحادِ فکر و نظر کی طرف دلوانہ وار بڑھنے لگے اسے چاہیے کیفیت اس کا استثنائی عنصرے تو اس جمہوریت کے خلاف صف آرا کج روی اور ظلم کی طاقتوں نے اسٹائل کے بلند تر صاف اور ستھرے ذکر کو جگہ جگہ سے قطع کرنا شروع کردیا کہ ایک حلقہ میں تعمیر و تشکیل کی تڑپ کے بعد اگر آزادی تحریر کا شعور نہ پایا جائے تو بہت سے ادیبوں کے لیے کوچۂ ادب میں کیا مزارہ جاتا ہے تو کیا پھر اسلوب ایک شعوری انتخاب کا معاملہ رہ جاتا ہے؟ ـــــ

اور اگر یہ صحیح ہے تو پھر بہت سے ادیبوں کے یہاں اس کے مسلک اور اسٹائل کے درمیان واقع خلیج کس نام سے پکاری جائے ـــــ!

مسلم ضیائی کی یاد میں

مسلم ضیائی ۱۹۱۹ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے ان کا خاندانی نام عبدالوہاب تھا۔ اور ان کی ابتدائی تعلیم لکھنؤ اور کاکوری میں ہوئی۔ اپنے والد عنایت حسین صاحب کے انتقال کے بعد وہ ۱۹۲۴ء میں اپنے ماموں مولوی احتشام علی کے ساتھ حیدرآباد آگئے اور ۱۹۵۲ء میں پاکستان آگئے ـ ۶ جون ۱۹۷۷ء ان کی حیات کا آخری دن تھا۔

انھوں نے نظام کالج سے ۱۹۳۲ء میں انٹرمیڈیٹ کیا ۱۹۳۴ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے بی۔اے اور پھر ۱۹۳۶ء میں تاریخ و سیاست میں ایم۔ اے کیا۔

۱۹۳۰ء میں انھوں نے مولانا محمد علی جوہر کے مشہور اخبار خلافت سے وابستگی اختیار کرلی۔ مسلم ضیائی نے مولانا محمد علی جوہر کی بہت سی تقاریر کی رپورٹنگ کی تھی۔ مولانا محمد علی جوہر اس جوان صحافی کی استعداد علمی کے بہت قائل تھے۔ اس سے پہلے انھیں اپنے اسکول۔ چادر گھاٹ ہائی اسکول کے انگریز پرنسپل مشہور مستشرق مارماڈیوک پکتھال کی شفقت بھی حاصل رہی تھی۔ پکتھال قرآن مجید کے انگریزی ترجمہ کی وجہ سے مشہور تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے یہاں شروع ہی سے سنجیدگی و متانت کا نور تھا۔ اور جب انھوں نے ۱۹۴۷ء میں بچوں کا مشہور رسالہ "تارے" جاری کیا تو اس رسالے کے اجرا کے پس پشت بھی یہی جذبہ تھا کہ بچوں کی ذہنی تربیت کی جائے اور انھیں بہتر شہری کے طور پر تیار کیا جائے۔

ان کی سب سے پہلی تصنیف روسی ظرافت (۱۹۴۶ء) ہے پھر بچوں کی دیکھ بھال ترجمہ ۱۹۴۷ء اس کے بعد "شہید سلطان اور اس کے خواب" (۱۹۹۰ء) "غالب کا منسوخ دیوان" (۱۹۶۹ء) "میر تقی میر کی آپ بیتی کا ترجمہ"۔

ان ساری کتب میں "غالب کا منسوخ دیوان" (۱۹۶۹ء) سب سے زیادہ اہم ہے لیکن وہ ایک مدت تک ایسے ناشروں کی تلاش میں رہے جو ان کے مسودات کو شائع کرسکیں، لیکن کیا کیا جائے اس زبوں حالی کے دور میں جنسی اور سنسنی خیز کتابوں کے ناشر اپنے مطلوبہ مواد کے لیے مارے مارے پھرتے ہیں اور سنجیدہ اور وسیع موضوعات پر لکھنے والے اپنے مسودات کو گاہ بگاہ دھوپ دکھاتے رہتے ہیں کہ مبادا ان کی کوششیں دیمک کی نذر ہو جائیں۔ کاش کوئی ایسا ادارہ ہوتا جو مسلم ضیائی جیسے مسلّمہ ادیبوں کی [illegible]

مثنوی کو تا اور انھیں دفتری جھگڑوں سے بے نیاز رکھتا۔ مسلم ضیائی کے غیر مطبوعہ مسودات میں " غالب کی داستانِ محبت " بھی ہے۔ یہ اپنی قسم کی واحد کتاب ہے اور مسلم ضیائی نے غالب کی شاعری سے اس گوشت پوست کی حسینہ کو دریافت کیا ہے۔ جس نے انھیں محبت کی آگ میں جھلسا رکھا تھا۔ اس کے علاوہ " غالب عشق اور دیوار " ۔۔ " غالب کی راتیں ۔۔ غالب کی یادیں " " حیدر علی " (یہ کتاب ایک مشہور فرانسیسی ادیب کی تصنیف مطبوعہ ۱۸۴۲ء کا اردو ترجمہ ہے) کارل مارکس (اینگلز کی مشہور کتاب کا ترجمہ) کتب خانہ شاہان اودھ (ترجمہ) " اردو شعراء کا تذکرہ " مرتبہ ڈاکٹر اشپرنگر کا ترجمہ " تاریخ انقلاب " (۱۸۵۸ء - ۱۹۴۷ء) اس کے علاوہ ان کی شعری تخلیقات اور طویل مثنوی " پاکستان سے پہلے ۔۔ پاکستان کے بعد " بھی لائق توجہ ہیں ۔

مسلم ضیائی صاحب پچھلے چار برس سے بیمار تھے اور پچھلے دو سال سے صاحبِ فراش۔ اس عرصے میں ان سے جب کبھی ملاقات ہوئی اور ہائے افسوس کہ یہ ملاقاتیں بہت کم ہوئیں۔ وہ اپنی زندگی کے اوراق الٹنے شروع کر دیتے۔ ورق کم الٹتے۔ آب دیدہ زیادہ ہوتے۔ اپنی کم کوشی کا گلہ اور دوستوں کی محبت و خلوص کا ذکر اس نیک نیتی سے کرتے کہ ان کی باتوں پر یقین آنے لگتا لیکن دونوں باتیں غلط تھیں انھوں نے زندگی بھر علمی و ادبی کام کیا اور عمر کے آخری حصے میں وہ اپنے دوستوں کو ترستے رہے۔ انھوں نے ایک درجن سے زیادہ بچوں کے لیے کتابیں لکھیں۔ غالب صدی کے موقع پر " غالب کا منسوخ دیوان " مرتب کیا۔ یہ اپنی قسم کا واحد کام تھا اور سچ بات تو یہ ہے کہ غالب کے مروجہ دیوان کی اشاعتِ اولیں کے بعد سے اب تک اس پائے کا کوئی اور کام نہ ہو سکا۔ اس کام سے غالب شناسی میں بہت اضافہ ہوا۔ اس کتاب کے بعد وہ ساری شاعری سامنے آگئی جو مروجہ دیوان میں شایع نہ ہو سکی تھی۔ مرحوم اس کتاب کی اشاعت سے چنداں مطمئن نہ تھے۔ وہ اس کتاب میں اپنی عمر بھر کی تحقیق کا نچوڑ دیکھنا چاہتے تھے۔ لیکن انھوں نے مجھ سے بارہا کہا کہ اگر تم اس کام کو مسودہ کی شکل میں دیکھو تو معلوم ہوگا کہ میں نے کیا کچھ کیا تھا۔ خیر یہ محض ایک بات تھی اور افسوس یہ ہے کہ اب صرف باتیں ہی رہ گئی ہیں۔ ہمارے درمیان اب وہ شخص موجود نہیں جس کے دم سے غالبیات کے بہت سے گوشے روشن ہوئے۔ کچھ مکمل اور کچھ نامکمل۔ اور کچھ کے بارے میں محض اشارے۔ کاش انھیں اپنی جوانی کے ایام جیسی آسودگی میسر رہتی۔ جب وہ ایک ناشر تھے۔ اردو محل کے مالک جسے انھوں نے ۱۹۴۲ء میں قائم کیا تھا۔ بہت سے ادیب اس امر کی گواہی دیں گے کہ وہ محض مسودہ فراہم کرنے کے وعدہ پر اپنے ساتھی ادیبوں کو پیشگی رقم مہیا کر دیا کرتے تھے۔ کرشن چندر اور بہت سے ادیب ضیائی کی ناشرانہ سخاوت کے گن گاتے رہے ہیں اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ ان کی بے ریا دوستی اور بے پایاں محبت کے ذکر پر اشک بار ہوتے رہے ہیں ۔

الغرض کیا کیا واقعات بیان کیے جائیں وہ ساری عمر کنوارے رہے اور اگر یہ کہا جائے کہ ادب ہی ان کی زندگی کا محور تھا۔ اور وہ ساری عمر دنیائے ادب ہی میں آباد رہے تو غلط نہ ہوگا۔ وہ نوجوان ادبا کے ساتھ اس درجہ شفقت سے پیش آتے کہ وہ نوجوانوں کے درمیان ایک بھرے پُرے خاندان کے ایک ایسے بزرگ کی حیثیت سے گھلتے ملتے کہ بزرگی و خوردی کا احساس مٹنے لگتا۔ وہ نوجوانوں کو [illegible] کہ خوب جیو اور بڑھاپے کو جوان رہنے کا [illegible] ان کی زندگی کو [illegible] اور زیادہ [illegible] بناتا تھا [illegible] وہ ابد میں بھی اسی [illegible]

(انجام - کراچی)

طوفان سے متاثرہ افراد کیلئے عطیوں کی وصولی کے مراکز

حکومت آندھرا پردیش عوام سے اپیل کرتی ہے کہ وہ فراخدلی کے ساتھ نقد یا اشیاء کی شکل میں عطیے دیں تاکہ ان افراد کو امداد فراہم کی جاسکے جو حالیہ طوفان سے متاثر ہوئے ہیں۔ عطیے ان مراکز کو بھیجے جاسکتے ہیں جن کی صراحت ذیل میں درج کی گئی ہے۔ دھلے ہوئے اور لانڈری کے کپڑے بھی فوری استعمال کے لئے بطور عطیہ دیئے جاسکتے ہیں ایسے معطی جو اشیاء کی شکل میں اپنے عطیہ ٹرین کے ذریعہ وجئے واڑہ کو روانہ کرنے کے خواہشمند ہوں ان سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ ترسیل سے قبل سب کلکٹر وجئے واڑہ کو مطلع کریں تاکہ ریلوے اسٹیشن سے ان اشیاء کو بروقت حاصل کرنے کے انتظامات عمل میں لائے جاسکیں۔ نقد یا چیک کی شکل میں عطیے چیف منسٹر سائیکلون ریلیف فنڈ کے نام بھیجے جاسکتے ہیں۔

اشیاء کی شکل میں عطیوں کی وصولی کے مراکز

(الف) میونسپل کمشنر آفس۔ دارالشفاء حیدرآباد اے پی	فون	57769
(ب) میونسپل کارپوریشن آف حیدرآباد۔ سکندرآباد ڈیویژن۔ سردار پٹیل روڈ سکندرآباد اے پی	فون	72012
(ج) ڈسٹرکٹ سپلائی آفیسر اے سی گارڈس، ماصاب ٹینک روڈ۔ حیدرآباد اے پی	فون	220939
(د) سائیکلون ریلیف ریسیونگ سنٹر بتوسط سب کلکٹر وجئے واڑہ اے پی	فون	96-76063
(ھ) کلکٹر گنٹور اے پی	فون	97-21925

نقد یا چیک کے ذریعہ عطیوں کی وصولی کا مرکز

سکریٹری ٹو گورنمنٹ۔ ریونیو ڈپارٹمنٹ سکریٹریٹ۔ حیدرآباد پن کوڈ 500022

ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ
حکومت آندھرا پردیش حیدرآباد

27/77-78

نقد و نظر

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلد آنا ضروری ہیں۔ ادارہ)

فائزہ (شعری مجموعہ) مصحف اقبال توصیفی

صفحات ۱۱۲ ڈیمائی سائز، خوبصورت سرورق قیمت -/۱۰ روپیہ
ناشر: مکتبۂ شعر و حکمت ۸۶۵-۶-۱۱، لکڑی کا پل، حیدرآباد ۴۰

مصحف اقبال توصیفی کی شاعری اس روایت کی اہم کڑی ہے جس کی داغ بیل ن۔م راشد اور میرا جی نے ڈالی تھی اور جسے "حلقہ ارباب ذوق" کے شعراء نے پروان چڑھایا تھا۔ ہماری شاعری کے بعض جدید رجحانات کا سلسلہ بھی اس روایت سے جا ملتا ہے۔ حلقۂ ارباب ذوق کا شناخت نامہ محض علامت نگاری، تحلیل نفسی اور آزاد نظم پر مشتمل نہیں ہے بلکہ یہ تحریک ایک مخصوص کلچر کی نمائندہ تھی جس میں انسانیت دوستی، فرد کی آزادی کا احترام، انفرادی جذبات اور تجربات کی قدر افزائی اور فن کی تخلیق کو بنیادی اہمیت حاصل تھی۔ جدید تر شعراء نے اپنے عہد کی حسیت کی ترجمانی کے ساتھ اپنی تخلیقات کے ذریعہ ان قدروں کی بازیافت کی ہے۔ مصحف اقبال توصیفی کی شاعری کا مزاج بھی کچھ ایسا ہی ہے۔

انھوں نے اپنی نظموں میں ان جانے تجربات اور ان کہے احساسات کو لفظوں کی گرفت میں لانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ شعر کی تحسین ایک پیچیدہ نفسیاتی عمل ہے جو شعر کے واحد متکلم سے قاری کی کامل مطابقت کا تقاضہ کرتی ہے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب لفظوں کا منتر قاری کو ہپنوٹائز کر کے ایک تنہا انجانی دنیا میں پہونچا دے لیکن وہ یوں محسوس کرے جیسے یہاں کی ہر شئے اس کی دیکھی بھالی ہے۔ مصحف اقبال کی شاعری میں یہ سحر کاری بدرجۂ کمال موجود ہے۔ ان کے اسلوب کا جو دوسرا اہم وصف ہے وہ سکوت کو گویائی بخشنے کا عمل ہے جہاں کچھ کے ذریعہ ان کہی کا ابلاغ مقصود ہوتا ہے۔ جس طرح پُرسکون سمندر کی لہروں کی نیم دوری گذرے ہوئے اور آنے والے طوفانوں کی داستان سناتی ہے۔ ان کی "ایک نظم" "صدا کی آواز" "تنہا پیڑ" "کنول" "انتظار" "نیند ٹوٹنے پر" "دوریاں" "سائے کی آنکھ" ایسی ہی لطیف اشاریت کی حامل نظمیں ہیں۔ مصحف اقبال توصیفی نے گھر دفتر اور بازار کے معمولی مشاہدات سے اپنی نظموں کے پیکر تراش کر ان میں گہری معنویت بھر دی ہے۔ اس اسلوب کو انھوں نے اتنا برتا اور نکھارا ہے کہ وہ ان کی شاعری کی پہچان بن گیا ہے۔ [illegible] کی بعض نظمیں اجنتا کی [illegible] تصویروں کی طرح [illegible] سے ایک مکمل واردات کو بیان کر دیتی ہیں۔ ایسا لگتا [illegible]

بہ گرد و پیش کی روداد اور اس کا دوران تجزیہ ہو کر ایک نظم بن گئے ہیں۔
گزرتے ہوئے لمحوں کی لطیف کیفیت اور شعریت کو لفظوں کے دام میں لا کر انھیں معنی خیز بنا دیا مصحف اقبال توصیفی کے فن کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔ یہ وصف ان کی نظموں متوسط طبقہ، ان کہی، اندھے خواب، دفتر سے گھر تک، گیان کے جنگل میں اور انہام جیسی نظموں میں بہت نمایاں ہے ان کا ہر مشاہدہ، اور تجربہ شخصی وار دات اور انفرادی احساس سے داخلی طور پر مربوط ہوتا ہے لیکن ان کے اظہار کے پیرایہ میں وہ معروضیت ہوتی ہے جسے ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے شخصیت سے فرار کا نام دیا ہے۔

مصحف اقبال توصیفی نے جہاں نظم کی صنف کو نئی جہتوں سے آشنا کیا وہیں انھوں نے جدید غزل کو بھی ایک نیا آہنگ بخشا ہے۔ انھوں نے غزل کی روایت اور اس کے فنی لوازم کی پاسداری کرتے ہوئے اسے اظہار کے بعض ایسے پیرایوں سے آشنا کیا ہے جو نظم سے مخصوص تھے جو گھریلو فضا اور ارد گرد کے ماحول کی مانوس کیفیت ان کی نظموں میں ملتی ہے وہ ان کی غزلوں میں بھی تازہ ہوا کی طرح در آئی ہے۔ مصحف اقبال توصیفی نے غزل کی روایتی لفظیات سے بڑی حد تک دامن بچائے رکھا۔ دوسری طرف انھوں نے اس فرہنگِ شعر سے بھی احتراز کیا ہے جو جدید غزل میں رواج پا کر پامال اور فرسودہ ہو گئی۔ مصحف اقبال توصیفی نے اپنی تخلیقات کے ذریعے خالص شاعری کی روایت کو آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ ان کی شاعری سماجی اور فکری مافیہ سے بھی بے نیاز نہیں ہے لیکن وہ زندگی کو خانوں میں بانٹنے اور حقیقت کو کسی خاص زاویے سے دیکھنے کے قائل نہیں ہیں۔ زندگی ان کے نزدیک ایک ناقابل تقسیم وحدت ہے جس کا ہر تجربہ منفرد ہونے کے باوجود کل زندگی کے وسیع تر پس منظر ہی میں بامعنی بنتا ہے۔

اس مختصر تبصرے میں نظموں سے اقتباسات دینے کی گنجائش نہیں ہے اس لیے ان کے مجموعۂ کلام خائزا سے غزل کے چند منتخب شعر پیش کیے جاتے ہیں جن سے مصحف اقبال توصیفی کی شاعری کے رنگ و آہنگ کا کسی قدر اندازہ ہو سکے گا۔

خشک پتوں پہ اپنا نام لکھیں   بین کرتی ہوا کے ساتھ چلیں
جس سے لی تھی اسی کو لوٹا دیں   یہ راتیں صبحیں یہ تری شامیں
کیا پتھر کی بھاری سل ہے ایک اک لمحہ ماضی کا   دیکھو دب کر رہ جاؤ گے اتنا بوجھ اٹھانے میں
گیت بابل کے سنانے تری سکھیاں آ گئیں   میں تو بس بچپن کا ایک ٹوٹا کھلونا ہو گیا
اپنا شہکار ابھی اے مرے بت گر نہ بنا   دل دھڑکتا ہے مرا تو مجھے پتھر نہ بنا
وہ گھروندے ترے، بچپن میں بھی ڈھا دیتی تھی   اب تو وہ کھیل کی باتیں بھی نہیں گھر نہ بنا
میں کب سے اپنے چاہنے والوں میں قید ہوں   سب کی زباں کو میرے لہو کا مزا لگا
اک ذرے کو اُلٹ پلٹا اس میں شہر تھے کرا بھی   اک لمحے کی جیب ٹٹولی سرمایہ تھا صدیوں کا

(ڈاکٹر مغنی تبسم)

رات والا اجنبی (افسانوں کا مجموعہ) عوض سعید، صفحات ۱۱۲، ڈیمائی سائز، سرورق، قیصر سرمست
قیمت۔ ۱۲/۰۰ روپئے۔ ناشر: مکتبۂ شعر و حکمت ۸۹۵-۹-۱۱ ملک پیٹ۔ حیدرآباد ۳۶

اردو افسانے کے جدید تر رجحانات کو فروغ دینے والوں میں عوض سعید کا نام نمایاں ہے۔ رات والا اجنبی ان کی

ں کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ میں جدید کہانیوں کے علاوہ بعض پرانی کہانیاں بھی ہیں جو پہلے کسی مجموعے میں شامل نہ ہو سکی تھیں۔
مجموعہ "خاکِ دل" "زیرِ دامی" "کفارہ" "دل خانہ خراب" وغیرہ۔ اپنی افسانہ نگاری کے پہلے دور میں عوض سعید نے زیادہ تر
ی کہانیاں لکھیں جنھیں اور پہلے کرداروں کے واسطے سے زندگی کے مختلف خارجی پہلوؤں اور مسائل کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا۔
ھوں نے اردو افسانے کو چند بے مثال کردار دیئے جو افسانوی ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ اب ان کی کہانیوں کا محرک اور
ر وقت بدل گئے ہیں۔ جدید کہانیوں میں انھوں نے موجودہ دور کے انسان کی داخلی زندگی کا کشمکش اور اس کے روحانی کرب کو
انداز میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ عوض سعید کے فن کا کمال یہ ہے کہ روایت سے انحراف اور تجرید کی طرف
ن کے باوجود ان کی جدید تخلیقات میں قصے کا عنصر مفقود نہیں ہوا ہے اور بے نام کردار بھی جیتے جاگتے انسان اور اپنے
ین رویے کی وجہ سے منفرد شخصیت کے حامل نظر آتے ہیں۔ لیکن ان کا عمل اور طرزِ فکر خارجی حالات اور ماحول کے تابع نہیں
اور جو واقعات رونما ہوتے ہیں ان میں زمانی اور مکانی تسلسل کے بجائے ایک علامتی ربط ہوتا ہے جس کی وجہ سے کہانی
یک پُراسرار فضا پیدا ہوجاتی ہے۔ ان کہانیوں کو پڑھتے ہوئے ہم اس تحیّر کی کیفیت سے دوچار ہوتے ہیں جو زندگی میں
وساری ہے لیکن سماجی عادتوں اور کاروباری زندگی کے بندھے ٹکے اشتغال نے اس تحیّر کی طرف سے ہمیں بے حس بنا دیا
ہے ہم تحیّر کی اس بے نام کیفیت کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو ہماری توجہ مختلف علامتوں پر مبذول ہو جاتی ہے اور
علامتوں کے ارتباط سے معانی کی مختلف سطحیں یکے بعد دیگرے ابھرنے لگتی ہیں۔ علامتوں کی ایک تعبیر سماجی مسائل سے
کرتی ہے تو غور و فکر میں کسی نفسیاتی حقیقت کی گرہ کھلتی ہے اور کبھی ہماری فکر پر ان علامتوں کا ایک مابعد الطبیعاتی
منکشف ہوتا ہے۔ مردہ گاڑی' تثلیت' چوتھا آدمی' جلا وطن' فیری اور رات والا اجنبی اس مجموعے کی ایسی ہی معنی خیز
ں ہیں۔ عوض سعید نے ان کہانیوں میں جس اسلوب کو بڑی کامیابی سے برتا ہے اس میں مزید ارتقاء کی گنجائش کم نظر آتی ہے
ن کو متحرک اور تازہ رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اظہار کی نئی راہیں تلاش کریں' عوض سعید کی تخلیقی صلاحیتوں سے
دہ پر یہ امید کی جاسکتی ہے کہ ان کی کہانیوں کا یہ مجموعہ ایک نئے ادبی سفر کا حرفِ آغاز بنے گا۔ (ڈاکٹر مغنی تبسم)

اقبال

مرتب عقیل الرحمٰن عقیل

صفحات (۴۶) کراؤن سائز' قیمت مجلد ۴/ روپے ناشر: قومی شاعری فورم' ملنے کا پتہ شالیمار پبلی کیشنز' تربیاتطہ حیدرآباد ملے

یہ مختصر سا کتابچہ علامہ اقبال کے عقیدت کے پھولوں کا گلدستہ ہے جس میں حیدرآباد کے ۲۲ شعراء کا اقبال
م خراجِ تحسین شامل ہے۔ عقیل صاحب نے بڑی کاوش سے ان گلہائے پریشاں کو جمع کرتے ہوئے اس گلدستے کو ترتیب
ہے۔ عقیل صاحب کی کوشش کو ہم اس لئے بھی سراہنے پر مجبور ہیں کہ عقیل صاحب اس دور کے نوجوان ہیں جبکہ ہندوستان
بال فراموشی کا دکھ رونا تھا۔ اقبال شناسی کی جستجو کا جذبہ نوجوانوں میں پیدا ہو جانا خود اس بات کی دلیل ہے کہ گرہی
ختم ہو رہا ہے۔ اس گلدستہ میں ۲۳ خراج ہائے عقیدت کے علاوہ خود مرتب کا مضمون "اقبال شناسی عہد حیدرآباد کا عصر
مختصر سے لکھا گیا ہے۔ جس میں مفید معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اقبال کے حضور حیدرآباد والوں کا یہ مختصر مگر مفید خراج ہر
ماننا اور باشعور اہلِ ذوق کی لائبریری کی زینت بنے' ہمارا مشورہ ہے کہ ایسی مختصر کتابوں کی حوصلہ افزائی ہو۔
(غلام جیلانی)

"تحریر" علمی مجلس کا تماہی رسالہ۔ ضیاء فتح آبادی نمبر۔ مرتب مالک رام صفحات ۲۲۰ قیمت پندرہ روپے
ملنے کا پتہ ۱۴۲۹، چھتہ نواب صاحب۔ فراشخانہ۔ دہلی ۱۱۰۰۰۶

تحریر کا یہ خاص نمبر سلسلۂ مطبوعات علمی مجلس دلّی کی ستائیسویں کڑی ہے اس خاص نمبر کی چند اہم خصوصیات لائقِ ذکر ہیں۔ ایک تو یہ کہ مردہ پرستی کو ترک کرتے ہوئے زندہ ادیب و شعراء کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کا نیک مقصد روشن نظر آتا ہے اور ہم اس اقدام کا تہہ دل سے استقبال کرتے ہیں۔ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ ہم ان مرحومین کو بھول جائیں جنھوں نے اُردو زبان و ادب کی خدمت میں عمریں گزار دیں اور اپنے پیچھے بیش بہا متروکہ چھوڑ گئے۔ ہمارے پُرخلوص استقبال کے پس پردہ جو جذبہ کارفرما ہے۔ اس کی بنیاد اُردو کے ادیب اور شعراء کے دلوں سے مایوسی اور بیچارگی کا احساس مٹانا ضروری ہے۔ جس کے لئے ایسے خصوصی شماروں کی اشاعت مفید اقدام ہوگی۔

زیرِ تبصرہ خاص نمبر میں نہ صرف آپ کو ضیاء فتح آبادی کے کلام کا انتخاب ملے گا بلکہ ان کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر نامور ادیبوں حضرت جوش ملیح آبادی، مالک رام صاحب، اعجاز صدیقی، کوثر چاندپوری، ڈاکٹر جاوید وششٹ، گربچن چندن، ڈاکٹر زرینہ ثانی اور ڈاکٹر تنویر احمد علوی کے عالمانہ مقالے ملیں گے جن کے مطالعہ سے جناب ضیاء فتح آبادی کی بھرپور شخصیت اور اُن کے فکر و فن پر روشنی پڑتی ہے اور خود ضیاء کے کلام سے بھی ان خیالات کی تائید نظر آتی ہے۔ ہم جناب مالک رام صاحب سے درخواست کرتے ہیں اس سلسلہ کی دوسری کڑیاں بھی منظرِ عام لائیں گے۔

(غلام جیلانی)

"کیا نام نہ ہوگا" مصنف بھارت چند کھنّہ : سرورق۔ طالب خوندمیری مجلد مع گرد پوش
سلسلۂ مطبوعات زندہ دلانِ حیدرآباد۔ صفحات (۱۵۲) قیمت ۸ روپئے

زیرِ تبصرہ کتاب (۱۷) مزاحیہ مضامین پر مشتمل ہے۔ کھنّہ صاحب تقریباً نصف صدی سے اس میدان کے کھلاڑی رہ چکے ہیں۔ جس طرح وہ کرکٹ کے میدان میں نامور رہے اسی طرح اس میدان میں بھی نامور ہیں۔ کرکٹ چھوٹ گئی لیکن اس میدان کی مشاقی کے جوہر بھی اس میدان میں منتقل ہوگئے جس کی بدولت وہ سوسائٹی کی ہر بُرائی پر بلا جھجکے چوٹ کئے جاتے ہیں۔ اس میں چوٹے بھی شامل ہوتے ہیں اور چھکے بھی۔ اور جب شخصیتیں مقابل ہوتی ہیں تو ایک ماہر گیند انداز بن جاتے ہیں جس کی وجہ سے مقابل شخصیتوں کی خوبیاں اور کمزوریاں سامنے آجاتی ہیں۔ کھنّہ صاحب خود اپنے آپ کو بھی نہیں بخشتے بلکہ چھکوں پر چھکے اُڑائے جاتے ہیں۔ کھنّہ صاحب کے مزاح میں طنز کی چاشنی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے، متانت، سنجیدگی اور شرافت کھنّہ صاحب کی شخصی خوبیاں بھی ہیں اور ان کی تحریروں کا وصف بھی۔ ہر مضمون میں ہر سطر اور ہر جملہ دعوتِ تبسم بھی دیتا ہے اور دعوتِ فکر بھی۔ ان دونوں میں سے کس دعوت کو قبول کرے وہ قاری پر منحصر ہوتا ہے۔ کتاب اچھی طباعت کے علاوہ دیدہ زیب ڈسٹ کور سے آراستہ ہے خصوصاً طالب خوندمیری کی بنائی ہوئی تصویر اور خود مصنف کی لکھی ہوئی مختصر تحریر کی تصویر کتاب کی خوبیوں میں اضافہ کرتی ہے۔ اُردو ادب کے شائقین کو چاہیئے کہ اس کتاب کو خرید کر پڑھیں اپنے لئے بھی اور دوسروں کو بطور تحفہ پیش کرنے کے لئے بھی۔

(غلام جیلانی)

شب گشت ـــ انجم عثمانی

صفحات ۱۰۰) ناشر کتب خانہ محمودیہ دیوبند قیمت ۷ روپے ڈیمائی سائز

انجم عثمانی کے انیس مختصر افسانوں کا مجموعہ ۔ سب کے سب افسانے کافذ پر بہت ہی مختصر ہیں لیکن قاری کو ان افسانوں کے بین السطور میں بہت کچھ مل جاتا ہے جس کی وجہ سے کسی قسم کی تشنگی باقی نہیں رہتی ۔ ان افسانوں میں سماج کے رستے ہوئے ناسوروں کے اسباب اور حل دونوں پائے جاتے ہیں۔ کردار دیکھے بھالے، واقعات روزانہ پیش آنے والے، مصیبتوں اور مشکلات کے وجوہ عام فہم اور ان کے حل بھی قابل عمل ۔ تحریر شستہ اور طنز و مزاح کی آمیزش سے عبارت ۔ کسی جملے پر قہقہہ لگانے کو دل چاہتا ہے تو کسی پر صرف معنی خیز تبسم اور کسی پر آنسو بہانے پر مائل ہونا پڑتا ہے ۔ ہمارے خیال میں انجم عثمانی کے ان افسانوں کا مجموعہ اردو کے ادب لطیف کے سرمایہ میں بیش قیمت اضافہ ہے ۔

(غلام جیلانی)

مسدود راہوں کے مسافر (افسانوں کا مجموعہ)

رضوان احمد ، ناشر ذلیدہ پبلی کیشنز پٹنہ ۴ (بہار)
ڈیمائی سائز مجلد مع گرد پوش صفحات ۱۲۸ قیمت ۱۰/- روپے

رضوان احمد کے بارہ افسانوں کا مجموعہ ہے اس کا دیباچہ بعنوان "بین السطور" لکھ کر مصنف نے قاری کو آگاہ کر دیا ہے کہ افسانوں کو سطور کی بجائے بین السطور میں تلاش کرنا چاہئیے ۔ اس نوجوان مصنف کو اعتراف ہے کہ "وہ فضا اور حالات سے مجبور ہو کر جوانی میں ضعیفی کی سرحدوں کو چھونے لگا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ اُسے ماحول میں صرف خوں آلود کپڑے، گندگی، کہنہ ہتھیار، چمگادڑیں، رقص کرتے ہوئے انسانی ڈھانچے اور منڈلاتے ہوئے گدھ ہی ملتے ہیں۔" اس مجموعے کو پڑھتے ہوئے لبا اوقات ہر سطر پر رک جانا پڑتا ہے اور سوچنا پڑتا ہے کہ مصنف کہنا کیا چاہتا ہے اور کہہ کیا رہا ہے۔ افسانہ نویسی ایک فن ہے اور وہ بھی فن لطیف اُس کے اصول و ضوابط ABSTRACT ART کے دائرے میں تلاش کئے جائیں تو نتیجہ ظاہر ہے۔ تاریک شب کے آخری لمحے ہوں کہ "خشک سمندر کی مچھلیاں" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کو شکار کھیلنے کی تمنا ہے لیکن صرف تیر کی آڑ سے "تیر بھی ایسی کہ جس پر چلنے کا گمان ہو۔ اور "صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں" کا منظر پیش کرتی ہوئی مصنف قلم کی تلاش میں سرگرداں رہکر محسوس کرتا ہے کہ قلم استعمال کرنے والے ہاتھ ہی قلم ہو گئے۔ ایسا کیوں ہے اس کا جواب بالکل واضح ہے کہ آنکھیں بند ہوں تو دنیا اندھیر ہو جاتی ہے۔ نہ ماضی نظر آتا ہے نہ حال، مستقبل تو مستقبل ہی ہوگا۔ ہم مصنف سے یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ زندگی "فرار" سے نہیں کشمکش سے بنتی ہے۔ اگر کشمکش میں راہوں کا صحیح تعین ہو تو کامیابی قدم چومتی ہے۔ جناب رضوان احمد بھی اگر اپنی راہوں کا تعین کر لیں تو نہ صرف ایک کامیاب بلکہ نامور ادیب بن سکتے ہیں۔ ہمارے اپنے خیال میں افسانہ نگاری شاید اُن کے لئے سازگار راہ نہیں ہے ۔

(غلام جیلانی)

براہ کرم تبصرہ کے لئے کتابوں کی دو جلدیں بھجوائیے [illegible] تبصرہ کے بعد جلد [illegible] ادارہ ادبیات اردو [illegible] محفوظ کی جاتی ہیں!

ضلع کرشنا کے طوفان سے متاثرہ افراد کی امداد

ایک اپیل

ایسے افراد، رضاکارانہ تنظیمیں اور دوسرے ادارے جو ضلع کرشنا کے طوفان سے متاثرہ افراد کی امداد، کپڑوں، بشمول شیٹ، پالیتھین بانکش، بیڈشیٹس، ادویات، کھانے پینے کی چیزیں، گھریلو استعمال کے برتن اور تعمیری اشیاء کی شکل میں دینے کے خواہش مند ہوں، ان سے درخواست ہے کہ اشیاء کی صحیح تقسیم اور رہنمائی کے لئے اسپیشل آفیسر سائیکلون ریلیف سپلائز سے دفتر سب کلکٹر وجے واڑہ پر ربط پیدا کریں۔

ایسی تنظیمیں اور افراد جو متاثرین کی بذات خود مدد کرنا اور اشیاء کی تقسیم کا کام سنبھالنا پسند کرتے ہوں ان سے گزارش ہے کہ وہ دستخط کنندہ ذیل سے مشورہ کریں تاکہ اشیاء کی دوہری تقسیم یا کسی ایک مخصوص علاقہ پر پوری کی پوری توجہ مرکوز نہ ہونے پائے اور اشیاء کی صحیح تقسیم اور متاثرین کی مناسب خدمت ہو سکے۔

رضاکارانہ تنظیموں سے خصوصی استدعا ہے کہ وہ دستخط کنندہ ذیل کے مشورہ سے ایک یا ایک سے زائد گاؤں کا انتخاب کریں اور وہاں طوفان سے متاثرہ افراد کی عارضی سکونت کے لئے فوری طور پر کمیونٹی شیلٹرس قائم کریں۔

ربط پیدا کیجئے

فون نمبر:

۸.۳۰ صبح ۸.۳۰ شام : ۶۲۲۹۰ وجے واڑہ

دوسرے اوقات : ۶۱۱۵۸ وجے واڑہ

بی۔ دانم آئی اے ایس

اسپشل آفیسر

سائیکلون ریلیف سپلائز، وجے واڑہ

DPR 28/77-78/169

ادبی سرگرمیاں

اُردو نامہ ۔ علمی ادبی اور تہذیبی خبرنامہ

۲؍ڈسمبر ۔ انجمن ترقی اُردو کی طرف سے ریاست میں اُردو تعلیم کے موجودہ موقف پر غور کرنے اور اس کی بہتری کی صورت گری کے وسائل تلاش کرنے کی غرض سے ماہرینِ تعلیم اور اردو کے ہمدردوں کا ایک مشاورتی اجلاس "اُردو ہال" میں ریاستی انجمن کے صدر نواب میر احمد علی خاں صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا نواب سعید جنگ، جناب عابد علی خاں، جناب ضیاء الدین انصاری، ڈاکٹر تقی خاں، جناب سید ہاشم علی اختر معتمد اعزازی ادارۂ ادبیاتِ اردو، ڈاکٹر عالم خوندمیری، مسٹر منوہر راج سکسینہ (ایڈوکیٹ) مسٹر کے بل، مہندرا (ریم کمل سمی) اور مسٹر سر بنواس لاہوٹی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

۳؍ڈسمبر ۔ بزم نارائن داس کا ماہانہ طرحی مشاعرہ حمید الدین قادری صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا۔ قدیم مکتب سخن کے دو درجن سے زیادہ شعراء نے غزلیں سنائیں۔

● اُردو اکیڈیمی آندھرا پردیش کے عہدہ داروں اور اسٹاف نے اپنی ایک دن کی تنخواہ ریاستی سیلاب زدگان کی مدد کے لئے چیف منسٹر ریلیف فنڈ میں جمع کرائی۔

۴؍ڈسمبر ۔ قومی شہری غازی محمد علی کی طرف سے اقبال صدی تقاریب کے موقع پر "نذرِ اقبال" (مرتبہ عقیل الرحمٰن عقیل) شائع ہوئی۔ اس مختصر مگر مفید کتاب میں علامہ اقبال اور حیدرآباد پر مکمل اور مقصدی مقالہ محررہ عقیل الرحمٰن کے علاوہ تقریباً تین درجن حیدرآبادی شعراء کا اقبال کو منظوم خراجِ عقیدت شامل ہے۔ یہ کتاب مرتب کے پتے (۱۸۔۳۔۲۳، سلطان شاہی، حیدرآباد ۵۰۰۲۶۵) سے چار روپے ۲۰ پیسے میں حاصل کی جاسکتی ہے۔

۶؍ڈسمبر ۔ اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش کی طرف سے مرحوم مخمور شاہد صدیقی کی بے نہایت شعری و ادبی خدمات کے اعتراف میں ان کی بیوہ کو ایک ہزار روپے کا عطیہ دیئے جانے کا اعلان کیا گیا۔

● انجمن ترقی اردو شہر حیدرآباد کی ۱۷ رکنی مجلس انتظامی کی ایک جلسۂ عام میں تشکیل عمل میں آئی۔ انجمن کے صدر جناب منوہر راج سکسینہ اور معتمد غلام صادق الدین منتخب ہوئے، دیگر ۱۴ اراکین کا بلا مقابلہ انتخاب بھی منعقد طور پر ہوا۔

۱۰؍ڈسمبر ۔ ریاستی انجمن ترقی اُردو کا نواں سالانہ اجتماع نواب میر احمد علی خاں کی صدارت میں منعقد ہوا۔

اضلاع کے (۲۱) اور حیدرآباد کے (۱۹) مندوبین نے ریاست میں اُردو ذریعہ تعلیم کے مدارس کے موقف، غیر اردو داں اساتذہ کے تقررات سے پیدا شدہ صورت حال اور لسانی اقلیت کی حیثیت سے اُردو والوں کے حقوق کی یکسوئی کی ضرورت جیسے مسائل پر مخاطب کیا اور انجمن کی طرف سے وقتاً فوقتاً محکمۂ تعلیمات میں کی جانے والی نمائندگیوں کے تعلق سے معتمد تنظیمی امور مسٹر سر بنواس لاہوٹی نے جلسہ کو واقف کرایا۔

● انجمن ترقی اردو کے اس اجلاس کے موقع پر ریاست کے اساتذہ صاحبان کا ایک مشاورتی اجلاس ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر مغنی تبسم ریڈر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی، پرنسپل فصیح الدین احمد، مسٹر نظام الدین مغل اور اضلاع کے اساتذہ مندوبین نے مخاطب کیا۔ ڈاکٹر گوڑ نے کہا کہ "اُردو کا تعلیمی بحران ملک کے تمام تعلیمی بحران کا حصہ ہے اس لیئے ہمارا نظام تعلیم روزگار سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ ملک کے قومی مزاج و کردار کے لحاظ سے نصاب اور تعلیمی نظام کا سیکولر ہونا ضروری ہے۔

۱۱؍ڈسمبر ۔ ریاستی انجمن ترقی

انجمن کے ۴۲ ویں سالانہ اجتماع کا مرکزی انجمن کے صدر پنڈت آنند نرائن ملا صاحب نے افتتاح کیا۔ میر احمد علی خان صاحب نے جلسہ کی صدارت کی۔ اس جلسہ کو جسٹس گوپال راؤ ایکبوٹے، جناب عابد علی خان، مسٹر پی نرسا ریڈی، ریاستی وزیر مال اور حبیب الرحمٰن سکریٹری انجمن نے مخاطب کیا۔ جناب ملا نے اردو والوں کو خبردار کیا کہ حکومت ۔۔۔۔۔۔ اردو کے مسائل کو حل کرنے میں ناکام رہی ہے۔ موصوف نے اردو والوں پر زور دیا کہ وہ اردو کے حقوق کے لئے جدوجہد تیز تر کر دیں اور تعلیم کے فروغ پر توجہ دیں۔

۱۱ر دسمبر ۷۷ء۔ انجمن کے سالانہ کنونشن کے موقع پر بین الریاستی مشاعرہ جناب علی احمد جلیلی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مسٹر ناصر کرنولی ایڈیٹر "پرچم" نے معتمد کے فرائض انجام دیئے۔ مسرز سعید شہید کا، علی احمد جلیلی، خیرات ندیم، ڈاکٹر غیاث صدیقی، ڈاکٹر صفدر علی بیگ، منوہر لال بہار، قتیل شفائی، میلان الدین ماہر، فیض الحسن خیال، علاءالدین نوید، ناصر کرنولی، غیاث متین، عظمت فاروقی، عبدالستار افسر، ڈاکٹر حسن رضوی، صادق النوری، راجہ لال راجہ، سلیم عابدی، اختر عزیزی، محمد منظور احمد، عزیز النساء قتیل، عتیق ملک اور نرگس حیدرآبادی نے کلام سنایا۔

۲۳ر دسمبر ۷۷ء۔ حلقۂ ارباب ذوق، ۱ کا ماہانہ ادبی اجلاس نظامس اردو ٹرسٹ لائبریری میں بصدارت ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ صدر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ منعقد ہوا۔ ڈاکٹر مغنی تبسم نے ڈاکٹر حنیف کیفی کی نئی تصنیف "اردو شاعری میں سانیٹ" پر سیر حاصل تبصرہ سنایا۔ جناب عبدالمجود ڈائرکٹر ٹرسٹ لائبریری نے شکریہ ادا کیا۔

۲۴ر دسمبر ۷۷ء۔ ہندی جرنلسٹ اسوسی ایشن کی طرف سے سہ لسانی محفل شعر مسز اوم پرکاش نرمل کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ ہندی اور انگریزی کے علاوہ اردو کے شعراء مسرز ڈاکٹر مغنی تبسم، شاذ تمکنت، امیر احمد خسرو، مصحف اقبال توصیفی، منوہر لال بہار اور انور رشید نے کلام سنایا۔

● حیدرآباد کے ایک کہنہ مشق صحیفہ نگار جناب شمس الدین قیصر سب ایڈیٹر روزنامہ "انگارے" طویل علالت کے بعد انتقال ہو گیا۔

● جواں سال صحافی اور ادیب مسٹر عابد صدیقی اپنی نئی خدمت ریسرچ آفیسر، ترقی اردو بیورو دہلی کا جائزہ لینے کی غرض سے دہلی روانہ ہوئے۔ عابد اس سے پہلے روزنامہ رہنمائے دکن میں سب ایڈیٹر کی حیثیت سے کارگزار رہے ہیں۔ دو سال ادھر ان کی کتاب "ادب اور صحافت" شائع ہوئی تھی۔

۲۵ر دسمبر ۷۷ء۔ حیدرآباد کے ادیبوں اور مصنفوں کی طرف سے مشہور افسانہ نویس جناب اقبال متین کی خدمات کے اعتراف میں ایک جلسۂ تہنیت ڈاکٹر عالم خوندمیری کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر یوسف سرمست، جناب احسن علی مرزا اور جناب سعید بن محمد نقش نے متین صاحب کی خدمات کو خراج تحسین ادا کیا۔ اس موقع پر ان کی خدمت میں گیارہ سو روپے کا کیسۂ زر بھی پیش کیا گیا۔

● کہنہ مشق سخنور مسٹر دنکر راؤ دیشمکھ دنکر (ایڈوکیٹ) کے شعری مجموعہ "انوارِ سحر" کی جناب عابد علی خان صدر نشین مجلس انتظامی ریاستی اردو اکیڈیمی نے رسم اجراء انجام دی اور کہا کہ دنکر صاحب کا مجموعہ کلام قدیم کلاسیکی رجحانات اور حیدرآبادی گنگا جمنی اقدار کا مرقع ہے۔ مسرز محبوب حسین جگر، سرفراز علی مرزا، عبدالکریم ماہر اور شالیمار پبلیکیشنز کے ڈائرکٹر مسٹر محمود خاور ایڈیٹر برگ آوارہ (جو اس مجموعہ کے ناشر ہیں) نے بھی دنکر جی کی شخصیت اور شاعری پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ صدر جلسہ نواب میر احمد علی خان نے بھی شاعر کو مبارکباد دی۔ آخر میں مسٹر احمد معین الدین برنی کی صدارت میں تقریباً دس شعراء نے کلام سنایا۔ مسٹر ارمان قریشی نے جلسہ کی نظامت کی۔

۲۶ ڈسمبر۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ہندی شاعری کے موضوع پر شعبۂ ہندی جامعہ عثمانیہ کی طرف سے سہ روزہ سمینار کا افتتاح پروفیسر سہنا نے ڈین فیکلٹی آف آرٹس نے کیا۔ پروفیسر نامور سنگھ (جواہر لال یونیورسٹی دہلی) ڈاکٹر راج کشور پانڈے (صدر شعبۂ ہندی عثمانیہ یونیورسٹی) کے علاوہ ناگپور اور پونے کی جامعات کے اساتذہ نے بھی مخاطب کیا۔ ڈاکٹر پانڈے نے حیدرآباد کی شعری و ادبی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے محمد قلی قطب شاہ کی روایات اور دکن کے مشترکہ کلچر کو زبردست خراج عقیدت ادا کیا۔

۳۰ ڈسمبر ۔ ریاستی قانون ساز اسمبلی میں تلگو کے علاوہ اُردو کے استعمال کے اغراض سے متعلق ایک گزٹ پیش کیا گیا جس میں اس امر کی صراحت کی گئی ہے کہ چند خدمات پر راست تقررات جیسے سکریٹریٹ، منسٹریل اور جوڈیشیل منسٹریل سروسیز کے سلسلے میں ایک علاقائی زبان کی حیثیت سے اُردو کو استعمال کیا جاسکے گا۔ گزیٹیڈ اور نان گزیٹیڈ خدمات کے لئے منعقد ہونے والے امتحانات کے لئے بھی اُردو کو دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا ہے۔

۳۱ ڈسمبر۔ انگریزی اور اردو ہفتہ وار پریس ونگ کی طرف سے ایک محفل مشاعرہ [illegible]

میں منعقد ہوئی۔ مسرز سعید شہیدی، امیر احمد خسرو، علی احمد جلیلی، کنول پرشاد کنول، صلاح الدین نیر، رئیس اختر، وقار خلیل، فیض الحسن خیال، ڈاکٹر احسن رضوی، منوہر لال بہار، امان ارشد اور صابر کمال نے کلام سنایا۔ مسٹر اے ام الحی ایڈیٹر پریس ونگ نے شکریہ ادا کیا۔ مسٹر عبداللطیف (ایم پی) نے بہ حیثیت مہمان خصوصی شرکت کی۔

● معروف افسانہ نویس جناب عاتق شاہ لکچرار سردار پٹیل کالج کی مختصر کہانیوں کا چھٹا مجموعہ "راستے کی کہانی" کے نام سے زیر طبع ہے۔ ۱۹۴۸ء میں شاہ کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ "فٹ پاتھ کی شہزادی" کے نام سے چھپا تھا۔ اُردو تحریک پر ایک اہم رپورتاژ "خالی ہاتھ" کو اترپردیش اور آندھرا پردیش کی اُردو اکیڈیمیوں کی طرف سے انعامات بھی ملے ہیں۔

● ادارۂ ادبیات اُردو کے امتحانات اُردو دانی، زبان دانی، اُردو عالم اور اُردو فاضل ۲۵ تا ۲۸ ڈسمبر تک شہر حیدرآباد کے مرکز انوار العلوم ہائی اسکول کے علاوہ دہلی، مدراس، بنگلور، نظام آباد، اننت پور اور نرمل میں بیک ساتھ [illegible]

جون اور ڈسمبر میں ملک کے مختلف مقامات پر منعقد ہوتے ہیں۔ ادارہ کے امتحانات اُردو عالم اور اُردو فاضل کو جامعہ عثمانیہ نے تسلیم کرلیا ہے۔ اس سلسلے میں معلومات کے لئے مسٹر اکبر الدین صدیقی سابق ریڈر سے جو امتحانات کے معتمد ہیں چار قندیل، آغا پورہ، حیدرآباد ۱ کے پتے پر مراسلت کی جاسکتی ہے۔

نتیجہ امتحانات ادارۂ ادبیات اردو منعقدہ ڈسمبر ۱۹۷۷ء

مرکز حیدرآباد : اُردو فاضل درجہ دوم ۶۔ محمد عزیز الدین درجہ سوم ۵۔ شاہ جہاں بیگم۔
اُردو عالم : درجہ دوم ۲۔ خالدہ بیگم درجہ سوم ۱۔ آمنہ بیگم ۲۔ فرحت النساء بیگم
اردو زبان دانی : درجہ سوم ۴۰۔ آر۔ کشورکمار

مرکز مدن پلی : اُردو فاضل : درجہ سوم ۷۔ ایس شاکر النساء
اُردو عالم : درجہ اول ۱۰۔ سید منیر محی الدین درجہ دوم ۱۱۔ محمد بشیر احمد درجہ سوم ۱۳۔ ایس شاہد النساء
اردو زبان دانی ، درجہ سوم ۱۹۔ محمد نیاز احمد ۲۰۔ ایس جلال الدین۔
اُردو دانی : کامیاب بہ امتیاز ۴۰۔ ڈی ارشاد علی خان ۴۲۔ پی مختار علی خان۔ کامیاب۔ ۴۱۔ ڈی
احمد علی خان ۴۳۔ ایس حمید پاشا۔ ۴۴۔ ایس عبداللطیف ۴۵۔ ایس بی بی جان ۴۶۔ پی شہوار نگار بانو
۴۷۔ ایس زبیر النساء ۴۸۔ ایس پروین بانو ۱۲۳۔ صابر النساء ۱۲۴۔ فہمیدہ بیگم

مرکز [illegible] اُردو زبان دانی ، درجہ سوم ۲۱۔ زاہد النساء بیگم ۲۲۔ حسینہ بیگم ۲۳۔ منور سلطانہ ۲۵۔ ایس اے شمس الدین
۲۶۔ سیدہ شبیرہ بیگم۔
اُردو دانی : ۴۹۔ شیخ مبین آرا بانو ۵۰۔ شیخ عبدالجلیل ۵۲۔ شیخ شمیم احمد

مرکز سداسیو پیٹ اُردو فاضل : درجہ دوم ۱۳۔ محمد فخر الحسن صدیقی درجہ سوم ۱۰۔ غلام صمدانی ۔ ۱۲۔ غلام غوث۔
اُردو عالم : درجہ سوم ۲۲۔ محمد یوسف علی۔
اُردو زبان دانی : درجہ دوم ۳۲۔ محمد عبداللطیف ۳۴۔ محمد تجمل افتخار احمد خان ۳۵۔ پروین سلطانہ۔
درجہ سوم ۲۷۔ محمد اسحاق احمد ۲۸۔ محمد انوار الحسن صدیقی ۲۹۔ محمد حسن الدین ۳۰۔ شیخ شمشیر علی۔ ۳۱۔ محمد منیر الدین احمد
۳۳۔ محمد اظہر اللہ ۳۶۔ پروین سلطانہ صدیقہ ۳۷۔ انسری بیگم ۳۸۔ رضیہ بیگم۔
اردو دانی : کامیاب ۵۴۔ محمد ضمیر الدین احمد ۵۵۔ محمد عبدالمقتدر ۵۶۔ سعیدہ فاطمہ ۵۷۔ فاطمہ تبسم
۵۸۔ عطیہ رضوانہ ۵۹۔ عائشہ جبیں۔

مرکز مدراس : اُردو فاضل درجہ دوم ۱۴۔ سید عبدالرحیم ۱۵۔ محمد مبین سلام الحبیب ۲۰۔ محمد عرفان اللہ۔ درجہ سوم ۱۷۔ ایس محمود اللہ
۱۹۔ ناصر النساء بیگم اُردو عالم درجہ سوم ۷۰۔ عبدالرشید ایس شیخ احمد ۷۲۔ خالدہ شہزادی ۷۵۔ سہیلہ بیگم۔
اُردو زبان دانی : درجہ دوم ۲۲۔ ممتاز مبین بیگم ۴۳۔ قمر جبیں ۴۴۔ طاہرہ بیگم ۴۵۔ ایچ ریحانہ بانو
اُردو دانی : کامیاب بہ امتیاز ۱۲۶۔ مختار بیگم ۱۲۷۔ بی احمد اللہ باشا

مرکز محبوب نگر: اُردو فاضل: درجہ دوم ۲۱۔ محمد حامد اُردو عالم درجہ سوم ۳۷۔ محمد یونس ۳۹۔ سراج الدین ۴۰۔ محمد [illegible]

مرکز اننت پور: اُردو فاضل: ۳۱۔ بی حمیدہ بیگم (درجہ دوم) اُردو عالم درجہ دوم ۲۱۔ محمد اسمٰعیل ۲۲۔ عبد الستار۔ درجہ سوم ۲۳۔ ایس الیاس احمد ۲۴۔ آر سید خلیل احمد ۲۵۔ محمد نور اللہ [illegible]۔ ایس انوار خان ۲۷۔ ایس فہیمہ تاج۔

اُردو دانی: کامیاب ۱۲۱۔ مہر تاج۔

مرکز نظام آباد: اُردو فاضل: درجہ دوم ۳۲۔ زاہد اللہ حسینی ۳۳۔ محمد ابراہیم ۳۶۔ محمد عبد الرشید ۳۷۔ خالد بن علی ۳۸۔ [illegible] ۳۹۔ اسما نعیم ۴۱۔ نور محمد خان۔ درجہ سوم ۳۵۔ سید قادر ۴۰۔ دردانہ صدیقہ۔

اُردو عالم: درجہ سوم ۴۸۔ محمد عبد اللطیف ۴۹۔ سید عبد الغفور ۵۰۔ معین احمد قادری ۵۳۔ فرحت النساء بیگم ۵۴۔ خدیجہ شاہین۔ اُردو دانی: کامیاب با امتیاز ۷۸۔ اسد بخاری ۷۹۔ شکیل احمد ۸۳۔ محمد بشیر الدین احمد ۸۴۔ محمد عبد الحلیم ۸۶۔ رفعت مہتاب ۸۸۔ عشرت النساء بیگم ۸۹۔ ریحانہ بیگم ۹۰۔ صفیہ رخسانہ ۹۱۔ عشرت [illegible] ۹۲۔ رفعت پروین ۹۴۔ ام سلمہ ۹۵۔ انیس فاطمہ ۹۶۔ زرینہ خاتون ۹۷۔ رضوانہ نسرین ۹۸۔ عائشہ بانو ۹۹۔ عبیدہ بیگم

کامیاب: ۷۶۔ محمد عبد المنان ۸۰۔ عابد حسین ۸۱۔ محمد احمد خان ۸۲۔ محمد عبد الظفر خان ۸۵۔ محمد فضل اللہ خان۔ ۸۷۔ بدر النساء بیگم ۱۰۰۔ ام سلیم ۱۰۱۔ عشرت فردوس ۱۰۲۔ فرزانہ شاہین۔

مرکز نرمل: اُردو عالم: درجہ سوم ۶۳۔ عائشہ صدیقہ صدیقی اکبری ۶۴۔ ممتاز بیگم ۶۷۔ مہ جبین۔ اُردو دانی۔ کامیاب ۱۰۳۔ [illegible] ۱۰۴۔ رحیم خان ۱۰۹۔ محمد سیف الدین ۱۱۱۔ نسرین بیگم ۱۱۴۔ بدر الضحیٰ ۱۱۶۔ نفیس دردانہ ۱۱۷۔ ظہور النساء ۱۱۸۔ پروین ۱۱۹۔ فاطمہ [illegible] ۱۲۰۔ شکیل احمد۔

مرکز دہلی: اُردو عالم: درجہ دوم عبد الحنان چاندنہ درجہ سوم ۲۷۔ محمد ادریس ۲۸۔ محمد سلیمان ۲۹۔ نظام الدین ۳۱۔ مزینہ خاتون ۳۲۔ شیخ عبد المتین ۳۴۔ وقار احمد ۳۶۔ رضیہ بیگم۔

اُردو دانی: کامیاب با امتیاز ۶۲۔ منیر الدین ۶۳۔ محمد ندیم ۶۸۔ محمد رفیق ۷۰۔ محمد قاسم ۷۱۔ محمد سلیم ۷۴۔ خلیل احمد۔

مرکز اماکنڈہ: اُردو زبان دانی: درجہ اول ۶۔ شیخ اصغر علی ۵۔ ین رسول صاحب درجہ سوم ۱۔ ایم امجد حسین ۲۔ ین [illegible]

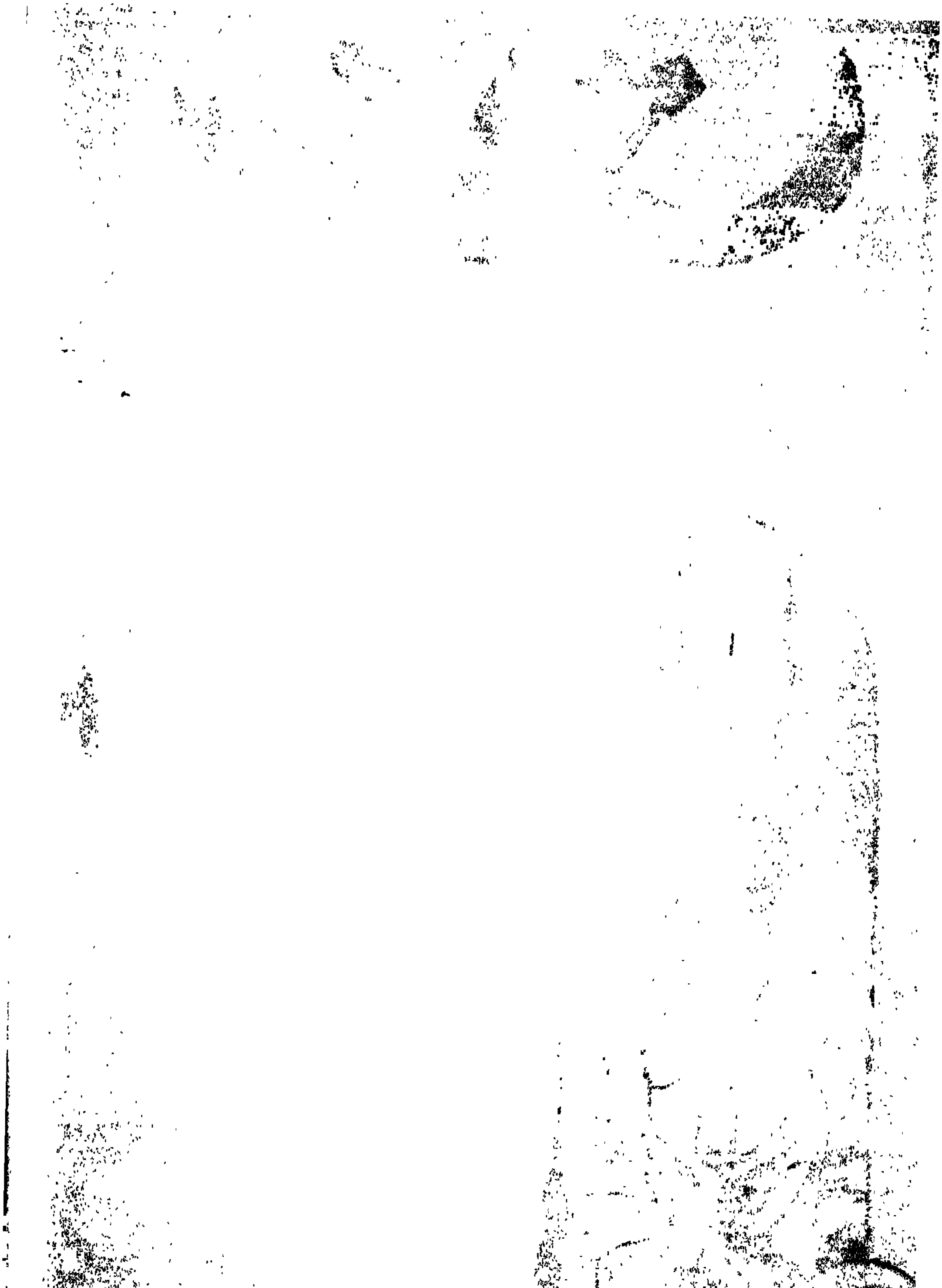
اُردو دانی: کامیاب با امتیاز ۹۔ ایم محمد شریف ۱۰۔ ایس عبد الحسین ۱۶۔ ایم امام حسین۔ کامیاب ۲۔ [illegible] بی ۵۔ ممتاز بیگم ۶۔ ایس سرس ولی ۷۔ بی لطیف صاحب ۱۱۔ ایس احمد باشا ۱۲۔ ایس عبد الرحمٰن ۱۳۔ ایم یونس باشا ۱۴۔ ایم شبیر احمد ۱۵۔ ایم لیاقت علی۔

مرکز ادونی: اُردو زبان دانی درجہ دوم ۱۔ ایم سراج احمد درجہ سوم ۷۔ سلے حسین شیم احمد ۸۔ ایس محمد عبداللہ [illegible] [illegible] بشری [illegible] ۱۲۔ [illegible] [illegible] ہاجرہ بیگم [illegible] رقیہ بی ۸۔ ایس رحیم النساء

محمد کمال الدین صدیقی

معتمد شعبۂ امتحانات ادارۂ ادبیات اردو


شماره



سن اجراء ۱۹۳۸ء فون ۴۲۶۹۰، ۲۸

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد

بنگران:
سید علی اکبر ایم اے (کینٹب)
معتمد مجلس مشاورت:
غلام جیلانی
مرتب:
وقار خلیل

جلد: ۴۱ شمارہ ۲
فروری ۱۹۷۸ء

زر سالانہ: ۱۲ روپے
ششماہی: ۷ روپے
فی شمارہ: ایک روپیہ پچیس پیسے

مجلس مشاورت:
ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
ڈاکٹر غلام عمر خاں
رحمن راہی سکینہ
عابد علی خاں
محمد منظور احمد

پرنٹر و پبلشر سید علی اکبر نے
مطبوعہ ... پرنٹنگ پریس ... حیدرآباد
بمقام ادارہ ادبیات اردو پنجہ گٹہ حیدرآباد ۴ سے شائع کیا

ترتیب

خوش آئند مستقبل کا پیام

۱. جنوب میں ہندوستان کا غلہ گودام کہلانے والی ریاست آندھرا پردیش اس بھیانک ترین طوفان کے جانکاہ صدمے سے آہستہ آہستہ سنبھالا لے رہی ہے ۔ جس نے گذشتہ سال نومبر میں ایک منحوس سنیچر کو ہمارے ساحلی اضلاع کو اپنے غیض و غضب کا نشانہ بنایا تھا ۔ متاثرہ اضلاع میں تقریباً ۳۶۰۰۴ لاکھ ایکڑ زیر کاشت رقبہ اس طوفان نے تباہ و تاراج کر دیا ۔

۲ ۔ ریاستی حکومت کی جانب سے روبہ عمل لائے جانے والے امدادی اقدامات رقمی ۵۷ر۱۷ کروڑ روپیے کا مرکز توجہ کاشت کار ہے ۔ نقصان پہنچنے والے تمباکو کے کوٹھوں کو فی کوٹھا ۵۰۰ روپیے کے حساب سے امداد دی جائے گی ۔ متاثرہ اضلاع میں کھیتی باڑی کے کام کے اور دودھیارے مویشی دیئے جائیں گے ۔ علاوہ ازیں " اسمال فارمرس ڈیولپمنٹ ایجنسی " کے قواعد کے تحت مرغیوں اور سوروں کی بھی فراہمی عمل میں لائی جائے گی ۔

۳ ۔ سمندر کی طوفانی موجوں سے متاثر ہونے والے علاقوں میں طلبا کو اسپیشل فیس اور امتحانی فیس سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے ۔ ان کے واسطے کتابوں کی مفت سربراہی کا بھی انتظام کیا گیا ہے ۔

۴ ۔ طوفان سے جن ماہی گیری کشتیوں کو نقصان پہنچا ہے ان کی درستگی کے لئے اور ضائع ہو جانے والی کشتیوں کی تلافی کے لئے اضلاع کرشنا ، گنٹور ، مغربی گوداوری ، مشرقی گوداوری ، نیلور ، پرکاشم اور وشاکھاپٹنم کے کلکٹروں کی تحویل میں ۱۰۲۸ کروڑ روپیوں کی رقم رکھائی گئی ہے ۔

۵ ۔ بنکروں کی امداد کے لئے ۹۲ر۱ کروڑ روپیے منظور کئے گئے ہیں ۔ ایک سو روپے مالیت کے دھاگے کی فراہمی کے علاوہ ہر متاثرہ بنکر کو کرگھوں کی درستگی کے لئے ۱۵۰ روپے دیئے جائیں گے ۔

ناظم محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ
حکومت آندھرا پردیش ، حیدرآباد

Mp 35/ADVT/64/1371

اپنی بات

ہماری زبان اور اُس کا ادب برِصغیر ہند و پاک کی وہ اکائی ہے جس کے رشتے مشرق اور مغرب سے یکساں استوار اور دلکش رہے ہیں۔ اُردو ادب، اس کا ثقافتی ورثہ کلاسیک سے ترقی پسندی اور پھر جدیدیت تک "ہندوستانی مزاج کا گھر آنگن رہا ہے۔ مہکتے ہی شجرِ سایہ دار، پھول، کلیاں اور پودے اس گلستانِ دانش و بینش میں پروان چڑھتے اور تخم دیتے رہے، ماہ و سال کی تمازت نے کیسے کیسے شہکاروں کو لقمۂ اجل بھی بنایا مگر دیارِ ادب کا گلستان نئے نئے پھول پتوں سے ہرا بھرا نظر آتا ہے۔

۱۹۷۸ء کیا آیا، باغِ اُردو سے زبان و ادب، علم و تہذیب، شعر و انشاء کے نامور شجر بادِ الم سے اُکھڑ گئے۔ ہنستی مہکتی زندگیاں اُجڑ گئیں، آسمانِ ادب کے چند تابناک ستارے بجھ گئے۔ ایک صدمہ ہو تو سہہ لیا جائے، دل پیٹ کر ڈھارس بندھی جائے، چند افراد کی وفیات دنیائے ادب کا صدمۂ جانکاہ ہے، جو بھی گیا ہے لگتا ہے اُس کی جگہ مشکل سے پُر ہوگی۔ سچ ہے "اللہ باقی، من کل فانی۔

■ ۱۱ر جنوری کو نامور انشائیہ نویس ادیب اور "چاند نگر" کا خوبصورت شاعر دیارِ فرنگ (لندن) میں عارضۂ فالج کے سبب ہفتہ عشرہ کی علالت کے بعد رحلت کر گیا۔ ابنِ انشاء کی وفات، شعر، سفرنامہ اور صنفِ انشائیہ کے لئے صدمہ ہے۔ سفرنامہ "چلتے ہو تو چین کو چلئے" جس کسی نے پڑھا ہے، اس صاحبِ طرز ادیب کی جدائی پر آنسو بہائے گا۔ "چاند نگر" کا یہ شاعر اسم بامسمیٰ تھا، پیارا پیارا اور من موہن، عمر ۵۱ سال تھی، نام شیر محمد، ۱۹۲۷ء میں جالندھر میں پیدا ہونے والا ابنِ انشاء طنز و مزاح کا اونچا معیار بنانے والوں میں سے ایک تھا، چند دن پہلے اپنے ہی ایک نامور معاصر ادیب ابراہیم جلیس کی المناک وفات پر ابنِ انشاء کا دل میں اُتر جانے والا مضمون ہم میں سے بہتوں نے پڑھا ہے۔ ابنِ انشاء کی غزلیں دلوں کو چھیڑتی ہیں، طرزِ ادا کی چمک دمک کیا کہنے، خدا بخشے اور پسماندوں کو صبرِ جمیل کی توفیق ملے۔

■ ۸ر جنوری کو کراچی میں نامور نقاد، افسانہ نگار اور مشرق و مغرب کے ادبی نکات کے رمز شناس محمد حسن عسکری اڑ سال کی عمر میں اللہ کو پیارے ہو گئے، عسکری مرحوم فرانسیسی اور انگریزی ادبیات پر خاص نظر رکھتے تھے، اُن کے کتنے ہی مقالوں سے اُردو تنقید عبارت ہے اور ان زبانوں پر کامل عبور بھی رکھتے تھے، اسلامیہ کالج کراچی کے شعبۂ انگریزی سے وابستہ تھے۔ "ستارہ اور بادبان" "انسان اور آدمی" عسکری مرحوم کے وہ تنقیدی مطبوعات ہیں، جو کہ مطالعہ سے متعلق تنقید کا یہ علمی حق ثابت ہوا ہے۔ مغربی علوم اور ادب کو اُردو دنیا سے متعارف کرانے کا سہرا کلیم الدین احمد کے بعد

حسن ملک کا کے سنسر رہا۔ افسوس تو اس کا ہے کہ پیک اجل نے انھیں اس وقت تاکا جب وہ کالج جارہے تھے کہ دل کا دورہ پڑا اور راستہ ہی میں جاں بحق ہوگئے، ایک افسانہ نویس کی ذات پل جھپکنے کہانی بن گئی۔ پیشۂ تدریس کے بعد لکھنے پڑھنے اور تنقید و تحقیق کے لئے اپنی زندگی کو وقف کرنے والا ایک محبوب نقاد بساطِ ادب سے رخصت ہوگیا، خدا بخشے، خوبیاں یاد رہیں گی

■ ۲۰ فروری کی تاریک شب میں ادبِ اطفال کے اُفق کا ایک مہتاب ماند پڑگیا۔ شفیع الدین نیّر نے تادمِ واپسیں بچوں کے شعری و نثری ادب کی صلہ و ستائش سے بے نیاز ہوکر خدمت انجام دی، نصف صدی تک ان کا قلم پھول کلیاں مہکاتا اور چاند ستارے چمکاتا رہا۔ ہندوستان جنت نشان کے گیت گنگناتا اور ننھوں کے جی کو لبھاتا رہا۔ کتنے ہی بڑے ایسے ہیں جنھوں نے نیّر کی تحریریں پڑھ کر لکھنا سیکھا، وہ ۹ فروری ۱۹۰۲ء میں پیدا ہوئے، زندگی بھر سخت محنت کو شعار بنایا۔ اپنی دنیا اور اپنا مقام خود بنایا۔ ملک کی قومی درسگاہ "جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی" میں معلم کی حیثیت سے اُردو تعلیم کے چراغ کو روشن رکھا۔ تقریباً چھ درجن کتابیں لکھیں۔ کیا نثر اور کیا نظم، نیّر کا قلم چندے آفتاب چندے ماہتاب تھا۔ خدا ترس، وضعدار، سادہ مزاج، مخلص اور اپنے دھن کے پکے قلندر، بچوں کی نفسیات کے گویا رازداں تھے۔ اسمٰعیل میرٹھی، محمد حسین حسان، تلوک چند محروم اور حامد اللہ افسر ایسے ارباب عناصر کا شفیع الدین نیّر "عطرِ مجموعہ" تھے، وہ حیات تھے تو گویا تھا ہمارے بچوں کے ادب کا ایک قافلہ باقی ہے۔ نیّر صاحب کی وفات ایک دبستان کی رحلت ہے۔ زندگی کے آخری دنوں میں جب وہ حیدرآباد تشریف لے گئے تھے تو ادارۂ ادبیاتِ اُردو کا بھی معائنہ کیا تھا، ڈاکٹر زورؔ اور ادارہ کے کاموں کی بڑی تعریف کرتے تھے، خدا بخشے اور پسماندوں کو صبرِ جمیل عطا کرے۔

■ ۷ فروری کو اُردو کے ایک بزرگ سخنور پروفیسر صوفی غلام مصطفےٰ تبسّم کا لاہور میں انتقال ہوگیا۔ لاہور کے "زندہ دلان" کی ایک معتبر اور معطر شخصیت کے اُٹھ جانے کا صدمہ اربابِ دکن کو بھی نم دیدہ کئے ہوئے ہے۔ تبسّم مرحوم ذاتی سے انجمن کا درجہ رکھتے تھے، اُردو، فارسی اور پنجابی ادبیات پر ان کی عالمانہ نظر تھی۔ خسروؔ غالبؔ اور اقبالؔ کے اُردو تراجم ان کی یادگار کاوشیں ہیں، جن سے استفادہ کرنے والے اربابِ فکر انھیں یاد رکھیں گے۔ بچوں کے لئے سلیس اور شیریں نظمیں لکھ کر تبسّم صاحب نے ادبِ اطفال کو مالا مال کیا، ۱۸۹۹ء میں امرتسر میں پیدا ہونے والا پنجابی نژاد "اردو زادہ" اعلیٰ عہدوں پر متمکن رہ کر زبان و ادب اور تہذیب و ثقافت کی خدمت کرتا رہا اور پھر جب بلاوا آیا تو لبیک کہہ کر رخصت ہوگیا خدا صوفی مرحوم کی قبر کو منوّر رکھے۔

■ "دبستانِ سیماب" کا کیسا روشن، کیسا تابناک اور معطر ستارہ ۹ فروری کو بمبئی کے اُفقِ ادب پر دم توڑ گیا۔ اعجاز صدیقی کی صفات وضعداری، شرافت، مشرقی اور ہندوستانی گنگا جمنی کلچر، صحافت، سخنوری اور انسانی ستودہ صفات کی موت ہے، سیماب اکبرآبادی کے گلشنِ ادب کا کیسا مہکتا شجر کٹ گیا، وائے افسوس، سیماب، ایسے استادِ سخن کی روایت کو اعجاز صدیقی نے اکبرآباد سے برصغیر ہندو پاک میں اپنی ذہانت و فطانت اور شریفانہ سلوک کے سبب برقرار ہی نہیں تابندہ تر رکھا۔ ماہنامہ شاعر کو صفِ اول کے جریدوں میں جو مقام ملا ہے، اُس کے لئے اعجاز مرحوم کی فعال صلاحیتوں کو بڑا دخل رہا ہے۔ کتنے ہی نئے لکھنے والوں کو اعجاز نے متعارف کرانے اور آگے بڑھانے میں، اعجاز صاحب نے شاعر کے ذریعہ اہم رول ادا کیا ہے۔

نقد' ادارہ اور سب رس کے قدر داں تھے ۔ ادبی صحافت میں "شاعر" کا کردار تاریخی حقیقت کی حیثیت سے یاد رہیگا
صدیقی شعری و ادبی حلقوں میں یکساں طور پر قابلِ احترام رہے ۔ بہ حیثیت سخنور وہ قادر الکلام اور اپنے اسلوب کے
بیان شاعر تھے ، بمبئی جیسے شہر میں آن بان سے زندگی گذارنا اور پھر "شاعر" کے ضخیم اور یادگار شمارے نکالتے رہنا اعجاز صدیقی کا ایسا
نامہ کہلائے گا جس کا آج کے حالات میں اعادہ سہل نہیں ۔ ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوئے ، شعری اور ادبی ماحول میں تادم
یں مصروف رہے ، صحت کی خرابی کے باوجود زندگی بھر شعر و ادب کے لئے جی داری سے سرگرم عمل رہے ۔ اُردو زبان و
ب کی ترقی میں مہاراشٹرا اردو اکیڈمی کے رکن کی حیثیت سے بھی اعجاز مرحوم نے سرگرمی دکھائی ، خدا بخشے اور پسماندوں کو
ی توفیق ہو ، "شاعر" کی اشاعت یقینی ہے کہ مرحوم کے قابل اور مستعد صاحبزادے (ناظر نعمان اور افتخار امام) اپنے والدِ
نادر ذاد کی یادگار کے طور پر برقرار رکھیں گے "سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے" کے مصداق اعجاز مرحوم کا مشن
ی رہے گا۔

■ ۱۲/ فروری کو اُردو کے باوقار ادبی ڈائجسٹ "شاہکار" الہ آباد کے ایڈیٹر، مشہور صحافی اور گاندھی وادی دانشور
ب محمود احمد ہنر (۶۱) سال کی عمر میں رحلت کر گئے ۔ ایک مخلص اچھے اوصاف کے حامل اور سلیقہ شعار معاصر کی وفات
م تم دیدہ ہیں ۔ خدا مغفرت فرمائے (آمین)

اِس بار "سب رس" کی مشمولات میں اُردو کلاسیک سے عصری ادبی رجحان اور زبان و تعلیم کے مسائل
بعد اہم تخلیقات شامل ہیں۔

مستقل عنوانات کے تحت منتخبات بھی چھپ رہی ہیں ۔ "سب رس" مارچ "یوم محمد قلی قطب شاہ" نمبر کی
صورت میں شائع ہوگا۔ ادارۂ ادبیاتِ اُردو کی طرف سے سہ روزہ "یوم محمد قلی قطب شاہ" کی سولہویں سالانہ تقاریب ۱۲ ار
۱۴ ار مارچ کو منعقد ہو رہی ہیں۔

غلام جیلانی

ضروری اعلان

"سب رس" برصغیر کا واحد ادبی ترجمان ہے جو کم قیمت میں بہتر ادبی مواد اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کرتا رہا ہے۔

ادارہ کی مجلسِ مشاورت نے طے کیا ہے کہ اگلے شمارہ مارچ ۱۹۷۸ء سے سب رس کا زرِ سالانہ طباعت اور کتابت کے میٹریل کی مہنگائی کے پیشِ نظر پندرہ روپے (15/=) کر دیا جائے۔

امید ہے سب رس کے باذوق خریدار اور بہی خواہ اس اضافہ کو قبول کریں گے اور اپنے تعاون سے محروم نہیں کریں گے۔ وہ اصحاب جن کے ذمہ نئے سال کا زرِ سالانہ ادا طلب ہے "نئی شرح" میں جلد ادا کر کے خدمت کا موقع دیں۔ (ادارہ)

مسعود دہلوی

رجب علی بیگ سُرور اور فسانۂ عجائب

رجب علی بیگ سُرور کے والد کا نام مرزا اصغر علی بیگ تھا۔ ان کی سنِ پیدائش کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ حامد حسن قادری لکھتے ہیں "غالباً ۱۲۰۲ھ / ۱۷۸۷ء (مرزا غالب سے دس برس پہلے) پیدا ہوئے تھے۔ سُرور لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ سُرور کے معاصر تذکرہ نگار بھی ان کو لکھنوی لکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ جس طرح سُرور فسانۂ عجائب میں لکھنؤ کی تعریف کرتے ہیں اس سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ سُرور لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ "شگوفۂ محبت" کے دیباچہ میں سُرور لکھتے ہیں

"نا سازیٔ بخت اور نیرنگیٔ زمانہ سے نہ عربی میں دخل ہوا نہ فارسی میں کامل ہوا۔ دونوں سے ناآشنا رہا۔ ایک کا بھی علم نہ حاصل ہوا۔ پست ہمتی سے اردو کے لکھنے میں اوقات بسر کی۔ کچھ دن نظم کا اہتمام رہا، شعر کہنے کا خیالِ خام رہا جب وہ بھی نہ ہوسکا نثر کی طرف خیال آیا۔"

اس بیان میں سُرور نے اپنی تعلیمی اور ادبی زندگی کا مختصر خاکہ کھینچا ہے۔ سُرور کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فارسی سے بخوبی اور کم سے کم کام چلانے بھر عربی سے واقف تھے۔ انہوں نے فارسی شاعری کا کافی مطالعہ کیا تھا اور فارسی کے بیشتر ممتاز شاعروں کا کلام ان کی نظر سے گذر چکا تھا۔ فارسی کے جو انشاپرداز ہندوستان میں مقبول تھے ان کو سُرور نے یقیناً غور سے پڑھا تھا اور ان سے متاثر بھی ہوئے تھے۔ یہی سبب تھا کہ انہوں نے اپنے لئے اردو نثر کا رنگین اسلوب پسند کیا۔ سُرور کے عہد میں اگرچہ بڑی حد تک اردو فارسی پر حاوی آچکی تھی اور پڑھا لکھا کہلانے کے لئے فارسی ادبیات سے واقفیت نہایت ضروری تھی۔ سُرور نے بھی یہ واقفیت بہم پہنچائی تھی۔ مگر فارسی لکھنا سُرور کو نہ آسکا تھا۔ عربی میں سُرور کی لیاقت معمولی تھی۔ اس زبان میں ان کی تعلیم غالباً کلامِ پاک کے رسمی مطالعہ اور چند ابتدائی درسی کتب تک محدود تھی۔

اُردو زبان و ادب میں سُرور نے واقعی دستگاہ بہم پہونچائی تھی۔ اُن کا مطالعہ وسیع تھا۔ اور شاعری کا بھی انہوں نے اچھا مطالعہ کیا تھا۔ سُرور خود بھی شاعر تھے اس لئے انہوں نے استفادہ کی غرض سے بھی اس کا مطالعہ کیا ہوگا۔ شاعری کے علاوہ سُرور کو داستانوں اور افسانوی ادب سے خاص دلچسپی تھی۔ فسانۂ عجائب کے لئے انہوں نے جو داستان ترتیب دی وہ اس کا ثبوت ہے کہ اس عہد کی تقریباً تمام داستانیں ان کی نظر سے گذر چکی تھیں۔

سُرور کثیر التصانیف تھے۔ خطاطی میں مہارت رکھتے تھے۔ اعلیٰ درجہ کے خطاط تھے۔ اس فن میں انہوں نے مشہور خطاط حافظ محمد ابراہیم سے تعلیم حاصل کی۔ تذکرہ نویس، فن خوش نویسی کے بڑے ماہر استاد تھے۔ موسیقی میں بھی کمال رکھتے تھے۔ شاعری

انا فاضل حسین کے شاگرد تھے ۔ نہایت ظریف، زندہ دل، خوش رو، خوش خو آدمی تھے ۔

سرور کے عہد میں فن سپہ گری کا بھی رواج تھا ۔ چنانچہ انہوں نے اس فن کو بھی حاصل کیا ۔ وہ محض نمائش کے لئے ہتھیار نہیں رکھتے تھے بلکہ جنگجو انسان کی طرح ان کا استعمال بھی کرتے تھے ۔ ۱۸۱۲ء کے آس پاس سرور کی شادی ہوئی ان کی اہلیہ کسی دولت مند گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں ۔ وہ سرور کی بہت وفادار اور چاہنے والی بیوی تھیں ۔ سرور نے بیوی کی دولت کے بل بوتے پر خاصے عیش کئے ۔ ۱۸۱۲ء

سرور نے جس انداز سے لکھنؤ کی جزئیات کا تذکرہ کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اس شہر طرب کا پورا لطف اٹھایا تھا ۔ اور ہر ہر طرح سے لکھنؤ کی بھرپور سیر کی تھی ۔ وہ کھانے پینے کا بہت شوقین ہے ۔ اور بخوبی جانتا ہے کہ کونسی چیز کہاں اور اچھی بنتی ہے ۔ وہ نان بائیوں اور نانبائیوں کے ذکر میں بہت دلچسپی رکھتا ہے ۔ میلہ ہو یا چوک کا بازار وہ ہر جگہ دخیل ہے ۔

۱۸۲۴ء میں غازی الدین حیدر نے کسی بات سے ناراض ہو کر انھیں جلا وطن کر دیا ۔ چار و ناچار سرور لکھنؤ کی سرزمین کو چھوڑ کر کانپور آ گئے ۔ سپہ گری اور شمشیر زنی کے فن سے واقف ہی نہیں تھے بلکہ اس کو برتتے بھی تھے ۔ اور شاید اسی کے نتیجہ میں وہ ایک قتل میں ملوث ہو گئے ۔ واقعہ کی تفصیلات معلوم نہ ہو سکیں صرف مرزا احمد علی کے نام سرور کے ایک فارسی رقعہ میں اس کی طرف اشارہ ملتا ہے ۔ جس کا ترجمہ یہ ہے :

"میرا حال تمہیں یاد ہوگا کہ خون (کرنے) کی علت میں گرفتار ہو گیا تھا ۔ ساری دنیا کہتی تھی کہ اس مخمصے سے زندہ نہ بچے گا لیکن بفضل خدا میرا کچھ نہ بگڑا ۔ اب تک زندہ و سلامت ہوں ۔"

سرور کے بیان سے یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ یہ واقعہ کب کا تھا ۔ لیکن ممکن ہے کہ اس کے نتیجہ میں ہی انہیں کانپور جانا پڑا ہو ۔ اس زمانے میں کانپور انگریزی عملداری کی حیثیت رکھتا تھا ۔ اور اکثر شاہی مجرموں کو جلا وطنی کی سزا دے کر دریائے گنگا کے پار اتار دیا جاتا تھا اس کے علاوہ کانپور چونکہ اودھ کی حدود میں شامل نہیں تھا اس لئے بعض اوقات قانون کی زد پر آئے ہوئے لوگ عتاب شاہی سے بچنے کے لئے بھی کانپور کا رخ کرتے تھے ۔ اس زمانے میں کانپور مجرموں کا زنداں بھی تھا اور ملزموں کی جائے پناہ بھی ۔ لوگ وہاں سزا کے طور پر بھیجے جاتے تھے اور سزا سے بچنے کیلئے بھی جاتے تھے ۔

یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ سرور، غازی الدین حیدر کے حکم سے جلا وطن کر کے بھیجے گئے تھے یا لکھنؤ سے فرار ہو کر خود جلائے وطن اختیار کر کے وہاں پہونچے تھے ۔ البتہ سرور کے ایک بیان سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ وہ خود ہی کانپور چلے گئے تھے ۔ سرور کا یہ کہنا کہ ان کو تلاش معاش کے سلسلہ میں کانپور جانا پڑا، اسی بات کی طرف اشارہ کرتا ہے ۔ یعنی ان کا حیلہ تو یہ تھا کہ وہ روزگار کی تلاش میں کانپور جا رہے ہیں لیکن اصل مقصد گرفت سے بچنا تھا ۔ بہرحال سرور کو لکھنؤ شہر ان کے لئے شہر ممنوع ہو گیا ۔

کانپور میں شہر کی قلت اور رذیلوں کی ریل پیل تھی ۔ سرور جیسے تماش بین اور زندہ دل شخص کو وہاں کے جبری قیام میں کیسے ذہنی کرب میں دوچار ہونا پڑا ہوگا ۔ وہاں کے رہنے والے سرور کو ایک آنکھ نہ بھاتے تھے ۔ وہ کوفت اٹھا اٹھا کر ہلکان ہوئے جا رہے تھے ۔

"فسانۂ عجائب" کے مرتب اطہر پرویز کہتے ہیں کہ میرا قیاس کہتا ہے کہ ۱۸۲۴ء میں جب وہ کانپور گئے تو اس وقت وہ قتل سے بری ہو چکے تھے لیکن مقتول کے متعلقین کی دشمنی کی وجہ سے ان کے لئے لکھنؤ کا قیام خطرے سے خالی نہ ہوگا ۔ غالباً اسی وجہ سے کانپور کے قیام کا زمانہ گوشہ نشینی میں گذرا کیونکہ اس قسم کی دشمنی کی مثالیں اس عہد میں بہت ملتی ہیں ۔

کانپور کے اس قیام میں حکیم سید اسد علی کی ذات ان کے لئے بڑا سہارا تھی ۔ وہ سرور کی غمخواری کرتے اور ان کی تکالیف دور کرنے کی تدبیریں کرتے ۔ ان کا یہ گوشہ نشینی کا زمانہ ادب کے حق میں فال نیک ثابت ہوئی ۔ حکیم اسد علی کی غمخواری سے سرور کو بہت تک ذہنی سرور ملا کرتی

تصنیف و تالیف کی صلاحیت پھر عود کر آئی۔ اور انہوں نے اپنی اوّلین تصنیف "فسانۂ عجائب" لکھی۔ لیکن لکھنؤ کی یادیں ابھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑ سکتی تھیں۔ اور ان ہی یادوں کے ہجوم میں اس داستان کی یاد ابھر کر سرور کے سامنے آئی جو انہوں نے لکھنؤ میں اپنے دوستوں کی صحبت میں سنائی تھی۔ چنانچہ سرور نے "فسانۂ عجائب" ۱۲۴۰ھ کے اندر اندر مکمل کرلی اور نصیر الدین حیدر کے عہد میں سرور اپنے وطن لکھنؤ واپس آ گئے۔

سیاسی سماجی اور تہذیبی پس منظر:

فسانۂ عجائب ۱۸۲۴ء میں تصنیف کی گئی۔ اس زمانے کے سیاسی حالات پر جب ہماری نظر پڑتی ہے تو غازی الدین حیدر کا وہ زمانہ سامنے آتا ہے جس میں معاشرہ کی سرشت عیش کوشی اور آرام پسندی ہو چکی تھی۔ جدوجہد سے قوم نابلد تھی۔ کاہلی اور کسالت اپنے نقطۂ عروج کو پہونچ چکی تھی۔ قصے کہانیوں اور داستان گوئی کا دور تھا۔ اپنے عہد کی داستانیں سن کر لوگ اس تصوراتی اور تخیلاتی دنیا کی پرواز کرنے لگتے تھے۔ جہاں عمل سے زیادہ رومان اور احساسِ برتری کی خوش گوار ہوائیں چل رہی تھیں۔ رومان انسانوں کے تخیل پر چھا چکا تھا۔ اس زمانے کے معاشرے، ادب، تہذیب و تمدن کی روح رومان ہی کو تصور کیا جاتا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ زبان کی سحرکاری و پرکاری پوری تمکنت کے ساتھ رگ و پے میں پیوست ہو چکی تھی۔

تصورات اور تخیلات کے ان محلوں میں پائیداری تو نہ تھی مگر ظاہری بناؤ سنگھار، رکھ رکھاؤ، اور شان و شوکت اپنے پورے حسن و جمال کے ساتھ موجود تھی۔ جس میں کیف و نشاط کا لامتناہی سلسلہ ہوتا تھا۔ جس سے باہر نکلنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ جب کوئی معاشرہ زوال پذیر ہوتا ہے تو اس کے افراد اس طرح کے جھوٹے نشے میں مخمور ہو جاتے ہیں اور اپنے عہد کے فطری تقاضوں کے خلاف مصنوعی تقاضوں کو پورا کرنا اپنا فرضِ اوّلین سمجھتے ہیں۔ لازمی بات ہے کہ اس انحطاط پذیر دور کا اثر زمانے کی تخلیقات پر شعوری یا غیر شعوری طور پر رونما ہوتا ہے۔ یہی سیاسی فضا لکھنؤ اور اس کے قرب و جوار میں پائی جا رہی تھی۔ جس کا اثر وہاں کی تہذیب و تمدن، رہن سہن، رفتار گفتار، خورد و نوش، لباس و پوشاک ذہن و دماغ پر پوری طرح پڑ رہا تھا۔

رجب علی بیگ سرور کا یہ شاہکار اس زمانے کی یادگار ہے جب انھیں لکھنؤ سے جلا وطن کر دیا گیا تھا۔ اپنے وطن سے دور رہ کر ایک وطن دوست انسان شدید قسم کا وطن پرست اور سچا محبِ وطن بن جاتا ہے۔ اپنے وطن کی تہذیب و تمدن، رہن سہن، بول چال، افراد اشخاص سے والہانہ محبت ہو جاتی ہے۔ بات بات میں وطن یاد آتا ہے، کم و بیش یہی کچھ عالم سرور پر بھی گزرا۔ جس کے باعث وہ مجبور ہو کر ایک شدید قسم کے وطن پرست بن گئے۔ انہوں نے ایک ایسی کتاب تصنیف کی جس کے ہر لفظ اور ہر جملے سے لکھنویت ٹپکتی و جھلکتی ہے۔ لکھنوی اندازِ بیان، لکھنوی طرزِ ادا جگہ جگہ پر نمایاں ہے۔

فسانۂ عجائب:

فسانۂ عجائب سرور کی پہلی نثری تصنیف ہے۔ سرور کی ادبی زندگی کا آغاز یوں تو اس کی تالیف سے پہلے ہو چکا تھا لیکن اس وقت تک ان کی ادبی سرگرمیاں شعر گوئی تک محدود تھیں۔ لیکن "فسانۂ عجائب" نے منظر عام پر آکر ایک صاحب طرز نثار کی حیثیت سے اتنا مشہور کر دیا کہ پھر وہ نثر ہی کا ہو کر رہ گئے۔ "فسانۂ عجائب" سرور کا پہلا تجربہ تھا اور اس میں ان کو اتنی زبردست کامیابی حاصل ہوئی کہ اگر اس کے بعد بھی وہ کچھ نہ لکھتے تو ان کی شہرت میں کوئی کمی نہ آتی۔ ہر فن کار کا شاہکار عموماً ایک ہی فن پارہ ہوا کرتا ہے۔ جو اس کی جملہ فنی خوبیوں پر محیط ہوتا ہے۔ سرور کا شاہکار فن پارہ "فسانۂ عجائب" ہے۔ اور سرور کے قلمی آثار میں اس کو منفرد حیثیت حاصل ہے۔ "فسانۂ عجائب" نے سرور کو ادب میں مستقل جگہ

ایک مدت تک یہ کتاب ذہنوں پر چھائی رہی۔ اور ایک مدت تک اس کا اسلوب نثر نگاروں کے لئے مشعلِ راہ بنا رہا۔ فسانۂ عجائب کا سن ۱۲۴۰ھ ہے۔

"فسانۂ عجائب" کو جو شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی وہ خاص طور پر اس کی زبان کی بدولت تھی۔ سرور کی شعوری کوشش یہی تھی کہ کتب کی زبان اور اسلوب عام فہم رہے۔ اسی وجہ سے سرور نے فسانۂ عجائب میں سادہ سلیس زبان استعمال کی ہے۔ جس میں بیان کے سوا دوسری رنگینیوں اور بے ضرورت لفاظیوں سے کام نہیں لیا۔ اور نہ اردو کے بنیادی اسلوب کو ہاتھ سے جانے دیا ہے۔ لیکن یا وہ صنعت گری اور مشکل نگاری پر اتر آئے ہیں۔ ایسے موقعوں پر سرور کو خود اپنی غلط روی کا احساس ہو جاتا ہے اور وہ یک بیک چونک کر ہموار پر چلنے لگتے ہیں۔ یہی فسانۂ عجائب کا بنیادی اسلوب اور اس کی اصل زبان ہے جس کو سرور نے پورے فسانہ میں برتا ہے اور یہی سبب ہے کہ قافیہ بندی اور رنگینی کے التزام کے باوجود مجموعی طور پر فسانۂ عجائب کا اسلوب اور زبان مشکل نہیں ہے۔ اس کتاب کی مقبولیت بڑی حد تک اس کی زبان اس زمانے کے لکھنؤ کی معیاری زبان ہے اور اس کا اسلوب اردو کا بنیادی اسلوب ہے۔

شگفتگی سرور کی تحریر کا خاص جوہر ہے جو فسانۂ عجائب کے قاری کو قدم قدم پر یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کا لکھنے والا ایک زندہ دل بشاش انسان ہے۔ قافیہ بندی اور لفظی صنعتوں کی وجہ سے فسانۂ عجائب کے مطالعہ میں کہیں کہیں پر جو ایک کسل سا محسوس ہونے لگتا ہے انداز بیان کی شگفتگی اسے دور کرتی چلتی ہے۔ فسانۂ عجائب کی سب سے اہم خصوصیت اس کا ہندوستانی مزاج ہے۔ یہ ہندوستانی مزاج یا قصہ میں نظر آتا ہے بلکہ پلاٹ کی بناوٹ میں بھی اس کا اثر نمایاں ہے۔

سرور حسب موقعہ زبان اختیار کرنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ جب بادشاہ کے ہاں فرزند پیدا ہوتا ہے اور بادشاہ شہزادے کا جنم پترا بنانے کو نجومیوں اور پنڈت کو بلاتا ہے تو سرور پنڈتوں کی مخصوص زبان و اصطلاحات لکھتے ہیں:

"نجومی، پنڈت، جفرداں حاضر ہوئے، بہت سوچ بچار کر برہمنوں نے عرض کی، مہاراج کا بول بالا رہے، جاہ و حشم، مرتبہ دو بالا رہے۔ ہماری پوتھی کہتی ہے، بھگوان کی دیا سے شہزادہ کا چندرمان بلی ہے وغیرہ وغیرہ۔"

مختلف لوگوں کی اصطلاحیں، شریف و رذیل کا طرز کلام، اہل بازار کی گفتگو وغیرہ مختلف اجزائے فسانہ، مناسب زبان و بیان میں ادا کئے ہیں۔ فسانۂ عجائب اس مخصوص اسلوب تحریر کی پہلی، بہترین و مکمل تصنیف ہے۔

ماحصل تبصرہ:

اردو کے نثر نگاروں میں سرور بہت نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کو بلا تامل اردو کے صاحب طرز نثر نگاروں کے زمرے میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ ان کا مخصوص طرز نگارش ایک مدت تک ذہنوں پر چھایا رہا اور یہ بات بلا خوف و تردد کہی جا سکتی ہے کہ اردو میں سرور سے پہلے کسی نثر نگار کے اسلوب نے لوگوں کو متاثر نہیں کیا اور سرور کے بعد ہر کسی کی پیروی نہیں کی گئی۔ فسانۂ عجائب کی اشاعت نے اردو نثر کا ایک نیا صحفہ کھول دیا۔ اگرچہ سرور اس اسلوب کے بانی اور موجد تو نہیں تھے لیکن سرور نے نثر رنگین کا جو اسلوب پیش کیا اور جو مقام حاصل کر لیا اس لئے سرور کو نثر رنگین کا موجد تو نہیں لیکن سب سے اہم نمائندہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے زبان کو شائستہ بنایا، اور خوبصورت مضمون کو طرح طرح سے آراستہ کر کے اردو میں انشاپردازی کی روایت کو مستحکم کیا۔

شرر کا عہد جس اسلوب کا طالب تھا اور جس اندازِ اظہار کو سب سے زیادہ پسند کرتا تھا، شرر نے وہی اسلوب مکمل شکل میں پیش کیا۔ اور یہی شرر کی مقبولیت کا راز تھا۔ شرر کے اسلوب نے کم از کم ایک پوری نسل کو متاثر کیا اور اردو نثر میں کم سے کم ایک عشرہ تک ان کے رائج کئے ہوئے طرزِ نگارش کی پیروی ہوتی رہی۔ یہ بہت بڑی کامیابی اور ادبی خدمت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو ادب کا مورخ ان کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

شرر کے اسلوب کے سلسلہ میں پروفیسر مسیح الزماں لکھتے ہیں:

"شرر کا کمال اور ان کے فن کی کامیابی یہ ہے کہ مروجہ پابندیوں کے باوجود ان کی عبارت میں ایسی بے ساختگی اور شگفتگی باقی ہے کہ عبارت میں الجھن پیدا نہیں ہوتی۔ ہمارے نزدیک اپنے رنگ کی کتابوں میں "فردوسِ بریں" کو جو امتیاز حاصل ہے اس کی یہی وجہ ہے کہ اس کی عبارت میں تصنع اور تکلف ہونے کے باوجود ایسی خیرہ اور دلکشی ہے کہ آدمی کو اس کے پڑھنے میں الجھن نہیں ہوتی اور زیادہ تر جگہوں پر یہ محسوس نہیں ہوتا کہ وہ کسی خاص کوشش سے لکھی گئی ہے ۔"

●●

۱۸۵۷ء سے پہلے اردو ادب میں داستانوں کا دور رہا ہے۔ داستانوں کے شباب کا زمانہ ۱۸۰۰ء سے ۱۸۲۵ء تک پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ہندوستان سیاسی، معاشی اور سماجی حیثیت سے بڑی ہی پستی میں چلا گیا تھا۔ چونکہ اس زمانہ میں ادب کی سرپرستی دربار ہی میں ہوتی اور ادیب دربار سے متوسل ہوا کرتے اسی لئے ہماری اکثر اہم اور بڑی داستانیں کسی بادشاہ یا امیر کی فرمائش پر لکھی گئی ہیں۔ چونکہ بادشاہ یا امیر بالکل بے دست و پا ہو گئے تھے اسی لئے وہ کسی خیالی دنیا میں کھو جانا چاہتے تھے۔ ان میں حقائق سے آنکھیں چار کرنے کی تاب نہ تھی۔ انھیں تو بس "افیون" چاہئے تھی۔ داستانیں ایک گوشۂ بیخودی پیدا کرنے میں جس طرح معاون ہو سکتی تھیں۔ وہ غالب کے ایک خط سے ظاہر ہے۔ جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ "دنیا سے بے فکر اور بے تعلق کرنے کے لئے ان کے پاس "اودھ نامہ" کی دو بوتلیں ہیں اور پانچ جز داستانِ امیر حمزہ" کیونکہ داستانوں میں ایسا ماحول اور فضا پیش کی جاتی ہے جن سے حقیقی دنیا کے تلخ حقائق سے دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا۔ ہر داستان میں مافوق الفطرت عناصر کی بہتات ہوتی، قصہ در قصہ ہوتا، غیر ضروری عبارت آرائی ہوتی، عیش و نشاط کی محفلیں ہوتیں، امن و سکون ہوتا، غرض وہ سب کچھ ہوتا جو خیال میں آسکتا ہے اور جس کی تمنا کی جا سکتی ہے۔ لیکن داستانوں میں دو باتیں ایسی ہوتی ہیں جن سے اس زمانے کے کرب پر روشنی پڑتی ہے۔ آغاز میں باوجود "شاہ کر دوں وقار کو سب کچھ حاصل ہونے کے کسی ایک چیز کی ایسی حسرت رہتی ہے جو اس کے سارے عیش و طرب کو خاک کر دیتی ہے۔ یہ تمنا آبِ حیات کے لئے ہوتی ہے یا کسی شہزادی کے لئے ہوتی ہے یا "نام لیوا، پانی دیوا" نہ ہونے کی وجہ سے۔ داستانوں کے آخر کا جملہ بہت زیادہ معنی خیز ہوتا ہے اور اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ جو داستان تاسر اپا تکلیف ہو ہر دل میں جاگزیں ہو گئی تھی۔ (بیسویں صدی میں اردو ناول — ڈاکٹر یوسف سرمست)

ڈاکٹر سید حامد حسین

فورٹ ولیم کالج کی اردو خدمات

فورٹ ولیم کالج ۱۸۰۰ء میں لارڈ ویلزلی کے حکم سے کلکتہ میں قائم ہو گیا تھا۔ اس کالج کا مقصد ان انگریزوں کو تعلیم دینا جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین کی حیثیت سے ہندوستان میں کام کرنے کے لئے آتے تھے۔ کیونکہ کمپنی کے مقبوضات میں نئے ذمہ داریاں سنبھالنے کے لئے یہ نہایت ضروری تھا کہ وہ ہندوستان کی زبان، یہاں کے رسم و رواج۔ یہاں کی تاریخ وغیرہ اور یہاں نافذ قوانین وغیرہ سے بخوبی واقفیت حاصل کریں۔ چنانچہ اس کالج کے قیام کے ساتھ ساتھ یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہندوستان آکر ملازمت کرنے والے ہر انگریز کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ فورٹ ولیم کالج میں داخل ہو کر مناسب تربیت حاصل کرے۔ اس کے بعد ہی یہ طے کیا جائے گا کہ وہ کس عہدے پر اور کس صوبے میں تعینات کیا جا سکتا ہے۔

کالج میں یونانی، لاطینی اور یورپ کی جدید زبانوں اور انگریزی ادب کے علاوہ عربی، فارسی، ہندی، سنسکرت، بنگالی، مراٹھی، تامل اور کنڑی زبانوں کی تعلیم کا انتظام کیا گیا تھا۔ ان کے ساتھ ساتھ ہندو اور مسلم قوانین، اخلاقیات، معاشیات جغرافیہ، ریاضی، تاریخ اور سائنسی علوم وغیرہ کی تعلیم کی سہولتیں بھی بہم پہنچائی گئی تھیں۔

کالج میں مشرقی زبانوں خاص طور پر ہندوستانی اور فارسی تعلیم پر زیادہ توجہ صرف کی جاتی تھی تاکہ نو وارد انگریز ان زبانوں پر ضروری قدرت حاصل کر سکیں۔ کالج میں ڈاکٹر جان گل کرسٹ کو ہندوستانی کا پروفیسر بنایا گیا تھا اور ان کے تحت چیف کی حیثیت سے کام کرنے کے لئے میر بہادر علی حسینی کا تقرر کیا گیا تھا۔ ابتداء میں فارسی کے بیس اور ہندوستانی کے بارہ[12] منشی ہوئے تھے جو پروفیسر کی اعانت کرتے اور مناسب نصابی کتابیں تیار کرتے تھے لیکن بعد میں ضرورت کا اندازہ کر کے ہندوستانی منشیوں کی تعداد ۲۵ تک کر دی گئی تھی۔

اردو زبان کی ترقی و ترویج میں فورٹ ولیم کالج نے ایک نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اس وقت اردو نثر میں ایسی کتابیں نہ تھیں جو تعلیمی ضروریات کو پورا کر سکیں۔ کالج اپنے انگریز طلبہ میں ایک ایسی زبان میں اہلیت پیدا کرنا چاہتا تھا جو سادہ بامحاورہ ہو اور عام بول چال کی زبان سے قریب ہو۔ اس وقت اردو نثر میں جو تصانیف دستیاب تھیں ان پر فارسی کے اور پر تکلف اسالیب کا گہرا اثر تھا۔ اس کے علاوہ وہ موضوعات کے اعتبار سے بھی کالج کی درسی ضروریات کو پورا کرتی تھیں کیونکہ کالج کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ وہ انگریز طلبہ کو ہندوستانی زندگی کے اہم پہلوؤں سے بھی واقف کرے۔ ان کے مطالعے کے لئے جو کہانیاں مہیا کی جائیں وہ نہ صرف علمی لحاظ سے ہندوستان کی نمائندگی کریں بلکہ ان کے ذریعے ہندوستان کے رسم و رواج، عقائد، عادات وغیرہ کا بھی علم ہو سکے۔

اردو زبان کی تاریخ میں فورٹ ولیم کالج پہلا ایسا ادارہ ہے جس نے علمی و ادبی تصانیف کا صرف ایک بڑا

بچانے پر مستحق ہیں بلکہ انہوں نے اردو زبان و ادب کی تشکیل و ترویج میں بھی ایک بڑا اہم کردار ادا کیا اور اس زبان کو نئے رجحانات اور ترجمات سے روشناس کیا۔ فورٹ ولیم کالج جہاں ایک تعلیمی ادارہ تھا وہیں اس نے تصنیف و تالیف کے ایک اہم مرکز کی حیثیت سے بھی شہرت پائی۔ کالج نے نہ صرف کالج میں ملازم منشیوں کی تصانیف شائع کیں بلکہ کالج سے باہر کے مصنفین کی تصانیف کو بھی اشاعت کے لئے قبول کیا اور ان پر انعامات دیئے۔

اردو نثر کو معیاری علمی و ادبی مقاصد کے لئے اعتبار بخشنے میں فورٹ ولیم کالج کا نمایاں ہاتھ ہے۔ کالج نے نہ صرف قصوں کہانیوں کی کتابیں شائع کیں بلکہ تاریخ و تذکرہ۔ مذہب و معاشرت، صرف و نحو اور لغت کی کتابیں بھی چھپوائیں۔

قصص کی کتابوں میں تراجم اور، خود موضوعات پر تصانیف کی کثرت ہے لیکن ان کی اہمیت اس بنا پر ہے کہ انھوں نے ایک رواں اور بے تکلف بیانیہ نثر کو فروغ دینے میں مدد دی ہے۔ میر امن کی "باغ و بہار"۔ حیدر بخش حیدری کی "طوطا کہانی" اور "آرائش محفل" بہادر علی حسینی کی "نثر بے نظیر" وغیرہ میں جو نثر استعمال کی گئی ہے وہ بامحاورہ، پر اثر اور جاندار ہے۔ لیکن انھوں نے خود کو ان حدود سے دور رکھا ہے جہاں انشاء پردازی بیجا تصنعات کی دلدل میں جا پھنستی ہے۔

فورٹ ولیم کالج کے زیر اہتمام جو تراجم شائع ہوئے ان میں سے بعض ایسی تصانیف سے تعلق رکھتے تھے جو مشرق کے مستند ادب میں ایک اہم مقام رکھتے تھے۔ ان میں شیر علی افسوس کا کیا ہوا سعدی کی گلستان کا ترجمہ "باغ اردو" کاظم علی جواں کا "شکنتلا" کا ترجمہ اور اکرام علی کے ترجمہ "اخوان الصفا" کا خاص طور پر ذکر کیا جا سکتا ہے۔

ان کے علاوہ بعض دوسرے مقبول اور دلچسپ قصوں کو اردو کا جامہ پہنایا گیا مثلاً شیخ حفیظ الدین نے "خرد افروز" کے نام سے "کلیلہ و دمنہ" کی داستان کو پیش کیا۔ نہال چند لاہوری نے "مذہب عشق" کے عنوان سے "قصہ گل بکاؤلی" لکھا۔ مظہر علی ولا نے "بیتال پچیسی" اور "مادھونل اور کام کندلا" کو اردو میں منتقل کیا۔ خلیل علی خاں اشک نے اردو میں "داستان امیر حمزہ" لکھی۔ ان کی وجہ سے اردو میں ایک پر اثر افسانوی نثر تحریر کرنے کی جانب رجحان پیدا ہوا۔ یہاں یہ بات بھی توجہ کے لائق ہے کہ ان قصوں کو عربی فارسی، سنسکرت، برج بھاشا وغیرہ مختلف زبانوں سے اردو میں اس طرح منتقل کر کے اردو کی ثقافتی ہم آہنگی کی ادبی بنیادوں کو پختہ کرنے میں مدد ملی۔

مشرقی ادبیات کی ایک امتیازی خصوصیت اس کی اخلاقیات سے وابستگی ہے چنانچہ فورٹ ولیم کالج کی کئی اہم تصانیف اس موضوع سے تعلق رکھتی ہیں۔ بہادر علی حسینی کا ترجمہ "اخلاق ہندی"۔ مظہر علی خاں ولا کی "ہفت گلشن" امانت اللہ شیدا کا ترجمہ "جامع الاخلاق" وینی نرائن کی "تنبیہ الغافلین" بخوبی مشرقی عقائد و اخلاق کو سمجھنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ ان میں سے اکثر تصانیف میں حکایتی انداز اختیار کیا گیا ہے جو نثر کے سادہ اور سلجھے ہوئے اسلوب سے زیادہ موزونیت رکھتا ہے۔

ہندوستانی معاشرت کے دوسرے پہلوؤں سے بحث کرنے والی بعض دوسری تصانیف بھی تیار کی گئیں مثلاً کاظم علی جوان نے ایک طویل نظم "بارہ ماسہ" تحریر کی جس میں ہندو مسلمانوں کے تہواروں کی تفصیل بیان کی گئی تھی اور حمید الدین بہاری نے "خوان الوان" میں ہندوستانی کھانے اور مٹھائیاں تیار کرنے کی ترکیبیں بتائی تھیں۔

تاریخ و تذکرہ کی جانب بھی توجہ کی گئی۔ حیدر بخش حیدری نے فارسی سے "تاریخ جہاں کشائے نادری" کا ترجمہ کیا۔ شیر علی افسوس کی کتاب "آرائش محفل" کا موضوع بھی ہندوستانی تاریخ تھا۔ بہادر علی حسینی نے فارسی میں تحریر "تاریخ آسام"

یا تھا اور مظہر علی ولا نے بھی "تاریخ شیر شاہی" اور "جہانگیر نامہ" کے عنوانات سے ترجمے کئے تھے۔ حیدر بخش حیدری
علی لطف دونوں نے "گلشن ہند" کے نام سے شاعروں کے دو تذکرے لکھے تھے۔ منشی نرائن جہان نے بھی اردو شعراء
تذکرہ مرتب کیا جو "دیوان جہان" میں شامل ہے۔

فورٹ ولیم کالج نے اردو زبان کے بارے میں بھی کتابیں شائع کیں۔ جان گلکرسٹ کالج قائم ہونے سے قبل ہی انگریزی
اور ڈکشنری اور ہندوستانی گرامر شائع کر چکے تھے۔ کالج کے قیام کے بعد انھوں نے "رہنمائے زبان اردو" اور "قواعد
کی دو کتابیں اور شائع کیں۔ ان کی "قواعد اردو" کا خلاصہ بہادر علی حسینی نے "رسالۂ گلکرسٹ" کے عنوان سے کیا۔
مرشد انے اردو صرف کے قواعد نظم کی شکل میں پیش کئے۔

فورٹ ولیم کالج اردو زبان و ادب کی تاریخ میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کالج کی کوششوں کے نتیجے میں اردو
براہ راست اور کارگر انداز سے مغربی علمی اصولوں اور معیاروں کا اثر مرتب ہوتا ہے۔ اردو نثر میں فورٹ ولیم کالج ایک
نیۂ کا نقطۂ آغاز کہا جا سکتا ہے۔ فارسی نثری اسالیب کے زیر اثر، اردو نثر پر جس رنگینی اور تصنع کا غلبہ ہوتا جا رہا
برخلاف رجحان پیدا کرنے میں فورٹ ولیم کالج نے اہم حصہ لیا ہے۔ اس نے نثر کو اس کے کارگر عملی منصب کا اہل
صرف ایک عبارت آرائی کا کمال نہ رہا بلکہ اس کو علمی اظہار کا ایک موزوں وسیلے کی حیثیت سے استعمال کیا جانے لگا
قصص کے علاوہ تاریخ و تذکرہ، اخلاق و مذہب اور صرف و نحو کے موضوعات پر سلیس اور براہ راست اسلوب
کی روایت پیدا ہوئی۔

فورٹ ولیم کالج نے کتابوں کی طباعت کے لئے ایک پریس بھی قائم کیا جو کہ ہندوستان میں سب سے پہلا چھاپہ خانہ تھا۔ نستعلیق
پریس میں چھپ کر اردو کتابیں، ان کے قلمی نسخوں کی بہ نسبت ایک زیادہ وسیع دائرے میں متعارف ہوئیں اور
سے انھوں نے ایک زیادہ بڑے حلقے میں اپنا اثر پیدا کیا۔ اس سے پہلے کسی دوسرے ادارے کے زیر اہتمام اردو
کا اتنی بڑی تعداد میں تصنیف و تالیف کا کام نہیں ہوا تھا۔ کالج کے قیام کے ابتدائی چار سالوں میں ہی ۲۳ کتابیں
میں اور کالج کے باہر کے مصنفین کی حوصلہ افزائی، سرپرستی اور ان کی تصانیف پر انعامات کی پیشکش کی بنا پر کالج
اردو کی نثری تحریرات میں اضافہ اور کالج کے ذریعے مروجہ سادہ نثری اسلوب میں لکھنے کا رجحان پیدا ہوا۔ فورٹ
ولیم کالج نے صرف جدید اردو نثر کی بنیاد رکھی بلکہ اس نے اردو کی نثری تحریرات پر بڑے دور رس اثرات بھی

اردو لکھئے ——

اردو پڑھئے اور اردو کی توسیع اشاعت میں اردو کا کام
کرنے والوں کا ہاتھ بٹائیے —!

بشیر احمد صابر

دکن کے سنگتراش

چلچلاتی دھوپ میں بیٹھے ہوئے کرتے ہیں کام ... توڑتے پتھر کا دل ہیں آدمی یہ صبح و شام

کرتے ہیں ہلکان اپنی جان غیروں کے لئے ... ہوتی ہے ان کی محنت میرے تیروں کے لئے

ہیں پسینہ میں شرابور کس قدر ان کے بدن ... قطرہ قطرہ جس کا ہے مشکیں لہو کا ہم وزن

آفریں تم پر ہے اے محنت کشو! صد آفریں ... رشکِ جنت بن رہی ہے جن کی محنت سے زمیں

جن کی محنت سے بنے ہیں بادشاہوں کے محل ... کارخانے شہر، قصبے جن کی محنت کا ہیں پھل

جن کی محنت سے بنی دنیا ہے یہ آرام کی ... جن کی محنت سے بنی تہذیب ہے اقوام کی

سینکڑوں صدیاں گذرتی ہیں تمدن کو یہاں ... دیکھو لگتی نہیں مٹنے کو پھر ان کے نشاں

تم سمجھتے ہو کہ کیا تاریخ دہراتی نہیں ... ہو گئے کتنے تمدن یاں ہیں مدفون زمیں

آدمی کوشاں ہے خود اپنی تباہی کے لئے ... کی کرائی ساری محنت کی تباہی کے لئے

تم بتاؤ کیا یہی انصاف ہے محنت کے ساتھ
لے کے کیا جاؤ گے تم دنیا کو بھی دولت کے ساتھ

بانو طاہرہ سعید

غزل

زندگی کیا تھی؟ بلا ہو جیسے
بد دعا۔ قہرِ خدا ہو جیسے

پیار کا ایسا ملا ہے بدلہ
پیار کرنے کی سزا ہو جیسے

دلِ ویراں میں ملاقات کا خواب
سنگ میں پھول کھلا ہو جیسے

ایک ایسا بھی تبسم دیکھا
زہر، امرت میں ملا ہو جیسے

طاہرہ، اُن کے تصور کی جھلک
نکہتِ موجِ صبا ہو جیسے

کھنڈر

سامنے ایک کھنڈر ہے جس میں
ڈوبے ابھرے ہیں کئی نقش و نگار
کہیں گلشن کی جھلک ہے تو کہیں صحرا کی
کتنی یادوں کے یہاں جھرمٹ ہیں
کتنے نقشے نظر آتے ہیں یہاں
ٹوٹا پھوٹا ہی سہی شیش محل ہے میری
یہ کھنڈر ہے میری ہستی کا نشاں

غزل

صابر کوسگوی

صحنِ گلشن میں صنوبر نہیں دیکھے جاتے ... آپ کے قد کے برابر نہیں دیکھے جاتے

شام سے زلفِ معنبر نہیں دیکھے جاتے ... خواب میں سانپ کے پیکر نہیں دیکھے جاتے

آنکھ کے بدلے ہوئے تیور نہیں دیکھے جاتے ... دل میں چبھتے ہوئے نشتر نہیں دیکھے جاتے

دیکھ لیتے ہیں جنوں خیز مناظر دل کے ... عالمِ ہوش میں اکثر نہیں دیکھے جاتے

ہم سے تو میرا اندازِ جنوں بھی بدلو ... خندہ زن ہوش کے منظر نہیں دیکھے جاتے

آپ اس طرح مرے سامنے آیا نہ کریں ... ہم سے یہ روز کے محشر نہیں دیکھے جاتے

آپ طوفان کا ساحل سے نظارا کیجئے ... آپ سے درد کے منظر نہیں دیکھے جاتے

چھین لو وقت کے ہاتھوں سے ہنسی کے ساغر ... دستِ انساں میں خنجر نہیں دیکھے جاتے

مسکراتے تھام لو آنسوؤں کو جگر کو دل کو
وہ پشیمان سے صابر نہیں دیکھے جاتے

محمودہ بانو

محمد قلی قطب شاہ بہ حیثیت شاعر

محمد قلی قطب شاہ کی شاعری میں عشق جلوۂ صد رنگ اور نقش ہائے رنگ رنگ نظر آتا ہے۔ اس نے موضوعات عشق کو دیوان معانی میں یوں بند کیا ہے جیسے غنچہ کی مٹھی میں گلشن! دانہ کی گرہ کی میں خرمن بہ الفاظ دیگر اس کی شاعری دراصل حدیث دل و دلبر کی تفسیر ہے۔ خیام کے اس ہیرو، رند مشرب کی زندگی اس مصرعے کی گردان ہے

خوشا و جام شراب و خوشا و ذوق وصال

وہ زندگی کو عیش و نشاط اور راگ رنگ میں گذارنے کا قائل ہے کہ زندگی کی رنگینیوں سے اسے عشق تھا۔ سورۂ رحمٰن گنوائی گئی اور سورۂ فتح میں وعدہ کی اعلیٰ خصوصیات سے لطف اندوز ہونے ہی کو وہ عبادت سمجھتا ہے اور جب رحمت ایزدی اس پر باران گل و بارش گلاب کی طرح برستی ہے تو وہ بارگاہ رب العزت میں بار بار سر نیاز جھکاتا اور طرح طرح سے شکرانے بجا لاتا ہے۔ اور یہی سب کچھ اس کی شاعری کا نچوڑ ہے۔

شاعری اس نے کی نہیں، شاعری اس سے ہو گئی ہے۔ چاہت ہو کہ شاعری دونوں اس کی پُر کشش شخصیت کے ساختہ مظہر ہیں وہ بیک وقت عاشق بھی ہے اور نشاط کار بھی، اس کا ضخیم کلیات اس کی نشاط افزا حیات کا بھرپور مرقع ہے اس کی سدا بہار نگاہیں چیزیں کئی دیکھنے کی عادی تھیں۔ اسی لیے بلاشبہ سہاگ متی کے کئی روپ پیاریوں کی شکل میں اس کے من موجود ہیں جن کے ساتھ خوش فعلیوں اور رنگ رلیوں کا ذکر بھی اس نے منظوم کیا ہے ؎

میرا سانولی من کی پیاری دِسے　　　　که پھولاں میں جو پھول بھاری دِسے

لیکن یہ سب محض کرشن کی گوپیاں تھیں جو رادھا سہاگ متی کا مقام نہ حاصل کر سکیں ؎

نبی صدقے لی حیدر پیاری　　　　اسے سیویاں ہیں چت سوں ہت باندے

حیدر محل حیاتے جلوا عشق کا گا دیا　　　　یزدانی تانت چومندر رنگاں ہیں بجا دیا

شاعری محمد قلی کے لئے ذریعۂ عزت نہ تھی بلکہ ذریعۂ نشاط۔ اس کا عشق بھی اعلیٰ قدروں کا حامل نہ تھا بلکہ محض تقاضائے شباب جو زلف و عارض کے سوا کچھ دیکھ نہ پاتا اور نہ کچھ دیکھنا ہی چاہتا تھا۔ اس کے یہاں صرف زناکی ہے اور یہ بھی شاعر کی یکسانی قدر ہے یعنی عشق اور صرف عشق۔ جس کی جو سنا انہوں نے میر کے ہاں بھی ہیں اور غالب کے یہاں بھی جو گرفتاری میں فقط مصرعہ ایسے پہلو تہی نہ کر سکا۔

[illegible]

عصر شاداں اس کی لذت و فکر کا آئینہ ساز رہا تھا۔ یوں سمجھئے کہ اس کی شاعری لفظوں کی آذری ہے۔ جس طرح ایک مجسمہ ساز کا تراشا ہوا مجسمہ جسم کے خط و خال دکھاتا ہے اور حسن کا اظہار جسمانی روپ کا پیرہن ہوتا ہے وہ ایک ماہر مجسمہ ساز کی طرح الفاظ کی مادّی و صداقت سے شعر کا پیکر تراشتا ہے جو اس کے کارخانۂ جلوۂ جانانان کی پیداوار ہیں۔ لفظوں کی یہ مجسمہ سازی بھی یقیناً فنِ لطیف ہے اور اس قسم کی شاعری میں اس کا کوئی ہمسر نہیں ۔۔

رتن قطبا کے ہیں نہ مول نیئں کس شہر میں مول　　لے کر آؤں جو بکھرا ہو دِسے اس کا شہر حیدر میں

کلیات معانی کی معنی آفرینی میں جدت بیان بھی ہے اور ندرتِ ادا بھی، رفعتِ تخیل بھی ہے اور بلندیٔ فکر بھی، گہرائی بھی ہے گیرائی بھی۔ جلال بھی ہے جمال بھی، فصاحت بھی ہے اور بلاغت بھی۔ شیرینی بھی ہے اور ترنم خیزی بھی۔ سطوتِ شاہانہ بھی ہے اور اندازِ فقیرانہ بھی۔ مقامی رنگ بھی ہے اور ہمہ گیر رنگ بھی۔ غرض یہ کہ کلام معانی گنجینۂ سخن بھی ہے اور اپنے عہد کی تہذیب و معاشرت کی زندہ جاوید تاریخ بھی ہے ۔۔

خداداد محل کوں محمد سنوارے　　تو اس میں جنت کے نگاراں نکالے

اس کے کلام میں ڈاکٹر زور نے تصوف و عرفان بھی ڈھونڈ نکالا ہے لیکن اجماعِ اُمم یہی ہے کہ اس کا مذہب **کلوا واشربوا و تعیشوا** رہا ہے۔ شاہد زور صاحب نے اس کی شاعری کو تصوفانہ گلابی میں اس لیے دیکھا ہو کہ اس کے یہاں حافظ کے رنگ میں بھی اشعار ملتے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے لکھا بھی ہے کہ "وہ دیوان حافظ کا حافظ نظر آتا ہے"۔ لیکن قلی کی شاعری کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اس کا یہ رنگ تقلیدی ہے۔ اس نے محض رسم شاعری نبھائی ہے۔ ورنہ تصوف و عرفان کے لیے اپنی ہستی کو جس قدر مٹانے کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس کے پاس نہیں۔

کہتے ہیں فراق، تشنگی و ہجر کلام کے تاثر کو بڑھاتے ہیں۔ لیکن محمد قلی کی شاعری اس نظریہ کی تردید کرتی نظر آتی ہے۔ اس نے وصل اور ہجر بعد وصل کے شعر کہے ہیں ۔۔

شراب ہور عشق بازی باج مج تھے نا لیا جائے　　کہ یو دو کام کرنا کر میں نے سوگند کھایا ہوں

سرا منج عید ہور ہی ہے کہ میں دھن و مکھ پایا ہوں　　فلک کے منتراں سینی سودھن کا من رجھایا ہوں

وارفتگی و سرشاری! سیرابی و ترنم خیزی اس کے موئے قلم سے ٹپکتی ہے اس کے ہاں عشق میں فراق، درد کا تجربہ ہے بھی تو ایسا ۔۔

جنت کی لذت فرشتیاں کو نیئں ہے　　بہت سعی سوں میں سو لذت پچھانی

اس کی شاعری وصال کی آگ ہے، جو خود بخود مشتعل ہوتی ہے۔ عشق کا چشمہ ہے جو خود ابلتا ہے۔ حسن کی برق ہے جو خود کوندتی ہے لیکن بقول ڈاکٹر زینت ساجدہ "اس کے باوجود اس کے یہاں سوز نہیں۔ درد نہیں۔ خلوتِ غم میں دل کو گھلانے والی کیفیات نہیں۔ جلوت ہے۔ رعنائیاں ہیں۔ رنگینیاں ہیں۔ جوانی کا بانکپن ہے۔ اونچے سروں میں گائے جانے والے گیت اور جھوم جھوم کر گائے جانے والے گیت۔ مجاز کے تمام پہلو اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ اس کے ہاں ملتے ہیں۔ اس طرح اس بادشاہ و بادشاہ گر کے یہاں نہ محرومیٔ قسمت کا رونا ہے نہ بدنصیبیٔ بخت کا گلہ۔ بس سہود و نشاط

منسابط ہے۔ شاعری نغمۂ بہار ہے۔ اجل رسیدہ خزاں کا گیت نہیں۔

محمد قلی کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت جیسا کہ متذکرہ بالا سطور میں لکھا جا چکا ہے : مقامی رنگ ۔ دیسی گُل رنگ یعنی نظیر اکبر آبادی کی طرح اس کی شاعری میں بھی حقیقت نگاری اور اپنے ماحول سے وفاداری ہے ۔ مقامی ' ملکی عناصر و ملامات کی روانی و فراوانی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے یہاں بالکل بائنے لیلیٰ و مجنوں ' وامق عذرا ' نل دمن نہیں۔ بلکہ تجربات عشق ہیں۔ (حسینوں سے کئے گئے حسین تجربے اور زلف و کاکل سے وفاداری کی اداکاری) اس میں آپ جنیوں و میوں نہیں۔ آپ موسیٰ کی سبک خرامی کے نظارے پنہاں ہیں۔ دوسری خصوصیت اس کی شگفتگی و شادابی ' لوچ ' مٹھاس ہے

معانی کے باتاں ستے جبرتا نمک ــــــ جیسے چاکھے کیے نمک سوں شکر

اور تیسری خصوصیت اس کے یہاں حسن اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں اور صاعقہ پاشیوں کے ساتھ اپنی صحیح جنس میں اسا ہوتا ہے ؎

چھبیلی سوں من لگیا ہے ہمارا ــــ کہ اس بن نیئں ہمیں ایک پل قرارا

اس کی شاعری کو الہامی کہا جاتا ہے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ شاعری نے محمد قلی کو اور محمد قلی نے شاعری کو نوازا عر کا بہترین نباض اور رمز شناس ہے۔ تغزل اس کے رگ و پے سے جاری و ساری نظر آتا ہے۔ غرض یہ کہ اس میں اور چاہے جانے کی تمام خصوصیات فتنہ سامانیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہیں ؎

پیا باج پیالہ پیا جائے نا ــــ پیا باج یک تِل جیا جائے نا
قطب شہ نہ دے مج دِوانے کو پند ــــ دِوانے کو کچھ پند دیا جائے نا

محمد قلی کی شاعری کی ایک اور خصوصیت اس کی کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی پاکیزہ زبان ہے۔ جو سبزۂ نو دمیدہ و گُلِ نو شگفتہ کی طرح ترو تازہ ہے۔ جیسے سطحی نظر سے دیکھئے تو کچھ نہیں۔ لیکن کچھ سمجھ کر یا گنگنا کر پڑھیے تو دل کے ساز بھی بج اٹھتے ہیں۔ جد آگیں اور کیف آور کیفیات طاری ہوتی ہیں۔

قطب زماں کے سب گنا ہاں بخش الٰہی ــــ بکڑیا علی داماں سب ہی اس عید میں

محمد قلی کی شاعری اکتسابی نہ تھی ' خداداد شاعرانہ صلاحیتیں اسے ودیعت ہوئی تھیں۔ اس کا کلام کسی بھی ملک الشعراء سے زورِ بیاں میں کم نہیں۔ جو پچاس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اس نے غزل۔ نظم۔ قصیدہ۔ مثنوی۔ مرثیہ۔ قطعات ' تقریباً تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ اس کے یہاں موضوعات حسن و عشق سے آگے جہاں اور بھی ہیں ان میں حمد ' نعت ' منقبت ' مدح حضرت بی بی فاطمہ (رض) ' عید غدیر ' شب برات ' عید الفطر ' عید الضحیٰ ' دیگر تہوار ' بسنت ' سالگرہ ' شادی ' جلوہ و دیگر رسومات ' شاہی لوازمات ' کھیل ' برسات ' دسہرا ' موسمیات و باغات موضوع سخن بنایا ہے گویا کوزہ میں دریا نوشی یا گاگر میں ساگر کی کوشش کی ہے۔

اس کی شخصیت میں اکبر کی تدبر اور [illegible] رعایا پروری کا جہانگیر کی عدل گستری و عاشق مزاجی [illegible]
[illegible]

سری کرشن سنہا

حیدرآباد کے قلندر

تلسی داس جی نے سنت اور اسنتوں کو پرنام کرکے "رامائن" کی شروعات کی تھی اسی طرح جب پہ اگ یونیورسٹی اور وہاں کے اورینٹل انسٹیٹیوٹ نے مجھے دو سال دکن کی تاریخ اور ہندوستان کے سنتوں پر لکچر دینے کے لئے مدعو کیا تو کچھ ہچکچاہٹ سی ہوئی۔ جن ملکوں میں زیادہ اسنت ہوں، وہاں سب ہی کو پرنام کرکے، بھگوان سے کامیابی کی دعا مانگ کر لکچر دوں کو آگے بڑھانا پڑا۔ حیرت کی بات یہ تھی صوفیانہ مباحث کو سننے کے لئے بہت زیادہ غیر متوقع طور پر لوگ آ گئے۔ ان میں زیادہ تر پروفیسر، میکینک، شاعر اور کافی پرانے دفتروں کے لوگ تھے۔

جھوٹ کی عادت نہیں۔ بے ایمانی طریقۂ زندگی نہیں۔ ہم نے شروع کرتے کرتے ہی کہا کہ جہاں دھرم ہوتا ہے وہاں اسنت بھی سنت کی طرح عزت پاتا ہے اور جہاں اس کا کال ہو وہاں سنت بھی اسنت۔ جا کر زندگی کے دشوار گذار راستے پر ٹھوکریں کھا کر اپنے دن پورے کرتا ہے۔ یورپ کی تاریخ کو ہم نے اس مضمون سے ثابت کیا۔ ہندوستان کے اتہاس کو دہرایا اور آخر میں اپنے محبوب دکن کے تاریخی اوراق سے حوالے دیئے۔

پرانا حیدرآباد ہی کیا بلکہ سارا دکن سنتوں اور صوفیائے کرام کی آماجگاہ تھا اس سرزمین نے کتنے ہی بھگتوں کو پیدا کیا جن کی لا انتہا محبت صرف بھگوان سے ہی نہیں بلکہ اس کے بندوں سے بھی تھی۔ جس وقت انجیل کو بھگتوں کی فہرست تیار کرنے کہا گیا تو سر فہرست ابو بن ادھم کا نام تھا جس کا مذہب وایمان بندوں کی بے غرض خدمت اور محبت تھا۔ اس حساب سے، چاہے وہ کمیونسٹ اسٹیٹ ہو یا کوئی اور، جو لوگ بندوں کی بغیر لالچ کے خدمت کرتے ہیں وہ سب سنت ہیں۔ گاندھی جی کی طرح۔ ابو بن ادھم، لینن، مارکس کی طرح۔ بے شک مذہب کو کمیونسٹ ڈکشنری میں افیون زندگی ٹھہرایا ہے۔ لیکن یہ وہ آلودہ، کرم خوردہ مذہب ہے جو روایتوں میں گھرا ہوا ہے اور جس کی نسبت اقبال نے کہا تھا ؎

تیرا نماز بے سرور تیرا امام بے حضور
ایسی نماز سے گذر ایسے امام سے گذر

آدمی کا ہر کام خدمت خلق ہے۔ گیتا نے اس کو کرم کہا اور توضیح کی کہ یہ کرم نش کام یعنی بے غرض ہو اور بھگوان کی خدمت میں ارپن کیا جائے۔ پوری کارکردگی کے ساتھ تو یہی کرم پوجا پاٹ ہو جاتا ہے۔ ایمان و دھرم، مذہب اور بھگتی اس سے جدا نہیں۔ ایسا سوچنے والے اس راستے پر چلنے والوں کی فہرست بہت لمبی ہے۔ لیکن سب کی دانست میں تلسی داس، سور داس، خواجہ بندہ نواز، کبیر، نانک، دیویکا نند اور گاندھی جی کے نام جانے پہچانے ہیں۔ یہ وہ سنت ہیں جو انسانوں کی طرح رہ کر اپنا کام کرتے ہوئے بندوں کی خدمت میں مست اور بھگوان کی بھگتی میں مگن رہے۔

دوسری فہرست ان سنتوں کی ہے جو دنیا سے غافل ہو کر بھگوان کی محبت میں گم ہو گئے۔ میرا کی طرح وہ گھر دوار

میں عجیب ہو گئے۔ رام کرشن پرم ہنس ایسے ہی سنت تھے جن میں ادویت کا فکری اور فطری میلان تھا۔

پہلے حیدرآباد میں دونوں طرح کے سنت تھے۔ ایک وہ جو کام کرتے ہوئے خدا کی محبت میں خوش تھے اور دوسرے اپنی اکائی کو بھول کر بالکل خدا کے ہو گئے تھے۔ یہاں خانقاہوں کے سنتوں میں جہاں بہت لوگ تھے وہاں ہمارے ابا بھی شریک ہو جاسکتے ہیں۔ بھجن، کیرتن اور قوالی ہمارے گھر کے خوش گوار رسم و رواج تھے۔ لیکن ہم بہت زیادہ متاثر عبدالقادر سے تھے جو مسجد میں چپراسی تھا اور جو باہر ایک تنگ و تاریک کمرے میں رہا کرتا تھا۔ صبح و شام مکہ مسجد کو جاکر کھچڑی کھاتا جو غریبوں میں روزانہ تقسیم ہوتی تھی۔ شام کو آتا، اپنی قندیل جلاتا، نماز سے فارغ ہوکر قرآن شریف کا ورد کرتا۔ رات گئے کرشن بھگوان کی تصویر پر پھول چڑھاتا اور گیتا کا اردو میں پاٹ کرتا۔ صبح نہا دھوکر نماز سے فارغ ہوکر کی ہنڈی میں چائے بناتا اور کوئی لیے پیتا۔ کمرے کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا۔ کوئی بھی آئے۔ کوئی بھی جائے۔ دو کپڑے جوڑے تھے۔ ایک جسم پر ہوتا تو دوسرا دھل کر سوکھنے کے لئے لٹکا ہوتا۔ عبدالقادر سے ہم نے پوچھا کہ تم کتنی تنخواہ کرتے ہو۔ جواب ملا کہ پانچ روپے ذات پر خرچ ہوتے ہیں۔ بقیہ مکہ مسجد کے اسکول اور وہاں کے فقیروں پر۔ ہم اس کرم یوگی سے یقیناً بہت متاثر تھے۔

پھر دوسرے کرم یوگی جن کے ہم درشن کرنے جاتے وہ بھٹ جی بابو تھے۔ ہم کو موسیقی سے بہت لگاؤ رہا ہے۔ ہم اس کلا کے حاصل کرنے میں بہت پاپڑ بیلے ہیں۔ بھٹ جی بابو اعلیٰ پائے کے موسیقار تھے۔ اس لئے بھی ہم کو ان کی بندگی بہت تھی۔ اکثر چھٹی میں ابا کے ساتھ ان کے پاس جاتے اور گھنٹوں گذار کر آتے۔ یہ کہا جاتا تھا کہ ایک روز صبح کو کچھ مہمان آگئے اور ان سے خواہش کی کہ وہ کچھ گائیں۔ ویسے وہ اسی روز بمبئی واپس ہو رہے تھے۔ بھٹ جی بابو خندہ پیشانی سے بیٹھ گئے۔ ساز جمع ہوا اور الاپ شروع کی۔ گانے میں اس قدر سوز تھا کہ سب کے دلوں میں درد بھر آئے۔ سماں بدلی میں آگیا۔ اجالے پر اندھیرا چھا گیا۔ سب کی آنکھوں کا حال یہی تھا ؎

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکے تو پھر لہو کیا ہے

ایک گھنٹے تک گانا ہوتا رہا جیسے بھگوان بیٹھے ہوں اور اس کا بھگت ان کی خدمت میں شکرانہ کرم کے ذریعہ ادا کر رہا ہو۔ گانا ختم ہوا اور فوری سب سے اجازت لے کر بھٹ جی بابو سیدھے اپنے کمرے میں گھس پڑے جہاں مرگ کا صبح سویرے ہی مرچکا تھا۔ کمرے میں دبا ہوا کہرام مچ پڑا اور بمبئی والوں کو سخت شرمندگی ہوئی کہ انھوں نے بے جا جسارت کی تھی۔ بھگوان کے بھگتوں کو ایک ہی دھن رہتی ہے۔ سب کی خدمت کر کر یہ زندگی اس مالک کا عطیہ کرم کے تھے۔ بھٹ جی بابو ایک بڑے کرم یوگی تھے۔

خواجہ بندہ نواز سے بھی ہماری عقیدت ایسی ہی رہی ہے۔ ہم کوڑنگل میں جاگیروں کی پیمائش اور زمین کے دعاوے کرنے کے لئے متعین تھے۔ ایک دفعہ حیدرآباد سے جا رہے تھے کہ ہم راستے میں بیمار ہوئے۔ کچھ روز تک کوڑنگل میں ہی مقیم رہے۔ وہ بہت کے گھر ہی قیام کیا۔ حضور نے ہمارے بے انتہا دیکھ بھال کی۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر خان صاحب [illegible] [illegible] ۔ لئے ہمارے دوست [illegible] گوڑ میں آپہنچے۔ پھر کیا تھا ان [illegible]
[illegible]

ہم حیدرآباد واپس ہو گئے۔ لیکن واپسی کے پہلے ہم اپنے دوستوں کے ساتھ گلبرگہ میں خواجہ صاحب کا شکریہ ادا کیا۔ اس وقت سے آج تک جب جب ہمیں خواجہ صاحب بلاتے ہیں ہم اُن کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنا حقِ بندگی ادا کرتے ہیں۔ خواجہ صاحب کا رحم و کرم اب بھی ہمارے شاملِ حال ہے اور اُن کی درگاہ کی اذاں ہمیں اکثر صبح میں نیند سے چونکا دیتی ہے۔ پر جتنے تو اُڑ جاتے اور وہیں بسیرا لیتے لیکن شاہین کا اشتیاق ہے طاقتِ پرواز نہیں۔

رمن مہارشی حیدرآباد کے تو نہیں لیکن حیدرآبادیوں کے دل کے بادشاہ تھے پروفیسر شیو موہن لال جو ہمارے ایک عزیز ہیں اُن کے بڑے معتقد تھے۔ انھوں نے ہم سے ایک دفعہ ذکر کیا کہ رمن مہارشی کا درجہ سنتوں میں بہت اونچا ہے کوئی بھی آزما سکتا ہے۔ وہ بولتے نہیں لیکن اُن کی خاموشی گویا ہوتی ہے۔ رات کو سونے سے پہلے اُن کا دھیان کیا جائے اور پھر جو من میں آئے اُن سے سوال کیا جائے۔ صبح کی نیند میں خواب کے ذریعے اس سوال کا جواب مل جاتا ہے۔ لگے ہاتھوں ہم نے بھی سونے سے پہلے سوال کیا کہ کیا ہم سیول سروس کے امتحان میں کامیاب ہوں گے۔ علی الصبح ہم نے خواب دیکھا کہ ہم کسی تیز رَو دریا میں اپنے ایک دوست کے ساتھ تیر رہے ہیں۔ ہمارے دوست تو بیچ میں رک گئے لیکن ہم نے دریا پار کر لیا اور دیکھا کہ ایک بڑا عالیشان محل ہمارے سامنے کھڑا ہے۔ اس کے ساتھ ہی کسی نے کان کے دریچے میں نقارہ بجایا اور کہا کہ یہی تمہارے سوال کا جواب ہے۔ چنانچہ ہم سیول سروس میں داخل ہو گئے۔ اس واقعہ کے بعد دل کی گہرائیوں میں یہ خیال موجزن ہو گیا کہ جلد سے جلد مہارشی جی کے درشن کے لئے جائیں۔

بالآخر وقت آ ہی گیا۔ محرم کی بارہ دن کی چھٹیاں تھیں۔ ہم اور بالا پرشاد گوڑ دونوں مدراس کے لئے ٹرین میں سوار ہوئے موسلادھار بارش میں وہاں پہنچے۔ ٹیکسی لی اور گوڑ کو مدراس اور میرنا بیچ کی سیر کرائی۔ شام کو پھر ٹرین میں ترونملے کے لئے سوار ہوئے۔ رات کے بارہ بجے ٹرین پہونچتی تھی۔ راستہ بھر بارش ہی بارش۔ اس پہ بدقسمتی یہ کہ فرسٹ کلاس کا ڈبہ بھر طریقے سے ٹپک رہا تھا اور کسی اسٹیشن پہ بھی کچھ کھانے کو نہیں ملا۔ غرض آسمان کو ہمارا امتحان مقصود تھا۔ بارہ بجے ترونملے پہنچے۔ قلی کا نام نہیں۔ اسباب خود ہی اُٹھائے اور باہر آئے۔ وہاں نہ کوئی ٹیکسی نہ تانگہ۔ اسٹیشن ماسٹر سے صلاح کی۔ اسٹیشن پہ سو رہنے کا مشورہ دیا۔

اس کسمپرسی کی حالت میں تھے کہ یکایک جیسے غیب سے ایک تانگہ فراٹے بھرتا ہوا آیا اور ہم سے سوال ہوا "آشرم جانا ہے"۔ ہم نے بڑی خوشی سے ہاں کہا۔ اسباب رکھا۔ سوار ہوئے اور کچھ ہی دیر میں ہم آشرم کے بڑے گیٹ کے سامنے تھے گیٹ خود بخود کھل گیا۔ چھوٹی دیواروں پر بانس اور گھانس کی کٹیا تیں قطار سے بنی ہوئی تھیں۔ تانگہ سیدھے آشرم کی ایک گھانس پھونس کی کٹیا کے پاس کھڑا ہو گیا۔ جھونپڑے میں تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی لیکن کیا کیا جائے۔ سامنے کی طرف جو تھوڑا سا راستہ تھا وہیں ہم دونوں نے اپنا بستر کھول دیا۔ طبیعت پژمردہ تھی۔ غضب یہ مینڈکی چھلنی سے چھن چھن کر لوبہ آ رہا تھا۔ ہم نے کہا کہ ہم صبح دیر تک سوئیں گے اور اگر رمن مہارشی کو درشن دینا ہے تو وہ خود آ کر ہمیں اُٹھائیں۔ سو رہے۔

صبح ایسا معلوم ہوا کہ کوئی کان کے پاس بیانڈ باجا بجا رہا ہے۔ چونک کر آنکھ کھولی تو دیکھا کہ رمن مہارشی ہم کو غور سے دیکھ اور مسکرا رہے ہیں۔ بس کیا تھا اُٹھ بیٹھے۔ منہ ہاتھ دھو کر فوراً اُن کی خدمت میں [illegible] [illegible] ہے۔ جو سکون اور عافیت ہم نے وہاں پائی وہ آج تک دل و دماغ میں گھر کئے ہوئے ہے۔ [illegible]

بیکے ساتھ اٹھتے بیٹھتے۔ کھاتے پیتے۔ انسان کی طرح رہتے لیکن اُن خاموش محبت بولتی تھی۔ اُن آنکھوں میں ک اجالا تھی جو سب کو اندھیرے سے اُجالے کی طرف لے جاتی تھی۔ وہ حقیقتاً بہت اونچے درجے کے کرم یوگی اور ت تھے۔

پساگ میں ایک دوست کے پوجا خانے میں ہم نے پہلی دفعہ ستیہ سائی بابا کی تصویر دیکھی جو بھبوت میں گھری ہوئی ۔ہمارے دوست نے بتایا کہ یہ پُٹا پرتی آندھرا کے سنت ہیں۔ اور روزانہ بھبوت خود بخود آجاتی ہے۔ کبھی کم نہیں نہ اُس وقت تو ہم نے اس بات کو آئی گئی کر دیا لیکن جلوہ خانۂ شوق میں ایک نئے بُت کا اضافہ ضرور ہوگیا۔ اور جا ہم کو موقع ملا ہم نے اُن کے درشن لئے۔ آج ہم سب بڑے اور چھوٹے اُن کی رحمت کی چھاؤں میں سانس لیتے ہیں۔

ستیہ سائی بابا ایک عجیب وغریب سنت ہیں۔ کوئی تعلیم نہیں لیکن سب کی زبان سمجھ لیتے ہیں۔ عمدہ مقرر ہیں۔ گاتا بہت ہی ے گاتے ہیں۔ اُن کی آنکھوں سے اُجالا ٹپکتا ہے۔ کوئی ڈاکٹر نہیں لیکن سب کے درد کا درمان کرتے ہیں۔ زماں ومکاں کی قید وہ اپنے بھگتوں کی مدد کے لئے دُور دُور بھٹکتے پھرتے ہیں۔ ذات پات کو فریب سمجھتے ہیں۔ اُن کے بھگتوں میں ہندو، ن، عیسائی، پارسی، سکھ، جرمن، آفریکی، امریکی اور دنیا کے سب لوگوں سے محبت اور سب کی بے لوث خدمت اُن حرم اور ایمان ہے۔ اُن کے کرشموں کی تعداد بے شمار۔ اُن کی خدمت بے شمار۔ ایسے ہی سنتوں سے دنیا کی جوت جلتی ہے۔

پہلے حیدرآباد میں دوسری طرح کے سنت تھے۔ اُن کو چاہے قلندر کہیں یا مجذوب، بات ایک ہی ہے۔ میر جملہ کے تالاب کے ے پاس زہرہ بوا رہا کرتی تھیں۔ کوڑے کرکٹ، پھٹے چیتھڑوں کی رانی۔ آس پاس فقیروں کا جمگھٹ رہتا تھا۔ منہ ہی منہ میں کہا کرتی تھیں۔ اُن کا خدا کے ساتھ عشق ایسا گہرا تھا جیسے ایک جان دو قالب۔ ہمارے نانا سخت بیمار تھے۔ بچنے کی اُمید نہ تھی۔ ایسے میں ہمارے ابّا کو ایک نہ سوجھی۔ وہ سیدھے بگی میں بیٹھ کر تالاب کے کٹّے کی طرف روانہ ہوئے۔ زہرہ جیسے ہی اُن کو دیکھا ہاتھ سے واپس جانے کا اشارہ کیا۔ بدشگونی ہوگئی۔ واپس ہوئے تو نانا خدا کو پیارے ہوچکے تھے

رائے رامیشور پرتاپ کے گھر کے سامنے ایک قلندر رہا کرتے تھے۔ اُن کے دو وقت کا کھانا پرتاپ ولا سے جاتا، جاتا۔ ایک وقت کا ذکر ہے کہ دوپہر کا کھانا پیش کیا گیا تو حضرت نے قبول کرنے سے انکار کیا۔ خوان واپس ہوا اور ا ایکسیڈنٹ کی اچانک موت نے سب کے منہ سے لقمہ چھین لیا۔ یہ بھی بڑے پہنچے ہوئے بزرگ تھے۔

ایک بہار ابھی واقعہ سُن لیجئے۔ ہمارے نانا کی ڈیوڑھی کے سامنے سرکاری طبیلہ تھا جس کی بڑی پھاٹک میں ایک مجذوب رہا تے۔ دن بھر اپنے چیتھڑوں میں مگن رہتے۔ بالوں کی لٹیں کاندھے تک تھیں۔ پیلے پیلے دانت۔ پھتی ہوئی ناک۔ جھیر جھر سا۔ عجیب اُن کی ہیبت تھی کوئی قریب سے دیکھے تو ڈر جائے۔ اُن کے دامن کی ہوا لے تو کئی دن تک بھوک مٹ جاتی تھی ہم بچوں کو یہ خیال ہوا کہ حضرت کو مسلسل ستایا جائے تاکہ وہ کہیں اور نقل مقام کرلیں۔ چھوٹے چھوٹے کنکر اُن پر پھینکے لیکن معلوم ہے کہ کوئی کنکر اُن تک پہنچا۔ دن بھر یہ قلندر وہاں رہتے اور شام کو معلوم نہیں کہاں شب بسری ہوتی۔

ہماری نانی بہت بیمار تھیں۔ بچنے کی کوئی اُمید نہ تھی۔ ہم باہر بنگلے میں سو رہے تھے۔ جہاں سے روزانہ کنکر پھینکے جاتے تھے صبح ایک چھوٹا سا پتھر بالکل ہمارے پاس گرا چھوٹا ضرور تھا لیکن اُس کی آواز ایک دھماکہ تھی۔ چونک کر اُٹھے اور کھڑکی کی طرف بھاگے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ وہی بزرگ نیچے کھڑے اپنی عجیب شکل سے مسکرا رہے ہیں۔ گھر کے اندر

کرام پا تھا۔ قصہ پارینہ ہو چکی تھیں۔

غرض یہ وہ حیدرآباد کے سنت تھے جن کو ہم نے دیکھا ہے۔ اُن کی روحانیت بے پناہ اور انسان دوستی غیر معمولی۔ وہ مجذوب بھی دیکھے ہیں جن کی قلندرانہ زندگی اپنی ایک واحد داستان تھی۔ وہ دنیا سے غافل، بندوں سے بے نیاز خدائے پاک میں منہمک تھے۔ محبت کا جذبہ جگر کی زبان میں بولتا ہے

تیری ہی جفا یاد نہ میری ہی وفا یاد ‏ ‏ اب مجھ کو نہیں کچھ بھی محبت کے سوا یاد ——

بقیہ اُردو زبان کے چند مسائل صفحہ ۲۷ سے آگے۔

ہو سکتا ہے ابتداء میں مایوسی ہو لیکن آخر میں کامیابی یقینی ہے۔

اب آخر میں ہم ایک اہم بات کی جانب توجہ دلانا چاہتے ہیں وہ یہ کہ بہت ساری ایسی کتابیں جن پر اُردو زبان کو ناز ہو سکتا ہے وہ آج نایاب ہو گئی ہیں۔ اُردو اداروں کو چاہیئے کہ ایسی کتابوں کی دوبارہ طباعت کروانا اولین فرض سمجھیں اور اس جانب توجہ کریں۔ اُردو کی ہزاروں بیش بہا کتابیں عرصہ سے نایاب ہو گئی ہیں بجز چند کتب خانوں کے کہیں دستیاب نہیں ہوتیں ان کتب خانوں میں بھی جو جلدیں موجود ہیں وہ اکثر بوسیدہ ہیں۔ اکثروں میں صفحات غائب ہوتے ہیں۔ یہ صورت حال نہ صرف قدما مثلاً محمد حسین آزاد، شبلی، نذیر احمد، سرسید، حالی کی تصانیف کی ہے بلکہ گذشتہ دس پندرہ سال پہلے منظر عام پر آنے والی اہم کتابیں بھی دستیاب نہیں ہوتیں۔

ملک کے ہر گوشے کے اُردو ادارے اتفاق رائے سے موزوں اقدامات کریں تو پھر ہمیں کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت ہوگی اور نہ شرمندہ ہونے کی۔ یہ ہو جائے تو آپ بہ بانگ دہل کہہ سکیں گے کہ ؏

تجھے کیا غم ہے سلے اُردو ابھی ہم لوگ باقی ہیں۔

دکھن سا نہیں ٹھار سنسار میں ‏ ‏ پنچ فاضلاں کا ہے اس ٹھار میں
دکھن ہے نگینہ انگوٹھی ہے جگ ‏ ‏ انگوٹھی کوں حرمت نگینہ ہی لگ
دکھن ملک کوں دھن عجب ساج ہے ‏ ‏ کہ سب ملک سر اور دکھن تاج ہے
دکھن ملک بہوتچ خاصہ ہے ‏ ‏ تلنگانہ اس کا خلاصہ اہے

(وجہی)

جو کوئی یاد کرتا نہیں اپنا وطن ‏ ‏ او مردہ ہے پیرن ہے اس کا کفن
وطن سب کوں دنیا میں پیارا اہے ‏ ‏ سفر ہے سو جوں باد یارا اہے

(طبعی)

غزلیں

وجود اس کا یہ مانا کہ مختصر ہوگا
جو حادثوں میں پنپے گا وہ معتبر ہوگا

کسی کے واسطے بن جائے گا کبھی دیوار
کبھی کسی کے لئے وہ سراپا در ہوگا

نہ اس طرح سے مٹاؤ نقوش ماضی کے
کبھی کبھی تو ادھر سے مرا گزر ہوگا

کہاں پہ ٹھہریں گے دم لینے کو تھکے راہی
جو راہ میں نہ کہیں سایۂ شجر ہوگا

کبھی تو سایہ کریں گے سکون کے لمحات
کبھی تو درد کے سورج سے کچھ مفر ہوگا

اسی اک آس پہ ہی سعیٔ نو کی ہے تحریک
کوئی تو ہاتھ کبھی میری پشت پہ ہوگا

ڈاکٹر احسن رضوی

رہیں مجھ سے وہ بے خبر، دیکھنا ہے
دعاؤں کا اپنی اثر دیکھنا ہے
ان آنکھوں میں دل کا لہو موجزن ہے
ہیں اشکوں میں کتنے گہر، دیکھنا ہے
غموں کو چھپائیں گے آنکھوں میں کب تک
مجھے ان کو باچشم تر دیکھنا ہے
یہ رہزن ہیں سب رہبری کیا کریں گے
مجھے خضر سا راہبر دیکھنا ہے
مرے نام ہی سے جسے برہمی ہے
اسی کی مجھے رہگزر دیکھنا ہے
سر راہ بیٹھا ہوں وعدے پہ ان کے
کہاں تک وہ ہیں معتبر، دیکھنا ہے
نگاہوں کے پہرے ہیں محفل میں ہر سو
ترے دیکھنے کا ہنر دیکھنا ہے
نظیر اپنے غم کی یہ تاریک راتیں
کبھی آئے گی بھی سحر؟ دیکھنا ہے

نظیر صفی پوری

تیری جستجو میں ہم، جب کبھی نکلتے ہیں
منزلیں بھی چلتی ہیں راستے بھی چلتے ہیں
جب ہماری لغزش پہ کوئی مسکراتا ہے
اور مضطرب ہو کر گرتے ہیں سنبھلتے ہیں
زندگی سنورتی ہے اضطراب پیہم سے
رنج و غم کے شیدائی درد و غم میں پلتے ہیں
معترض جو تھے کل تک میری رہ نوردی پر
آج خود وہی میرے ساتھ ساتھ چلتے ہیں
حاصل گلستاں کچھ پھول ہی نہیں ہوتے
دامن گلستاں میں خار بھی تو پلتے ہیں
نذر کر چکا آخر اپنی جان پروانہ
چشم شمع محفل سے اشک غم جو ڈھلتے ہیں
ہر قدم پہ اک سجدہ فرض عشق ہے ساجد
ان کی رہگزر پہ ہم سر کے بل ہی چلتے ہیں

ساجد رضوی

غلام جیلانی

اُردو زبان کے چند مسائل

ہندوستان کے مختلف حصوں سے آوازیں بلند ہو رہی ہیں کہ اُردو زبان کو اس کا حق ملنا چاہیئے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سا حق ہے جو ملنا چاہیئے اور نہیں مل رہا ہے۔ اور یہ کہ اس حق کو کس نے غصب کر لیا ہے۔ اس سوال کے مختلف جواب ملتے ہیں ان جوابوں کو یکجا کر کے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اس ضمن میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ درست ہے کہ نہیں اور اگر درست نہیں تو درست کیا ہے اس ضمن میں جو کوششیں ہو رہی ہیں وہ اگر ناکافی ہیں تو سوچنا ہوگا کہ کن چیزوں کی کمی ہے۔ اب آیئے ان جوابات کو یکجا کریں۔

(۱) ہندوستان میں اُردو بولنے والوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ حکومت اس کو تسلیم نہ کر کے غلطی کر رہی ہے۔

(۲) ہندوستان میں بولی جانے والی زبانوں میں اردو ہی ایک ایسی زبان ہے جو لسانی تقاضوں کو پیدا کرنے کی قابلیت رکھتی ہے

(۳) ہندوستان کی ملی جلی تہذیب کا مشترکہ ورثہ ہونے کی حیثیت سے اُردو کو ایک قوم، ایک طبقے کی زبان کہنا سراسر ناانصافی ہے۔

(۴) اُردو ہی وہ زبان ہے جس میں زمانے، ضروریات زندگی اور ماحول کے مطابق تبدیلی قبول کرنے کی صلاحیت ہے۔

(۵) اُردو ہی وہ زبان ہے جو مختلف صوبائی زبانیں بولنے والوں کے لئے ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع دے سکتی ہے۔ اور اس طرح ان علاقوں میں ثانوی زبان بننے کی قابلیت رکھتی ہے۔

(۶) اردو زبان کی خاص خصوصیت جو شاید کسی اور زبان میں نہ مل سکے وہ یہ کہ اردو میں ہر موقع اور محل کے ایسے موزوں اشعار مل جاتے ہیں کہ جن سے مطلب نہ صرف واضح ہو جاتا ہے بلکہ تقریر ہو یا تحریر دونوں میں زور پیدا ہو جاتا ہے۔

جہاں تک پہلے جواب کا تعلق ہے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دستور ہند جب اس کے وجود کو قبول کر چکا ہے تو پھر حکومت کے تسلیم نہ کرنے کا کیا مطلب؟ اُردو کو ملک کی اول درجے کی زبان بنانے کا مسئلہ تو تقسیم ہند کے ساتھ ہی ختم ہو گیا بجز ایک یا دو صوبوں کے کبھی بھی اُردو کو علاقائی زبان قرار نہیں دیا جا سکتا۔ تو پھر علاقائی زبان بنانے کو ترجیح ہے تو کیونکہ علاقائی زبان کی بنا پر صوبوں کی تشکیل عمل میں آئی ہے تو کسی مخصوص شہر جیسے حیدرآباد جہاں اردو بولنے اور سمجھنے والوں کی اکثریت ہے اس کے لئے علٰحدہ زبان کا تعین ایک مہمل سی بات ہوگی۔ اگر حق تسلیم کرنے سے مطلب اُردو کو ذریعہ تعلیم بنانا سمجھتے [illegible] اس ضمن میں بہت دشواریاں سامنے آجاتی ہیں۔ پہلی دشواری تو خود مانگ کرنے والوں میں پھوٹ کی شکل میں نظر آتی ہے [illegible] ثانوی کلاس تک اس کو محدود کرنا چاہتے ہیں، چند وسطانیہ پر اکتفا کرتے ہیں اور چند تو اعلیٰ تعلیم بھی اُردو [illegible] ہیں۔

اب آپ ہی بتلایئے کہ حکومت تسلیم کرے تو کیا کرے۔ صرف ثانوی جماعتوں کی حد تک اُردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کا ادعا کرنے والے احباب کا استدلال ہوتا ہے کہ بچے کم عمری میں ہی اپنی زبان میں زیادہ آسانی سے اثرات قبول کرتے ہیں اور اس کی وجہ سے ان میں پڑھنے لکھنے کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ لیکن یہاں یہ استدلال ٹکراتا ہے مقامی یا صوبہ واری زبانوں سے۔ مقامی یا صوبہ واری زبان چونکہ اکثریت کی زبان ہوتی ہے اس لئے ان کے مقابلے میں اردو کو ترجیح دینا ناممکن ہوتا ہے۔ یہ درست ہے کہ ابتدائی جماعتوں میں ذریعہ تعلیم اُردو ہونے سے ان احباب کے بچے اُردو سے ناآشنا نہیں ہیں جن کی مادری زبان اُردو ہے اور یہ بھی درست ہے کہ اکثر گھرانوں میں مادری زبان اُردو ہونے کے باوجود ان گھرانوں کے بچے اُردو پڑھنا لکھنا یا تو بالکل نہیں جانتے یا جانتے بھی ہیں تو نہ جاننے کے برابر۔ لیکن جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس صورتحال کا علاج اُردو کا ذریعہ تعلیم بنانا نہیں بلکہ کچھ اور ہے اور اس ضمن میں مزید روشنی بروقت ڈالی جائے گی۔

ثانوی یا اعلیٰ تعلیم کے لئے اُردو کو ذریعہ تعلیم قرار دینے کی پیروی کرنے والوں کا استدلال ہوتا ہے کہ بجز اُردو کسی اور مقامی زبان میں لسانی تقاضوں کی تکمیل کی قابلیت نہیں۔ اس خصوص میں دعویدار عثمانیہ یونیورسٹی کے کامیاب تجربے کو ثبوت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ان بلند بانگ دعووں کی تکذیب اس بات سے ہوتی ہے کہ امتحانات اور زندگی دونوں مقابلوں میں صرف وہی طلباء کامیاب رہتے ہیں جو صرف اُردو ترجموں پر اکتفا نہ کرتے تھے بلکہ اوریجنل کتابیں اور مابعد آنے والی انگریزی کتابوں سے استفادہ کرتے تھے۔ اس کے ماسوا ان مدارس میں اُردو کو ذریعہ تعلیم کا ادعا کرنے والوں کو یہ سوچنا چاہیئے کہ ہندوستان میں جب اُردو دفاتر یا کاروباری اداروں میں استعمال ہونے والی زبان نہیں ہے تو اس زبان کو ذریعہ تعلیم بنا کر تعلیم پانے والے کریں گے کیا؟ پرانی مثل یاد آتی ہے کہ "پڑھے فارسی بیچے تیل" نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرونی ممالک میں بھی یہ لوگ کسی مقابلے میں سبقت حاصل کر سکیں گے۔ یہ درست ہے کہ "علم برائے علم" کو ماننے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ایسا کرنے والوں کی تعداد کتنی ہو گی کتنی ہو سکتی ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ ہندوستان کی ملی جلی تہذیب کے اس مشترکہ ورثہ کی لاپروائی برتی جا رہی ہے۔ اس خصوص میں بعض دلچسپ امثال سامنے آتے ہیں۔ مثلاً فلمی کہانیوں میں استعمال ہونے والی زبان جو بجز اُردو کے کچھ اور نہیں ہوتی اس کے باوجود فلم ہندی کی ہوتی ہے۔ بڑے شہروں کے بازاروں میں ایک اردو ہی ایسی زبان ہے جس سے بآسانی کام نکل جاتا ہے وہ شہر خواہ کسی صوبہ کا کیوں نہ ہو [illegible] پڑھنے اور لکھنے کی خواہش رکھنے والوں کو کسی قسم کی سہولتیں یا مواقع نہیں پیدا کئے جاتے [illegible] سے زیادہ کچھ نہیں کرتیں۔ زیادہ [illegible] اُردو سے وابستہ [illegible] کر دیتی ہیں لیکن نہ ایسی [illegible] اُردو [illegible] سے انکار نہیں لیکن [illegible] [illegible]

[illegible]

میں اردو مادری زبان کی حیثیت رکھتی ہے انہیں چاہیئے کہ بچوں کو شروع سے اردو پڑھنے لکھنے کی ترغیب دیں۔ نصابی تعلیم کے علاوہ اردو تعلیم کا انتظام کیا جائے۔

ایک اور دلچسپ ادعا یہ ہے کہ اردو ہی وہ زبان ہے جو ضروریات زندگی اور ماحول کے مطابق تبدیلی قبول کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس دعوے کی صحت پر کسی کو شک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس دعوے کے پس پردہ اردو والوں کی خواہش ہے۔ کیا یہ خواہش اردو کو ہندی پر ترجیح کی ہے۔ کیا یہ خواہش اردو کو علاقائی زبانوں پر ترجیح کی ہے۔ اگر ان اصحاب کا یہی خیال ہے تو کہنا پڑے گا کہ "ایں خیال است محال است و جنوں است"۔ اس سے ہٹ کر ایک بات لائق غور یہ ہے کہ اردو زبان میں ایسی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے لیکن اس صلاحیت سے فائدہ اٹھا کر اردو کی عظمت کو بڑھانے کے لئے اردو والے کیا کر رہے ہیں۔ وہ کہہ اٹھیں گے سینکڑوں نئی کتابیں چھپ رہی ہیں نئے نئے رسائل نکل رہے ہیں۔ صحافت کے میدان میں بھی اردو اخبارات اپنا مقام پیدا کر چکے ہیں۔ ان چیزوں سے انکار نہیں۔ دیکھنا ہے کہ اردو کی جو کتابیں ان دنوں منظر عام پر آ رہی ہیں وہ کیا زندگی کے جملہ تقاضوں کو پورا کر رہی ہیں۔ شعراء کے کلام کے مجموعے، ناول اور افسانوں کے مجموعے، مزاحیہ یا طنزیہ مضامین کے مجموعوں کی تعداد منظر عام پر آنے والی کتابوں کا ۹۰ تا ۹۵ فیصد ہوتا ہے۔ کبھی کبھی ایک آدھ کتاب تحقیقاتی موضوع کی مل جاتی ہے وہ بھی صرف قدماء اردو کے کلام یا ادبی کاوشوں پر تبصروں کی شکل رکھتی ہیں اور کبھی کبھی سوانح یا سفرنامہ قسم کی چیز سامنے آ جاتی ہے۔ تاریخ، علوم و فنون کی حد تک اردو میں جو کچھ قدما نے کیا ہے اس سے ہٹ کر کچھ نہیں ملتا۔ اس کمی سے متعلق کہا جاتا ہے کہ ایسی کتابوں کی جب تک مانگ نہ ہوگی وہ لکھی نہیں جا سکتیں۔ مانگ کیوں نہیں ہے کبھی اس پر غور ہوتا ہے؟ دراصل اردو کتابوں کی یوں بھی مانگ کم ہے اور ظاہر ہے کہ علوم و فنون کی کتابوں کی مانگ کم ہی رہے گی لیکن محض مانگ کی بناء پر ہی کتابوں کی اشاعت ہو تو پھر بلند بانگ دعوے بھی نہیں کئے جانے چاہئیں۔ تاریخ، علوم و فنون میں کتابیں لکھوانے کا کام اردو کی ترقی و بقا کے لئے کام کرنے والے اداروں کا فرض ہے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس فرض کی تکمیل کی طرف بہت کم توجہ دی جاتی ہے۔

اب آیئے دیکھیں کہ اردو کی ترقی و ترویج کے لئے کیا ہو رہا ہے۔ ہندوستان کے متعدد صوبوں میں حکومتوں کی سرپرستی میں اردو اکیڈیمیاں قائم ہو گئی ہیں۔ اگرچہ ان کی عمر ابھی کم ہے اس پر بھی جس راہ پر یہ چل رہی ہیں وہ کہاں تک صحیح ہے اس کا تعین ہونا چاہیئے۔ محض تازہ مطبوعات کو طلب کر کے مصنفین کو انعام یا مسودوں کی طباعت کے لئے مالی امداد فراہم کرنا کافی نہیں، اس کے برخلاف معقول معاوضہ دے کر اہل اصحاب سے علوم و فنون کی کتابیں لکھوانا چاہیئے تاکہ اردو میں صلاحیت کے باوجود تہی دامانی کے الزام سے بچ سکے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ ان اداروں میں خود غرض افراد اور حقیقی بہی خواہان اردو میں فرق نہیں کیا جاتا۔ اس کی وجہ سے حقیقی بہی خواہ نہ آزادی اور بے باکی سے کام کر سکتے ہیں اور نہ شر و فساد سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ اردو والوں میں کیچڑ اچھالنے کی عادت زیادہ پائی جاتی ہے۔ اصلاح کی غرض سے تنقید یا اعتراض کم۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اگر ایک ادارہ کچھ کام کرنے لگتا ہے اور کچھ مقبولیت حاصل کر لیتا ہے تو ساتھ ہی کئی اور ادارے ان ہی مقصدوں کو لے کر میدان میں اتر جاتے ہیں اور پھر ملنے والی امداد اور تعاون کے حصے بخروں کا دور شروع ہوتا ہے اور اس کے لئے مکروہ حرکتوں سے بھی باز نہیں آتے۔ اداروں کی کثرت پر اعتراض نہیں۔ اعتراض ان کے طریق عمل پر ہے۔ اگر ادارے مل جل کر کام کریں، مختلف صلاحیتوں سے مشترکہ

طور پہ کام کیا تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔

ہمارے اپنے خیال میں ذریعۂ تعلیم بنانے کا ادعا ترک کر کے پوری کوشش یہ ہونا چاہیئے کہ ہر تعلیمی ادارے میں، ہر منزل پہ اردو کی تعلیم کا اس طرح انتظام ہو کہ ہر وہ طالب علم جو اردو کو اختیاری یا زائد زبان کی حیثیت سے پڑھنا چاہے پڑھ سکے۔ ایسا انتظام کسی درجہ یا لیول کے لئے مخصوص نہ ہو بلکہ ہر منزل پہ ممکن ہونا چاہیئے۔ اس ضمن میں تعلیمی اداروں میں یہ شرط عائد ہو سکتی ہے جب تک ایسی تعلیم کی خواہش رکھنے والوں کی موزوں تعداد موجود نہ ہو انتظام نہ صرف بے سود ہوتا ہے بلکہ تعلیمی اداروں کے لئے گراں ثابت ہوتا ہے۔ ایسی شرط پہ اعتراض کرنا درست نہیں بلکہ اس کو قبول کرتے ہوئے اس کی تکمیل کی ترغیب دی جانی چاہیئے اور ہر وہ گھرانہ جس کو اردو مادری زبان رکھنے کا شرف یا دعویٰ ہے اپنے بچوں کو اردو بطور زائد زبان سیکھنے پہ مجبور کرنا چاہیئے تا کہ تعلیمی ادارے خواہش مند طلباء کی تعداد کے پیش نظر تعلیم کا انتظام کرنے پہ مجبور ہوں۔

جہاں تک اردو اشعار سے متعلق ادعا کا تعلق ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اردو اور خصوصاً اردو غزل کے اشعار کی یہ خوبی ہے کہ زندگی کے ہر مرحلہ اور موقع پہ چسپاں ہونے والا شعر مل جاتا ہے۔ یہ خوبی قدما کے کلام میں بھی تھی اور جدید شاعروں کے کلام میں بھی ہے۔ اردو کو اس میدان میں ایسا مایۂ ناز مقام ملنے کی ایک وجہ جو سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ اردو زبان کی ابتداء تو بول چال سے ہوئی لیکن ادبی کاوشیں اولاً منظوم ہی رہیں۔ مگر یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ محض یہ خوبی کیا زبان کی بقاء کی ضامن ہو سکتی ہے۔ اشعار کا خزانہ اپنی جگہ رہ جاتا ہے جب اس کے سمجھنے والوں کا وجود نہ ہو۔

ان کی شکایت درست ہے۔ اس شکایت کو دور کرنا ضروری ہے۔ عام کتب فروش کاروباری نکتۂ نظر سے صرف ایسی کتابوں کا اسٹاک رکھتے ہیں جو جلد بک جاتی ہیں۔ ان کا ایسا کرنا ضروری ہے لیکن اردو کی ترقی سے دلچسپی رکھنے والے اداروں کو چاہیئے کہ موزوں مقامات پر اردو کے معیاری کتب کی فروخت کا انتظام کریں۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ کئی سال پہلے انجمن ترقی اردو کی جانب سے عابد روڈ پر اس نوع کی دوکان قائم ہوئی تھی اور اہل ذوق کو بہ آسانی معیاری کتب مل جایا کرتی تھیں۔ غالباً ربع صدی کے بعد آندھرا پردیش اردو اکیڈمی نے اب ویسا ہی انتظام کیا ہے۔ اکیڈمی کا یہ اقدام قابل مبارکباد ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ نہ تو یہ انتظام موزوں مقام پہ ہوا ہے اور نہ مکمل ہے۔ مزید وسعت دینا اور موزوں مقام کا انتخاب کرنا ضروری ہے۔ یہاں ایک اور بات بھی لائق ذکر ہے وہ یہ کہ اردو کے معیاری کتب سے دلچسپی رکھنے والے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک تحقیقاتی میدان کے طلباء، دوسرے اہل ذوق۔ تحقیقاتی میدان کے طلباء اپنی ضرورت پبلک یا کالجوں کے کتب خانوں سے پوری کر لیتے ہیں اور اہل ذوق بہت کم کتاب کی تلاش میں نکلتے ہیں لیکن اگر کتاب کہیں نظر آ جائے تو خریدنے سے پیچھے نہیں ہٹتے اس لئے منظر عام پر معیاری کتب کو لانا ضروری ہے۔ مثال کے طور پہ پالم ایئر پورٹ کو ہی لیجئے یا بمبئی اور حیدرآباد اور لکھنؤ کے ایر پورٹ۔ یہ وہ مقام ہیں جہاں قیمتی سے قیمتی کتب فروخت ہو سکتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ انگریزی کی جس قدر کتابیں فروخت ہوتی ہیں ان کا مقابلہ تو ممکن نہیں لیکن اردو کی معیاری کتب موجود ہوں تو ان کی نکاسی بھی ہو سکتی ہے۔ مگر کس قدر افسوس ناک بات ہے، ان ہوائی اڈوں پر اردو کی ایک بھی کتاب نظر نہیں آتی۔ ریلوے اسٹیشنوں کے بک اسٹال میں اول تو اردو کی کتابیں ہوتی کم ہیں اور اگر ہوتی بھی ہیں تو صرف فلمی یا جاسوسی ادب کی حد تک [illegible]۔ اردو کے ناشرین کو چاہیئے کہ وہ ان مقامات تک اپنی کتابوں کو پہنچانے کی سعی کریں۔

بقیہ صفحہ ۲۲ پر دیکھئے

مصطفیٰ شروانی

اُردو کے بعض گمنام شعراء

کبیر داس کا ایک مشہور دوہا ہے ؎

پوتھی پڑھ پڑھ جگ موا پنڈت بھیا نہ کوئے ۔۔۔ چار اکشر پریم کے پڑھے سو پنڈت ہوئے

کبیر کے مافی الضمیر کو اردو شاعری پر پھیلا دیجئے۔ یوں محسوس ہوگا کہ شاعر شہرت کے کتنے ہی بلند مقام کو چھو جائے اگر اس کی فکرِ سخن میں درد نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ معاملے اور معنی آفرینی کی ہر منزل پر رنگ و نور کی گلکاریاں ہی رہروانِ سخن کو اونچے درجے عطا کر سکتی ہیں۔ ہندوستان میں اُردو شاعری کے افق پر اَن گنت ستارے چمکے بہت سے روشن رہے، کچھ مدھم ہو گئے، ماند پڑ گئے اور ڈوب گئے مگر تھوڑی سی تلاش و جستجو سے اس بحرِ ناپیدا کنار میں وہ آبدار موتی بھی ملتے ہیں جن کی چمک دمک کبھی کم نہ ہوگی بلکہ بڑھتی ہی رہے گی۔ بہ تصرف عبد اللہ بیدلؔ بیکانیری ؎

محرمانِ کیف و سرمستانِ گلشن کے لئے ۔۔۔ گلشنِ عالم میں ہر گل میکدہ بردوش ہے

مارچ ۱۹۴۰ء میں حلقۂ ادب لکھنؤ سے جناب سبط حسین نے انقلابی نظموں کا ایک مجموعہ موسومہ "آزادی کی نظمیں" شائع کیا تھا جسے ۱۹۴۲ء کی آزادی کی جدوجہد کے دوران برطانوی حکومت نے ممنوع قرار دے کر اس کے ساری موجودہ نسخے ضبط کر لئے تھے۔ اس مجموعہ میں جہاں غالبؔ، محمد حسین آزادؔ، حالیؔ، شبلیؔ، چکبستؔ، حسرتؔ اور جوشؔ جیسے اساتذہ کا کلام ہے وہیں ایک بالکل گمنام شاعر رضا نقوی کی ایک نظم "مانجھی" بھی شریکِ انتخاب ہے۔ یہ نظم آج سے تقریباً چالیس سال بیشتر انگریزی حکومت کے ظلم و جبر و استبداد کے خلاف کہی گئی تھی مگر اس کے بعض اجزا آج بھی زمانہ کی تیر مجبوریوں سے ہم کنار محسوس ہوتے ہیں ؎

بیکل ہے ہواؤں میں کشتی سرکش جھونکوں کو کیا کہیے ۔۔۔ باہر طوفاں، اندر طوفاں من کی لہروں کو کیا کہیے

بہر بھرا ہے، اک دریا مانجھی

ہاں کشتی تیز چلا مانجھی

اس پار ہمیں لے چل مانجھی فطرت کو جہاں آزادی ہے ۔۔۔ کہتے ہیں جسے روحوں کا وطن روحوں کو جہاں آزادی ہے

رہتی ہے جہاں راحت مانجھی

ہاں کشتی تیز چلا مانجھی

ایک اور بالکل گمنام شاعر حکیم معشوق علیخاں جوہر کا تذکرہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ حکیم جوہر ۱۸۵۲ء

میں شاہجہاں پور میں پیدا ہوئے۔ وہاں میں تعلیم پائی۔ لکھنؤ میں طب کی مہارت حاصل کی بھوپال میں شعر و سخن کی محفلوں کو جگمگایا حیدرآباد میں عرصہ تک وکالت کرتے رہے ہیں ۱۹۲۸ء میں شاہجہاں پور میں اپنی وفات سے دو مہینے پہلے خود اپنا مادۂ تاریخ وفات "کل نفس ذائقۃ الموت" کہہ کر رحلت کر گئے۔ ۱۹۰۸ء میں حیدرآباد پہنچنے کے بعد حکیم جی کو عزیز مرزا مرحوم آنجہانی مہاراجہ کشن پرشاد شاد کے پاس لے گئے۔ مہاراجہ بہادر نے حکیم صاحب سے کوئی نظم سنانے کی فرمائش کی۔ حکیم جوہر نے عرض کیا "پرانی چیز کیا پیش کروں کوئی مصرعہ عطا ہو اس پر طبع آزمائی کروں" مہاراجہ بہادر نے اپنی ہی غزل کا مصرعہ دیا۔ "ادھر دل شاد ہوتا ہے اُدھر ناشاد ہوتا ہے" ساتھ ہی یہ بھی فرمائش کی کہ "حکیم صاحب۔ مادرزاد" کے قافیہ کو نہ بھولیے گا"

تھوڑی ہی دیر میں حکیم جوہر نے فی البدیہہ پندرہ سولہ شعر کی غزل مہاراجہ کی خدمت میں پیش کر دی جس کے دو شعر یہ ہیں ۔

چمن میں ہر طرف شورِ مبارکباد ہوتا ہے
کوئی بلبل اسیر پنجۂ صیاد ہوتا ہے

ازل سے یہ اسیرِ دامنِ صیاد آئی ہیں
گلو میں قمریوں کے طوق مادرزاد ہوتا ہے (حکیم جوہر)

حکیم جوہر شعری معمہ گوئی میں کمال قدرت رکھتے تھے۔ باہر مرزا مرحوم کے نام کا دلچسپ شعری معمہ یوں کہا ہے

قبا بر قدِ تو می دوزد ایام
بیا از قاف تا قاف اے پسر نام

(یعنی اپنا نام قاف سے قاف تک نکالو۔ قبا برقد میں دو قاف کے درمیان "بابر" کا لفظ ہے) صنعت غیر منقوطہ (بغیر نقطہ) میں جوہر کا ایک استادانہ خط فنکارانہ تجربہ میں لاثانی ہے۔ "والا گہر۔ کل طوطا رام مددگار محکمہ ڈاک کا کارڈ ملا اور آم کا ٹوکرا وصل ہوا۔ مدد مہر و کرم ہوا اور اس دم سرکار کا مرسلہ مراسلہ رسالۂ الہلال مع مسودہ کلام اور سردار گوہر سرور کا لکھا ہوا سورۂ "الحمد" کا حصہ ملا۔ دل مسرور رہا۔ سرور کا سکہ مسکوک اور دل کا الم دور ہوا۔ الکلام کلام سرکار کو کلام الملوک ملک الکلام کہو مگر گوہر سرور کا طور اور مدح کس طرح ادا ہو۔ ہر سطر کو سلکِ گوہر دار، ہر دائرہ کو سلکِ مسلسل لکھو سو کم۔

" ہمارا حال معلوم ہوا ہوگا۔ ماہ دو ماہ کا عرصہ ہوا کہ مسکمہ درد اور آلام ہوا ہوا ہر ایک کا گلِ مراد کھلا مگر کام انکار ہا سو ہمارا۔ اللہ رحم کرے حاصل کلام سرکار کو سلام اور طوطا رام کو رام رام۔ دعاگو ــ گوہر "

تین سو سال پہلے دورِ اکبری میں ابوالفضل نے کلام پاک کی تفسیر بے نقط فارسی میں لکھی تھی اردو زبان میں اس صنفِ سخن میں حکیم جوہر نے پہلی بار طبع آزمائی کی تھی ۔

دہلی کے مرحوم شاہی خاندان کے ایک چشم و چراغ مرزا فخرالدین فخرو جنھیں دہلی والے پیار سے مرزا چپاتی کہتے تھے بہت بامعنی شاعری کرتے تھے۔ ان کی ایک خوب صورت غزل کے چند شعر ہیں ۔

صراف کسوٹی پہ گھسا کرتے ہیں زر کو
ہم وہ ہیں جو آنکھوں سے پرکھتے ہیں بشر کو

دل ملنے کے ہیں چند نتیس عدد حرف بھی دو ہیں
بے لکھے سمجھ لیتے ہیں ہم زیر و زبر کو

اِن چار عدد کو جادو سے ستم دیکھا ہے فخرو
اک حسن کو، آواز کو، دولت کو، ہنر کو (مرزا فخرو)

پنجاب میں لالہ جلاق لال کا ظریفانہ کلام تجنیس نگاری کا بے مثل مرقع ہے۔ حقے کی چلم ٹوٹنے پر ملاحظہ فرمائیں لالہ جی نے جو

چلم حقے کی ٹوٹی کیا ستم ہے آسمان ٹوٹا
کہ خاکی حقہ زر تشتی کا بستی نزد یہاں ٹوٹا

چلم حقے کی ٹوٹی اور دل اپنا یہاں ٹوٹا
یہ دل اپنا ہیں ٹوٹا دل کرو بیاں ٹوٹا (حاجی لق لق)

حاجی لق لق نے ایک ڈرامہ لکھا تھا "فرشتوں کا امتحان" اسے ۱۹۳۷ء میں امرتسر کے ایک گمنام شاعر سید خادم حسینی خادم نے پنجاب اکیڈیمی امرتسر کے ذریعہ منظوم شکل میں شائع کیا اس منظوم ڈرامہ کا صرف ایک ہی شعر قومی جذبات نگاری کا نمونہ ہے ؎

اپنے وطن کی آبرو اہلِ وطن سے ہے
بلبل کے چہچہوں سے نہ شور زغن سے ہے (خادم امرتسری)

غالب کا شعر ہے ؎

یہ مسائلِ تصوف، یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

لیکن ایک بالکل ہی غیر معروف شاعر راد ھولال مست نے کچھ اور ہی کہہ دیا ہے ؎

وہ لحد میں بوئے مے تھی کہ نہ آسکے فرشتے
میں عذاب میں پھنسا تھا جو نہ بادہ خوار ہوتا (رادھولال مست)

اسی موضوع پر اس سے ذرا کچھ ہٹ کر دہلی کے پنڈت ہری چند اختر نے یہ معنی خیز شعر کہہ دیا ؎

خدا تو خیر مسلماں ہے اس سے کیا شکوہ
مرے لئے مرے بھگوان نے بھی کچھ نہ کیا (ہری چند اختر)

مشہور فلمی مغنی اور گلوکار کندن لعل سہگل کے انتقال پر موسیقار اور شاعر نوشاد نے جو شعر کہے اپنی نفاست اور خوب صورتی میں لاجواب ہیں ؎

کوئی چیز شاعر کی ہمساز ملتی
کوئی نغمے مطرب کی دمساز ملتی
یہ کہتا ہے ہر شعر کاغذ پہ آکر
مجھے کاش سہگل کی آواز ملتی

*

ایسا کوئی فن کار مکمل نہیں آیا
نغموں کا برستا ہوا بادل نہیں آیا
موسیقی کے ماہر تو بہت آئے ہیں لیکن
دنیا میں کوئی دوسرا سہگل نہیں آیا

اس نامکمل سے جائزے کے ختم پر حضرت صفی لکھنوی کے چھوٹے بھائی سید مقبول حسین ظریف لکھنوی کی (بعنوان شفیق تخلص) نظم میں خوبصورتی سے شاعری اور شاعروں پہ طنز کیا گیا ہے وہ بے محل نہ ہوگا ؎

بھائی ہوا بکس جس بستی میں ہم آباد ہیں
اس جگہ سالہ بڑے بڑھیا ہیں مادر جاد ہیں

ان سبھوں میں سیکھ پر تو اک بجٹ استاد ہیں
ان کو ہر موسم کے کی غزلیں منہ جبانی یاد ہیں

جس جگہ استاد نے دو تین غزلیں جھاڑ دیں
شاعروں نے ہو کے شرمندہ بیاضیں پھاڑ دیں

حیدرآباد کے شاعر (۱۳)

ناصر کرنولی

۱۹۶۲ء میں ساہتیہ اکیڈمی کے مطبوعہ تذکروں کا سلسلہ ـ ۱۳

عبدالرحمٰن خاں ناصر کرنولی، جولائی ۱۹۳۲ء میں کرنول (آندھرا پردیش) میں پیدا ہوئے۔ والد جناب موسیٰ رضا خاں اس لحاظ سے خوش نصیب کہلائے جا سکتے ہیں کہ ان کے صاحبزادے اردو شعر و ادب کا صحت مند ذوق رکھتے اور پیشۂ تدریس سے عبارت ہیں۔ ناصر آندھرا تہذیب اور دکنی کلچر کا خوشگوار امتزاج ہیں۔ جنوبی ہند کے سرسید ڈاکٹر مولوی عبدالحق اور عثمانیہ کالج کرنول سے ان کی فکر و نظر جلا پاتی ہے۔ لسانی تقسیم سے پہلے کل آندھرا انجمن ترقی اردو کے معتمد کی حیثیت سے اردو زبان اور ادب کو فروغ دینے میں ناصر نے نمایاں خدمات انجام دیں۔ ۱۹۵۶ء میں جب ان کا گھرانہ بالکلیہ حیدرآباد منتقل ہوا تو ناصر نے جامعہ عثمانیہ میں داخلہ لیا اور ۱۹۶۰ء میں ایم اے کیا۔ ان دنوں "مجلہ عثمانیہ" کی ادارت کے فرائض بھی تمام و کمال خوش اسلوبی سے انجام دیئے۔ ۱۹۶۱ء سے ویویک وردھنی ایوننگ کالج میں شعبۂ اردو کے لکچرار کی حیثیت سے کارگذار ہیں۔ شعری تخلیقی صلاحیتیں ابتداء ہی سے درخشاں رہیں، آندھرا علاقہ میں اردو زبان و ادب کی رفتار اور ادبی ورثہ پر کئی تحریریں ملک کے اہم رسائل و جرائد میں شائع ہوئیں۔ نظم اور غزل پر یکساں عبور ہے، پڑھتے بھی خوب ہیں۔ کلام میں سلاست، عصری شعور اور کلاسیک کی مہک پائی جاتی ہے۔ ۱۹۵۸ء میں شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ کے مقابلہ شعر میں ان کی غزل کو انعام اول بھی ملا۔ ترقی پسند اقدار عزیز ہیں اور ریاستی انجمن ترقی پسند مصنفین کے جوائنٹ سکریٹری بھی ہیں۔ ۱۹۶۲ء سے ماہنامہ "پونم" انہماک اور توجہ سے نکال رہے ہیں اور دل کا بیشتر حصہ "پونم" کو صحت مند اور حسین بنانے کے حق میں گھلاتے ہیں۔ اہم رسائل و جرائد میں کلام چھپتا رہتا ہے اور آل انڈیا ریڈیو کے مختلف مرکزوں سے سنا جاتا ہے۔ "آندھرا میں اردو زبان و ادب کے ارتقاء" پر ریسرچ مکمل کیا ہے۔ کاش یہ مقالہ شائع ہو جائے۔ (د، خ)

جب بھی تہذیب کی قدروں کو بدلتے دیکھا
وقت کو ہم نے سانچوں میں ڈھلتے دیکھا

خار و خس پر نہیں موقوف بہاروں کا کرم
گل شاداب کو بھی خون اگلتے دیکھا

ایک امید کہ لمحے کا سہارا لے کر
کتنے جذبات کو صدیوں سے بہلتے دیکھا

جگنو پہ ہوتا تھا گماں آہنی چٹانوں کا
وقت کی دھوپ میں اہراموں کو بھی پگھلتے دیکھا

دوستی ان سے ہے ناصر کو، محبت تو نہیں
اس تعلق پہ بھی احباب کو جلتے دیکھا

●

یادِ ماضی سے الجھتے رہے پیکر کتنے
شیشۂ دل پہ برستے رہے پتھر کتنے

گونگے لفظوں میں مرے قید ہیں معنی کیا کیا
نازِ سادہ میں پوشیدہ ہیں نشتر کتنے

لغزشِ پا سے سنورتی گئیں گلیاں کتنی
سرخرو ہم سے ہوئے راہ کے پتھر کتنے

دوستی جن سے عبارت ہے تعجب ہے وہی
آستینوں میں چھپا رکھے ہیں خنجر کتنے

دل بھی آئینہ سے کچھ کم نہیں ہوتا ناصر
دیکھ لو اس میں وفاساز ہیں پیکر کتنے

●

ضمیر سر بہ گریباں ہے عمر بھر کے لئے
سزا ملی وہ تمنائے بے خبر کے لئے

خیالِ یار ہے یا کوئی برگِ آوارہ
جو گلستاں کے لئے ہے نہ دشت و در کے لئے

غرور ہے کہیں ٹوٹ جائے گا شاید
ہیں کب سے منتظر الزام میرے سر کے لئے

وفا نہیں تو فریبِ وفا ہی سہی
بہل تو جاؤں کسی طرح عمر بھر کے لئے

سلگتے وقت کے صحرا میں زندگی ناصر
ترس رہی ہے کسی سایۂ شجر کے لئے

●

مت پوچھئے کس کرب سے دوچار ہوئے ہیں
جذبات جو شرمندۂ اظہار ہوئے ہیں

حیرت ہے کہ اس دور کے اربابِ محبت
حالات سے سمجھوتہ پہ تیار ہوئے ہیں

دیوانگیٔ شوق میں جب بات بڑھی ہے
شائستہ تقاضے بھی گنہگار ہوئے ہیں

کب مصلحتِ وقت کا سیلاب رُکا ہے
کب قول و قسم راہ کی دیوار ہوئے ہیں

اک شوخ نگاہوں سے پلانے پہ بضد ہے
ناصر کے بہک جانے کے آثار ہوئے ہیں

پروین ممتاز حسین

ایک خیال دو شاعر

"سب رس" ماہ دسمبر جنوری ۷۸ء ۱۹۷۷ء میں جناب رشید قریشی کا مضمون پڑھنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہونچی ہوں کہ اسی عنوان پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ کاش ادارۂ "سب رس" اس عنوان کے تحت ہر شمارے میں ایسے اشعار کے سلسلہ کا آغاز کرے اور مضامین لکھنے والوں کو اس عنوان پر لکھنے پر آمادہ کرے۔ اس خیال کے تحت میں نے قلم اُٹھانے کی جراءت کی ہے۔ اور اس ضمن میں یہ جسارت بھی کرنا چاہتی ہوں کہ بعض اوقات ایک خیال صرف دو شعراء کے ہاں ہی نہیں بلکہ کئی شاعروں کے ہاں بھی ملتا ہے۔ میر تقی میر کا شعر ملاحظہ کیجئے ؎

سرہانے میر کے آہستہ بولو ابھی ٹک روتے روتے سوگیا ہے

اس شعر کا پس منظر میر کی سو سالہ غم و اندوہ سے بھری زندگی ہے۔ اس پس منظر کا صرف ایک مصرعہ میں کہ "ابھی ٹک روتے روتے سوگیا ہے"۔ جو عکس سامنے آتا ہے اس کا جواب ملنا دشوار ہے۔ وہ میر ہی تھے جو اس سادگی سے یہ بات کہہ گزرے۔ اب آئیے۔ دیکھیں اس خیال کو اُن ہی کے ہم عصروں نے کس طرح پیش کیا ہے۔ سودا کے ہاں یہی خیال رسوم و عزا کے سے ملتا ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

سودا کی جو بالیں پہ ہوا شورِ قیامت خدّام ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

اللہ رے زور بیان۔ ابھی آنکھ لگی ہے۔ پر غور کیجئے۔ گو "خدام ادب" کے استعمال سے تعلّی کا پہلو ضرور اُبھرتا ہے لیکن اُردو شعراء میں سودا کے مقام کے لحاظ سے ایسی تعلّی بیجا نظر نہیں آتی۔ میر اور سودا کے ایک اور ہم عصر بقاؔ دہلوی نے اس خیال کو یوں پیش کیا ہے ؎

اے شورِ قیامت یونہی افسانہ کہے جا آج آنکھ بقاؔ کی بڑی مشکل سے لگی ہے۔

مصرعہ ثانی میں بے ثباتیٔ حیات کے ساتھ ساتھ حیات و موت کے معاملہ میں انسان کی بے بسی کو کس قدر خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے وہ لائقِ غور ہے۔ اسی طرح میر تقی میر کا مشہور شعر ؎

میرے تغیر حال پر مت جا اتفاقات ہیں زمانے کے

سادگی و پُرکاری کی بہترین مثال ہے۔ اسی خیال کو خواجہ میر دردؔ نے یوں ادا کیا ہے ؎

میرے تغیرِ رنگ کو مت دیکھ یوں بھی اے مہرباں ہوتا ہے

اور مومن خاں مومن نے جو ندرت پیدا کی ہے۔ وہ قابل غور ہے ؎

میرے تغیرِ رنگ پہ مت جا یوں بھی اے مہرباں پڑتی ہے۔

متذکرہ بالا تینوں اشعار ظاہری طور پر الفاظ کے الٹ پھیر کی مثال ہیں لیکن اسی الٹ پھیر سے ان شعراء کے مزاج کا پتہ چلتا ہے۔ تیرو ماکا یہ شعر ملاحظہ فرمایئے ؎

گدا دست اہلِ کرم دیکھتے ہیں ہم اپنا ہی دم اور قدم دیکھتے ہیں

اسی خیال کو غالب کے ہاں دیکھئے ؎

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

اسی لئے غالب کا یہ کہنا " غالب کا ہے اندازِ بیاں اور " بے جا نہیں

غالب کے اس شعر میں جو بات استعارہ کے ذریعہ کہی گئی ہے۔ وہی چیز امیر مینائی کے ہاں خالص تغزل میں ملتی ہے

ترے تیرِ نیم کش کو کوئی میرے دل سے پوچھے وہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا
جو نگاہ کی تھی ظالم تو پھر آنکھ کیوں چرائی وہی تیر کیوں نہ مارا جو جگر کے پار ہوتا

ایک خیال کا دو یا دو سے زائد شعراء کے ہاں پائے جانے کی بات صرف قدما پر موقوف نہیں چنانچہ ماہر نادری کا یہ شعر پیش ہے ؎

مرے زخمِ دل کا مقدر تو دیکھو نگاہوں سے ٹانکے دیئے جا رہے ہیں

اس سے ملتا جلتا خیال ساغر نظامی کے ہاں یوں ملتا ہے ؎

کرم کی یہ مجبوریاں توبہ توبہ نظر سے دلاسے دیئے جا رہے ہیں

کیفی حیدرآبادی کے اس شعر کو ملاحظہ فرمائیے ؎

یہ تاروں کی بے ڈول جھلکاریاں ہیں تماشا ہے پانی میں چنگاریاں ہیں

اسی خیال کو اُن ہی کے شاگرد صفی اورنگ آبادی یوں لے اڑے ہیں ؎

مرے آنسوؤں نے جلایا عدو کو تماشہ ہے پانی میں چنگاریاں ہیں

انداز ہو بہو تری آوازِ پا کا تھا دیکھا نکل کے گھر سے تو جھونکا ہوا کا تھا
(احمد ندیم قاسمی)

دیکھا تو وہ جھونکا تھا نسیمِ سحری کا دھوکہ یہ ہوا تھا کہ صدا آپ نے دی ہے
(خورشید احمد جامی)

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا (غالب)
دیکھو تو صاف کر کے کتابِ گزرِ روزگار طاق کے ورق پہ نام ہے کس کا لکھا ہوا
(خورشید احمد جامی)

قند مکرر

مرزا ظفر الحسن

مخدوم کے نثری مضامین

پھول اور پتھر : مخدوم نے یہ چھوٹی سی کہانی ۱۹۳۰ء میں لکھی جب وہ انٹرمیڈیٹ کا طالب علم تھا۔ دوسری تحریروں کی طرح یہ بھی مخدوم نمبر صبا میں شائع ہوئی ہے (ص ۲۵۶) اس کا پلاٹ مختصر مگر موضوع موثر ہے۔ کردار پتھر، کلیاں اور پھول ہیں۔ بلکہ صرف پتھر اور کلیاں کیونکہ ان ہی کے درمیان مکالمے ہوتے ہیں۔ کلیاں پتھر کے بے مصرف ہونے کا ذکر کرکے اس کا مذاق اڑاتی ہیں۔ جس کا پتھر کو اتنا غم ہوتا ہے کہ وہ کالا پڑ جاتا ہے۔ کلیوں کو اپنے بے جا مذاق کا احساس ہوتا ہے اور غم سے وہ پیلی پڑ جاتی ہیں۔ ایک دن ایک پاگل کا ادھر گزر ہوتا ہے۔ پاگل کے دل میں ایک مورت تھی۔ پاگل نے (اس) پتھر سے ایک مورت بنائی۔ بڑی حسین۔ زمین نے اس مورت کو دیکھ کر کہا " یہ دیوی ہے " آسمانی۔ پھر پتھر نے کلیاں چن کر انہیں اس مورت کے قدموں میں ڈال دیا۔ کلیوں نے آنکھ کھولی اور مسکرا دیں "

میں نے معلوم کرنے کی کوشش کی کہ یہ کہانی مخدوم کی پہلی تخلیق ہے کہ نہیں۔ مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ میرا قیاس کہتا ہے کہ اس سے پہلے اس نے کوئی اور کہانی یا مضمون نہیں لکھا۔ اگر لکھا تو وہ شائع نہیں ہوا یا شائع ہوا تو میری دسترس میں نہیں ہے۔

پھول اور پتھر پہلی بار ماہ نامہ "سب رس" حیدرآباد دکن کے فروری ۱۹۳۸ء کے شمارے میں شائع ہوئی (ص ۸) جہاں سے مخدوم نمبر صبا میں نقل کی گئی۔ اگر مخدوم نمبر میں پہلی اشاعت کا حوالہ دے دیا جاتا تو اس سے کم ازکم یہ تو ضرور ہی معلوم ہو ہی جاتا کہ یہ فروری ۱۹۳۸ء سے پہلے کی تخلیق ہے۔

آدم کی اولاد : یہ کہانی بھی مختصر ہے اور ہسپانوی سے ماخوذ۔ "سب رس" حیدرآباد دکن میں شائع ہوئی ہے۔ دسمبر ۱۹۳۸ء ص ۴۱ - ہسپانوی کہانی نویس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ مرکزی خیال یہ ہے کہ دنیا کی بہت سی معاشی اور معاشرتی خرابیوں کی ذمہ داری حوا پر ہے۔ آدم اور حوا جنت بدر ہوئے۔ زمین پر بہو بچے، بائیس بچوں کو جنم دیا اور بڑی مفلوک الحال زندگی بسر کی۔ گاؤں کا بڈھا چودھری کھیت کے اپنے ساتھی مزدوروں کو اماں حوا کی کارستانیاں سناتے ہوئے یہ کہانی بیان کرتا ہے۔

ایک دن آسمانی خداوند کا زمین پر نزول اجلال ہونے والا تھا۔ جس کی اطلاع ایک فرشتے نے حوا کو دی۔ حوا نے صرف تین بچوں کو اپنے ساتھ رکھا بقیہ کو جانوروں کے کوٹھے میں بند کرکے خداوند کی تشریف آوری کا انتظار کرنے لگیں۔ خداوند زمین پر اترے اور اپنی نرم مسکراہٹ سے آدم کی مزاج پرسی کی۔ حوا کو تکلم سے سرفراز فرمایا۔ خداوند کی اس عنایت سے گناہگار جوڑے کا دل پسیج گیا۔ طلبی پر تینوں بچے حاضر کئے گئے تو خداوند نے ایک کو دیکھ کر کہا کہ یہ قاضی ہوگا۔ عدل کرے گا، چند خصوصیات بھی بتلائیں۔ دوسرے کے متعلق کہا کہ یہ سپہ سالار ہوگا اور انسانوں کو اس طرح ہانکے گا جیسا کہ بکروں کو مسلخ کی طرف ہانکا جاتا ہے۔" تیسرا بچہ پیش ہوا تو فرمایا" تو عوام کا خون چوس کر تا ج و تخت

کی رگوں میں پھوٹے گا۔ تو مہاجن ہوگا۔"

حوّا نے باقی اُنیس بچوں کو جانوروں کے کوٹھے سے نکال کر پیش کیا۔ اور استدعا کی کہ کچھ انہیں بھی عطا ہو۔ پہلے تو خداوند نے کہا "ان کے (تین) بھائیوں نے سب کچھ لے لیا ہے" اس کے بعد کہا "ہم غور کریں گے اور دوبارہ ملاقات پر دیکھیں گے" اور آخر میں فرمایا "ان کی تقدیر میں یہی ہے کہ یہ دوسروں کا پیٹ پالیں اور خدمت گزاری کریں۔"

معلوم ہوتا ہے مخدوم نے یہ کہانی بڑی عجلت میں لکھی ہے اور اس پر کوئی خاص محنت نہیں کی ہے۔ دکنی الفاظ استعمال کئے ہیں جملوں میں روانی نہیں ہے۔ بعض مکالمے بے ربط ہیں اور کہانی میں روانی نہیں ہے۔

کھوئے ہوئے تارے یہ بھی مختصر کہانی ہے۔ ۱۹۳۵ء میں لکھی گئی تھی۔ (ص ۳۵۸) یہی وہ سال ہے جس میں مخدوم کا پہلا ڈرامہ اسٹیج ہوا اور اس سے پہلے وہ اپنی نظم "پیلا دوشالہ" کی وجہ سے کافی مقبول و معروف ہو چکا تھا۔ کہانی کا پلاٹ مختصر، موضوع اثر انگیز اور کردار صرف چار ہیں۔ دو فرشتے، ایک شاعر اور شاعر کی محبوبہ۔ ہیلائیل اور جنائیل نام کے دو فرشتے آسمان پر تاروں کو گیند بنا کر ان سے کھیل رہے تھے کہ دو ستارے آسمان پر سے نیچے گر گئے۔ اور آسمان کے حکمران نے انہیں تلاش کرنے کا حکم دیا۔ فرشتوں کو پتہ چلا کہ شاعر کی محبوبہ کی آنکھوں میں "ایک الوہی چمک" ہے۔ جس سے انہوں نے نتیجہ نکالا کہ یہ آنکھیں نہیں آسمان کے گم شدہ تارے ہیں۔ فرشتوں کی آسمان سے مسلسل جلاوطنی کی سزا کی معافی کی یہی صورت تھی کہ انہیں شاعر کی محبوبہ کی آنکھیں دلوادی جائیں۔ شاعر کی محبوبہ اپنی آنکھیں فرشتوں کے معائنے کیلئے پیش کرتی ہے جنھیں فرشتے گم شدہ تارے تسلیم نہیں کرتے اور واپس چلے جاتے ہیں۔ محبوبہ شاعر سے کہتی ہے "جب وہ فرشتے مجھے دیکھ رہے تھے تو میں نے خود پر اس احساس لذت کو طاری کیا تھا جو تمہارے بوسۂ اولین سے مجھ میں پیدا ہوا تھا۔ میں جانتی تھی کہ اس مسرت کی یاد میری آنکھوں میں اجرام فلکی سے زیادہ روشنی اور چمک پیدا کر دے گی۔

پاپن میرے اور مخدوم کے ہمدم دیرینہ علی احمد مرحوم کو ایک رسالہ نکالنے کی سوجھی۔ اس یار طرحدار کا مفصل ذکر میں ماضی میں لکھ چکا ہوں۔ (ذکر یار چلے ص ۱۹۰) باقاعدہ رسالے کیلئے سرمائے کی ضرورت تھی۔ اور سرکار سے منظوری لینی پڑتی تھی۔ علی احمد ملازم سرکار تھا اور ہم سب قلاش۔ اس لئے ہم نے مشورہ دیا کہ "داستان گو" کو رسالہ نہیں ایک مسلسل کتاب قرار دے کر ہر ماہ ایک قسط شائع کرو۔ بارہ اقساط کی قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے اور ایک قسط دو آنے کی۔

پاپن داستان گو سے نرگس نے نقل کیا اور وہاں سے نقش و نگار مورخہ ۸ رمئی ۱۹۴۱ء نے حاصل کیا۔ اور اب غالب لائبریری میں محفوظ ہے۔ خدا کی عدالت میں خاموشی ہے۔ پاپن کی پیشی ہوتی ہے جس پر الزام ہے کہ اس نے کہا "خدا غافل سو رہا ہے" پاپن عرض کرتی ہے میں نے ماں باپ کا چھوڑا ہوا اثاثہ فروخت کر کے اپنا پیٹ پالا۔ جب فاقوں کی نوبت آگئی تو مجبوراً مجھے اپنی جوانی اور جسم بیچنا پڑا۔ یہ کاروبار ایسا چمکا کہ دنیا جہاں کے دھنی اور دولت مند میرے غلام ہو گئے۔ "آہستہ (جوانی کا) یہ نشہ اتر تا گیا۔ رنگ رلیوں میں کمی ہوتی گئی .... دل کی دنیا جو کل تک جنت تھی قید خانے کی کوٹھری کی طرح اندھیرا اور مرگھٹ کی طرح ڈراؤنی بن گئی۔ پاپن اپنی عصمت فروشی کے متعلق کہتی ہے "اگر میں نہ ہوتی تو دنیا کی بہو بیٹیوں کی عصمت کا ضامن کون ہوتا۔ میں نے خود کو خراب کر کے دنیا کی ناموس کی حفاظت کی تھی۔ اس کا صلہ یہ ملا کہ جب میں راستوں سے گذرتی ہوں تو لوگ مجھ سے اپنا بدن چراتے ہیں جیسے کوئی خرابی سے بچنا چاہتا ہے۔ پاپن وہ داغ دکھاتی ہے جو کسی دولت مند کے ٹکڑوں کے کھٹملوں سے اس کے جسم پر پڑ گئے تھے جب کہ اس نے وہ دولت پر تھوک کر بھیک مانگی تھی تاکہ اپنے بھوکے بچے کا پیٹ بھرسکے۔ پاپن اپنی داستان

سنا کر کہتی ہے "دیکھو یہ داغ .... کیا پھر بھی میں سمجھتی کہ خدا زندہ ہے اور .... عورت کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے وہ خاموش ہو گئی۔

"خدا کی عدالت میں خاموشی تھی"

اس کہانی میں اگر خالص دینی نقطۂ نگاہ سے سوچیں تو کافی تلخی ہے اور حیرت ہوتی ہے کہ ان دنوں کے علمائے دین نے اسے کس طرح برداشت کیا۔ حکومت وقت نے کوئی محاسبہ کیوں نہیں کیا۔

سفر کی جھلکیاں

مخدوم نے ۱۰ مارچ ۱۹۵۳ء سے ۲۹ جولائی ۱۹۵۵ء تک یورپ، ایشیاء اور آفریقہ کے کئی ملکوں کے سفر کئے۔ کوئی باقاعدہ سفرنامہ تو نہیں لکھا البتہ چند مختلف مضامین میں اپنے سفر کی کچھ جھلکیاں اور یادیں پیش کی ہیں۔ ۱۔ یورپ کا سکھنو ویانا، ۲۔ اپنا کھانا اپنا گانا، ۳۔ راحت جاں، ۴۔ عید اور خودکشی، ۵۔ نظم "۶۔ اجنبی" سوائے نظم کے ساری تحریریں سفر سے واپس آنے کے دو سال بعد کی ہیں۔ طرز نگارش کوئی خاص نہیں۔ معلومات کا کوئی خاص خزینہ بھی نہیں مگر ان میں مخدوم کے شگفتہ مزاج کا عکس ملتا ہے۔ اور وہ ایسی باتیں زیادہ بیان کرتا ہے جن کا راست تعلق اس کی فکر، انسان دوستی، محبت اور خلوص کے رشتوں سے ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے۔ اسے ہندوستان پر جرمن زبان میں ایک ضخیم کتاب "نبض ہند" ملی جس میں اس کی نظم "تلنگانہ" کا ترجمہ بھی شامل تھا۔ فن لینڈ میں اگر کوئی اشتراکی شراب پی لے تو اسے پارٹی سے خارج کر دیا جاتا ہے۔ مخدوم نے اس سفر میں ایران کی تودہ پارٹی کے قائد ایرج اسکندری سے حافظ، خیام اور فارسی کے دوسرے شعراء پر گفتگو کی اور ملک الشعراء بہار کا غیر مطبوعہ کلام سنا۔ ویانا میں "شمشیر الحمید" "راحت جاں" اور "راحت حلقوم" نام کے کھانے کھائے۔ ویانا کے ایک صحافی سے "بلو بیر سٹر" کا لقب حاصل کیا۔ مخدوم بیان کرتا ہے ویانا میں کرسمس کی رات جتنی خودکشیاں ہوتی ہیں سال بھر میں کسی اور وقت نہیں ہوتیں۔ پراگ کے رہنے والے اپنے شہر کو پیار سے "سو میناروں والا شہر" کہتے ہیں۔ اس کی کوئی تفصیل یا وجہ نہیں بتائی۔ سفر کی بابت یہ مختصر مضامین اور ان کی مشمولہ جھلکیاں پڑھنے کے بعد مجھے غم ہوا کہ مخدوم کے دوستوں اور رسائل کے ایڈیٹروں نے اس کا پیچھا کر کے اس سے کچھ اور نہیں لکھوایا۔ ممکن ہے یہی جس کے لئے مخدوم کو فرصت نہ مل سکتی تھی اگر مزید کوائف اور حالات لکھا لیتے یا اس سے پوچھ پوچھ کر خود لکھ لیتے تو وہ اچھا خاصہ اثاثہ اور معلومات کا خزینہ ہوتا۔

چاندنی چوک کا کھڑا مشاعرہ

چاندنی چوک دلی کی ایک سڑک پر کھڑے کھڑے مخدوم، نیاز حیدر اور امرتا پریتم نے اپنا کلام سنایا (۱۹۵۶ء) اس میں ایک جگہ لکھا ہے جب پروفیسر ہرنام سنگھ شان نے مخدوم کے متعلق دریافت کیا کہ کیا یہ اردو کے شاعر ہیں تو امرتا پریتم نے جواب دیا "شاعر تو اردو ہی کے ہوتے ہیں"۔ مخدوم لکھتا ہے نو سال سے منتظر تھا کہ امرتا سے ان کی پنجابی نظم سنوں جو اس طرح شروع ہوتی ہے:

وارث شاہ قبر سے اٹھ
کتاب عشق کا ورق کھول
پنجاب کی ایک بیٹی کے دکھ نے
ہیر رانجھا لکھایا۔

بگھی کے پیچھے چھوکرا

مخدوم نے اپنی دھرم ونت اسکول کی طالب علمی کی یادیں مختصر کی ہیں۔ یہ ۱۹۵۰ء کی تحریر ہے۔

پتہ نہ چل سکا یہ اولاً الذکر مضامین سے پہلے کہیں اور شائع ہوا کہ نہیں۔ تحقیق اور اشاعت کا درمیانی عرصہ نو سال ہے۔ پرانے دنوں میں امیروں کی بگیوں کے پیچھے غریب لڑکے لٹک کر تھوڑا ابہت سفر کر لیتے تھے۔ اور جب دوسرے لڑکے آواز لگاتے "بگھی کے پیچھے چھوکرا" تو کوچوان پلٹ کر اپنا چابک مارتا جس سے وہ لڑکا بھاگ جاتا۔ میں مڈل پڑھتا تھا اور اپنے والد کے ساتھ سنگا ریڈی میں رہتا تھا۔ سال میں دو چار بار والد حیدرآباد ضرور آتے اور ہم لوگ اپنے ایک رشتہ دار کے پاس ٹھہرتے جو فوج بے قاعدہ میں اجیٹن تھے۔ والد نے اپنے متذکرہ عارضی قیام کے دوران سواری کی سہولت کے لئے ایک بگھی خرید رکھی تھی۔ بگھی ہماری اور گھوڑا اور کوچوان اجیٹن صاحب کا۔ ایک مرتبہ ہم نیچے کہیں جا رہے تھے کہ سڑک کے دو چار لونڈوں نے آواز لگائی "بگھی کے پیچھے چھوکرا" جس پر کوچوان نے اچانک چابک رسید کی۔ میں نے پوچھا تو کوچوان بولا "بگھی ان چھوکروں کے باپ کی ہے جو اس طرح لٹک جاتے ہیں، وزن زیادہ ہو جاتا ہے تو گھوڑے کو بھی تکلیف ہوتی ہے"۔ مخدوم نے اس مضمون میں اور کئی باتیں لکھی ہیں۔

مضامین

۱۔ ٹیگور کی عالمگیر شہرت کا راز (مجلہ عثمانیہ جلد ہشتم شمارہ اول و دوم ۱۹۳۵ء ص ۱) یہ مضمون اصل کتاب ٹیگور اور ان کی شاعری کا حصہ ہے۔ اور پہلے ایڈیشن کے صفحہ ۶۹ سے شروع ہوتا ہے۔ (۲) اردو ڈراما دور جدید اور حیدرآباد (۱۹۱۴ء سے ۱۹۳۶ء تک) مجلہ عثمانیہ کی جلد دس شمارہ ایک اور دو مارچ ۱۹۳۷ء کے صفحہ ۸۶ سے شروع ہوتا ہے۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ یہ مضمون مخدوم کے ایم اے کے مقالے کا حصہ ہے۔ اس میں ۱۹۱۴ء سے ۱۹۳۶ء تک کی تمثیلی تحریکات اور سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے مخدوم یاد دلاتا ہے کہ ۱۹۱۲ء میں سینما شروع ہوا۔ اور وہ ہندوستان کے عوامی تھیٹر کے زوال کا سبب بنا۔ جدید اردو ڈرامے کا دور جہاں الماجد کے ڈرامے زرد پتیاں سے شروع ہوتا ہے جو ۱۹۱۷ء کی تخلیق ہے۔ حیدرآباد کے مختلف ڈرامہ نگاروں اور ان کے ڈراموں، ڈرامے کی انجمنوں اور خصوصاً جامعہ عثمانیہ کی تمثیلی سرگرمیوں کا حال بیان کرتا ہے۔ (۳) اندر سبھا سے پہلے یہ مضمون مجلہ عثمانیہ کی جلد ۱۳ شمارہ ایک اور دو (۱۹۴۰ء) میں شائع ہوا ہے۔ ص ۱ تا ۴۲) مضمون میں ہندو ڈرامے کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ یہ بھی میرے خیال میں اسی مقالے کا حصہ ہے البتہ مخدوم کے نام کے ساتھ ریسرچ اسکالر لکھا ہے۔ جامعہ عثمانیہ میں ایم اے پاس کرنے کے بعد کچھ طلباء ریسرچ اسکالر ہو جاتے جنہیں ہر ماہ کچھ وظیفہ دیا جاتا اور جامعہ کے منظور کردہ موضوع پر تحقیق کرکے کوئی مقالہ لکھے۔ میرے قریبی دوستوں میں اشفاق حسین نے اقبال پر مقالہ لکھا جو مقام اقبال کے نام سے شائع ہوا ہے۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ مخدوم نے بہ حیثیت ریسرچ اسکالر کوئی مقالہ لکھا یا نہیں یہ بھی نہیں بتا سکتا کہ انہیں کب تک جامعہ سے وظیفہ ملتا رہا۔ جامعہ عثمانیہ کے دفتری ریکارڈ سے ہی اس کی تفصیل معلوم ہو سکتی ہے۔

مجاہد اقبال (بالِ جبریل اور ضربِ کلیم کی روشنی میں)

۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو مسلم کلچر سوسائٹی کی جانب سے ٹاؤن ہال حیدرآباد دکن میں یوم اقبال منایا گیا۔ جلسے کے نشست اول کی صدارت عظیم جاہ بہادر نے اور دوپہر کے اجلاس کی صدارت مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر شاد نے کی۔ صبح مخدوم نے اقبال کی نظم ... ابن الخیر ... کون آتش ... نے دوپہر میں ایک مقالہ پڑھا جس کا عنوان اوپر درج ہے۔ یہ مقالہ پورا مستقلاً کہاں چھپا یا گیا تھا۔ البتہ ماہنامہ سب رس حیدرآباد دکن کے کوئی پونے دو سو صفحات کے اقبال نمبر میں ایک صفحے کا اقتباس ملتا ہے (جنوری ۱۹۳۸ء) اس میں مخدوم کہتا ہے "اقبال کے کلام کے کئی پہلو ہیں۔ اسی مناسبت سے ان پر بحث کی جاتی ہے۔ ان میں سے ایک پہلو جہاد کا ہے اور غالباً غالب پہلو بھی یہی ہے" جب تک پورا مقالہ سامنے نہ ہوتا یا نہیں جا سکتا کہ جہاد اور کلام اقبال

ے مقالہ ... ایڈیشن میں مخدوم کے بیشتر تحریریں شائع ہوئیں (ادارہ)

کے دوسرے پہلوؤں کی بابت اس مقالے میں لکھا گیا ہے ۔ مخدوم کے ایک مضمون "گوئٹے کے مکتوبات محبت" کی تلاش میں بھی کامیابی نہیں ہوئی ۔ پروفیسر عبدالقادر سروری کی ادارت میں نکلنے والے مجلہ مکتبہ کے تین شمارے غالب لائبریری میں محفوظ ہیں ۔ اپریل ۱۹۲۸ء ستمبر ۱۹۳۰ء اور جنوری ۱۹۳۱ء ۔ ان میں وہ مضمون نہیں ہے اس کے بعد کے کسی شمارے میں شائع ہوا ہوگا ۔

"اردو ڈرامہ اور اسٹیج کا تاریخی اور تنقیدی مطالعہ" مخدوم کے ایم اے کا مقالہ ہے جو کتابی صورت میں شائع نہیں ہوا ہے ۔ تفصیلی ذکر اسی باب میں ملے گا ۔ مجلہ عثمانیہ میں اس کے دو شائع شدہ حصوں کا ذکر پہلے کر چکا ہوں ۔ مقالے کا موضوع اس نسبت خاص کی طرف ایک اور نشاندہی ہے جو اس ڈرامے سے تھی ۔ بلکہ اس کی پوری زندگی ایک ڈرامہ رہی ہے ۔ کبھی المیہ کبھی طربیہ اور کبھی مزاحیہ ۔ علی الاعلان بھی، پردے کے پیچھے بھی، مجلس یاراں میں بھی، مجلس دشمناں میں بھی ۔

خطوط

مخدوم نمبر نیا آدم میں چھ خطوط شائع ہوئے ہیں ۔ (ص ۲۴۷) چار نصرت محی الدین کے نام ہیں اور دو محمد مہدی سابق شریک مدیر روزنامہ پیام حیدرآباد دکن کے موسومہ ۔ مخدوم جب دوبارہ ۱۹۶۸ء میں بیرون ہند گیا تو سمرقند، ماسکو اور باکو سے یہ خط لکھے ۔ ان میں چند ایک دلچسپ باتیں بھی ہیں ۔ سمرقند میں ازبکستان کے شاعر علی شیر نوائی کے ۵۲۵ ویں جشن سالگرہ میں شرکت کی ۔ باکو میں آپیرا لیلیٰ مجنوں دیکھا ۔ باکو کے متعلق لکھا ہے کہ "یہ شہر تیل، آگ اور ہوا کا شہر ہے" تفصیل نہیں بتائی ۔ ایک خط موسومہ محمد مہدی مورخہ ۱۹ر نومبر ۱۹۶۶ء میں حیدرآباد سے لکھا ہے ۔ مخدوم نے چاول کی بڑھتی ہوئی مہنگائی کے خلاف گیارہ دن بھوک ہڑتال کی تھی جو ۷ر نومبر ۱۹۶۶ء کو ختم ہوئی ۔ اس کے متعلق اس خط میں لکھتا ہے "بیدل فاقے کو دیدارِ الٰہی کا وسیلہ بتاتا ہے مجھے تو آخری دنوں میں آنکھ بند کرنے پر ایسے رنگ، بدن اور چہرے دکھائی دیئے جو اس "عالم مجاز" میں کبھی نہیں دیکھے اور کھانے کے لئے ایسی ایسی نعمتیں اس دار المحن میں جن کے انسان خواب دیکھتا ہے ۔ کلیجی کی پورن پوری ــــ کبھی آپ نے نام سنا ہے ؟ میں نے دوران فاقہ خواب میں کھائی ہے ۔ جب خیال آیا کہ ارے میں تو برت پر ہوں تو آنکھ کھل گئی ۔ مخدوم نے اپنے مزاج کی رنگارنگی اور شگفتگی خواب اور فاقے میں بھی برقرار رکھی ۔

اہم ترین خط سبط حسن کا موسومہ ہے اور مخدوم نمبر صبا میں شائع ہوا ہے ۔ (ص ۲۴۹) موضوع آرٹ اور پروپگنڈہ ہے ۔ اور خیالات ۱۹۴۸ء کے ہیں ۔ لکھتا ہے "کون آرٹ پروپگنڈہ نہیں رہا ؟ کیا تم یورپ کے کلیساؤں کو مسیحیت سے، یونان کی آذری کو فطرت پرستی سے، ایلورہ اجنتا کو برہمنیت، جینیت اور گوتمیت کے معاشرتی فلسفے سے علیحدہ کر سکتے ہو ؟ یورپ کے رقص خانوں اور تھیٹروں میں اور تمہارے تغزلی ادب میں جنسی معاملات کی ہنگامہ خیز، تبلیغ اور تشہیر کے سوا ہے کیا ؟ یہ ہو سکتا ہے کہ طرز بیان میں فرسودگی اور بڑھاپا محسوس ہو تو سمجھو کہ آرٹسٹ سے اس کی بقا کی صلاحیت سلب ہو چکی ہے ، وہ مر رہا ہے ..... لیکن جہاں غیر متبدل معاشرے میں آرٹ کی نمایت حسین کی جا رہی ہو، اس سے میٹھے کا کام لیا جا رہا ہو یہ سمجھنا کہ آرٹ پروپگنڈے سے ماورائی کوئی قائم بالذات وجود ہے میں تو نہیں مانوں گا .... رضا (رضا انصاری فرنگی محلی) کے خط میں میں نے تمہیں خوب ڈانٹا ہے ۔ ذرا پڑھو .... یہ موضوع دلچسپ ہے ۔ فرصت ملی تو ارادہ ہے کہ آرٹ اور پروپگنڈے پر مضمون ہی لکھا جائے ۔ میں آرٹ اور پروپگنڈے کے فرق کو محسوس کرتا ہوں مگر دیا آرٹ نہ آرٹ ہے نہ پروپگنڈہ کیونکہ مہملات کا نام نہ آرٹ ہو سکتا ہے نہ پروپگنڈہ "

مخدوم کے اس خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے موضوع پر غور اور اس کا مطالعہ کیا تھا اور ایک محکم رائے بھی رکھتا تھا ۔ اس

اپنا موعودہ مضمون نہیں لکھا جس کا افسوس ہے۔ رضا کا موسومہ خط دستیاب نہیں ہوا۔ اور سبط حسن سے پوچھا تو انہوں نے بتایا اس خط کی کوئی بات انہیں یاد نہیں۔ سبط حسن نے پاکستان آتے ہوئے اپنے تمام خط بمبئی میں چھوڑ دیئے تھے۔ انہیں نہیں معلوم کہ پہلا خط کس طرح سفر کرتا ہوا دکن پہونچا اور سلیمان اریب نے شائع کر کے اسے محفوظ کر دیا اور دوسرا خط کہاں ضائع ہو گیا یا کیوں نہیں شائع ہو سکا۔

مخدوم کا اخباری دنیا سے صرف آنا جانی رابطہ رہا کہ اس نے بہ حیثیت مترجم روزنامہ "مشیر دکن" اور روزنامہ "پیام" میں چند ماہ کام کیا ہے۔ اور بس۔ اسی طرح تین ماہ دکن ریڈیو حیدرآباد کے ابتدائی زمانے میں ترجمے کا کام کیا کرتا تھا۔ البتہ طالب علم تھا تو ایک سال مجلہ عثمانیہ کا نائب مدیر رہا۔ اول الذکر دو سرگرمیاں ملازمت یا پیشے کے باب میں آتی ہیں اور آخر الذکر طالب علمی کا اعزاز تھا۔

کہانیوں، خطوط، سفر کی جھلکیوں اور مضامین کے علاوہ مخدوم نے اور کیا لکھا اور وہ شائع ہوا میں معلوم نہ کر سکا۔ دوستوں کو تلاش کرتے رہنا چاہیے تاکہ اس کی مطبوعہ یا غیر مطبوعہ تحریریں کسی نہ کسی صورت میں محفوظ ہو جائیں۔

ٹیگور اور ان کی شاعری

یہ مخدوم کی اولین مستقل کتاب ہے۔ حیرت ہے کہ داؤد اشرف نے اپنی کتاب "مخدوم — ایک مطالعہ" میں اس کتاب پر صرف تین سطریں صرف کی ہیں (ص ۲۲) جس میں یہ غلطی بھی شامل ہے کہ اس کا دوسرا ایڈیشن اقبال اکیڈیمی سے شائع ہوا ہے۔ یہ غلطی صاحب کتاب نے صبا کے مخدوم نمبر کے صفحہ ۲۷۵ سے نقل کی ہے۔ کتاب کے دونوں ایڈیشنوں کی فوٹو کاپیاں غالب لائبریری میں محفوظ تھیں۔ اس لئے مجھے علم ہوا ورنہ میں بھی غلطی میں بھی نقل کر ڈالتا۔ داؤد اشرف کی مولفہ کتاب ان کے ایم اے اردو جامعہ عثمانیہ کا مقالہ ہے جس کی تیاری کے سلسلے میں وہ مخدوم سے مل چکے تھے۔ ان احباب اور اداروں سے بھی واقف ہوں گے جہاں سے مستند معلومات حاصل کی جا سکتی تھیں۔ اور اشاعت کے وقت مخدوم زندہ تھا۔ مقالہ نگار یا صاحب کتاب مقامی ہونے کی بنا پر اس موقف میں تھے کہ مخدوم یا اس کے قریبی دوستوں سے دریافت کر کے بلکہ دوسرا ایڈیشن بچشم خود دیکھنے کے بعد لکھتے۔

اسی کتاب کے صفحہ ۵۵ پر لکھتے ہیں "ٹیگور پر انہوں نے ایک کتابچہ بھی لکھا ہے" جہاں تک میں جانتا ہوں ایسا کوئی کتابچہ موجود نہیں ہے۔ ان کا اشارہ "ٹیگور کی عالمگیر شہرت کا راز" کی طرف ہے جس کا ذکر اوپر کر چکا ہوں۔ وہ تو مخدوم ہی کی کتاب سے نقل کیا گیا ہے۔ الگ سے کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ اور کتابچہ تو بالکل نہیں۔

ٹیگور اور ان کی شاعری کا پہلا ایڈیشن (۱۲۸ صفحات) ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد دکن نے ۱۹۳۵ء میں شائع کیا۔ غالباً ٹیگور کی حیدرآباد تشریف آوری کے بعد اشاعت عمل میں آئی۔ ورنہ وہ جب جامعہ عثمانیہ آئے تھے تو اس کا ایک نسخہ انہیں دیا جاتا۔ دوسرا ایڈیشن (۱۴۹ صفحے) ادارۂ اشاعت اردو حیدرآباد دکن نے آٹھ سال بعد ۱۹۴۳ء میں طبع کیا۔ دونوں کے متن میں کوئی فرق نہیں ہے۔ البتہ پہلے ایڈیشن میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کا دیباچہ بھی اور مخدوم کا لکھا ہوا دیباچہ ہے۔ انتساب کے صفحے پر لکھا ہے "میں اس حقیر کوشش کو بہ صد ادب و خلوص اردو کے محسن استاذی مولوی عبدالحق صاحب مدظلہ پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ کے نام معنون کرنے کی عزت حاصل کرتا ہوں۔" دیباچہ میں چند سطریں امجد حیدرآبادی کے متعلق ہیں اور ٹیگور اور امجد کی بابت وہ کہتا ہے "امجد اور ٹیگور کے کلام کو ساتھ ساتھ رکھ کر پڑھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی روح دو مختلف زبانوں میں ہم سے کلام کر رہی ہے۔" اسی میں وہ خوش خبری سناتا ہے کہ دوسری کتاب "امجد اور ٹیگور" میں ان دونوں پر بحث کی جائے گی۔ افسوس کہ مخدوم نے یہ کتاب کبھی نہیں لکھی۔

دوسرے ایڈیشن میں ڈاکٹر زور کا دیباچہ بھی اور دیباچہ حذف کر کے مخدوم نے بالکل نیا دیباچہ لکھا جس میں وہ کہتا ہے "اس مقالہ

ہم دنیا میں اور خصوصیت سے حالات میں بڑی تبدیلیاں ہو گئی ہیں؛ یہ درست ہے اور ان تبدیلیوں کا اثر نمایاں طور پر نئے دیباچے میں نظر آتا ہے۔ اس نے فاشزم کے خلاف اور سوشلزم کی تائید میں ٹیگور کے اقوال اور خود اپنے تاثرات دیئے ہیں اور سوویت روس کی تعریف اور اشتراکیت کی دعوت دی ہے۔

کتاب میں بعض دلچسپ انکشافات ملتے ہیں۔ مثلاً ٹیگور کو کتب اور مکتب کی تعلیم اور اس وقت کے اساتذہ سے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ ان کی پہلی نظم کنول پر تھی جو انہوں نے آٹھ برس کی عمر میں لکھی۔ ٹیگور ابھی پورے پچیس برس کے بھی نہ تھے کہ انہوں نے [illegible] سے پشاور تک بیل گاڑی میں سفر کرنے کا منصوبہ بنایا۔ مگر ان کے والد نے اجازت نہ دی۔ مخدوم نے ایک یہ دلچسپ واقعہ بھی لکھا ہے " نوبل انعام ملنے سے کوئی چھ سال پہلے جامعہ کلکتہ کے نائب امیر جامعہ (وائس چانسلر) سراس ٹامس مکرجی نے ایک مرتبہ سنڈیکیٹ میں ٹیگور کو ادبیات کی ڈگری دینے کی تحریک پیش کی مگر اس مجلس نے اس تحریک کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ ٹیگور صرف بنگالی لکھتے ہیں۔ ایک رکن نے یہ بھی کہا کہ اگر ٹیگور کو ایسی ہی عزت بخشی کا خیال ہو تو انہیں میٹریکولیشن کا ممتحن بنا دیا جائے۔ " ٹیگور ٹھاکر کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ انہیں لاڈ سے "رابی" پکارا جاتا ہے۔ ۱۹۱۳ء میں نوبل انعام اور ۱۹۱۴ء میں سر کا خطاب ملا جو انہوں نے جلیانوالہ باغ کے المناک واقعہ کی وجہ سے ۱۹۱۹ء میں واپس کر دیا۔

چالیس برس پرانی یہ کتاب پاکستان میں نایاب اور ہندوستان میں کمیاب ہے اور اپنے موضوع پر اردو میں اولین کوشش ہے۔ جس کے بعد یا جس سے متاثر ہو کر دوسری کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اس لئے میں ۴۲ عنوانات کی فہرست (جس طرح وہ کتاب میں ہیں) نقل کر رہا ہوں جنہیں مصنف نے پانچ ادوار میں تقسیم کر کے ان پر خیال آرائی کی ہے۔ جن ناظرین کی دسترس میں یہ کتاب نہیں ہے انہیں اسی طرح مشمولات کا علم ہو سکتا ہے۔ اس سے زیادہ کی گنجائش میری کتاب میں نہیں ہے۔

پہلا دور: ۱۸۶۱ء سے ۱۸۸۴ء تک:- ان تحریکات کا ذکر جن کی وجہ سے بنگال میں ادب عالیہ کا احیا ہوا۔ مغربی تعلیم۔ راجہ رام موہن رائے اور خود ٹیگور کے خاندان والوں کی خدمات اور قابلیت کا ذکر، ٹیگور کس ماحول میں پیدا ہوئے، خارجی اور گھریلو ماحول، ٹیگور کا بچپن، ماں کا انتقال، والد کی تربیت، کن اثرات نے ان کی شخصیت پر اثر ڈالا۔ تعلیم۔ مدرسوں سے بیزاری۔ فطرت سے عشق۔ شاعری کی ابتداء۔ ٹیگور کے بچپن کے رفیق اور ان کا اثر ٹیگور کی زندگی پر۔ دور اول کی شاعری پر تبصرہ۔

دوسرا دور: ۱۸۸۴ء سے ۱۹۰۱ء تک:- شادی اور دوسرے دور کی ابتداء، زندگی میں زبردست تبدیلی۔ ذمہ داریاں۔ کاروبار کا انتظام۔ سیاسی ڈرامہ، اس پر تنقید، شیلدا قیام، کاشتکاروں سے میل جول، زرعی معاملات اور کاشتکاروں سے ہمدردی، اس دور کے افسانے اور ان پر دیہی ماحول کا اثر۔ ڈرامے، ان پر تنقید۔ سیاسی اور ادبی سرگرمیاں، مذہبی شاعری کا آغاز۔

تیسرا دور: ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۷ء تک: ناول نویسی کی ابتداء، خصوصیات، علیحدگی بنگال کے جھگڑے میں ان کی [illegible] ڈرامہ [illegible] گورا پر تنقید۔

چوتھا دور: ۱۹۰۸ء سے ۱۹۲۲ء تک: عالمگیر شہرت، گیتان جلی۔ نوبل انعام، ڈرامہ "حلقۂ بہار"، اس پر تنقید، ٹیگور کی شاعری کے مختلف رنگ۔ شباب کی شاعری پر تبصرہ، گیتان جلی اور گارڈنر کا فرق، کریسنٹ مون کا مرتبہ، مشرق بعید کا سفر، جنگ عظیم کا آغاز۔ قومیت کے خلاف جہاد۔

پانچواں دور: ۱۹۲۲ء سے ۱۹۳۵ء تک:- ٹیگور کا پیام ہندوستان اور یورپ کے نام، قومیت کے خلاف خطبات، عالمگیر برادری اور اخوت کی تعلیم، [illegible] مستقبل ہندوستان اور تحریک عدم تعاون، اس تحریک کی مخالفت، گاندھی اور ٹیگور کا مقابلہ، شاعر کا [illegible] شانتی نکیتن اور [illegible]

مخدوم کی نثر نگاری کے متعلق میرا مجموعی تاثر یہ ہے کہ انہیں نثری تخلیقات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس لئے کوئی خاص اسلوب پیدا نہیں کر سکے جس کی وجہ سے ان کو نثر کی دنیا میں یاد رکھا جائے۔

(عمر گذشتہ کی کتاب [illegible])

بادۂ کہن

سید محمد بینظیر شاہ وارثی

حضرت سید محمد بینظیر شاہ وارثی (۱۸۶۳ء — ۲ ستمبر ۱۹۳۲ء حیدرآباد) کڑہ مانک پور (یو۔ پی) کے صوفی صافی گھرانے کے محترم بزرگ اور قادر الکلام سخنور تھے۔ ابتدائی تعلیم یو۔ پی میں اپنے والد حضرت سید شاہ احسان علی قبلہ کی نگرانی میں حاصل کی، فارسی میں مطبوعہ مثنوی "مجموعۂ بینظیر" کے علاوہ ملکہ وکٹوریہ کی نذر انگریزی قصیدہ اور دو مشہور مثنویاں "معشوق الکلام" (مطبوعہ ۱۸۹۰ء) اور کتاب "مبین" سے اردو اسکالرس بخوبی واقف ہیں۔ آپ نے نثر میں علم نباتات کے موضوع پر ایک کتاب "گنجینۂ عثمانیہ" بھی لکھی۔

بینظیر شاہ وارثی اگلے وقتوں کے نیک نہاد، اللہ والے بزرگ تھے، دیارِ وارثیہ کے رشد و ہدایت کے روشن چراغ کو اپنے کردار اور رشد و ہدایت سے تابندہ تر رکھا۔ شعر و ادب، تصوف و عرفان اور زبان دانی و طب میں نام کمایا، استادانہ شہرت پائی۔ لکھنؤ، علیگڈھ، رام پور اور آخر حیدرآباد میں زندگی کے وقار کو روشن رکھا۔ خدمت کی اور مخدوم کہلائے۔ اول اول ۱۹۰۰ء میں حیدرآباد آئے پھر ۱۹۰۹ء میں دوبارہ آئے اور تادمِ واپسیں یہیں رہے۔ حضور نظام میر عثمان علی خاں، مہاراجہ کشن پرشاد اور سر راس مسعود سے روابط استوار تھے۔ کلام میں روانی، سلاست، سادگی اور تصوف کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ ۱۹۵۸ء میں محمد اکبر الدین صدیقی صاحب نے "کلامِ بینظیر" کو اپنے مفصل اور جامع مقدمے کے ساتھ شائع کر دیا ہے جس میں تقریباً دو سو غزلیں، فارسی قصائد و غزلیات کے علاوہ مثنویاں بھی شامل ہیں۔ اسی مجموعۂ سخن سے انتخاب پیش ہے۔ (و۔خ)

کہتا ہے حسنِ مطلق جلوہ ہے عام میرا
اچھی نگاہ والو تم پر سلام میرا

سب سے پہلے اس نے ظاہر کیا اپنا خیال
اور پھر ہر ذرہ اس کے زیرِ فرماں کر دیا

حسن میں بھی عشق ہے تو عشق میں بھی حسن ہے
ایک کے گھر ایک کو قدرت نے مہماں کر دیا

اب وہ کھولیں یا نہ کھولیں دوسرا رخ بینظیر
ایک رخ تصویر کا میں نے تو عریاں کر دیا

ملی ہے خاک نشینی یہ شکر ہے ورنہ
اگر زمین نہ ہوتی تو آسماں ہوتا

نشان پوچھے کوئی کس سے جانے والوں کا
غبار بھی تو پسِ کارواں نہیں ہوتا

ہمیں روکیں دیوار و در کیا جنوں میں
جدھر رخ کیا صاف میدان نکلا

مٹا کر مجھے اب مٹاؤ گے کس کو
چلو ہو چکا آزمانا تمہارا

یہی گردشیں ہیں جو لے حضرتِ دل
ابھی تک وہ جانِ تمنا نہ آیا
سرو قد میں نے کہا تو آئے بل ابرو پہ کیوں
ایک بھی دیکھی نہ تیرے حسن کی سی داستاں
گراں قدر ہے عشق بے قدر بھی
ہائے وہ رخصت کسی کی ہائے وہ آثارِ صبح
شب بسر کر کے بہت دیکھا وصال و ہجر میں
رات کو لکھی تھی شرح والقمر اے بے نظیر
وہ جھلک ہے ہر شریف کی فطرت میں تا حیات
کسی اور خوبی کی حاجت نہیں
دعائیں تو دی ہیں مگر دیکھتا ہوں
کہاں کباب میں ثابت ہے جو شراب میں آگ
نہ کیوں بہار میں آتش مزاج ہو ہر رند
مجھے خیال ہوا اپنے قصۂ دل کا
یہ کیا حجاب ہے اے سرد مہر زاہدِ خشک
نہ عروج کچھ نہ نزول ہے یہ خیال و وہم فضول ہے
نظر آتا نہیں اک گل میں بھی جب رنگِ ثبات
کہاں تک بات کو تولوں کہاں تک کچھ نہ میں بولوں
جب آ نکلے کوئی سائل ہمیں بھی پوچھ لیتے ہیں
ازل سے ہر انجام لکھ گیا
میں اٹھنے کو اٹھا تو اس بزم سے
بڑوں کی جان پہ گرتی نہیں ہے برق بلا کیونکہ
ہمیں نے حیرتی بن کر تجھے آئینہ دکھلایا
کوئی محشر تک بھی نہ لکھ سکا میرے کارِ بد کا بھلا ہوا
جب خدائی تری نظر آئی
نام تو رہ گیا زمانے میں
عشق میں زندگی رہی لیکن

کبھی تو پھرے گا زمانا تمہارا
بھروسا ہے کیا دم کا آیا نہ آیا
اتنی سی بھی بات اس کا اس قدر ٹیڑھا جواب
پڑھ گیا انوار کے دفتر آفتاب
وہ خفا ہے تو سب کچھ خفا ہے تو ہیچ
دل پہ اب تک چل رہے ہیں خنجرِ آثارِ صبح
ایک حالت پہ نہیں رہتے کبھی اطوارِ صبح
حاصلِ تفسیر بیضاوی ہیں یہ اشعارِ صبح
صورت کو بھولے پن سے نظر کو حیا سے ربط
جو انساں میں ہو آدمیت فقط
نہیں آتی اس لب پہ دشنام کب تک
کہ سرد ہو کے نہ قائم رہی کباب میں آگ
اِدھر کباب میں گرمی اِدھر شراب میں آگ
لگی ہوئی نظر آئی جہاں کتاب میں آگ
نہ اس حباب میں پانی نہ اس حباب میں آگ
جو بلندیاں ہیں نشیب میں وہی پستیاں ہیں فراز میں
ہیچ ہے گلشن جنت کی بہار آنکھوں میں
میں اپنا بھید کیوں کھولوں کہ اپنا راز داں میں ہوں
خدا رکھے انھیں جو یاد کرتے ہیں فقیروں کو
شبِ غم کی لیکن سحر رہ گئی
طبیعت وہیں بیٹھ کر رہ گئی
مری جانب تو دیکھیں ہنس کے اچھا دیکھنے والے
ہمیں سے بے حجاب اے حسن اپنا دیکھنے والے
کہ قرار دادِ گناہ سے مری فردِ جرم بری رہی
بندگی میری بندگی نہ رہی
نہ رہی دولتِ سخن نہ رہی
آن رہتی مگر وہی نہ رہی

سب رنگ

اس عنوان کے تحت ہندوستان وپاکستان کے معیاری ادبی کتب ورسائل سے مضامین نظم ونثر کا انتخاب شائع ہوتا ہے۔

ڈاکٹر نثار احمد فاروقی

خطوطِ غالب میں تاریخی مواد

مرزا غالب کے خطوط اُردو نثر کا بہترین اور قابلِ فخر سرمایہ ہیں اور انھوں نے پہلی بار یہ ظاہر کیا تھا کہ اُردو میں اسلوب کا کیسا تنوع اور تاثیر موجود ہے۔ ان کی مکتوب نگاری کے مختلف پہلوؤں پر بحث ہو چکی ہے اور ابھی بہت سے گوشوں پر تحقیق وتنقید کی گنجائش باقی ہے، مثلاً غالب کے خطوط کا جائزہ اس نظر سے نہیں لیا گیا کہ تاریخی مواد کے اعتبار سے ان کی قدر وقیمت کیا ہے۔ اور وہ انیسویں صدی کے نصفِ اوّل کی تاریخ لکھنے والوں کے لیے کتنے مفید ہو سکتے ہیں؟

پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ مرزا غالب کا تاریخی شعور کچھ زیادہ ترقی یافتہ نہیں تھا، وہ تاریخی اور نیم تاریخی مواد میں امتیاز بھی نہیں کر سکتے تھے، اور انھوں نے دیو مالا کو بھی تاریخ سمجھ کر قبول کیا ہے۔ لیکن تاریخ کے موضوع سے اُن کا ربط ضرور رہا، چنانچہ انھوں نے بہادر شاہ ظفر کے دربار میں مورّخ کا منصب قبول کیا تھا اور وہ خاندانِ مغلیہ کی تاریخ "پرتوستان" لکھنے پر مامور ہوئے تھے، جسے انھوں نے دو حصّوں میں تقسیم کیا، پہلا حصّہ "مہرِ نیم روز" حضرت آدم سے ہمایوں بادشاہ کی وفات تک کے حالات پر مشتمل لکھا بھی گیا، اور ان کی زندگی ہی میں شائع بھی ہو گیا تھا۔ دوسرے حصّے کا نام "ماہِ نیم ماہ" تجویز ہوا تھا، جس میں جلال الدین اکبر سے بہادر شاہ ظفر تک تاریخی وقائع لکھے جانے والے تھے، مگر ۱۸۵۷ء نے ایسی بساط اُلٹی کہ یہ حصّہ لکھا ہی نہیں گیا۔ غالب نے خود متعدد مواقع پر اس کا اعتراف کیا ہے کہ مختلف کتابوں کو کھنگالنا اور اپنے مطلب کا مواد تلاش کرنا ان کے بس کی بات نہیں تھی، پھر بھی انھوں نے مورّخ بننے کا منصب اس لیے قبول کر لیا تھا کہ حکیم احسن اللہ خاں وغیرہ تاریخی کتابوں سے اقتباسات انھیں فراہم کرتے رہیں گے اور وہ اسے اپنے مرصع اسلوب میں قلمبند کر دیا کریں گے۔ اس دور میں تاریخ کے اسلوب کی اہمیت کسی طرح بھی حوادث اور وقائع کی صحت سے کم نہیں تھی۔ بلکہ اس زمانے کا مذاق سب سے پہلے یہی دیکھتا تھا کہ کیسا لکھا ہے۔ اور کیا لکھا ہے۔ یہ بالکل ثانوی بات تھی۔ تاریخ میں ابوالفضل کے اسلوب نے معیار کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔ اس کی نقل کرنے کی کوشش سب کرتے تھے کامیاب چند ہی کو ہو سکی ہوگی۔ چنانچہ سرسیّد احمد خاں نے جب دہلی کی عمارتوں کے حالات پر مشتمل "آثار الصنادید" لکھی تو اس کا جو حصّہ بابِ جس میں دہلی کی شخصیتوں کے حالات تھے۔ مولانا امام بخش صہبائیؔ سے لکھوایا تھا، اس لیے کہ وہ مقفّیٰ ومسجّع عبارت لکھنے پر قادر تھے۔ قلعۂ دہلی نے بھی غالب کو مورّخ بنایا تو یہ ان کے اسلوب کی قدر دانی تھی، یہ سبب نہیں تھا کہ وہ باعتبارِ اصول

تاریخ نویسی زیادہ محتاط اور معتبر ثابت ہوں گے۔ یہ تو ایک درباری منصب تھا، لیکن غالب کو اپنے طور پر بھی تاریخ لکھنے کا اتفاق ہوا۔ ۱۸۵۷ء میں جب دہلی میں مارشل لا لگا ہوا تھا اور شہر میں نقل و حرکت ممکن نہ تھی، غالب گھر میں بیٹھے تماشا دیکھ رہے تھے۔ شغلِ بیکاری کے طور پر انھوں نے اس شورش کی تاریخ لکھنی شروع کر دی اور اسے بعد کو "دستنبو" کے نام سے چھاپ کر حکام والاشان، بلکہ ملکۂ معظمہ تک بھیجا۔ اس میں ظاہر ہے کہ غالب کا نقطۂ نظر جانب دارانہ رہا۔ وہ اگر معزول بادشاہ سے یا بغاوت کرنے والی رعایا سے ہمدردی رکھتے بھی ہوں گے تو انھیں اس کے اظہار کی آزادی حاصل نہیں تھی لیکن چونکہ انھوں نے لکھا اس میں بھی تاریخی صحت کا بہت زیادہ خیال نہیں رکھا۔ وہ "دستنبو" لکھنے کے دوران خانہ نشین تھے اور معلومات کے اصلی مصادر تک پہنچنے کی سہولت انھیں حاصل نہیں تھی اس لیے جو کچھ عوام میں مشہور ہو تا تھا وہی ان کے لیے "تاریخی" مواد بن جاتا تھا۔ پھر اسے بھی احتیاط کی چھلنی میں خوب چھان لیتے تھے کہ اس میں حاکمانِ فرنگ کے منہ کا مزا بگاڑنے والی کوئی چیز تو نہیں رہ گئی ہے! یہاں بھی انھوں نے اسلوب کی آڑلی اور خالص فارسی لکھنے کا بہانہ کر کے ایسی باتوں کا چھپا لیا جن سے باغی ہندوستانیوں کو شکایت کرنے کا موقع ملتا۔

سوال یہ ہے کہ جب غالب کے تاریخی شعور کو زیادہ سراہا نہ جا سکے اور ان کی تاریخی کتابوں کا یہ حال ہو کہ وہ موضوع سے زیادہ اسلوب کا نمونہ ہوں تو ان کے خطوط میں تاریخی مواد کیا ہوگا۔ اور اس کی تاریخی قدر و قیمت کیا مانی جائے گی؟ لیکن خطوط کا معاملہ "مہر نیم روز" یا "دستنبو" سے قطعاً مختلف ہے۔ مرزا غالب نے ابتدا میں فارسی زبان میں خط لکھے، پھر شاید اس وجہ سے کہ فارسی انشا کی طرف ہمہ وقت طبیعت مائل نہ رہتی تھی اور مکتوب الیہم کا حلقہ خاصا وسیع ہو چکا تھا انھوں نے اُردو میں لکھنا شروع کیا۔ تاکہ صرف مطلب کی باتیں بے تکلف لکھ دیا کریں۔ چونکہ طبیعت میں شوخی اور بذلہ سنجی بہت زیادہ تھی اور اسلوب انسان کی ذہنی کیفیت کا آئینہ ہوا کرتا ہے، اسی لیے ان کا اُردو کا بے تکلف اسلوب شوخی، نکتہ آفرینی اور جودت و جدت کا دلکش نمونہ بن گیا اور ان کے اُردو خطوط احباب میں مقبول ہونے لگے۔ بعد کو ان کے شائع ہونے کی باتیں بھی ہونے لگیں تو غالب نے بھی شعوری طور پر یہ سمجھ لیا ہوگا کہ ان کی یہ نجی تحریریں کتابی صورت میں چھپیں گی اور وہ اسٹائل کی حد تک چوکنا (CONSCIOUS) ہو گئے: لیکن خطوط کا مواد وہی نجی باتیں تھیں۔ زیادہ سے زیادہ زبان و لغت کے مسائل بیان کرنے میں انھیں یہ احساس ہوا ہوگا کہ انھیں شائع ہونا ہے۔ لیکن ان کے علاوہ بھی خطوط میں ایسی ہزاروں باتیں آ گئی ہیں جنھیں غالب نے یہ سمجھ کر نہیں لکھا ہے کہ ان سے مورخ کو کچھ مواد ملے گا، بلکہ یہاں واقعات کا ایسا بیان ہے جس میں تاریخی جس کا کہیں پتا نہیں ہے اس لیے ان خطوط سے حاصل ہونے والی تاریخی معلومات کو مستند مانا جا سکتا ہے۔

ایک مورخ جن مصادر سے تاریخ کا مواد حاصل کرتا ہے انھیں دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، اصلی اور ذیلی۔ اصلی مصادر تو وہ ہیں جن میں حوادث اور وقائع سے متعلق معلومات ضمناً حاصل ہوتی ہیں جب ماضی کا پردہ درمیان میں حائل ہو تو بعض جزئیات تک ہماری رہنمائی ضمنی مصادر ہی کرتے ہیں۔ انیسویں صدی کی معاشرتی تاریخ ہو یا ادبی۔ اس دور کے افراد کی سوانح نگاری ہو یا بعض اہم وقائع خصوصاً ۱۸۵۷ء کی شورش زیر بحث ہو۔ غالب کے خطوط سے ہمیں ایسا مواد ملے گا جو دوسرے تاریخی مصادر پیش کرنے سے قاصر ہوں گے۔

غالب خود تاریخ کا ایک باب ہیں۔ ان کے عہد کی تاریخ ان کی شخصیت کے چاروں طرف بکھری ہوئی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ مغلیہ سلطنت کا آفتاب غروب ہونے کو ہے اور کمپنی بہادر کا اثر و رسوخ روز افزوں ہے۔ دہلی میں ایک بساط بچھی ہوئی ہے، مگر آثار بتاتے ہیں کہ چراغِ صبحگاہی کی کیفیت ہے۔ یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء کی صرصرِ بے امان اسے بجھا دیتی ہے۔ اور مغلوں کی برائے نام حکومت ختم ہو کر دولتِ برطانیہ کا پرچم لہرانے لگتا ہے۔ نئے انقلاب کے ساتھ بہت سی تبدیلیاں بھی آتی ہیں ایسی رستاخیز میں سماج کا جو اعلیٰ متوسط طبقہ سب سے زیادہ متاثر ہوتا ہے، غالب اسی طبقے کے ایک فرد تھے جن کے پاس کچھ نہیں تھا، مگر وہ اپنی آبرو بہت زیادہ سمجھتا تھا۔ اور اس کے لیے خاصا حساس بھی تھا پھر غالب کا تعلق قلعہ معلی سے بھی رہا وہ دربار سے تعلق کو اپنی عزت اور وجاہت کا نشان سمجھتے تھے۔ انھیں اپنی خاندانی پنشن کی وجہ سے ابتدا ہی میں سابقہ انگریزی حاکموں سے بھی پڑا۔ انھوں نے دہلی سے نکل کر کلکتے میں خاصا وقت بسر کیا اور دہلی اس وقت اگر قدامت کا نمونہ تھی تو کلکتہ جدیدیت کا سمبل بنا ہوا تھا۔ اس طرح غالب نے قدامت کے پیر اکھڑتے ہوئے اور جدّت کے قدم آہستہ آہستہ جمتے ہوئے دیکھے۔ ان کی زندگی کا بڑا حصہ دہلی میں بسر ہوا اور ذاتی کمالات کی وجہ سے وہ اپنے عہد کی معروف و ممتاز شخصیت بن کر رہے اور ایسی ہی ممتاز شخصیتوں کی دوستی اور قربت اور اختصاص کے تعلقات انھوں نے قائم رکھے۔ برطانوی علاقوں کی نسبت دیسی ریاستوں اور جاگیروں کا حال قدرے مختلف تھا۔ سامراج نے اپنے مفاد کے لیے انھیں پرانے انداز پر باقی رکھا تھا۔ اور صرف محدود قسم کی خود مختاری دے رکھی تھی۔ غالب نے بعض دیسی ریاستوں سے بھی تعلقات رکھے۔ اور رام پور کا دو بار سفر کیا۔ اس طرح وہ ریاستوں کے کوائف سے بھی محض بیگانے نہیں تھے جب غالب کی سوانح عمری کے پورے فریم میں دیکھا جائے تو اپنے عہد کے اضطراب و اضطراب کی نمائندگی کرنے والے چند ہی نفوس ایسے ملیں گے جن سے ہمیں تاریخ کے لیے اتنا مواد مل سکتا ہو جتنا غالب سے ملتا ہے، اس کی قدر و قیمت بھی خطوط ہونے کی وجہ سے اور زیادہ ہو جاتی ہے، کیونکہ خطوط نجی سرمایہ ہیں اور صرف مکتوب الیہ تک محدود سمجھے جاتے ہیں۔ اور ان کے پردے میں انسان کا ذہن عموماً اپنا پورا اظہار کر دیتا ہے۔ غالب کے خطوط بھی ان کے ذہن کا آئنہ ہیں، یہاں وہ اونچی آواز میں سوچتے ہوئے ملتے ہیں۔ اور ان میں ان کی شخصیت کے ساتھ ہی ان کا دور بھی جھلکتا رہتا ہے۔

ایک بات یہ بھی قابلِ غور ہے کہ ان خطوط کی تعداد کچھ معمولی نہیں ہے کہ دس، بیس، تیس، پچاس خطوط ہیں۔ ان کے اردو اور فارسی خطوط جو اب تک دریافت ہو کر چھپ گئے ہیں۔ ایک ہزار سے زیادہ ہیں جن میں آٹھ سو سے زیادہ اردو میں ہیں۔ پھر ان کا زمانہ بھی بہت پھیلا ہوا ہے۔ یعنی تقریباً چالیس سال کے عرصے میں یہ خطوط لکھے گئے ہیں۔ اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ انیسویں صدی کا نصفِ اوّل تاریخ کے اعتبار سے کچھ متحرک زمانہ نہیں ہے، بلکہ اس میں بے کیفیتی کا غلبہ ہے۔ غالب کے خطوط بھی ۱۸۵۰ء تک اِکّا دُکّا ہی ملتے ہیں مثلاً ۱۸۴۸ء، ۱۸۴۹ء، ۱۸۵۰ء، ۱۸۵۱ء میں ان کا ایک ایک اردو خط ملتا ہے ۱۸۵۲ء میں یہ تعداد ۴ اور ۱۸۵۵ء میں ۶ ہو جاتی ہے لیکن ۱۸۵۸ء سے ۱۸۶۹ء تک اس تعداد میں برابر اضافہ ہوتا رہا ہے اور تاریخ کے نقطۂ نظر سے یہی دور سب سے زیادہ اہم ہے جس کا بیان دیسی مورخوں کے ہاں کم تر ملتا ہے۔

اگر کسی ایک واقعے کی تاریخی اہمیت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو سب سے زیادہ مواد ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگِ آزادی

کے بارے میں ملتا ہے جسے انگریزوں نے "غدر" کا نام دیا تھا۔ غالب کے انتہائی محتاط رہنے کے باوجود اس وقت فوجی حکومت کے مظالم، اہل شہر کی خانماں بربادی، اور داروگیر کے بارے میں بہت ہی قیمتی اشارے ان خطوط میں محفوظ ہیں۔ غدر کے حالات دوسری کتابوں میں اور خود انگریزوں کی لکھی ہوئی یادداشتوں میں بھی مل جائیں گے، مگر خطوط غالب سے جیسی دلی شہر کا جو حال معلوم ہوتا ہے وہ کسی دوسرے ماخذ سے نہیں مل سکتا۔ دہلی میں جہاں آج ایڈورڈ پارک ہے یہاں سے چاندنی چوک کے سرے تک یعنی لال قلعہ اور جامع مسجد کے درمیان کا پورا علاقہ جو اب وسیع اور کشادہ میدان بنا ہوا ہے، غالب کے زمانے میں یہاں خاص بازار، اردو بازار، بیگم بازار، بڑے گھنے، گنجان اور بارونق بازار تھے، یہ سارا علاقہ ان کی نظروں کے سامنے صاف کیا گیا وہ پالکی میں بیٹھ کر اُجڑے ہوئے محلوں کی سیر کرنے جاتے تھے اور پھر اپنے دوستوں کو خطوں میں اس کی کیفیت لکھتے تھے ـــــــ "میں سوار ہو کر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا، جامع مسجد راج گھاٹ کے دروازے تک چلا جامع مسجد سے راج گھاٹ کے دروازے تک بلا مبالغہ ایک صحرائے لق و دق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں وہ اگر اٹھ جائیں تو ہُو کا مکان ہو جائے۔ یاد کرو، مرزا گوہر کے باغیچے کے اس جانب کو کئی بانس نشیب تھا وہ اب باغیچے کے صحن کے برابر ہو گیا۔ یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہو گیا۔ فصیل کے کنگورے کھلے رہے ہیں، باقی سب اٹ گیا۔ آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازے سے کابلی دروازے تک میدان ہو گیا۔ پنجابی کٹرہ، دھوبی واڑہ، رام جی گنج، سعادت خاں کا کٹرہ، جرنیل کی بی بی کی حویلی، رام جی داس گودام والے کے مکانات، صاحب رام کا باغ، حویلی، ان میں سے کسی کا پتا نہیں ملتا۔"

یہ صرف ایک اقتباس مثال کے طور پر پیش کیا گیا۔ اس میں دہلی کے دس محلوں کے نام آگئے ہیں جن کا آج نشان بھی باقی نہیں ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دہلی کے بارے میں کتنا قیمتی تاریخی مواد خطوط غالب میں مل سکتا ہے۔ سیاسی تاریخ کے لیے تو ہمارے پاس بہت سے مصادر ہیں لیکن اگر اس عہد کی سماجی زندگی کو تاریخ کے آئینے میں دیکھنا ہو تو سب سے زیادہ مسالا غالب کے خطوط ہی سے ملے گا۔

(سہ ماہی "زبان و ادب" پٹنہ)

غزل

ڈاکٹر سید اختر مدنی

جاں بھی اُسی کی، دیدۂ تر بھی اُسی کا ہے
سو بار آئے دل میں، یہ گھر بھی اُسی کا ہے

اُس کا وجود میرے شب و روز کا فروغ
شب بھی اُسی کی، خواب سحر بھی اُسی کا ہے

ہے رنگ اُسی کا موئے قلم، رنگِ شعر میں
پھر کیا غلط کہ میرا ہنر بھی اُسی کا ہے

گو ہے خزاں گرفتہ، وہ غنچہ مسکرا دیا
سب پھول کھل اُٹھے، یہ اثر بھی اُسی کا ہے

وہ جنبش نے انقلاب کے جس نے کیے تھے بند
خونخانۂ یک جہاں دگر بھی اُسی کا ہے

دل میں کبھی کھلائے تھے جس نے ہزار پھول
یہ باغِ بے گیاہ و شجر بھی اُسی کا ہے

گو لیلۂ نگارِ اختر دیوانہ کب سے تھا
اُلجھا ہوا یہ تارِ نظر بھی اُسی کا ہے

(افکار کراچی، شمارہ)

نقد و نظر

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدوں کا آنا ضروری ہے)

دو ڈرامے تجرباتی

مصنف کمال احمد صفحات ۹۶ ڈیمائی سائز (عمدہ آفسیٹ طباعت)
قیمت : ۷/- روپے ناشر : شاداب کتاب گھر ۵-۱/۳۴ سرسید احمد روڈ کلکتہ ۱۴

ڈرامہ کی اہم ضروریات ۔ پس منظر کی ایسی عکاسی کہ ماحول نا آشنا نہ رہے ۔ کرداروں کی گفتگو عمل اور خیالات میں اس طرح کی ہم آہنگی ہو کہ وہ جیتے جاگتے انسان ہوں نہ کہ صرف تصوراتی ۔ مکالموں میں نہ صرف زبان و ادب کا چٹخارہ ہونا چاہیئے بلکہ کہنے والے کے کردار سے مطابقت رہے ۔ ان دو تجرباتی ڈراموں میں کمال احمد صاحب نے دو مختلف نوعیت کے ڈرامے پیش کئے ہیں ۔ پہلا ڈرامہ " شیشے کا گھر " ایک بوڑھے باپ کی بچھڑے ہوئے بیٹے کے لئے تڑپ ہو سکتی ہے اس کو مرکزی خیال بنایا ہے ۔ احساس سے عاری اولاد باپ کے جذبات کا کس طرح خون کرتی ہے بڑے اچھے انداز میں پیش کیا ہے ۔ خانم شریف ، ڈاکٹر سنہا ، سندیپ کمار کرایہ دار کے کردار میں جیتے جاگتے نمونے ہیں لیکن مرکزی کردار یعنی " نواب " کے ساتھ ڈرامہ نگار نے انصاف نہیں کیا ہے شاید نواب کا نام دینے کے بعد انھیں صرف نواب وہ بھی ماضی کا بگڑا ہوا نواب بنا کر مرکزی خیال سے مطابقت کو فراموش کر دیا ہے ۔ دوسرا ڈرامہ " ایک تماشا جو " پہلے کے مقابلے میں بہت ہی پست معیار رکھتا ہے ۔ پس منظر مرکزی خیال سے مختلف ہے اس ڈرامے کے جملہ کردار نہ پوری طرح اگلے زمانے کے ہیں اور نہ موجودہ زمانے کے ۔ یہ ڈرامے نا آشنا ماحول ، بے جان کردار اور روکھے پھیکے مکالموں سے بھرے پڑے ہیں ہمارا خیال ہے کہ ڈرامہ نگار جس چیز کو طنزیہ طور پر پیش کرنا چاہتا تھا وہ کر نہیں پایا جس کی وجہ سے ڈرامہ اپنی ساری دلچسپی کھو بیٹھا ۔

(غلام جیلانی)

جو نہ کرنا تھا (ناول)

مصنف : برق آشیانوی قیمت : ۶/- روپے ناشر : نسیم بک ڈپو لکھنؤ

یہ بات میرے لئے بالکل نئی نہیں ہے اور نہ حیرت کا موجب کہ برق آشیانوی نے ایک سنجیدہ معاشرتی ناول لکھ کر کوئی نیا قدم اٹھایا ہے ۔ میں نے لکھنؤ سے جناب موسیٰ کلیم (برق آشیانوی) کو ایک سنجیدہ ادیب اور انقلابی شاعر کی حیثیت سے واقف ہوں ۔ ۱۹۶۰ء کے بعد ادبی حلقوں میں وہ ایک نئے نام برق آشیانوی سے طنز و مزاح کا ادب لکھنے لگے اور جلد ہی مقبول مزاح نویس بن گئے ۔

ناول "جو نہ کہنا تھا" ایک سنجیدہ معاشرتی و اصلاحی کہانی کے علاوہ قومی یکجہتی اور ایثار و قربانی کا مکمل مرقع ہے کہانی کا سب سے بڑا عنصر اس کا تسلسل اور جذبات کی مکمل عکاسی ہے۔ اس کا غمگین حصہ پڑھیئے تو راشد الخیری کی یاد تازہ ہو جاتی ہے ــــ ناول ایک متمول خاندان کی اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی کی کہانی ہے جو اپنی پسند کے مطابق شادی نہ ہونے پر اپنے پسندیدہ نوجوان سے خواہش کرتی ہے کہ وہ خفیہ طور سے شادی کر لیں لیکن . . . .

غرض یہ ناول ایک رومانی داستان ہی نہیں بلکہ ایک طرف سماج کے رستے ہوئے ناسور یعنی جوڑے کی رقم اور جہیز کی لعنت پر بھرپور وار ہے تو دوسری طرف عورت کو اس کے ملکوتی صفات کی بلندیوں پر پہونچا کر پابند وفا ثابت کرتا ہے اس میں آنسو بھی ہیں، مسکراہٹیں بھی ہیں اور دعوتِ فکر بھی ہے تسلسل اور دلچسپی کا یہ عالم ہے کہ ناول پڑھنا شروع کیجئے تو ختم ہونے تک چھوڑنے کو جی نہیں چاہے گا۔

بہرحال اشتیاق الحسن نے معاشرہ کے اہم پہلو پر سنجیدگی اور خلوص سے بہتر ناول لکھ کر اپنی مخفی صلاحیتوں کو ایک بار پھر روشن کیا ہے۔

(شمیم نصرتی)

لفظوں کی دھوپ (شعری مجموعہ)

شاعر: شکیل منظری صفحات: (۱۱۲) ڈیمائی سائز

قیمت: ۱۹/- روپے ملنے کا پتہ: شالیمار پبلی کیشنز تپ بازار حیدرآباد

"لفظوں کی دھوپ" شکیل منظری کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ ۱۴ نظموں، ۸۲ غزلوں اور چند متفرق اشعار پر مشتمل اس مجموعۂ کلام کی ترتیب و تزئین، انتخاب کلام، کتابت و طباعت، گٹ اپ غرضکہ ہر مرحلے پر احتیاط، نفاست اور سلیقہ کا ثبوت دیا گیا ہے۔ نظمیں اگرچہ کم ہیں لیکن ان کی زیریں فضاء میں افسانوی آہنگ کی بازگشت پائی جاتی ہے۔ شکیل منظری توجہ دیں تو وہ اچھی اور بلند پایہ نظموں کی تخلیق کر سکتے ہیں لیکن بنیادی طور پر شکیل منظری غزل کے شاعر ہیں جس کا ثبوت غزلوں کا مجموعۂ کلام ہے۔

ڈاکٹر مغنی تبسم نے اپنے پیش لفظ میں شاعر کی ذات کے سفر استناد کی بھرپور عکاسی کی ہے جس سے شاعر کے شعری رویّہ کو سمجھنے میں بڑی حد تک مدد ملتی ہے۔ لیکن "لفظوں کی دھوپ" میں یہ سفر ابھی استناد کی حقیقی منزل تک پوری طرح پہنچ نہیں پایا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ لفظوں کی دھوپ کا شاعر یادوں اور خواب کا شاعر بن کر سامنے آتا ہے۔ اور انہی بھول بھلیوں میں خود اپنی تلاش میں سرگرداں نظر آتا ہے۔ اس عمل میں ماضی کا رشتہ حال اور مستقبل سے بار بار ٹوٹ جاتا ہے جو سفر استناد کی نا تکمیلیت کا باعث ہے۔

بایں ہمہ لفظوں کی دھوپ بڑی سہانی، نرم اور سایہ آسا محسوس ہوتی ہے۔ خیال کا اچھوتا پن، فکر کی گہرائی، احساس کی شدت، زیر تکمیل لہجے کی انفرادیت بھی کچھ رنگ اس میں جھلکتا ہے۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

یاد کا ابر دے نغموں کی پھواریں برسا جل رہا ہے مرے احساس کا صحرا ساقی

جلتے لفظوں کی تمازت میں شکیل اپنی آواز کا سایہ ہم تھے۔
یاد کرنے کا سلیقہ بھول بیٹھے جب سے ہم تب سے تیری ساری یادیں خواب آسا ہو گئیں
مقتل میں ڈوبی ہوئی یادوں کا حصہ بن گئیں تو نے جو پرچھائیاں چھوڑیں وہ صحرا بن گئیں
دو نگاہیں منتظر اک خواب کی اک دریچہ ادھ کھلا سا جاگتا
کیا کرب تھا کہ تجھ سے بچھڑ کر تمام عمر میں خواب خواب لمحوں میں بھی مضطرب رہا۔

(رشید عبدالسمیع جلیل)

نقطے اور لکیریں (شعری مجموعہ)

شاعر: امین تابش صفحات (۱۱۴) قیمت: ۸/- روپے
ملنے کا پتہ: امین تابش ۱۷۸ جی، بی، روڈ باندرہ بمبئی ۵

"نقطے اور لکیریں" امین تابش کی (۷۷) غزلوں کا مجموعہ ہے جس میں ایک نعت بھی شامل ہے۔ غزلوں کے مزاج، رنگ اور لفظیات میں ایک طرح کی عمومی فضا پائی جاتی ہے جس سے امین تابش کی شاعری عوامی شاعری سے قریب تر محسوس ہوتی ہے لیکن جذبہ کا فقدان کھٹکتا ہے۔ کہیں کہیں قدیم و جدید رنگ کا امتزاج بھی پایا جاتا ہے لیکن غالب رنگ بیسویں صدی کے پہلے نصف کے لب و لہجہ کی بازیافت ہے۔

"نقطے اور لکیریں" کی شاعری ایک باشعور فن کار کی شاعری تو ہے مگر جس کا حیطۂ ادراک ابھی بمبئی کی تنگ و تاریک گلیوں تک محدود ہے۔ اس اعتبار سے امین تابش اخلاص فکر کے امین ہیں اور "نقطے اور لکیریں" ان کے فکر تاب و تابش۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

زندگی: کوئی معمہ تو نہیں ہے یارو کیوں وہ تعبیر طلب ٹھہری ہے خوابوں کی طرح
کس کی انگڑائی کا منظر اثر انداز ہوا مری رگ رگ کھنچی جاتی ہے خیالوں کی طرح
چہرہ بھی اک کتاب ہے دل بھی ہے اک کتاب دونوں کو پڑھ کے تم مری باتوں کا دو جواب
اُس کی نہیں تلاش کہ سایہ ملے کہیں کتنی ہی تیز دھوپ ہو چلتے ہیں آج بھی
کرنیں سورج کی رکی جاتی نہیں اپنے سائے کی طوالت دیکھئے
ان کھلی آنکھوں سے دیکھے رہ گئے جو منظر بند آنکھوں میں وہی خواب چلے آتے ہیں

(رشید عبدالسمیع جلیل)

—— "سب رس" میں تبصرہ کے بعد کتابیں "ادارہ ادبیات اردو" کے کتب خانہ میں اسکالروں کے استفادے کے لئے رکھی جاتی ہیں مصنفوں سے خواہش ہے کہ وہ اپنی مطبوعات کی دو جلدیں پابندی سے بھجوائیں —— (ادارہ)

آئیے ہم اپنی کمر کس لیں

ہمارے ساحلی اضلاع کے کچھ علاقوں میں ۱۹ر نومبر ۷۷ ۱۹ء کے نحس سنیچر کو آنے والے ہلاکت خیز طوفان نے تباہی اور بربادی کے جو منظر اپنے پیچھے چھوڑے ہیں ان کی تشریح امکان سے بعید ہے۔ عوامی جائیداد کو پہنچنے والے نقصان کی کہانی سب سے زیادہ دردناک ہے۔

متاثرہ علاقوں میں فوری طور پر روزگار کے مواقع فراہم کرنے کے لئے اور ذرائع آبپاشی کی بحالی نیز سڑکوں اور عمارتوں وغیرہ کی تعمیر و ترمیم کے لئے ریاستی حکومت نے ۷۲۵ لاکھ روپیوں کی منظوری دی ہے۔

تعمیر و ترمیم کی سرگرمیاں ایسے کاموں پر مرکوز ہیں جو پنچایت راج، عمارات و شوارع، تعمیرات عامہ اور بلدیات کے تحت آتے ہیں۔ ہر محکمہ کے لئے منظورہ رقومات حسب ذیل ہیں۔

بڑی اور اوسط آبپاشی	(پی ڈبلیو ڈی)	۱۵۰ لاکھ روپے
چھوٹی آبپاشی کے وسائل	(")	۷۵ لاکھ روپے
عمارات و شوارع	(آر اینڈ بی)	۱۵۰ لاکھ روپے
عمارات	(۰)	۵۰ لاکھ روپے
شوارع	(پنچایت راج)	۱۰۰ لاکھ روپے
عمارات بشمول مدارس	(")	۱۰۰ لاکھ روپے
چھوٹی آبپاشی کے وسائل	(")	۵۰ لاکھ روپے
سڑکیں، عمارتیں اور آبرسانی	(بلدیات)	۵۰ لاکھ روپے
جملہ		۷۲۵ لاکھ روپے

مکرر تعمیر اور بازآبادکاری کے کاموں کے لئے طویل مدتی پروگرام درکار ہوتے ہیں۔ آئیے ہم سب اور ہم میں سے ہر ایک کمر کس لے اور آئندہ درپیش آنے والے عظیم مسائل سے نمٹنے کے لئے تیار ہو جائے۔
یقیناً آندھرا پردیش پھر سے مسکرائے گا۔

ناظم محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ
آندھرا پردیش۔ حیدرآباد

No 365/ADVT/74/1371

ادبی سرگرمیاں

اردو نامہ ؛ علمی، ادبی اور تہذیبی خبر نامہ

یکم جنوری ، جناب موسیٰ ناظم لکچرار اورنٹیل اردو کالج کے مضامین کا ایک مجموعہ "ایک انمول پھلواری" کے نام سے نگاہ پبلیکیشنز حیدرآباد ۱۲ کی طرف سے شائع ہوا۔

● کل ہند صنعتی نمائش میں ریاستی اردو اکیڈیمی کے بک ڈپو کا ریاستی چیف منسٹر شری این ٹی راماراؤ نے افتتاح کیا۔ صدر اردو اکیڈیمی جناب آصف پاشاہ نے اکیڈیمی کے کاموں سے چیف منسٹر کو واقف کرایا۔ جناب عابد علی خاں صدر نشین مجلس انتظامی اردو اکیڈیمی نے چیف منسٹر کو اردو کتابوں کا سیٹ نذر کیا۔ اس موقع پر اردو مصنفوں کے علاوہ دو اردو دوست وزراء مسرز پی نرسا ریڈی (وزیر مال) اور کے ای کیشولو (وزیر چھوٹی صنعتوں) بھی موجود تھے۔

● ایک اخباری بیان کے ذریعہ ڈاکٹر عالم خوندمیری نے ریاستی اردو اکیڈیمی کی جنرل کونسل سے استعفیٰ دیدیا۔

● بزم طالب رزاقی کی طرف سے مرحوم ... کی دوسری برسی کے موقع ... ایک شعری نشست جناب روحی قادری کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ مسرز آوج یعقوبی، خیرات ندیم، اسد انصاری، اعظم عبیدی، ڈاکٹر راہی، علی سرور اور شکیل انور رزاقی کے علاوہ کئی شعراء نے کلام سنایا۔

۳ جنوری : اربن کمیونٹی پراجکٹ میونسپل کارپوریشن کے زیر اہتمام سہ لسانی مشاعرہ ڈاکٹر ضیاء صدیقی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ تلگو اور ہندی کے علاوہ اردو کے شعراء مسرز امیر احمد خسرو، خیرات ندیم، شمس الدین تاباں، راجہ لال راجہ، عقیل ہاشمی، صادق نوید، ناظم میرزائی، علی الدین نوید، رؤف خیر، ٹھاکر بجرنگ سنگھ فقیر، بالا پرشاد باقی اور مراد خاں دکھل نے کلام سنایا۔ مولانا حافظ ابو یوسف ایم، ایل، سی نے مخاطب کیا۔ شعراء کو اسناد توصیفی بھی دیئے گئے۔

۷ جنوری : ادارۂ ترقی ادب آندھرا پردیش کے صدر جناب کے ایم خاں کو مرکزی ترقی اردو بورڈ وزارت تعلیم حکومت ہند کے رکن کی حیثیت سے نامزد کیا گیا۔

۸ جنوری : اقبال اکیڈیمی کے زیر اہتمام محفل اقبال ہوا۔ مسرز محمد منظور احمد (لکچرار سٹی کالج) ظہیر الدین احمد، احمد اللہ قادری اور خواجہ ناصر الدین نے علامہ اقبال کے فلسفہ و فکر پر مخاطب کیا۔ جناب خلیل اللہ حسینی نے اس اجلاس کی صدارت کی۔

● مشہور افسانہ نویس ابراہیم شفیق مرحوم کے ادبی اثاثے کے تحفظ کے لئے اردو دوستوں اور قلم کاروں کی طرف سے "شفیق میموریل سوسائٹی" کا قیام عمل میں آیا۔ جس کے سرپرست حافظ ابو یوسف (ایم، ایل، سی) اور صدر جناب اقبال متین منتخب کئے گئے۔ جناب عاتق شاہ اور جناب اکرام جاوید نائب صدور، جناب اعظم علی خاں معتمد کی حیثیت سے چنے گئے۔

● ہفت روزہ آندھرا پنچ کی ۱۷ ویں سالگرہ پر جلسۂ تہنیت، جناب رحمت علی ڈپٹی اسپیکر کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مسرز رحیم فرہاد، پی وینکٹ سوامی (ایم پی) عبدالرحیم اتاد نے مسٹر ملک محمد علی خاں ایڈیٹر "آندھرا پنچ" کی صحافتی خدمات کو خراج تحسین ادا کیا۔ اور مقررین جلسہ نے حیدرآباد میں اردو صحافت کے ارتقاء پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

● معروف صحافی شمس الدین تابش مرحوم کی خدمات کو اردو ورکنگ جرنلسٹ کی طرف سے بھرپور خراجِ عقیدت ادا کیا گیا۔ جناب معین فاروقی ایڈیٹر "انگارے" نے اس تعزیتی جلسہ کی صدارت کی۔ ایک قرارداد کے ذریعہ مرحوم صحافی کے پسماندگان کی اعانت کے لئے حکومت کو توجہ دلائی گئی۔ رحیم فریادی صدر ریاستی اردو پریا ذیکلس اسوسی ایشن، احسن علی مرزا (سیاست) صباحت جیلانی (رہنمائے دکن) جہاندار افسر (کرنٹ نیوز) ناظم مرزا (انگارے) ڈاکٹر یوسف نیم (رہنمائے تلنگانہ) اور ظفر خیر آبادی (سماچار) نے مخاطب کیا اور حکومت سے مجوزہ جرنلسٹ بینیفٹ اسکیم کی عاجلانہ عمل آوری کا مطالبہ کیا۔

۱۰ر جنوری: صدر ریاستی اردو اکیڈیمی جناب آصف پاشا سے اردو صحافیوں کے ایک وفد نے جس کی قیادت مسٹر معین فاروقی ایڈیٹر انگارے نے کی، ملاقات کے بعد اس امر کا مطالبہ کیا کہ اردو اکیڈیمی کی طرف سے صحافیوں کی بھی ادیبوں، شاعروں کی طرح اعانت کی جائے۔

● زندہ دلانِ حیدرآباد کے سالانہ انتخابات میں مسرز بھارت چند کھنہ (صدر) نریندر لوتھر اور رشید قریشی (نائب صدر) طالب خوندمیری (معتمد عمومی) مسیح انجم اور پوگس حیدرآبادی (نائب معتمدین) اور رشید عبدالسمیع جلیل (خازن) کے علاوہ اراکین مسرز مصطفیٰ کمال، حمایت اللہ، مصطفیٰ علی بیگ، گرز بھز حیدرآبادی اور اسمٰعیل ظریف بلامقابلہ منتخب ہوئے۔

۱۲ر جنوری: ریاستی اردو اکیڈیمی کے صدر جناب آصف پاشا (وزیر قانون) نے پریس کانفرنس کو مخاطب کرتے ہوئے اردو اکیڈیمی کی دو سالہ کارکردگی کی رپورٹ سنائی اور ریاستی حکومت سے اکیڈیمی کے تعلیمی اور ادبی امور کی وسیع طور پر انجام دہی کے سلسلے میں مالی امداد میں اضافے کی ضرورت پر زور دیا۔ موصوف نے بتایا کہ ریاستی حکومت کو اردو کی ترقی و اشاعت سے کافی دلچسپی ہے اور اس سلسلے میں سہولتیں بھی فراہم کر دی گئی ہیں۔ موصوف نے بتایا کہ حکومت نے تعلیمی اداروں اور نظم و نسق میں اردو کے استعمال کا جائزہ لینے کی غرض سے ایک کمیٹی بھی تشکیل دی ہے۔ جناب آصف پاشا نے کہا کہ عثمانیہ یونیورسٹی میں "اقبال چیر" کے قیام کے سلسلے میں وائس چانسلر سے نمائندگی کی گئی ہے۔ اکیڈیمی کی طرف سے کتابوں کی اشاعت کا ذکر کرتے ہوئے صدر اردو اکیڈیمی نے بتایا کہ شہر حیدرآباد کے کلچر پر رائے محبوب نرائن سے کتاب لکھوائی جا رہی ہے اسی طرح ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید کا مقالہ "تلگو ادب اور فنونِ لطیفہ" بھی اکیڈیمی شائع کر رہی ہے۔ علم عروض پر پروفیسر ابوالظفر عبدالواحد کی کتاب "آہنگِ شعر" طباعت کے مراحل میں ہے۔

۱۴ر جنوری: پروفیسر عالم خوندمیری نے ریاستی اردو اکیڈیمی سے اپنے استعفیٰ کی وجوہات کا اظہار کرتے ہوئے اخبار میں بیان میں بتایا کہ ان کے استعفیٰ کا تعلق اکیڈیمی کی اگزیکیٹو کونسل کے اس فیصلے سے نہیں ہے جو مسٹر اقبال متین کی کتاب "چراغ تہہ داماں" کو انعام کا مستحق نہ قرار دینے سے متعلق ہے بلکہ اکیڈیمی میں ادیبوں کی کم تعداد تناسب پر ہے۔

۱۵ر جنوری: اقلیم ادب کا ماہانہ ادبی اجلاس ڈاکٹر حسن عسکری (مسلم یونیورسٹی علیگڈھ) کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مشہور آرٹسٹ سعید بن محمد نقاش کے فن اور شخصیت پر معین الدین نے انٹرویو لیا۔ محترمہ جیلانی بانو نے نئی کہانی سنائی۔ "ایک نظم تین تاثر" کے زیرِ عنوان اثر غوری کی نظم پر جمیل شیدائی، برق یوسفی اور گوتم سروپ نے تجزیاتی مطالعہ پیش کیا۔

● ادبی ٹرسٹ کے زیرِ اہتمام مشہور سخنور جناب خیرات ندیم کا پہلا شعری مجموعہ "صفِ مژگاں" شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں صرف غزلیں ہی شامل ہیں۔

● حیدرآباد کے ایک کہنہ مشق شاعر جناب معین الدین اثر فاروقی کا طویل علالت کے بعد انتقال ہو گیا۔

● مرکز ادب کا طرحی مشاعرہ جناب سلطان محی الدین سیف حموی کی صدارت میں

منعقد ہوا۔ ڈاکٹر رام پرشاد سرپرست
یم نے ابتداً اُردو شعر و ادب کی حیدرآبادی
مدروں پر مخاطب کیا۔ محفلِ شعر میں سرزد تکر
اؤ د نکہ دلشیمکہ، محسن نظامی، عظیم حیدرآبادی
اجہ لال بہار، محوی سرورشی، رؤف ارسلان،
رمان فاروقی اور وقار عزیقی نے حصہ لیا۔

۱۹ جنوری: ادارۂ ترقی ادب کے زیرِ اہتمام اُردو ہال میں ایک سیمینار "اقبال اور مشرق کی بیداری" کے موضوع پر منعقد ہوا۔ مرکزی وزیرِ مملکت جناب فضل الرحمٰن نے سیمینار کا افتتاح کیا۔ جناب کے یم خان رکن ترقی اُردو بورڈ نے صدارت کی۔ ڈاکٹر عالم خوندمیری مہمانِ خصوصی تھے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد شکیب، ڈاکٹر رحیم الدین کمال، ڈاکٹر تیج نارائن جیسوال اور میر کمال الدین علی خاں نے سیمینار میں حصہ لیا۔

● حلقۂ اربابِ ذوق کا ماہانہ ادبی اجلاس نظام اُردو لائبریری میں بصدارت ڈاکٹر غلام دستگیر رشید منعقد ہوا۔ ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے "رشید احمد صدیقی ایک جائزہ" کے زیرِ عنوان مقالہ سنایا۔ جناب عبدالمحمود ڈائرکٹر نظام اُردو ٹرسٹ نے شکریہ ادا کیا۔

● سنٹرل ڈائرکٹریٹ فیلڈ پبلسٹی کی طرف سے نمائش کلب میں ایک محفلِ مشاعرہ بعنوان "ہم ایک ہیں" آراستہ ہوئی۔ جناب راجے کنج بہاری لال (آئی اے یس) نے صدارت کی۔ مسرز ڈاکٹر مغنی تبسم، سعید شہیدی، امیر احمد خسرو، خیرات ندیم، صلاح الدین نیّر، رئیس اختر، فیض الحسن خیال اور وقار خلیل نے نظمیں سنائیں بعد میں غزلیہ شاعری کا دور ہوا۔ صلاح الدین نیّر نے نظارت کے فرائض انجام دیئے

● مرکزی وزیرِ مملکت برائے توانائی جناب فضل الرحمٰن نے ریاستی اُردو اکیڈیمی کا معائنہ کیا۔ جناب عابد علی خان صدر نشین مجلس انتظامی اکیڈیمی نے تعارفی اور خیر مقدمی تقریر کرتے ہوئے اکیڈیمی کی کارکردگی سے وزیرِ موصوف کو واقف کرایا۔ اس موقع پر موصوف نے ادبی ٹرسٹ کی مطبوعات کا سیٹ بھی تحفتہً دیا۔ مسٹر رحمٰن نے کہا کہ حیدرآباد کو اس کی ادبی اور تہذیبی خدمات کی وجہ سے لکھنؤِ ثانی کا مقام حاصل ہے۔ اکیڈیمی کی طرف سے ادیبوں، شاعروں کی معاونت کے جذبے کی وزیرِ موصوف نے ستائش کی۔ جناب مجاہد چندر کھنہ ڈائرکٹر اکیڈیمی اور جناب رشید قریشی اسسٹنٹ ڈائرکٹر نے وزیرِ موصوف کا خیر مقدم کیا۔ اس موقع پر ادیبوں، شاعروں نے بھی شرکت کی۔

● بزمِ اُردو اہلِ ایکزیکیٹی بورڈ کی طرف سے مرکزی وزیر جناب فضل الرحمٰن کا خیر مقدم کیا گیا۔ اس تقریب کی صدارت جناب سید رحمت علی ڈپٹی اسپیکر نے کی۔ جناب رحمٰن نے کہا کہ اُردو والوں کو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ اُردو کا مستقبل ہندوستان میں نہایت تابناک ہے۔ اس جلسہ کو جناب کے یم خان، رکن ترقی اُردو بورڈ، ڈاکٹر وینا تارا رائو صدر نشین ریاستی ایکزیکیٹی بورڈ نے بھی مخاطب کیا۔ جناب نریندر لوتھر نے خوبصورت فکاہیہ سنایا۔ مسٹر یم اے عظیم صدر بزمِ اُردو نے طالبین بورڈ کی ادبی و تہذیبی صلاحیتوں پر روشنی ڈالی اور رپورٹ پیش کی۔ مسٹر کمال الدین نے خیر مقدم کیا۔ مسٹر محمد ظہیر الدین خان نے شکریہ ادا کیا

۲۰ جنوری: مرکزی وزیرِ تجارت جناب عارف بیگ نے "ولا اکیڈیمی" کی طرف سے ایک استقبالیہ میں شرکت کی۔ مسٹر شمس الدین احمد معتمد ولا اکیڈیمی نے سرگرمیوں سے واقف کیا اور مطبوعات کا سیٹ وزیرِ موصوف کی نذر کیا۔

۲۲ جنوری: ریاستی اُردو اکیڈیمی کے پریس نوٹ کے بموجب صدر اکیڈیمی نے محترمہ شاکرہ بیگم کو اکیڈیمی کی ذیلی کمیٹی برائے کتب خانہ پر بطور نمائندہ صدر رنگشتی کتب خانہ "رکن نامزد کیا۔

۲۵ جنوری: اُردو مجلس کا ماہانہ ادبی اجلاس جناب یم اے معروف کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جناب سری کرشن سنہا نے "مہندر پرتاپ کی یادیں" کے زیرِ عنوان مضمون

سنایا۔ تیج نارائن جی جیسوال نے ہندی شاعر پنت کی حیات اور شاعری پر مقالہ پڑھا۔ محفلِ شعر میں مسرز اختر حسن، ممنواز علی مرزا، ڈاکٹر احسن رضوی، رحمٰن جامی، راجہ لال راجہ، گیان سنگھ شاطر، علی سرور اور معتمد اردو مجلس جناب صلاح الدین نیر نے کلام سنایا۔

۲۶ جنوری: یومِ جمہوریہ ہند کے موقع پر ادارۂ ادبیاتِ اردو کی عمارت "ایوانِ اردو" پر جناب میر سراج الدین علی خاں آفس سکریٹری نے قومی پرچم آویزاں کیا۔

● "ساز اور آواز انٹرپرائز" کی طرف سے آراستہ شبِ غزل میں پاکستان کے معروف موسیقار مہدی حسن نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ نامور غزل گو شعراء کا کلام پیش کیا۔ ریاستی گورنر محترمہ شاردا مکرجی نے نہال موسیقار کو حیدرآباد کے چارمینار کا نقرئی ماڈل پیش کیا۔ جناب وسیم اختر نے شبِ غزل کی کامپیئری کی۔

۲۷ جنوری: اقبال اکیڈمی کی طرف سے محفلِ اقبال کو ڈاکٹر عالم خوندمیری نے مخاطب کیا اور اقبال کے فلسفۂ تصورِ زمان و مکان پر روشنی ڈالی۔

● اردو کی نامور افسانہ نویس محترمہ جیلانی بانو کے افسانوں کا تلگو ترجمہ "کیدارم" کی رسمِ اجرا تلگو اکیڈمی میں ڈاکٹر بی گوپال ریڈی سابق گورنر اترپردیش نے انجام دی۔ تلگو کے مشہور ناول نگار مسٹر رنگاچاریہ داسرتھی نے بانو کی کہانیوں کو تلگو میں منتقل کیا ہے۔

● کل ہند صنعتی نمائش کی طرف سے نمائش کلب میں ایک محفلِ مشاعرہ جناب سید ہاشم علی اختر معتمد ادارۂ ادبیاتِ اردو کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ ڈاکٹر افضل محمد نے خیر مقدمی تقریر کی۔ جناب میر اکبر علی خاں سابق گورنر اڑیسہ مہمانِ خصوصی تھے۔ اس مشاعرہ میں مسرز ہاشم جاہ، بے حس الہ آبادی، نایاب سلطانہ، فیض الحسن خیال، قمر خلیل، ڈاکٹر احسن رضوی، امیر احمد خسرو، رئیس اختر، سعید شہیدی، اوج یعقوبی، صلاح الدین نیر، شاذ تمکنت، کنول پرشاد کنول، عزیز النساء صبا اور خیرات ندیم نے کلام سنایا۔ جناب صلاح الدین نیر معتمد مشاعرہ تھے۔

۲۸ جنوری: عثمانیہ یونیورسٹی نے جناب عبدالقادر عماری کو ان کے مقالے "حیدرآباد کے نواب، سماجی تبدیلیوں کے پس منظر میں" پر سوشیالوجی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کا مستحق قرار دیا۔

۲۹ جنوری: وزیرِ خارجہ مسٹر اٹل بہاری واجپائی نے اخباری نمائندوں سے بات کرتے ہوئے کہا کہ "اردو ہندوستانی زبان ہے اور ہندوستان میں پیدا ہوئی اور یہیں پروان چڑھی ہے۔ اس کی ترویج و اشاعت کے لئے جنتا حکومت اور جنتا پارٹی ہر ممکنہ عملی اقدامات کرے گی۔ مسٹر واجپائی نے اربابِ صحافت کو بتایا کہ اردو کے تعلق سے نئی حکومت کی پالیسی بالکل واضح ہے۔

۳۱ جنوری: نمائش سوسائٹی کی طرف سے طنز و مزاح لکھنے والے شعراء کا مشاعرہ جناب بھارت چند کھنہ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مسرز ان بٹھہ، محمد جہانگیری، خورشید کاظمی، حلیم بیگ، محمد علی منگل، حفیظ خان سپاٹ، صبغۃ اللہ جھپاٹ، اسمعیل ظریف، سرپٹ حیدرآبادی، مصطفیٰ علی بیگ، بوگس حیدرآبادی، گڑبڑ حیدرآبادی، اشرف خوندمیری اور طالب خوندمیری نے کلام سنایا۔ ●

مستقبل کی پکار

آندھرا پردیش کے ساحلی اضلاع کے کچھ حصوں کو حال ہی میں نشانہ بنانے والی دیوہیکل سمندری موجوں سے بچ جانے والے دہشت زدہ ماہی گیروں کی زبانوں پر خوف و ہراس سے معمور بہت سی کہانیاں ہیں۔ ان میں سے بعض سطح سمندر پر نظر آنے والے مہیب آگ کے گولے کی باتیں کرتے ہیں، اور بعض کانوں کو بہرہ کر دینے والی بجلی کی گرج دار آواز کا ذکر کرتے ہیں۔ جو ۱۹ر نومبر ۱۹۷۷ء کے نحس سنیچر کو موت و تباہی کی جانب بہالے جانے والی ہیبت ناک موجوں کے حملے سے قبل سنائی دی تھی۔ اب یہ لوگ آہستہ آہستہ اپنے حواس میں آ رہے ہیں۔ اور ریاستی حکومت کی فیاضانہ امداد کی بدولت اپنی حسب معمول سرگرمیوں کی انجام دہی کے قابل ہو رہے ہیں۔

طوفان کے باعث ضائع ہو جانے والی کشتیوں کی تلافی کے لئے اور نقصان پہنچنے والی کشتیوں کی درستگی کیلئے اضلاع کرشنا، گنٹور، مغربی گوداوری، مشرقی گوداوری، نیلور، پرکاشم اور وشاکھاپٹنم کے کلکٹروں کی تحویل میں ۱ء۴۸ کروڑ روپیوں کی رقم رکھی گئی ہے۔

بلاک ڈیولپمنٹ آفیسرز کے توسط سے ماہی گیری کے ساز و سامان کی تقسیم کے لئے ۲۵ء۶۰ کروڑ روپیوں کی رقم اضلاع کرشنا، گنٹور، مغربی گوداوری، مشرقی گوداوری اور پرکاشم کے کلکٹروں کی تحویل میں دی گئی ہے۔

کولیرو کے مستحقین کے لئے بانسوں کی خریدی اور ماہی گیری میں کام آنے والی ٹوکریوں کی تیاری کیلئے ۲ر۹ لاکھ روپیوں کی رقم مختص کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں بحالی و باز آبادکاری کے کاموں کے لئے "اے۔ پی۔ فشریز کارپوریشن" کو ۲۱۵ لاکھ روپیے اور "بوٹ بلڈنگ انڈسٹریز کواپریٹیو کریڈٹ سوسائٹی" کلی کلادین کو ۵ لاکھ روپے بطور پیشگی رقم کے مہیا کئے گئے ہیں۔

ایک نئی صبح سمندر کے جیالے سپوتوں کا خیر مقدم کر رہی ہے، وہ ضرور مستقبل کی پکار پر لبیک کہیں گے

ناظم محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ
آندھرا پردیش - حیدرآباد

Ro. 32/ABNT/C4/1871

دستی کرگھوں کی مسرت بخش آواز پھر سنائی دے گی

آندھرا پردیش میں زراعت کے بعد شعبۂ دستی پارچہ بافی لوگوں کی سب سے بڑی تعداد کو روزگار فراہم کرتا ہے اس لئے ریاستی حکومت کی جانب سے حالیہ طوفان کا نشانہ بننے والے ساحلی علاقوں کے بدنصیب بافندوں کی امداد بڑے پیمانہ پر کی جائے گی تاکہ وہ اپنی زندگی کو نئے سرے سے شروع کرسکیں اور ان نظرنواز اور مسحورکن رنگوں والے کپڑوں کی تیاری میں پھر سے جٹ جائیں جو مغربی دنیا میں وسیع مقبولیت اور ستائش حاصل کرچکے ہیں۔

ہر متاثرہ بافندے کو ۱۰۰ روپیے مالیت کے دھاگے کی فراہمی کے علاوہ ۱۵۰ روپیے کرگھوں کی درستگی کے لئے دیئے جائیں گے۔ ضلع کرشنا کے تعلقہ جات "بندر" اور "دیوی" میں یہ امداد ۷۵ فیصد مفت اعانت اور ۲۵ فی صد قرض کی صورت میں بہم پہونچائی جائے گی، جب کہ دوسرے متاثرہ اضلاع میں اس امداد کی نوعیت ۵۰ فیصد مفت اعانت اور ۵۰ فی صد قرض کی ہوگی۔ ضلع وشاکھاپٹنم کے ان مواضعات میں جو "شاردا" ندی کی طغیانی کے باعث مکمل طور پر غرقاب ہوگئے ہیں مفت اعانت کا تناسب ۷۵ فی صد ہوگا۔

متاثرہ علاقوں میں ہینڈلوم بافندوں کی امداد کے لئے ۱٫۶۲ کروڑ روپیے منظور کئے گئے ہیں۔

وہ دن دور نہیں جب دستی کرگھوں کی
مسرورکن آواز پھر سے دکھ بھرے
دلوں کی تسلی و تشفی کا باعث ہوگی۔

ناظم محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ
حکومت آندھرا پردیش حیدرآباد

No. 34/ADVT/C4/1371

سن اجرا ۱۹۳۸ء فون ۳۸۳۶۹۰
یادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

ماہنامہ
سب رس
حیدرآباد

نگران:
سید علی اکبر ایم اے کینٹب
معتمد مجلس مشاورت:
غلام جیلانی
مرتب:
وقار خلیل

مجلس مشاورت:
ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
ڈاکٹر غلام عمر خاں
رمن راج سکسینہ
عابد علی خاں
محمد منظور احمد

جلد: ۲۱ شمارہ: ۳
مارچ ۱۹۷۸ء

زر سالانہ: ۱۵ روپے ششماہی ۸ روپے
فی شمارہ: ایک روپیہ پچاس پیسے

یوم محمد قلی قطب شاہ نمبر

ترتیب

قند مکرر

بادۂ کہن

حیدرآباد کے شاعر

سب رنگ

نقد و نظر

اپنی بات

پہلے صاحبِ دیوان شاعر اور ہندوستان کے دل حیدرآباد کے بانی سلطان محمد قلی قطب شاہ معانی کی یاد کو دکن میں اب ایک تہذیبی جشن اور تیوہار کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ دکنیات کے عظیم محقق، ادارۂ ادبیاتِ اردو کے بانی ڈاکٹر زورؔ نے یومِ محمد قلی قطب شاہ تقاریب کا آغاز کیا تھا۔ ۱۹۵۸ء سے اب تک ہر سال یہ تقاریب منعقد ہو رہی ہیں۔

اس بار یومِ محمد قلی قطب شاہ کی تقاریب کا ۱۲ مارچ ۷۸ء کو ریاستی گورنر محترمہ شاردا مکرجی نے محمد قلی کے گنبد واقع گولکنڈہ پر افتتاح کیا۔ ادارہ اور گولکنڈہ سوسائٹی کے تعاون سے منائے جانے والے جشنِ محمد قلی کے افتتاحی جلسہ کو مخاطب کرتے ہوئے ریاستی گورنر صاحبہ نے کہا "یومِ محمد قلی تقاریب کو حیدرآباد کی عظیم روایات اور تہذیب کی یادگار کی حیثیت سے منا کر بلاشبہ ہم سب اس حکمران کو خراجِ عقیدت پیش کر رہے ہیں جس نے اپنے کارناموں سے بلا لحاظ مذہب و فرقہ تمام رعایا کے دلوں پر حکمرانی کی اور انھیں انسانیت اور بھائی چارگی کا درس دیا۔ گورنر صاحبہ نے کہا کہ ویسے تو ہندوستان پر کئی حکمرانوں نے حکومت کی لیکن ان میں بہت کم ایسے حکمران گزرے ہیں جن کی یاد اس طریقہ سے منائی جاتی ہو، جب تک حیدرآباد کی تاریخ باقی ہے بانیٔ شہر کا نام روشن رہے گا۔"

چیف جسٹس آندھرا پردیش جناب ایس۔ اوبل ریڈی نے اس تقریب کی صدارت کرتے ہوئے قطب شاہی روایات اور دکنی کلچر کو عصرِ حاضر کے لئے مثالی قرار دیا اور کہا کہ "محمد قلی قطب شاہ" کے دور کو ہندوستان میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ اس حکمران نے کبھی بھی کسی کو مذہب یا فرقہ کی بنیاد پر نہیں دیکھا بلکہ ہندو مسلم اتحاد اور ان میں آپسی خلوص و بھائی چارگی کا جذبہ پیدا کرنے میں انتہائی اہم کردار ادا کیا۔ جسٹس ریڈی نے موجودہ نسل کو قطب شاہی تعلیمات اور روایات پر عمل پیرا ہونے کا مشورہ دیا۔

یومِ محمد قلی کی اس افتتاحی تقریب میں ہزاروں افراد نے شرکت کی جن میں ریاستی وزراء، سیاسی و سماجی قائدین، دانشور، اساتذہ، یونیورسٹی کے لکچرر، شعراء، صحافی اور "تلگو"، ہندی، اردو بولنے والے سبھی شامل ہیں۔

محمد قلی کی "مناجات" کماری پریم لتا اور ڈاکٹر احمد جاوید رضا نے سنائی اور سماں بندھ گیا، محمد قلی کے ایک شعر پر گولکنڈہ کی فضاؤں میں ... سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ ہز ایکسلنسی صاحبہ نے لطف لیا اور آمین کہا۔ وہ شعر یہ ہے

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر　　　رکھیا جوں توں دریا میں من یا سمیع

یوم محمد قلی قطب شاہ کے موقع پر جناب رمن راج سکسینہ نے خیرمقدمی تقریر کرتے ہوئے ادارہ کی علمی و ادبی مصروفیات اور اس تقریب کے انعقاد کے پس منظر پر روشنی ڈالی۔ پھر جناب ہاشم علی اختر معتمد عمومی ادارہ نے چند پیامات سنائے۔

جناب عابد علی خاں صدر نشین مجلس انتظامی ریاستی اردو اکیڈیمی نے مختصر مگر مفید تر تقریر کرتے ہوئے ملا وجہی کا یہ شعر پڑھا

دکھن ہے نگینہ انگوٹھی ہے جگ — انگوٹھی کوں حرمت نگینہ ہی لگ

اور کہا کہ محمد قلی نے مختلف زبانوں میں ہم آہنگی پیدا کر کے سارے ملک کے لئے ایک روشن مثال قائم کی ہے۔ حیدرآباد میں آداب اور اخلاق کی شائستہ روایتیں جن کی ملکوں ملکوں شہرت ہے محمد قلی ہی کی دین ہے۔ محمد قلی نے حیدرآباد کے ذریعہ دنیا کو ایک ایسا فلسفۂ حیات دیا جس سے یکجہتی اور ہم آہنگی جیسے لفظوں کو صحیح مفہوم ملا۔ حیدرآبادی تہذیب کے بانی کی یاد منانا شاہ پرستی نہیں بلکہ مشترکہ اور ملی جلی تہذیب کا جشن منانا ہے۔

جناب خواجہ محمد احمد ڈائرکٹر ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے بھی قطب شاہی نظام حکومت کو خراج عقیدت ادا کیا اور دکن کی لسانی ہم آہنگی کو مثالی قرار دیا۔ ملک کے نامور موسیقار عزیز احمد خاں وارثی نے قوالی پیش کر کے زبردست داد و تحسین حاصل کی۔ کیپٹن عباس عابدی نے محمد قلی کا دکنی مرثیہ پڑھا۔ گنبدان قطب شاہی پر صبح ہی سے میلہ لگا تھا۔ عوام کی بڑی تعداد نے شرکت کی، دکن کے صنعتی پراجکٹ کی نمائش بھی کی گئی تھی اگر گھوڑ سواری اور نیزہ بازی کے کرتب کا مظاہرہ بھی ہوا۔ دکنی لوک گیت اور ڈانس کے ایٹم کو عوام نے دلچسپی سے دیکھا اس موقع پر شعراء برادری نے پاٹ لک اور مشاعرہ کا اہتمام بھی کیا تھا جسے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے کہا کہ "اردو شاعری کا خمیر انسانی محبت اور اخلاص سے عبارت ہے اس لئے اردو کے شاعروں نے بشمول محمد قلی قطب شاہ ہمیشہ اعلیٰ انسانی اقدار کے چراغ کو روشن رکھا۔"

گولکنڈہ سوسائٹی کی طرف سے اس موقع پر قلعہ میں آواز اور روشنی کا پروگرام پیش کیا گیا جس میں محمد قلی کے عہد حکومت کی جھلکیاں نمایاں کی گئی تھیں۔

۱۳ مارچ کو ایوان اردو میں ادبی اجلاس جناب نریندر لوتھر کی صدارت میں منعقد ہوا۔ نامور اصحاب شعر و ادب نے محمد قلی کے ادبی کارناموں اور فلاحی خدمات پر مقالے پڑھے۔ یہ سب مقالے اسی اشاعت میں شامل ہیں۔ ادبی اجلاس میں بحیثیت مہمانان خصوصی ماہر غالبیات جناب مالک رام اور ماہر عثمانین دانشور ادیب جناب مرزا ظفر الحسن نے بھی شرکت کی۔ مرزا صاحب نے ادارہ کی علمی خدمات اور ڈاکٹر زور کو بھرپور خراج عقیدت ادا کیا۔ صدر جلسہ جناب لوتھر نے قطب شاہی دور کو ایک قابل رشک دور قرار دیا اور کہا کہ محمد قلی کا "کلیات" اس کا شہر اور "چارمینار" رہتی دنیا تک اس کی یاد دلاتے رہیں گے۔ ادبی اجلاس کی نظامت کے فرائض جناب محمد منظور احمد نے انجام دیئے۔

۱۴ مارچ کو یوم محمد قلی کا تلگو اجلاس ڈاکٹر ڈی راما راؤ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ نامور تلگو اسکالروں نے محمد قلی کی شاعری اور اس کے عہد حکومت کو زبردست خراج عقیدت ادا کیا۔

یوم محمد قلی قطب شاہ تہذیب جس خدمت، تازگی اور عوامی طریق پر جناب رمن راج سکسینہ صاحب کی شخصی دلچسپی اور محنت سے مقبول بنایا جا رہا ہے اس کی ستائش کی جانی چاہیئے۔ ڈاکٹر زور نے حیدرآباد والوں کو مل جل کر کام کرنے کا درس دیا تھا اور سکسینہ صاحب بھی انھیں راہوں پر سب کو ساتھ لے کر اسی خلوص اور لگن کے ساتھ جشن قلی کا اہتمام ہر سال کرتے رہتے ہیں۔

(غلام جیلانی)

تعارف ادارہ و یوم محمد قلی قطب شاہ

(رمن راج سکسینہ)

عالی مرتبت گورنر صاحبہ، عالی مقام چیف جسٹس صاحب، خواتین و حضرات!!

آج ہم یہاں اردو کا سولہواں سالانہ تہوار یعنی "یوم محمد قلی قطب شاہ" منانے کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ گذشتہ پندرہ سال سے اسی مقام حیدرآباد کے بانی، اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر، تلگو اور فارسی کے پرستار سلطان محمد قلی قطب شاہ معانی کی یاد منانے، علم و ادب دل بستگی رکھنے، اس کے کارناموں کو خراج عقیدت پیش کرنے ہم یہاں جمع ہوتے ہیں۔ یہ تقاریب کوئی میلہ یا دکھاوا نہیں ہیں تقاریب کے ذریعہ حیدرآباد کی قدیم معاشرت، علم و ادب اور فنون لطیفہ سے عام اور خاص کو متعارف کرانے کی کوشش کی جاتی ہے یہ خوشی کا مقام ہے کہ اب یہ "تحریک" ایک تہذیبی جشن کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ ان تقاریب کی افادیت اور اہمیت کے نظر، گذشتہ کئی سال سے اس ریاست کے گورنر صاحبان ان تقاریب کا افتتاح فرما رہے ہیں۔ گذشتہ اجلاسوں کا افتتاح شری بھیم سین سچر، شری بی۔ رام کشن راؤ، نواب مہدی نواز جنگ، شری کھنڈو بھائی ڈیسائی، شری موہن لال سکھاڈیا اور شری ایس۔ جے دیوان نے کیا۔ یہ بات ہمارے لئے باعث صد افتخار ہے کہ شریمتی شاردا مکرجی آج اس اجلاس کا افتتاح فرمائیں گی۔

گذشتہ تقاریب کی صدارت شری آصف پاشاہ، ڈاکٹر گوپال ریڈی اور شری این سنجیوا ریڈی جیسے اکابرین نے فرمائی ہے۔ آج اس تقریب کی صدارت شری کامن۔ ادبل ریڈی چیف جسٹس آندھرا پردیش ہائیکورٹ فرما رہے ہیں۔ جو نہ صرف ایک ماہر قانون، بلند مرتبت حاکم ہیں بلکہ حیدرآبادی اور آندھرا کی تہذیب و ثقافت کے زبردست پرستار ہیں۔

حضرات!

اس مقام پر یہ عرض کرنا کچھ غلط نہ ہوگا کہ حیدرآباد میں "جشن محمد قلی قطب شاہ" کو وہی اہمیت حاصل ہے جو دہلی میں "پھول کی سیر" اور پنجاب و بنگال میں "بیساکھی تہوار" کو حاصل ہے غالباً دنیا کے تمام شہروں میں یہ اعزاز شاید ہم اہل حیدرآباد ہی کو حاصل ہے کہ ہر سال "بانی شہر" کی یاد منانے کے لئے اس طرح یہاں جمع ہوتے ہیں۔

دکن کے عظیم محقق، جامعہ عثمانیہ کے مایہ ناز استاد، ڈاکٹر محی الدین قادری زور مرحوم بانی ادارہ ادبیات اردو کی تحریک اور کوشش ۱۹۵ء میں پہلا یوم محمد قلی قطب شاہ منعقد کیا گیا۔ ڈاکٹر زور نے اپنی عمر کا بڑا حصہ گولکنڈہ کی معاشرت اور محمد قلی قطب شاہ کے کارناموں کی تحقیق میں صرف کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ ڈاکٹر زور کی تحقیق کی بنا پر محمد قلی قطب شاہ کے مقام کا تعین کیا جا سکا ایک عرصہ تک ولی دکنی کو اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر خیال کیا جاتا رہا۔ یہ کس قدر حیرت اور مسرت کی بات ہے کہ جو سلطنت زوال گولکنڈہ کے بعد ختم ہو چکی تھی وہ پھر آندھرا پردیش کے قیام کی صورت میں ایک مستحکم ریاست بن گئی اور اب آندھرا پردیش کی تہذیب کو پھر سے فروغ پانے کا موقعہ حاصل ہو رہا ہے۔

آج اس محفل میں، جب کہ آپ یہاں طور پر دیگر مقررین کے خیالات، گورنر صاحبہ اور چیف جسٹس صاحب کے ارشادات اور محترق کا مزلیات سننے کے مشتاق ہیں، ادارہ ادبیات اُردو کی تفصیلی رپورٹ کو پیش کرنا بے محل ہوگا۔ حیدرآباد کے علمی و ادبی حلقے ادارہ ادبیات اُردو کے کام اور مقاصد سے یوں بھی واقف ہیں۔ اس لئے کسی رسمی تمہید کا سہارا لئے بغیر یہ عرض کروں گا کہ آج سے ۵۰ سال قبل یعنی ۱۹۳۱ء میں ڈاکٹر [illegible] زور مرحوم کی تحریک اور کوشش سے ادارہ ادبیات اردو کا قیام عمل میں آیا۔ ڈاکٹر زورؔ، ان کے رفقاء اساتذۂ عثمانیہ یونیورسٹی، طلیسانین عثمانیہ اور دیگر ہم دوست احباب کی انتھک کوشش کا نتیجہ ہے کہ آج یہ ادارہ، ہندوستان کے اہم تحقیقاتی مراکز میں شمار کیا جاتا ہے۔ ادارہ کے کتب خانہ میں مختلف علوم و فنون پر ہزاروں نادر و نایاب مخطوطات اور مطبوعات موجود ہیں۔ ادارہ کے صدر جناب سید علی اکبر اور معتمد عمومی جناب ہاشم علی اختر آئی۔ اے۔ ایس ہیں۔ جن کی پُر خلوص کوشش اور توجہ کی بناء پر ادارہ اپنی علمی و ادبی خدمات کو، محدود مالیہ کے ساتھ ہی سہی، بڑی مستعدی کے ساتھ انجام دے رہا ہے۔

شعبہ امتحانات ادارہ کا ایک اہم شعبہ ہے جو ۱۹۴۰ء سے مسلسل کام کر رہا ہے ان امتحانات کا مقصد یہ ہے کہ اُردو کی معیاری تعلیم کا شوق عام کیا جائے۔ اُردو دانی، اُردو زبان دانی اور عالم اور اُردو فاضل کے امتحانات کی کامیابی پر اسناد دئے جاتے ہیں۔ ان امتحانات میں دہلی، آندھرا پردیش، مہاراشٹرا، کرناٹک اور یوپی کے اُمیدوار بڑی تعداد میں شریک ہو رہے ہیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی نے امتحانات اُردو عالم اور اُردو فاضل کو تسلیم کر لیا ہے۔ امتحانات کا اہتمام اور نگرانی جناب محمد اکبر الدین صدیقی فرماتے ہیں۔ مجلس امتحانات کے صدر جناب سراج الدین احمد ہیں جن کی خصوصی توجہ کی بنا پر یہ شعبہ کافی ترقی کر رہا ہے۔

ادارہ کا ترجمان رسالہ "سب رس" ۱۹۳۸ء سے پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے "سب رس" کا شمار ہندوستان کے ان چند گنے چنے رسالوں میں ہوتا ہے جو زائد از تیس سال سے مسلسل شائع ہو رہا ہے۔ اس رسالہ کی ادارت کے فرائض جناب غلام جیلانی صاحب انتہائی حسن و خوبی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔ رسالہ "سب رس" کے مالیہ کو مستحکم بنانے کے لئے حیدرآباد کے نامی گرامی صحافی جناب عابد علی خاں صاحب خاص توجہ فرما رہے ہیں۔ ترقی اُردو بورڈ کے زیر اہتمام وزارت تعلیم حکومت ہند کی جانب سے خوشنویسی کا ایک مرکز ادارہ ادبیات اُردو کی نگرانی میں قائم ہوا ہے۔ خوشنویسی اور خطاطی کا قدیم اور مستحکم فن جو تیزی کے ساتھ رو بہ زوال تھا۔ اب ترقی اُردو کی بروقت توجہ کی وجہ سے کچھ سہارا لیا ہے۔ مرکز خوشنویسی کے طلباء اور طالبات کو نصاب کی تکمیل کے دوران وظیفہ ادا کیا جاتا ہے۔ نصاب کی تکمیل کے بعد وہ ایک باوقار پیشہ کو اپنا ذریعۂ معاش بنا سکتے ہیں۔

بانیٔ ادارہ ادبیات اُردو، ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ مرحوم کی یاد میں ہر سال یوم زورؔ منایا جاتا ہے تاکہ جدید نسل ڈاکٹر صاحب کے علمی و ادبی کارناموں سے واقف ہوتی رہے اور چراغ سے چراغ روشن ہوتے رہیں۔

۱۹۷۶ء میں یوم محمد قلی قطب شاہ کی تقاریب گولکنڈہ سوسائٹی کے تعاون کے ساتھ منائی گئی تھیں۔ خوشی کی بات ہے کہ اس سال پھر گولکنڈہ سوسائٹی کا بھرپور تعاون اور اشتراک ہمیں حاصل ہو رہا ہے۔ ادارہ کی طرح، گولکنڈہ سوسائٹی، حیدرآبادی اور آندھرائی تہذیب کو منظم کرنے میں کوشاں ہے۔ ان مقاصد کے تحت ادارہ ادبیات اُردو اور گولکنڈہ سوسائٹی ایک ہی منزل کی جانب رواں دواں ہیں تاکہ اس طویل سفر میں اگر ہم سفر مل جائیں تو منزلیں آسان ہو جاتی ہیں۔ ؎

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر — لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

یوم محمد قلی قطب شاہ کی ان تقاریب کے انعقاد اور مختلف انتظامات کے سلسلہ میں جناب سید علی اکبر صدر ادارہ اور جناب

شہر کی اختر حسن معتمد ادارہ کے قیمتی مشورے اور ہر اعتبار سے حاصل ہوتی رہی۔ آغا حیدر حسن صاحب جناب میر معراج الدین علی خاں، جناب منظور حسن، جناب خواجہ حمید الدین، جناب سید اکمل حسین، عثمان راؤ اور جناب وقار خلیل نے بحیثیت معتمدین شعبہ جات کام انجام دیا۔ مجلس ادبیہ حیدرآباد (مکتبہ فاروقیہ) ... کے تعاون کے لئے ہم شکر گزار ہیں۔

آخر میں ادارہ ادبیات اردو اور کو نگرڈہ سوسائٹی حیدرآباد کی جانب سے گورنر صاحب، چیف جسٹس صاحب، معزز خواتین حضرات تمام آپ سب کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ ●

محمد قلی قطب شاہ معانی

حیدر محل

حیدر محل میں دائم حیدر کا جلوہ گاؤ
ہر شش آسمان حضرت پہ نصرت طبل بجاؤ
لیا سیم ساق ساقی منج بزم میں صراحی
پیالے کی جوت میانے سائیں صورت کھاؤ
ہمہر گھڑیاں سوں یادیں سینے آپر کچھ نیں
نا بات دید دستی امرت گھڑیاں بھراؤ
پدمینیاں جتیاں مل اشروپ پر تجلیاں ہیں
ان ہاتھ تول بیڑا دیکھ سکیاں نا آجاؤ

صدقے نبی قطب شہ جلوے کے تحت بیٹھے
حوراں پریاں سہیلیاں مل آرتی دکھاؤ

●

ضروری اعلان

سب رس برصغیر کا واحد ادبی ترجمان ہے جو کم قیمت میں بہتر ادبی مواد اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کرتا رہا ہے۔

ادارہ کی مجلس مشاورت نے طے کیا ہے کہ مارچ ۱۹۷۸ء سے سب رس کا زرِ سالانہ طباعت اور کاغذ کی قیمتوں میں اضافہ کی بنا پر پندرہ روپیہ (۱۵ روپے) کر دیا جائے۔ امید ہے سب رس کے باذوق خریدار اور بہی خواہ اس اضافہ کو قبول کرتے ہوئے اپنے تعاون سے سرفراز کریں گے۔ (ادارہ)

دکن دیس، دکنی بھاشا اور قلی قطب شاہؒ

پروفیسر سید سراج الدین

دکن، بھارت دیس کی سب سے قدیم دھرتی ہے۔ جب اتر کا میدانی علاقہ یعنی آریہ ورت ابھی سمندر کے پانی تلے تھا یہ اس وقت بھی نمودار تھا۔ اس بھومی کا ارضی اور موسمیاتی ٹھہراؤ بے مثال ہے اور اس کی قدامت کے آگے ہندوستان کے دوسرے خطے ارضیاتی نوعمر لیتے ٹھہرائے جاسکتے ہیں۔ اس کی بھوری، سرمئی چٹانیں جن سے چالوکیہ، راشٹر کوٹ اور کاکتیا لوگوں نے لاجواب بت تراشے اور جن سے قطب شاہوں نے اپنی پُرشکوہ عمارتیں بنائیں، اس حصہ دنیا کی سب سے پُرانی چیزیں ہیں ۔۔ دکن کے ہر سمے بدلتے مناظر اس اکتانے والی یکسانیت سے یکسر عاری ہیں جو شمالی یا نچلے جنوبی ہندوستان کا روپ ہے۔

لیکن دکن جغرافیائی ہی نہیں ایک تاریخی اکائی بھی ہے۔ ویدوں میں تو "دکھشن" یا "دکھشنا پتھا" کا ذکر نہیں ملتا لیکن کلاسکی سنسکرت ادب میں رام چندر جی کا بن باس دکن ہی میں بیتتا ہے۔ رام کو ان بنوں میں دکن کی برساتوں اور عشق و عاشقی کا جو مزا آیا ہوگا وہ ایودھیا لوٹ کر بھی یاد رہا ہوگا۔ دکن کا قلبی علاقہ گوداوری اور کرشنا ندیوں کے بیچ میں واقع ہے اور یہ علاقہ صدیوں سے قدرتی طور پر ملاپ کا علاقہ رہا ہے۔ تین تہذیبی اور لسانی خطے یہاں ملتے ہیں۔ تلنگانہ، مہاراشٹرا اور کرناٹک۔ اتر سے آریائی یا ترک مغل فتوحاتی اور تہذیبی دھارے وندھیاچل کے رخنوں سے گزر کر یہاں بار بار پہنچتے رہے ہیں۔

لیکن یکجائی کے ساتھ ساتھ لسانی علٰحدگی کی بھی یہی ایک روایت دکن میں رہی ہے جیسے بارھویں اور تیرھویں صدی میں چالوکیہ سلطنت کی مرہٹی، یادوا، تلنگی کاکتیا اور کنڑی بولنے والی ریاستوں میں تقسیم سے ظاہر ہے۔ یکجائی کی کہانی ستاواہنا سلطنت (۲۰۰ ق م تا ۲۲۷ء) سے چلتی ہے اور چالوکیوں، آٹھویں صدی کے راشٹر کوٹوں اور چودھویں و پندرھویں صدی کے بہمنیوں سے گزرتی ہوئی مرحوم ریاست حیدرآباد تک پہنچتی ہے جو بھارت کی لسانی تقسیم کے بعد ملاپ و یکجائی کی آخری پناہ گاہ سی لگتی ہے۔ اس حیثیت سے اندرونی طور پر خود مختار ریاست حیدرآباد کو تاریخ ہند میں کسی قدر بے اعتنائی کی نذر کر دیا گیا ہے۔

شمال سے جو فوجی اور تہذیبی حملے ہوتے رہتے ہیں ان میں سب سے زیادہ اہم محمد تغلق کی یہ کوشش تھی کہ اپنی راجدھانی کو دلی سے دولت آباد پر منتقل کرے۔ اپنی اس سعی ناتمام کے دوران محمد تغلق ایک پوری تہذیب کو اپنے تمام لوازمات کے ساتھ دکن لے آیا کیونکہ اس کے ساتھ آنے والوں میں نہ صرف سپاہی اور سردار تھے بلکہ سرکاری عہدہ دار

دستگیر پیشروؤں سے تعلق رکھنے والے، عالم اور صوفی بھی تھے۔ انہی کے کاروان میں علاء الدین بہمن شاہ بھی تھا جس نے بعد میں بہمنی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی عداوت و محبت کی داستان دکن میں بہمنیوں سے شروع ہوتی ہے۔ ویسے جنوب میں اسلام عرب تاجروں اور قلندر صوفیوں کے ذریعہ مسلمانوں کی سیاسی طاقت سے بہت پہلے پہنچ چکا تھا۔ بہمنیوں نے جنوب کی طاقتور ہندو سلطنت وجیا نگر سے لڑائیاں لڑیں لیکن ان کے ساتھ ایک وسیع تہذیبی لین دین کو بھی جاری رکھا۔ بہمنیوں نے اپنی حکومت کی پائیداری کو بلنگا یتوں سے رفاقت میں ڈھونڈا۔ آج بھی گلبرگہ میں حضرت خواجہ بندہ نواز کی درگاہ کے کلس کی صفائی اور چراغ لنگایت اپنا ہی حق سمجھتے ہیں۔

۱۵۳۸ء کے لگ بھگ بہمنی سلطنت ٹوٹ پھوٹ گئی اور دکن کی خاک پر پانچ ریاستیں ابھریں جن سے آپ سب واقف ہیں اور جن میں دو اہم ہیں، بیجاپور کی عادل شاہی اور گولکنڈہ کی قطب شاہی۔ انھیں کا وہ زمانہ ہے جب ہندوؤں اور مسلمانوں کی تہذیبی اور جذباتی یکجائی کے لئے سب سے زیادہ سازگار فضا قائم ہوئی۔ عادل شاہوں اور قطب شاہوں نے ایک ایسی دو لسانی ہندو مسلم تہذیب کو فروغ دیا جو دکن کی زندگی میں پیوست ہی نہیں بلکہ اس میں تحلیل ہو کر اس کی رگ و پے میں سما گئی۔ ابراہیم عادل شاہ جگت گرو کہلایا۔ ابراہیم قطب شاہ نے سات سال وجیا نگر کی ہندو ریاست میں گزارے اور گولکنڈہ کو تو ہندو تہذیب کے ایک حصے کو اپنے مزاج کا جزو بنا کر لے آیا۔ اس کے بیٹے محمد قلی نے جو اس سے بھی زیادہ گنگا جمنی نفسیات کا حامل تھا شہر حیدرآباد کی بنا ڈالی۔ اسی لحاظ سے یہ شہر صرف بھاگ متی کے رس بھرے عشق کی ہی نہیں ایک پورے تاریخی تہذیبی ملاپ کی نشانی ہے۔

میں نے دکن کو ملاپ اور یکجائی کا علاقہ کہا ہے جو ایک عام بات ہے اور دکن میں زبان زد ہے لیکن عام طور پر لوگ دکن کا تہذیبی قبا کے ان رشتوں کو الگ کر کے ان کا تجزیہ نہیں کرتے جن کے تانے بانے سے یہ قبا تیار ہوئی ہے۔

بنیادی طور پر تو دکنی تہذیب ان دو عظیم تہذیبوں کا سنگم ہے جو بجائے خود مخلوط و مرکب ہیں یعنی ہندو اور مسلمان تہذیبیں۔ اس اتصال کی کہانی دکن میں صوفیوں کے ورود سے شروع ہوتی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اسلام کے پیغام کو ہندوستان کے کونے کونے میں پہونچایا اور یہاں کے باسیوں کا دل موہ لیا۔ اس ملک کی نفسیات و تہذیب میں صوفیوں کا جو حصہ ہے اس کی انسان گیر حدوں کا تعین ہندوستان کی تاریخ میں اب تک نہیں کیا گیا ہے۔ مسلمان حکمرانوں کے لئے اسلام سیاسی طاقت کے جواز اور مبداء کی حیثیت رکھتا تھا۔ ان کا اسلام سیاسی مصلحت کا پابند تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمان فرماں روا ایک طرح کی فکری دوعملی کا شکار رہے ہیں۔ ان کی طاقت کا نقطۂ پرکار وہ مسلمان سپاہی تھے جن کو متحد رکھتے ہیں۔ ان کی سیاسی بقا منحصر تھی اور جن کو اسلام کی نسبت ہی سے متحد رکھا جا سکتا تھا۔ دوسری طرف ان کی طاقت کا دائرہ اس ہندو معاشرے کا ہم محیط تھا جو ان کے چاروں طرف اور پھیلا ہوا تھا اور جس کی خوشنودی کے بغیر اس ریت کو پھلنے پھولنے حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ وہ ایسا طریق اختیار کرنے پر مجبور تھے جو وقتیہ مصالح پر مبنی ہو۔ صوفیوں کا اسلام سیاسی قوت کے پرے ایک ایسا پیغام تھا جو ہر انسانی دل تک پہنچنے کے لئے تھا۔ یہ ایک عظیم

تھا جس میں زبانوں، امتیازات اور آزادی تھی جس کا مقصد فضا فروغ کی سماجی اور روحانی تہذیب اور دکنی دنیا کا مداوا تھا جس سے مس میں لاکر رو دے ہوؤں کو فرد انسانیت اور غلاموں کو رشتہ کا مزہ نصیب ہوتا تھا۔ ابتدا میں صوفی عزلت گزین بھی تھیں تھا، اس کی زندگی ان لوگوں کے بیچ گزرتی تھی اور وہ جانتا تھا کہ یہی اس کا مقام ہے۔ شیخ نظام الدین اولیا سے ' جو پہلے دور کے سب سے عظیم صوفی ہیں۔ یہ قول منسوب ہے کہ درحقیقت مجھے ایک کتاب دی گئی ہے جس میں لکھا ہے کہ جہاں تک ہو سکے دلوں کو تسکین پہنچاؤ۔ تالیف قلوب صوفی کا مسلک تھا۔ شیخ نظام الدین نے ایک اور موقع پر کہا تھا کہ میرا جی تو چاہتا ہے کہ اپنا وقت تنہائی اور عبادت میں گزاروں لیکن میں کیسے ان لوگوں سے منہ موڑ سکتا ہوں جو اپنے دکھ لے کر میرے پاس آتے رہتے ہیں۔ جس بے پایاں صبر کے ساتھ صوفیوں نے انسانی دکھ کو گھٹانے اور سماجی و روحانی بیداری کو پھیلانے کی کوشش کی وہ اس دیس کی تاریخ کا سب سے زیادہ روح پرور باب ہے۔

دکن میں صوفیوں کے مرکز دولت آباد، گلبرگہ، بیدر، بیجاپور، برہان پور، کڑپہ اور کرنول رہے ہیں۔ اس مختصر گفتگو میں صرف چند نام لئے جا سکتے ہیں جیسے دولت آباد کے منتجب الدین زر بخش، برہان الدین غریب اور زین الدین، گلبرگہ کے سراج الدین جنیدی اور سید محمد گیسو دراز خواجہ بندہ نواز، بیدر کے ابوالفیض اور گنج نشین، بیجاپور کے عین الدین گنج العلم اور امین الدین اعلیٰ، گولکنڈے کے شاہ راجو اور حسین شاہ ولی۔ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز غالباً دکن کے آخری عظیم چشتی صوفی ہیں جنہوں نے شیخ نظام الدین کی روایت میں پرورش پائی تھی۔

پندرھویں صدیوں میں ایک اور مذہبی دھارا دکن میں داخل ہوا۔ یہ شیعہ ایران سے آیا تھا۔ فضل اللہ انجو پہلا ایرانی ہے جس نے دکن میں مقام اقتدار حاصل کیا اور یہاں سے وہ سلسلہ شروع ہوا جس نے ایران و دکن کو ایک رشتے میں منسلک کر دیا۔ قطب شاہی حکمران شیعہ تھے اور بہت سے عادل شاہی شیعہ تھے اور ان کی سرپرستی میں شیعہ روایت، الاؤں اور عاشور خانوں کے ذریعہ جو ہر گاؤں میں قائم کئے گئے دکن کے گوشے گوشے میں پھیل گئی اور دکن کے مخلوط مذہبی تار و پود کا جزو بن گئی۔

یہ برہمن لنگایت، سنی، صوفی، شیعہ روایت تھی جسے محمد قلی نے ایک نیا موڑ دیا۔ اس نے اس کے اجزاء کو آمیز کر کے تہواروں میں سمو دیا اور ایک ایسا صلح کل مشرب جاری کیا جس کی لہریں ہماری زندگی میں آج بھی رواں ہیں۔ اس نے موجودہ تہوار جاری کئے ان میں سے بعض ایرانی ہیں بعض ہندو اور بعض اسلامی۔ لیکن ان سب کو اس نے رنگ و رقص کا روپ دیا اور ایک ایسی جذباتی ہمہ تہذیبیت پیدا کی جس میں ڈوب کر دکنی لوگوں نے نرمی اور رواداری کو اپنے مزاج کا جز بنا لیا۔ یہ نرم، آسان اور بے تشدد مذہبیت، یہ سخی، جذباتی شعری روحانیت دکن کا خاصہ بنی رہی ہے۔

چنانچہ یہاں کٹر پن بہت کم ہے۔ در سارے مذہبوں نے ایک پرامن سشیل طے کر لیا ہے لیکن اس نرم عقیدگی کا ایک منفی پہلو بھی ہے اور وہ ایک ایسی بے تعلقی ہے جو کسی بڑی تحریک یا مقصد سے اس وجہ سے پہلو تہی کرتی ہے کہ اس میں زحمت ہے اور عقیدے کی سخت استواری ضروری ہے۔

دکن کی پچرسی تہذیب کا سب سے نمایاں مظہر وہ زبان ہے جسے ہم دکنی یا دکنی اُردو کہتے ہیں اور جس کی تدریج و ترقی میں محمد قلی نے بڑا حصہ لیا۔ یہ آئی تو غالباً محمد تغلق کے لشکریوں کے ساتھ شمال سے لیکن اس نے یہاں جو روپ پا

وہ اسے اتری ہندوستان کی اشتد سے بالکل مختلف بنا دیتا ہے۔ یہاں شعراء میں اس کے نام "گرنتھ اور شکری" ہے جنہوں نے اس کے جینیوں کے زیر سایہ اپنے ابتدائی دن گزارے ہیں۔ میں اس زبان کے بارے میں دو چار باتیں عرض کروں گا مجھے ٹھیک ٹھیک علم نہیں کہ کب یہ تبدیلی آئی کہ دکنی کو ایک گاؤں کی یا ناتراشیدہ زبان سمجھا جانے لگا اور اسے ادب کے دائرے سے نکال کر صرف بازار، گلی کوچے میں چھوڑ دیا گیا۔ یہ اس حد تک ہوا کہ میں آج یہ ادبی گفتگو دکنی میں نہیں کر سکتا اور اگر کر بھی سکوں تو اسے ایک مذاق سمجھا جائے گا۔ چنانچہ آج کل لوگ اسے مزاحیہ جلسوں میں خوب برتتے ہیں۔ اس سلوک کا نتیجہ یہ ہوا کہ دکن میں تحریری اور بول چال کی زبان کا رشتہ ٹوٹ گیا جو نثری ادب اور خصوصاً ناٹک یا ڈرامے کے لئے ایک بڑی ہی نقصان دہ چیز ہے۔ میرا خیال ہے کہ دکن کی اُردو نثر پہ یہ اعتراض کہ وہ بڑی بوجھل ہوتی ہے صحیح تو ہے لیکن ناانصافی بھی۔ اپنی بول چال کی زبان سے کٹ کر دکن کا نثر نگار ایک کتابی یا مکتبی زبان استعمال کرنے پہ مجبور ہے اگر وہ بوجھل نہ ہو تو اور کیا ہوگی۔

دکنی اُردو کی غیر پختہ یا دیہاتی شکل نہیں ہے بلکہ اپنے طور پر ایک بے حد پُرمغز، پُرفن اور سریلی زبان ہے جو شخص یہ نہیں مانتا وہ محمد قلی کی کلیات پڑھے لیکن اس طرح نہ پڑھے جیسے غالب یا اقبال کو پڑھتے ہیں اس کے فنا اس کی تھاپ اور ٹیکے کو سمجھ کر پڑھے، پھر دیکھیے کہ اس میں کیا رس اور کیا مٹھاس اور کیا معنویت ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ دکنی آج کی اُردو کے مقابلے میں کچھ ویسی ہی ہے جیسی جدید انگریزی کے مقابلے میں اینگلو سیکسن یا اولڈ انگلش۔ اولڈ انگلش جدید انگریزی کی ناپختہ شکل نہیں ہے بلکہ بجائے خود ایک طاقتور ذریعہ اظہار اور ایک تونگر زبان ہے جس کا لطف الگ ہے لیکن کم نہیں۔

دکنی محمد قلی کی کلیات تک پہنچتے پہنچتے سو دو سو سال کی مدت طے کر چکی تھی اور ایک نہایت سلیس و پُرکار بھاشا کا روپ لے چکی تھی۔ یہ اُردو کی ابتداء نہیں بلکہ ایک علیحدہ سمت میں اس کی انتہا ہے۔ یہ وہ اُردو ہے جو اُتر کی اُردو سے زیادہ ہندوستانی اور مقامی رنگ کی حامل ہے۔ یہاں گل و بلبل، لالہ و نسترن کم ہیں۔ یہاں مے کے بدلے 'مد' ہے، قسم کے بدلے 'سوگند' اور حرف و حکایت کے بدلے 'باتاں' ہیں۔ یہاں "شگوفے" "کلیاں" ہیں اور دوشیزائیں 'چھیاں'، 'کنولیاں'، 'کنواریاں' یہاں دکن کی برسات ہے، پھاگ اور بسنت ہے۔ عشق کی شدت ظاہر کرنی ہو تو قلی قطب کہیگا "تیری نیہہ کا منج کوں پکڑ لڑیا"۔ فارسی اس زبان کا بھی صنفی مخزن ہے لیکن اس کے بعض لفظ اور بہت سی نحوی ترکیبیں مرہٹی ہیں اور اس کی سریلی تان تلنگی سے مستعار ہے۔

اینگلو سیکسن کے برخلاف دکنی ایک متروک زبان نہیں ہے بلکہ آج بھی مستعمل اور تازہ ہے۔ دکن کی عورتوں نے اسے گھروں میں زندہ رکھا ہے۔ وہ لوگ بھی جو ادبی یا رسمی جلسوں میں شمالی ہند کی اُردو استعمال کرتے ہیں یار دوستوں کی محفلوں میں اسے برتتے اور اس کے لطف اور چٹخارے سے واقف ہیں۔ دکنی کے مخصوص محاورے اس کی ترکیبوں اور صوتیات سے یہاں بحث نہیں کی جا سکتی اس کے لئے علیٰحدہ نشست چاہیئے۔ یہاں صرف اس بات کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ دکنی کو بول چال کی روایت تو مسلسل ہے لیکن اس کی ادبی روایت بھی مری نہیں ہے۔ حالیہ برسوں میں شاعری میں اس کا

عجیب ہوا ہے۔ غالباً اس صدی کے تیسرے دہے میں نذیر الدین دہقانی نے اسے جگایا۔ نذیر صاحب کے تخلص سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بھی دکنی کو ایک غیر شہری لہٰذا غیر مہذب یا "گنوارو" زبان سمجھتے ہیں۔ دہقانی کے بعد مختلف شاعروں نے طنز کے طور دکنی سے کام لیا لیکن محض ایک متبدل دہے کے مزاح کی خاطر۔ جن دو شاعروں نے دکنی کو بڑے پیمانے پر سنجیدہ شاعری کیلئے استعمال کیا۔ وہ گلبرگہ کے سلیمان خطیب اور حیدرآباد کے سرور ڈنڈا ہیں جس بے تکلفی اور لطف کے ساتھ ان دونوں نے ہر طرح کے مضمون اور تاثر کو دکنی میں ادا کیا ہے وہ نہ صرف ان کے اپنے ملکۂ شاعری بلکہ دکنی کی ادبی صلاحیت کا بھی ایک کھلا ثبوت ہے۔ ان کی شاعری کو ایک اتفاقی حادثہ سمجھنا یا اسے اردو کی باقاعدہ شاعری کے دائرے سے باہر رکھنا سخت غلطی ہوگی۔ جس طرح سے ان دونوں نے اپنے مخصوص محاورے میں تخیل کی ساری حرکیوں کو سمویا اور جس طنز جیسی گہرے انسانی درد اور سماجی شعور کا اس میں اظہار کیا ہے اس کی داد اردو کے نقادانِ فن کی طرف سے ابھی ملنی باقی ہے۔ ایک خیال یہ بھی آتا ہے کہ اگر جستجو کی جائے تو ممکن ہے یہ پتہ چلے کہ دکنی شاعری کی روایت اس دیس کے انجانے کونوں میں غیر معروف طور پر پرورش پاتی رہی ہے۔

وقار خلیل

چار مینار

چار مینار رخسارِ صبحِ وطن — چار مینار مہتابِ ارضِ دکن
چار مینار اردو کی پہلی غزل — چار مینار سرمایۂ فکر و فن
علم و دانش کا وہ دلنشیں باب ہے — جس سے نکھرا ہے تہذیب کا بانکپن
جس سے چھنتی ہے اخلاص کی چاندنی — جیسے دھرتی پہ آجائے نیلا گگن
جادۂ شوق میں رشتۂ آرزو — جس سے تابندہ ہے زندگی کی کرن
جس کے ماتھے پہ رقصاں ہے نورِ وفا — جس کا ہر نقش گلزار و گل پیرہن
حسنِ معیار گلدستۂ مہر و ماہ — سامنے جیسے کوئی بیاضِ سخن
صبحِ تاریخ کا پیکرِ دل نشیں — فکر و فن کے لئے اک مہکتا چمن
چار مینار شاعر کا وہ خواب ہے — جس کے تعبیر کی اک جھلک ہے دکن

○

ڈاکٹر غلام عمر خاں

قدیم دکنی شاعری — ایک جائزہ

قدیم دکنی شاعری کی نشوونما کا زمانہ تقریباً چار صدیوں پر پھیلا ہوا ہے۔ پندرھویں صدی کے آغاز سے دکنی شاعری کے اولین نمونے ملنے شروع ہوتے ہیں۔ اور اٹھارویں صدی کے وسط تک دکنی کے سرمایہ میں بلند پایہ شعرا کے کلام سے اضافہ ہوتا رہا۔ سترھویں صدی دکنی شاعری کا سنہرا دور ہے۔ جس نے محمد قلی، وجہی، غواصی، نصرتی اور ہاشمی جیسے شاعر اردو کو دیئے۔ انگریزی ادب کی ساری تاریخ میں یہ شیکسپیئر اور ملٹن کا عہد ہے۔

پندرھویں اور سولھویں صدی میں دکنی شاعری کے جو نمونے ملتے ہیں ان میں صوفی شعرا کی مثنویوں کے علاوہ "کدم راؤ اور پدم راؤ" اور اشرف بیابانی کی مثنوی "نوسرہار" قابلِ ذکر ہیں۔ شاعری کے ان نمونوں کو اردو زبان کی تاریخ میں لسانی نقطۂ نظر سے اہمیت حاصل ہے۔ ادبی اعتبار سے ان کی چنداں اہمیت نہیں ہے۔ لیکن سترھویں صدی تک پہنچتے پہنچتے دکنی ادب ایک بولی کی حیثیت سے گزر کر مستقل ادبی زبان کا درجہ حاصل کر چکا تھا۔ اور شاعری کے ایسے کارنامے اس عہد میں تخلیق ہوئے جن پر اردو زبان آج بھی بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔ اگرچہ اردو کے عام قارئین کے لئے زبان کی قدامت' ان ادبی شہ پاروں کی تحسین کی راہ میں حائل ہے۔

قدیم دکنی شاعری کی عام خصوصیات اور رجحانات کا جائزہ لینے کے لئے ضروری ہے کہ ہم بعد کے دور کی اردو شاعری کے رجحانات اور میلانات پر بھی نگاہ رکھیں۔ اس طرح ایک تقابلی نظر کے ذریعہ ہم دکنی شاعری کی قابلِ امتیاز خصوصیات کی نشاندہی کر سکتے ہیں۔

۱۸۵۷ء سے قبل کی اردو شاعری کو بہ آسانی دو ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ قدیم دور' جو دکنی کا دور ہے' پندرھویں اور سولھویں صدی سے شروع ہوتا ہے۔ اور ۱۷۰۰ عیسوی کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔ دوسرا دور ۱۷۰۰ عیسوی سے شروع ہوتا ہے جو ولی کے سفرِ دہلی کا زمانہ ہے۔ اور ۱۸۵۷ء کے بعد ختم ہوتا ہے۔

۱۸۵۷ء سے قبل کی اردو شاعری' دو مختلف شعری روایات کے زیرِ اثر پروان چڑھتی رہی ہے۔ ایک ہندوستانی شاعری کی روایت ہے۔ قدیم دکنی شاعری پر ہندوستانی شاعری کی روایت کا اثر غالب ہے۔ جبکہ ۱۷۰۰ عیسوی کے بعد دہلی اور لکھنؤ میں نشوونما پانے والی شاعری' بالکلیہ فارسی شاعری کی روایت کے تابع رہی ہے۔ دکن کے شعرا نے بھی فارسی شعر و ادب سے بڑے پیمانے پر استفادہ کیا ہے۔ شاعری کی ساری اصناف غزل، مثنوی، قصیدہ، رباعی وغیرہ فارسی سے مستعار ہیں۔ فارسی کی بحریں بے کم و کاست دکنی میں قبول کر لی گئیں۔ دکنی کی متعدد مثنویاں فارسی کی مثنویوں کے نمونہ پر مبنی ہیں۔ لیکن جب ہم دکنی شاعری کی روح اور اس کے مواد کا تجزیہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ دکن کے قدیم شعرا [illegible] کی

ترجمانی کرتے ہیں۔ اپنی شعری تخلیقات میں وہ فارسی کی کورانہ تقلید کو کبھی روا نہیں رکھتے۔ ان کے تخلیقی رویہ میں بڑی خود اعتمادی اور آزادہ روی کی شان نظر آتی ہے۔ فارسی شاعری میں امرد پرستی کی روایات کے زیر اثر محبوب کو ہمیشہ مذکر تصور کیا جاتا ہے۔ اسی روایت کے اتباع میں ... کے بعد شمالی ہند میں نشوونما پانے والی اردو شاعری میں محبوب کیلئے ہمیشہ مذکر کا صیغہ استعمال ہوتا رہا ہے۔ لیکن دکنی کے شعرا نے ابتدا ہی سے اس غیر حقیقی رجحان سے انحراف کیا۔ دکنی شاعری میں مرد کی مخاطبت صنف نازک سے ہوتی ہے۔ یا پھر قدیم ہندوستانی روایت کے مطابق عورت کی طرف سے اظہار ہو تو مخاطب مرد ہوتا ہے۔ دکنی شاعری کے اولین نمونوں سے لے کر ولی کے ابتدائی دور کے کلام میں ہر جگہ محبوب کی صورت میں ایک ہندوستانی عورت کا تصور ملتا ہے۔ جس کے حسن و جمال اور آرائش و زیبائش کے تفصیلی مرقعے ہر شاعر کے کلام میں مل جاتے ہیں۔

محمد قلی قطب شاہ نے اپنی غزلوں میں اُن بیسیوں حسیناؤں کے نام بھی گنائے ہیں جو اس کے محل کی زینت تھیں۔ ڈاکٹر زور نے اپنے مرتبہ کلیات محمد قلی میں ایک مستقل باب "بارہ پیاریاں" کے عنوان سے قائم کیا ہے۔ جس میں محمد قلی کی وہ مسلسل غزلیں یکجا کر دی گئی ہیں جن میں شاعر نے اپنی بارہ محبوب سکھیوں کے عشوہ و جمال کی داد دی ہے۔

قدیم دکنی شاعری کی ایک بنیادی خصوصیت "حقیقت نگاری کا میلان" ہے۔ شعرا اپنے مشاہدات، تاثرات اور جذبات کو بلا تکلف اور تصنع کے بغیر، راست، سادہ اور فطری لیکن پُر اثر اور موثر اسلوب میں پیش کرتے ہیں۔ پُر تکلف اسلوب سے گریز" اور فطرت، انسانی جذبات کا موثر اظہار، ہر زبان کے ابتدائی دور کے فن کاروں کا ایک نمایاں وصف رہا ہے۔ انگریزی کا چاسر اور شیکسپیئر بھی اپنی خصوصیت کے لئے ممتاز ہیں۔

حقیقت نگاری کے رجحان کا ایک پہلو یہ ہے کہ قدیم دکنی کے فن کار اپنی شاعری کا مواد، اطراف و اکناف کی زندگی، مقامی ماحول اور مقامی روایات سے حاصل کرتے ہیں۔ وہ سارا مواد جو ان کے جمالیاتی تجربہ کا جزو ہے ان کی تخلیقات میں بڑی دیانت داری کے ساتھ منعکس ہوتا ہے۔ محمد قلی کی غزلوں کا مطالعہ کیجئے تو ان میں آپ کو کوئل کی کوک بھی سنائی دیتی ہے اور پپیہے کی پکار بھی۔ بادل کی گرج کے ساتھ مینڈک کی آوازیں بھی سنائی دیتی ہیں۔ اور رات کو جھینگر کی آوازیں بھی۔ کہیں شاعر اپنی سکھیوں کے ساتھ بسنت کھیلتا نظر آتا ہے۔ سکھیاں رنگ کی پچکاریاں لیے ہیں شرابور ہوگئی ہیں۔ محل کے در و دیوار رنگین ہوگئے ہیں بلکہ سارا تر وک رنگین نظر آتا ہے۔ کیوڑے کی خوشبو سے فضا معطر ہے۔ کہیں عود اور عنبر کی کی لپٹیں آرہی ہیں اور عبیر و گلال کی بارش ہو رہی ہے۔ کہیں پھولوں پر بھونرے منڈلا رہے ہیں اور شاعر اور اس کی سکھیاں ہاتھ میں ہاتھ دیے گلے میں پھولوں کی مالا پہنے سروبن میں گھوم رہے ہیں۔

چپیپا گاتا ہے میٹھے بنیاں — دھر رس سے امرت پیل کا پیالا
گرج بادل بجے دلور گیت گاوے — کوئل کوکے سو جھل بن کے خیالا
پیاری اپیا ہات میں ہات لے — سروبن میں بنریں گل پھول مالا

—

شادیاں سکل مناؤ خوشیاں کدم کاؤ — چھدیر عبیر چلاؤ دھند کار برکی کا

—

بسنت کے پھول کھلے ہیں ات رنگیلے — ہوا میرا ن دیکھ اس تا کیں ملی

کنتی کے جھولے بنتے ہیں ادکھ پر — کہ جیوں چپل پر ڈلے بھونرا سو کیانی
کوئل کہاں بسنت کے راگ کو لا — کہ لائے ہے اس ہرت میں سب نشانی

بسنت کھیلیں ہمن ہور ساجن یوں — کہ آسمان رنگ شفق پایا ہے سارا
جوبن کے حوض خانے رنگ سوں بھر — سورہ مار دم پچکاریاں لائے دھارا
نبی صدقے بسنت کھیلیا قطب شاہ — رنگیلا ہور ہیا ہے ترلوک سارا

اردو کا ایک عام طالب علم جو دہلی اور لکھنؤ کے شعراء کی فضا میں سانس لینے کا عادی ہے جب قدیم زبان کی رکاوٹوں کو عبور کرتے ہوئے محمد قلی، غواصی یا وجہی کی دنیا میں داخل ہوتا ہے تو اسے یہاں اپنائیت اور یگانگت کا خوشگوار احساس ہوتا ہے۔ وہ گویا کسی اجنبی ماحول سے اپنے وطن میں واپس لوٹ آیا ہو۔ یہ احساس بالکل فطری ہے۔ کیونکہ یہاں قاری کو اپنے جمالیاتی مشاہدات کا عکس نظر آتا ہے۔

ولی کی تقلید میں شعرائے دہلی نے فارسی کی بجائے اردو میں شعر گوئی کا آغاز کیا۔ تو کچھ عرصہ تک زبان و اسلوب میں وہ دکن کے شعراء کی پیروی کرتے رہے۔ کیونکہ اس زمانہ میں دہلی کی اردو ولی شعرائے دہلی کے الفاظ میں "گنوارو" زبان تھی اور دکنی ایک ترقی یافتہ ادبی زبان۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد مرزا مظہر کی سرکردگی میں جو لسانی مہم شروع ہوئی اس کے نتیجہ کے طور پر زبان میں ہندوستانی اصل ([illegible]) کے سینکڑوں الفاظ کو جن سے دکنی عبارت تھی، متروک قرار دیا گیا۔ اور اردو میں فارسی اور عربی الفاظ کا بے ہنگم داخلہ شروع ہوا۔ اس تحریک نے اردو زبان کے فطری ارتقا کو سخت نقصان پہونچایا۔ بات صرف فارسی اور عربی کے الفاظ کے استعمال تک محدود نہیں رہی تشبیہات استعارات تلمیحات غرض فارسی شاعری کا تمام تر تقلید ([illegible]) تدریجی طور پر شعرائے اردو کی تخلیقی سرگرمیوں کا ماخذ بن گیا۔ جس رجحان کا آغاز دہلی میں ہوا تھا لکھنؤ میں پہونچ کر اس نے اور شدت اختیار کر لی۔ اس رجحان کا نقطۂ عروج ہمیں غالب جیسے شعراء کے ہاں ملتا ہے جن کی صرف زبان ہی فارسی کے غیر معتدل اثر سے گرانبار نہیں بلکہ ان کا فن فارسی شاعری کی تقلید پر مبنی ہے۔ بعض اوقات وہ تلاش و جستجو کے ساتھ ایسا اسلوب اور اپنے اشعار میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو کسی کلاسیکی فارسی شاعر کے کلام میں ان کی نظر سے گزرا ہو۔ شعر ولی ہی مل میں دہی اس کاوش پر نازاں ہے۔ معاصرین اس قسم کے اشعار پر "کوہ کندن و کاہ برآوردن" کی پھبتی کستے ہیں لیکن شاعر کو ستائش کی تمنا ہے اور نہ صلہ کی پروا۔ وہ خوش ہے کہ "میری بات سمجھی محال ہے"۔

فارسی سے مغلوب ذہن کے تخلیقی رویہ کا تجزیہ دشوار نہیں ہے۔ یہ شعراء سچے تھے تو ہندوستان میں رہتے۔ ان کے جمالیاتی تجربہ کا مواد فطری طور پر ہندوستانی زندگی اور مقامی روایات پر مشتمل ہے لیکن جب وہ شعر کہتے ہیں تو اپنے جمالیاتی تجربہ کی تعبیر یا اس تجربہ کی ترسیل و ابلاغ کا کام فارسی کی تقلید کے توسط سے انجام دیتے ہیں۔ بالفاظ دیگر مقامی ماحول کے اظہار کے لئے ایرانی شاعری کا چشمہ استعمال کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ رجحان اردو کا ایک نقص ہے۔ لیکن اس محدود اور مقید نقطۂ نظر نے اردو شاعری کے نفوذ اور صحت مند نشوونما میں منفی رول انجام دیا ہے۔ صنف اول کے شعراء کی تقلید میں دوسرے اور تیسرے درجے کے سینکڑوں شعراء نے غیر حقیقی اور بے جان شاعری کے دفاتر کے انبار لگا دیئے۔ جنہیں جدید اردو شاعری کے علمبردار حالی نے "عفونت میں سنڈاس سے بدتر" قرار دیا ہے۔

ماہنامہ سب رس حیدرآباد

زندہ ایک زندہ زبان کی خصوصیت ہے جن ادوار سے گزرتی رہی ہے ان ادوار کی زبان کا سرمایہ جہاں تک زندہ کا تعلق ہے دکنی شاعری کے سرمایہ میں محفوظ ہے۔ لیکن دلی اور لکھنؤ کے دبستانوں کی شاعری اپنے عہد کی حقیقی زبان، زندہ زبان، کا احاطہ نہیں کرتی شاعری میں اس زبان کا استعمال ممکن تھا جس کی نظیر فارسی کے اساتذہ کے کلام میں موجود ہو۔ مقامی پھول اور پرندے، دیا اور دیپ تاریخی اور مقامی روایات کے حوالے ہماری شاعری میں اس لئے بار نہیں پا سکے کیونکہ فارسی کے کلاسکی شعرا کے ہاں ان کی سند نہیں ملتی۔ اسی طرح ہماری سماجی زندگی کے بیسیوں پہلو ایسے ہیں جن کی ترجمانی شاعری بالخصوص غزل میں ناممکن تھی۔ صرف نظیر اکبرآبادی یکہ و تنہا ایسا شاعر ہے جس نے اس روش کے خلاف بغاوت کی۔ اس نے اپنی شاعری کے دروازے اپنے عہد کی زندہ زبان کے لئے بند نہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ نظیر کے کلیات میں ہمیں ایسے سیکڑوں الفاظ ملتے ہیں جن کا ریکارڈ معاصر اردو شعرا کے ہاں نہیں ملتا۔ حتیٰ کہ مروجہ لغات میں بھی یہ الفاظ بار نہیں پا سکے۔

قدیم دکنی شاعری کا کوئی جائزہ مکمل نہیں ہو سکتا اگر غواصی کا ذکر اس میں شامل نہ ہو۔ جو دکنی کا عظیم ترین شاعر ہے۔ مثنوی اور غزل گوئی میں (اور یہی دو اصناف قدیم دکنی میں مقبول تھیں) دکنی کا کوئی شاعر اس کے مرتبہ کو نہیں پہنچتا۔ غواصی کے کلام میں اور شاعرانہ فنکاری کی بلندیوں کو چھوتی نظر آتی ہیں۔ جہاں تک صنف غزل کا تعلق ہے تغزل و سرمستی، جذبات کا سوز و گداز، زبان کی بے ساختگی اور لطافت، شگفتگی، اشعار کی نغمگی اور موسیقیت، یہ وہ خصوصیات ہیں جہاں غواصی، دور حاضر کے مقبول متغزلین اور جگر کے مقابلے میں بھی منفرد نظر آتا ہے۔ اس کی بعض غزلیں جو ولولے جذبات، بلند آہنگی، کیف و مستی، سرخوشی و سرشاری، شعور ذات کی رنگین جمالیاتی کیفیت کی عکاسی کرتی ہیں۔ حافظ اور خسرو کی اسی رنگ و آہنگ کی غزلوں کی ہم پایہ ہیں۔

قدیم دکنی شاعری کے وسیع پس منظر کے ساتھ اردو زبان کے مجموعی نشو و نما پر نگاہ ڈالی جائے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ پندرھویں صدی سے سترھویں صدی کے اواخر تک اردو شاعری، حقیقت نگاری، سادگی اور زور و اثر کی خصوصیات سے متصف، صحت مند خطوط پر نشو و نما پاتی رہی تھی۔ دہلی میں مرزا مظہر کی تحریک کے بعد اس کی سمت میں انحراف پیدا ہوا۔ اور وہ اپنی قدیم شاہراہ سے ہٹ کر ڈگر پر چل نکلی۔ اور ۱۸۵۷ء تک فارسی شاعری کی غیر معتدل اور کورانہ تقلید میں ایک مخصوص سمت میں آگے بڑھتی رہی۔ حتیٰ کہ ۱۸۵۷ء کے بعد مغربی علوم و فنون کی ابھرتی سرسید اور حالی کی تحریک کی صورت میں اس کے غیر فطری نشو و نما پر روک لگادی۔ شاعری کا دھارا اپنا رخ بدل کر پھر اسی سمت میں بہنے لگا۔ جو کلاسکی دکنی شاعری کی سمت تھی، یعنی حقیقت نگاری، سادگی، زور و اثر کے رجحانات کا اعادہ۔

(۲) [illegible]

حیدرآباد شہر شروع ہی سے ایک انفرادی خصوصیت اور ایک گونہ خود پسند معاشرت کا مرکز رہا اور جو لوگ دوسرے مقامات سے اس شہر میں وقتاً فوقتاً آ کر آباد ہوئے اس میں بستے رہتے ہیں وہ بھی صرف اس رنگ میں رنگ گئے بلکہ اسمیں اضافہ کرتے گئے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حیدرآباد اور سلطنت آصفیہ حکمرانی کے معائب اور محاسن دونوں کا مکمل مرقع رہا ہے۔ (ڈاکٹر [illegible])

محمد قلی قطب شاہ

باقر رضوی امانت خانی

سلطنت پہ گولکنڈے کی ترا جب راج تھا — مُلک کے امن و اماں کا تیرے سر پہ تاج تھا
سانس لیتی تھی چمن میں عہدِ چمن کی زندگی — سیج پر پھولوں کی سوتی تھی دلہن کی زندگی
جنتِ ارضی بنے تھے راستے بازار کے — کھوٹے سکے مُلک میں چلتے نہ تھے کردار کے
تھرتھراتے، کانپتے، ڈرتے ہوئے جانا نہ تھا — اپنے سائے سے کبھی انسان گھبراتا نہ تھا
سیم و زر کا تھا بدل سوداگری کی شان میں — تلتا تھا بازار گویا عدل کی میزان میں
اتحادِ باہمی کی ڈالدی تھی تو نے چھاپ — عید اور تہوار گویا تھے ہندو مسلم کا ملاپ
رات دن کٹتے تھے سب کے ایک طرزِ خاص میں — جھولتی تھی زندگی گہوارۂ اخلاص میں
جی رہی تھی قوم، ہر صورت میں اپنی آن پر — دم نہ ہرگز ٹوٹتا تھا زندگی کی تان پر
فارسی، اُردو، تلنگی پر تصرف تھا ترا — جامِ صہبائے زباں، سہ آتشہ تو نے پیا
خشتِ اوّل تیرے ہاتھوں نے رکھی ہے پائیدار — حیدرآبادِ دکن ہے آج تیری یادگار
تو رواداری کا شیدا تھا یہی تو ہے سبب — ہیں رواداری کے دلدادہ دکن کے لوگ سب
بعد مرنے کے بھی زندہ رہ گیا تیرا مزاج — تیری گنبد سے عیاں ہے ہندو مسلم امتزاج
جنگ کے ہنگام میں بھی انحصارِ امن تھیں — گولکنڈے کی فصیلیں اک حصارِ امن تھیں
متحد کرتی رہی ہر ایک تقریبِ دکن — ہے تری ممنونِ احساں آج تہذیبِ دکن
ہیں منارے چار جس کے، شمعِ منزل بن گئی — زندہ ہی تیری عمارت، شہر کا دل بن گئی
وہ عمارت جس سے ملتا ہے تناسب کا پتا — نقش کا جس کے دکن میں مدتوں سکہ چلا
عشق کی طاقت لئے تھی تیری ہمت کی نگاہ — نغمۂ موسیٰ کی روانی تیرے جذبے کی گواہ
ثبت، تاریخِ ادب میں ہو گیا تیرا نشاں — صاحبِ دیواں ہے پہلا شاعرِ اُردو زباں
آشتی دین و مذہب ہو جاتی ہے جامِ رند میں — تو نے ہی تہذیب ایک کو سموڈ یا ہند میں
آج تک حیدرآباد و دکن پہ ہیں نقوشِ امتزاج — شکل میں تیری ڈھلا تھا اس طرح دکنی مزاج
ساتھ تیرے مُلک سارا حرفِ ماتم ہو گیا — قوم کا تہوار ہی دکنی محترم ہو گیا
تیری رنگیں شاعری کا تیرا دیواں ہے کنول — تو غزل کہتا تھا، خود ہی مجسم تھا غزل

داد تجھ کو مل رہی ہے عالمِ تاثیر سے
خود محبت بات کرتی ہے تری تصویر سے

ڈاکٹر سیدہ جعفر

محمد قلی کی شاعری

محمد قلی کے کلام میں ہندوستانی ماحول، ہندو دیو مالا اور ہندوستانی طرزِ فکر کا اثر نمایاں ہے۔ حسن پرستی اور جمالیت محمد قلی کے کلام کے دو غالب رجحان ہیں جن میں بظاہر کوئی ربط اور ہم آہنگی نظر نہیں آتی۔ ممکن ہے کہ شاعر نے اپنی عیش پسندی اور اپنے منفی جذبے کو مذہب کے پردے میں چھپانے کی کوشش کی ہو۔ مذہب پرستی کے بارے میں فرائڈ کہتا ہے کہ "یہ بھی بعض صورتوں میں جنسی جذبے ہی کا ایک شکستہ اور سبھیدہ اظہار ہے": محمد قلی کی شاعری کے دو قوی محرکات رہے ہیں ─ یا تو مذہبی عقائد اور مذہبی تقاریب نے اس کو طرب کیف کی طرف مائل کیے رکھا یا پھر حسینوں کے ناز و ادا نے اس کے جذبات میں تلاطم پیدا کیا اور جذبات کے اسی تموج کو اس نے شعر کی صورت میں پیش کیا ہے۔ جنس کو تقدس سے وابستہ کرنے کا تصور بھی ہندوستانی طرزِ فکر کی دین معلوم ہوتا ہے۔ تانترک جوگیوں اور شیو کے پجاریوں نے "بیم" کی بابت کے نظریے کو جنسی تلذذ کی مثال کے ذریعے سے بھی سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ محمد قلی کے کلام میں ایسے اشعار موجود ہیں جن میں مذہب کو جنس کے آئینے میں دیکھنے کی سعی نمایاں ہے۔ وہ اپنے اکثر اشعار میں بھوگ بلاس کے آنند کو "نبی کا صدقہ" سمجھتا ہے۔ ناگ کے روپ احساس کے تقدس کے تناظر (perspective) میں دیکھیے تو میلان بھی ہندو پریم کلا (Art of love) سے اثر پذیری کی غمازی کرتی ہے۔ محمد قلی کو اپنی عیش کوشی اور روشِ رندانہ کا پورا احساس تھا۔ وہ حضرت علی سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ "میں آپ کے دربار میں سر جھکاتا ہوں اور غلام حیدر کرار مشہور ہوں مجھے اپنی عملی زندگی میں بھوگ بلاس اور عیش و عشرت کی فراوانی سے ندامت اور پریشانی نہیں میرا اہتمام بھی (زمین پر) عیش و عشرت کی سیج ہے اور آکاش پر تمہاری شان یہ ہے کہ "روح الامین" تمہارے پگ تلے" اپنے "شبیر" کا "فریفتہ" کہتا ہے تو میرا "گفتو تا سا میں" اور "سو جان" ہے۔ اس لئے مجھے عاقبت اور مآلِ زندگی کا فکر نہیں، میں اپنے اس محبوب کو تکتے رہنے اور آرتی اتارنے کا متمنی ہوں"۔ محمد قلی کے ایسے اشعار کرشن بھگتی سے اس کی اثر پذیری کے غماز ہیں۔ ہندوستانی معاشرت، یہاں کے رسم و رواج اور ثقافتی میلانات محمد قلی کے طرزِ فکر میں اتنے رچ بس گئے تھے کہ اپنے روحانی رہبروں کی مدح کرتے ہوئے بھی وہ جمالیاتی جذبے کے طلسم سے باہر نہیں آسکا ہے۔ محمد قلی اس معاملے میں ابراہیم کی طرح وسیع النظر اور کشادہ قلب تھا۔ اس نے مقامی اثرات اور روایات سے متاثر ہو کر بعض ہندوستانی تہواروں کو شاہی تقاریب کی حیثیت بخشی تھی۔ محمد قلی اپنے طرزِ عمل کے بارے میں کہتا ہے ؎

ہندو ریت کوں دیتے ہیں تم دلیاں   کہ ریت خانہ تمنے ہے تو لیں بھی ہمن سر

ہندوستانی معاشرت اور ہندو ریت سے جذباتی وابستگی کا اثر اس کے تمام کلام میں جاری و ساری نظر آتا ہے۔ محمد قلی کا کلام حسن کی حب الوطنی اور قوم پرستی کا شاہکار ہے۔ اس نے دکن کے ذرے ذرے سے محبت کی۔ اس سرزمین کے دریاؤں، پہاڑوں، موسموں اور یہاں کے تہواروں سے اسے والہانہ وابستگی ہے۔ وہ پھولوں اور میووں کے بجائے گنگا اور جمنا کا ذکر کرتا ہے۔ "میرا محبوب گنگا جل سے ٹھنڈی ہوا آتی

ظاہر ہے محمد قلی کو آتش کی اہمیت تنگی ہے جسے

سکی بنہ کے منبع ان پن کھڑے ہیں　　کہ ہوں آتش کی بجاتے آگی ۔

محمد قلی ہندوستانی تہذیب کا پرستار تھا۔ دکن کی معاشرت کا خمیر دو قوموں کی مشترکہ تہذیب سے تیار ہوا تھا۔ بھگتی اور صوفیانہ تحریک کی ندیوں کے اشتراک سے دکنی معاشرے کی ذہنی تربیت ہوئی تھی۔ شمالی ہندوستان میں شہنشاہ اکبر نے قومی وحدت کے تصور کو استوار کرنے کی کوشش کی تھی اسی کا ہم عصر جب یہ محمد قلی تھا جس نے ہندوستان کی علاقائی زندگی میں وحدت کا جلوہ دیکھنے کی کوشش کی اور ہماری شاعری میں قومی تمدن کا پہلا رنگ کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے۔ اس کی شاعری کا اصل مزاج ہندوستانی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ وطنیت اور قومی یک جہتی کے جذبے سے سرشار نظر آتا ہے۔ قطب شاہیوں کی تہذیب ہر معنی میں ایک گنگا جمنی تہذیب تھی۔ جس میں ایران اور ہندوستان کے ثقافتی تصورات اور سماجی عقائد کا ایک لطیف امتزاج نظر آتا ہے۔ محمد قلی نے اپنے دورِ حکومت میں دکنی تہذیب کو حیات نو عطا کی۔ دکن کے رسوم و عقائد' یہاں کی معاشرت اور تہذیبی زندگی کی بڑی متحرک اور رنگین تصویریں محمد قلی کے کلام میں موجود ہیں جو اسی مشترک میراث کا عطیہ معلوم ہوتی ہیں۔ قطب شاہیوں کے متحدہ قومیت کے تصور نے دکن کے باشندوں کو ایک مضبوط تہذیبی رشتہ میں منسلک کر دیا تھا۔ اس کی شاعری میں اس عہد کے تہذیبی عناصر کی بھرپور ترجمانی ملتی ہے۔ اور اس کی ساری فضا ہندوستانی ہے۔ شاعر نے اپنے دور کے لباس' زیورات' طرزِ معاشرت اور تہذیبی اقدار کی ایسی نایاب عکاسی کی ہے کہ صدیاں گذر جانے کے باوجود یہ تصویریں دھندلی نہیں ہوتی ہیں۔ ہر دور میں عورتوں کے پر تکلف لباس' زیورات اور سامانِ آرائش و زیبائش سے دلچسپی رہی ہے۔ قطب شاہی محلات میں زر و جواہر کی کمی نہ تھی۔ اس لئے محمد قلی کی پیاریاں خوبصورت اور بیش قیمت زیورات سے مزین نظر آتی ہیں۔ کنٹھ مال' کرن پھول' پسے' نتھنی' ٹیکا' سہرا' بینا' ہانس' چھلا' چپل لڑی' ناگ سر' کن موتی اور ایسے ہی زیورات ہیں جن کے نام سے بھی نئی نسل نامانوس ہے۔ رسومات' رہن سہن' اور طرزِ زندگی میں جس قومی ہم آہنگی اور یگانگت کو محمد قلی نے پروان چڑھایا تھا اس کی بہت سی مثالیں اس کے اشعار میں اپنی جھلک دکھاتی رہتی ہیں۔

محمد قلی نے اپنی شاعری میں حیدرآبادی تہواروں کے بھی بڑے دلچسپ مرقعے پیش کئے ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ بدیسی نسل اور تہذیب سے تعلق رکھنے والے حکمرانوں نے کس طرح خود کو ہندوستان کی ایک علامت بنا کر زندگی بسر کی۔ اور اپنی شخصیت کو کس طرح مقامی اثرات کے سانچے میں ڈھال لیا تھا۔ محمد قلی کی شاعری اس حقیقت کا اظہار ہے کہ شاعر اور اس کے گردوپیش کے میلانات سے کس طرح متاثر ہوتا ہے۔ اور کس طرح سماجی زندگی کے مختلف عوامل و رجحانات شاعر کے شعری محرکات کی بنیاد بن جاتے ہیں۔ جشنوں کی دھوم دھام' محلات کی چہل پہل اور میلاد' عیدوں کے اہتمام' آتش بازی اور باجوں کا اہتمام' گرمی کی شدت' بسنت کے میلے کی بہار اور زہرہ جبینوں کی خوش پوشاکی و خوش خرامی' شاعر کی طبیعت کی جولانیوں کا موجب ہوئی ہے۔

محمد قلی کو موسموں کی کیفیات بیان کرنے اور مختلف موسموں میں انسانی جذبات کی تصویر کشی سے خاص دلچسپی ہے۔ اردو کے بہت کم شعراء نے مناظرِ قدرت اور مظاہرِ قدرت کو موضوعِ سخن بنا کر ان کی مختلف کیفیات اور بدلتے ہوئے حالات کی مصوری کی ہے۔ سنسکرت شاعری میں یہ عنصر موجود ہے۔ کالی داس نے اپنی تخلیقات میں مناظرِ قدرت کی بڑی عکاسی کی ہے۔ وہ مظاہرِ فطرت کے پس منظر میں انسانی احساسات کو جذبات کی ہم آہنگی کے ساتھ ابھارتا ہے اور انہیں ایک نئی صورت عطا کرتا ہے۔ انگریزی کے شاعروں نے مناظرِ قدرت کی عکاسی میں [illegible] نہایت اشاریت اور رمزیت سے کام لیا ہے۔ ان کا شائبہ بھی محمد قلی کی شاعری میں موجود نہیں لیکن کالی داس کی طرح وہ فطرت کے مناظر سے متاثر

موسموں کے سحر اور ان کی دل کشی میں ڈوب جانے کا رجحان محمد قلی کو سنسکرت اور ہندی شاعری سے ملا اور گہری دلچسپی ظاہر کرتا ہے۔ بسنت کے تہوار، موسمِ سرما کر دیتا ہے۔ محمد قلی نے دکنی کلام کے پس منظر میں مختلف موسموں کی گوناگوں کیفیات و خصوصیات کو واضح کیا ہے۔ محمد قلی نے اپنے دور کی برسات میں محمد قلی اور اس کی رعایا کی کیا تقریبات منائی تھی اس کا اندازہ بھی اس کے کلام سے ہو سکتا ہے۔ گرمی کی شدت اور بے چینی کے بعد بارش کا پہلا قطرہ انسانوں کے لئے مسرت کا پیام، برکھا کا آغاز یا بارش کا ایک قومی تہوار منایا جاتا تھا۔ برسات کے موسم میں پھوار، نئی زندگی اور شادمانی کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔ اس دوران نیز تہوار سے محمد قلی کو خاص دلچسپی تھی۔ کیفیت، پودوں کی سبزی، بادلوں کی گرج، قوسِ قزح کی خوبصورتی، پپیہے کی پیہو پیہو، مینڈکوں کی شہنائی، کوئل کی کوک، مور کا ... برسات کے پھولوں کی خوشبو موسم کی دلفریبی میں اضافہ کرتی ہے۔ محمد قلی کی ان تصویروں کو مقامی رنگ نے نئی آب و تاب عطا کی ہے۔

کالی داس نے "رت سمہار" میں بارش کو "پارس راجہ" کے روپ میں پیش کیا ہے جو ہاتھوں کے کلسے ہاتھی پر چڑھ کر ... اتنے میں لے، کرکھڑ کے طبل بجاتا، بڑی شان و شوکت کے ساتھ آتا ہے۔ بارش "کدم کے پھولوں، ارجن کے پھولوں اور کیتکی کے ... سے جنگل کا دامن بھر دیتا ہے۔ کالی داس کہتا ہے کہ اپنے جسموں کو چمک دار ریشمی لباسات سے سجانے والی عورتیں جو پھولوں کی ... بارش کے ٹھنڈے منظروں سے محبت کے ترانے گانے لگتی ہیں۔ محمد قلی یہاں کالی داس کا ہم خیال نظر آتا ہے، وہ کہتا ہے

سہیلیاں بنی تیلی رت میں شوانی ۔ میگھا چھائے انبر رنگا رنگ نہانی
سبے سیس آنچل دھر نور جیوں گگن پر ۔ مرگ میں مرگنیوں کی کسوت شہانی

یہاں یہ بتانا مقصود نہیں ہے کہ محمد قلی کالی داس جیسا بلند پایہ شاعر تھا اور اس نے کالی داس کی پیروی کی ہے یا اس کی ... سے اثر پذیر ہو کر شعر کہے ہیں۔ اس سے صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ ہندوستان کے طول و عرض میں فاصلوں اور جغرافیائی ماحول کی تبدیلی کے باوجود موسم کی خاص کیفیات کم و بیش یکساں ہوتی ہیں۔ جن شاعروں میں مشاہدے کی قوت تیز ہوتی ہے اور جو منظر پر قدرت رکھتے ہیں وہ فطری مناظر کی ایسی جاندار تصویریں پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جن کی شعری بصیرت ... ہمارے سامنے آتی ہیں۔ محمد قلی اور کالی داس چونکہ ایک ہی ملک کے مختلف موسموں کا نقشہ پیش کر رہے ہیں اس لئے ان کے ہاں اگر کہیں ہم آہنگی موجود ہو تو یہ کوئی تعجب خیز امر نہیں ہے اور اس ہم آہنگی اور ذہنی مناسبت کی طرف اشارہ کرنا بے محل نہیں معلوم ... محمد قلی کی شاعری میں مسلسل اور باقاعدہ منظر نگاری نہیں پائی جاتی لیکن اس کے متفرق اشعار کو مربوط کر دیں تو موسموں کی تصویر نظر آتی ہے۔ محمد قلی کا یہ کلام منظریہ شاعری کی تعریف میں نہیں آسکتا ہو تو بھی ہم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے ... شاعری میں منظر نگاری کے دھندلے نقش ضرور دکھائی دیتے ہیں۔ یہ ایسی تصویریں ہیں جن میں تخیل کی کارفرمائی بھی ہے اور ... کی صداقت بھی جن کی تجسیم میں اس کا خلاق ذہن گرد و پیش کے ماحول سے پیکر تراشی کا مواد بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ ... اور اپنی دلفریبی سے انہیں دکنی ادب کا لافانی جزو بنا دیتا ہے۔ مناظرِ قدرت سے لطف اندوز ہونے کا رجحان محمد قلی کی ... اکثر جگہ بڑی شدت سے نظر آتا ہے۔

(باہم محمد قلی کے اعلیٰ ... میں پیش ...

ڈاکٹر غیاث صدیقی

بھاگ متی

(اردو کی پہلی غزل)

خلوتِ شاہ میں آہٹ ہوئی، گھنگرو بولے
بڑھ کے تھامے ہے کوئی دستِ حنا آلودہ
ہاتھ تہذیب کے، لفظوں کے لبوں تک پہنچے
رُک گئیں گیت کی نبضیں، تو لبِ آہستہ کھلے
جیسے پیمانِ وفا، قول و قسم، راز و نیاز
جیسے فانوس کی آنکھوں میں بھر آئیں آنسو
جیسے تھم تھم کے مہک اُٹھے بدن کی خوشبو
دلِ عاشق نے کہا "لے یہ دکن تیرا ہے"
بھیگی پلکوں نے کہا "آج قلی میرا ہے"

خلوتِ شاہ میں آہٹ ہوئی، گھنگرو بولے
لبِ یاقوت سے لہرائی دعا کی خوشبو
"کوئی فرزندِ دکن ہو" یہ اُسے یاد رہے
یہ وطن میرا، مرے نام سے آباد رہے
مُہرِ تصدیق ہوئی ثبت تو لب کانپ گئے
خلوتِ شاہ میں آہٹ ہوئی، گھنگرو بولے
دستِ تحقیق نے گل پوش دریچے کھولے
چشمِ تاریخ نے پلکوں کی اُٹھائی چلمن
دلِ شاعر کے دھڑکنے کی صدا آتی تھی
اور اردو کی غزل جام بکف، نغمہ بہ لب
اپنے خالق کے شبستان میں لہرائی تھی
حسن اور عشق کی راہوں میں ہے اردو کا ازل
دل کے ایوان میں ضیا بار ہے مہتابِ غزل

تقی علی مرزا

یورپ میں نشاۃ ثانیہ کی تحریک اور اس کے اثرات

چند سال قبل انڈین ہسٹری کانگریس کے سالانہ اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر ہارون خاں شیروانی نے ایک نہایت فکر انگیز بات کہی تھی کہ اکثر مورخین اور محققین ہندوستان کی تاریخ سے مراد شمالی ہند کی تاریخ خصوصاً دہلی کی سلطنت کی تاریخ لیتے ہیں۔ اور نتیجتاً دوسری سی سلطنتوں کی تاریخ کی جانب وہ توجہ نہیں دی جاتی جن کی وہ مستحق ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس رائے کے اظہار کے وقت پروفیسر موصوف کے ذہن میں دکن کی سلطنتیں خصوصاً بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت، گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت اور بیجاپور کی سیاست رہی ہوں گی جن کی سیاسی معاشی تاریخ اور ادبی اور تہذیبی کارناموں کے تعلق سے اتنا کام نہیں ہوا ہے جتنا کہ ہونا چاہیئے تھا۔ وہ تو غنیمت ہوا کہ ڈاکٹر زور مرحوم اور ان کے ساتھیوں کی مساعی کے باعث دکنی ادب، جس کے دو بڑے مرکز بیجاپور اور گولکنڈہ تھے، گمنامی سے بچ گیا۔ اور دکنی ادب اور زبان پر تحقیق کا آغاز ہوا جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ مگر اب بھی قطب شاہی تمدن کے کئی گوشے ایسے ہیں جن پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ سترھویں اور اٹھارویں صدی عیسوی کے یورپی ادب میں گولکنڈے کے ہیروں کا ذکر جا بجا ملتا ہے۔ لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ جب اس سطح کو کریدا جائے تو کچھ اور نادر جواہر برآمد ہو جائیں اور ہم عصر یورپی ادب اور تمدن اور گولکنڈہ کے ادب اور تمدن میں مشترکہ اقدار کا پتہ چلے۔ اگر ایسا ہو سکے تو پھر یوم محمد قلی قطب شاہ کے موقع پر پڑھا جانے والا میرا یہ مضمون اتنا بے معنی IRRELEVANT نہ معلوم ہو جتنا بظاہر دکھائی دیتا ہے۔ بہرحال ادبی اجلاس کے کنوینر اور میرے کرم فرما جناب منظور احمد صاحب کے حکم کی تعمیل میں یہ مختصر مضمون یورپی نشاۃ ثانیہ کی تحریک کے بارے پیش خدمت ہے۔

یورپ میں نشاۃ ثانیہ کی تحریک کے آغاز کی تاریخ کا تعین کوئی سیدھا سادہ مسئلہ نہیں ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مختلف ممالک میں تحریک مختلف زمانوں میں شروع ہوئی۔ اٹلی میں سب سے پہلے، پھر فرانس، انگلستان اور مغربی یورپ کے دوسرے ممالک میں اور سب سے آخر جرمنی میں اور پھر مختلف ملکوں میں۔ اس تحریک کی نوعیت بھی جداگانہ رہی۔ بعض مقامات پر اصلاح دین کا عنصر غالب تھا تو بعض اور مقامات پر فنون لطیفہ اور ادب کے شعبہ میں اس کا زور رہا۔

اکثر مورخ ۱۴۵۳ء کو نشاۃ ثانیہ کا نقطۂ آغاز قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ اس سال بازنطینی سلطنت کے دارالخلافہ قسطنطنیہ کا سقوط آیا۔ اور ترکوں نے اس شہر کو فتح کر لیا۔ اور اس قدیم شہر میں جو عالم تھے انہوں نے اپنے کتب خانوں کو ترکوں سے بچا کے اپنے ساتھ لیا اور یونان قدیم کے علوم کو پھیلانے یورپ کے مختلف ممالک کا رخ کیا اور زیادہ تر اٹلی میں جا بسے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کلاسیکی علوم جو کتابوں میں محفوظ تھے اب ان کی اشاعت ہونے لگی اور یورپی ذہن جو صدیوں سے جہل اور تنگ نظری کا شکار تھے اب ان کی [illegible] ہونے لگی۔

کی طاقت نے اقدام نے کا موقع فراہم کیا مگر ۱۰۹۲ء میں سقوط طلیطلہ سے ... کی تاریخ کا آغاز کن حالات میں ہوا یہ بیان کرنا مقصود نہیں ہے۔ حاصل یہ کہ علم کا سلسلہ اس سے بہت پہلے شروع ہو چکا تھا اور اس تحریک کے پیچھے جو وجوہ کارفرما تھیں ان میں سے بیشتر صلیبی جنگوں کے دوران وجود میں آئی تھیں۔ صلیبی جنگوں کی طویل داستان ۱۰۹۶ء میں شروع ہوتی ہے جبکہ پوپ اربن دوم (URBAN II) اور راہب پیٹر (PETER THE HERMIT) نے یورپی اقوام کی غیرت دینی کو للکارا اور انہیں شہر بیت المقدس کو ترکوں کے قبضہ سے آزاد کرانے کے لئے آمادہ کیا۔ اور پہلی صلیبی جنگ لڑی گئی — اس کے بعد وقفہ وقفہ سے دو سو برس تک ان جنگوں کا سلسلہ جاری رہا۔ جن میں کبھی عیسائیوں اور کبھی مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی۔ مگر بالآخر فلسطین مسلمانوں ہی کے قبضہ میں رہا۔ اور جس مقصد کے لئے یورپی قوموں نے یہ خونریز جنگیں لڑی تھیں وہ انہیں حاصل نہ ہو سکا۔ مگر یورپ کے نقطۂ نظر سے صلیبی جنگوں کا مثبت اور نہایت ہی روشن پہلو یہ تھا کہ یورپ کے لوگ عربی تہذیب و تمدن سے آشنا ہوئے اور یونان قدیم کا فلسفہ، علم ہندسہ، طب، فلکیات اور دوسرے بہت سارے علوم عربوں کے ذریعہ دوبارہ یورپ کو مل گئے۔

عربی دانشوروں نے نہ صرف یونانی علوم کو عربی زبان میں منتقل کیا تھا بلکہ خود اپنی جانب سے ان میں گراں بہا اضافے کئے۔ ان علوم کی تشریح اور تفسیر میں طب ... مشہور انگریزی مورخ جی ایم ٹریویلین نے اپنی تاریخ عالم میں ایک بڑی دلچسپ بات یہ لکھی ہے کہ یورپ والوں نے صلیبی جنگوں کے صلہ کے طور پر ہر وہ چیز حاصل کی جس سے راہب پیٹر نے انہیں ڈرایا تھا۔ یعنی وسیع النظری، روشن خیالی اور رواداری کا مسلک، اور ہر وہ چیز کھو دی جو انہیں عزیز تھی یعنی جہالت، تنگ نظری اور مذہبی عصبیت۔ اس ذہنی لین دین کا ایک دلچسپ شاخسانہ یہ بھی نکلا کہ عربوں نے اگر یونانی ناموں کو عربی جامہ پہنایا تو خود عربی فلاسفر اور حکماء کے ناموں کے ساتھ یہ ستم ظریفی ہوئی کہ یورپی زبانوں میں وہ قلب ماہیت کا شکار ہو گئے۔ اگر GALEN، EUCLID، HIPPORATES جالینوس، اقلیدس اور بقراط بن گئے تو ابن سینا، ابن رشد اور حاذق AVICENNA، AURROES اور RHAZEES میں تبدیل ہو گئے۔ سرزمین یورپ پر قائم ہونے والی اسلامی حکومتوں خصوصاً سسلی اور اسپین نے تہذیب و تمدن کے وہ معیار معین کئے جو اقوام یورپ کے لئے سرچشمۂ وجدان بن گئے۔ اور اگر اقبال نے سسلی اور اندلس کا ذکر افتخار اور حسرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کیا ہے تو اس پر تعجب کی کوئی بات نہیں۔ مسجد قرطبہ اگر اندلسی تمدن کا شاہکار ہے تو اس پر لکھی ہوئی نظم شاعر کے فن کا نقطۂ عروج بھی بن گئی۔

یورپی قوموں کو لذت تجدید سے آشنا کرنے اور ان کی فکر کی کشتیٔ نازک کو رواں کرنے میں جو چیز بڑی مدد و معاون ثابت ہوئی وہ تھی اسی زمانہ میں پرنٹنگ پریس کی ایجاد تھی جس نے اشاعت علوم کو ایسی سہولت دی کہ پڑھنے والوں کی تعداد میں بہت تیزی سے اور بکثرت اضافہ ہو گیا۔ اور علم جو مخطوطات میں مقید تھا اور جو زیادہ تر کلیسا کا اجارہ تھا اب عوامی ملکیت بنتا گیا۔ اصلاح دین کی تحریکوں میں بھی طباعت کی ایجاد نے بڑا اہم حصہ ادا کیا ہے۔ نشاۃ ثانیہ نے انفرادیت اور مادیت کی قدروں کو پروان چڑھایا۔ انفرادیت کے جذبہ کی ترقی کا یہ نتیجہ نکلا کہ ہر قسم کی مطلق العنانی اور استبداد کے خلاف بغاوت کا علم بلند ہوا خواہ وہ مطلق العنانی کلیسا کی ہو یا شاہی کی، گروہ کی ہو یا تنگ نظر علماء دین کی۔ اصلاح دین کی تحریک کے پس پشت یہی جذبہ کارفرما تھا کہ فرد اور خدا کے درمیان کسی واسطہ کی ضرورت باقی نہیں۔ چنانچہ انجیل مقدس کا ترجمہ مختلف یورپی زبانوں میں ہونے لگا اور عام لوگ اس کی رسائی ممکن ہو سکی۔ ارسطو جس کا قرون وسطیٰ میں بول بالا تھا اب تنقید و تنقیص کا شکار بن گیا۔ گویا اسی زمانہ میں جدید سائنس کی بنیادیں قائم ہوئیں جن کے سبب یورپی اقوام حیرت انگیز ترقی کی راہ پر گامزن ہونے کے قابل ہو سکیں۔

صلیبی جنگوں کے عواقب کا ایک اور پہلو یہ تھا کہ بڑی داستانیں مشرق کی تجارت جو کہ شکل اور [illegible] جاری تھی اس لئے مغربی یورپ کے سیاحوں اور جہازرانوں نے نئے بحری راستوں کی تلاش میں سرگرمی دکھائی جن کی مدد سے مشرق سے تجارت کے سلسلہ کو وسعت دی۔ حسن اتفاق سے ایک نے وسیع اور دولت سے مالامال براعظم کو بھی دریافت کر لیا اور یہیں سے یورپی اقوام کی ملک گیری اور سلطنت آرائی کی تاریخ شروع ہوتی ہے ۔

نشاۃ ثانیہ کا انسان ایک عجیب و غریب مخلوق تھا . RENAISSANCE MAN کا تصور ہمیں اٹلی، فرانس اور انگلستان کی ان ETIQUETTE BOOKS میں ملتا ہے . اس موضوع کی شاید سب سے اہم تصنیف اطالوی اہل قلم CASTIGLIONE کی IL CORTEGIANO ہے جس میں ایک آئیڈیل مرد کی تصویر کشی کی گئی ہے جو تلوار کا دھنی اور شہسوار بھی ہے اور لاطینی اور یونانی زبانوں کا ماہر بھی، جو قلعوں کی تسخیر کا انتظام کر سکتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ حسن معشوق کی تعریف نہایت لطیف پیرائے میں نظم کر سکتا ہے . عملی شکل میں ایسے آئیڈیل انسان اس زمانہ کی تاریخ میں ہمیں ملتے ہیں مثلاً LEONARDO DA VINCI جو بیک وقت مجسمہ ساز بھی تھا مصور بھی، انجینئر بھی تھا اور [illegible] بھی۔ یا SIR WALTER RALEIGH جس کی شخصیت میں سپاہی اور قزاقی، درباداری اور شاعری کی صفتیں یکجا ہو گئی تھیں . اس بوقلمونی شخصیت کا تجزیہ یہ کہہ کر کرنا صحیح نہیں ہے کہ وہ محض ایک DILETTANTE تھے اور ان سے کسی پائدار کارنامے کی توقع [illegible] نہیں کی جا سکتی . اس نقطۂ نظر کی نفی نشاۃ ثانیہ کے دور کی کئی تاریخی شخصیتوں سے ہوتی ہے . انسان تخلیق کا مرکز قرار پایا . اور HUMANISM کے عقیدے کی ترقی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جسم انسانی کے حسن کا اظہار اس زمانہ کے آرٹ کا اہم جزو بن گیا . سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی کی مجسمہ سازی اور مصوری کے شاہکار حسن انسانی کی دلبری کی عکاسی میں اپنا جواب نہیں رکھتے . یونان قدیم کو چھوڑ کر دنیا کے کسی خطہ میں ایک مختصر عرصہ کے دوران ہمیں فنون لطیفہ کی ایسی بہار ہمیں نہیں ملتی جیسی کہ اٹلی میں۔ رنگ و جشن کی اس دنیا میں رہبانیت کیلئے کوئی مقام نہیں تھا . عقبیٰ پر عقیدہ تو نہیں ہوا لیکن دنیا سے لگاوٹ بڑھتی گئی . ۱۱۹۵ء میں پوپ اربن سوم نے ایک رسالہ دنیائے فانی کی تحقیر کے بارے میں لکھا تھا، کے تقریباً چار سو سال بعد ۱۵۸۰ء میں مشہور فرانسیسی فلسفی اور اہل قلم MONTAIGNE نے تعلیم اطفال کے ضمن میں یہ بات لکھی کہ یہ عظیم دنیا ہی سب سے بڑی درسگاہ ہے اور اس سے بے توجہی جہالت کی نشانی ہے . ان دو نقطۂ نظر میں جو تفاوت ہے وہ اس ذہنی انقلاب کی عکاسی کرتا جو نشاۃ ثانیہ نے یورپ میں جاری و ساری کر دیا تھا۔

اس مختصر مضمون میں یہ گنجائش نہیں ہے کہ نشاۃ ثانیہ کے دور کے یورپی ادب کا اجمالی جائزہ بھی لیا جا سکے . ایک دو امور کی طرف اشارہ کرنا چاہوں اور اپنے مضمون کو ختم کر دوں . یورپی اقوام نے مشرق سے فلسفہ، ریاضی، منطق، طب اور دوسرے بہت سے علوم میں جو [illegible] کیا اس پر کافی کام کیا جا چکا ہے . لیکن یورپی ادب میں مشرق کے اثرات کے بارے میں خاطر خواہ تحقیق نہیں ہوئی ہے . نشاۃ ثانیہ میں جہاں کئی کلاسیکی اصناف سخن کا احیا ہوا وہیں کئی ایک نئی اصناف سخن بھی وجود میں آئیں . اور مجھے یقین ہے کہ ان میں سے چند سخن کی تخلیق مشرق کی مرہون منت ہیں . مثلاً کلاسیکی رزمیہ کی نئی شکل جو سولھویں صدی عیسوی میں رونما ہوئی یعنی ROMANTIC EPIC اور جس کے شاہکار اطالوی میں ARIOSTO کی نظم ORLANDO FURIOSO اور TASSO کی نظم GERUSALEMME LIBERATA ہیں، پ[illegible] زبان میں CAMOENS کی نظم OS LUSIADS اور انگریزی میں SPENSER کی نظم THE FAERIE QUEENE اور جن کی داستان طرازی [illegible] ہے یا ایک اور نئی صنف یعنی FAIRY-TALE کا [illegible] جس کی دو اچھی مثالیں BOCCACCIO کی DECAMERON

۔۔۔ CHAUCER کی THE CANTERBURY TALES ہی اور اس کی اہم خصوصیت داستان در داستان ہے ۔ ان سب میں ایک حقیقت ہے جو یقینا مشرقی ادب سے یورپی ادب میں اسپین کے راستے سے پہونچا تھا ۔ یا پھر اس زمانے کی یورپی شاعری میں COURTLY LOVE کا تصور اور عشقیہ شاعری میں فراق و وصال کے قصے عاشق کی جانسوزی اور معشوق کی بے مروی کی کیفیات کا بیان اس مشرقی چیز ہے ۔ جو یقینا مشرقی ادب سے یورپی ادب میں منتقل ہوئی ہے ۔

میں نے تو تھوڑی بہت ذہنی کھینچ تان کے ساتھ محمد قلی قطب شاہ کی عشقیہ شاعری اور اس کی ہم عصر ملکہ انگلستان ایلزبیتھ کے دور کی عشقیہ شاعری میں ربط قائم ہی کر دیا ۔ آپ چاہے نہیں یا نہ مانیں ۔

(یوم محمد قلی کے ادبی اجلاس میں پڑھا گیا) ۔

دکنی تاریخ اور ادب کی کتابیں

ادارۂ ادبیات اُردو نے دکنی ادب کو فروغ دینے میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں ۔ دکنی کی کتنی ہی کتابیں اس ادارہ سے شائع ہوئیں جن کی تحقیقی دنیا میں قدر و منزلت ہے ۔ درج ذیل کتابیں محدود تعداد میں برائے فروخت موجود ہیں ۔ فوری طلب فرمائیے :

معانیٔ سخن (انتخاب کلام محمد قلی قطب شاہ)	مرتبہ ڈاکٹر زور مجلد	۴/۰
میر محمد مومن (قطب شاہی کے وزیر اعظم کی حیات)	مرتبہ ڈاکٹر زور —	۵/۰
حدیقۃ السلاطین (تاریخ عہد قطب شاہی)	مرتبہ علی اصغر بلگرامی فائکا	۱۵/۰
تاریخ گولکنڈہ (مبسوط تاریخ عہد قطب شاہی)	از پروفیسر مجید صدیقی	۱۲/۰
نذر محمد قلی قطب شاہ (تذکرہ و مقالات)	مرتبہ ڈاکٹر زور باتصویر	۸/۰
یادگار محمد قلی قطب شاہ ۱۹۶۵ء (مضامین نظم و نثر)	مرتبہ محمد اکبر الدین صدیقی	۳/۰
" " ۱۹۶۶ء (" ")	" "	۳/۰
محمد قلی قطب شاہ کی جیون کہانی (ادب اطفال)	وقار خلیل	۱/۵۰
سیر گولکنڈہ (عہد قطب شاہی کا نیم تاریخی افسانوی ادب)	ڈاکٹر زور	۳/۰

ملنے کا پتہ : سب رس کتاب گھر ایوانِ اردو پنجہ گٹہ روڈ حیدرآباد ۲۰

خیرات ندیم

چار مینار کا شہر

عظمتِ جانِ سخن
سلسلۂ روایاتِ کہن
معبدِ موسیقی کے وطن
ساری دنیا میں ہے مشہور ترا سانولا پن
حیدر آباد دکن

عشق کا پیار کا شہر
لب و رخسار کا شہر
چار مینار کا شہر
کھلکھلاتا تری باتیں ہے اداؤں میں پھبن
حیدر آباد دکن
ساری دنیا میں ہے مشہور ترا سانولا پن
حیدر آباد دکن

جیسے اک ماہ جبیں
چشم و دل میں ہو مکیں
جس کی ہر بات حسیں
یکجہتی ترا مذہب ہے وفا تیرا چلن
حیدر آباد دکن
ساری دنیا میں ہے مشہور ترا سانولا پن
حیدر آباد دکن

مستقل عزم جواں
پاسبانِ دل و جاں
مہر و الفت کے نشاں
تیری تہذیب سلامت تیرا انداز عجیب
حیدر آباد دکن
ساری دنیا میں ہے مشہور ترا سانولا پن
حیدر آباد دکن

تیری گلیوں کی ہوا
جیسے خوشبوئے وفا
دل نوازی کی ادا
آئینہ سامنے ہے یا تیرا اشفاف بدن
حیدر آباد دکن
ساری دنیا میں ہے مشہور ترا سانولا پن
حیدر آباد دکن

ساتھ تنویر لئے
اپنی تفسیر لئے
حسنِ تعمیر لئے
نغمہ و شعر میں ڈوبا ہوا ہر رقص نگن
حیدر آباد دکن
ساری دنیا میں ہے مشہور ترا سانولا پن
حیدر آباد دکن

اشک اور آہ کا دل
بے غرض چاہ کا دل
وہ قطب شاہ کا دل
تو بہاروں کی زمیں بھاگ متی کا مسکن
حیدر آباد دکن
ساری دنیا میں ہے مشہور ترا سانولا پن
حیدر آباد دکن

تو ہے چاہت کے لئے
شوق و راحت کے لئے
ہر نفاست کے لئے
حسن ہی حسن سے معمور ہے تیرا آنگن
حیدر آباد دکن
ساری دنیا میں ہے مشہور ترا سانولا پن
حیدر آباد دکن

ماہ پاروں کا وطن
لالہ زاروں کا وطن
وضعداروں کا وطن
تو دیا [illegible] ہر کو مرے گلیاں
حیدر آباد
ساری دنیا میں ہے مشہور تیرا سا
حیدر آباد

آمنہ انصاری

قلی قطب کا یہ نگر

قلی قطب کا یہ نگر ۔ یہ شہرِ نیلم و گہر
عظیم ہے عظیم ہے ۔ میرا دکن میرا وطن عظیم ہے عظیم ہے۔

یہ میرا دکن ہے، میرا ملک، میرا محبوب اور یہ شہر، شہرِ خوباں۔ چاہنے اور چاہے جانے کی ساری روایات جہاں ملیں۔ یہ بھاگ متی کا نگر، یہ قطب شہ کا معبد، یہ ترکستان کے قراقو نیلو کے بیٹے ۔ قرا یوسف سکندر ثانی اور جہاں شاہ کے وارث محمد قلی کا پایۂ تخت ـــ

میرے چاروں طرف بکھری ہوئی چٹانیں ہیں۔ ان گنت راستے پتھر ہی پتھر ـــ پتھر کہ جن سے دیوتاؤں کی مورتیاں تراشی جاتی ہیں۔ یہ پتھر کا دیس ہے کہ دیوتاؤں کی نگری۔ جنگل سے آتی ہوئی آوارہ ہوائیں کسی کے دل کی دھڑکنوں کا ترنم لئے ـــ کہیں دور سے جیسے کوئی آواز دے رہا ہے ـــ

ان کالے پتھروں پہ چل کے جو تم آ سکو تو آؤ ۔ میرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے

یہ سرزمین جو اپنے سینے میں کتنے ہی راز پوشیدہ کئے ہمیں تک رہی ہے۔ یہ چٹانوں کے بیچ نیم تردیں قلعے دامان سے لہلہاتے ہوئے ـــ یہ بانکی تلنگن سلونا سانولا چہرہ اُمنڈتی گھٹا کی طرح گھنیری زلف، جھلملاتے نین ۔ ماتھے پہ بندی، ہاتھوں میں سرخ و سبز کانچ کی ترشی ہوئی چوڑیاں، یہ گلے میں پُشتہ، کمر میں چاندی کا کمر پٹہ، پاؤں میں کڑے بیچ کی انگلی میں رشل، ٹخنوں سے اونچا، گہرے رنگ کی ساری باندھے جس کی تار لہرا رہا ہے، یہ تلنگن کہ جیسے دیکھ کر قطب شہ کا جی بھی مچل اٹھا کہ ـــ

بنی صدقے قطب شہ سانولی سدرن ۔ بچن ہندی سوں بولے ایم رت دیم

ہرا بھرا لہلہاتا دھان مرغزاروں کے ساتھ کہیں کہیں ایک سیمیں لکیر سی جگمگا اٹھتی ہے، یہ جل بل ـــ یہ پتھروں کے درمیان کہیں چھپتا کہیں نظر آتا، یہ نہروں کا جال، یہ چاندی کا بدلتے ہوئے موسی ـــ یہ پانی جو شراب کی تاثیر رکھتا ہو کہ ایک بار جو منہ سے لگا لے پھر عمر بھر اس کے نشہ میں غرق رہا۔ عمر بھر دکن کی طلسماتی وادیوں میں بھٹکتا رہا اور ان کے بھید [illegible] ـــ اور وہ ہے ـــ فصیلیں، کنگورے، اطراف پھیلی ہوئی خندق ـــ وہ بلند بانگ عمارتیں کہ جن کے ماتھے پہ جڑے نگینوں ایک دھندلکا سا سینہ چھپائے سینے پہ آ رہے نظر آتی ہیں۔ یہ کھنڈر ہیں کہ [illegible] ـــ

یہ قلعہ اُن کے محل، یہ گیسنہ باغ جہاں عبدالرزاق لاری کے خون نے ابھی تک گلزار کھلا رکھے ہیں۔ یہ بالا حصار کی جانب بڑھتا ہوا راستہ ——

یہ بیکراں سناٹا ——— لیکن نہیں کوئی آواز ہے —— کوئی آواز جو بالا حصار سے دستک کی صدائے بازگشت بن کر لوٹتی ہے —— یہ پیہم پائل کس کی ہیں جو آج قلعہ کی دیواروں پر چلتی پھرتی نظر آ رہی ہیں۔ یہ پائل کی آواز یہ کھنکتے ہوئے قہقہے، یہ گھنگھروؤں کی جھنکار، پلکوں کھینچے ہوئے تاروں پر ناچتا چلا آ رہا ہے۔ یہ کس نے آج در دل پہ آ کے دستک دی کہ آرزو کے خرابے میں چراغاں سا ہونے لگا —— یہ بارہ پیاریوں میں گھرا قطب شہ گوری رنگت، اونچی ناک ذرا سا آگے کی جانب جھکی ہوئی، کھڑا نقشہ، باریک ترشی ہوئی مونچھیں، نشہ میں ڈوبی ہوئی آنکھیں، محبت کے سرخ ڈوروں کے جال میں گندھی ہوئی دکنی وضع کی پیچ دار پگڑی باندھے، ململ کا جامہ شبنم کا نیمچہ پہنے گلے میں کپڑا ڈالے ہاتھوں میں جڑاؤ کڑے پاؤں میں آیا شاہی وہ آن بان وہ بانکی چتون کہ ؎

ہر ایک وصف ہر یک کدھی   پین نور تن کا ایرہن
پی مدن جھلکا بدن   شہ پگ چمن کد آئے ہیں
مکھ شاب کے رنگ آب کوں   افتاب جوں ات تاب سوں
دکھلاے کر مہتاب کوں   بے تاب کر پگلاے ہیں

اور قطب شہ کے آگے ہاتھ باندھے دلیس دلیس کے حسین کہ جن کے چہروں سے شباب ٹپکتا آنکھیں جیسے موتی کوٹ کوٹ کر بھر دیئے گئے ہوں، رخسار جیسے بجلیاں پیس کر گھلی ہوئی کہ ؎

لُرباں جتے دنیا منے خدمت کریں شہ کنے   یوسف صورت نازک نمنے چوبھر کھڑے مدے ایں

اور قطب شہ ان سب سے بے نیاز کہیں دُور خلا میں نظریں جمائے اُسے کھوج رہا ہے۔ وہ جو ان سب سے زیادہ حسین ہے وہ جو سینکڑوں برس پرانی شراب کی سی تاثیر رکھتی ہے وہ جس کی پائل کی جھنکار نے معانی کے دل کے ساز پہ ملکوتی راگ چھیڑ رکھے تھے —— وہ چچلم کی رقاصہ، وہ بھاگ متی بھاگاں بھری موتیاں سے مانگ جڑی، ہاتھوں میں مہندی، پیروں میں گھنگرو، ماتھے پہ ٹیکا، کانوں میں اتہان بالیاں، چوکٹے، گلے میں موتیوں کی بدھی، بازو پہ نورتن بیج بند جہانگیریاں، ندی کنارے اس کی راہ تک رہی ہے موسیٰ ندی کے کنارے جہاں اس کا گاؤں ہے جہاں اس کا گھر ہے۔ اس کی نگاہیں دُور قلعہ کی فصیلوں پر کچھ تلاش کر رہی ہیں کچھ کھوج رہی ہیں، وہ محبت کا اوتار —— وہ اس کا پیارا —— اور قطب شہ آج اس تک پہنچ نہیں پایا۔ آج ندی میں باڑھ آ گئی —— موسیٰ کی لہریں غضبناک ہو ہو کر چچلم پہ چڑھ دوڑیں، اس کا گاؤں پانی میں گھر گیا —— لہر یکلخت —— جیسے قطب شہ کے پہلو میں کسی نے ڈنک مارا۔ وہ تلملا اُٹھا، اس نے موسیٰ کی غضبناک لہروں سے لڑنے کا فیصلہ کر لیا —— اور عشق کی اس بلاخیز کے آگے آخر موسیٰ نے ہتھیار ڈال دیئے تو ادھر ابراہیم قلی قطب شاہ نے۔ اب قلعہ اور چچلم کے فاصلے سمٹ گئے تھے اب محب اور محبوب کو ملانے کے لئے ندی کے سینے پہ پل کی کمانیں گڑنے لگیں، وہ گھنگرو اپنے قلعہ گولکنڈہ

کے ملن پر بھاگ متی نے کہا یہ کتنے مزے کی بات ہے کہ چاہنے والوں کی اس بستی؟ پھولوں کے اس دیس میں کچھ لوگ بھی
ہمہ دلعزیز شہزادہ جس کو ـــ

محمد قلی نے بھاگ نگر کی بنیاد رکھی وہ پہلا پتھر محبت کے نقش اپنے سینے پر کندہ کئے اس شہر کی نیو بن گیا
محمد قلی نے دامن پھیلا کر اپنے معبود سے دعا مانگی ـــ

میرا شہر لوگاں سوں معمور کر رکھیا جوں تو دریا میں من یا سمیع

چہلم کے موقع نے دیکھتے دیکھتے رنگ روپ بدل ڈالا، قلعہ سے سیدھی سڑک پل پر سے گزرتی چلی گئیں بھاگ متی
کے دروازے تک وہاں محبت کا مندر تعمیر ہونے لگا ـــ چارمینار ـــ جس کے چاروں طرف سے سڑکیں آکر ملتی ہیں"
اس کی سب سے اوپری منزل پر ایک وسیع و عریض مسجد اور حوض درمیانی منزل میں مدرسہ اور خانقاہ ـــ چاروں
طرف سے جو ۶۰ فیٹ عریض اور میناروں تک جس کی بلندی ۱۹۰ فیٹ قرار دی گئی ـ چاروں میناروں میں زینے باہر سے
ایسی خوش وضع کمانیں کہ اندر یہ عظیم الشان عمارت کیا کیا چھپائے ہوئے ہے کچھ پتہ نہیں چلتا ـ پتھر اور چونے میں تعمیر
شدہ یہ دنیا کا آٹھواں عجوبہ آج بھی محمد قلی کے ملک کے اس اندرونی جذبہ کی نشاندہی کرتا ہے وہ عقیدت و محبت جو اُسے
بھاگ متی سے تھی کہ اس نے اس سرزمین پر جہاں بھاگ متی کے قدم پڑے تھے خانۂ خدا تعمیر کیا کہ من و تو کے سارے حجاب
اس کے آگے سے اٹھ چکے تھے ـ وہ جان گیا تھا کہ محبت خدا ہے اور خدا محبت!

چارمینار کے چاروں طرف جو بازار سجائے گئے سنا ہے کہ چودہ ہزار دکانیں تھیں' بھانت بھانت کے اسباب
تجارت سے بھری ہوئی اور ذرا آگے بڑھئے شمال مغرب کی سمت دولت خانۂ عالی جلو خانہ کے چاروں طرف چار بلند
کمانیں کھڑی کی گئیں اور بیچوں بیچ ایک ہشت پہلو حوض، جلوخانہ کے مغرب میں محلات شاہی کی بنیاد رکھی گئی
اس طرف جو کمان بنائی گئی وہ دروازہ دولت خانۂ عالی کہلاتی تو اس کمان میں ۶۰ فیٹ بلند اور چھ فیٹ چوڑے
دو سنگ خارا کے جس کے اوپر ۳۶ فیٹ کا ایک اور پتھر رکھ کر باب عالی کی چوکھٹ تعمیر کی گئی ـ اس چوکھٹ میں
صندل، ہاتھی دانت اور سونے کا ایک دروازہ لگایا گیا ـ حضرت میر محمد مومن صاحب نے اس دروازے کے آگے ایک
پتھر کا ستون گاڑ دیا تھا جس پر ایسے طلسم وغیرہ منقوش تھے کہ جو ایک بار اس دروازے سے گزر جاتا اس پر ایک سحر طاری ہو جاتا
یہی وجہ ہے کہ آج تک اس کمان کو سحر یا طلسم کمان کہا جاتا ہے ـ

باب عالی سے اندر کی جانب آگے بڑھئے تو جنوب کی سمت دفتر خانۂ شاہی اور مغرب کی طرف جاندار خانہ اور
کارخانہ ہائے عامرہ شمال کی طرف ایک اور دروازہ ملے گا جس میں داخل ہونے کے بعد وسیع میدان جس کے چاروں طرف
لشکریوں، جلوداروں، فیل نشینوں اور شتر داروں کے لئے بڑے بڑے ہال یا ایوان بنے ہوئے تھے ـ اس سے گزرنے
کے بعد "چندن محل" کی عمارت ملتی اور پھر گگن محل جس میں خاصے تنگ عرب اور دکنی سلحدار حاضر رہتے، اس محل کی
شرقی جانب تین سو فیٹ طویل ایک ہال تعمیر ہوا جس میں باورچی خانہ شاہی کا ہے ہر قسم کے کھانے پک کر تیار
دسترخوان مجلس پر ہوتا اس شاہی دسترخوان پر پکے ہوئے کھانے ـ

سجن محل ... محلات شاہی سے ایک تھا جو شہر کے وسط میں تعمیر کئے گئے تھے اور جس کو دولت خانۂ عالی کہتے تھے۔ سجن محل کے بارے میں قلب شہ نے جو نظم لکھی ہے اس سے اس کی خوبصورتی اور دلکشی کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے۔ وہ خوبصورت عمارت چاروں طرف باغیچے میں گھیرا، صاف وشفاف پانی کی نہریں کھلی وادی جس میں جھک جھک کر اپنا چہرہ دیکھتے ہوئے، موتیا کی مہک، چنبیلی کی چمک، وہ اونچی اونچی محرابیں، شہ نشین، وسیع ایوان، پھولوں کے تختے اور ۔۔۔

سا جنی سجن محل میں مساج کر چھاں سو آئی　　جان جانی ہو کے جان کا پیالہ سو منگوں پلائی

سجن محل اسی وقت لٹ گیا جب سلطان عبداللہ کے عہد میں مغلوں نے حیدرآباد پر اچانک حملہ کیا اور بادشاہ کو محلات چھوڑ کر قلعہ گولکنڈہ میں پناہ لینی پڑی۔

خداداد محل حیدرآباد کا سب سے بڑا اور عظیم الشان آٹھ منزلہ محل تھا جس کے بارے میں قلب شہ نے اپنا ایک طویل نظم میں لکھا ہے کہ اس محل کی بلندی آسمان جیسی ہے روئے زمین پر ایسا محل کسی نے نہ دیکھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدسیوں نے اس کو زمین پر لاکر رکھ دیا ہے۔ اس کی آٹھوں منزلیں آٹھ بہشتوں کی طرح ہیں جن میں آب حیات کے چشمے بہہ رہے ہیں۔ یہ محل اتنا ہوا دار ہے کہ اس کی آٹھوں منزلوں میں دم عیسیٰ جیسی ہوائیں چلتی رہتی ہیں تاکہ دنیا کو زندگی بخش سکیں۔ اس محل میں جو نازنینیں رہتی ہیں ان کے رخسار لعل بدخشاں کی برابری کرتے ہیں۔ ان کے چہرے مشعل کی طرح روشنی پھیلاتے ہیں تو ان کے ہونٹ عقیق یمن کو شرماتے ہیں ؎

خداداد محل کروں محمد سلواسے　　تو اس میں جنت کے نگاراں نکاسے

بلندی محل کا ہے اسماں جیسا　　سورج چاند تارے سو اس تھے سنگالے

اعلیٰ محل اپنی نزاکتوں اور دلربائیوں کی بناء پر کچھ اور خصوصیات رکھتا تھا جہاں یہ گھڑی خوشی کی گھڑی ہوتی کہ

اسی محل اعلیٰ دے اعلیٰ خوشیاں اعیش گھڑی　　اعلیٰ سکی اعلا دسے جو بن کھڑی دو داں بیری

صدقے نبی اعلیٰ محل ہیں قطب شہ جم جم اچھو　　جب تک اچھیں اسماں پر چند اسور نہیر اختری

"حنا محل" میں محمد قلی ایک عرصہ تک فروکش رہا، حنا محل اس جگہ واقع تھا جہاں اب وکٹوریہ دواخانہ ہے۔ یہ وہ محل محمد قلی کے سپہ سالار امین الملک کا باغ تھا جو ندی کے کنارے سے لے کر خداداد محل اور دولت خانۂ عالی تک پھیلا ہوا تھا۔ حنا محل ایک ایسی عشرت گاہ تھی جہاں کبھی اداسی کی پرچھائیاں نہ پڑ سکیں اور اس کے لئے قطب شہ اپنے پیمبر کی مہربانیوں کا ہمیشہ مشکور رہا ؎

صدقے نبی کے قطبا جہاں محل میانے　　عشرت پکڑ بسایا صلوات بر محمدؐ

"محل کوہ طور" اس جگہ واقع تھا جہاں اب قصر فلک نما ہے۔ محل کوہ طور سہ منزلہ تھا۔ کوہ طور بہت پر فضا جگہ تھی جہاں کا سرسبزی و شادابی دیکھ کر محمد قلی قطب شاہ نے اس سہ منزلہ محل کی تعمیر کرائی اس کے ایوان وسیع شہ نشین اور کمرے نہایت پر تکلف اس محل کے سامنے اونچی اونچی کمانیں بنا کر سامنے سے صحن کو پتھر اور چونے سے ترتیب دیا گیا اس کے نیچے ایک بہت بڑا حوض ۱۵۰ فیٹ لمبا اور ۹۰ فیٹ چوڑا بنایا گیا۔ اس محل کے جلو میں [illegible]

حوض اور فوارے بنائے گئے اور نیچے سے پانی ، اوپر اس طرح پہونچایا گیا کہ تمام فواروں سے بادل کی طرح فضا میں پانی برساتے رہتے تھے۔ پہاڑ کے دامن میں تالاب بھی برجوں کی طرح عمارتیں بنائی گئیں تاکہ دوسری شاہی ضرورتوں کے کام آئیں۔

محمد قلی نے اس کی تعریف یوں کی ہے ؎

کہہ طور پر سدا ہے سبحان کا اُجالا | تو غیب سے نظر کر تی رحمان کا اُجالا
اس محل کوں سو دیکھت جھک پیاس سب بجھاؤ | جانو جھلکتا واں شہ مردان کا اُجالا
ہر اِک کنگورا اس کا جام جہاں نما ہے | ہے ہر منار پر شہ کیخسرو کا اُجالا
قطبا نبی کے صدقے آنند کر اس محل میں | بستا ہے اس میں شہر نیدان کا اُجالا

محل کوہ طور دراصل وہ شبستان تھا جہاں بادشاہ اپنی بارہ پیاریوں کے ساتھ دادِ عیش دیتے جاتے۔

"باغ محمد شاہی" غالباً اس جگہ واقع تھا جہاں اب میر عالم کی بارہ دری ، نئے پل کا دروانہ ، یوسف گنج اور چھتہ بازار واقع ہے یعنی دلی دروازہ کے جانب مغرب تو امین الملک کا باغ تھا اور جانب مشرق باغ محمد شاہی میں ایک نہایت ہی خوبصورت محل اس جگہ بنا ہوا تھا جہاں حال حال تک نواب میر عالم کی مشہور و معروف بارہ دری یعنی لکڑ کوٹھے کی عمارت تھی محمد قلی قطب شاہ کا ذوقِ تعمیر کا ذوق اتنا پختہ تھا کہ اس نے جو عمارتیں بنوائیں ، باغ لگوائے ، نہریں تعمیر کیں ان سب میں فنکارانہ چابکدستی کا کمال نظر آتا ہے۔ اس باغ میں پھولوں کے قطعے الگ ، پھلوں کے درخت الگ ، خوشبودار جھاڑیوں سے ساری فضا مہکی ہوتی۔

حیدر محل : محمد قلی قطب شاہ کی محبوبہ دلنواز بھاگ متی کی خلوت گاہ کہ جس کی زمین ، صندل جیسی ہوائیں ، خوشبو میں گندھی ہوئی چاروں طرف ڈھنڈھاتے چمن چھیر نوں کی ترل ری ، پھولوں کی کیاریاں ، پتی پتی دھلی ہوئی ، سبزہ جیسے زمرد کہ جس کے کناروں پر گل عقیق نے آگ لگا رکھی ہو یہیں دکن کی وہ نازنین رہتی تھی جس کے پیچھے یہیں نقش سے تاجدار سلطنت کی آنکھوں میں پیار کی جرت جلا رکھی تھی یہیں عشق تھا یہیں عشق تھا ، عشق کی سرگرمیاں تھیں ، عشق کی دلربائیاں تھیں ، زلفوں کی گھنیری چھاؤں میں سکھ کے سپنے تھے ، یہاں محبت تھی۔ محبت جو اتنی حسین شئے ہے کہ کہیں افق کے کسی کنارے سے ملتا ہو تو زمین و آسمان سب جگمگا اُٹھتے ہیں ، یہاں رات کی رانی کی مہک میں چمپا کلی کی خوشبو میں قطب شاہ نے بھاگ متی کی گھنیری زلفوں میں اپنا مکھڑا چھپا لیا تھا ، بھاگ متی کہ جس کے عشق نے بھاگ نگر کی بنیاد رکھی ، بھاگ نگر بھاگیہ وانوں کی بستی جو سارے ہندوستان میں خوش نصیبی کی علامت سمجھا جاتا ، بھاگ کا ابھرتے ہوئے نور میں کھلتی ہوئی دوپہروں میں ڈھلتی ہوئی شاموں میں ، چاند کے نورانی ہالے میں ، گنبد کی گھنیری چھاؤں میں جھلک جھلک قطب شاہ کے انفاس کی خوشبو مہکی ، یہ شہر جو شہر نگاراں ہے ، محبوبوں کی بستی ہے ، چاہنے والوں کا دیس ہے یہاں محبت کی سرشاری ہے ، عشق کی دنیا بکھری ہے ، وفا کا دستور ہے ، یہ حیدرآباد ہے میرا شہر میرے قطب شاہ کی بستی بقول قطب شاہ ؎

بھر تک میا ہے اپن دنیا قطب کر سب دکھن
سیسوں بنی کا نت چرن جب لگ سے تن میں جیا

مجیب خیرآبادی دکن

صبحِ فرخندہ

میرے محبوب عزیزانِ دکن کیسے ہیں
میرے ہمدم مرے یارانِ وطن کیسے ہیں
نازنینانِ چمن سرو سمن کیسے ہیں
دشت کے صحرا غزالانِ ختن کیسے ہیں
کچھ مرے شہرِ نگاراں کی خبر ہو تو بتا؟
اے صبا سوئے دکن تیرا گزر ہو تو بتا؟

بول اب کیا ہے بہاروں کے وطن کا عالم؟
یعنی اس گم شدہ فردوسِ دکن کا عالم؟
تو نے دیکھا ہے کسی رشکِ چمن کا عالم؟
نقرئی باہوں کا گلنار بدن کا عالم؟
غمزہ و عشوہ و انداز و ادا باقی ہے!
کیا پری زادوں میں کچھ بوئے وفا باقی ہے!

گولکنڈہ پہ کبھی ٹھہری تو ہوگی تھک کر!
چار مینار پہ ڈالی کبھی عبرت کی نظر!
ندیاں آج بھی دیتی ہیں صدا جا کر!
فتح میداں میں کیا تو نے کبھی رقصِ سحر!
حسنِ خوابیدۂ اصنام سے ٹکرائی ہے؟
کیا اجنتا کے در و بام سے ٹکرائی ہے؟

آصفی دور کی نکھری ہوئی اقدار بھی ہیں
زورؔ و امجدؔ کی تصانیف کے انبار بھی ہیں
لوگ دلدار بھی ہیں لوگ طرحدار بھی ہیں
دیکھنا یہ ہے کہیں صبح کے آثار بھی ہیں
اذنِ بیداریٔ احساس و نظر
کاش تو اس شبِ زنداں کو سحر

شب گزیدوں کو اجالوں کا پتہ ہے کہ نہیں
کوئی سورج کسی قالب میں ڈھلا ہے کہ نہیں
کوئی آشفتہ سر و آبلہ پا ہے کہ نہیں
پھر وہاں مجھ سا کوئی شعلہ نوا ہے کہ نہیں
محشرِ دار و رسن اب بھی ہے
دار پہ اب بھی وہاں حرفِ

اہلِ ساحل نے پیامِ دلِ طوفاں کہہ دے
اے صبا دور نہیں رحمتِ یزداں کہہ دے
پھر حسیں اور جواں ہوں گی گلیاں کہہ دے
اتنی مایوس نہ ہو منزلِ جاناں کہہ دے
صبحِ فرخندہ بہت جلد
پھر سوئے ارضِ دکن یاد

انیس قیوم فیاض

"ٹپکے ہے ہر روش سے قطب شہ کا بانکپن"

سرزمینِ دکن، ہندوستان کا وہ علاقہ جو نربدا اور وندھیاچل کی جنوبی سطح مرتفع ہے، یہاں آپ ہم سبھی رہتے ہیں ـــ یہی علاقہ کبھی سلطان محمد قلی قطب شاہ کے خوابوں کا شہر تھا۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ گولکنڈہ کی سلطنت کا پانچواں عظیم المرتبت بادشاہ گذرا ہے۔ قدرت نے اسے سلطنتِ دکن کے علاوہ سلطنتِ سخن کی بھی بادشاہت دی تھی۔ وہ پہلا صاحبِ دیوان شاعر ہے۔ جس کا ضخیم کلیات خود اس کی منظوم سوانح حیات ہے اور اپنے عہد کی تاریخ بھی۔ جس کے ذریعہ اس زمانے کے تہذیب و تمدن، رہن سہن کے طریقے، عید اور تہوار، موسم، حاکمِ سلطنت کی رواداری، مذہب پرستی، وطن دوستی پر روشنی پڑتی ہے۔ اور آج بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ قلی قطب شاہ نے جو روایتیں چھوڑی ہیں اس کا عکس سرزمینِ دکن کی ہر روش سے ٹپکتا ہے۔ وہی دکن جس کے تعلق سے کہا گیا ہے

دکھن ملک کوں دھن عجب ساج ہے   کہ سب ملک سر ہور دکن تاج ہے

ـــ اس نے ملنساری، رواداری، منصف مزاجی، اور بے تعصبی سے حکمرانی کی۔ وہ رعایا کو محبت کی نظر سے دیکھنے کا عادی تھا اور اصحابِ علم و فن، ماہرینِ سیاست کا قدرداں۔ اپنی حکمرانی کے طویل عرصہ میں اس نے علم و ادب کی تشنگی بخش توسیع کی۔ اس کا اظہار اس وقت کے اور آج کے تمام مورخین نے کیا ہے۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ نے علم کی ترقی اور تعلیم کی وسعت کے لئے جو کوششیں کیں وہ ناقابلِ فراموش ہیں۔ جو بھی علمی ذخیرہ دستیاب ہوا ہے اس کی علمی شغف اور سرپرستئ علم کا شاندار کارنامہ ہے۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کی علمی سرپرستی کی روئیداد معلوم کرنے کے لئے صرف ایک ایسے واقعہ کا تذکرہ کرنا کافی ہے۔ جو ایک شاعر کی زبانی ہے۔

"مجسمِ خلق امین خان نے مجھے اپنے قریب بیٹھنے کی عزت دی، میرے جسم پر خوشبو لگائی۔ ایک نہایت قیمتی کیسری رنگ کا شال میرے کاندھوں پر ڈالا گیا اور جواہر کا ایک ڈبہ جس میں کئی یاقوت تھے مجھے دیا گیا، اور اس کے بعد نظم سنانے کی فرمائش کی گئی۔"

شعراء کو ہمیشہ بادشاہ کا تقرب حاصل رہا۔ کیونکہ ان کے بلند پایہ نتائج، افکار و تخیل کی بلندی، خیالات کی گہرائی، اسلوب کی جدت اور بیان کی پاکیزگی، لطافت اور شستگی نے دکنی ادب کے ہر صنف میں چار چاند لگا دیئے تھے۔

قلی قطب شاہ نے اپنی شاعری کے ذریعہ اس زمانے کے سماجی اور تہذیبی حالات، رسم و رواج، مراسمِ شادی بیاہ، عید بقرعید، شبِ برات،

بسنت نوروز، سالگرہ وغیرہ کی صحیح عکاسی کی اور انہیں اہتمام سے منانے کی روایتیں ڈالیں۔

شاعری کے بعد فنون لطیفہ کی دوسری شاخ مصوری اور نقاشی ہے۔ اور فن تعمیر میں مقبولیت اولین شرط ہوتی ہے۔ چار مینار میں موجود ہے۔ اس میں شکوہ اور سطوت کے ساتھ پاکیزگی اور روحانیت بھی ہے محرابوں میں ایک بانکپن اور مینار کے کنگروں میں ایک ندرت۔ تعمیری قدروں کے لحاظ سے کوئی مقبرہ یا مسجد، کوئی ایوان اس کی شانِ رعنائی کو نہیں پہونچ سکتے۔ کسی نے چار مینار کے تعلق سے کہا:

عظمتِ خوابیدہ کے اے پاسباں گم شدہ منزل کے میرِ کارواں،
تیرے ہر ذرہ سے عظمت آشکار تیرے چہرے سے عیاں عزّ و وقار
جیسے اک تارہ اندھیری رات میں جیسے جگنو موسمِ برسات میں

بھاگ متی سے اس کی محبت کی یہ یادگار صدیوں سے دلوں کی تسخیر کا علامتی نشان رہی ہے۔ اس نے حسن کو بہت قریب سے دیکھا، تجربات نے تو اس کے جمالیاتی شعور اور حس کو بیدار کر دیا تھا۔ اس نے خود ہی اکثر جگہ کہا ہے کہ فن شاعری میں اس نے جو کمال حاصل کیا وہ عشق کا کرشمہ ہے۔ اس نے زندگی میں عشق کی اہمیت کو محسوس کیا اور ایک ناقابلِ تسخیر قوت اور عظیم دست قرار دیا۔

نہیں عشق جس وہ بڑا کوڑ ہے کدھیں اس سے مل بیٹھیا جائے تا

مختلف عمارتیں مختلف جذبات پیدا کرتی ہیں۔ چنانچہ چار مینار کی عمارت بھی ایک جذبہ پیدا کرتی ہے۔ جذبۂ محبت اور جذبۂ رواداری۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ اس نے بھاگ متی جیسی عام سی لیکن حسین عورت کو قطب شاہی سلطنت کی ملکہ بنایا۔ اور اپنے دل میں جگہ دی۔ اس کی ہر روش میں رواداری کا جذبہ نمایاں نظر آتا ہے۔

اسلامی اصول اور عقائد کے لحاظ سے جانوروں کی تصویریں بنانا منع ہے۔ لیکن شاہ کی رواداری نے ان اصولوں سے بھی ا
چنانچہ اکثر عمارتوں کے دروازوں اور محرابوں پر مور اور شیروں کی تصویریں ملتی ہیں۔ گنڈ بھیرنڈا۔ ہندو معتقدات میں بہت ہی پوتر مانا جاتا ہے یہ ایک عجیب الخلقت پرند ہوتا ہے جس کے دو سر، تین آنکھیں ہوتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ ہاتھیوں تک کو چونچ میں دبوچ سکتا ہے۔ چنانچہ اس قسم کے پرندے کو بھی اکثر عمارتوں پر ہاتھیوں پر ٹوٹتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اپنی وسیع المشربی کی اس سے بہتر مثال اور کیا ہو سکتی ہے؟

شاہی محلات کی وسعت اور کشادگی خود حکمرانوں کی وسیع القلبی کی غماز ہوتی ہے۔ چنانچہ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے زمانے میں محلات کی دوسری تیسری منزل پر بھی چمن بندی کی جاتی تھی۔ ان کے کھنڈر آج بھی موجود ہیں اور زبانِ حال سے اپنی داستان دہرا رہے ہیں۔ ان عمارتوں کی بلندی پر پانی پہونچایا جاتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قطب شاہی حکمرانوں کو اونچے اونچے مقامات تک پانی پہونچانے سے خاص دلچسپی تھی۔ چنانچہ چار مینار کے اوپر جو مسجد ہے وہاں نل کے ذریعہ پانی اوپر پہونچانے کا انتظام تھا۔ گوشہ محل کا حوض اب تک موجود ہے۔ جس میں ہمیشہ پانی بھرا رہتا تھا اور خواتین کشتی رانی کرتی تھیں۔

رہن سہن کے بعد لباس کی صراحت کی جاتی ہے۔ قطب شاہی دور میں محمد قلی قطب شاہ وہ پہلا شخص تھا جس نے خاندانی روایات کو چھوڑ کر دکن کے ہندوؤں کا لباس زیب تن کر لیا تھا۔ پوستین اور تاتاری قبا کے عوض ململ جامہ اور ریشم کا نیمہ پہنا تھا، جڑاؤ کپڑے پہنتے۔ اس زمانے میں دلہنوں کیلئے پشواز اور چو حاشیہ اور تنگ پاجامہ ہوا کرتا تھا۔ جو آج بھی دکنی دلہنوں

ہے۔ اسباب سنگھار میں پان، مسی، مہندی خصوصیت کی چیزیں ہیں۔ مختلف طریقوں سے چوٹی اور جوڑے بنائے جاتے، قسم قسم عطر استعمال ہوتے جن کی مہک دور تک جاتی تھی۔

یہی قطب شاہی بادشاہوں کی رواداری کی بہترین مثال ہے کہ ان کے بادچی خانوں کے افسر اکثر ہندو ہوتے۔ ہندو اصحاب پر اعتماد کیا جاتا تھا۔ کھانا سلیقہ سے کھلایا جاتا، شادی کی تقریبات مجے، ساچق، مہندی، عقد خوانی، چوتھی، ولیمہ، جمگی کی تقریبات بہت اہمیت دی جاتی۔ محرم میں خاص انتظامات ہوتے، بے گوشت کی غذا کھلائی جاتی اور عاشور خانوں کو زینت دی جاتی۔ چینی اور تام چینی برتن استعمال ہوتے۔ ماہ ربیع الثانی میں نیازوں کا سلسلہ جاری رہتا۔ مسلمان ہی نہیں ہندو اصحاب بھی نیاز کرتے، اور اپنی عقیدت کا اظہار کرتے تھے۔

سارے کے سارے حکمراں شیعہ عقائد کے سختی سے پیرو تھے۔ لیکن قلی قطب شاہ کے عہد میں ان عقائد کو کافی فروغ حاصل ہوا۔ ان کے نئے خد و خال ابھرے اور کئی نئی روایات نے نشو و نما پائی۔ چنانچہ پروفیسر عبدالمجید صدیقی لکھتے ہیں "گولکنڈے کے بادشاہوں میں اتنا خوش ذوق شاعر جس کو زندگی کے ہر پہلو سے مس ہو، نہیں پیدا ہوا ـــ دکن کی ادبی تاریخ اس پر جس قدر بھی ناز کرے کم ہے"۔

(یوم محمد قلی کے ادبی اجلاس میں پڑھا گیا)۔

محمد قلی قطب شاہ معانیؔ

دکھن کی پتلی

سدا انکھیں مست کرتی ہے نین ستیں نین پتلی	کہ بالی غمزے کے پیالے پلاتی ہے یوں پتلی
مین سوں صبر کر کہتی، کروں اب صبر میں کیتا	نین جوتے ہیں روشن دیکھتی توں ہے گگن پتلی
سجنواں کشتی منے میں یوں رہیا جیوں نوح کشتی میں	پرت دریا منے پایا پری ایسی رتن پتلی
نین کے حوض میں تیری نوی چالیاں سوں تیرتی ہے	نین عاشق ہیں دیکھن کے بچن سینے کرن پتلی

نبی کے صدقے سر تھے جیتیا ناداں بالی کوں

انند اس سوں ملی قطب زماں تے تیں دکن پتلی

رشید احمد

معانی کی شاعری پر ایک ناقدانہ نظر

شہنشاہ اکبر اور بادشاہ عباس صفوی کا ہمعصر سلطان محمد قلی قطب شاہ معانی اپنے والد ابراہیم قطب شاہ کی وفات پر بارہ سال کی عمر میں سریر آرائے سلطنت ہوا۔ جلد ہی اس نے ابراہیم عادل شاہ والیٔ بیجاپور سے صلح کر لی اور اپنی بہن کا نکاح اس کے ساتھ کر دیا۔ اس طرح بساطِ سیاست کی ذہنی الجھنوں سے چھٹکارہ پانے کے بعد معانی نے اپنی تمام تر توجہ انتظامِ سلطنت کے ساتھ ساتھ شعر و شاعری، فنونِ لطیفہ کی سرپرستی، رعایا پروری اور علم نوازی پر مرکوز کر دی۔

محمد قلی قطب شاہ اردو زبان کا ایک بلند پایہ اور دکنی زبان کا وہ پہلا صاحبِ دیوان شاعر ہے جس کا ضخیم کلیات "گنجینۂ سخن" بھی ہے اور اپنے عہد کی تہذیب و تمدن و معاشرت کی زندہ جاوید تاریخ بھی۔ ۱۰۲۵ھ میں اس کے بھتیجے اور داماد سلطان محمد قطب شاہ (ظل اللہ) نے اس کے کلیات کو مرتب کیا۔ ڈاکٹر زور نے سلسلۂ اشاعتِ مخطوطاتِ سالار جنگ کی جانب سے شائع کیا۔

محمد قلی قطب شاہ کا ضخیم دیوان اٹھارہ سو صفحات پر مشتمل ہے تقریباً سارے اصنافِ سخن کا احاطہ کرتا ہے۔ اس میں مثنوی، قصیدہ، مرثیہ، غزل اور رباعیات سب ہی ملتی ہیں جو نہ صرف اس کی متنوع شخصیت کی نشاندہی کرتی ہے بلکہ اس کی قادر الکلامی اور پُرگوئی کی بھی شاہد ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنے کلام (۹) تخلص استعمال کئے جن میں سے دو زیادہ مشہور اور ایک دوسرے سے مختلف ایک معانی اور دوسرے قطب۔ دکنی میں وہ معانی اور فارسی میں قطب شاہ تخلص کرتا تھا۔ اس کے کلیات کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کوئی پچاس ہزار سے زیادہ اشعار کہے تھے۔

محمد قلی قطب شاہ کو شعر و شاعری کے علاوہ دیگر فنونِ لطیفہ سے بھی بہت شغف تھا فنِ تعمیر سے اس کی دلچسپی کی مظہر دو مشہور عمارتیں "خداداد محل" اور [illegible] و خسروی [illegible] گولکنڈہ سے کچھ فاصلہ پر اپنی محبوبہ "بھاگ متی" کے نام سے بسایا گیا وہ شہر جو پہلے بھاگ نگر پھر کچھ عرصہ بعد حیدرآباد سے موسوم کیا گیا۔ آج بھی اس کی نیک نیتی، خلوص اور پُر اثر دعاؤں کا جیتا جاگتا نمونہ ہے ـــــ

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر ؛ رکھیا جیوں تو دریا میں من یا سمیع

اس کے دربار و دربار میں بڑے بڑے صاحبانِ کمال اور استادانِ فن اس کی داد و دہش اور قدر دانی کا حال سن کر آتے اور اس کی فیاضی سے مستفیض ہوتے تھے۔

معانی دوسرے حکمرانوں کی طرح شاعروں میں بھی اس کی اُفتادِ طبع کچھ اس طرح کی روش پر چلتی ہے۔ تاہم اس کا فخر کرنا کہ "کلام الملوک ملوک الکلام" کی آئینہ داری ہو تو یہ ایک حقیقت ہے کوئی شاعرانہ تعلّی نہیں ـــــ

کرتے ہیں دعویٰ شعر کا سب اپنی طبع سوں ؛ بخشا فصیح شعر معانی کے تئیں خدا

اگرچہ [illegible] شاعری میں [illegible] صد رنگا" اور "نقش ہائے رنگا رنگ" کی صورت ملتا ہے لیکن اس نے اپنی شاعری کو

صرف عشق و محبت، حمد و نعت، مرثیہ و منقبت تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ انسانی معاشرت، فطرت، عورت، ماحول اور مقامی رنگ پر بھی انہوں نے بڑی نظر ڈالی ہے۔ اُس دور کے رسم و رواج، عید برات، دن تہوار پر طبع آزمائی سے اس کی وسعتِ نظر کا اور وسیع المشربی کا ثبوت ملتا ہے۔

وہ عشق و محبت کے ہر کوچہ و بازار سے گزرتا ہے اور اس کا خریدار بھی بنتا ہے۔ مظاہرِ قدرت اور مناظرِ قدرت کی رعنائیوں میں کھو گیا ہے، رسم و رواج اور تخت و تاج کی مسرت زائیوں میں بھی بے خود رہا ہے۔ اُس نے موضوعاتِ عشق کو "دیوانِ معانی" میں اس طرح سمیٹا ہے جیسے غنچہ کی مٹھی میں گلشن اور دانے کی گرہ میں خرمن۔ اس کی شاعری دراصل حدیثِ دل و دلبری کی تفسیر ہے۔ بستر و دلبرا، حدیث و دیگراں تخیلِ وہ فارسی شاعری کا متتبع ضرور ہے لیکن مقلدِ محض نہیں۔ اس کی افتادِ طبع تقلید کی حدود کو توڑ کر آزادروی اور جدت کو اپناتی ہے۔ اُسی کا مشاہدہ ہر شئے میں جمالِ یار دیکھتا ہے۔ عشق اُس کی رگ رگ میں سمایا ہوا تھا۔ یہی اس کی شخصیت و شاعری کا مرکزی نقطہ ہے۔

حرف و صوت کی جنت سے جب طبیعت اُکتا جاتی ہے تو وہ عود و چنگ تک "ایوانِ سرود" میں پہنچتا ہے۔ یہاں کی کیف زائیوں سے جی بھر جاتا ہے تو پھر "خشت و سنگ" کی دنیا سے بے نور کی رنگ آمیزی کو نکلتا ہے۔ چاہت ہو کہ شاعری، نقاشی ہو کہ مصوری، فنِ تعمیر ہو کہ تزئین سب اُس کی پُرکشش شخصیت کے بے ساختہ مظہر ہیں۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاعری اس نے کی نہیں، شاعری اس سے ہو گئی ہے ع۔ خوش باش دمے کہ زندگانی اینست۔ اُس کا مسلک ہے۔ وہ زندگی کو عیش و نشاط اور راگ رنگ میں گزارنے کا قائل ہے کہ زندگی کی رنگینیوں سے اُسے عشق تھا۔ زندگی کی سنگینیوں سے اُس کا سینہ شقّ نہ تھا۔ عمر خیام کی طرح وہ "آج اور اب" کا قائل ہے وہ "شئے باقی" اُدھار کرنے والا ساقی نہیں۔ زندگی میں حاصل ہونے والی ان نعمتوں سے لطف اندوز ہونے ہی کو وہ حاصلِ زندگی اور عینِ عبادت سمجھتا تھا اور جب قدرت اس پر بارانِ رحمت بن کر برستی اور انعام و اکرامِ ایزدی سے نوازتی ہے تو وہ بارگاہِ رب العزت میں اپنا سر جھکاتا ہے اور طرح طرح سے شکرانے بجا لاتا ہے۔ کبھی دربارِ مصطفوی میں سرِ نیاز خم کرتا ہے۔ کبھی سرکارِ مرتضوی میں ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہے ۔۔۔ ع "نبی صدقے علی حیدر۔ پیاری" الخ

۔۔۔ اور یہی سب کچھ اس کی شاعری کا نچوڑ ہے۔

اُس کے فکر و نظر کی جولانگاہ "عشق" ہے جو "وجدان" کی سطح تک بھی نہیں پہنچ پاتا۔ سرحدِ ادراک سے پرے اُس کے تخیل نے کبھی جست پرواز نہیں کی۔ وہ بہ یک وقت عاشق بھی ہے اور معشوق بھی، طالب بھی ہے اور مطلوب بھی، ساقی بھی ہے اور متوالا بھی! ہندی شاعری کی روایات کا سہارا لے کر جس میں اظہارِ عشق عورت کی جانب سے کیا جاتا ہے اس نے معشوق کو عاشق کا روپ دیا اور عاشق کو معشوق کے لباس میں پیش کیا۔ ہمدم و مونس، رقیب و حبیب کی بجائے سکھی و سہیلی، سوکن و سوتن اور ہجر و فراق کی جگہ بِرہ و برہن کے راگ الاپے ۔۔

پیا کس سے گنوائی رات ساری ؎ تمن انکھیاں میں پائی ہے خماری

چاہت اور عشق کی یہ افزونی "من تو شدم تو من شدی" کا کلمۂ مختتمہ ہو یا نہ ہو اس کا ضمیر دلیل اُس کی نشاط انگیز حیات بھر پور غماز ہے۔ اُس کی تصنیف میں نگاہیں ہم بزم کی متلاشی اور مجاز میں حقیقت دیکھنے کی عادی نہیں یا نہیں اتنا ضرور ہے کہ اُس نے "سہاگ کی ساری" کی بجائے "پیالیوں" کی شکل میں اپنے پاس جمع کئے۔ تمن "ساتوں" پیاری وغیرہ یہ سب شاید محض کرشن کی گوپیاں جو رادھا کا سہاگ حاصل کر سکیں ۔۔

موہن لال من کی پیار بھری ہے ؎ اُنکھ چھیلاں میں جوں چھیل بھاری ہے

شعری [illegible] تھا بلکہ ذریعۂ نشاط! اس کا عشق بھی [illegible] قدر دانی کا حامل نہ تھا بلکہ محض اقتضائے شباب [illegible] اور حسن [illegible] دیکھ پاتا۔ اس کے ہاں صرف مسرت کا ذاتی طریقہ [illegible] بیشتر شعراء کے ہاں پائی جاتی ہے [illegible] میر کے "شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے" [illegible] "ظلمت کدے میں" [illegible] ناز سا پرزادہ [illegible] انتقام لینے اور حصول [illegible] میں ہمیشہ دستی کرنے کیلئے [illegible] غالب کا "بارگاہِ تخیل تک پانی باقی تھا۔ حتیٰ کہ ایک فا[illegible] قبولیت پسند شاعر [illegible] کی رعنائیوں اور [illegible] سے محفوظ نہ رہ سکا۔ لیکن میر، غالب اور فانی کے برخلاف اس شاعر کا صرف لفظ [illegible] خارجیت کے زیر اثر شعری پیکر تراشتی ہے جس میں داخلیت کا کوئی اثر نہیں کیونکہ وہ ایک مجسمہ سا [illegible] سے جسم کو [illegible] دیکھ سکتا اور حسن کا [illegible] مادی وسائل کے بغیر نہیں کرسکتا۔ یہ مادی وسائل الفاظ کی جادوگری ہے ان وسائل سے وہ شعری پیکر تراشتا ہے اور اپنی رنگ ریزیوں اور خوش فعلیوں کے نقش و نگار ابھارتا ہے۔

غرض [illegible] گری بھی یقیناً شاعری ہے اور اس قسم کی شاعری میں اس کا کوئی ہمسر نہیں ؎

[illegible] سے خالی نہیں
اپنے شاہوں کو یہ امت بھولنے والی نہیں (اقبال)

●

محمد قلی قطب شاہ معانی

سانولی

میری سانولی من کی پیاری دیسے — کہ رنگ روپ میں کوئی ناری دیسے
شبے سب سہیلیاں میں بالی عجب — سرو قد ناری اُتاری دیسے
سکیاں میں ڈولے نہہ بازی سوں جب — او مکھ جوت تھے چند کی خواری دیسے
توں سب میں اُتم ناری تج سم نہیں — کوئل تیری بولاں تھے ہاری دیسے
تیری چال نیکی سبھی من کوں بھائے — سکیاں میں توں جوں پھل بھاری دیسے
بہت رنگ سوں آپ رنگیاں سکیاں — ولے کاں ترے رنگ کی ناری دیسے

نبی صدقے قطبا پیاری سدا
سہیلیاں میں زیبا تمہاری دیسے

محمد عبدالکریم ماہر حیدرآبادی

شہر حیدرآباد

تی کھڑکیوں، خاموش دروازوں کا شہر
ے میٹھے بول، خواب انگیز آوازوں کا شہر
رصدا ہے کیف افزا ہر فضا فردوس گوش
شق کی سرمستیوں کا حسن کے رازوں کا شہر
ت کا گہوارہ، ایثار و وفا کا گلستاں
مدفن، علم و ادب کے گہرافشانوں کا شہر
دوارے، مسجدیں، مندر، کلیسا جابجا
مہ، اذاں، ناقوس اور گھنٹوں کی آوازوں کا شہر
ے گوشے میں یہاں کاشی، بنارس، ہر جگہ
ہے گیلانوں کا تبریزیوں کا شیرازیوں کا شہر
گلیاں، بارہ دریاں، ذاکرِ بارہ امام
ار بارہ کھڑکیوں، بارہ ہی دروازوں کا شہر
یں حاکم قطب شہ کا عدا محل یادگار
، حیدر محل کے جیسی شہ نازنیں کا شہر
رمن، شاہ راجو اور میر یوسف شریف
شرف الدین سے قرآں کے [illegible] کا شہر
یہ اس کی ہیں آصف [illegible] شاہجہاں
ہے گنگا تاج محلوں [illegible] کا شہر

اس کا ہر مینار، انگشتِ شہادت سر بسر
ارضِ کثرت پہ یہ ہے وحدت کی سطوتوں کا شہر
چار مینار اس کا مشہد، کوہِ مولا ہے نجف
سبز گنبد اور سیہ محل کے اعجازوں کا شہر

آج ماہر جیسی ناخواندہ مہماں ہوں
[illegible] کا شہر

جوہر ہاشمی

گولکنڈہ

دمک رہا ہے ابھی کوہ نور دنیا میں
جہاں میں آج بھی لاڈلی کا نام زندہ ہے
دلوں میں بھاگ متی کی وفا کی خوشبو ہے
قلی قطب کی نگاہوں کا نور پھیلا ہے
کھڑا ہوا ہے جو بوڑھا درخت صدیوں سے
وہ اب بھی قصۂ ماضی پہ جھوم جاتا ہے
اسی گنکنڈہ میں ہیں اب بھی شباب کے آثار
صدائیں دیتے ہوئے در ہیں، بولتی دیوار

ابھی ہواؤں میں وہی شوخ سرسراہٹ ہے
وفا کی آج بھی خوشبو مہک رہی ہے یہاں
خلوص و عشق کے نقش و نگار باقی ہیں
زمیں ستاروں کی صورت چمک رہی ہے یہاں
چراغ عظمتِ الفت کے جل رہے ہیں ابھی
بجھا سکی نہ جسے آج تک کوئی آندھی
نقوشِ ماضی کا آئینہ بن کے رہتے ہیں
زبانِ حال سے ہر لمحہ وہ یہ کہتے ہیں!
دلوں میں پیار کے اب کوہ نور چمکاؤ
وطن کے واسطے لاڈلی کا عزم جگاؤ

ترقی کے لئے نئے نئے ذرائع اور مواقع

قدیم وندھیاچل کے جنوب میں واقع آندھرا پردیش، صنعتوں میں سرمایہ کاری کے لئے ایک مثالی اور سازگار ماحول رکھتا ہے۔ ریاست میں گزشتہ چار سال کے دوران ۴۲ کی تعداد میں بڑی اور اوسط صنعتوں کا قیام عمل میں آیا ہے جن میں ۹۰ کروڑ روپیوں کا سرمایہ مصروف کیا گیا۔ ۳۰۰ سے زائد اجازت نامے فی الوقت عمل آوری کے منتظر ہیں۔ ان میں سے ۱۹۳ پراجکٹس بالکلیہ طور نئے ہیں جن کا مجوزہ سرمایہ ۸۵۰ کروڑ روپیہ ہے اور جن میں ۶۰۰۰۰ ہزار افراد کے لئے روزگار کی گنجائش ہے۔

خود روزگار اسکیمات کے شعبے میں آندھرا پردیش کو قابل فخر مقام حاصل ہے۔ اب تک اس شعبے کے تحت ۸۰۰۰ چھوٹے صنعتی کاروبار آغاز کئے جا چکے ہیں جن کی بدولت تقریباً ۲۲۵۰۰ پڑھے لکھے بیروزگار افراد کام سے لگ گئے ہیں اور جن میں ۱۹ کروڑ روپیوں کا سرمایہ مصروف ہے۔

آندھرا پردیش انڈسٹریل ڈیولپمنٹ کارپوریشن۔ آندھرا پردیش اسمال اسکیل انڈسٹریل ڈیولپمنٹ کارپوریشن۔ آندھرا پردیش فینانشیل کارپوریشن اور آندھرا پردیش انڈسٹریل انفرااسٹرکچر کارپوریشن جیسے با اختیار ادارے ہماری ریاست میں تیز تر صنعتی ترقی پر غیر منقسم توجہ دے رہے ہیں۔

<u>باہمت اور بلند حوصلہ سرمایہ کاروں کو آندھرا پردیش میں ترقی کے لئے نئے نئے ذرائع اور مواقع دریافت کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔</u>

ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ
حکومت آندھرا پردیش۔ حیدرآباد

DIPR: No. 30/77-78/366

قند مکرر

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

ہندوستان: محمد قلی قطب شاہ کی نظر میں

محمد قلی قطب شاہ اُردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر اور اردو ادب کا سرپرست تھا۔ وہ ہندوستان کے ایک مشہور و معروف شہنشاہ اکبر کا ہمعصر تھا۔ ۱۵۶۵ء میں پیدا ہوا۔ پندرہ سال کی عمر میں ۱۵۸۰ء میں گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت کا بادشاہ بنا اور صرف ۴۶ سال کی عمر میں ۱۶۱۱ء میں فوت ہوا۔ لیکن اس قلیل مدت میں اس نے تورانی الاصل ہونے کے باوجود ہندوستان کی سرزمین پر ایسی ایسی یادگاریں چھوڑی ہیں جو رہتی دنیا تک اس کے نام کو اس ملک کے عاشق اور اہل ملک کے سچے بہی خواہ کی حیثیت سے زندہ رکھیں گے۔

شہر حیدرآباد اس نے بنایا۔ چار مینار کی عمارت اسی کے اعلےٰ تخیل کا نمونہ ہے۔ اور پھر اس نے اپنی آخری آرام گاہ جس گنبد کی شکل میں تعمیر کرائی تھی اس سے بھی ہندوستان کی محبت اور اہل ہند کے کلچر اور تمدن کا احترام آج تک نمایاں ہے۔ اس نے عام اسلامی گنبدوں سے ہٹ کر ایک ایسی وضع کا گنبد بنایا جس کا نچلا حصہ مندروں کا ہم شکل ہے اور جس سے ہند اسلامی طرزِ تعمیر کی ایک نئی روایت قائم ہو گئی چنانچہ بعد کو حیدرآباد میں مسجدیں بھی اسی طرز پر تعمیر کی جاتی رہیں۔

محمد قلی قطب شاہ نے اُردو کے علاوہ تلگو اور فارسی میں بھی شاعری کی تھی، مگر اس کا اُردو کلام ہی محفوظ رہا جو اصناف سخن کے اعلےٰ نمونوں سے معمور ہے۔ یہ کلام زبان اور موضوع دونوں کے لحاظ سے نہایت اہم ہے۔ زبان کے لحاظ سے اس لئے کہ اس میں زیادہ سے زیادہ دیسی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ دیسی الفاظ کی اسی کثرت کی بناء پر آج ارباب ہندی محمد قلی کو ہندی ہی کا شاعر سمجھتے ہیں، اُردو کا نہیں۔ موضوع کے لحاظ سے اس لئے کہ اس نے عام فارسی اور اُردو شاعروں کی طرح رسمی و روایتی موضوعوں پر نہیں لکھا بلکہ ایسے مضامین اور موضوعات پر بھی غزلیں، نظمیں اور قصیدے لکھے جن کی طرف عام شاعروں کی نظر ہی نہیں پڑتی یا پڑتی تھی تو وہ ان کو شعر و سخن کا موضوع بنانے کے قابل ہی نہیں سمجھتے تھے۔

محمد قلی نے ہندوستان کے موسموں، پھلوں، پھولوں، درختوں، تہواروں اور ہندوستانی عوام کے رسم و رواج اور رہن سہن پر بڑی عمدہ عمدہ نظمیں لکھی ہیں۔ وہ بادشاہ ہونے کے باوصف صحیح معنوں میں ایک عوامی شاعر تھا۔ وہ زندگی کے عوامی پہلوؤں پر انھیں کی طرح غور کرتا اور انھیں کی طرح دلچسپی لیتا تھا۔

حیدرآباد کو اس نے ایک ادبی گارڈن سٹی یعنی کھلے ہوئے شہر باغات کے طور پر بسایا تھا۔ اور جب اس کے ہاتھوں کے درخت پھولے پھلے اور اس نے سڑک سے گزرتے ہوئے ان کو دیکھا تو ان پھولوں اور پھلوں کی تعریف میں ایک نظم لکھی جس کے چند شعر یہ ہیں جن سے اس کی زبان اور اسلوب و ذوق کا اندازہ ہو سکے گا۔

سڑک سے باغ کو دیکھت کھلے منجہ باغ کے غنچے — ہوا اس غنچے کے باساں سے لگیا جگ مگی سارا
دِسے نا سک کی چنپا پھول دو پات چاندسا ہے — چھتر تس دیکھ اس جاگہ ہوا حیران من سارا
انداں میں شبھے سوچیوں یا پھوٹ پتلیاں میں — ہو رکھتا پیل اس انداں پہ سے چھوٹکا نین سارا

دسیں ناریل کے پھل یوں زمرد مرتباناں جوں — ہوا اس کے تاج کوں کہتا پیالہ کر دکھن سارا
دسیں جامن کے پھل بن میں دسیلم کے نمن سالم — نظر لاگے نہ تیوں میویاں کوں لا رکھیا ہے چمن سارا
صفت تجھ باغ کوں سوسن بھی کھولیا ہے دس زباں اپنی — دکھن سب سندیاں لے تیں کھلیا نرگس نمن سارا

یعنی جب میں سڑک سے باغ کو دیکھتا ہوں تو ایسے لگتا ہے غنچے نظر آتے ہیں جو کہ خوشبو سے سارا جہاں مہکا رہے ہیں۔ ایسے چمپا کلی کے پھول ناگ کی طرح اور اس کی پتیاں جھومتے ناگ کی طرح ہیں۔ اور سبزہ اژدہا کی طرح نظر آتا ہے۔ جس کو دیکھ کر میرا دل حیران رہ جاتا ہے۔ انار دل نہ ہے دانے ایسے نظر آتے ہیں جیسے کہ ہیرے کی ڈبیوں میں یاقوت۔ ناریل کے پھل زمرد کے مرتبان نظر آتے ہیں۔ ان کے تاج کو سارا دکن پیالہ کہتا ہے جامن کے پھل ایک سالم نیلم کی طرح ہیں اور ان کو اس لئے باغ میں لگایا گیا ہے کہ چمن کو نظر نہ لگے۔ اس باغ کی تعریف کرنے کے لئے سوسن بھی اپنی دس زبانوں کے ساتھ کھلے ہیں اور نرگس کے پھول دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے سارے دکن کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں۔

ہندوستانی پھلوں اور پھولوں پر محمد قلی نے اسی طرح متعدد نظموں میں اظہار خیال کیا ہے۔ ہندوستان کے موسموں، برسات، گرمی اور سردی پر بھی اس نے کئی نظمیں لکھی ہیں۔ خاص کر آغاز موسم برسات پر تو اس کی پندرہ نظمیں بڑی بلند پایہ اور دلچسپ ہیں۔ دکن میں جس دن بارش شروع ہوتی ہے اسے آج بھی مرگ کا دن کہتے ہیں۔ اور مرگ لگنا یعنی بارش شروع ہونا ایک تہوار ہے جسے عوام و خواص سب دھوم دھام سے مناتے ہیں۔ محمد قلی بھی یہ تہوار بڑے شوق سے مناتا تھا اور اس تہوار کو اپنی نظموں میں مرگ سال آنے کے نام سے یاد کرتا ہے۔ مثلاً ؎

سہیلیاں مرگ سال آیا ہوا سوں — گرجنا اس کا سہتا ہے ادا سوں

مرگ سال آئیا سر تے مرگ نینی سنگاراں کر — حیرت مانک جھومیتاں لعل موتیاں لے کے دھالاں کر

محمد قلی نے ہندوستان کی برسات کی تفصیلات جی کھول کر بیان کی ہیں۔ ایک نظم میں لکھتا ہے۔ (نظم کا خلاصہ) "آسمان پر فرشتوں نے مرگ کے مہینے کو رخصت دی اور اس خوشی میں سمندر کے موتیوں کو آسمان سے برسایا جن سے ہمارے صحن بھر گئے۔

زمین نے سر پر جواہر کی پگڑی باندھی اور رنگ میں کانچ کے رنگ کی چولی پہن لی۔ لعل یمن جیسی بیر بہوٹیاں تمام ملک میں نکل آئیں۔

ہر طرف ہرے بھرے جنگل دیکھ چاروں طرف سے مور کوک رہے ہیں ہرے جنگل میں لال لال پھول نہیں ہیں بلکہ زمرد کی لگنوں میں شبنمی تیل سے شمعیں جل رہی ہیں۔

اس تازگی و طراوت کو دیکھ کر موہنیاں اپنے خوش رنگ جسموں پہ رنگ برنگ کے لباس اور زیور سجائے ہوئے اپنے جوبن کی بہار دکھاتی ہوئی ناز و انداز کے ساتھ محو خرام ہیں۔

ہوا کا نظارہ کرنے کے لئے مست سہیلیوں نے شراب پی لی ہے اور چنبیلی کے جھولوں میں جھومتے ملہار کے گیت گاتے پھر رہے ہیں بارش کا موسم آیا اور کلیوں کا راج شروع ہو گیا۔ اب ہری ہری ڈالیوں کے سروں پر پھولوں کے تاج پہنائے جائیں گے۔

مینہ کی بوندوں کا پیالہ ہاتھ میں دیکھ کر ہر مہ جبیں نہایت ناز و نخرے کر رہی ہے
جسم شدت کی وجہ سے لرز رہے ہیں اور جوبن کپکپا رہے ہیں۔ پیا کا چہرہ دیکھ کر چولی خود بخود پھٹی جا رہی ہے
چاروں طرف گرج کی آواز سنائی دیتی ہے اور مینہ برستا ہے۔

عشق کے ترانوں سے موزعوں نے چمنوں کو معمور کر دیا ہے۔

محمد قلی نے اسی طرح موسم سرما پر بھی لکھا ہے۔ وہ اس نظم کو اس طرح شروع کرتا ہے ؎

بھاآئی ہے لے کے ٹھنڈ کالا — پیا بن ستاتا بدن پالے بالا
لے سیتل ہوا ٹھنڈ لگے نین پیا بن — گھر سیجہ کنٹھ لاکر سے جنجہ ہالا

ہندوستان کے مشہور تہوار بسنت پر بھی اس نے کئی نظمیں اور قصیدے لکھے ہیں جن میں بسنت کھیلنے اور اس تہوار سے لطف اندوز ہونے کے رنگا رنگ مرقعے پیش کئے گئے ہیں۔ یہ نظمیں موضوع کی مناسبت سے بہت رنگین اور شوخ ہیں۔ ایک نظم میں وہ اس قسم کے خیالات ظاہر کرتا ہے۔

تیرے مندر میں بسنت سعادت کی خبر لے آیا۔ اس کے آنے سے میری آنکھوں کا چمن پھولوں اور پھلوں سے معمور ہو گیا۔

بسنت کے پھول نے دوسرے تمام پھولوں کو مہمان بن کر آنے کی دعوت دی اور اس تقریب میں گلاب کو پیالہ بنا کر خدمت کرنے کی غرض سے لے آیا۔

بسنت کی روشنی سے تمام دنیا میں پھول کھل گئے اور آسمان پر لال رنگ چھا گیا۔ سورج کا دستہ پہ بسنت ہی کا رنگ جھلکتا ہے اور چاند کے حوض کو بسنت نے چندن بھر کے جھکا دیا ہے۔

بسنت کی وجہ سے ہر گھر میں موتیوں اور یاقوتوں کے انبار لگ گئے اے معانی خدا کا شکر بجا لا کر تیرے مندر میں رات اور دن خوشی اور آنند کے ساتھ بسنت منایا جاتا ہے۔

ہندوستان کے موسموں اور تہواروں کے ساتھ ساتھ محمد قلی یہاں کے رسم و رواج اور کھیل کود میں بھی ذاتی دلچسپی لیتا تھا۔ ان سے متعلق اس نے اپنی نظموں میں دلچسپ تفصیلات محفوظ کر دی ہیں۔ ہندوستانی شادیوں میں مہندی اور جلوے کی جو رنگا رنگ رسمیں ہوتی ہیں۔ ان کی بعض کی نظموں میں بیان کی ہیں جن کے مطالعے سے دولہنوں کے بناؤ سنگھار اور محفلوں کے تکلفات واضح ہوتے ہیں کہ کس طرح ایک طرف بڑے اہتمام سے جلوے کا تخت سجایا جاتا تھا۔ چوکیوں کو چاروں طرف سے موتیوں سے آراستہ کیا جاتا تھا۔ مشاطائیں دلہن کے ہاتھوں اور پاؤوں کو مہندی لگاتیں۔ کنول کلیوں کے ہار گوندھے جاتے۔ سہیلیوں کو بھی مہتروں کے کنارے کی ساڑھیاں پہنوا دی جاتیں۔ سات سہاگنیں مل کر ان کے بالوں میں تیل لگاتیں، کنگھی کرتیں چوٹی گوندھتیں۔ مانگ میں موتی پروتیں، پیشانی پر چاند کا ٹیکہ لگایا جاتا۔ آنکھوں میں کاجل اور سرمے کے خط کھینچے جاتے۔ مہین کپڑے کا ایسا زریں لباس پہنایا جاتا کہ جسم اس میں سے جھلکے لگتا غرض اسی طرح آراستہ و پیراستہ کر کے سات سہاگنیں دلہن کو جلوے کے تخت پر لا کر بٹھاتیں اور اس کے سر پر سہرا اور گلے میں پھولوں کے ہار پہناتیں۔ دولہا اور دلہن دونوں کو شربت پلایا جاتا اور دونوں کے ہاتھوں میں پان کے بیڑے دئے جاتے تاکہ ایک دوسرے کو کھلائیں۔

رسم و رواج کے سلسلے میں محمد قلی نے ہندوستانی ناٹکوں اور نٹوں کے کھیل اور رقص و سرور کی مجلسوں کی جو دلچسپیاں بیان کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح زری کی مدیاں کو نوری کی طرح باندھ کر ان کے درمیان نٹ تاروں کی طرح رقص کرتے تھے۔ یہ نٹ ایسے چمکدار لباس پہنتے تھے کہ ان کا بدن سورج کی طرح چمکتا تھا کانوں میں آویزے بجلیوں کی طرح چمکتے تھے۔ وہ طرح طرح کے پھندنے رنگ کے گلوبند باندھ لیتے تھے۔ اپنے چہروں کو اس طرح بناتے کہ ان کی آنکھوں کے قریب غازہ سرمہ ایسا نظر آتا جیسے اژدہا زبان نکالے کھڑا ہو۔ ان کے ہاتھوں پر جگہ جگہ مہندی کے نقش ایسے نظر آتے جیسے ہرے ہرے پتوں میں لال پھول کھلے ہوں۔ ادا کاری کے ساتھ ساتھ یہ ایسی عمدہ باتیں کرتے کہ گویا

مانو جھوم رہے ہوں۔ قلابازیوں کے وقت ان کی پھرتی دیکھ کر لوگ چیتے کا کر بھول جاتے تھے۔ یہ نٹ بھاری بھرکم ہاتھیوں کی طرح مستی اور تنومندی دکھاتے تھے۔ ان کے قد ایسے سیدھے ہوتے جیسے تیر۔ جب وہ آہستہ چلتے تو بادل کی طرح آگے بڑھتے اور تیزی میں آتے تو ہوا بن جاتے تھے۔ یہ ایسے چنچل، چتر اور باکمال تھے کہ انسان تو درکنار فرشتے بھی ان کا کمال دیکھنے آسمان سے اتر آتے۔

ہندوستانی عورتوں کے کھیلوں میں محمد قلی نے چوکڑ کا چھو اور ڈھال ڈھکنی کے کھیلوں پر نظمیں لکھی ہیں۔ ایک نظم میں اس کا آغاز اس طرح کرتا ہے ؎

سکی تال سے منجہ خشکی کھسڑی ۔۔۔ کر ڈھال ڈھکنی کھیل کر ٹھکو کھسڑی

آخر میں ان متعدد نظموں اور اشعار کی طرف بھی اشارہ کر دینا ضروری ہے جن میں محمد قلی نے ہندوستان خاص کر دکن کی عورتوں کے سراپا لکھے ہیں اور ان کے حسن و نزاکت کی مدح سرائی کی ہے۔ اس نے ان کی خوبیوں کی بنا پر انھیں دنیا بھر کی عورتوں میں افضل قرار دیا ہے ایک جگہ لکھا ہے ؎

کالیاں گوریاں سکیاں کو جگ میں جو ہتیاں سو بسرا
کونی سام کوں دیکھت ہیں سدو بھولیا دکن میں

اس کے دیوان میں یوں تو دکن کی تلنگن اور برہمن وغیرہ حسینوں پر کئی نظمیں ہیں مگر ایک نظم کا عنوان ہندی چھوری ہے جس میں عام ہندوستانی لڑکیوں کو خراج تحسین ادا کیا ہے۔ اس نظم کے ابتدائی دو شعر یہ ہیں جن سے ہندوستانیت سے ان کی دلی محبت جھلکتی ہے۔

رنگیلا ہے انکھیاں تے تو رنگ بھری ہے ؛ سگڑ مندر سہیلی گن بھری ہے
لٹکنا من مجنے اس سہا سے ؛ وہ ہندی چھوری بہو چند ترپری ہے

(ادبی تحریریں مطبوعہ ۱۹۶۳ء سے)

●

حیدرآباد ایک عجیب و غریب شہر ہے، اس کا چپہ چپہ اپنے اندر سینکڑوں دلکشیاں رکھتا ہے اس کی تاریخ، اس کا تمدن، اس کی معاشرت اور اس کی روایات غرض ہر چیز ذوق رکھنے اور مطالعہ کرنے والوں کے لئے گوناگوں دلچسپیوں کا باعث ہوتی ہے۔ بہت کم شہر ہوں گے جہاں طرز معاشرت میں، گلی کوچوں میں، بستیوں اور محلوں میں اور خود باشندوں میں ایسا شدید "جزر و مد" اور ایسی بلند و پست "بوقلمونی" پائی جاتی ہو۔ کوئی نسل ایسی نہیں جس کے نمائندے یہاں نہ رہتے ہوں، شاید ہی کوئی زبان ہو جو یہاں نہ بولی جاتی ہو۔ ان کے محل اور جھونپڑے، بنگلے اور باغات، سڑکیں اور گلیاں اپنی اپنی طرز تعمیر اور اپنی تاریخی خصوصیتوں کے لحاظ سے اس شہر کو ایک "عجائب گاہ" بنائے ہیں۔

جتنی اس "فرخندہ بنیاد" میں ماضی کی عظمتیں، حال و مستقبل کی تابناکیاں اور جدت طرازیوں کے ہم پہلو بہت شاید ہی صوبہ بھر کی کسی اور آبادی میں پائی جاتی ہوں۔ (ڈاکٹر زور ــــ فرخندہ بنیاد حیدرآباد سے)

بادۂ کہن

سلطان محمد قلی قطب شاہ معانی (۴ اپریل ۱۵۶۶ء ـ ۱۱ جنوری ۱۶۱۱ء) دکنی اردو کا بلند پایہ اور عظیم المرتبت سخنور تھا، وہ ہر روز اُسی طرح بے تکلفی سے شعر کہتا رہا جس طرح دریا میں ہر روز موجیں اُٹھتی ہیں لیکن نہ تو دریا کی روانی میں فرق آتا ہے اور نہ موجوں کا طوفان کم ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے ؎

صدقے نبی قطب شہ یوں شعر بولے ہر دن   دریا کو روز جوں ہے موجاں کا طلوع

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ کا یہ احسان اُردو شعر و ادب اور تہذیب و ثقافت کبھی نہ بھلائے گی کہ دکنیات کے اس محقق اور عالم نے ۱۹۴۰ء میں "کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ" کو مرتب کیا اور دکن کے نامور علم دوست امیر نواب سالار جنگ نے سلسلۂ یوسفیہ کے تحت اسے شائع کر دیا۔ اس طرح اُردو زبان و ادب کی تاریخ میں کلیات محمد قلی کے سبب دو سو سال کا اضافہ ہو گیا۔

محمد قلی نے اپنے عہد حکومت میں نہ صرف اُردو اور تلگو کے شاعروں اور ادیبوں کی قدر کی بلکہ خود بھی اُردو کا ایسا شیدائی تھا کہ اس زبان میں پچاس ہزار شعر لکھے۔ گویا ۱۲ سال کی عمر کے بعد سے اوسطاً ہر روز اس نے چار پانچ شعر ضرور لکھے ہوں گے۔

مجموعی طور پر محمد قلی قطب شاہ کی زندگی کا ہر ورق عوام کی خدمت، ہندو مسلم ایکتا اور مشترکہ کلچر کی تعمیر و ترقی سے رنگین ہے ـــ ذیل میں کلیات محمد قلی قطب شاہ سے معانی کی غزلوں کا انتخاب پیش کیا جا رہا ہے ـــ (د، خ)

نزاکت حسن و دولت ہے منگے جا ہی کریں سکتا   نوایوں نوجوانی سوں سکل شاہی کریں سکتا
دیا مشرق و مغرب میں جھلک دیپن لکھا تیرا   کہ تو جلوہ فلک تھے ہے سو تا ماہی کریں سکتا
منجے سو سچ کتا بان تھے تو اخلاص لکھیا توں   ایہی خدا پر سبھی عاشق سو اک راہی کریں سکتا
زمانے کے اندھارے تھے معانی توں نکر غم جگ   پیالا بھت پیا کے پیو توں جگ شاہی کریں سکتا

○

یوسف کم سو پیارا آکا اب بکتاں غم نہ کھا   گھر ترا تمہید کا ہوگا گلستاں غم نہ کھا
ماں تو نا اُمید نہ ہو کوں جانے سرِ غیب   کیا اچنبھا پردے او حسن کھیلیں تم نہ کھا

پاتا تیرا دو اگر ہے عشق پنتھ دکھلائے گا
شاہ و رایاں تو ہے رایاں میں زرایاں غم نہ کھا
قطب شہ اس گنج فکر د قلوت دنیا منے
تھا اپنے وحدت دعا و درس قرآں غم نہ کھا

○

خبر لیا یا ہے ہدہد میرے تئیں اس یار جانی کا
خوشی کا وقت ہے ظاہر کروں راز نہانی کا
مرے جیو آرسی میں خیال تج مکھ کا سو دستا ہے
کرے او خیال منج دل میں نشانی زرفشانی کا
جھپیلے مست ساقی کے پچھیں دو نین سو مخموراں
پلا دو مٹی ہوا اب تو ہوا ہے گل فشانی کا
ہمیں ہیں عشق کے پنتھ میں دو تو عالم تے بے پروا
لگیا ہے داغ منج دل پہ سو اس ہندوستانی کا
پڑے دنبال میں میرے سو اس نینا اُلک دنبالے
خدایا عشق مشکل ہے بجرم بکھ توں معانی کا

○

خبر لیا دو کہ میرے تئیں سو آپ یہ رحمت عالم کا
نہ جانوں میں کہ او بے رحم ہے سب جگ میں آدم کا
اگر وہ ملتفت ہووے ہماری بات پر یک چھن
نواسوں میں خزینہ اس ابھر اس دل کے دو ہم کا
فقیر و ناتواں ہوا میں کہاں شاہاں کی مجلس منج
مگر آپ خیال میں دیکھوں او صحبت آب زم زم کا
پیا تج بند میں الجھا ہوا کر تا منج بند تھے
معانی کوں غلاماں میں خطاب اب دے مکرم کا

○

سکی آپی توں سائیں سمجھاؤ نا
مندر میرے سمجھاؤ کر لیاؤ نا
پیاری کا کرنا ہے من بھاؤ نا
پیا مکھ بچن نے منگل گاؤ نا
پیا ہاتھ میں ہے مرا اختیار
تمنج اپنا کیا ہے موہن بھاؤ نا
جیا نا دو تن کوں اگن رشک میں
ستانے دو تن منج سوں راؤ نا
بلانا وخت منج ہنسی بازی سوں
دو تن دیکھتے منج مندر آؤ نا
نبی صدقے قطبا توں اس چھوکری
سیں کی سر اک میں سوہلا گاؤ نا

○

صباحی او مکھ دیکھ پینا شراب
فرح بخش ساعت میں لینا شراب
ترے حسن تھے دان دے شاہ کوں
او مکھ کے عرق تھے سو پینا شراب
تری نین مستی ہو روں روں چڑھی
پرت سے بھریا جل کا لینا شراب

○

جواہر نین کہیں تج سار کا خوبی کے دکاں میں
جو آوے مول کرنے تج تو ہوے جوہری بے ہوش
عجب کچھ سحر دھرتے ہیں سکی تج نین ساحر دو
کہ تج نیناں کے سحراں دیکھ ہوے سامری بے ہوش
اگر محمود ہوا فیروز بے ہوش ہوئیں عجب کیا ہے
ہوئے تج وصف نا کر سک ظہیر ہور انوری بے ہوش
نبی صدقے قطب کوں دیا بچن اچھا ثریا سے
فلک پر لیو غزل سن سن کے ہوے مشتری بے ہوش

ملن مست، بدل مست، کچی مست، پیی مست ہوئی مست، پون مست، لگن مست، پری مست
چڑھی مست، بہی مست، ڈلی مست، رہی مست مکھا مست، سلامت، منہن مست، پری مست
کھڑی مست، اچل مست، ڈھلی مست، ادھی مست گزک مست، نقل مست، بچن مست، پری مست
پری مست، پون مست، سرا مست، ہوئی مست ملی مست، کبھی مست، رسن مست، پری مست
کھپا مست، پھلاں مست، کجل مست، کھلی مست لٹاں مست، نین مست، دکھن مست، پری مست
بلا مست، طرا مست، دھری مست، دھری مست شکر مست، چمن مست، ہنسن مست، پری مست
چولی مست، کھلی مست، کمل مست، بھنور مست قطبؔ مست، اگھے مست، نین مست، پری مست

٥

چنچل مکھ ترا دیکھ ڈھلتا شمع سو عاشق ترا ہو کے ڈلتا شمع
ترے حسن کو دیکھ شرموں سیتے عشق کے بہانے تے گلتا شمع
ترے زلف کی دکھ پریشانی کوں پڑن جوں پریشاں ہو جلتا شمع
ترے نین کا جلا دیکھ دھن! اپنے کا جلا ہونے جلتا شمع
گھرے گھر دھونڈے تج چنچل رات کوں ترے تیئں لمس ہو نکلتا شمع
بگلتے جوں ہو لے سورج سامنے تجے دیکھ دھن دوں پگلتا شمع
قطبؔ آئے جب صبح اپس کے مندھر سو تسلیم کرشہ کوں چلتا شمع

٥

ترے دو نین ہیں بد مست متوال ترے دو گال ہیں خوبی کے گلال
ترے مکھ کی نشان نیں ہیں کہ دو ناگ سلیماں کی انگوٹی کے ہیں رکھوال
بھواں تیریاں کوں لیکھے گا نقاش کماں دو کھینچتا ہے سخت اشکال
سکیاں کے پت میں دیک پیالی مدکی نہیں دیکھیا اگن کے تیں جو ستیال
تو موتی بے بہا ہے تج بہا نیں جگت کا مال ہے تیرا سو پامال
جہاں ہے سیمیا کا نقش اس تھے کہے ہیں عارفاں سب اس کو تمثال
نبی صدقے قطبؔ جم عیش کر عیش کہ تج در پر کھڑے ہیں فتح واقبال

٥

ہمارا سجن خورشن نظر باز ہے تو اس دل میں سب عشق کا راز ہے
سنوارے ہیں مجلس پیا روپ سوں مدن مطرب اس میں خوش آواز ہے
نبی صدقے قطبا پہ آنند دار علی کی تھے سدا باز ہے

حیدرآباد کے شاعر (۴)

وقار خلیل

۱۹۷۲ء میں مہاراشٹرا ساہتیہ اکیڈمی کے قدر دوں کا سلسلہ

ڈاکٹر زور، مخدوم اور جامی کی روایات کو نئی نسل کے جن سخنوروں نے حیدرآباد میں اپنے فکر و فن سے روشن رکھا ہے ان میں وقار خلیل بھی ایک ہیں۔ تقریباً تیس سال سے ان کا نام اور کام ہند و پاک کے ادبی حلقوں میں جانا پہچانا رہا ہے۔ لکھنا پڑھنا اور قلم سے رشتہ رکھنا یہ ہیں وقار خلیل کے صبح و شام اور وہ اس میدان میں قدم رو نگار کے بھی شاہد ہیں اور بے شمار اسباب اس کے بھی مارے ہوئے ہیں لیکن دھن کے پکے ہیں اور لگن سے کام کئے جاتے ہیں۔ ۱۲ جنوری ۱۹۳۰ء کو گوگی شریف (تعلقہ شاہ پور ضلع گلبرگہ۔ کرناٹک) میں پیدا ہوئے۔ پورا نام سید شاہ محمد خلیل الرحمن کرہ سوار ہے۔ والد گرامی حضرت ابوالوفا سید شاہ محمد حمید الحسینی ناتی کرہ سوار نقاتی، صاحب دیوان شاعر اور شرفائے دکن سے تھے۔ ۱۹۴۶ء سے وقار خلیل حیدرآباد منتقل ہوئے۔ چادرگھاٹ ہائی اسکول میں زیر تعلیم رہے منشی اور منشی فاضل کیا۔ ابتدا ہی سے لکھنے پڑھنے کا شوق تھا حیدرآباد کے ادبی ماحول نے جلد ہی انہیں صحافی، ادیب اور شاعر بنا دیا۔ بچوں کیلئے کتابیں ڈاکٹر زور نے لکھوائیں، ادارہ سے چھپوا کر حوصلہ افزائی کی۔ ۱۹۵۸ء سے اب تک "ادارہ ادبیات اردو" سے وابستہ ہیں۔ ان دنوں "سب رس" کے مرتب کی حیثیت سے میرا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ ہند و پاک کے ادبی اور علمی حلقوں میں اپنا مقام پیدا کر لیا ہے۔ پہلا شعری مجموعہ "شاعری" کے نام سے طباعت کے مراحل طے کر رہا ہے۔ چند دنوں سے دکنی رنگ کی غزلیں خوب خوب کہہ رہے ہیں اس شمارے میں یہ تخلیقات بطور خاص شامل کی جا رہی ہیں

(غلام جیلانی)

دکنی رنگ

اُن کے جتنے ہیں کام، خوش رہتے
شغل بادہ کہ جام، خوش رہتے
اپنی اپنی نظر کے منظر ہیں!
دوپہر ہو کہ شام، خوش رہتے
جب سے بدلا نظامِ میخانہ!
سقف و محراب و بام خوش رہتے
پھر شبِ غم سے واسطہ نہ پڑے
صاحبو! اب سلام خوش رہتے
صحنِ مسجد میں صرف اللہ ہو
میکدے میں امام خوش رہتے
اپنا ہندوستان ہے پیارے!
بھوک میں بھی عوام خوش رہتے
دکنی رنگ میں وقار خلیل
شاعر خوش کلام خوش رہتے

○

عاشقاں ہو تو روز دید کرو
خوب خوشیاں مناؤ، عید کرو
اُوندھے چالاں چلو نکو ہرگز
عاقلاں گفت ہور شنید کرو
کب تلک حالات کے بگلے شکوے
جاں بھی خوشیاں ملیں خرید کرو
پاپ کیا سے بچارے لوگاں کا
پوچھ لیئو جرم ناپدید کرو
ہر روایت قدیم سے رنگی!
حوصلہ ہے تو پھر جدید کرو
سخن کے غزلاں وقار صاحب کے
بولے اِس رنگ کو مزید کرو!

کیفِ خیال و قامتِ زلف و کمر نکو
اب یہ فریبِ چارہ گری چارہ گر نکو
جس رہگذر پہ قافلۂ جہل ہے رواں
دانشوروں کے واسطے وہ رہگذر نکو
سب کچھ لٹا کے تئے اندھیر دل کے شہر سے
زخم سحر کے بعد بھی زخمِ سحر نکو
جب زندگی بخطِ خفی سرنگوں سی ہو
شوریدگی بصورتِ برق و شرر نکو
جلتی ہوئی حیات کی ہے روشنی بہت
اب ہم کو یہ چراغ سرِ رہگذر نکو
تنہائیوں کے دشت میں ہی ٹھیک ہیں وقار
یہ شب نما سحر، یہ سراب نظر نکو

○

یو جگ کا ہے ہر اک طور نیارا رے
عجب ہے اُجالا، اندھارا رے
جو نت غم سہے، مسکرا کر جئے
وہی شہر میں اپنا پیارا رے
یہ سرکار کیسی ہے، کیا بولنا!
غریباں کے حق میں خسارا رے
جگت میں کوئی بے سہارا نہیں!
فقط اللہ صاحب سہارا رے
دکن دیس کی سانولی کے سوا
حسینانِ عالم اُتارا رے
سخن رنگ مہکے وقار خلیل
قطب شہ کی دکنی میں پیارا رے

○

سدرنگ اس عنوان کے تحت ہندو پاک کے معیاری ادبی رسائل و کتب سے مضامین نظم و نثر کا انتخاب شائع ہوا کرے گا۔ (ادارہ)

صمدانی نقوی

دکھنی لوک گیت

دکنی لوک گیت شاعری کی ایک ایسی قسم ہے جو سنگیت سے بھرپور ہے۔ سنگیت اس شاعری کا روپ ہے۔ یہ شاعری اپنی داخلی [illegible]ت میں اپنے سوا کسی اور کی محتاج نہیں۔ سُر و تال کی بندشیں بھی اس کی بے ساختگی کو متاثر نہیں کر سکتیں۔

آج کل ہم جس شاعری سے دوچار ہیں وہ قرطاس و قلم کی شاعری ہے۔ وہ گیت جو کبھی اَن دیکھے تھے، شاعروں کی یادداشت کے ذخیروں [illegible] فذ پہ اتارے گئے۔ انھیں چھاپا گیا۔ ان کی اشاعت بڑے پیمانے پر کی گئی۔ جاڑوں کی سرد راتوں میں لحافوں میں دبکے بے شمار پڑھنے [illegible]الے انھیں پڑھا اور اپنی بزمِ تصور کو ان کی مدد سے چراغاں کر لیا۔ اس طرح ہماری شاعری الہامی حدود سے نکل کر فنِ انشاء کے [illegible]دود میں داخل ہو گئی۔

قدیم زمانے میں شاعر کی ادبی استعداد اس کے دوسرے ہم نفسوں کے مقابلے میں کسی بلند سطح پر نہیں تھی۔ وہ عام مکالموں کی زبان [illegible]ت کہتا تھا لیکن اس کا بیان عام بول چال کی زبان کے مقابلے میں زیادہ رواں ہوتی تھی۔ یہ روانی اس کی علمی استعداد کے سبب نہ [illegible] اس کا وجدان اور اس کی مشق اسے روانی بخشتے تھے۔ لوک گیت کے بنانے میں صرف شاعر کا وجدان ہی کام نہیں کرتا۔ وہ تو سماج [illegible]ے مرہ زندگی کے بطن سے پیدا ہوتا ہے اور ضرورت کے مطابق رنگ روپ اختیار کرتا ہے۔ لوک گیت کا مسکن عوام کی زبان ہے [illegible]ے زبان کے سہارے عہد بہ عہد اپنی زندگی کا ثبوت دیتے اور اپنے مقصدِ حیات سے سادہ زندگیوں کو سیراب کرتے مدتوں باقی رہتے [illegible] قلم اور کاغذ کی دنیا میں یہ کہیں نہیں ملتے۔ مگر اپنے مخصوص سماج میں ان کی ترنم ریزیاں بدستور جاری رہتی ہیں یہاں تک کہ وہ مخصوص [illegible]م ہو جائے اور نیا معاشرہ اس کی جگہ لے لے۔ یہ اپنے آپ پیدا ہو نے لے اور اپنے آپ مرنے والے، وہ گیت اپنے سماج سے کچھ [illegible]ورجہ مانوس ہوتے ہیں کہ اس کے بغیر ایک لمحہ بھی زندہ نہیں رہتے۔

لوک گیت چونکہ کسی ایک فرد کی اختراع نہیں ہے بلکہ ان کی آفرینش میں پورے سماج کا وجدان کام کرتا ہے۔ اس لئے لوک [illegible]ے پر کسی شخصیت کی چھاپ نہیں ہوتی۔ اس کا شاعر نامعلوم ہے۔ ہمارے آج کل کی شاعری ایک ایسے سماج کا ذہنی سرمایہ ہے جو اپنی [illegible]ت میں [illegible] شخصی اور انفرادی ہے۔

لوک گیتوں کا مرغوب اور زیادہ تر موضوعات کی سادہ زندگی ہے۔ سادہ مزاج دیہاتیوں کے سینوں میں [illegible]

ہوتا ہے جسے وہ بیان نہیں کر سکتے۔ جس کی وضاحت ان کے بس کا روگ نہیں۔ گیت کہنے والا کوئی بھی ان کی تشریح نہیں کر سکتا مگر اپنے وجدان کے زور سے انھیں اظہار کا روپ دے سکتا ہے۔ گو بچی کے ایسے گیت جن میں اس کے ہم نفسوں کے مبہم ارمانوں کی جھلک ہو جب ان کے کانوں تک پہونچتے ہیں تو وہ ان ارمانوں کو صحیح معنوں میں اپنا لیتے ہیں۔ وہ ان گیتوں کا کھلے دل سے سواگت کرتے ہیں اور خیالوں کی دنیا میں کھو کر انھیں ایک نئی آسودگی کا احساس ہوتا ہے۔ شاعری فطرت کو مسخر کرنے کی ایک الگ ہی کوشش رہی ہے — ہمارے مہذب سماج میں ہر شخص اپنے خیال سے فطرت کی تسخیر چاہتا ہے اور اپنے اس عمل سے سماجی رشتوں کو الجھا بھی دیتا ہے۔ ہمارا انام شاعر جسے لوک گیتوں کی تخلیق کی سعادت حاصل ہے۔ جذبات کی ترجمانی میں ایک ایسے رقاص کا رول ادا کرتا ہے جو اپنے ساتھ اپنے ہم رقصوں کے حرکات و سکنات کی تالیف بھی کرتا جائے۔ یہ نامعلوم شاعر ہو سکتا ہے کہ سماج کا ہر فرد ہو۔ کیونکہ فطری طور پر ہر فرد شاعر ہے عام بول چال کے دوران جب کبھی بات چیت میں کوئی جذباتی موڑ آجاتا ہے تو جملوں کی ساخت بھی چست اور پُر کیف ہو جاتی ہے۔ اس کے الفاظ کے زیر و بم میں شعر کا سا آہنگ آجاتا ہے۔ یہ سب کچھ نہایت بے ساختگی سے وقوع پذیر ہوتا ہے۔ لوک گیت بھی اسی طرح وجود میں آتے ہیں۔ واقعات اور ان کے ردّ عمل کا نتیجہ لوک گیت بنانے والا اکیلا گیت نہیں بناتا، اس کے ساتھ پورا سماج شامل ہوتا ہے جس کا ردّ عمل ان میں معنی پیدا کرتا ہے۔

لوک گیتوں کے لئے کسی کتابی علم کی ضرورت نہیں۔ یہ ان پڑھ اور جاہل لوگوں کے گیت ہیں۔ ان ہی کے ہونٹوں پر زندہ رہتے ہیں سماج کا ہر متنفس انھیں اپنا سمجھتا ہے۔ ان سے محبت کرتا ہے۔ روزمرہ کی بات چیت میں یہ گیت کسی کول جھرنے کی طرح پھوٹتے ہیں۔ ان کی تخلیق کا دائرہ تنگ نہیں ہے۔ کبھی کوئی خاص موقع پیدا ہوتا ہے تو اس کے ساتھ تازہ لوک گیت بھی جنم لے لیتا ہے۔ شعر گوئی کا ردِ عمل، فکر کی توانائی اور اظہار کی لطافت زندہ رکھتی ہے لیکن لوک گیتوں کے لئے ان میں سے کسی کی بھی ضرورت نہیں۔ لوک گیت تو کسی واقعہ کا جذباتی ردّ عمل ہیں۔ نہایت مہمل اور بے معنی الفاظ سے بھی ذہنی تسکین کے سامان ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ 'ہائی سو' کی تکرار آہنگ تو پیدا کر سکتی ہے لیکن معنی نہیں پیدا کر سکتی۔ اس کے باوجود محنت کے دوران، ذہنی اور جسمانی اذیت کو بھلانے والی یہی تکرار ہی تو ہے جو مزدوروں کے لوک گیت کی جان ہے۔ ان گیتوں کی زبان عوام کی زبان ہے۔ یہ وہی زبان ہے جو راستوں پر، گھر کے آنگن میں، کھیتوں کے کنارے، کارخانوں، مزدوروں کی چالوں، شراب گھروں اور چائے خانوں غرض ہر غیر علمی جگہ پر بولی اور کہی جاتی۔

ہر معاشرہ نے اپنے عروج کے زمانے میں دنیا کے لئے لوک گیت مہیا کئے ہیں۔ لیکن جب وہ معاشرہ اپنی تہذیب و ثقافت کے ساتھ ختم ہوا تو اس کے گیت بھی مٹتے چلے گئے۔ چین میں مانچو خاندان کے زوال کے بعد ان کے لوک گیت کا چلن بھی ختم ہو گیا۔ لیکن چین کی حکومت اور وہاں کے پڑھے لکھے طبقے میں یہ احساس موجود تھا کہ پچھلی تہذیبوں کے آثار کے طور پر تختے، زیورات، مجسمے، برتن اور ٹوٹی پھوٹی اینٹیں محفوظ رکھی جاتی ہیں، وہاں لوک گیت نظر انداز کئے جانے کے قابل نہیں ہیں۔ کیونکہ ان گیتوں کو محفوظ کر کے کسی خاص دور کے ذہنی اور معاشرتی کیفیات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ میقاتی چھٹیوں میں مختلف درسگاہوں کے اساتذہ اور طالب علم ٹولیوں کی شکل میں چین کے دور دراز دیہاتوں میں پھیل جاتے ہیں اور ان گیت کاروں کی تلاش کرتے جنھیں مانچو خاندان کے دورِ حکومت کے لوک گیت یاد ہیں۔ اس طرح لوک گیتوں کا ایک معتد بہ ذخیرہ ان کے پاس جمع ہو گیا ہے۔ ہائیڈروجن اور ایٹم کے اس دور حکومت میں جبکہ انقلابات دمادم ہو رہے ہیں۔ اس بات کی ضرورت اور بھی شدت سے محسوس ہوتی ہے کہ مٹتی ہوئی تہذیب کے جتنے بھی نمائندہ آثار مل سکیں انھیں محفوظ کر لیا جائے۔ لوک گیت تو بہرحال ایک زندہ صنف

ادب ہے جو مدتوں کسی معاشرہ میں سانس لیتی رہی ہے اور جس نے اس معاشرہ کی خصوصیات کو اپنے اندر جذب ہی نہیں کیا بلکہ ان کی ترجمانی کا فرض بھی ادا کیا ہے۔

دکن میں سقوط حیدرآباد سے پہلے جو معاشرہ آباد تھا' وہ اپنی تہذیب اور ثقافت میں مغلیہ دور سلطنت کی نمائندگی کرتا تھا ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی میل میلاپ نے ایک ایسی مخلوط تہذیب پیدا کی تھی جس کی خصوصیات میں برتنے والے کے فہم و اعتقاد کے مطابق تبدیلیاں کرلی جاتی تھیں۔ ہندوؤں کے یہاں تہذیب و شائستگی کے جو معیار تھے وہ کسی حد تک مسلمانوں سے مشترک ضرور تھے۔ لیکن ہندو دھرم اور شاستر کی روشنی میں ان میں کہیں کہیں ترمیم بھی کرلی جاتی تھی۔ مسلمانوں کے گھروں کی دیواریں چونے کی سفیدی سے روشن اور فرش لال مٹی سے رنگین نظر آتے تھے۔ اس کے برعکس ہندوؤں کے گھروں میں چونے کی سپیدی تو ضرور ہوتی تھی لیکن فرش گوبر سے لیپے جاتے تھے اور دہلیز پر گوبر کا چھڑکاؤ اور اس کے نقش و نگار ابھارے جاتے تھے۔ ہندوؤں کے گھروں میں پیتل کے پیلے پیلے برتن اور بے ٹونٹی کے لوٹے ہوتے تھے مگر مسلمانوں کے پاس تانبے کے برتن اور ٹونٹی والے لوٹے عام طور سے استعمال کئے جاتے تھے گھر کے صدر دروازہ پر ہندو آم کے پتوں کی جھالر لگاتے مگر مسلمانوں کے گھروں پر پردے لٹکے ہوئے ہوتے یا کوئی دیوار یا تختہ کی اوٹ لگی ہوتی تھی۔ یہ سب اختلافات اعتقادات کی پذیرائی میں تھے' ورنہ تہذیب کی داخلی روح میں مشترک اقدار بھی موجود تھیں۔
سینکڑوں برس کی زندگی کی اونچ نیچ نے جو کچھ انہیں سکھایا' رہنے کے جو ڈھنگ بتائے' اپنے پرائے' بڑے چھوٹے' امیر و غریب عالم و جاہل حاکم و محکوم کے درمیان حفظ مراتب کے جو طور طریقے معین کئے وہ سب ہندو اور مسلمانوں میں بطور قدر مشترک مروّج تھے

حیدرآباد دکن کی آبادی کا اسی فیصد حصہ دیہات میں آباد تھا اور دیہاتی آبادی کی اکثریت کا گزارہ زراعت پر تھا۔ یہ زراعت پیشہ آبادی نہایت سادہ ماحول میں زندگی بسر کرتی اور فطرت کی بخششوں کے سہارے زندہ رہتی تھی۔ فطرت کو انہوں نے اپنی زندگی میں کچھ اس طرح رچا بسا لیا تھا کہ فطرت سے ان کے تصادم کا کہیں دور دور تک امکان نہ تھا۔ ان کے کچے مکانوں' پھوس کی چھتوں اور میٹھے تیل کی پنتھیوں کے اجالوں میں ایک سویا ہوا ماضی ایک توانا حال اور ایک پرامید مستقبل دکھائی دیتا تھا۔ کبھی وہ اپنے ماضی سے شاداں اور حال سے مغموم ہو جاتے۔ کبھی حال سے مطمئن اور مستقبل کی غیر یقینی کیفیت سے گھبرا اٹھتے۔ ان ہی معصوم ارمانوں' معصوم خوابوں اور معصوم دعاؤں سے مل کر ان کے گیت بنتے تھے۔ دوپہر کی دھوپ میں محنت کرتے ہوئے باپوں نے جنہیں اپنے بچوں کو سنایا۔ ماؤں نے لوریاں بنا دے کر جن کا رس اپنے ننھوں کے کانوں میں گھولا' دلہنوں نے سسکیاں بھر بھر کر اپنے شوہروں کے سینوں میں جنہیں اتار دیا۔ بوڑھیوں نے قصے کہانیوں کے روپ میں جنہیں دہرایا اور سکھیوں نے اپنی سہیلیوں کو یاد کرتے ہوئے جنہیں الاپا چکی کے گیت گائے' پردیسیوں کو یاد کیا' اپنے پرایوں سے محبت کی اور کھیت کی چاندنی میں چمکنے والی منڈیروں پر سریلے پائلوں کی جھنکار کے ساتھ جنہیں بانسری کی پوری لے میں سمو دیا۔ یہ روایاتی اور عوامی شاعری کسی ایک شخص کی نہیں بلکہ ان ہزاروں خاندانوں کی شاعری تھی۔ جس نے فکر اور تجربہ کے بغیر جنم لیا اور ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں اور اس طرح سارے دکن میں پھیل گئی۔ شہروں میں جو خاندان آباد تھے وہ بھی کسی نہ کسی حیثیت سے دیہات والوں سے متعلق تھے۔ یا تو ان کی کوئی زمین وہاں ہوتی' یا گھر ہوتے' کوئی باغ ہوتا یا ان کا جدی کوئی مسجد' کوئی مندر یا کوئی عزیز وہاں ہوتا۔ ملازمت کے ذریعے سے بھی بہت سے شہری خاندان دیہات سے مربوط تھے۔ رسل و رسائل کی سہولتیں جیسے جیسے بڑھتی گئیں دیہات اور شہروں کا رشتہ مضبوط ہوتا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوک گیت دیہات میں رائج تھے وہ [illegible] شہروں میں بھی [illegible] البتہ تھوڑا سا فرق آ جاتا تھا لیکن معنوی یا لفظی اعتبار سے ان میں [illegible]

ہوتی تھی۔ یہ اس مخصوص معاشرت کی یگانگت اور ہم آہنگی کا بیّن ثبوت ہے۔

دکنی گیتوں کی زبان دکنی ہی تھی۔ جس میں اردو اور ہندی دونوں ہی کی آمیزش تھی۔ حیدر آباد کی ریاست ویسے تو زبان کے اعتبار سے تین اہم علاقوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ایک وہ علاقہ تھا جہاں تلنگی بولی جاتی تھی۔ دوسرا وہ علاقہ جہاں مرہٹی کا چلن تھا اور تیسرا وہ جہاں کنڑی زبان کا دور دورہ تھا۔ مگر دکنی اردو ایک مشترکہ زبان کی حیثیت سے ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی تھی۔

گیہوں اور جھنوں کا موسم اسی وقت سے شروع ہو جاتا تھا۔ جبکہ کھیت اپنے شباب پر آجاتے، سبز پودوں کے سروں پر اناج کی سنہری بالیاں جھولنے لگتیں۔ ایک دیہاتن اپنے گھر کی بالائی منزل پر چڑھ کر ان لہلہاتے کھیتوں کو دیکھتی اور گانے لگتی۔

کھیتی گے ماں کھیتی، پٹیل بھائی کی کھیتی
ماڑی چڑھ کو دیکھی، لچھمی لہریاں لیتی

گاؤں کے سماج میں پٹیل کا بڑا اہم مقام تھا۔ وہ نہ صرف زمیندار ہوتا تھا بلکہ گاؤں کی پوری زیر کاشت اراضی کے مداخل و مخارج کا حساب اسی کے پاس ہوتا تھا۔ وہ حکومت اور کاشتکاروں کے درمیان ایک اہم اتصالی کڑی کا کام کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہماری اس دیہاتن نے جب اپنی ماڑی سے سارے گاؤں کے کھیتوں پر نظر ڈالی تو اسے پٹیل بھائی کی کھیتی سب سے زیادہ لہلہاتی نظر آئی اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کھیتی نہیں بلکہ لکشمی ہے جو دولت کی دیوی کہلاتی ہے، اس کھیت میں لہرا رہی ہے۔ کھیت سے دولت کی اس مناسبت کو آج بھی ہم محسوس کر سکتے ہیں۔

پھر فصل کٹنے کا زمانہ آیا۔ بالیاں پک گئیں۔ ہرے ہرے پودے کھیتوں کی گود میں سُلا دیئے گئے۔ پھر کھلیان میں دھان اکٹھے کئے گئے اور انھیں کوٹ کر چاول الگ کرنے کی مہم شروع ہوئی۔ بڑے بڑے الاؤ سلگائے، محنت کش کاشتکار دن کے عمل سے الاؤ میں گپ شپ کرتے بیٹھے ہیں اور عورتیں گھروں میں دھان کوٹ رہی ہیں۔ آٹا پیس رہی ہیں اور ساتھ ساتھ اپنے گیتوں میں اپنی الھڑ مسرتوں اور ارمانوں [illegible] رہی ہیں۔

[illegible]ناں میں کوٹوں، دھانوں میں کی کاڑی — مسافر کی داڑھی، جھاڑو لے کو جھاڑی
[illegible] کر بیٹھی، پیٹ بھر کو چوٹی — بیچ میں گلا دیتی، مالن جیسی بیٹی
[illegible] ماں کے داتاں، سونے سلائیوں کے — اوپر پھرتے ہاتاں کنگھی کلائیوں کے
کوٹتی پیستی دکھیتی، گردن ہور شانے — یہ دکھ کون پہچانے جنم کی جنی ماں نے

یہ بول اگرچہ سیدھے سادے ہیں۔ لیکن ان کے اندر محسوسات کی ایک دنیا آباد ہے۔ دھانوں سے کاڑیاں کو الگ کرنے کے لئے وہ جھاڑو استعمال کرتی ہے جسے از راہ تفنن وہ مسافر کی داڑھی سے تشبیہ دیتی ہے۔ چکی پیسنے والیوں میں انھیں اپنی بیٹیاں دکھائی دیتی ہیں جن کی صحت اور بالیپن اپنے شباب پر ہے۔ جن کی پشت پر ان کے گھنے اور لمبے بالوں کی موٹی موٹی چوٹیاں لہرا رہی ہیں۔ مالن کا لفظ دکن میں صحت مند لڑکیوں کے لئے بولا جاتا تھا۔ دھان کوٹتے ہوئے اور چکی پیستے ہوئے ان عورتوں کے ہاتھ دکھنے لگتے ہیں۔ وہ ہاتھ جن میں سہاگ کے کنگن ہیں۔ مگر یہ دکھ سوائے ماں کے کون جان سکتا ہے۔ گاتے گاتے ان کا دھیان اپنی جوان اور ان بیاہی بیٹیوں کی طرف جاتا ہے۔ گھر میں دولت، اناج کے روپ میں آنگن میں بکھری پڑی ہے۔ ان میں سے ایک لڑکی آواز میں اپنی سکھیوں اور ہمجولیوں کو اس طرح مژدہ سناتی ہے۔

توسے ہی دھانوں کا کروں گی رسمانا — گھر میں عورت بیٹھی، رات آیا پاؤں ماما

دیہات میں لڑکی سارے گاؤں کی بیٹی کہلاتی تھی۔ اس کے بیاہ کی فکر سارے گاؤں کو ہوتی۔ فصلیں کٹنے کے بعد جو نکہ دولت کے آنے کا قرینہ و ارزانی ہوجاتا۔ اس لئے شادی بیاہ کی بات چیت شروع ہوتی۔ رات میں پاؤں میز کا رسم کرنے دولہا والے آئے تھے۔ ان کے سوا گت اور خاطر مدارات کے دیہاتی کے پاس نئے چاولوں کا کثیر مقدار ہے جن کا مزہ میٹھا اور سوندھا ہے۔

اس خبر کے پاتے ہی ساری سکھیاں کھلکھلا اٹھیں اور لے مبارکباد دینے لگیں۔ ان مبارکبادیوں سے شرما کر وہ کہتی ہے:۔

بیٹی کو منگنے آئیں، کالے کے جی بیدر کے
شہزادے بدر کے پائل لائیں سونے کے

ماں کو اپنی لڑکی پر ناز ہے۔ بیدر جو محمود گاواں کی سرزمین ہے، جس پر بریدشاہی سلطنت کا بول بالا رہا۔ جس کے بادشاہ نے شام کے وقت آبادی پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور محسوس کیا کہ لوگ غربت کی وجہ سے شام کا کھانا نہیں پکاتے ہیں۔ اس نے اپنے شاہی مطبخ سے سارے شہر کے لئے شام کی خوراک کا بندوبست کر دیا۔ وہی نامور سرزمین ہے جہاں سے لوگ اس کی لڑکی کو مانگنے آئے تھے۔ سونے کے پائل اپنی خواہش کی ترجمانی کے لئے لڑکی کے پاؤں میں پہنائے گئے لیکن ماں کو اپنی بیٹی پر ناز ہے ایسی شان و شوکت اور الماس و نگین سب اس کی صحت و خوبصورتی پر سے نچھاور ہے۔ اب رسم تو ہوگیا۔ لڑکی پر نگرانی ہونے لگی:

آن بیاہی بیٹی کو آنگن سپھرنا منع
سامنے دیوان خانہ چوسر کھیلتا ہتا

اگلے وقتوں میں آج کل کے کھیل تو تھے نہیں۔ چوسر ہی شریف گھرانوں میں مقبول تھا۔ دولہا میاں اپنے دوستوں کے ساتھ اپنے دیوان خانے میں بیٹھے چوسر کھیل رہے ہیں۔ دیوان خانہ کچھ ایسے موقع پر واقع ہے کہ دلہن کے گھر کا آنگن دکھائی دیتا ہے۔ لڑکی کی ماں کہتی ہے "بیٹی تو ابھی اَن بیاہی ہے اس لئے تجھے پردہ کرنا چاہئے اور آنگن میں نہیں اترنا چاہئے" تربیت کا یہ انداز دکن میں بہت عام تھا۔

لڑکی کی بات تو پکی ہوگئی۔ لڑکی ہوتی ہی پرائے گھر کی ہے۔ اب اسے اپنے لڑکے کا خیال آجاتا ہے اور وہ گانے لگتی ہے۔

میرے گھر کے پیچھے گاڑی گڑگڑاتی
وہ کون سہیلی آئی گلا بھر کو موتی

میرے گھر کے پیچھے لال مٹی کا کھڈا
اس میں بیٹھا بڈا سولاپور کا ھنڈا

بھائی تیری بیٹی دے میرے بیٹے کو
ذات کو کیا پوچھیں گا؟ الحمد سے موتی کو

اسے اپنے لڑکے میں کوئی بھی اوگن نظر نہیں آتے۔ وہ تو اصلی موتی کی طرح پاکیزہ ہے۔ اس کے دل کی آرزو یہ ہے کہ بھائی کی بیٹی سے اپنے بیٹے کا بیاہ رچائے۔ اسی لئے گیت کے انداز میں اپنی دلی آرزو کا بیان وہ اپنے بھائی سے کرتی ہے۔ قدیم زمانے میں گاڑیوں کے پہیوں پر لوہے کا ایک پٹہ چڑھا ہوتا تھا۔ جب گاڑی دیہاتی راستوں پر چلتی تو بڑی گڑگڑاہٹ ہوتی۔ اس شور سے اس کے کان کھڑے ہوجاتے ہیں وہ سمجھتی ہے کہ اس کے بیٹے کے لئے کوئی سہیلی، گلا بھر کے موتی پہنے، یعنی اپنے تموّل اور خوشحالی کا اظہار کرتے ہوئے پیام لے آئی ہے۔ اس واقعہ پر اس کے من میں خوشیوں کی پھلجھڑیاں چھوٹنے لگتی ہیں۔ اور وہ بے ساختگی کے ساتھ کہتی ہے کہ اس کے گھر کے پیچھے ایک گڑھا ہے جہاں سے لال مٹی کھود کھود کر لے جائی جاتی ہے وہ اپنی معصوم سہیلیوں کو ڈراتی ہے "سکھیو کبھی اس 'کھڈے' کا رخ نہ کرنا۔ وہاں ایک سولاپور کا بڈھا بیٹھا ہے۔ جو عورتوں کو پکڑ لیتا ہے۔" ساری سکھیاں کھلکھلا کر ہنس دیتی ہیں۔ دھان کا کوٹنا جاری ہے۔

مگر وہ پھر سنبھل گئی۔ بیٹی کی شادی سے تو پہلے نمٹ لے۔ شادی کے دن قریب آرہے ہیں۔ چیونٹیوں کی ریل پیل ہے۔ گھر والوں سے اٹھنا پڑتا ہے۔ شام سویرے سے مشعلیں روشن کر جاتا ہے۔ آنگن میں چاولوں کی دیگ چڑھتی ہے۔ کھانے اٹھ رہے ہیں باتیں ہو رہی ہیں [illegible] نے کنوؤں سے تالابوں سے ٹھنڈے پانی کے گاگر بھر بھر کر ایک طرف لگا دئیے ہیں۔ دھنک اڑ رہی ہے۔ کچھ جھگڑے بھی چل رہے ہیں [illegible] ہیں۔ دن عید اور رات شب برات ہے اور گھر کے اندر کہیں دالان کے ایک کونے میں چکی بچھائے چند عورتیں "آسمان" کے گیت گا رہی ہیں

لمبی عمر: آسمانی تاروں کی ایک مشتری کا نام ہے۔ اسا دری شادیوں میں قسم قسم کے راگ کے گیت رسیلے گلوں سے یہ آواز آرہی ہے۔

میرے من کے مرادوں میں پائی گے ماں — اللہ صاحب کی رات جگائی
حضرت بیوی سہاگ پائی گے ماں — اللہ صاحب کی رات جگائی

گھر کے دوسرے حصے میں دلہن کے لئے جھولا سجایا جارہا ہے، جہاں اسے مانجھے بٹھانے کا ارادہ ہے۔ عورتیں گارہی ہیں۔

مانجوں کی کوٹھری، تلے تل سنواری — مانجوں میں ہماری تخت پیٹ ماری

دلہن کو جلوہ نشین کرنے کے لئے جب تخت پر بٹھایا گیا تو وہ رونے لگی۔ لے یہ سب کھیل عجیب سانگ، ہاتھا۔ اسے دور رجھکیا کتنا سہانا حسین۔ ماں کو بیٹی کا اس زار و قطار رونے کا صدمہ ہے۔ وہ گیت کے انداز میں کہتی ہے۔

آرسی میری بیٹی، تخت پہ نا رونا — سمجھاؤ ماں جاناں سیوتی کمھلا جانا

سیوتی کے پھول دکن کے جاڑوں کی خصوصیت ہیں۔ سپید رنگ کے نازک سے یہ پھول فطرت کے صنعت کاروں کا حسین و دلفریب نشانہ ہیں۔ دلہن کے چہرہ کو سیوتی کے پھول سے تشبیہ دینا اور اس کے رونے کے باعث اس کے کمھلا جانے کا اندیشہ کرنا اس لوک گیت کی سادگی اور پُرکاری پر دلالت کرتا ہے۔

دلہن مانجھے بیٹھ گئی۔ آخر شادی کا دن آگیا اور صبح سویرے دولہا کی بہن نے یہ مژدہ سنایا۔

شب گشت نکلا بھائی کہ شب گشت میں شہنائیاں — بازو سے جھونا یاں اوڑھائیں گے رومالاں

فجر کی نماز گاؤں کی مسجد میں پڑھ کے دولہا دلہن کے گھر آگیا اور دلہن کی ماں نے آواز دی۔

شب گشت نکل کو شیوؤ، آیا ہے منڈھے میں — شکر لاؤ پڑے میں پیرت ہے جوڑے میں

گھر کے آنگن میں میانہ قد کے چار بانس گاڑ کر ستلیوں کی مدد سے ہرے ہرے پتوں اور رنگ برنگی پھولوں کی چھت تیار کی جاتی ہے۔ بانسوں کے گرد پھولوں کی بیلیں چڑھا دی جاتی ہے اور رنگ و نکہت سے یہ منڈوا مہک اٹھتا ہے۔ اسی پُر بہار منڈھے تلے شادی کی ساری رسومات انجام پاتی ہیں۔ دولہا دلہن کے گھر آگیا اور اب منڈھے میں براجمان ہے۔ دلہن کی ماں کا دل، دولہا کے چہرے مہرے کو دیکھ کر باغ باغ ہوا جاتا ہے۔ وہ اس نیک قدم پر دولہا کا منہ میٹھا کرنا چاہتی ہیں۔ اس لئے شکر مانگ رہی ہیں تاکہ ایک چٹکی اپنے ہاتھ سے دولہا کے منہ میں ڈال دیں۔

اب تو شادی کا گھر نوبت اور شہنائیوں کی آواز سے گونجنے لگا ہے۔ بجے باجے الگ دھوم مچا رہے ہیں۔ ملا کیسے ختم ہوا۔ مسرت کی گھڑیاں کتنی جلد گزر گئیں۔ شام ہوئی۔ وداعی کا وقت قریب آگیا۔ نائنوں نے مشعلیں ہاتھوں میں اٹھالیں۔ منڈھے تلے تخت پر لال لال پڑا کیا گیا۔ کپڑوں کی ایک گٹھری کی طرح دلہن کو اس پر بٹھایا گیا۔ اب آرسی مصحف کی رسم ہوگی۔ جوڑے میں پیرت رکھنے سورۂ اخلاص پڑھا جائے گا۔ مگر دلہن رو رو کر ہلکان ہوئی جاتی ہے، اس کا سیوتی جیسا چہرہ کمھلا رہا ہے۔ دلہن کو دلاسہ دینے کے لئے دیہاتن کہتی ہے ؎

آرسی میری بیٹی تخت پہ نا رونا — شر طال باندھیں بھایاں ہم پہنے بلانا

مگر اس کا رونا بھلا کہاں رکتا ہے۔ آخر مہمان ہیکر دولہا والے آگئے اور دلہن کو اٹھا کر میانے میں سوار کرانے کی رسم شروع ہوئی۔ دیہاتن کا دل بھر آیا۔ بڑی دیر سے ضبط کر رکھا تھا رو پڑیں۔

آرسی کو اٹھائے استھاں چڑھاتے — نینو کے بڑے بھایاں میانہ اٹھاتے

پھر تو سارا گھر رو دیا۔ بیٹی کو کیا وداع کیا دل ہل گئے۔ بارات چلی گئی۔ باجوں گاجوں کی آواز دور سے دور تر ہوتی گئی اور پھر گھر میں ایسا سناٹا چھا گیا کہ اللہ کی پناہ۔ اتنے دنوں کی تھکن ایک بار اُبل پڑی ہے دیکھو بے سدھ پڑا سو رہا ہے نہ کھانے کی فکر ہے نہ چوری کا خوف گھر کے دروازے کھلے ہیں۔ بھک منگے راستوں پر گشت کر رہے ہیں۔ پڑوسیوں کو اس کا خیال ہے۔ اس لئے وہ کاج کے گھر کی چلتے پھرتے نگرانی کر رہے ہیں۔

پھر دن پر دن گذرتے گئے۔ دکن کی سانولی اپنے میکے سے جہیز سسرال میں گرہستن کے فرائض انجام دینے لگی۔ وہ اپنی دیورانیوں اور جٹھانیوں کے ساتھ پنگھٹ پر پانی بھرنے آتی ہے:

دیورانیاں جٹھانیاں ہمارے گام کی رانیاں   پہنی زر کی ساڑیاں دکھیتیں سگی بہا ناں
دیورانیاں جٹھانیاں مل چلے پانی کو   رستہ دیو جاؤ کو دیوار کی رانی کو

دیورانی، چھوٹے دیور کی بیوی کو کہتے ہیں۔ دولہا میاں کے بڑے بھائی دلہن کے لئے ہمیشہ کا رشتہ رکھتے ہیں۔ اور ان کی بیوی کو جٹھانی کہا جاتا ہے۔ یہ سب ایک ہی گھر میں مشترک خاندان کے طور پر رہتے بستے ہیں۔ گھر کے سب رہنے والے آپس میں محبت کے رشتے سے جڑے ہوئے ہیں۔ البتہ نند، جو شوہر کی بہن ہے اس کے ساتھ دکنی اس سانولی سے کچھ ان بن سی ہے۔ نند سمجھتی ہے کہ جب سے یہ آئی ہے اس کا بھائی اس سے محبت کم کرنے لگا ہے۔ اسی لئے وہ بھاوج کو طعنے دیتی رہتی ہے۔ طعن تشنیع کی بات بھلا کیسے بھاتی ہے بھاوج بھی اس سے اب گھبرانے لگی ہے وہ کہتی ہے:

نند کا جی نا تا، مجھے نئیں گے بھاتا   سالو کی مسریوں میں سرو اے کا کانٹا

سرو اے کا کانٹا سالو کے رنگ کا ہوتا ہے اور جب اسی رنگ کے کپڑے میں اٹک جاتا ہے تو بڑا چبھتا ہے اور ڈھونڈے سے نہیں ملتا۔ نند کو سرو اے کا کانٹا کہنا بڑا معنی خیز ہے۔ مگر پھر اسے محبت آجاتی ہے۔ آخر وہ اس کے میاں کی بہن ہی تو ہے وہ اسے کتنا پیار کرتے ہیں۔ ان کی خوشی کے لئے میں تو اپنا سب کچھ قربان کر دوں گی۔ اور وہ گانے لگتی ہے۔

نند کو بلاؤں گی نندوئی کی راہ سے   دو شالے اوڑھاؤں گی عربی باجی سے

مگر قسمت کی کرنی دیکھئے:

نند آئیں بول کو بھار کی دہلیز سوئی   ایسی ہیبت پڑی چھ مہینے کا ٹھہ چڑھی

بے چاری بیمار ہو گئی اور چھ مہینے فراش رہی۔ جب اچھی ہوئی تو گھر کے کام کاج میں پھر گتھ گئی۔ لیکن اب جسم کچھ بوجھل بوجھل سا ہونے لگا۔ آنکھوں میں نیند کی پریوں نے ڈیرے جمائے۔ گھر میں آؤ بھگت ہونے لگی۔ ہر فرد مہربان ہو گیا۔ یہاں تک کہ نند نے طعن و تشنیع چھوڑ کر بھاوج کی خدمت گذاری اختیار کی اور سب نے مل کر خوشی اور حجاب کے ملے جلے جذبے کے ساتھ کہا۔

اللہ اللہ کر کو ایک اک پیڑھی چڑھی   ہاتھ میں ناڑا لپوڈی مراد منگنے کھڑی

یہ مراد کیا تھی۔ یہی تھی کہ سہاگن کی گود ہری ہو جائے اور سہاگن کے سر سے ستر بلائیں ٹل جائیں۔ کیونکہ دکن میں یہ بات عام تھی کہ اگر سہاگن کو بچہ نہ ہو تو شوہر دوسرا بیاہ کر لیتا ہے اور سوتن کا جلاپا سہنا پڑتا ہے۔ ایسے میں اسے اپنے میکے کا خیال آتا ہے اور کبھی بھائی کے ملنے کی بات یاد کرتی ہے۔ کبھی بھائی کو اولاد ہونے کی دعائیں کرتی ہے۔ محبت کا ایک دریا ہے کہ امڈ پڑتا ہے:

گھر بھا ناں بھاناں، نہال کر جو چھینے ٹیں سگے منڈھے ویش بھائی کے بیٹھے ہیں
بھائی میرا جیو، بھاوج میری تاندہ چندری کی ڈال کو لال گنوارا باندھو

لیکن یکا یک اسے ایک بدمزگی کا خیال آجاتا ہے۔ وہ بھی تو آخر کسی کی نند ہے۔ وہ اس کا بدمزگی کی یاد سے بھر اٹھتی ہے

بھاوج کے گھر گئی، بھاوج آڑ کا تیڑھی رکھ لے ساڑھی کا چھلا، بھائی سے ملکو چلی

رواج کے مطابق جب بہن بھائی کے گھر آتی تو بھائی اسے ساڑی اور چھلا کا محبت بھرا تحفہ دیتا مگر اب تو وہ بگڑ بیٹھی ہوئی ہے، اور کہتی ہے: نہیں چاہئے یہ تحفہ۔ رکھ لے اسے۔ وہ تو محض اپنے بھائی سے ملنے آئی تھی۔ ممکن ایسا کبھی نہ ہوا کہ بہن بھائی کے گھر سے نا گئی ہو۔

پھر سہاگن کی گود بھری ہو گئی اور وہ ننھے کے لئے جھولا تیار کرنے لگی۔ دیکھئے اس کے کاروبارِ شوق کا عالم۔

گنوارے کی نیّا، ہری پیلی رنگی تالے کی حیات، اللہ کلے منگی
گنوارے کے نیچے ٹھنڈی ریس بن چلے گنوارے میں تانا، ستر بلا ٹلے

گنوارہ میں تانا، گھر دستا نورانا
اللہ کی درگاہ میں بھیجوں گی شکرانا
گنوارہ بناؤں گی رنگین لال پٹی کا
چاند سوتا ہے گوری کا پیپل پان لوٹی کا

گوری کا چاند جھولے میں کھیلتا، انگوٹھا چوستا، روتا، مسکراتا، آوازیں نکالتا، ہمکتا، آکاش کے نیلے ہنڈولے میں چاند کی طرح جھولتا پڑا ہے۔ مگر اب وہ جھولے سے اتر کر چلنے بھی تو لگا ہے۔

تانا میرا چھلے پاؤں لے پاؤں لے
نازک تلوے تیرے بچھاؤں گی پستولے

ننھے کو دیکھنے کے لئے سب عزیز و اقارب آ رہے ہیں۔ گوری اس طرح خبر دے رہی ہے۔

میرے گھر کے پیچھے الائچی کا کھیت
آئیں ہیں بڑے بیٹھے ہاتھ میں ہری بیت

ہری بیت سمجھ کر اس نے یہ بتا دیا کہ یہ لکڑی تازہ درخت سے توڑ کر ہاتھ میں سنبھال لی گئی ہے۔

سونے کی صراحی، گلاب سے بھرائی
نماز پڑھتی بھائی قبلے شال بچھائی

بھائی کی خاطر، سونے کی صراحی میں گلاب بھروا کر منگوایا جا رہا ہے تاکہ جائے نماز پر چھڑکاؤ کیا جائے۔

مگر بچہ روتے روتے اٹھ بیٹھا۔ اسے بھوک لگی ہے، اسے مخاطب کر کے کہتی ہے:

آگے آگے گھوڑی، کہاں گے کھل کوندا
یہ میرے تلنے کو دودھ دے گے سونڈا

حیات بخش دودھ کے دھارے جو کالی گائے کے تھنوں میں رکے ہوئے تھے۔ بچہ نکلے اور ننھے کی رگوں میں خون بن کر دوڑنے لگے۔ گودی والی اسے دیکھ دیکھ کر خوشی سے پھولے نہیں سماتا۔ وہ فخریہ انداز میں کہتی ہے:

میرے لالنے میں سبھی گورے گورے
سانولے رنگ کے پھولے نینوں میں لال ڈورے
سالونے کے منہ پر پسینے کے ریلے
بجی ماں نے بوسے منہ پہ موتی رولے
تکنے تانے دل کو کھیلتیں گولا گولی
تانے کی زبان میں بسم اللہ کی بولی
بسم اللہ بسم اللہ بولو میرے تانے
بسم اللہ پڑھانے بیٹھیں دائے نانے

بچے کی مکتب کی تعلیم شروع کرنے سے پہلے قرآن پاک سے سورۂ اقرار کی تلاوت کرائی جاتی تھی۔ مہمان جمع ہوتے۔ کھانا پینا ہوتا۔ ننھے کو نانا دادا مل کر پھول پہناتے۔ ڈھولک اڑتی۔

اب ننھا مکتب جانے لگا ہے۔

ننھے تارالوں کی دوپہر کی تعلیم　　　ننھے نئی معلوم دستار ہے خالم
دستار کے پاواں میں سونے کی کھڑاویں　　　جاتیں مکتب خانے لال کو سبق پڑھانے

ذرا مکتب خانے کی ترکیب پر غور کیجیے۔ پہلے کے استاد سخت گیر ہوتے تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ مشفق بھی ہوتے تھے۔ علم دولت سے وہ ننھوں کا گود بھرتے تھے۔

اتنے میں گودی کے شوہر آ گئے۔ وہ ننھے کو ننھیال لے جانا چاہتے ہیں۔ وہ شوہر کا منہ دیکھ کر کہتی ہے۔

دھوپ کالے کی دھوپ کیسی نہیں دیتی سایا　　　بن چھتری کے آیا، لال کا منہ کملایا

وہ ممتا کے بھرپور جذبے کے ساتھ ننھے کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے۔

بڑے بڑے دید سے بٹھانے کے دالنے　　　ٹوپی پہنیو تانے، نانا کے گھر جانے

ننھا چلا گیا لیکن گودی کا دل اداس ہو گیا۔

کالی بچی گائے کا دودھ نہیں جمتا　　　بچے ننھیال میں وقت نہیں گمتا

یہ روایت نہ معلوم کہاں تک صحیح ہے کہ کالی گائے کا دودھ نہیں جمتا۔ غرض دکن کی یہ گودریاں، یہ ساونریاں اپنی زندگی کے دن ہنستے گاتے گزار گئیں۔ ان کے گیت ان کے احساسات کے ترجمان ہیں۔ ان کی محبت، ان کی خوشی، ان کی تمنا کا شیشہ ہیں۔ لیکن اب وہ معاشرہ ہی ختم ہو گیا۔ وہ گوریاں کہیں دور چلی گئیں۔ ان کے گیت بھی دم توڑتے گئے اور آج ان کو گانے والا کوئی باقی نہیں۔ بس نام اللہ کا!

(سہ ماہی اردو نامہ۔ کراچی)

نقد و نظر

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

کاویم (شعری تصنیف)

مصنف : کاوش بدری ؛ ضخامت : ۲۰۴ صفحات قیمت : ۲۴ روپے (بغیر تصاویر)
۳۳ روپے (مع تصاویر)
پیشکش : کل جنوبی ہند انجمن ترقی پسند مصنفین اردو مدراس ۱۲•
۔ انجمن مصنفین اردو تملناڈو ، مدراس ۱۲•

کاویم جناب کاوش بدری کی ایک ایسی شعری تصنیف ہے جس کے بارے میں مصنف کا دعویٰ ہے کہ "صنفِ مونو لاگ" میں "قوم پسندانہ عناصر" اور "دراوڑی کلچر" کے ساتھ "انکشافِ ذات" پر یہ اردو کی پہلی طویل نظم۔ اس نظم کو پڑھ کر مجھے "انکشافِ ذات" کی ترکیب سمجھ میں نہ آسکی ، اگر انکشافِ ذات سے مراد جواہر لال نہرو کی بیس نکاتی پروگرام کی منقبت اور دراوڑی کلچر کی داد ہے تو یہ ترکیب ضرور اس ترکیب سے جدا ہے جو مثلاً جناب کاوش بدری ایک معروف اور معروف جدید غزل گو ہیں ۔ ان کے حسنِ سخن کی ہند و پاک میں شہرت ہے ۔ زبان و بیان پر ان کو استادانہ قدرت حاصل ہے ۔ اس نظم کو مسدس کی صنف میں لکھا گیا ہے جو رزمیہ کے لئے موزوں تر ہے اور لفاظی کے لئے طاقتور ترین ۔ کاوش نے بھی اس صنف میں کمال دکھایا ہے ۔ مثلاً ۔

کہسار کے بدن سے صنم جھانکنے لگے شاخِ نشاط سے گلِ غم جھانکنے لگے
انسان کے دل سے دیر و حرم جھانکنے لگے لوح و قلم خدا کی قسم جھانکنے لگے
اس اک جھانک میں کئی صدیاں گذر گئیں
شیرازۂ حیات کی کڑیاں گذر گئیں — (آوارگی)

آساں نہیں بجھے ہوئے چہروں کو دیکھنا پیوندِ بخت و درد میں جسموں کو دیکھنا
دستِ خزاں میں بن کھلے غنچوں کو دیکھنا قبروں پہ کھیلتے ہوئے بچوں کو دیکھنا
ڈھلتے ہوئے فرش و عرش بھی اشکِ غریب سے
کعبے میں روشنی ہے تو داغِ حبیب سے — (معراجِ غم)

اس نظم کا غالباً "مقصد" ویدک نظریہ کہ انسان کی ذات ہی خدا ہے اور انسان ہی میں خدا ہے اور اسی پیکر خاکی میں ظہور خدائی "کی تفصیل ہے۔ اسی نظریہ کو مداوڑی قرار دیا گیا ہے۔ کاوش بدری ایک قابل شاعر ہیں۔ ان کا ادبی تجربہ وسیع ہے ان کی ادبی کاوشوں تجربات اور مباحث اردو کے رسائل میں جاندار رہے۔

کاوش اس نظم میں انکشاف ذات، جنت دوزخ اور آواگون سے گذرے ہیں اور یہ تمام منزلیں علامہ اقبال نے بھی کامیابی سے اور عظیم طور پر طے کی ہیں۔ کتاب کی طباعت مناسب، سرورق اچھا اور قیمت عام خریداروں کے لئے زیادہ ہے۔

(اسلم عمادی)

میری دھرتی، میرے لوگ

شاعر: شیشندر شرما، ترجمہ: اختر حسن، ضخامت: ۱۱۲ صفحات، قیمت ۲/۵۰ روپے
ناشر: انڈین لینگویجس فورم، گوشہ محل، حیدرآباد

شیشندر شرما ایک فعال اور شادابِ انسانیت کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کا تعلق انسانیات اور قدرت کی بے بہا نشانیوں سے ہے اور انھوں نے اپنی نظموں میں وطن پرستی بلکہ زمین پرستی اور فطرت پرستی کی علامات و تشبیہات کو رومانی شاعروں کی طرح استعمال کیا ہے۔ ان کے پاس تشبیہات کا ایک نادر اور گنجان خزانہ ہے مجھے مسرت ہے کہ "نیلم کے پنکھ" (ترجمہ: غیاث صدیقی) کے بعد اختر حسن کے اس ترجمے کو پڑھنے کا موقع مل رہا ہے۔ دونوں ہی تراجم شیشندر کی شاعری کو کامیابی سے پیش کرتے ہیں۔

شاعر کا لب ولہجہ اس طویل نظم میں کسی ہادی کے جیسا ہے جو سماج سے یوں گفتگو کرتا ہے جیسے ان سے خوش آئند مستقبل اور زرخیز کھیتیوں کے وعدے کر رہا ہو لیکن جس کی باتوں میں پند و نصائح نہ ہوں۔ وہ اپنے روحانی تجربات کا ذکر کر رہا ہے جن سے وہ آگہی کی تلاش، سکون کی تلاش اور راحت کی آرزو میں شب و روز گزرتا ہے جب کہ کسی کرشمہ ساز کی طرح وہ شکلیں اور صورتیں بدل بدل کر اپنے آپ کو سمجھنے میں سرگرداں ہو۔ وہ ماورائے موجود ایک ایسی ہستی ہے جو اپنی تیسری آنکھ سے دھرتی اور اس پر رواں انسانوں اور وقت کی لہروں کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کا اصل مقصد اس کائنات کے حاکم کل کی تلاش ہے جس کے ہوتے ہوئے بھی زمین ایک طرف تو خوبصورتی اور زر و جواہر کے ذخائر اگل رہی ہے تو دوسری طرف آتش فشاں کی طرح انسان پر مصائب و آلام کا لاوا اگل رہی ہے۔

شرما کی شاعری اردو زبان کے ماضیٔ قریب کے مقبول شعراء جوش ملیح آبادی، نہال سیوہاروی، احسان دانش، مجاز، جذبی، ساحر لدھیانوی اور کیفی اعظمی کی شاعری سے ملتی جلتی ہے۔

اختر حسن ایک خوش کلام معروف ادیب ہیں اور ان کے ترجمہ میں بلا کی نفاست ہے۔ یہ کتاب اردو داں احباب کے لئے ایک اچھا تحفہ ہے۔ طباعت اچھی اور قیمت مناسب ہے۔ (اسلم عمادی)

دکن اداس ہے یارو

حیدرآباد کی یادوں کا تیسرا مجموعہ، مصنف: مرزا ظفر الحسن
ناشر: ادارہ یادگار غالب کراچی صفحات ۱۲۸ قیمت دس روپے

زیر تبصرہ کتاب کا جیسا کہ نام سے ظاہر ہے مشفق خواجہ صاحب کا یہ کہنا کہ مرزا صاحب حیدرآباد سے خالی ہاتھ نہیں آئے۔ یہ پورے حیدرآباد کو اپنے

ساتھ لے آئے ۔ وہ اب بھی اسی حیدرآباد میں رہتے ہیں اور اسی کی معطر فضاؤں میں سانس لیتے ہیں" کچھ بیجا نہیں۔ ظفر الحسن جیسی شخصیتوں سے غالب کے اس شعر کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال   ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

ظفر الحسن کا حیدرآباد اور حیدرآبادیوں کو ٹوٹ کر چاہنے کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ تیس سال گذرنے کے بعد بھی یادوں کے سلسلے کی کڑیاں سامنے آتی جا رہی ہیں ۔ ان یادوں کے سلسلہ میں دیکھی بھالی، جانی پہچانی شخصیتوں کے چہرے بھی ملتے ہیں اور اس دور کے واقعات کا تاریخی پس منظر بھی ۔ یہ درست ہے کہ سقوط حیدرآباد کی نہ تو یہ تاریخ ہے اور نہ واقعاتی ڈائری ۔ شخصی احساسات اور مشاہدات کے اس دلچسپ مرقع میں کھوئی یادیں ملتی ہیں اور یادوں کے چہرے روشن نظر آتے ہیں اس کے ساتھ ہی ساتھ ہم یہ بھی کہنے پر مجبور ہیں کہ چاہت یکطرفہ نہیں ۔ حیدرآبادیوں کے کان آج بھی ظفر الحسن کی آواز سے آشنا ہیں اور آج بھی تعلیم یافتہ اصحاب کی محفلیں ظفر الحسن کے ذکر سے خالی نہیں ہوتیں ۔ ہمیں یقین ہے کہ ان مختصر سی کتاب کو اردو والے بالعموم اور اہل دکن خصوصی طور پر دلچسپی سے پڑھیں گے اور مرزا صاحب کے طرز نگارش کی داد دیں گے۔

(غلام جیلانی)

امانتِ سخن

باقر رضوی امانت خانی   صفحات (۱۸۴) قیمت ۶ روپے

ملنے کا پتہ : باقر امانت خانی ۔ ۹۱۶-۳-۲۲ کھیت بالشتی بہ دار الشفاء حیدرآباد

جناب باقر رضوی امانت خانی کے پانچ مرثیوں کا مجموعہ جو باشتراک اردو اکیڈمی چھپ کر منظر عام پر آیا۔ باقر نہ صرف ایک مرثیہ گو ہیں بلکہ دوسری اصناف سخن میں بھی ان کی کہنہ مشقی اور قادر الکلامی کا اعتراف کیا جاتا رہا ہے۔ اگرچہ مرثیہ گوئی موضوع کے اعتبار سے مقررہ حدود کی پابند صنف ہے لیکن زیر تبصرہ مجموعے کے مطالعہ کے بعد یہ کہنا پڑتا ہے کہ باقر صاحب نے ان حدود کی پابندی کرتے ہوئے زمانے کے بدلتے ہوئے رجحانات کو پیش نظر رکھا ہے اور طرز بیان میں جا بجا ندرت پیدا کی ہے ۔ پروفیسر احتشام حسین اور ڈاکٹر رشید موسوی کے مقدمات نے مرثیوں کے اس مجموعے کی قدر و قیمت میں اضافہ کیا ہے ۔ باقر صاحب کے مرثیوں میں سوز کے ساتھ ساتھ واقعات کی مرقع نگاری بھی ملتی ہے ۔

تاریخ ادبیاتِ تاجکستان

مصنف: یرژی بیچکا   مترجمہ: کبیر احمد جائسی

ناشر : انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی   مجلد صفحات ۲۷۶ قیمت /۱۳ روپے بیت اشاریہ جلد

تاجکستان کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہے کہ ایک زمانے میں تاجکستان سلطنت فارس کا ایک جزو تھا یہی وجہ ہے کہ وہاں کی زبان آج بھی فارسی ہی کی شاخ معلوم ہوتی ہے نہ صرف یہ بلکہ اصناف ادب و سخن بھی فارسی ادب و سخن کے سے ہیں ۔ اردو اور فارسی کا باہمی تعلق و رشتہ کسی وضاحت کا محتاج نہیں ۔ بہ ایں وجہ تاجکستانی ادب سے اردو والوں کو آشنا ہونے کی تمنا بیجا نہیں ۔ کسی زبان کے ادب سے آشنا ہونے کے لئے اس زبان کی تاریخ ادب ضروری ہے ۔ تاریخ ادبیات تاجکستان کا اردو میں ترجمہ شائع کرنا انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی کے بیش بہا خدمات میں سے ایک تصور کیا جا سکتا ہے ۔ جناب کبیر احمد جائسی نے ترجمہ نہایت شستہ اور سلیس زبان میں کیا ہے جس کے باعث زیر تبصرہ کتاب اردو ادب کے طالب علم کے لئے دلچسپی لئے ہوئے ہے ۔

(غلام جیلانی)

ادبی سرگرمیاں

اُردو نامہ: علمی، ادبی اور تہذیبی خبر نامہ

یکم فروری: عثمانیہ یونیورسٹی نے محترمہ لئیق
خدیجہ صلاح کو اُردو میں ایم فل کی ڈگری کا مستحق قرار
دیا۔ "سب رس" میں لئیق صاحبہ کی بیشتر تحریریں
شائع ہوئیں اور پسند کی گئی ہیں۔

۲ فروری: حیدرآباد کے بزرگ استادالکلام
شاعر جناب خواجہ عبدالعلی صدیقی (۱۳۲۲ھ)
۲ فروری ۱۹۷۸ء کو انتقال کر گئے۔ صدیقی
مرحوم علوم مشرقیہ کے فارغ التحصیل اور
حیدرآباد کی کلچر کے دلدادہ بزرگ تھے۔
عبدالوہاب عاصم قادری سے تلمذ تھا۔ مرشد
دکن مولانا عبداللہ شاہ سے بیعت تھی۔
تقریباً تمام اصناف سخن میں عبور حاصل تھا۔
زندگی کے آخری حصے میں صرف نعت گوئی کی
طرف رجحان اور روش رہا۔ "بزم حسان" کے بانی
اور سرپرست تھے اور آپ کو "حسانِ دکن"
کا خطاب بھی مرحمت ہوا تھا۔ نعتیہ کلام کا
مجموعہ "فاران" کے نام سے شائع ہو چکا ہے
صدیقی مرحوم کے تلامذہ میں نواب شفیع الدین
خان، سید جلال مرحوم، عقیل ہاشمی (مصنفِ
موجِ نور) اور کمال صدیقی قابلِ ذکر ہیں۔

۴ فروری: نامور ترقی پسند شاعر
اور دکن کے ہر دل عزیز کمیونسٹ قائد مرحوم
مخدوم محی الدین کے ۔۔۔ یوم پیدائش کے
موقع پر دو روزہ تقاریب اردو ہال
میں منعقد ہوئیں۔ پروفیسر جی۔ رام ریڈی
وائس چانسلر جامعہ عثمانیہ نے افتتاح کیا
مسٹر جسٹس گوپال راؤ ایکبوٹے نے صدارت
کی۔ مخدوم کی ادبی، ثقافتی اور سیاسی خدمات
کو مسز زہرہ، پروفیسر حبیب الرحمٰن، ڈاکٹر سی نارائن
ریڈی، عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست، مسٹر اختر
حسن جوائنٹ سکریٹری اردو اکیڈمی، اقبال
متین اور ۔۔۔ عالم علی خاں نے خراجِ عقیدت
ادا کیا۔ بزرگ کمیونسٹ قائد مسٹر روی
نارائن ریڈی نے مخدوم کی تصویر کی گلپوشی
کی۔ جسٹس ایکبوٹے نے صدارتی تقریر
کرتے ہوئے کہا کہ "مخدوم نے سماج کی
تشکیل کے لئے اپنی ساری زندگی وقف
کر دی تھی۔ وہ ایک عظیم شاعر اور محبت
و محنت کے سپاہی تھے۔ اس تقریب میں دکن
کے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں نے
شرکت کی۔ جناب سردار جعفری بھی مہمانوں
میں شامل تھے۔

شب میں محفل نغمہ منعقد ہوئی۔ معروف
موسیقاروں عارف رؤف، حکیم ۔۔۔ اور
بیگم ۔۔۔ نے مخدوم کا کلام پیش کیا۔

● جناب کے۔ یم خاں ۔۔۔
اردو بورڈ نے ایک بیان میں بتایا ہے کہ
مرکزی وزیر اطلاعات و نشریات مسٹر ۔۔۔ کے
اڈوانی نے دہلی میں ایک ملاقات کے موقع پر
انہیں اس امر کا یقین دلایا ہے کہ حیدرآباد کے
تقریباً بارہ لاکھ عوام کی اپنی زبان اردو
ہے، اس لئے حیدرآباد ٹی۔ وی پروگرام میں
اردو کی شمولیت حکومت کے زیر غور ہے مسٹر
خان نے وزیر موصوف سے اپنے بیان میں اس
امر کی عاجلانہ خواہش کا اظہار کیا ہے کہ وہ
جلد اس تجویز کو روبعمل لائیں۔

۵ فروری: مخدوم ۷۰ ویں سالگرہ
تقاریب کمیٹی کی طرف سے "اردو ہال" میں
ایک سمینار جناب علی سردار جعفری کی صدارت
میں منعقد ہوا۔ جعفری نے کہا کہ "مخدوم عصری
تاریخ ادب اور سیاست کا اہم حصہ تھے"
ڈاکٹر عالم خوندمیری نے بتایا کہ مخدوم کی شاعری
میں واقعیت اور خواب کے درمیان فصل
کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے اور یہی فاصلہ
بڑی شاعری کی پہچان ہوتا ہے۔ مخدوم کے ہمدم
دیرینہ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے بھی مخدوم کی
سیاسی اور ادبی خدمات اور ترقی پسند اقدار
سے اُن کی والہانہ وابستگی پر اظہار خیالات
کا اظہار کیا۔ مسٹر جی۔ پلا ریڈی نے تلگو میں تقریر
کرتے ہوئے مخدوم کی شاعری پر تبصرہ کیا اور
بتایا کہ ان کی نظموں کو سمجھنے کے ۔۔۔
۔۔۔ انقلاب کی آگ میں تپ کر محبت کیسے
کندن ہو جاتی ہے۔ شب میں جناب شاہد
تمکنت کی صدارت میں "یادِ مخدوم"

محفلِ شعر کا اہتمام ہوا۔ جناب اختر حسن نے صدارت کی۔ تقریباً ایک درجن سے زیادہ ترقی پسند اور جدید اقدار کے علاوہ کلاسیکل شعور رکھنے والے شعراء نے اس مشاعرہ میں کلام سنایا۔

● ادارۂ فقہِ ادب کی محفلِ رودیتی رائے محبوب نارائن کوثر کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ کئی شاعروں نے رباعیات سنائیں۔

۱۰ فروری کا بزمِ طالب رزاقی کا غیر طرحی مشاعرہ جناب خیرات ندیم کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جوہر ہاشمی نے نظامت کی۔ مسز صلاح الدین نیر، ڈاکٹر احسن رضوی، صادق نقوی، عزیز بھاسی، عبرت سکندرآبادی، عظیم حیدرآبادی، علی سوز، روشن خیال، رحمت یوسف زئی اور اسد رضا خلیل کے علاوہ کئی شعراء نے کلام سنایا۔

۱۲ فروری: ممتاز صحافی اور مصنف مولانا امداد صابری دہلوی ڈپٹی میئر دلی میٹروپالیٹن کاونسل نے ادارۂ ادبیات اردو کے دفاتر کا ... ایوانِ اردو میں معائنہ کیا۔ ادارہ کے شعبہ کتب خانہ، میوزیم اور مرکزِ خوشنویسی کی کارکردگی پر مولانا صابری نے خوشنودی کا اظہار کیا۔ ادارہ کی طرف سے موصوف کو ادارہ کے کتب خانہ کی مخزونہ فہرست مخطوطات کی تین جلدوں کا سیٹ تحفۃً دیا گیا۔

۱۳ فروری: میونسپل کارپوریشن حیدرآباد کی طرف سے دکن کے قائد انقلاب مولانا

بوزنگ سخنور علامہ حیرت بدایونی کی تیسری برسی کے موقع پر ان کی شعری و ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر درگاہ یوسفین سے جامع مسجد ملے پلی تک جانے والی شاہراہ کو حیرت بدایونی روڈ سے موسوم کیا گیا۔ اور سڑک کی دو جانب تختیاں آویزاں کی گئیں۔

۱۵ فروری: ممتاز مجاہدِ آزادی صحافی اور سخنور مولانا محمد علی جوہر کی پیدائش صدی تقاریب کے سلسلے میں بمقام ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ایک مشاورتی اجلاس جناب خواجہ محمد احمد ڈائرکٹر انسٹی ٹیوٹ کی صدارت میں منعقد ہوا اور ایک اسٹینڈنگ کمیٹی تشکیل دی گئی جس کے اراکین میں ریاستی انجمن ترقی اردو کے صدر نواب میر احمد علی خاں، جناب میر اکبر علی خاں سابق گورنر اڑیسہ، جناب عابد علی خاں صدر نشین مجلس انتظامی ریاستی اردو اکیڈیمی پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی اور جناب سید عباس لاہوتی شامل ہیں۔ ڈاکٹر محمد لطیف الدین کو کنوینر منتخب کیا گیا۔

۱۷ فروری: ریاستی گورنر مسز شاردا مکرجی نے تلگو اکیڈیمی کے زیرِ اہتمام منعقدہ ایک جلسہ کو مخاطب کرتے ہوئے لسانی اور عمومی تعلقات میں استواری کی خاطر ملک کی تمام قومی زبانوں کے لئے ایک ہی رسم الخط کے استعمال پر زور دیا۔

۱۹ فروری: اردو مجلس کا ماہانہ ادبی اجلاس ممتاز طنز و مزاح نویس ادیب جناب مرزا فرحت اللہ بیگ (دہلی) کی صدارت میں بمقام اردو ہال منعقد ہوا۔ جناب سری کرشن سنہا نے حیدرآباد کے قلندر کے زیرِ عنوان مضمون سنایا۔ جناب اختر حسن نے تاثرات سفرِ پاکستان پیش کئے۔ معروف عثمانین دانشور ادیب جناب مرزا ظفر الحسن کا تیس سال بعد ورودِ حیدرآباد پر اردو مجلس کی طرف سے خیر مقدم کیا گیا۔ مرزا صاحب نے بھی جلسہ سے خطاب کیا۔ محی الدین نوید اور گیان سنگھ شاطر نے کلام سنایا۔ جناب صلاح الدین نیر معتمد اردو مجلس نے جلسہ کی کارروائی چلائی۔ صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، ابن انشا، اعجاز صدیقی، شفیع الدین نیر اور محمود احمد ہنر کی وفات پر قرار دادِ تعزیت منظور کی گئی اور دو منٹ کی خاموشی منائی گئی۔

● اقلیمِ ادب کے خصوصی اجلاس کو جناب مرزا ظفر الحسن نے مخاطب کیا اور پاکستان میں اردو ادب اور ثقافت کی رفتار پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے غالب اکیڈیمی اور جناب فیض احمد فیض کے بارے میں کئی علمی و ادبی سوالات کے تشفی بخش جوابات دیئے۔

۲۰ فروری: جشن رحمت اللعالمین کے سلسلے میں کل ہند نعتیہ مشاعرہ "دارالسلام" میں جناب عابد علی خاں ایڈیٹر "سیاست" کی نگرانی میں منعقد ہوا۔ مسز زاہدہ آکاسی اور رفعت صدیقی (لکھنؤ) پروفیسر جلال لکھنوی، ہاشم جاد، امیر احمد خسرو، احمد معین رضوی، خواجہ شوق

(باقی ص ۱۱۳ پر)

بقیہ "اردو نامہ" صفحہ [illegible] سے آگے

بیرنگ، ہنگی فیض، ڈاکٹر احسن رضوی، صلاح الدین نیر، خواجہ فکر گوڈرشاہی، نصرت ندیم، سید شہید کا، صادق نقوی، راجہ لال راہبر، فیض الحسن خیال معظم عابدی اور کئی شعراء نے کلام سنایا۔ ڈاکٹر غلام مرزا نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔ ۲۲ر فروری: عثمانیہ یونیورسٹی نے جناب افضل اقبال کو مدراس میں اردو ادب کی نشو و نما ۱۸۷۹ء سے ۱۹۵۵ء تک کے موضوع پر مقالہ تحریر کرنے پر پی ایچ ڈی کی ڈگری کا مستحق قرار دیا۔ ڈاکٹر افضل نے یہ مقالہ ڈاکٹر سیدہ جعفر ریڈر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی کی نگرانی میں مکمل کیا۔ ادارۂ سب رس کی طرف سے ڈاکٹر افضل اقبال کو مبارکباد دی جاتی ہے۔ ۲۵ر فروری: معروف ترقی پسند شاعر اور صحافی جناب ش۔ و۔ عشرت کی شاعری کا پہلا مجموعہ "شہر دل" کے نام سے شائع ہوا۔ ڈاکٹر زینت ساجدہ ریڈر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ نے اس مجموعہ کا دیباچہ سپرد قلم کیا ہے "شہر دل" اس کے ناشر سوپر سانک۔ کا چیننگ سنٹر دیوان کی دیوڑھی حیدرآباد اور اردو اکیڈیمی بک ڈپو حیدرآباد سے خریدا جا سکتا ہے۔ ۲۶ر فروری: حیدرآباد کے ضرورت مند صحافیوں کی اعانت کے لئے ایک کلچرل پروگرام جناب محبوب حسین جگر جوائنٹ ایڈیٹر روزنامہ "سیاست" کی صدارت میں منعقد ہوا۔ تہذیبی سفیر جناب تحمل حسین ایم ٹیکس آفیسر مہمان خصوصی کی حیثیت سے رونق افروز تھے۔ پروگرام کے چیف آرگنائزر مسٹر راجکمار ڈوڈنل نے مرحوم شمس الدین کیفو (صحافی) کے علاوہ مسٹر کے پی سنتوسی کا نیوز ایڈیٹر دکن نیوز کو گیٹ زر پیش کیا۔ ۲۸ر فروری: ممتاز عثمانین، کانگریسی قائد ڈاکٹر ایم چنا ریڈی سابق گورنر یوپی حالیہ اسمبلی انتخابات میں کانگریس آئی کے ٹکٹ پر جیتے تھے اور پارٹی نے ریاست میں وزارت بنانے کی ذمہ داری انھیں سونپی۔

• ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے گولکنڈہ سوسائٹی کے تعاون کے ساتھ سہ روزہ یوم محمد قلی قطب شاہ تقاریب کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا۔ مسٹر من راج سکسینہ ایڈوکیٹ ان تقاریب کے ادارہ کی طرف سے معتمد عمومی نامزد کئے گئے۔ ادبی اجلاس کی معتمدی جناب محمد منظور احمد لکچرار سٹی کالج کے سپرد ہوئی۔ نشر و اشاعت کی معتمدی پر وقار خلیل کا انتخاب ہوا۔ آغا حسین ضابط معتمد استقبالیہ اور جناب میر ساجد علی سلطان معتمد مالیہ کمیٹی اور تلگو اجلاس کے کنوینر مسٹر کاسنر سمہوان ریڈی منتخب ہوئے —— •

اعلان بحکم پریس رجسٹرار حکومت ہند، فارم ۴ رول نمبر ۸

ایڈیٹر کا نام: سید علی اکبر
قومیت: ہندوستانی
پتہ: ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد ۴۔

پتہ: ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد ۴
پبلشر کا نام: سید علی اکبر
قومیت: ہندوستانی

[illegible] سید [illegible]
قومیت: [illegible]ستانی
پتہ: ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد ۴
نام و پتہ مالک: ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد ۴

[illegible] معلومات درج کی گئی ہیں، میرے علم میں صحیح ہیں۔ دستخط سید علی اکبر

ہمارے منصوبوں کو کامیاب ہونا چاہیئے

ہمارے پانچسالہ منصوبوں کا مقصد فیصلہ کن انداز میں ملک کے مستقبل کی تشکیل جدید عمل میں لانا ہے۔ برسوں سے ہمارے منصوبے ملک کی معاشی ترقی کی رفتار کو تیز سے تیز کرتے آرہے ہیں۔ آندھرا پردیش میں قومی تعمیر کی سرگرمیوں پر ان منصوبوں نے پائدار اثرات مرتب کئے ہیں۔

معاشی ترقی کے معاملے میں پانچواں منصوبہ سب سے زیادہ امید افزا ثابت ہوا ہے۔ منصوبے کے تحت اخراجات کی گنجائش سال ۷۴-۱۹۷۳ء میں ۹۳ کروڑ روپے تھی جو بڑھ کر ۷۵-۱۹۷۴ء میں ۱۴۸ کروڑ روپے۔ ۷۶-۱۹۷۵ء میں ۲۰۳ کروڑ روپے۔ ۷۷-۱۹۷۶ء میں ۲۹۸ کروڑ روپے اور ۷۸-۱۹۷۷ء میں ۳۸۳ کروڑ روپے ہوگئی ہے۔ اندازہ ہے کہ سال ۷۹-۱۹۷۸ء میں منصوبے کے تحت فراہم کی جانیوالی گنجائش ۴۵۰ کروڑ روپیوں تک پہنچ جائے گی۔ اس طرح سال ۷۹-۱۹۷۸ء منصوبہ جاتی اخراجات کی رقم پورے چوتھے منصوبے کی رقم کے تقریباً مساوی ہوجائیگی جو ۴۹۹ کروڑ روپے تھی۔ پانچویں منصوبے کی پہلی مدت کے دوران ۱۴۸۰ کروڑ روپے سے زائد رقم خرچ ہوگی جو چوتھے منصوبے کے اخراجات سے تین گنا زیادہ ہے۔

ہمارے منصوبوں کی کامیابی کی صورت میں ہی
عوام خوشحالی سے ہمکنار ہوسکتے ہیں

ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ
حکومت آندھرا پردیش - حیدرآباد

MR. No. 38/77-78/366

سن اجراء: ۱۹۳۸ فون: ۳۸۴۶۹

یادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

نگران:
سید علی اکبر ایم اے (کیمبرج)
معتمد مجلس مشاورت:
غلام جیلانی
مرتب:
وقار خلیل

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد

مجلس مشاورت
ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
ڈاکٹر غلام عمر خاں
رحمن راج سکسینہ
عابد علی خاں
محمد منظور احمد

جلد: ۴۱ شمارہ: ۴ اپریل ۱۹۷۸ء

زر سالانہ: ۱۵ روپے ششماہی: ۸ روپے فی شمارہ: ایک روپیہ پچاس پیسے

ترتیب

[illegible] اشاعت [illegible]

روشن مستقبل

آندھرا پردیش شیڈولڈ ٹرائبس کارپوریشن ۔ گریجن کوآپریٹیو کارپوریشن ۔ گریجن ڈیولپمنٹ ایجنسی اور انٹیگریٹیڈ ٹرائبل ڈیولپمنٹ ایجنسی کی تشکیل کی بدولت ریاست آندھرا پردیش جائز طور پر یہ دعویٰ کرسکتی ہے قبائیلیوں کی ترقی کے لئے ایک مستحکم ادارہ جاتی بندوبست فراہم کرنے کے معاملے میں وہ ملک کی اولین ریاست ہے ۔

یہ ریاست اس بات پر فخر کرسکتی ہے کہ اس نے پہاڑوں کی آغوش میں پرورش پانے والے اپنے باشندوں کو ایک نیا معاشی نظام عطا کیا ہے ۔ تیسرے منصوبے میں قبائیلی بہبود کے لئے اخراجات کی گنجائش ۰۸ ر ۱ کروڑ روپے تھی جو بڑھ کر پانچویں منصوبے میں ۶۵ ر ۴۵ کروڑ روپے ہوگئی ہے ۔

منصوبہ جاتی اسکیمات ۔ زراعت ۔ افزائش مویشیاں ۔ برقی ۔ چھوٹی آبپاشی اور تعلیم سے متعلق سرگرمیوں پر مرکوز ہیں ۔ آج ایسی طاقتیں رُو بہ عمل ہیں جو ترقی کے لئے کوشاں ہیں ۔ قبائیلیوں کو ان کی اپنی دقیانوسی دنیا سے "اور تابناک ماحول میں لایا جائے"

ایک روشن مستقبل ان کے انتظار میں ۔

ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ
حکومت آندھرا پردیش حیدرآباد

اپنی بات

سب رس کے یوم قلی قطب شاہ نمبر کو علمی، ادبی اور دکنیات کا ذوق رکھنے والے حلقوں میں پسند کیا گیا۔ دکنی ادبیات سے جامعاتی سطح پر اب تک جس طریقے سے جائزہ لیا جا رہا ہے۔ اُسے تسلیم کیا جانا چاہیئے۔ جامعہ عثمانیہ کے محققین نے اس جانب قرار واقعی سعی مشکور کی ہے۔ ضرورت ہے کہ نئے اسکالر بھی اپنی مثبت توجہات دکنیات شناسی کی طرف مرکوز کریں، گزشتہ دنوں لندن کے ایک اسکالر ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز نے دکنیات پر فاضلانہ خطبہ دیتے ہوئے قدیم زبانوں کی لسانیات کی کوششوں کی تائید کی ہے اور بتایا کہ عصری زبانوں اور ان کے ادبی ورثہ کے استحکام میں قدیم ذخیرۂ ادب سے شناسائی ضروری امر ہے۔ ملک کی بیشتر جامعات میں دکنی ادب محض نصاب کے ایک گوشہ کی حد تک پڑھایا یا پڑھایا جاتا ہے۔ اگلے محققوں کی طرح دکنیات پر تحقیق اور توجہ میں تخلیقی عناصر فروگزاشت نظر آتے ہیں۔ اس طرف لسانیاتی شعور رکھنے والوں کو توجہ دینا چاہیئے۔

دکنیات کی ایک ببلیوگرافی کی ترتیب و اشاعت بڑی حد تک عصری ضرورت ہوگی اور اس کام کی تکمیل بلد ہو جائے تو بجائے خود ایک کارنامہ ہوگا۔

"سب رس" کے اس شمارے میں "قندِ مکرر" کے صفحات میں ملک کے مشہور مجاہدِ آزادی، تحریک خلافت کے بانی مبانی رہنماؤں میں کے دستِ راست مولانا محمد علی جوہر کی صد سالہ پیدائش تقاریب کے موقع پر چند اہم تحریریں شائع ہو رہی ہیں۔

مولانا محمد علی ملک کی تحریک آزادی کے جیالے سپاہی، نڈر اور بے باک محبِ وطن اور شعلہ بیان مقرر، فاضل ادیب، صحافی اور سخنور ہی نہیں، آزاد ہندوستان کی خاطر تخت یا تختہ کا نعرہ لگا کر فرنگیوں سے ملک کو آزاد کرانے کی روشن ترین مثال قائم کی۔ ایسے صاحب کردار قومی رہنما کی یاد نئی نسلوں میں ملک اور قوم سے رشتہ استوار کرنے کا سبب بنے گی۔

سب رس نے صفحات نئے اور با شعور قلمکاروں کی جرید حوصلہ افزائی کا ابتدا ہی سے ثبوت دیا ہے۔ اس بار بھی بیشتر نئے لکھنے والوں کی اچھی تخلیقات شائع ہو رہی ہیں۔ صاحبِ فکر و نظر اصحاب کی متوازن اور سلجھی ہوئی تحریریں بھی آپ کی نظر سے گزریں گی "مستقل عنوانات" کے تحت بھی منتخب اور کیف و رنگ رس پیش کیا جا رہا ہے۔

باوجود یاد دہانی، ہمارے بعض خریداروں نے زرِ سالانہ کی تجدید نہیں کی ہے۔ پھر ایک بار اُن اصحاب سے ادارہ خواہش کرتا ہے کہ اپنے ذمہ کی واجب الادا سالانہ قیمت جلد سے جلد روانہ فرمائیں اور سب رس کی توسیع اشاعت میں اپنے مخلصانہ تعاون سے مدد کریں۔

(غلام جیلانی)

جگن ناتھ آزاد

اقبال اپنی نظر میں

یہ نشری بات چیت دہلی کے ایک روزہ قیام میں محترمی رفعت سروش کی خواہش پر ازرہِ مجلس کے لئے قلم برداشتہ لکھی گئی تھی۔ اُس وقت حوالے کیلئے کوئی کتاب میرے سامنے نہیں تھی۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ کسی شعر کے حوالے میں مجھ سے سہو ہو گیا ہو۔ خیال تھا کہ کسی وقت کلام اقبال کے مجموعوں کو سامنے رکھ کر اس بات چیت پر نظر ثانی کر دوں گا۔ لیکن اس کا موقع نہ مل سکا۔ (جگن ناتھ آزاد)

ہر بڑے شاعر کی طرح اقبال کے اندر بھی ایک بڑا نقاد پوشیدہ تھا جس نے اقبال کی شاعری، اقبال کے فکر و نظر اور اقبال کے نظریات پر احتساب کا کام اول سے آخر تک جاری رکھا۔ اس نقاد کا شاعر سے الگ ایک اپنا وجود بھی رہا اور اس کی شخصیت شاعر کی شخصیت کا ایک حصہ بھی رہی۔ اس نقاد نے شاعر کی شخصیت کا حصہ بن کر اقبال کے کلام میں وہ کیفیت پیدا کی جس سے اکثر و بیشتر شعراء کا کلام محروم رہتا ہے۔

آپ اگر اجازت دیں کہ میں اقبال کے تعلق سے نقد و نظر کو بھی جذبہ ہی کہوں تو میں یہ کہوں گا کہ نقد و نظر کے اس جذبے نے اقبال کے کلام میں کیوں اور کیا کی ایک ایسی کیفیت پیدا کر دی جس کے آئینے میں ہمیں یہ دیکھنے کا بخوبی موقع ملا کہ اقبال خود اپنی شاعری اور اپنے نظریات کے بارے میں کیا سوچتے تھے۔ اور کیا کہتے تھے۔

ابھی اقبال کی شاعری کی ابتدا ہی تھی کہ انھوں نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے ایک اجلاس میں "ابر گہر بار" کے عنوان سے ایک طویل نظم پڑھی۔ یہ نظم بعد میں "فریاد امت" کے نام سے ایک کتابچے کی صورت میں شائع ہوئی۔ یہ وہی نظم ہے جس کا صرف ایک بند "دل" کے عنوان سے "بانگ درا" میں شامل ہے۔ اور جس کا پہلا مصرع ہے۔

قصۂ دار و رسن بازیِ طفلانۂ دل

اس طویل نظم میں اقبال کہتے ہیں۔

زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں

رند کہتا ہے ولی مجھ کو ولی رند مجھے
سن کے ان دونوں کی تقریر کو حیراں ہوں میں

کوئی کہتا ہے کہ اقبال ہے صوفی مشرب
کوئی کہتا ہے کہ شیدائے حسیناں ہوں میں

دیکھ اے چشمِ عدو مجھ کو حقارت سے نہ دیکھ
جس پہ خالق کو بھی ہو ناز وہ انساں ہوں میں

یہاں چند اشعار کو اقبال کی تخلیقی صلاحیت کا تجزیہ کرنا مقصود نہیں بلکہ یہ کہ اقبال کی شاعری نے بعد میں جو ایک کیفیت یا جہت انداز پیدا کیا اور ایک جداگانہ طرزِ ادا کی نسبت اختیار کی وہ سال یا سال پہلے اقبال کے دیدۂ دل کو اپنی جھلک دکھا رہی تھی۔ مذکورہ چند اشعار میں اقبال نے اپنی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر جس طرح سے بھرپور تبصرہ کیا ہے۔ وہ اس عظیم فنی شخصیت کا کمال ہے۔ جو ایک بڑے شاعر اور بڑے نقاد کے امتزاج سے پیدا ہوتا ہے۔

اقبال کے یہاں اپنی شاعری کا یہ احتساب ہمیں "اسرارِ خودی" سے "ارمغانِ حجاز" تک کئی مدارج طے کرتا نظر آتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اقبال اپنے بارے میں کیا کہتے تھے یعنی اقبال کا اپنی نظر میں کیا مقام ہے۔ فکر و فن اقبال کا ایک ایسا پہلو ہے جو اقبال کی نظم و نثر میں نمایاں طور پر ہمارے سامنے آتا ہے۔ "اسرارِ خودی" میں فن و فکر پر بحث کرتے ہوئے اقبال خود اپنی شاعری کو زیرِ بحث لاتے ہیں۔ اور شعر اور مقصد کو ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

مراۃِ شب چوں مہرِ عالمتاب زد — گریۂ من بر رخِ گل آب زد
باغباں زورِ کلامم آزمود — مصرعے کارید و شمشیرے درود

یہ اقبال کا ۱۹۱۵ء کا کلام ہے اور ممکن ہے "اسرارِ خودی" کا یہ حصہ اس سے پہلے کا ہو اور غالباً ہوگا۔ لیکن کس قدر مقامِ غیرت ہے کہ اقبال اپنے زورِ کلام پر "مصرعے کارید و شمشیرے درود" کا اطلاق کر رہے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں شاعری پیغمبری کا جزو ہو جاتی ہے۔

اپنی شاعری اور اپنا فکر اقبال کے نقد و نظر کا خاص موضوع رہے ہیں۔ "گلشنِ رازِ جدید" میں کہتے ہیں۔

مپنداری کہ من بے بادہ مستم — مثالِ شاعراں افسانہ بستم
نہ بینی خیر ازاں مردِ فرودست — کہ بر من تہمتِ شعر و سخن بست
بکوئے دلبراں کارے ندارم — دلِ زارے غمِ یارے ندارم
بہ جبریلِ امیں ہم داستانم — رقیب و قاصد و دربان ندانم

ان اشعار میں اقبال صرف اپنی شاعری ہی پر نہیں بلکہ اپنے دور کی اور اپنے دور سے پہلے کی "اردو" اور فارسی شاعری پر بھی تبصرہ کر رہے ہیں۔ اور ساتھ ہی اعلیٰ شاعری اور عمومی شاعری کا فرق سمجھا رہے ہیں۔ اقبال کی نظر میں کوئے دلبراں والی شاعری یا دوسرے لفظوں میں رقیب اور قاصد اور دربان والی شاعری چھوٹے درجے کی شاعری ہے۔ بڑی شاعری نہیں ہے۔ بڑی شاعری اقبال کے نزدیک وہ ہے جس کا نقشہ اقبال نے اس طرح کے اشعار میں پیش کیا ہے۔

شاعرِ دلنواز بھی بات اگر کہے کھری — ہوتی ہے اس کے فیض سے کشتِ سخنوری ہری
شاعرِ رنگیں نوا ہے دیدۂ بینائے قوم

اس نظم میں آگے کہتے ہیں۔

مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ — کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

اس مقالے میں بنیادی طور پر کوشش کی جا رہی ہے یہ ایک حقیقت ہے کہ اقبال کا کلام اوّل سے آخر تک [illegible] میلان پیدا [illegible]

تجزیہ شعر کے سلسلے میں سب سے مشکل بات یہ لگتی ہے کہ وہ عنصر جو شعر میں تخلیقی یا شعری طلسمات کے ساتھ جو سامنے شعر کی صفت کے تخلیق ہوتی ہے اس کو منطقی انداز میں کیا جا سکتا ہے مگر یہ بات ضروری ہے کہ ہر بڑا شاعر اپنے کلام کا تجزیہ کرنے پر قادر ہوتا ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہوتا ہے۔ بڑے شعرا نے اکثر اوقات فلسفیانہ مسائل کا ذکر استفہامیہ انداز میں کیا ہے۔ غالب کے یہاں کسی نہ کسی شکل میں ہو [illegible] صورت میں ملتے ہیں۔ انہوں نے اکثر ان شعری خصوصیات کے بارے میں ایسے سوالات پیش کئے ہیں جو ان کے کلام میں عناصر ترکیبی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اقبال بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ ۱۹۱۱ء یا ۱۹۱۲ء کے زمانے کی ان کی ایک غزل ہے۔ جس میں وہ کہتے ہیں:

سخن میں سوز الٰہی کہاں سے آتا ہے — یہ چیز وہ ہے کہ پتھر کو بھی گداز کرے

گویا شعر میں سوز کی موجودگی شعر کا ایک ایسا پہلو ہے جو شعوری طور پر اقبال کی گرفت میں نہیں آ رہا ہے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس سوال نے اقبال کو کتنی مدت پریشان رکھا ہوگا۔ اور اس گتھی کو سلجھانے کے لئے انہیں کتنی بے خواب راتیں بسر کرنا پڑی ہوں گی۔ لیکن ۱۹۳۲ء میں جب وہ آسمانوں کی سیر کے دوران میں بہشت بریں میں پہنچتے ہیں۔ اور وہاں ان کی ملاقات ہندوستان کے ایک اور عظیم شاعر بھرتری ہری سے ہوتی ہے۔ تو ان سے پہلا سوال وہ یہ کرتے ہیں:

شعر را سوز از کجا آید بگو — از خودی یا از خدا آید بگو

گویا اپنے کلام کو سوز و گداز سے معمور کر دینے کے باوجود اقبال سوز و گداز کا راز پانے کیلئے اس کا تجزیہ کرنے کی کوشش میں مصروف رہے۔ اور بیس برس تک اس کوشش میں مصروف رہنے کے بعد ایک بار پھر اس سوال کو دہرا کے قاری کو اس حقیقت سے آگاہ کرتے ہیں کہ میں ان بیس برس کی مدت میں اس سوال کا جواب نہیں پا سکا۔ [illegible] میں وسعت نظری کی مثالوں میں یہ ایک مثال ہے۔

تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ یعنی RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM اقبال کی ایک ایسی انگریزی تصنیف ہے، انگریزی زبان میں جس کا دنیائے فلسفہ میں بہت اونچا مقام ہے۔ یہ کتاب شروع میں چھ لیکچروں پر مشتمل تھی۔ بعد میں ان کی تعداد سات ہو گئی۔ اس کے دیباچے میں آپ لکھتے ہیں (اب اس عبارت کے صحیح الفاظ تو مجھے یاد نہیں۔ مفہوم پیش کر رہا ہوں)

فلسفے میں قطعیت نام کی کوئی شے نہیں ہے۔ جوں جوں وقت گزرتا جائے گا اور کاروان فکر یا علم آگے بڑھتا چلا جائے گا اغلب ہے کہ ان خیالات سے جو ان مقالات میں پیش کئے گئے ہیں۔ زیادہ بہتر خیالات اہل نظر کے سامنے آئیں۔

گویا اقبال کی رائے اپنی فلسفیانہ تحریروں کے متعلق انتہائی حد تک ترقی پسندانہ تھی اور اپنی تحریروں کو انہوں نے حرف آخر نہیں سمجھا۔ اگرچہ حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ کتاب RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM کے مباحث آج تک ذہن انسانی کی اسی طرح رہنمائی کرتے ہیں جس طرح ۱۹۲۸ء اور ۱۹۲۹ء میں کرتے تھے۔

اس ضمن میں [illegible] قارئین کے سامنے لانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اقبال نے فکر [illegible] طالب علم کی حیثیت کو بہت اہمیت دی ہے۔ [illegible] ایک طالب علم [illegible] جہاں تک [illegible] کا تعلق ہے۔ [illegible] اشعار سے [illegible]

زیارت گاہ اہل عزم و ہمت ہے لحد میری — کہ خاک راہ کو میں نے بتایا راز الوندی

یا
چو رخت خویش بربستم ازیں خاک ہمہ گفتند با ما آشنا بود
ولیکن کس ندانست ایں مسافر چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود

یا
میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری نفس مرا شعلہ بار ہوگا

یا
اندھیری شب ہے جدا اپنے قافلے سے ہے تو ترے لیے ہے مرا شعلۂ نوا قندیل

لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ بعض مطالب علامہ زندگی بھر کسمسانے کی نوبت کی ہے۔ وہ بھی اپنی جگہ ایک حقیقت ہے۔ نثر میں بعض دوستوں نے ایک جگہ اس طرح کی بات لکھی ہے کہ شاعری کو بطور فن سیکھنے کے لئے جو وقت درکار ہے وہ مجھے نہیں ملا۔ اس لئے میری شاعری کو فنی باریکیوں کے اعتبار سے دیکھنا عبث ہے۔ ایک اور موقع پر یہ کہہ چکے کہ ممکن ہے آنے والی نسلیں مجھے شاعر ہی نہ سمجھیں مجھ کو کہنا ہے اسی کہنا اس کلمہ سے بڑے ہونے (انکسار کا نتیجہ ہو۔ لیکن جہاں تک طالب علم کا اور دوسروں کے کمالِ فن کے اعتراف کا تعلق ہے۔ انہوں نے اکثر اس کا اظہار کیا ہے۔ اپنی ایک نظم میں جس کا عنوان ہے "جاوید سے" کہتے ہیں۔

کیا میری بساط ہے جہاں میں بس ایک فغانِ زیرِ بامی
نایاب نہیں متاعِ گفتار صد انوری و ہزار جامی

اور پھر چونکہ انہیں اس امر کا بڑی احساس ہے کہ ان کا کلام تہہ در تہہ معنویت سے لبریز ہے اور اس کا محض سطحی طور پر مطالعہ قاری کو بعض غلط اندیشیوں میں بھی مبتلا کر سکتا ہے۔ انہوں نے اپنے کلام کے مطالعے سے متعلق قاری کو انتہائی طور پر محتاط ہونے کا درس دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

کرم شب تاب است شاعر در شبستانِ وجود در پر و بالش فروغے گاہ ہست و گاہ نیست

احتیاط کو انہوں نے اور موقعوں پر مختلف اسالیب میں بیان کیا ہے۔ تاکہ ان کے اور قاری کے درمیان کم سے کم فاصلہ باقی رہے مثلاً

صاحبِ ساز کو لازم ہے کہ غافل نہ رہے گاہے گاہے غلط آہنگ بھی ہوتا ہے سروش

اور ایسے ہی بنیادی واضح انداز میں اسی بات کو یوں کہتے ہیں

گہ مری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجود گہ الجھ کے رہ گئی میرے توہمات میں

"بالِ جبریل" اقبال کا نغمۂ آرزو اور مجموعۂ کلام ہے جس میں یہ پہلو اور زیادہ وضاحت کے ساتھ جھلک اٹھتا ہے۔ اور یہ بات نامکمل رہ جائے گی اگر میں اس بات چیت کو ختم کرتے وقت ان ہی پیارے اقبال کے چند شعر اس محفل میں پیش نہ کروں

فطرت نے مجھے بخشے ہیں جوہر ملکوتی خاکی ہوں مگر خاک سے رکھتا نہیں پیوند
درویشِ خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند
کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق نے ابلہِ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند
مشکل ہے کہ اک بندۂ حق بین و حق اندیش خاشاک کے تودے کو کہے کوہِ دماوند

عابد النساء

آلِ احمد سرور بحیثیت نقاد

آلِ احمد سرور اردو ادب کے خدمت گزاروں میں اہم حیثیت کے حامل ہیں۔ وہ ایک بلند پایہ ادیب و نقاد ہی نہیں بلکہ ان کا شمار اردو کے بلند پایہ تنقید نگاروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے ابھی تک کسی ایک موضوع پر مستقل کتاب تصنیف نہیں کی صرف مختصر و طویل مضامین لکھے ہیں۔ سرور صاحب ایک صاحب بصیرت نقاد ہیں۔ انھوں نے اردو تنقید میں خلوص اور مفید اضافے کئے ہیں۔ ان کے بعض مضامین اہم کتابوں پر بھاری معلوم ہوتے ہیں۔ سرور صاحب نے جمالیاتی اور سماجیاتی تقدروں کے ساتھ ساتھ اخلاقی اقدار کی اہمیت پر بھی زور دیا۔ انھوں نے صحیح معنوں میں جدید اردو تنقید کو جنم دیا اور پروان چڑھایا ہے۔ ان کی تنقیدی تحریروں نے تنقیدی افق کو وسیع کیا۔ اردو میں تنقیدی اصول و نظریات سے روشناس کیا۔ تنقید کو ایک مستقل فن کی بات بنایا اور سنجیدگی بخشی۔ وہ صرف موجودہ عالمی اصول نقد سے واقف ہی نہیں بلکہ فنی قدروں کی آگہی بھی رکھتے ہیں۔ وہ مغربی نظریوں کو آزادانہ کے ساتھ اپنے تصرف میں لاتے ہیں۔ ان کے فلسفیانہ طرز تفسیر نے اردو میں سنجیدہ، صاف اور رواں نثر کو عام کیا ہے۔

پروفیسر آلِ احمد سرور کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے تنقیدی شعور سے ادب کی صحیح راہیں متعین کیں اور ترقی پسند شاہراہ پر بڑے وقار اور متانت کے ساتھ گامزن ہو گئے۔ اردو تنقید میں سرور صاحب کا تنقیدی شعور صحیح تنقیدی نمونے پیش کرسکتا ہے۔ وہ نہ مشرقیت سے بیزار ہیں اور نہ مغربیت کی کورانہ تقلید کرتے ہیں۔

آلِ احمد سرور ایک اچھے نقاد ہیں ان کی تنقیدیں ابھرتی ہیں پھر بھی ان کے برتنے کا انداز ایک انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت انصاف ہے جو نقاد کے لئے ضروری ہے۔ نقاد کی حیثیت سے سرور صاحب نے ایک خاص شہرت حاصل کرلی ہے۔ جس کی خاص وجہ یہ تھی کہ سائنس سے بھی واقف ہیں اور انگریزی ادب کے ماہر ہیں۔ انھوں نے انگریزی ادب سے بنیادی اصول اخذ کرکے اپنی زبان کو وسعت عطا کی۔

سرور صاحب کی تنقیدی تحریروں کی اہمیت صرف اسی بنا پر نہیں ہے کہ ان کی تحریروں میں ذہنی توازن، فکری بصیرت اور فنی رمز شناسی کا ہم آہنگ ہوگیا ہے۔ بلکہ ان کی تنقیدی تحریریں اپنی ادبیت کی وجہ سے ایک مستقل قدر و قیمت رکھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا شمار صاحب طرز نقادوں میں ہوتا ہے۔

سرور صاحب مغربی ادب سے متاثر ضرور ہیں لیکن مشرقی ادب سے بیزار نہیں ہیں۔ انھوں نے مغرب کے تنقیدی اصولوں سے کام لیا ہے۔ اور مغربی شاعروں اور انشا پردازوں کے اقوال و خیالات بھی پیش کئے ہیں۔ لیکن ان کی تحریروں میں مغرب زدگی

احساس نہیں ہوتا کہ اجارہ دار تجربے کا مغرب کے اثرات کے ساتھ ساتھ ان کے یہاں مشرقی تنقید کے اثرات بھی ملتے ہیں۔ وہ نہ تو ترقی پسند تحریک کے مخالف ہیں اور نہ قدامت پرستی کے قائل ہیں۔ بلکہ انہیں قدیم و جدید کا سنگم کہا جاتا ہے۔ مزاج کے اعتبار سے مشرقی ہیں اور ذہن کے اعتبار سے مغربی۔ سرور صاحب اپنی تحریروں میں جدت، تخیل، حسن اور تشبیہ و استعارات سے بھی کام لیتے ہیں۔

پروفیسر آل احمد سرور تنقید میں اشتراکیت اور مارکسیت تک تو نہیں جاتے لیکن سائنٹیفک تنقید کے بنیادی عناصر ان کے نظریات تنقید اور انداز تنقید دونوں میں موجود ہیں۔ انہوں نے شعرا اور مصنفین پر تنقیدیں نہیں لکھی ہے بلکہ کچھ اصول تنقید بھی مرتب کئے ہیں۔

سرور صاحب نقاد کے لئے جن چیزوں کا لحاظ کرتے ہیں۔ اس کے متعلق جاوید وششٹ لکھتے ہیں؟ اردو تنقید کے ارتقا میں لکھتے ہیں۔

"وہ نقاد کے لئے کسی وطن کا ہونا ضروری قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں اس کا ایک نقطۂ نظر ضرور ہونا چاہیئے۔ لیکن ادب کے لئے کسی خاص جماعت یا نظریے سے اپنے آپ کو وابستہ کرلینا مناسب نہیں اس کے لئے ادبیات کی قدر بھی ضروری ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ نئے نئے تجربات کو نظر انداز کرے۔ سرور ان کو اچھی نظر سے نہ دیکھے۔ تنقید کا مطلب ان کے خیال میں تشریح نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک ادبی شعور میں گہرائی اور تازگی پیدا کرتی ہے۔"

سرور صاحب ادب کو زندگی کا ترجمان کہتے ہیں۔ اور اس کو تنقید حیات سمجھتے ہیں۔ وہ ادب برائے ادب کے قائل نہیں اور نہ یہ مانتے ہیں کہ ادب انفرادی کوشش کا نتیجہ ہے۔ ان کے تنقیدی تحریروں میں انتہا پسندی نہیں۔ ان کی تنقید میں مارکسی اثرات کم ہیں۔ آل احمد سرور پروفیسر کلیم الدین احمد کی طرح اپنے ادبی سرمائے سے مایوس نہیں۔ وہ تنقید کے تیشے سے صرف بت شکنی کا کام ہی نہیں لیتے بلکہ بت تراشتے بھی ہیں۔

سرور صاحب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی شخصیت مشرق و مغرب کی ادبی ثقافت کا حسین و متوازن امتزاج ہے جس کا ان کے ساتھ انہوں نے جو مخالف عناصر کو یکجا کیا ہے اس کی مثال اردو ادب میں کم ہی ملتی ہے۔ اردو ادب کو مغربی افکار و اصول سے روشناس کرانے میں آل احمد سرور کا حصہ سب سے زیادہ ہے۔ اردو ادب کی تاریخ میں تنقید کے مغربی اسلوب کو انہوں نے فطری حیثیت دے دی ہے جس میں کسی اجنبیت اور تصنع کا احساس نہیں ہوتا۔ سرور صاحب اسی لئے وہ پہلے نقاد ہیں جنہوں نے کلاسیکی اور اقبال کے نظریۂ فن کو اپنے تنقیدی نظریات میں داخل کیا ہے۔ اہل بصیرت حضرات کے لئے سرور صاحب کا ادب ایک درخشاں مشعل راہ ہے۔

تنقید کرتے ہوئے سب سے پہلے سرور صاحب کی نظر اس زندگی اور ماحول پر پڑتی ہے جو شاعر یا مصنف کی اپنی تخلیق سے وابستہ ہے۔ ان کی تنقید میں جمالیاتی رنگ موجود ہے۔ انہوں نے اپنی تنقید سے ماضی کے پرانے نقوش کو اجاگر کیا ہے۔ اگرچہ دور حاضر کے تمام مشرقی اور مغربی اثرات کو ان کی تنقیدوں میں سمیٹ لیتے ہیں لیکن اپنی طرز میں بدلنے کی جانب توجہ

کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اعتدال کا انداز ان کے یہاں مکمل صورت میں نظر آتا ہے۔ سرور صاحب کی تنقید کا اہم رجحان سماجی اور اقداری تنقید ہی کی طرف رہا ہے۔ لیکن اس میں انتہا پسندانہ کیفیت نہیں۔ وہ اس سلسلہ میں ترقی پسندوں کی طرح اشتراکی نہیں ہو جاتے۔ وہ ادب کے سماجی اور عمرانی اہمیت کے قائل ہیں۔ ادب ان کے نزدیک ایک مقصدی ہونا چاہیئے۔ سماجی اور اجتماعی زندگی ہمیشہ ان کے پیش نظر رہی ہے۔ انھوں نے اپنی تنقیدوں میں عقل و شعور سے کام لیا ہے۔ ادب کے جو صحت مند اور صحت بخش تصورات ہیں وہ سرور صاحب کے یہاں ایک متوازن حالت میں ملتے ہیں۔

آل احمد سرور متعدد جہات کے مصنف ہیں۔ لیکن ان پر کوئی لیبل چسپاں کرنا آسان نہیں۔ ان کی تنقید کی ابتدا انگریزی کے اثر سے ہوئی آئی۔ اے۔ رچرڈس اور ٹی ایس ایلیٹ کے خیالات کو اپنایا اور انھیں عصریت عطا کی۔

سرور صاحب کا خیال ہے کہ نقاد خواہ کسی بات کو پسند کرے یا نہ کرے لیکن اس کی اچھائی کا اعتراف وہ ضرور کرے۔ انھوں نے نااہل تنقید کو شکل اہم سے تعبیر کیا ہے۔ سرور صاحب نے اردو تنقید کو معروضیت، تحمل کا احساس اور ایک خاص توازن اور اعتبار کی بخشی ہے۔ ان کی تنقید میں ادبی تعصبات اور جذباتیت سے اجتناب ملتا ہے۔ سرور صاحب ادب کے تمام میلانات سے استفادہ کرتے اور انھیں برتنے اور ان کی اچھائیوں کو اپنانے پر زور دیتے ہیں۔ وہ ترقی پسند تحریک کے حامی ہیں۔ انھوں نے ادب برائے ادب کے رجحان کی سخت مخالفت کی ہے جس کی آڑ میں نراجیت اور رجعت پسندی کی نشو و نما ہوتی ہے۔ سرور صاحب ادب میں افادیت، خارجیت اور عصریت کے قائل ہیں۔ ان کے خیال میں ایک جامع اور مکمل تنقید ان تمام محرکات اور عوامل کا احاطہ کر لیتی ہے جو ادب اور زندگی کو مختلف سمتوں سے متاثر کرتے ہیں۔

سرور صاحب کے نزدیک تنقید شعر کا بوجھ کرنا نہیں ہے بلکہ اعلیٰ شعور میں گہرائی اور تازگی پیدا کرنے کے مترادف ہے۔ وہ تنقید کو کسی تخلیقی ادب سے کم نہیں سمجھتے۔ وہ تنقید میں معقولیت اور توازن کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ سرور صاحب تنقید کو ایک سنجیدہ، اہم اور مشکل کام سمجھتے ہیں۔ ان کا مقصد طلب فن کا نہیں بلکہ قدروں کی اشاعت ہے۔ اس لئے اپنے قاری سے علاوہ سنجیدگی، متانت اور صحت فکر کا مطالبہ کرتے ہیں۔

آل احمد سرور کلیم الدین احمد کے برخلاف ادبی تنقید میں تجربے کو صحیح نہیں سمجھتے جس طرح کلیم الدین احمد راست حملہ کرتے ہیں اور سختی سے کام لیتے ہیں سرور صاحب اس کے برخلاف ہیں۔ وہ اپنی تنقید کو مکمل نہیں سمجھتے جب تک کہ پوری طرح اپنے نقطہ نظر سے قاری کو روشناس نہ کرا دیں۔ ان کی تنقیدوں میں فکر کی گہرائی اور گیرائی، سنجیدگی اور بے پناہ متانت ہوتی ہے۔ سرور صاحب اردو تنقید کی ایک زبردست شخصیت ہیں ان کا طرز اظہار بھی دلکش ہے۔ جس نے تنقید کو تحقیق سے ہم آہنگ کیا اور اس کے پڑھنے پڑھانے کو ایک شغف، طلب اور بافت کے بجائے ایک مسرت انگیز مشغلہ بنا دیا۔ عصریت کا یہ انداز ادب میں صحت مند تنقید کو عام کرنے میں بہت بڑا حصہ ادا کرتا ہے۔

▲ ▲ ▲

مصطفیٰ شروانی

انگریزوں کی اُردو خدمات

صحن چمن سے قدرتِ دیرینہ ہے دور   حسرت نصیب دل ہے ہر اک انجمن سے دور

یہ شعر میر یا مومن کا نہیں ہے نہ سودا یا مصحفی کا ہے بلکہ جارج پیش شور نامی ایک انگریز شاعر کا ہے جو نواب نظر محمد خان والیٔ بھوپال کے وزیر خاص تھے۔ مطلع جیسا حسین ہے بعد کی پوری غزل ایسی ہی مرصع ؛

گھیرے ہوئے تھیں عشق میں ناکامیاں مجھے   تھی حد ممکنات میری انجمن سے دور
شکوہ نہ باغباں کا نہ صیاد کا گلہ   لکھا مرے نصیب نے مجھ کو چمن سے دور

اُردو مجلس کے ایک حالیہ خصوصی جلسہ میں ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز کی عالمانہ اُردو تقریر موصوف کے اُردو ادب و شاعری اور علم لسانیات پر کامل عبور اور یہ سدی لسانی واردات محض دس سالہ علم و تجربہ اور دیگر مستشرق معلمات کا نتیجہ اس تاثر کو جنم دیتا ہے کہ ہندوستانی زبانوں اور بالخصوص اُردو ادب و شاعری سے یورپی اصحاب کی وابستگی اس خوبصورت زبان کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔

یہ امر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اُردو زبان کی سب سے پہلی مستند گرامر ۱۷۱۵ء میں جان جوشوا کیٹلر نامی ہالینڈ کے ایک باشندے نے تحریر کی تھی جو شاہ عالم اول کے عہد میں ۱۷۱۱ء میں ہندوستان آئے تھے۔ کیٹلر نے ہندوستانی زبان کی ایک لغت بھی ترتیب دی تھی جسے ۱۷۴۳ء شائع کیا گیا۔

مرسیو جیمس ہیڈرلے کے صاحبزادے کیپٹن الگزینڈر ہیڈرلے کی تعلیم و تربیت دارالسلطنت دہلی میں ہوئی۔ سترہ اٹھارہ سال کی عمر رہی ہوگی کہ الگزینڈر کو اردو شعر و ادب نے متاثر کیا۔ وہ اچھے شعر کہنے لگے اور نواب زین العابدین خان عارف سے اصلاح لینے لگے۔ ۸ / جولائی ۱۸۱۸ء میں الگزینڈر ہیڈرلے نے اس دار فانی سے کوچ کیا ان کے بھائی تھامس ہیڈرلے نے جو نہایت بہترین عالم تھے ۱۸۲۳ء میں الگزینڈر کا مجموعہ کلام چھپوایا۔ الگزینڈر کی شاعری رنگین بیانی اور برجستگی کا مرقع ہے فرماتے ہیں۔

جب سے جدا ہوئے ہیں تجھ سے ہوا نا خوش ہیں   [illegible] پھر کے رہ گیا
[illegible]   [illegible]

سرکو وحشت میں پہاڑوں سے بچا کر لایا ورنہ دیوار سرِ کوچۂ جاناں کے لئے

بعدازاں شہنشاہ اکبر کے عہد میں یورپ سے آئے اور توپ خانہ کے افسر مقرر ہوئے۔ فارسی ا
شاعری پر دسترس حاصل تھی ماحول کے لحاظ سے رزمیہ شاعری کرتے تھے، ان کا ایک دلچسپ شعر ہے ؎

کھینچ کر تیغ جو وہ میرے برابر آیا راہ پر میں نے یہ جانا کہ مقدر آیا

بوربون خاندان کے ایک اور چشم و چراغ ممتاز مسیح ممتاز ملٹری ہیڈ کوارٹر میں ایک معزز عہدے پر مامور
شعر کہتے تھے ان کی ایک مرصع غزل کے دو شعر ہیں:

ستم پر آپ سے بھی جفا ہو رہی ہے دوائے دل مبتلا ہو رہی ہے
جو جھکتے ہے سر ان کے قدموں پہ ممتاز نمازِ محبت ادا ہو رہی ہے

ارمینیا کے کپتان موسس مانوک قسطنطنیہ اور کابل ہوتے ہوئے ہندوستان آئے تھے۔ کابل میں
کی وجہ سے فارسی زبان پر کافی عبور تھا اور اردو میں بھی شعر کہتے تھے۔ مانوک کا ایک خوبصورت فارسی شعر ہے

چہ کردی با من مشتاق اے دوست مرید ساغر و پیمانہ کردی

کپتان موسس مانوک کے صاحبزادے جوزف مانوک المتخلص بہ عاشق بھی بہت اچھے اردو کے شاعر
جوزف مانوک کا اردو کلام زمانہ کی دستبرد کے ہاتھوں تلف ہو گیا لیکن "آثار الشعراء" میں آپ کا تذکرہ ا

آہ سے اب مری کہتا ہے فلک تھرا کر تجھ کو تاثیر یہ حاصل کبھی ایسی تو نہ تھی
کوئی وحشی کوئی دیوانہ ہے کوئی مجذوب مست قاتل تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی
ہے ہرا رشکِ چمن باغ میں دل کہتا ہے گل یہ آوازہ تھا دل کبھی ایسی تو نہ تھی
بے طرح عشق کے پھندے میں پھنسے ہو عاشق یہ بلا جان پہ نازل کبھی ایسی تو نہ تھی

مانوک خاندان کے ساتھ آرمینیا سے جلا وطن ہو کر قسطنطنیہ سے ہندوستان آنے والوں میں تھامس
اور ان کے بزرگ بھی تھے۔ تھامس جیمز نے بھوپال میں رہائش اختیار کی اور اکیس سال کی عمر میں اسلام ق
اپنا نام محمد سلیمان رکھا۔ عوام میں " اچھے صاحب " مشہور تھے۔ نفیس کے کلام میں داغ کی نفاست ملتی۔
شعر کہا ہے ؎

زلیخا دید سے محروم پھر جاتی ہے آ آ کر کوئی تصویرِ یوسف کھینچ دے دیوارِ زنداں پر
تپشِ دل نہ دی فرصتِ تحریر مجھے اتفاقاً جو کبھی ہاتھ بھی آیا کاغذ

قاضی عبدالغفار مرحوم نے اقبال کی شاعری کے ایک جائزے میں کہا ہے "شعر ایک الہام ہے جو ا
نہیں محض نظم ہے۔ قافیہ، ردیف، لے اور ترنم کی ایک ترکیب۔ استعدادِ فطرت کے معنی کی پوشیدہ
گہرائی لبریز ہو کر سیدھے سمندر شاعر ہے" خود اقبال کی شاعری پر جرمنی، فارسی اور اردو کے بیدل اور غالب
کی فکر و نظر نے اثر کیا ۱۹۰۶ء میں اقبال چھ ماہ تک لندن یونیورسٹی میں پروفیسر آرنلڈ کے قائم مقام

زبان کے پیغمبر بھی ہیں ۔ علامہ اقبال کے کلام میں فلسفیانہ رنگ سے یورپ کے مفکرین عملی طور پر متاثر ہوئے ۔ کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر نکلسن نے اقبال کی "اسرارِ خودی" کا انگریزی ترجمہ کیا ۔ ڈاکٹر براؤن نے اسرار خودی کے انگریزی ترجمہ پر رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے جرنل ۱۹۲۱ء میں تبصرہ کیا ۔ ڈاکٹر براؤن نے ۱۹۲۴ء میں چار جلدوں میں تاریخ ادبیات فارسی مرتب کی اور جلد چہارم میں شہاب الدین سہروردی کا ذکر کیا ہے ۔ جرمنی کے ڈاکٹر ڈانیشود سونے نے "پیام مشرق" کے مقدمہ کا جرمن زبان میں ترجمہ کیا ۔ ڈاکٹر فشر پروفیسر لیپزگ یونیورسٹی نے جرمن زبان میں "پیام مشرق" کی وضاحت کی ۔ جرمن مستشرق ڈاکٹر ہاکنی مائیکے نے "پیام مشرق" کے ایک حصہ کا جرمن زبان میں ترجمہ کر کے اسے چمڑے پر ... ... خوشخط لکھ کر مشرقی انداز کے نقش و نگار سے مزین کر کے اقبال کی خدمت میں پیش کیا ۔

ادب و نثر نگاری کے علاوہ اُردو زبان میں کم و بیش ایک سو انگریز افراد نے معیاری شاعری کی ہے ۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے بڑی جانفشانی سے پندرہ سال کی تلاش و تحقیق کے بعد یورپین اور اینگلو یورپین شعراء کے حالات اور کلام یکجا کئے ہیں ۔ ضرورت ہے کہ اس تحقیق کو اور آگے بڑھایا جائے جس سے اُردو زبان کی نہ صرف ہندوستان میں ہر دلعزیزی کا ثبوت فراہم ہوگا بلکہ اس کی بین الاقوامی شہرت میں چار چاند لگ جائیں گے جیسے کلکتہ کی ایک آرمینی خاتون ملکہ جان ملکہ نے جن کا دیوان "مخزن اللغت" ۱۳۰۳ھ میں شائع ہوا تھا اُردو زبان کی بہتر ترجمانی کی ہے ۔

اپنی حیرت کی کوئی شکل بناؤں تو کہوں ۔ سامنے آئینہ سازوں کو بٹھالوں تو کہوں
دل صد چاک پہ لے جان جہاں غرقت میا ۔ کیا گذرتی ہے ، ذرا ہوش میں آؤں تو کہوں

۲۲

(اشعار)

عقل کو ہم نے کیا نذرِ جنوں ۔ عمر بھر میں یہی دانائی کی
کیا دی کہ بعد جیل کا خلعت جنھیں ملا ۔ کر سکتے نہیں تمیز وہ موتی میں کی
ستم دار کو حکم نفس بندی ملا ۔ کیا کہوں کیسی رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی
ملتی نہیں کسی کو سند امتحاں بغیر ۔ [illegible]
قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے ۔ اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد
کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف ۔ کافی ہے اگر ایک خدا میرے لئے ہے

محمد علی جوہر

مولوی عبدالحق

یادِ رفتگاں

مولانا محمد علی: ایک خاکہ

ہندوستان کی جدید تاریخ میں جو انگریزی تعلیم اور مغربی تہذیب کا مولود ہے مولانا محمد علی مرحوم عجیب و غریب شخصیت کے شخص تھے۔ وہ مختلف متضاد اور عجیب و غریب عناصر کا مجموعہ تھے۔ اگر انھیں ایک آتش فشاں پہاڑ یا گلیشیر سے تشبیہ دی جائے تو کچھ زیادہ مبالغہ نہ ہوگا۔ ان دونوں میں عظمت و شان ہے لیکن دونوں میں خطرہ اور تباہی بھی ہے۔

وہ انگریزی کا بہت بڑا ادیب، زبردست انشا پرداز اور اعلیٰ درجے کا مقرر تھا، لیکن جب لکھنے اور بولنے پر آجاتا تھا تو اعتدال اور تناسب دونوں نظر سے اوجھل ہو جاتے تھے اور انمول جواہر پاروں کے ساتھ کنکر اور روڑے بھی بے تکلف چلے آتے تھے۔ وہ آزادی کا دلدادہ اور جبر و استبداد کا جانی دشمن تھا، لیکن اگر کبھی اس کے ہاتھ میں اقتدار آتا تو وہ بہت بڑا جابر اور مستبد ہوتا۔ وہ محبت و مروت کا پتلا تھا اور دوستوں پر جان نثار کرنے کے لئے تیار رہتا تھا۔ لیکن بعض اوقات ذرا سی بات پر اس قدر الگ بگڑ جاتا تھا کہ دوستی اور محبت طاق پر دھری کی دھری رہ جاتی تھی۔ دوست بھی اس کے جان نثار اور فدائی تھے۔ لیکن اس طرح بچتے تھے جیسے آتش پرست آگ سے بچتا ہے۔ وہ اپنے رفیقوں اور کارکنوں کے ساتھ بڑی شفقت اور عنایت سے پیش آتا تھا اور طرح طرح کے سلوک کرتا تھا، لیکن جب بگڑتا تو آپے سے باہر ہو جاتا تھا۔ اس وقت اسے نہ کسی کی عزت آبرو کا خیال رہتا تھا نہ اپنے کام کا۔ اسی لئے وہ اپنے ہی کارکنوں سے بیزار ہو جاتا اور وہ لوگ جنھیں وہ چن چن کر لایا تھا آخر کار ایک ایک کر کے الگ ہو گئے۔ اور تو اور مدت تک وہ مذہب سے بیگانہ سا رہا اور جب ادھر جھکا تو ایسا کہ بڑے بڑے مذہبی علما اور کٹر ملا بھی اس کے سامنے ہیچ تھے۔ وہ جب کبھی کسی کام کو اٹھاتا تو بڑے جوش و خروش سے اٹھاتا اور بڑی بڑی تیاریاں کرتا تھا لیکن تکمیل کو پہنچانا اس کی طبیعت کے خلاف تھا۔ کامریڈ کس دھوم سے نکالا۔ ہمدرد بھی اسی شان سے نکلا۔ دونوں اخبار ایسے تھے کہ اپنے پرائے سب انھیں سر آنکھوں پر رکھتے تھے۔ لیکن جو ان کا حشر ہوا وہ بھی معلوم ہے۔ مسلم یونیورسٹی کے مقابلے میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد جس زور و شور اور دھوم کے ساتھ ڈالی گئی اور اس کا جو حشر ہوا وہ سب ہماری نظروں کے سامنے ہے۔ اس وقت قومیت اور آزادی کی تحریک انتہا تک پہنچ گئی تھی۔ اگر جامعہ ملیہ کے نصاب تعلیم و طرز تعلیم پر غور کرنے کے لئے اس کے رفقا کی کوششیں نہ ہوتیں تو وہ ہم کبھی نہیں بھلا سکتے۔ ... ان کے بعد

اور صاحب نظر رفیق جو اس مجلس میں شریک تھے شش و پنج میں تھے کہ کس نصاب اور اسلوب کے ساتھ ایک دوسرے کا سبب بنا رہے تھے۔ وہ اس وقت اس خیال میں مست تھے اور اعتماد اس کا پورا یقین تھا کہ ہندوستان الگ ہو کے رہے گا اور

حکومت کا مالک ان کے قبضے میں ہوگی۔ اس خیال سے ... اور اس سے زیادہ ان کے جوش اور جنگ کا ... بہک سا گیا

وہ بات اس وقت ان کے منہ سے نکلتی تھی اس میں ایک عجیب شان اور ادا اور انداز تھا۔ ... کا ذکر جتنا کم کیا

جانے بہتر ہے۔ اس کا نقشہ صرف اسرائیل کی طرح ملک کے ایک سرے سے دوسرے تک پھیل گیا اور وسیع و عریض [illegible]
ہندو اور مسلمان سب ہی اس کا پیٹ بھرنا گئے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کی وجہ سے حیثیت و جوش قوت کی ابھر [illegible]
تھی لیکن اور [illegible] ہو جانے کے سبب کہ معلوم ہے جب یہ اکیلا [illegible] سکی۔ سانپ نکل گیا مگر ہم ابھی تک لکیر پیٹے جاتے
ہیں۔ محمد علی مرحوم اس شخصیت اور قابلیت کے آدمی تھے کہ وہ اپنے کا سودا کے بے گھر بیٹھے ہزاروں کا کما لیتے اور جمع کر سکتے
تھے اور کرتے تھے، لیکن وہ اس بے دردی سے بے پروائی اور بے فکر ذمہ داری خود پر اسے صرف کرتے تھے کہ ان کے کام بھی بگڑ
جاتے تھے اور خود بھی قلاش ہو جاتے تھے۔ ہم میں زمانہ کی پڑی ہوئی [illegible] اور خصوصاً مسلمانوں میں اب تک زمینداری شان قائم
ہے جو بادشاہی شان کی نقل ہے۔ ہم انتظام کرنا اور اعتدال کو ملحوظ رکھنا بالکل نہیں جانتے۔ ہم صرف ایک بات جانتے ہیں لٹانا
اور لٹانا۔

محمد علی مرحوم ہر اعتبار سے ایک دیو پیکر شخص تھا۔ اس کے رفقا اور اس کے ہم عصر اس کے سامنے بونے تھے مگر افسوس کہ اسے اپنے
اوپر قابو نہ تھا اور یہی اس کی ناکامی کی اصل تھی۔ اس کے ایک دوست جو اسے بچپن سے جانتے تھے اور جنہوں نے زندگی کی ہر منزل میں اسے دیکھا
اور اس کا ساتھ دیا تھا، فرماتے تھے کہ محمد علی کو لیڈری نے تباہ کیا۔ اس میں مطلق شبہ نہیں کہ وہ اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ لیڈری
کے قابل تھا بشرطیکہ اسے اپنے نفس پر قابو ہوتا۔ وہ جس طرح بیماری میں بد پرہیزی پر قابو نہیں رکھتا تھا اسی طرح ہر معاملے میں جوش کے وقت
وہ اپنے اختیار سے باہر ہو جاتا تھا۔

محمد علی کی زندگی بہت سبق آموز اور نہایت عبرت انگیز ہے۔ اس کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ہم میں بہتر سے بہتر اور قابل سے
قابل شخص بھی [illegible] پیچھے ہے۔ ہماری ناکامی کے اسباب خود ہم ہی میں موجود ہیں۔ آج جس شے کے لئے ہم رو رہے ہیں اس کا علم ہوتا
ہے کہ شاید ہم اس کے قابل نہیں۔ ہم جب اپنے نفسوں کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہماری سیرتیں خام ہیں ہماری طبیعتیں ناتربیت یافتہ
اور ہمارے نفس بے قید ہیں۔ ہمیں ابھی بہت سی ٹھوکروں اور بہت سی [illegible] کی ضرورت ہے۔ جو چیز کام میں کامیاب کر رہی ہے وہ اس
کے لئے پختہ سیرت اور اعتدال طبع کی ضرورت ہے اور آج کل ہم سے کوسوں دور ہے۔ (زمانہ مئی ۱۹۳۱)

عبدالماجد دریابادی

مولانا محمد علی: کیا خوب آدمی تھا

[illegible] ۱۹۲۶ء۔ ایک [illegible] جلسے کے قریب [illegible]
[illegible] پہنچے ہیں [illegible] سے
[illegible]
[illegible]
[illegible]

دوسرے مقابل کی نشست [illegible] کاغذ کا پتلا [illegible] اُٹھ گیا۔ صاحب بہادر ان کی طرف دیکھ کر چیز کی مسکراہٹ سے چہرے
اور مزہ چکھ کر بولے۔ [illegible] This is mother [illegible] [illegible]
کے گرد کے شہرت [illegible] انگریزی زبان اور لہجے [illegible] جواب دیا۔ [illegible] مولانا [illegible] صاحب آپ
یہ درست لیتے ہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ [illegible] صاحب یہ [illegible] جواب [illegible] برجستہ جواب [illegible] والا تھا
[illegible] ناک بھوں [illegible] آپ کا یہ خادم۔ صاحب کو یہ گمان نہ تھا۔ یہ چہرہ [illegible] اور سر پر [illegible] لگا کے دیکھے [illegible]
[illegible] جتنے ہندوستانی [illegible] انگریزی جانتا ہوگا [illegible] ماشاء اللہ برجستہ آپ
[illegible] اس کے بعد ادھر سے منہ پھیر کر گفتگو اپنے پرانے رفیق سفر سے شروع کی۔ ولایت [illegible] کرکٹ کی مشہور و معروف ٹیم ایم سی
سی کی ٹیم ہندوستان آئی ہوئی تھی۔ موضوع گفتگو بھی ٹیم تھی۔ اور اس کے کھیل اور مختلف ٹیچ محمد علی خاموش [illegible] سنتے رہے اس کے
بعد نہ رہا گیا۔ بولے دخل در معقولات معاف۔ کھلاڑیوں پر آپ جو رائے زنی کر رہے ہیں صحیح نہیں ہے۔ فلاں کھلاڑی میں یہ خوبی
ہے اور فلاں میں یہ خرابی اور لگے اس کی تفصیل بیان کرنے۔ اور صاحب تھے کہ بھونچکے بنے [illegible] انسان [illegible] سے یہ ماہرانہ
معلومات سن رہے تھے۔ محمد علی اب نفس کرکٹ پر آگئے اور لگے انگلستانی کرکٹ کی تاریخ بیان کرنے۔ لندن میں اور آکسفورڈ
میں فلاں سنہ میں بولنگ کے یہ طریقے رائج تھے گیند کی پچ یوں پڑتی تھی۔ بیٹنگ یوں کی جاتی تھی۔ فلاں زمانہ میں یہ تبدیلیاں
ہوئیں۔ ہندوستان اور انگلستان دونوں کی زمینوں میں یہ فرق ہے وغیرہ وغیرہ بولنے والا اب گفتگو نہیں کر رہا تھا گویا
کرکٹ پر انسائیکلوپیڈیا کا آرٹیکل سنا رہا تھا۔ آخر میں صاحب بولے۔ آپ کو کرکٹ کے متعلق بڑی معلومات ہیں۔ محمد علی نے کہا مجھ
کو نہیں بلکہ ہر علی گڑھی کو ایسی صورت میں معلومات ہوتی ہیں۔ وہ بولا کیا آپ علی گڑھ [illegible] کپتان رہ چکے ہیں۔ یہ بولے جی نہیں [illegible]۔ بڑے بھائی
[illegible] Big Brother تھے شوکت صاحب کے لئے یہ Big Brother کی تعلیم محمد علی بھائی نے اپنے کالج [illegible]
[illegible] وقت [illegible] تھی۔ وہ انگریز [illegible] بے ساختہ بولا [illegible] talk like Mohd. Ali [illegible]
آپ محمد علی کی زبان بول رہے ہیں۔ یہ بولے I am Ali "یعنی میں خود ہی محمد علی ہوں"۔ صاحب بہادر کی حیرت اب دیکھنے
کے قابل تھی آنکھیں پھاڑ کر بولے Really one of the two Ali Brothers یعنی دو محمد علی جوہر
برادران میں کے [illegible] انہوں نے چمک کر جواب دیا۔ Yes, the younger and the more sharp.
[illegible] of the two [illegible] صاحب کو اپنی حیرت کے رفع کرنے میں اب کی دیر
سیکنڈوں کی نہیں منٹوں کی لگی [illegible] بے [illegible] کے ساتھ [illegible] اور [illegible] محمد علی کے چہرہ پر گرمی ہوتی تھی۔ محمد علی
[illegible] اور لطف لینا شروع کیا۔ بولے اتنا گھبرائیے نہیں کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ علی برادران جس انگریز کو دیکھ پاتے ہیں اس پر جھپٹ
کر [illegible] ہندوستان [illegible]۔ ایک مشہور انگریز [illegible] اس وقت علی
برادران کا [illegible] زمانہ [illegible]
فوج کے [illegible]

ایک بار محمد علی انگلستان میں تقریر کرنے گئے ہوئے۔ [illegible]
[illegible]

ایک ایک بیلنٹ بلکہ ہر سیکنڈ کی کسر میں بھی گھنٹہ ترجمانی کا وقت ملتا ہے۔ حاضرین لوٹ گئے اور ناواقفوں نے آنے لگی کہ آپ مجھے جواب دیجئے نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا پانچ منٹ کی بجائے پورے پینتالیس منٹ تک بولے۔

ایک اور منظر اسی سفر میں ضمن میں کسی جگہ مولانا تقریر میں بیان یہ کر رہے تھے کہ ہر تیس اور سمرنا تو جاہی چکے قسطنطنیہ کس طرح چھوڑ سکتے ہیں جس سے ہماری تمام قدیم و دیرینہ روایات وابستہ ہیں۔ جلسہ مخالفین سے بھرا ہوا تھا انہیں میں سے ایک تاریخ کے فاضل نے اُٹھ کے سوال کر دیا کہ یہ تو بتلائیے کہ قسطنطنیہ کب سے آپ کے قبضہ میں ہے۔ کوئی معمولی مقرر ہوتا تو گھبرا جاتا۔ مولانا نے اپنے سلسلۂ کلام میں ذرا فرق آنے دیئے بغیر جواب دیا۔ سنہ تو یاد نہیں اتنا یاد ہے کہ جب سے آپ کے قبضہ میں ہندوستان ہے۔ اس سے کچھ مدت سے قسطنطنیہ ہمارے قبضہ میں ہے۔ جلسہ میں قہقہہ پڑ گیا اور فاضل تاریخ مدعی بیٹھ گئے۔ عمر بھی کا قوت حافظہ بلا کی تھی اور ذہانت اور برجستگی تو کہنا چاہیے ان پر ختم تھی۔ سارے لطائف و ظرائف کوئی لکھنے بیٹھ جائے تو کتاب کیا معنی دفتر کا دفتر تیار ہو جائے اور سب لکھے بھی کون سکتا ہے۔ کس کو یاد رہ سکتے تھے اور یاد کا سوال تو یہ کہ ہر سال کے ہر دن اور ہر دن کے چوبیسوں گھنٹے ہمزاد بنا ساتھ۔ ایسا کون رہ سکتا تھا۔

مناسبت لفظی کے بادشاہ تھے بات میں بات پیدا کر دینا جیسے تھا زیادہ جلسوں میں مقبول تھے۔ ۱۹۲۸ء میں یہ حال سُنا کہ مہاراجہ الور کو کچھ رحم سا آ گیا۔ بیمار رہتے تھے۔ علاج کے لئے یورپ بھیجا گیا۔ اس سے قبل الور ملک گئے۔ مہاراجہ انگریزی کے ادیب تھے فارسی کے بھی شاعر تھے اور وحشی تخلص کرتے تھے۔ ملاقات کے وقت اپنا دیوان پیش کیا اور اس پر اپنے قلم سے یہ عبارت لکھی "To my Maulana from his wehshi" اپنے مولانا کی خدمت میں ان کے وحشی کا ہدیہ۔ مولانا نے جیب سے فوراً قلم نکالا۔ اپنا تصنیف کیا اور اس پر یہ عبارت لکھ کر پیش کر دیا۔ "From a dagys maolana to a real "Maharaja" یعنی ایک نام کے مولانا کی طرف سے کام کے مہاراجہ کی خدمت میں ہدیہ" حد ذہانت یہ تھی کہ غصہ کی حالت میں بھی فقرہ چست کرنے سے باز نہ رہ سکے۔

خلافت کمیٹی کے جلسوں میں گرما گرم تحریک ہونے کے وقت بار بار یہ منظر دیکھنے میں آتا۔ ایک بار کیا ہوا کہ مرکزی خلافت کمیٹی کا اجلاس [illegible] میں حکیم اجمل خاں صاحب کی صدارت میں ہو رہا تھا۔ محمد علی بیچارے حضور لیے ہوئے تھے مخالف صف میں ایک [illegible] [illegible] اور اسی روز ان کے [illegible] تعریف فرما رہے تھے۔ بحث نے طول کھینچا اور یہ [illegible] ناخوش ہو کر جلسہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ محمد علی [illegible] غضب ہو گیا۔ باپ بیٹے روح القدس تینوں خفا ہو گئے۔ [illegible] [illegible] سب [illegible] کا تخلص تھا گوہر۔ فرماتے تھے کہ مجھے [illegible] کرتا ہوں اسی وزن [illegible] شفیع کی مشہور غزل پر غزل۔ [illegible] [illegible] تو [illegible] فرماتے ہیں —

[illegible]　　[illegible] کے ساتھ ہوں گے بیاباں میں ہم
[illegible]　　[illegible] ایک ہمزاد فرنگی زبان سے کہتے ہیں
[illegible]　　[illegible] کہ [illegible] [illegible]
[illegible]

شوکت جو لکھے تھے وہ تن و توش جب نہیں   پھر کیوں گنیں نہ اپنے کو رو حانیوں میں ہم

ابھی گوہر ان ہی تھے جو علی گڑھ کالج میں طالب علموں نے زبردست اسٹرائک ۱۹۰۷ء کی۔ عین اسی زمانہ میں سر سید کی برسی آ گئی۔ اور اسی سال اولڈ بوائز ایسوسی ایشن نے بھی اپنا سالانہ جلسہ منانا طے کیا۔ محمد علی آتے ہیں اور ایک منظوم عریضہ سر سید روح کی خدمت میں اپنے پیارے بڑے لڑکوں کو سنا کر پیش کرتے ہیں۔ دو تین شعر ملاحظہ ہوں۔ ؎

خیر تو قوم کی کشتی کی اگر کشتی سے باہر ہو   چڑھے ساحل پہ ہیں تو کیا ہمارے ناخدا تم ہو

سر سید کے عقائد ملحوظ خاطر رہیں۔

یہاں مانا کہ تاثیر دعا میں شک رہا تم کو   وہاں ضائع نہ ہوگی پھر بھی مشغول دعا تم ہو

تمہیں کو ڈھونڈتی پھرتی ہیں اب آنکھیں علیگڑھ میں   اور اس پر یہ تماشا ہر طرف اب جلوہ نما تم ہو

سکھایا تھا تمہیں نے قوم کو یہ شور و شر سارا   جو اس کی انتہا ہم ہیں تو اس کی ابتدا تم ہو

ایک زمانہ تھا کہ ہندوستان کا گھر گھر اس گیت سے گونج رہا تھا۔

بولیں اماں محمد علی کی   جان بیٹا خلافت پہ دے دو

یہ سب جیل کے باہر تھا۔ جیل کے اندر خود محمد علی کیا کر رہے تھے۔

تم یوں ہی سمجھنا کہ فنا میرے لئے ہے   پر غیب سے سامان بقا میرے لئے ہے

پیغام ملا تھا جو حسین ابن علی کو   خوش ہوں وہی پیغام قضا میرے لئے ہے

میں کھو کے تری راہ میں سب دولت دنیا   سمجھا کہ کچھ اس سے بھی سوا میرے لئے ہے

امید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے   یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

یہ شاعری نہ تھی آپ بیتی کا ایک ٹکڑا تھا۔

کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف   کافی ہے اگر ایک خدا میرے لئے ہے

لڑکا کوئی نہ تھا۔ لڑکیاں چار تھیں۔ ایک سے ایک بڑھ کر چہیتی اور لاڈلی ۱۹۲۳ء میں اسی جیل ہی میں تھے کہ بجلی آ گری۔ چاند سی جوان شادی شدہ دق میں مبتلا ہوئیں اور مرض روز بروز بڑھتا گیا۔ محمد رود مقید جانے والے باپ پر کیا گزری ہوگی جو دوسروں کی اولاد کے لئے تڑپ جانے والا تھا۔ خود اپنی نازوں کی پالی نور نظر کے لئے کیسا کیسا بلبلاتا ہوگا۔ تڑپتا ہوگا۔

نہ چلا تو عالم خیال ہی میں بچی سے کہنے لگے ؎

میں ہوں مجبور پہ اللہ تو مجبور نہیں   تجھ سے میں دور سہی وہ تو مگر دور نہیں

اور پھر اپنے ہی کو یوں تسکین دینے لگے ؎

امتحاں سخت سہی پر دل مومن ہے وہ کیا   جو ہر اک حال میں امید سے معمور نہیں

ہم کو تقدیر الٰہی سے نہ شکوہ نہ گلا   اہل تسلیم و رضا کا تو یہ دستور نہیں

پھر اپنے اور اپنی نور نظر دونوں کے پیدا کرنے والے سے یوں دعا کی۔ مگر مجھ کو اگر منظور ہے ... تو تو مردوں کو جلا سکتا ہے۔ قرآن میں کیا   تخرج الحی من المیت مذکور نہیں

تیری قدرت سے خدایا تیری رحمت نہیں کم — آمنہ بھی جو شفا پاتی تو کچھ دور نہ تھا

جانتے تھے کہ سرنوشت کا نوشتہ ٹلتا نہیں، سمجھتے تھے کہ تقدیر الٰہی کیا فیصلہ کر چکی ہے، کہتے ہیں اور دل تھام کر کہتے ہیں ؎

تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اس کو — نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہ تھا

ایک نہیں دو جوان پیاری سی لڑکیوں کا جنازہ اپنے ہاتھوں اٹھایا۔ قبر میں سلایا۔ دل ان ذاتی صدموں کی تاب کہاں لاتا۔ قومی صدمے ان سے بڑھ چڑھ کر تھے اس کے بعد چھ سات سال، محمد علی کو قوم و ملت کے پیشوا، ملک کے سردار کی حیثیت سے انھوں نے جانا۔ کروڑوں نے پہچانا۔ ان سب سے زیادہ خوش نصیب وہ تھے جنھوں نے محمد علی کو قریب سے بحیثیت دوست کے۔ عزیز کے۔ انسان کے دیکھا۔ کیا بیان کیا جائے کیسی نعمت انھیں ہاتھ آگئی تھی۔ ایک صداقت مجسم۔ ایک پیکر اخلاص جرأت۔ دیانت ہمت۔ بے خوفی کا مجسمہ۔ پاس والے جتنے قریب سے دیکھتے۔ آئنہ صفت جوہر کے جوہر اور زیادہ کھلتے گئے۔ نکھرتے گئے۔ مشہور۔ تمام تر ایک بے باک سیاسی لیڈر کی حیثیت سے تھے لیکن ان کے لغت میں ڈپلومیسی کا لفظ ہی نہ تھا ظاہر و باطن یکساں۔ جو خیال دل و دماغ میں آگیا۔ زبان سے ادا ہو کر رہا۔ جو بات دل میں آئی منہ پر آئے بغیر نہ رہی۔ کہتے ہیں کہ اہل سیاست وہ ہوتے ہیں جو کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔ محمد علی اس معنی میں اہل سیاست قطعاً نہ تھے ایک بار نہ تھے۔ ہزار بار نہ تھے۔ محبت کے پتلے تھے۔ مہر و الفت کے بندے تھے۔ محمد علی پکے عاشق زار۔ دوستوں، رفیقوں، ساتھیوں پر سو جان سے نثار، اور دور کا واسطہ رکھنے والوں کے مونس و غمگسار۔ کہا کرتے تھے کہ شہرت میں کیا رکھا ہے۔ میں تو محبت کا بھوکا ہوں۔ مسلمانوں کے اور عالم اسلامی کے ساتھ شیفتگی کی یہ کیفیت کہ افریقہ میں کسی کے تلوے میں کانٹا چبھے اور اس کی چبھن یہاں ہندوستان میں بیٹھے محمد علی محسوس کریں۔ سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے یہ مصرع بار ہا سننے میں آیا تھا اور دل ہمیشہ اسے نری شاعری سمجھا۔ محمد علی کی زندگی نے سمجھا دیا کہ شاعری کبھی حقیقت مجسم بن جاتی ہے۔ لوگوں کو مہمان بنانے کھانا کھلانے۔ خاطریں کرنے کے حریص تھے۔

اور زندگی کا ثبوت بہت ہے۔ زنداں سے بڑھ کر دیتے ہیں۔ لیکن جاننے والے جانتے تھے کہ نہ پہننا تھا نہ سینے، بہتے ہیں بولتے ہیں۔ گرجتے ہیں لیکن اندر ہی اندر جلتے گئے پھکتے گئے پگھلتے گئے۔ مذہب کے دیوانے تھے۔ پروردگار سے عشق کم دیکھنے میں آیا ہے۔ قرآن پڑھتے تو قرآن ہی کے ہو جاتے۔ جب اس مضمون کی آیتیں آتیں کہ منافقوں کو دیکھو کہ بجائے اللہ کے یہ اللہ کے بندوں سے ڈرتے ہیں تو آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے اور بار بار ان آیتوں کی تکرار کرتے۔ ان الحکم الا للہ تو گویا تکیہ کلام تھا۔

۴ اور ۵ جنوری ۱۹۳۱ء کو درمیانی شب میں جو مسلمانوں کے یہاں پندرھویں شعبان کی متبرک رات تھی۔ جب روئے زمین کے مسلمان بڑے ذوق و شوق سے جان کی اور ایمان کی، دنیا کی اور عقبیٰ کی دونوں کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہے تھے مشیت الٰہی نے اپنی یہ نعمت واپس طلب کر لی۔ شاید اس لئے کہ محمد علی کے اہل وطن۔ اہل ملت اس نعمت کے اہل نہ ثابت ہوئے۔ جان لندن میں جان آفریں کے سپرد کی اور آخری آرام گاہ کے لئے جگہ کہاں ملی؟ سرزمین مقدس میں قبلۂ اول کے قریب۔ جا تاج عمر سے متصل۔ اقبال کو الہام ہوا ؎

"سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گذشت"

ماتم و شیون کا ہنگامہ ہندوستان بھر میں، اور سارے عالم اسلامی میں اس زور شور سے اٹھا اور اتنے روز تک رہا کہ تاریخ میں مثال مشکل سے ملے گی۔

ماتم ہر زمانہ میں ہر پیمانہ پر ہوتا ہے "عشق کا مسجد ہے" اور یہ بھی کہہ گئے تھے ؎

ہے رشک [illegible]

پروفیسر رشید احمد صدیقی

محمد علی

ولادت تو نادر ذات ہوتی ہے لیکن محمد علی کی موت خانہ زاد تھی۔ عام طور پر موت اپنا انتخاب خود کرتی ہے لیکن محمد علی نے خود موت کا انتخاب کیا اور یہی وہ چیز ہے جس نے محمد علی کی زندگی اور موت دونوں کو ایک حقیقت بنا دیا۔ سنگین اور مسلح!

محمد علی کی زندگی اور موت دونوں ان کی انفرادی اور شخصی افتاد طبع کی ایک جلوہ گری تھی اور شخصیت کی اسی جلوہ گری کا نام قدرت ہے صحیح اور گراں مایہ!

محمد علی کی زندگی کے مختلف نشیب و فراز تھے۔ کسی کی زندگی میں نہیں ہوتے لیکن ان کی موت نے ہر نشیب کو فراز اور ہر فراز کو پُر شوکت بنا دیا۔

محمد علی کو بد توفیقوں اور بد مذاقوں سے سابقہ پڑا۔ ایسے بد توفیق اور بد مذاق جو ہمہ گیر تھے، بوالہوس اور اکثر کینہ پرور بھی۔ محمد علی نے ان سب سے انتقام بھی لیا۔ لیکن اپنی زندگی میں نہیں بلکہ اپنی موت سے!

محمد علی کے باب میں بعض کہتے ہیں کہ وہ بڑے رہے تھے لیکن ان کا کوئی کارنامہ نہیں ہے۔ یہ تنگدلوں اور تنگ نظروں کا فیصلہ ہے۔ "مردِ غازی" کے کارنامہ کا اندازہ مقبوضات کی وسعت، مالِ غنیمت کی فراوانی، جشن و جلوس کی ہماہمی و طرب انگیزی، تمغوں اور اسلحہ کی چمک اور جھنکار سے نہیں کیا جاتا بلکہ اس کا اندازہ کیا جاتا ہے ٹوٹی ہوئی، بکھری ہوئی زرہ، بہتے ہوئے لہو، دکھتی ہوئی روح اور دمکتے ہوئے چہرہ — ڈوبتے ہوئے سورج سے۔

محمد علی کا قلب حزیں تھا لیکن روح امر تھی — بشارت ازلی تھی۔ حزیں یوں کہ جن کو وہ محبوب رکھتے تھے وہ بھی ان کے مخالف۔ کیسی مخالفت؟ اصولی نہیں بلکہ اکثر ذاتی مواد، نفس پروری اور تن آسانی کے تحفظ کے لئے۔ وہ ایک شیر کی مانند تھے جس کو شیروں سے نہیں بلکہ اور بھیڑیوں سے سابقہ ہو۔ بشارت ازلی اس لئے کہ شخصیت کامیاب رہی، شخص کا انجام ناقابلِ التفات۔ انفرادی آزادی 'حق' کی کامیاب دلیل ہے — روشن اور محکم!

محمد علی کی ذہانت اور فطانت اب کہاں ملے گی۔ وہ تیغ اصیل تھی جو رزم میں بے پناہ تھی اور بزم میں ایک جلوہ گری۔

وہ مخالفت اور مقابلہ میں بے باک اور بے پناہ تھے۔ اپنے چھوٹوں پر شفقت کرتے تھے ان کو پناہ دیتے تھے۔ ان کی دلداری اور آسانی کرتے۔ ان کے لئے مارنے مرنے پر تیار ہو جاتے۔ محمد علی کی آغوش میں رحمت تھی۔ ان سے مدد لینے کے متمنی ہوتے تھے کہ اب ساری ذمہ داری، ساری فلاکت و ہلاکت محمد علی کی اور کامیابی کا شہرت مدد لینے والے کی!

وہ آغوشِ مادر، بازوئے برادر اور راحتِ عزیزاں تھے

کربلا کے بولنے اور لکھنے والے تھے۔ بولتے تو معلوم ہوتا کہ ابوالہول کی آواز اہرامِ مصر تک گونج رہی ہے۔ لکھتے تو معلوم ہوتا کہ کسی نگار خانے میں توپیں داغی جا رہی ہیں یا پھر شاہجہاں کے ذہن میں تاج کا نقشہ مرتب ہو رہا ہے۔ ... نے ان کو اپنے ہاتھ سے لکھتے ہوئے سنا ہے اور خود محمد علی کو داد دینے سے پہلے انیس کو داد رہا ہے۔

ضیغم ڈکارتا ہوا نکلا کچھار سے

محمد علی پر روپے اور شہرت کی بارش ہوئی اور محمد علی نے ان دونوں کو گلاب بنا کر بہا دیا۔ دونوں نے مفاہمت کی ہوتی اور مفلسی سے بھی سابقہ پڑا۔ لیکن یہ چیزیں جسم و جان کی تھیں۔ ان کی روح پاک تھی۔ ظاہر کیا معلوم نہ ہو سکے تو کیا ہوتا۔ ہو سکتا ہے کہ محمد علی اور سر سیاں کو محسوس ہونے والے کی موت آخر کیا شہادت دیتی ہے۔

محمد علی کی موت کا حال جب میں نے سنا تو تھوڑی دیر کے لئے یقین نہیں آیا اور دیر تک یہ خیال آتا رہا کہ محمد علی کو آخر موت نے زیر کس طرح کیا۔ خود موت پر کیا گزری ہوگی!

پھر سوچنے لگا کہ اگر غلامی کی قضا و قدر یہ چاہتی تھی کہ ہم محمد علی کو بجائے ہندوستان کے کسی مسلمان لیڈر کے حوالہ کرو۔ یہ سوال آتے ہی فیصلہ ہو گیا اور انتہائی تعجب کے ساتھ کہ محمد علی کے بدلے میں ہندوستان کا بڑے سے بڑا لیڈر دیا جا سکتا تھا اور اس کا ماتم نسبتاً کم ہوتا!

لوگ آزردہ نہ ہوں۔ انسان کے دل میں عجیب عجیب خیالات آتے رہتے ہیں۔ بعض خیالات کو کبھی الہام قرار دیا جاتا ہے اور کبھی یہ صرف مہمل بھی ہوتے ہیں۔ لیکن خیال کے عجیب تر ہونے کے معنی ہمیشہ مہمل یا مہمل تر ہونے کے تو نہیں ہیں۔ محمد علی میں کمزوریاں بھی تھیں لیکن کمزوریاں نہ ہوتیں تو آج کل کے مسلمان لیڈر مصطفیٰ کمال، اور رضا شاہ پہلوی کی شہنشاہیت پر کیا گزر جاتی۔

ملک و ملت کی جنگ اب بھی جاری ہے۔ لیکن معرکۂ جنگ خاموش ہے۔ فتح و شکست تو اس لئے بنائے گئے ہیں کہ فتح و شکست ہوتی رہے۔ لیکن جنگجو کہاں ہے۔ شہادت کس کو نصیب ہوگی۔ ایسا حسین کہاں جس کا خود یزید کو تلاش ہو!

آئیے جہاں کل فاتح بیت المقدس نے سر جھکایا تھا وہاں آج محمد علی کی معراج منائیں!!

اللہ اکبر واللہ اکبر لا الہ الا اللہ، واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد

("گنج ہائے گرانمایہ" سے)

"— آج جس مقصد کے لئے میں یہاں آیا ہوں وہ یہ ہے کہ میں اپنے ملک کو اسی حالت میں واپس جاؤں جب کہ آزادی کا پروانہ میرے ہاتھ میں ہو۔ میں ایک غلام ملک کو واپس نہیں جاؤں گا، میں ایک غیر ملک میں جب تک وہ آزاد ہے، مرنے کو ترجیح دوں گا۔ اور اگر آپ مجھے ہندوستان کی آزادی نہیں دیں گے تو پھر آپ کو یہاں میری قبر کے لئے جگہ دینی پڑے گی۔

مجھے امید ہے کہ ہم یہ تمام چیزیں لے کر واپس جائیں گے اگر ہمیں یہ چیزیں نہ ملیں تو ہم ملک کی لڑائی لڑنے والوں کی صفوں میں وہیں چلے جائیں گے جہاں ہم دس سال پہلے موجود تھے، وہ آج بھی ملک کا [illegible] ہیں، اس وقت آپ جو چاہیں کہہ لیجئے!"

(گول میز کانفرنس لندن میں مولانا محمد علی کی معرکۃ الآرا تقریر کا اقتباس)

بادۂ کہن

مرزا قربان علی بیگ سالک

مرزا قربان علی بیگ سالک کا شمار غالب کے ان چند ممتاز شاگردوں میں ہوتا ہے جن کو مرزا سے کافی طویل مدت تک قرب اور استفادہ کا موقع ملا۔

مرزا قربان علی بیگ سالک ترکی النسل تھے۔ سالک کے والد نواب عالم بیگ خاں نواب میر نظام علی خاں کے آخری عہد میں حیدرآباد آئے۔

سالک حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ہمارا قیاس ہے کہ ان کی تاریخ پیدائش ۱۸۱۹ء اور ۱۸۲۴ء کے درمیان ہوگی۔ سالک کی ابتدائی تعلیم و تربیت دہلی میں ہوئی۔ انھوں نے ۱۵ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا۔ ابتدا میں حکیم مومن خاں مومن کو اپنا کلام دکھایا اور بعد میں غالب سے رجوع ہوئے۔

مرزا غالب کے انتقال کے بعد ۱۸۷۰ء میں سالک حیدرآباد چلے آئے یہاں ان کے سینکڑوں شاگرد ہوتے۔ "تلامذۂ غالب" میں سالک کو یہ فخر حاصل رہا ہے کہ مرزا غالب کے انتقال کے بعد مرزا کے بیشتر شاگردوں نے اصلاح کے لئے سالک سے رجوع کیا۔

سالک کا انتقال ۱۸۸۱ء میں حیدرآباد میں ہوا۔

سالک کے دو دیوان شائع ہوئے۔ ایک "ہنجارِ سالک" اور دوسرا "میخانۂ سالک"۔ سالک نے اپنا کلیات "کلیاتِ سالک" کے نام سے مرتب کیا تھا جو ۱۸۸۰ء میں ان کی زندگی ہی میں شائع ہوا۔ راقم الحروف نے سالک کی شخصیت اور شاعری پر ایک تحقیقی کتاب "ذکرِ سالک" کے نام سے قلمبند کی ہے جس کا پیش لفظ ماہرِ غالبیات جناب مالک رام نے لکھا ہے۔ بہت جلد شائع ہو جائے گی۔ ذیل میں سالک کا کلام پیش کیا جاتا ہے۔ (سید [illegible] الدین علی خاں)

لذتِ نیشِ غمِ پنہاں مگر رکھتے نہیں — زخم پر ہم خواہشِ زخمِ دگر رکھتے نہیں
صبح ہوتی ہے تو ہم سو یاس سے کرتے ہیں شام — شام ہوتی ہے تو امیدِ سحر رکھتے نہیں
دیدۂ تر نے کیا واعظ کے آگے لاجواب — کس طرح کہہ دیں کہ ہم دامانِ تر رکھتے نہیں

برق بن کر ترے مہجور جیا کرتے ہیں — تپشِ دل کی تڑپنے سے دوا کرتے ہیں
شرم کی بات ہے دشمن سے مدد کی خواہش — کیوں نظر جانبِ افلاک کیا کرتے ہیں
کٹ گئی عمر یوں ہی حضرتِ ناصح افسوس — ہم سنا کرتے ہیں اور آپ کہا کرتے ہیں

اعتبارِ نگۂ ناز ہے کب کیا ان کو — قتل کو آتے ہیں اور ہاتھ میں شمشیر نہیں
گریہ نے ہجر میں تسکین کا سہارا کھو یا — کہ ساقی میری آنکھوں میں وہ تصویر نہیں
ایک کاشانۂ دل ٹوٹ کے وہ بھی نہ بنا — اور دنیا میں مجھے حسرتِ تعمیر نہیں
عشق میں کیوں کہ کوئی بھی خدا یاد نہیں — یہ محبت ہے بتوں کی کہ خدا یاد نہیں
دیکھنا ہو جو عشق کا دل کو کھو کر — کچھ گیرا آئے کہیں اس کے سوا یاد نہیں
تجھکو دیدار دکھانا بھی اگر ہو منظور — کیا مجھے آیتِ موسیٰ صعقا یاد نہیں

کیوں بر شکوہ کہنے سے اتنے خفا ہیں آپ — بندے اگر نہیں تو کسی کے خدا ہیں آپ
آرائشوں کے حیلہ سے فرصت نہیں کبھی — یہ وہ بلا ہے زلف کہ خود مبتلا ہیں آپ
کہتے ہیں کس ادا سے وہ آئینہ دیکھ کر — شہرت جہاں میں حسن کی ہے نام خدا ہیں آپ

عجب کیا ہے بہا دے گر تماشائے عصیاں کو — تھوا ہے موج زن دریا میرے اشکِ ندامت کا
پسند اللہ کو کیا جانے کیا آجائے اے زاہد — مجھے شرمِ گنہ تجھکو تکبر ہے عبادت کا

کس کا جلوہ نظر سے گذرا ہے — کہ مجھے کچھ نظر نہیں آتا
تیرا کوچہ اگر بہشت نہیں — جا کے کیوں نامہ بر نہیں آتا
دل کو کیا جانے کیا ہوا سالک — چین کیوں رات بھر نہیں آتا

کیا غیر تھا کہ ہے تدبیر سے تقدیر کو ضد — کاش ہوتا نہ بھروسا مجھے دانائی کا
حسرتِ مردہ کو دم بھر میں جلا لیتا ہوں — آپ کیا مجھکو بھی دعویٰ ہے مسیحائی کا
کیوں نہ ملا کہ میری حیرت پہ جہاں ہو حیراں — محو حیرت ہوں کسی کو خود آرائی کا

دیکھئے میں آئینہ کے مجھکو بھی کرلو شریک — کیا مزا آتا ہے تم کو دیکھ کر تنہا ہاہلد

آدمی انس کی صنعت ہو سے کچھ خبر نہیں — ساقی ہے کون، جام کہاں اور کدھر شراب

کم نہیں زندگی خضر سے کچھ نام نکو — کھول سکندر جو سوا آبِ بقا کرتا تھا

تنگدستی اگر نہ ہو سالک — تندرستی ہزار نعمت ہے

ابوالفیض سحر

اسما سعیدی کی شاعری

اُردو شاعری کی تاریخ میں شروع ہی سے خاتون شعراء کی روایات بھی ملتی رہی ہیں۔ ابتداءً اگرچہ خال خال سہی لیکن آج کی شاعرات کی تعداد خاصی بڑی نہیں بلکہ ان کی تخلیقات بھی خاصی جامع اور دقیق ہیں۔ دکنی عہد کی اشرف النساء شرف، ماہ لقا بائی چندا سے لے کر ہمارے عہد کی بشیر النساء بیگم بشیر، خورشید نذیر، بانو طاہرہ سعید، عظمت عبدالقیوم، شفیق فاطمہ شعریٰ، اشرف رفیع، زاہدہ زیدی، ساجدہ زیدی، ممتاز مرزا اور اسما سعیدی وغیرہ تک کی صاحب دیوان اُردو ادب میں نمایاں حیثیت رکھنے والی شاعرات کا سلسلہ ہمارے سامنے ہے۔

صاحب دیوان شاعرات میں گلہائے فکر کی خالق اسما سعیدی کی شاعری کا مقام ممتاز ہے۔ اسما سعیدی حقیقی معنوں میں فطری شاعرہ ہیں "گلہائے فکر" جیسا ضخیم مجموعۂ کلام اُردو شاعرات کے مجموعوں کی اشاعت کی تاریخ میں بہ لحاظ ضخامت و محاسن پہلا تجربہ ہے۔ ان کے مجموعے میں علم و ادب سے سچی لگن پائی جاتی ہے۔ شعر و شاعری کا ذوق ورثے میں ملا ہے۔ بسمل سعیدی جیسے استاد فن کی بیٹی ہیں۔ ان کی سرپرستی، تربیت اور رہنمائی نے اسماء سعیدی کے کلام کو زبان و فن کے معائب سے پاک کر دیا ہے بلکہ فنکارانہ مہارت پیدا کر دی ہے۔ اسما سعیدی کی شاعری کا یہ بنیادی وصف بھی ہے۔ امریکی فلاسفر ایمرسن کا قول ہے کہ:

TO APPRECIATE THE BEAUTIFUL ONE SHOULD ALSO BE BEAUTIFUL

اس لئے اُردو شاعری بحیثیت مجموعی اور کسی اُردو کے شاعر کے کلام پر تبصرہ کرنے سے پہلے اُردو شاعری کی روایات و مزاج سے واقف رہنا بنیادی شرط ہے۔ اُردو شاعری پرانی روایات کی قدروں اور نئے تجربوں کے قرینوں کا دلچسپ اور دلکش امتزاج ہے۔ ہر فن ابتدا میں ایک تجربہ ہوتی ہے اور ہر تجربہ بعد ازاں ایک روایت بن جاتا ہے۔ ادب اور زبان کو تجربے کی ضرورت ہوتی ہے بعض تجربے نام و نمود کی وجہ سے بھی ہوتے ہیں لیکن اسما سعیدی نے اس قسم کے تجربوں سے حاصل کی جانے والی شہرت کو پسند نہیں کیا انھوں نے ایسا تجربات سے انحراف کیا ہے۔

ہے شوق اسما شاعری کا خیالِ دولت و شہرت نہیں ہے

ان کی شاعری کا مزاج روایت اور تجربات کی روشنی سے ہم آہنگ ہے۔ روایات کا حسن اور کلاسیکی رچاؤ ہے۔ اسما کے شعری اظہار کے پیچھے گہرے اور خاموش احساسات و جذبات کی ایک وسیع دنیا ہے کبھی کبھی اس پر ایک دھیمی کھنک

جاتا ہے اور کبھی ہم رنگی کا دھوکہ ہوتا ہے ان کے اشعار میں روایات کا تتبع ہے تو شعری اقدار کی پاسداری بھی موقع اور واردات کی فضا کی مناسبت سے بحروں کا انتخاب موثر اور رواں دواں زمینیں ردیف اور قافیے اسما کے کلام کی خصوصیات میں سے ہے۔

ڈاکٹر اسما نے غزلیں بھی خوب لکھی ہیں اور نظمیں بھی۔ ان کی غزلوں کے بہت سے اشعار ذہن و دل پر گہرا اثر ڈالتے ہیں مثال کے طور پر ؎

گھٹا سورج غروب ہونے پر　　اک کلی دل میں مسکرائی ہے
اس ادا سے رُلا دیا آ کر　　کوئی جیسے ہنسا دیا آ کر
کسی کی یاد نے لی تھی بس ایک انگڑائی　　ہزار شعر کے مضمون آتے جاتے ہیں
اس آئینے میں صاف نظر آ رہے ہیں آپ　　پردہ بھی اختیار کیا تو بہار کا
ہزار رنگ سے آرائشِ چمن کر لو　　جو موجِ بادِ بہاراں نہیں تو کچھ بھی نہیں

انھیں اپنے ہی غم کا احساس نہیں دوسروں کا بھی ہے ؎

ہم اپنی بیکسیِ حال سے غمگیں نہیں ہوتے　　مگر اوروں کی ہم سے بیکسی دیکھی نہیں جاتی

ڈاکٹر اسما کی نظر اپنے دور کے مسائل پر بھی ہے ؎

نہیں فکر اپنے ہی اک آشیاں کی　　سرِ شاخِ گُل آشیاں اور بھی ہیں

غزل کی تہذیب و مزاج و رموز سے یہ خوب واقف ہیں کہتی ہیں:

لاکھ لفظوں سے سنوارو یہ سنورتی کب ہے　　کیفیت دل کی رقم ہو تو غزل ہوتی ہے
اپنے اشکوں سے نہیں ہوتی غزل کی تخلیق　　حسن کی آنکھ بھی نم ہو تو غزل ہوتی ہے
تنگیٔ ذہن سے بیزار ہے اس کی فطرت　　اُلفتِ دیر و حرم ہو تو غزل ہوتی ہے

اسما سعیدی کا کلام معائب زبان و بیان سے مبرا ہے۔ زود گوئی و بسیار نویسی کے باوجود زبان و بیان کی ناہمواریاں ہیں۔ فنی صحت و درستگی کا ہمیشہ خیال رکھتی ہیں۔ چند مثالیں پیش ہیں۔

پھریں ضرور پھریں آپ اپنے وعدوں سے　　مگر حضور خدا کی قسم کا کیا ہوگا
گزر رہی ہے کچھ اس طرح بے تعلق سی　　کہ زندگی نہ رہی جیسے زندگی اپنی
ہر اک شے ہے یہاں سرشارِ الفت　　کلی کیا پھول کیا برگ و شجر کیا

اب تک اردو شاعری کا معیار بالعموم سہلِ ممتنع ہی رہا ہے جو عوامی مقبولیت کا معیار بھی رہا ہے ڈاکٹر اسما کے بیشتر اشعار سہلِ ممتنع کے ذیل میں آتے ہیں ان کی شاعری اس معیار پر بھی پوری اترتی ہے۔

معتبر ہم نہیں دنیا میں　　رنگ دیکھا بہت زمانے کا
ان کا احسان واقعی احسان　　جن کو شیوہ نہیں جتانے کا
چمن میں [illegible] بہاروں کی قسمیں　　سرِ بزم جیسے مزاروں کی شمعیں

یہ تو ہیں کہنے کی سب باتیں ہیں ورنہ　　ابھی زخمِ جگر اچھا ہوا ہے

غم اور عرفانِ غم اسما کی شاعری کے مزاج کا داخلی و احساساتی غالب عنصر ہے۔ اسے یہ بے تکلفی سے برتتی ہیں جیسے
ستار نواز کی انگلیاں ستار کے تاروں کو چھیڑتی اور بجاتی ہیں۔ ملاحظہ ہو:

شبِ غم کس کو نیند آتی ہے اسما　　مقدر جلنے کیسے سو گیا ہے
جامِ غم دیجئے کچھ آپ　　دل تو عادی ہے غم اٹھانے کا
اسما ملی بھی کوئی خوشی کی اگر گھڑی　　وہ بھی غموں کی یاد میں [illegible]
طوفانِ غم سے مجھ نہ لے دل سنبھل ذرا　　ہم کو بہت سے کام ہیں [illegible] ہے

ڈاکٹر اسما جدیدیت کی قائل تو نہیں ہیں مگر "گلہائے فکر" میں مسائل و موضوعات [illegible] وسعت کی

ملاحظہ ہو:

بھیانک رات ہے اور راہ دشوار　　مگر عزم جواں ہے اور میں ہوں
وہ زندگی بھی کیا جو سہاروں پہ چل سکے　　اچھا ہوا جو کوئی سہارا نہیں رہا
منزل نہیں مقام نہیں کوئی راہ نہیں　　ہر کاروانِ زیست ہمیشہ سفر میں ہے
تمہاری ذات ارسطو سہی اور افلاطون　　کسی کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
ہمیں یہ غم ہے کہ اے زلفِ برہم دوراں　　ہمارے بعد ترے پیچ و خم کا کیا ہوگا
عالمِ صبح و شام تو دیکھو　　طور ہی اور ہے زمانے کا
گلستاں جب تباہ ہو بلبل　　وقت ہے کوئی گیت گانے کا
جو درد کا درماں تھے زمانے میں انھیں کو　　محرومیٔ درماں و دوا دیکھ رہے ہیں

شعر و ادب سے شغف اسما سعیدی کا محبوب مشغلہ ہے۔ اس ذوق و شوق و انہماک کے سبب ان
کلاسیکی رچاؤ بدرجۂ اتم موجود ہے۔ یہ خوبی ہر کسی کے حصّے میں نہیں آتی۔

عقل کی سو مسافتیں عشق کا ایک ہی قدم　　فاصلہ فرش و عرش کا دل کا بس ایک گام ہے
پختگیٔ شعور نے دی ہے وہ وسعتِ نظر　　آج نظر میں ہر مقام منزلِ ناتمام ہے
یہ اشک لال و گہر ہی سہی مگر اسما　　نصیب آپ کا داماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
جہاں کوئی احساس ہوتا نہیں ہے　　بس اب آج ہم بھی وہاں جا رہے ہیں
جو سمجھو تو اس میں حقائق بہت　　نہ سمجھو تو ہستی بھی موہوم ہے

ڈاکٹر اسما نے غزلوں کے علاوہ نظمیں قطعات اور رباعیات بھی کہی ہیں۔ نظموں میں ان کی روانی
ہوتی ہے۔ یہ ڈاکٹر اسما کی محنت، زبان پر عبور اور بسمل صاحب کے فیضان کا اثر ہے مجھے یقین ہے کہ ڈاکٹر
کا مجموعۂ کلام "گلہائے فکر" بڑی دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ اور مقبولِ خاص و عام ہوگا۔

…کیا ہے بس اک تارِ پیرہن کے سوا
…کچھ اور مرے پاس میرے تن کے سوا

…تو شدتِ احساس نے ڈبو ڈالا
…ے جام میں کچھ بھی نہیں جلن کے سوا

…بزم کی خوشبو کا اک فسانہ تھا
…نے کیا دے دیا گھٹن کے سوا

…بھی جاتا ہوں تیرے حضور جاتا ہوں
…مقام کہاں تیری انجمن کے سوا

…حسن کہیں سب بلائے جاں جن کو
…ک ادا ہے نہیں کچھ وہ بانکپن کے سوا

…گھپ ہے کہاں سوجھتا ہے ہاتھ کو ہاتھ
…نگاہ کی امید کی کرن کے سوا

…بادۂ امروز خام ہے صاحب
…کام نہیں بادۂ کہن کے سوا

…ب حیدرآبادی

صلاح الدین نیر

کہلائے تو یہ چشمِ گنہ گار بھی لے جا
نفرت کی فضاؤں میں مرا پیار بھی لے جا

میں یہ نہیں کہتا کہ گنہ گار نہیں ہوں
سر شرم سے جھک جائے تو دستار بھی لے جا

تا عمر یہاں خانماں برباد رہوں گا
اک دل کے سوا تو مرا گھر بار بھی لے جا

یہ لوگ کبھی تجھ کو تہی دست نہ سمجھیں
احباب سے ملنا ہو تو تلوار بھی لے جا

تنہائی سے گھبرایا ہوا سہما ہوا ہے
محفل سے یہ دیوانے کو سرِ دار بھی لے جا

اک جنسِ وفا کے لئے بازارِ ہوس میں
مجھ جیسا محبت کا خریدار بھی لے جا

شائستۂ آداب ہے احباب کی محفل
جانا ہو اگر عظمتِ کردار بھی لے جا

جز مرگِ تمنا یہاں اب کیا ہے نیرؔ
دل ہی نہیں تو حسرتِ دیدار بھی لے جا

غزلیں

نصیر پرواز

یہ شہرِ سخن ہے یہاں فنکار بہت ہیں
الفاظ و معانی کے پرستار بہت ہیں

نظمیں ہیں رقم شمعوں پہ اور [illegible]
پھولوں کی طرح نازک لب و رخسار بہت ہیں

ہم نے بھی جلائی ہے کوئی شمعِ تفکر
ہم سے بھی یہاں صاحبِ کردار بہت ہیں

شہرت کے لئے ہوتی ہے لمحوں کی پرستش
اس وقت میسر تو گنہ گار بہت ہیں

اندازہ لگائے کوئی میرے بھی جنوں کا
ہر نقش پہ مرے [illegible] کے اشعار بہت ہیں

تشکیک و تذبذب کی کڑی دھوپ ہے سر پر
ہر گام شکستہ در و دیوار بہت ہیں

کوئی نہیں جو دامن اور اک [illegible]
ہر گام پہ یوسف کے خریدار بہت ہیں

ہو دیدۂ بینا تو ہمیں خود ہی پرکھ لو
ہم ہونٹ نہ کھولیں گے کہ خوددار بہت ہیں

کچھ وقت پرستوں کو ملی ہے یہاں شہرت
کس کو یہ خبر پیکرِ افکار بہت ہیں

پروازؔ ہر اک شکل پہ عریاں ہیں مسائل
موضوعِ سخن قابلِ اظہار بہت ہیں

[illegible] صدتال

غزلیں

۱

سید انوار ظہوری (پاکستان)

مقتل ہوں تو زہر پلا دیجئے مجھے — بے وقت آگہی کی سزا دیجئے مجھے
باقی ہے کوئی گوشہ خلائے بسیط پر — خاموش ہوں تو صوت و نوا دیجئے مجھے
تنہا مجھے تشنہ مجھے اتنا نہ دیں — بہتر ہے موج موج بہا دیجئے مجھے
گنبد کی بازگشت ہوں ابھروں گا دوں گا — جس قول میں ہوں آپ مٹا دیجئے مجھے
یادوں نے زخم زخم گلستاں سجا دیا — اب زہر دیجئے نہ دعا دیجئے مجھے
رکھتا ہوں لفظ لفظ معانی گرفت میں — بے شک بیاں حسن دکھا دیجئے مجھے
اکسیر ہوں زمیں کا مقدر جگا دوں گا — ہر سمت ریزہ ریزہ اڑا دیجئے مجھے
مسلک تھی کی تاب یہاں کون لائے گا — جوگوں کی انجمن سے اٹھا دیجئے مجھے

قائم ہے فکر و فن کی ظہوری سے آبرو
ایسا ہے اور کون دکھا دیجئے مجھے

۲

کرب ہر سانس کا تقدیر بنا جاتا ہے — یہ بھی تیری ہی مشیت کی ادا ہو جیسے
ڈگمگاتے نظر آتے ہیں زمانے کے قدم — زندگی بیٹھ گئی آبلہ پا ہو جیسے
خال و خد کا یہ تناسب یہ سراپا خوط — حسن در حسن فضا بکھری ہوا ہو جیسے
دل سمندر ہے تو قرینہ متلاطم ٹھہرا! — موج در موج کوئی حشر بپا ہو جیسے
مطمئن ہے مرے احساس کا بڑھتا سایہ — میں نے جو ہم کے تجھے دیکھ لیا ہو جیسے
رسم نو معرفت ذات کا عنواں ٹھہری — اب ترے شہر میں ہر شخص خدا ہو جیسے
یوں بڑے غور سے دیکھو ترے ملنے کا لکھی — زخم خوردہ مرا مجبور انا ہو جیسے
مہرباں ہیں مرے ذخولا پھر کے نیا نمک — یہ بھی اک شعبدہ رسم وفا ہو جیسے
کہنہ اقدار نہ باقی ہیں تکلف کی حدیں — زور سیلاب سے پل ٹوٹ چکا ہو جیسے
میں کہاں جاؤں تغافل کی شکایت لے کر — خود زمانہ ترے سانچے میں ڈھلا ہو جیسے
یوں وہ تصویر دکھاتے ہیں فنا کی ہم کو — ان کے حصے میں فقط نقد بقا ہو جیسے
مطمئن یوں ہیں مرے عہد کے دانا بینا — وقت حالات کا خود عقدہ کشا ہو جیسے
لفظ بنتے نہ مرکبات کا انداز سخن — کرب احساس معانی میں چھپا ہو جیسے
بچ سکا وقت گرفتار کے تصرف سے کہاں — کوئی آوارہ بگولوں میں گھرا ہو جیسے

آسمانوں سے اترتا ہے ظہوری کا سخن
یوں وہ پڑھتا ہے خدا بول رہا ہو جیسے

حقیر ندوی (بنگلہ دیش)

ستم بھرے ہوئے صبح
نگاہ وقت کے آگے

شکاتے جو زباں رکھ کے
اتارے ہیں وہ جسے

انہیں یہ آج ہے پتھراؤ
جو وار سہتے رہے شو

فراخدل ہوں مری پیش
یہ چند واسطے حاصل

زمانہ ہوا تو نہیں ظلم
ہمیں بھی یاد ہیں لمحا

ابھی تو میرا ادھورا
ابھی ہیں سامنے آسیا

مری نظر میں ہے میر
میں جانتا ہوں تقاضے

حقیر وقت کا نوحہ
قصیدہ خواں رہو

ناکام زیست چھوڑ بھی یہ بے بسی کی بات
اس زندگی میں چھیڑ کوئی زندگی کی بات

چشم خدا شناس بھی حیران رہ گئی
پہنچی کہاں کہاں مری خود آگہی کی بات

دار و رسن کے ذکر سے ارزاں ہو کیوں جہاں
ہے اک یہ اہل دل کے لئے دل لگی کی بات

کرنے کو کوئی لاکھ کرے دشمنی کی بات
آئے تری زباں پہ مگر دوستی کی بات

پائے کہاں سے کامگر زیست میں ثبات
محروم عزم سے ہو اگر آدمی کی بات

پردے میں یاس کے ہے اک امید کی کرن
تاریکیوں میں گھر کے بھی کر روشنی کی بات

آئے جو پاس ساقی، ساغر بکف، یہ حرف
اے ہم نشیں نہ چھیڑ مری تشنگی کی بات

[illegible] ہے
[illegible] کی بات

غزلیں

کیا جانے کس حدود کا ابھرا پسار ہے
دل رو رہا ہے اور زباں نغمہ بار ہے
صیاد انھیں گلے سے لگا لے کہ ہر اسیر
پروردۂ نشاط و سرور بہار ہے
اب کیا کروں میں اپنے دل سادہ لوح کو
وہ جھوٹ کہہ رہے ہیں مجھے اعتبار ہے
بیٹھا ہوں دل کے داغ منور کئے ہوئے
کتنی حسین میری شب انتظار ہے
کہنے گئے تھے درد کا افسانہ ہم، مگر
صرف اتنا کہہ سکے کہ ہمیں تم سے پیار ہے
گل مسکرا رہے ہیں تو شبنم ہے اشکبار
شاید اسی کا نام ہی فصل بہار ہے
اچھا! یہ کہکشاں ہے، مجھے اب خبر ہوئی
میں تو سمجھ رہا تھا تری رہگزار ہے
خالی ہے کچھ ضرور تمہاری جفاؤں میں
ورنہ شب الم میں مجھے کیوں قرار ہے
ہے دل میں درد آنکھ میں آنسو لبوں پہ آہ
اخلاق آج میرے چمن پر بہار ہے!!

اخلاق سہسرامی

قطعات

ہر خوشی کی تاک میں غم ہے ضرور
بات یہ سیدھی سی ہے مجھ کو شعور
حوصلوں کو اس قدر رکھو بلند
مشکلیں تم سے رہیں خود دور دور

*

زندگی نے دکھائے خواب بہت
وقت نے لائے انقلاب بہت
ہم نے تو حال دل سنایا تھا
اس پہ برہم تھے کیوں جناب بہت

*

کچھ اندھیرا کچھ اجالا ہے
اس کا ہر بھید ہی نرالا ہے
شوقی ہو جائے پل میں جانے کیا
زندگی آج کی [illegible] ہے

مومن خاں شوقی

حیدرآباد کے شاعر

(۱۵)

ساجد رضوی

۱۹۶۲ء میں مطبوعہ ساہتیہ اکیڈمی کے تذکروں کا سلسلہ

میر رضا علی رضوی نام، ساجد تخلص ۱۲ جنوری ۱۹۳۰ء کو حیدرآباد کے سادات گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید بہادر حسین رضوی طیار خود بھی شاعر تھے اس لئے ساجد کو گھر سے ہی شعری ماحول نصیب ہوا۔ والدہ ایران کے علمی و مذہبی گھرانے سے نسبت رکھتی ہیں۔ ساجد رضوی نے دار الشفاء ہائی اسکول اور دار العلوم کالج میں تعلیم حاصل کی۔ غزل سے شعر گوئی کا آغاز ہوا۔ کلام میں سلاست، تغزل اور کلاسیکی طرح داری نمایاں نظر آتی ہے۔ غزلوں کے مقطعے بالعموم اسم با مسمیٰ ہوتے ہیں۔ ترنم سے شعر سنا کر محفلوں کو گرماتے رہے، ادھر چند سال سے مشاعروں میں نظر نہیں آ رہے ہیں۔ ساجد رضوی مدحِ اہلِ بیت نظم کرنے اور واقعاتِ کربلا کو اپنے ڈھنگ سے پیش کرنے میں خاص صلاحیت رکھتے ہیں۔ سلام اور قصائد کے مطبوعہ مجموعوں میں "سجدے" "جلوے" "تجلیاں" "شمعِ حرم" اور "کاروانِ غم" قابلِ ذکر ہیں۔ غزلیہ شاعری کا انتخاب "جانِ غزل" کے نام سے اشاعت کی منزلوں میں ہے۔ وقتاً فوقتاً آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے کلام نشر ہوتا رہتا ہے۔ علمی و ادبی رسائل و جرائد میں کم کم ہی چھپتے رہے ہیں۔ حضرت نجم آفندی سے فنِ شعر کی تربیت پائی ہے۔ شگفتہ طبع، وضعدار اور مخلص فرد ہیں۔ (د۔م۔ح)

منصورِ محبت بنا سولی پہ چڑھا میں
رسوا تری خاطر سرِ بازار ہوا میں

اب میرے تصور کا سلیقہ کوئی دیکھے
تنہائی کے عالم میں بھی تنہا نہ رہا میں

مشکوک محبت ہے مرے ہوشِ نظر سے
خود تجھ سے چھپا کر بھی تجھے دیکھ چکا میں

سچ یہ ہے کہ انداز خودی چھپ نہیں سکتے
مجبورِ دعا تو ہے نہ مجبورِ دعا میں

دنیا سے نرالا ہے یہ دستورِ محبت
ہو قتل کی خطا آپ سے پاتا ہوں سزا میں

ساجد کی طرح صحنِ گلستاں میں مسلسل
ہر نقشِ قدم پہ ہوں ترے ناصیہ سا میں

پردۂ ہوش اٹھا گیا کوئی
مجھ کو مجھ سے ملا گیا کوئی

جذب کرکے تجلیوں میں مجھے
اپنا جیسا بنا گیا کوئی

شامِ غم وعدہ کرکے آنے کا
ظلمتِ غم بڑھا گیا کوئی

حالِ دل سن کے خود سے میرا
آپ اپنے کو پا گیا کوئی

آج تکمیلِ دردِ غم کرکے
میری بگڑی بنا گیا کوئی

بھولنے کی جو میں نے کوشش کی
یاد آتا چلا گیا کوئی

صحنِ گلشن میں آج نقشِ سجود
مثلِ ساجد بنا گیا کوئی

دیکھا نگاہ و دل کا تصادم کہاں کہاں
پردے کی جنبشوں میں ملے تم کہاں کہاں

میخانے میں، چمن میں، کلیسا میں، دیر میں
ہوش و حواس میرے ہوئے گم کہاں کہاں

پھولوں میں، بجلیوں میں، ستاروں میں، چاند میں
بکھرا ہوا ہے ان کا تبسم کہاں کہاں

ذوقِ نظر سے پوچھئے مجھ سے نہ پوچھئے
ہوتا ہے دو دلوں کا تصادم کہاں کہاں

پردے کی بندشوں پہ ابھی کل کی بات ہے
ملتے تھے احتیاط سے ہم تم کہاں کہاں

مسجد میں، خانقاہ میں، کعبے کے صحن میں
ساجد ہیں کشتگانِ توہم کہاں کہاں

دل میں ڈھونڈیں گے تجھے یار و حرم کے ویرانے میں
تو تو ملتا نہیں کعبے میں نہ بت خانے میں

دل کبھی شانہ بنا اور کبھی آئینہ بنا
پیچ کچھ اور پڑے زلف کے سلجھانے میں

کیسے سمجھوں کہ ملاقات ہوئی ہے تجھ سے
ہوش باقی ہے ابھی کچھ ترے دیوانے میں

مسکراتی ہوئی کلیوں کا بھروسہ کیا ہے
دیر لگتی نہیں نظروں کے بدل جانے میں

آپ کے جام بکف آنے سے اتنا تو ہوا
بات طے ہو گئی میخانے کی میخانے میں

اس حقیقت کا پتہ پاؤ گے تم وقتِ سحر
شمع میں آگ نہیں آگ ہے پروانے میں

بات اتنی ہے کہ [illegible] سے ہٹ کر ساجد
[illegible] کعبے میں نہ بت خانے میں

بات چند گفتہ

جمہوریت

لفظ جمہوریت کثرتِ استعمال سے بے حال اور پامال ہے خود جمہوریت، اس کے بانیوں اور اس کے مریدوں کے اوصافِ خوابیدہ درخمیدہ کی وجہ سے خوار و زار ہے۔ سقراط سے لے کر آج تک کے مفکرین نے اس کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ اس طرزِ حکومت کے لئے نہ صرف باعثِ افتخار نہیں بلکہ باعثِ ندامت و ملامت ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

ایتھنز کی جمہوریت کا ذکر کرتے ہوئے سقراط نے فرمایا تھا۔ "طوفانِ نفس کی موجوں کے تھپیڑوں پر جھٹکا کھاتا ہوا عوام کا اوراں ڈول اژدھام اس سے اور کیا مضحکہ انگیز ہو سکتا ہے۔ تقریری مقابلے اور مباحث منعقد کرنے والی سوسائٹی کی قائم کردہ حکومت جس کا سپریم کمشنا حمق و مہتاکوں اور معمولی دھندے کرنے والوں کی انتہائی ناپسندیدہ پسند کے ایسے لوگوں پر مشتمل ہے۔ جن کو ہر عقدہ کے بعد کے ہیر پھیر جاننے کی بنیاد پر مقرر کیا گیا ہے۔ کیا یہ ضعیف الاعتقادی اور اوہام پرستی نہیں ہے کہ زیادہ تعداد فہم و فراست پیدا کر سکتی ہے؟ اس کے برعکس کیا یہ ہر مسلمہ نہیں ہے کہ اژدھام میں انسان زیادہ بیوقوف، زیادہ تشدد پسند اور انتہائی بے رحم بن جاتا ہے بہ نسبت اس کے کہ وہ علیحدہ اور اکیلا ہو؟ کیا یہ باعثِ شرم نہیں ہے کہ انسان ایسے فنِ خطابت کے سخن آراؤں کے ہاتھوں حکومت پائیں جن کا شور و غوغا اس وقت تک بند نہیں ہوتا جب تک کہ ان کا منہ بند نہ کر دیا جائے، بالکل اس طرح جس طرح پیتل کے برتنوں کو پیٹنے سے نکلنے والی آواز کی بازگشت کو روکنے کے لئے برتنوں کے منہ پر ہاتھ رکھ دینا پڑتا ہے۔"

ارسطو "انتہائی ابتر قسم کی غیر یکسانیت غیر یکساں اشیاء کو یکساں قرار دینے کی کوشش سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ اس جنگل کے بے سر و پا داستان کی طرح ہے جس میں جب جانوروں کی کونسل میں خرگوشوں نے جانوروں میں برابری یعنی مساوات کی رٹ لگانی شروع کی تو شیر نے پوچھا کہ تمہارے پنجے اور دانت کہاں ہیں؟"

شیکسپیئر "تم بھی چھچھورے سیاستدانوں کی طرح چشمہ لگا کر ایسا ظاہر کرو کہ تم کو سب کچھ نظر آ رہا ہے جبکہ نظر آنے کے لئے کچھ نہ ہو۔"

والٹیئر "بادشاہت اور جمہوریت میں صرف اتنا فرق ہے کہ یا تو تم کو ایک بھیڑیا ہڑپ کر جائے یا ایک سو چوہے ...۔ جو کچھ تم کہہ رہے ہو مجھے اس سے مکمل اختلاف ہے مگر میں اپنے آخری دم تک اس بات کی تائید کروں گا کہ تم جو کچھ کہتے ہو اس کے کہنے کا تم کو حق حاصل ہے۔"

ایڈمنڈ برک "جمہوریت اور بد اخلاقی دستوری آزادی کا ناقابلِ تسخیر دشمن ہیں۔"

ایمرسن "انسانوں کی ناتراشیدگی اور نااہلی ہر لمحہ اقتدار کے سے میلان، بے غرض اور سنجیدہ دلیری کی مذمت کرتی ہے"

امیکسن کی داد کو جانے "جمہوریت اعلیٰ ترین خوبیوں کو ہموار و چپٹا اور معمولی پن کو ابھارتی ہے"

ڈیسیفن: "اس کو اس بات کا یقین ہے کہ جمہوریت یعنی عوام کی جوڑ توڑ اور کارستانیوں سے احمق اور دھوکے باز تر ہو جاتے ہیں اور ملک معمولی اور ادنیٰ قسم کے بے ایمان اور بدکار لوگوں کے رحم و کرم کا شکار ہو جاتا ہے۔"

ھربرٹ سپنسر: "میں سزائے موت کو صرف حکمرانوں کی بداعمالی، بدعنوانی، رشوت خوری یا سرکاری رقومات کے لئے جائز سمجھتا ہوں۔"

جے۔ بی۔ پریسٹلے: "جمہوریت کا انحصار معمولی قسم کے سلیقہ، شائستگی و خوش اطواری پر ہوتا ہے اگر کوئی کسی جماعت کے خلاف ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اس کے اسٹینڈرڈ کو گرا کر EFFACATE و خالی کر دے۔"

برنارڈ شاہ: "جمہوریت چند بددیانت لوگوں کو مقرر کرنے کے بجائے عوام کے انتخاب کا حق کثیر تعداد میں نا اہل لوگوں کو سونپ دیتی ہے۔"

آلڈس ھکسلے: "جمہوریت کا اپنا قانون یہ ہے کہ جو گروہ کسی تجویز کو پیش کرتا ہے یا ہوتا ہے وہ اس کا مخالف ہوتا ہے، کے لئے لیاقت کے متناسب ہے۔ اس بارے میں بحث بھی ہوتی ہے وہ ان دونوں کے وزن یا تعداد کے برابر۔ اور ان مجموعوں سے جو ہے وہ جمہوری کیفیت ہے۔"

ڈاکٹر ایس۔ رادھاکرشنن: "جمہوریت سے مراد محض پنچایتی نظام نہیں ہے۔ اس کا مطلب بداعمالی، بددیانتی یا رشوت نہیں ہے۔ اس کا مطلب پاسداری کی نمائش یا اقتدار و حق استحقاق کا بیجا استعمال بھی نہیں ہے۔ جمہوریت میں اخلاقی معیاری اصولوں پر حکومت چلائی جاتی ہے۔"

جینز ونسن: "اگر کوئی قوم مسلسل مباحث برداشت کر سکتی ہے تو ہم کو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ وہ ٹھنڈے دل کا طریقہ (رویّہ) اختیار کر سکتی ہے۔ جو اصلی جمہوریت کی سند ہے۔"

نارتھکوٹ پارکنسن: "جمہوری دستور کے دو بنیادی اصول۔ ایک تو لامرکزیت جس کے تحت اعلیٰ اقتدار اقتدار میں دخل اندازی نہیں کرتا۔ دوسرا بنیادی اصول مرکزیت ہے یعنی قومی سطح پر فیصلہ کرنا جس کا مطلب یہ ہے کہ اقتدار اعلیٰ اونچے کام کرنے سے روکتا ہے۔"

" JEEUITS جیزوئٹس اور اشتمالیت کے مقابلہ میں معاشرتی انسان نہایت کمزور ہے جو محض خیالی خوبیوں کا مجموعہ ہے وہ خود عمل پیرا نہیں ہوتا اور آپ کو وہ راہ بتلاتا ہے جس پر وہ خود نہیں چلتا۔"

ایڈلائے اسٹیونسن: "جمہوریت کا نفاذ محض حق رائے دہی یا استعمال یا پارلیمنٹری سسٹم، معاشی نظام یا قانونی ۔۔۔ نہیں۔ جمہوریت غالباً فطرت انسانی کا ایک نہایت دلیرانہ تجربہ ہے۔"

ڈوایٹ میکڈانلڈ: "اعلیٰ ترین کو سپاٹ کرنے کی کوشش میں ہماری جمہوری سوسائٹی بدترین اور کمتر میں کامیاب ہو جاتی ہے تاکہ اونچ اور نیچ کو ملا کر ایک انتہائی مدقوق اور ادنیٰ سطح پر پہنچا دیں جس میں ۔۔۔ کا سکتا ہے۔ اور یہ کہ ۔۔۔ کی زندگی کو بحث کر دہ ۔۔۔ ہو کر گلے سڑ رہے ہیں۔"

ونوبا بھاوے: "گنگے ہلستے جب دنیا بھر سے ۔۔۔ کہا کہ آخر بات ہے کہ ۔۔۔ ام ۔۔۔ جمہوریت ۔۔۔ تو مولانا سجاد مرحوم نے ۔۔۔ ۔۔۔ خرابی ملنے ۔۔۔ فرق ماہیت کا علم نہیں کیا بلکہ اس کو فرقہ

ابراہیم لنکن: "(الف) عوام کو ہمیشہ کے لئے دھوکے میں نہیں رکھا جا سکتا مگر ان میں سے ایسی کافی تعداد کو الو بنایا جا سکتا ہے جو ایک جمہوری ملک پر حکومت قائم رکھنے کے لئے کافی ہے۔"

(ب) "رائے دہندوں کی تعداد جس قدر زیادہ ہوگی اسی کے لحاظ سے اُن کی پسند کے نمائندوں کی صفات معمولی ہوں گی۔ وہ اپنے نمائندوں کی عقل، وسیع النظری اور دور بینی کی خوبیاں نہیں مانگتے بلکہ تھوڑی سی بہت تقریر کرنے کے فن کی صلاحیت اور عوام کو ناؤ کشتی کا وعدہ سے ندا چہرے رکھنے کا انتظام۔"

(ج) "جمہوری طرز حکومت میں عنانِ حکومت ایسے اشخاص کی گرفت میں آجاتی ہے جن کی رشوت ستانیاں، غیر معمولی حد تک معمولی ہوں، نااہلیت اور قانونی حیلہ بازیاں اکثر پارلیمنٹری حکومت سے ہٹا کر مظالم یا آمریت کی طرف لے جاتی ہے۔"

(د) "کم تعلیم یافتہ لوگوں یعنی جاہلوں کی جمہوریت کا مطلب ہے بے حساب ریاکاری اور بے پناہ دغابازی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اصل مقتدر جماعت کے علاوہ ایک بڑی تعداد طفیلی سیاستدانوں چھوکروں کے لئے آرام و آسائش کے لوازمات فراہم کرنا۔ اور یہ سمجھے محض اقتدار اعلیٰ کی خدمت اور حب [illegible] کی دھوکہ دہی کا کام سرانجام دیتے ہیں۔"

(ہ) "آج کل یہ رجحان ہو گیا ہے کہ لاعلمی اور ناواقفیت، رشوت خوری اور بد دیانتی وغیرہ عوام کے نمائندوں اور جماعت کی اجارہ بن کر رہ گیا ہے۔"

(و) اگرچہ کوئی دو انسان یکساں نہیں ہوتے مگر موقعوں کی فراہمی یکساں ہونی چاہئے اور ہو سکتی ہے۔ ہر شخص کو اس بات کا حق حاصل نہیں ہوتا کہ اس کو عہدے اور اختیار حاصل ہو بلکہ اس کو یہ سہولت (حق) حاصل رہنا چاہئے کہ وہ کسی بھی شعبہ میں داخل ہو سکے جہاں اس کی اہلیت بڑھ سکے اور پروان چڑھ سکے۔ اور وہ اقتدار اور عہدہ حاصل کرنے کے قابل سمجھا جا سکے۔"

(ز) "جب سرمایہ داری اور معاشرتی اصولوں میں ٹکراؤ ہوتا ہے تو اس سے جو چیز پیدا ہوتی ہے وہ معاشرتی طرز حکومت کا قیام نہیں بلکہ ریاست کی سرمایہ داری وجود میں آتی ہے۔ انقلابی خود سرمایہ دار بن جاتے ہیں اور خود کو ملک سے تعبیر کرنے لگتے ہیں۔"

کپلنگ: "سیاست کا مطلب ہے امیروں سے دولت اور غریبوں سے ووٹ حاصل کرنا اور یہ بتلانا کہ ہر ایک کو دوسرے سے محفوظ رکھا جا رہا ہے۔"

لارڈ کیمراز: "پارلیمان کی اکثریت کو مطیع و منقاد رکھتے ہوئے موجودہ جمہوری حکومتیں فرسودہ قسم کے قوانین منظور کروا کر نتائج کے مسائل کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ پارلیمنٹ مقتدر اعلیٰ ہے اور ایسے قوانین منظور کر سکتی ہے مگر دیکھنا یہ ہے کہ یہ طریقہ کار قوانین کی حکومت کے منافی تو نہیں۔ کسی جمہوری حکومت میں عدلیہ اور وکالت پیشہ لوگوں کو مکمل آزادی حاصل رہنی چاہئے۔ ان ہی سے ہر ایک باشندے کی آزادی برقرار رہ سکتی ہے۔ ان کی غیر موجودگی میں آزادی کے دستوری تحفظات اور [illegible] طور پر [illegible] حکومت محض [illegible] کاغذی شیر سے [illegible]۔"

واقعہ [illegible] ہے کہ جمہوریت سے مراد ہے عوام کی [illegible] خاطر عوام کا [illegible] عوام ہی کے ہاتھوں [illegible] ایسا نظام حکومت جس میں [illegible] کو غریبوں کے لئے [illegible] صفات حاصل ہوتی ہیں۔ جس میں آپ [illegible] چاہیں [illegible] مگر یہ [illegible] نہیں [illegible] کہ آپ نہیں [illegible] چاہتے [illegible]۔ ایک ایسی حکومت جو عوام کا ہے [illegible] بعض عوام [illegible] کی [illegible] کرتے ہیں۔

سب رنگ

اس عنوان کے تحت ہندو پاک کے معیاری ادبی رسائل و کتب سے منتخب نظم و نثر کا انتخاب شائع ہوا کرے گا۔ (ادارہ)

سبق

رضیہ فصیح احمد

"کچھ اور بھی سُنا؟ —"

خالہ بڑھن جب بھی آتی ہیں برقع اتارتے ہوئے یہی ایک جملہ کہتی ہیں — مگر آج وہ بڑی ہی بے چین سی لگ رہی تھیں اور ان کے لہجے میں کچھ ایسی کھنک سی تھی کہ جو میں اکثر ان کا یہ جملہ نظر انداز کر دیتی، پہلی مرتبہ متوجہ ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ حالانکہ ابھی ابھی "خاتون" کا خاص نمبر لے کر بس بیٹھی ہی تھی جس میں کوئی چھوٹا ناول قسط وار چل رہے تھے۔ ابھی پیدی اور سرورق ناشتہ ہی کے نام [illegible] نہ ہوئے تھے کہ خالہ آن ٹپکیں —

"خالہ سلام" — میں نے دھوپ میں پڑی ہوئی چارپائی پر اکڑوں بیٹھے بیٹھے کہا۔ سردیوں کی دھوپ میں بیٹھنے کا انداز ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔

"اماں کہاں ہیں؟" خالہ نے میرے سلام کو سرے سے نظر انداز کر دیا۔ اتنے میں اماں باورچی خانے سے ہاتھ پونچھتی نکلیں۔

"سلام آپا، آؤ — آج تو صبح ہی صبح ...."

"اسے نگوڑا بتا رہا ہے کہ خانزادہ بڑی کے گھر تیار ہو رہا ہے اور چھوٹی بھی وہیں پہنچ گئی ہے" — "اچھا —!" اماں نے حیرت سے منہ اور آنکھیں پھاڑ دیں —

"چلو ذرا تماشا دیکھ کے آئیں" خالہ ایسی خوش تھیں جیسے کہیں لاٹری نکل آئی ہو۔

"ہائے ہے" اماں نے کلیجہ تھام لیا — "کمبخت کہیں اگر انہیں پتہ چل گیا یا بابو صاحب کو تو؟"

"اونہہ، انہیں کون بتانے بیٹھا ہے؟ پانچ منٹ میں ہو کے آ جائیں گے۔ پیچھے سے گھر میں کیا پتہ چلے گا کون آیا کون گیا —"

اماں کے چہرے پر تذبذب کے آثار تھے — آخر انہوں نے میری سمت دیکھا — "اور بجیا؟" خالہ نے پلٹ کر میری طرف دیکھا میں ہاتھ "خاتون" کے ناول "آنکھیں میں بھرے ہیں آنسو" کی چھٹی قسط پڑھنے میں منہمک تھی۔ بے حد لطف آ رہا تھا۔ اماں اور خالہ کی باتیں کانٹے کی طرح چبھ رہی تھیں۔ مگر بڑوں سے انسان کچھ کہہ بھی تو نہیں سکتا۔ ابھی میری سہیلی ہوتی تو [illegible] کیا بک بک لگا رکھی ہو۔ دیکھتی نہیں ہو میں پڑھ رہی ہوں —

"بجیا کو بھی لے چلو" خالہ بولیں۔

"تلے بے" اب کے تو اماں سر سے پیر تک کانپ گئیں۔ "جوان لڑکی کو لے کے گھر —!؟"

"امّاں تو کہتی ہیں کہ پانچ منٹ کے مطابق ... کسی کو کچھ پتہ نہیں چلتا۔"

"نہ، اکیلی کسے جانا ٹھیک نہیں۔" اماں نے فیصلہ دیا۔ تب خالہ بی کے کان کھڑے ہوئے، خدا جانے کہاں جانے کی باتیں ہو رہی ہیں۔

"تو پھر اسے یہیں چھوڑ جاؤ — تھوڑی دیر کی تو بات ہے۔ اندر سے کنڈی بند کرلے گی۔"

"نہ بابا — زمانہ خراب ہے۔ جوان لڑکی کو اکیلی گھر میں چھوڑنے کی قائل نہیں۔"

"اے تم تو قصائی کی بچی ہو — چل تو بھی اٹھ — ذرا دو منٹ کو ہمارے ساتھ چل۔"

خالہ نے آخری بات اسی سے کہہ کر اپنی آواز کا والیوم بڑھا کر مجھے مخاطب کیا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا اور ایسے موقعوں پر میں بہت نخرے بھی کرتی تھی — مگر آج خالہ اماں کی ٹون ایسی تھی کہ تجسس غالب آگیا۔ جوانی دیوانی ہو نہ ہو کریدنی ضرور ہوتی ہے۔ میرے دل کو بھی کرید سی لگ گئی۔ آخر یہ جا کہاں رہی ہیں؟ میں اپنے پسندیدہ رسالے کو تکیے کے نیچے چھپا، میں بال بنانے لگی۔

اماں بولیں "یہ پھول دار کپڑے نہیں چلیں گے، میں ذرا بدل لوں۔"

"بس قمیص بدل ڈالو۔ شلوار اور دوپٹہ تو ٹھیک ہیں۔" خالہ نے کہا۔

وہ جیسے بیٹھی تھیں ویسی ہی چلنے کو تیار تھیں۔ مگر امی نے سادگی کے بہانے دھوبی کے گھر کی دُھلی ہوئی کھڑکھڑاتی لٹھے کی شلوار اور شربتی رنگ کی ململ کی قمیص ... سفید دوپٹہ اوڑھے، کالی چادر میں لپٹ کر تیار ہوگئیں۔ گھر میں تالا ڈالتے ہوئے اماں نے پڑوس کے بچوں کو گھر کا خیال رکھنے کو کہا اور خالہ جان کے ساتھ ... ہو لیں۔ جوں جوں ہم آگے بڑھتی جاتیں، گلیاں پتلی، سیلی اور غلیظ ہوتی جاتیں۔ گلی کے دونوں طرف سرخ اینٹوں کے مکان تھے۔ کہیں کہیں ٹاٹ کے پردوں کے پیچھے سے بچے مکان کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے نظر آتے تھے۔ ان ہی گلیوں میں سے [illegible] گلیاں پھوٹ کر [illegible] ایسی گلیاں کہ جہاں سورج دیوتا کا تو کیا ذکر [illegible] صاحب تک کو جھانکنے کی اجازت نہیں تھی — خالہ اماں آواز [illegible] کرتی جا رہی تھیں۔ میں اپنے برقعے اور جوتوں کو [illegible] سے بچاتی ان سے نزدیک تر رہنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی — "اے ہے، سب کام ویسے ہی پڑا ہے [illegible] دروازے بند ہوگئے یا پھر [illegible] تو اب دوسرے محلوں [illegible]"

خالہ کی آواز آئی۔

"بس خالہ آہستہ بولو، بہت سناٹا سب ہے۔" اماں نے کہا۔

[illegible] کہیں کہیں سڑک پر [illegible] نکلا تھا۔ ایسی ہی اینٹوں کی سرخ سیلی گلیوں سے گزرتے [illegible] ایک طرف [illegible] نظر آیا۔ خالہ اماں [illegible]

[illegible]

"میں اسے کیوں مارتی، میرے صدقے تو وہ جاتا تھا۔ میرے بچوں کو پیار کرتا تھا۔ ہمارا ہو وہ دشمنوں نے جو جل جل کر خاک ہو رہے تھے" ایک نے ہاتھ لہرا کر کہا، اس کے بالوں کی لٹیں بکھری ہوئی تھیں۔ آنکھیں سرخ تھیں اور شل سے آنکھیں اور ناک صاف کرنے کی وجہ سے چہرہ سرخ چقندر ہو

"ارے مجھ دکھی، بی بات کی خبر ہے، سب کچھ اس سے لے لیا اور جب کنگال کر دیا، کچھ نہ رہا تو اسے ختم کر دیا" دوسری عورت حلیہ بھی کم و بیش ایسا ہی تھا۔ اس کی بیٹھی ہوئی آواز بتا رہی تھی کہ یہ معرکہ خاصی دیر سے جاری ہے۔

"ارے ختم تو تو نے اسے پہلے ہی کر دیا تھا، اس کے پاس تھا کیا" پہلی عورت نے دانت کچکچا کر کہا۔ عورتوں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر موقع کی نزاکت کا خیال کر کے جھٹ اپنی کھلی باچھیں سمیٹ لیں۔

"پھر بچوں کو اس کا نام لے کر پال رہی ہے اور کہتی ہے کہ اس کے پاس تھا کیا" دوسری نے چٹکی لی۔ عورتوں نے پھر ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکا۔

"ارے پال رہی ہوں تو اپنی کمائی سے ـــ اس کے پاس تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ میں ہی اسے دیتی تھی جس میں سے وہ ترس تیرے بچوں کو بھی خیرات دے دیتا تھا" پہلی نے تلملا کر کہا۔

"خیرات کی بچی ـــ" مزید تکلف کئے بغیر دوسری عورت نے پہلی کے جوڑے پکڑ لئے اور دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔ سب نے کہہ کے انہیں چھڑانے کی کوشش کرتی رہیں مگر جب تک وہ الگ ہوں ایک کی بالی کان کو چیرتی ہوئی دوسرے کے ہاتھ میں تھی۔ اور کان سے خون ٹپک رہا تھا۔ دوسری کے بالوں کا ایک گچھا پہلی کے ہاتھ میں تھا۔ دونوں کے بال سر پر چڑیوں کی طرح کھڑے تھے ـــ خون کبوتر اور چہرے لال بھبوکا۔ دونوں کی زبانیں ایک ساتھ بجائے جانے والے دو الگ الگ ریکارڈوں کی طرح مختلف راگ الاپ رہی تھیں جن کی تھیم بہت حد تک ایک ہی تھی۔

اسی وقت مردانے میں سے کوئی لمبا چوڑا مرد آیا اور بھاری بھرکم آواز میں بولا۔ "یہ کیا شور مچایا ہے تم لوگوں نے۔ میت کا بھی احترام" چار آدمی اس کے ساتھ تھے۔ انہوں نے چارپائی اٹھائی اور بیڑ کو چیرتے مردانے میں لے گئے۔ ان میں سے ایک عورت جھٹ اس مرد "بھیا تم نے کہا تھا کہ کوئی پھندہ ہو گا تو میں آئی تھی ورنہ میں اپنی بے عزتی کرانے کبھی نہ آتی۔ اب میں تو جا رہی ہوں، اگر جنازہ نہ آیا اور مجھے نہ دکھایا تو قیامت کے دن تمہارا ہاتھ تھاموں گی ـــ چلو رے چلو۔ ننکو، سکو، گڈو، جلو۔ چلو" ذرا دیر میں مرغی کی طرح بچوں کو سمیٹ وہ اپنی کالی شال کو سر پر اوڑھے اسی سے ناک پونچھتی ہوئی تیزی سے باہر نکل گئی۔ گھر میں رہ جانے والی مرغی حاضرین کو دیا "کٹنی نے پولیس کو بھی پیسے کھلا دیئے۔ وہ بھی اس سے مل گئی۔ سب کو معلوم ہے کہ قتل کا کیس ہے۔ لاش کو کٹنے سے اٹھا کر دکھا دیا پھر پھسل گیا۔ ہسپتال لے کر نہیں گئی" مُردی کہتی ہے کہ ڈاکٹر نے یقین دلا دیا تھا کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ وہ بھلا نالے اور کان سے خون بہ فکر کی بات ہی نہیں۔ ڈاکٹر کو بھی پیسے کھلائے ہوں گے ـــ میں کہتی ہوں کوئی نہیں ہے اتنے لوگوں میں میرا جو کہنے والا ـــ صاف کہوں گی کہ اس کٹنی نے اسے مارا ہے" وہ ہسٹیرک ہونے لگی تو عورتوں نے گھسیٹ کر دیوان پر لا کر بٹھا دیا۔ ایک عورت نے پانی لا کر پلایا۔ وہ دیوار سے سر لگا کر لمبی لمبی آہیں بھرنے لگی۔

میں کسکتی کسکتی بالکل ہی کونے میں ستون کے پیچھے دبک گئی اور ماحول کا جائزہ لینے لگی۔ جہاں میں بیٹھی تھی وہاں سے تو مردانہ صاف نظر آ رہا تھا۔ ایک میں بغیر بستر کی چارپائی اور دوسرے میں ایک خالی تخت بچھا ہوا تھا۔ خاصا بے سر و سامانی کا عالم تھا۔ برآمدے کے ستون

کے تھے جو تمیں سے سیاہ ہو رہے تھے اور مکھیاں ان پر ایسی طمانیت سے بیٹھی تھیں جیسے گڑ پر بیٹھی ہوں ۔ باورچی خانے میں میلے برتن بے ترتیبی سے پڑے تھے ۔ صحن میں ہینڈ پمپ کے نیچے میلے کپڑوں کا ڈھیر پڑا تھا جیسے کوئی کپڑے دھوتے دھوتے اٹھ گیا ہو ۔ صحن کی دیواروں میں طاقچے تھے جن میں خالی ڈبے، بوتلیں اور بے کار چیزیں شاید برسوں سے پڑی تھیں ۔ صحن میں تین چارپائیاں بان کی پڑی تھیں جن پر مریضوں کی بیٹھکیں بھی جمی ہوئی تھیں ۔ صحن کی دیوار کے ساتھ لکڑی کے خالی بکس اور کارڈ بورڈ کے ڈبے دھرے تھے ۔ اور دو تین بہت جہازی قسم کی پرانی آرام کرسیاں پڑی تھیں ۔ ذرا جھک کر دیکھا تو کوٹھے پر جاتا تنگ زینہ نظر آیا ۔ سارے محلے میں ایسے ہی تنگ ٹوٹے پھوٹے اونچی اونچی سیڑھیوں والے زینے تھے ۔ جہاں سے کسی کا گر پڑنا کوئی ایسی تعجب کی بات نہیں تھی ۔ تعجب مجھے کوٹھے کی دیوار میں بنی ہوئی ایک کھڑکی پر ہوا جو کوٹھے کے صحن میں کھل رہی تھی اور جس میں سے ایک تخت کا سفید کونا اور چند گاؤ تکیے نظر آ رہے تھے ۔ اوپر ایک خوبصورت سی شہ نشین تھی ۔ نیچے یہ غلاظت اور اوپر یہ سجاوٹ ۔ میں حیران ہو کر سوچنے لگی اور جانے کیا جی میں سمائی کہ جھٹ وہ تنگ زینہ چڑھ اوپر چلی آئی ۔ زینہ ویسے ہی اوٹ میں تھا ۔ اور سب اس عورت کی باتوں میں جو دنیا سے [illegible] ہو گئی تھیں، اتنے محو تھے کہ کسی نے مجھے نہ دیکھا ۔ اوپر ایک منقش چھت کے نیچے چاندنی کا فرش تھا ۔ گاؤ تکیے دھرے تھے ۔ ایک طرف تخت بچھا تھا ۔ خاصا صاف ستھرا ماحول تھا، نزدیک ایک کمرہ تھا جس کے کواڑ بھڑے ہوئے تھے ـــــ لگے ہاتھوں یہ بھی دیکھتی چلوں ۔ میں نے دھکا دیا ۔ کواڑ کھلے اور جیسے چودہ طبق روشن ہو گئے ۔ پھر ایک بم پھٹا ـــ "کون ہے ـ؟" ایک عدد موٹی سی کالی ـــــ "ذرا سامنے تو آ تجھے بھی سبق دے ڈالوں"

پھر چوڑیوں کی کھنکھناہٹ کے ساتھ کھی کھی کی آواز ـــــ دروازہ بند کرتی تو اور سامنا ہوتا ۔ میں اسے جوں کا توں چھوڑ دل پر ہاتھ رکھے جانے کیسے زینے کی وہ خطرناک سیڑھیاں اترتی ہی چلی گئی ۔ ایسی ہی سیڑھیوں سے گرے ہوئے شخص کا جنازہ ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے مثال بنا سامنے دھرا تھا ۔ میں ٹھیک اسی جگہ جا بیٹھی جہاں سے اٹھی تھی ۔ مگر دل کسی طرح اس جگہ واپس نہیں آ رہا تھا ـــ بھاگے جا رہا تھا، طوفان میل کی طرح، جیسے اب کبھی رفتار کم نہ کرے گا ـــ وہ تو اچھا ہوا اماں نے نہ دیکھا ورنہ اسی جگہ یقیناً میری میت دھری ہوتی ۔

"چلو بس چلو" انیقہ خالہ نے مجھے ٹہوکا دیا اور خود بھی اٹھ کھڑی ہوئیں ۔ ذرا کی ذرا دیوار سے سر ٹکائے آہیں بھرتی خاتون کو دلاسہ دیا اور تیزی سے جوتے پہن، برقعے اوڑھ گلی میں اتر گئیں ۔ میں اور اماں بھی لشتم پشتم پیچھے بھاگیں ۔ اب قافلہ پھر پہلے کی طرح رواں تھا ـــ آگے خالہ بڑھ رہیں، پیچھے اماں، توبہ تلا مچاتی، کانوں پر ہاتھ دھرتی، پیچھے میں اپنے دل کو قابو میں رکھنے اور غلاظت سے قدموں کو بچانے کی کوشش کی۔

"ستیاناس، کیا کہہ رہی تھی کہاں کہاں پھنسا لیا؟" خالہ پلٹ کر مسکرائیں ۔

"توبہ توبہ، کیسی میت کی بے حرمتی کی" اماں بولیں ۔

"مگر آپا پیشہ تو انہوں نے چھوڑ دیا ہے ـــ سنا ہے ۔"

"اے نہیں، سب چلتا ہے" خالہ نے آواز کے ساتھ چال دھیمی کر دی ۔"

"ڈاکٹرانی کہہ رہی تھیں مجھ سے ایک ایجنسی کا پوچھ رہی تھی کہ کون کیسا ہے ـــ چھوٹی بہنیں بھی سب بڑیوں کے نقش قدم پر چل رہی ہیں ۔ [illegible] تو نام ہی نام ہے ۔"

"اے مجھے ویسے گھر میں جانا نہیں چاہیے تھا کنواری بالی کو لے کر"

"اے تو کیا اس کے اصل جنازے پہ کسی نے [illegible]، یا تمہاری ساری کسی نے ہاتھ ڈالا جو ایسے گھبرا رہی ہو"

"خیر خواہ مخواہ تو بیٹا —" اماں بولیں
"وہ مرد ہی کیسے جو کمال ہو" خالہ چڑ گئیں۔
"ذرا بھی خدا تماشہ دیکھ کر آ گئے۔ بھلا بتاؤ مفت میں کہیں ایسا تماشہ دیکھنے کو ملتا۔ بھئی پتہ نہیں کیا ہو گیا نہیں"
"تمہاری اس کنوئیاں پینے کی عادت نے ہی تو خراب کیا ہے تمہیں" ایسے کہہ ہی رہی تھیں" اماں دل ہی دل میں خوش تھیں۔
"تو اور کیا" اور ابھی تو چل رہا ہے ڈرامہ۔ دیکھو دفنانے دفنانے کہیں سے جہیز کی دھجیاں ہی نہ بکھر جائیں" خالہ مزے میں تھیں۔

"چلو اچھا ہے آدمی دھجیاں یہ اپنے گھر میں دفن کرے گی" آدمی رہے اپنے گھر میں"
"توبہ کرو تو بہت —" اماں اتنی سنجیدہ بنی جا رہی تھیں۔ مگر محض دکھاوے کو وہ بھی خوب لے رہی تھیں۔
گھر آیا تو دونوں برآمدے میں بیٹھ گئیں — اماں چھالیہ نکال کر بیٹھ گئیں اور خالہ سر گوشیوں میں پلنے بڑھنے کا شغل کرنے لگیں۔ اس گھرانے کی خیلی کو اٹھانے سارے راز طشت از بام کر رکھے تھے — میں نے پھر اپنا رسالہ کھولا — سنسنی خیز تھا بھی کیا — رسالہ کیا بیچنا تھا — مسالہ بیگم کا افسانہ "سوکھے پھول" پڑھنا شروع کیا — پھر — بالکل سوکھے پھولوں کی طرح بے جان تھا — "آؤ اک عمرِ اثر ہوتے تک" ناول کی ہر قسط بڑے شوق سے پڑھتی تھی۔ وہ شروع کیا — وہی ... یہ ناول بھی اس وقت بالکل بے جان اور بیمار سارے پھیکے چہروں کی قسطیں دیکھیں۔ سب پھیکی تھیں — جانے کیا چڑیلیں چڑیلیاں کی کہانی ہیں۔ میں نے رسالہ اٹھا کر پھینک دیا۔ اور تکیے کے نیچے سے ناخون تراش نکال کر سر جھکا کر چھوٹے موٹے ناخون کاٹنے لگی تاکہ خالہ اور اماں کی باتیں اچھی طرح سن سکوں۔
(بشکریہ انکار ہم)

غزل

اظہر سعید

لوگ آتے ہوئے ٹھوکر نہ لگا لے جائیں
ہم نہ پتھر ہیں کہ رستے سے ہٹائے جائیں

فکرِ مرہم بھی نہیں، فرصتِ درماں بھی نہیں
اس پہ یہ ہے کہ ہم زخم دکھائے جائیں

روز کی پرسشِ احوال سے تنگ آئے ہیں
درد افسانہ نہیں ہے کہ سنائے جائیں

اک کرن، اک گلِ تر، ایک صبا کا جھونکا
عمر ہے تو انہیں خوابوں میں گنوائے جائیں

طعنۂ زہد نہ دو، اب جو کم آمیز ہوئے
ہم نہ ایسے ہیں کہ ایسوں سے [illegible] جائیں

کم ہوئی بزمِ تمنا میں دلوں کی قیمت
اب یہ آئینے کہیں اور سجائے جائیں

دیکھنا قسمتِ دل شہرِ وفا ٹھہرے ہیں
ایسے پیماں کہ نہ توڑے نہ نبھائے جائیں

بوسۂ خونِ بسمل کے بنا جاتی ہے قاتل کا سراغ
[illegible]

بشکریہ انکار

نقد و نظر

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدوں کا آنا ضروری ہے)

کتاب: شب گرد۔ شعرائے کنڑا کے منتخب شعر۔ ترجمہ: حمید الماس۔ صفحات ۹۶۔ قیمت دس روپے
ملنے کا پتہ: [illegible] ۷۵۴ [illegible] بنگلور۔

کنڑا کے وہ چند شاعر یقیناً خوش نصیب ہیں جن کی شاعری کو حمید الماس جیسے [illegible] نصیب ہوا۔ شب گرد میں جن شعرا کا کلام شریک ہے ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ [illegible]، [illegible]، بی۔ [illegible]، [illegible]، [illegible]، سدا [illegible]، [illegible]، [illegible]، [illegible]، [illegible]، چندر کانت کسنور، [illegible]، [illegible]، [illegible]۔ گویا [illegible]۔

شب گرد میں شریک نظموں سے یہ احساس اور شعور ہوتا ہے کہ شاعری کی بنیادیں سماج سے ہٹ کر [illegible] ہیں چاہے وہ کسی زبان میں ہو۔ آج کا شاعر اپنے [illegible] کا اظہار کرتا ہے [illegible] وہ نہیں چاہتا کہ سماج اس کے رسوم و قیود اس کے اظہار پر [illegible]۔ کنڑا کے شاعر [illegible] اور [illegible] میں صاحبِ کمال ہیں۔ چند مختصر نظمیں تو اتنی رنگین اور خوش [illegible] ہیں جیسے تتلیاں۔

اس شاعری میں [illegible] ہے وہ [illegible] اپنے ملک کی وسعت و عظمت، اپنے کلچر کی شان و شوکت کے درمیان [illegible] ہے۔ [illegible] نظموں کے ترجمے اتنے شستہ کیے گئے ہیں کہ کہیں ترجمہ ہونے کا اندازہ ہی نہیں ہوتا۔ اس کے لیے حمید الماس مبارکباد کے مستحق ہیں۔ چند نظمیں ملاحظہ کریں۔

آسماں سے اتر کر گیا / یہ زمیں سے کہ
[illegible] / اور
[illegible] / [illegible]   (چندر کانت کسنور)

یہ جو آنسو [illegible] / [illegible]
[illegible]
[illegible]   (سدا [illegible])

دیکھتا ہوں جب بھی دیواروں میں پودے
اور امریکی دکانوں پر / بہاری کو قمیر
ذہن میں اک تازگی محسوس ہوتی ہے مجھے (اے کے مانجم)

کتاب کا سرورق مناسب، کتابت، طباعت اچھی اور قیمت مناسب ہے۔

(اسلم)

رات کے ہزار ہاتھ شاعر: علی ظہیر۔ صفحات ۷۲۔ (مجلد ۶۵) قیمت: ۱۵ روپے

ناشر: فردوسی پرنٹرس و پبلشرس حیدرآباد — ملنے کا پتہ: اردو اکاڈمی حیدرآباد۔ آندھرا پردیش

علی ظہیر اردو کے جدید تر شاعروں میں سے ہیں اور ان کی شاعری اس ننھے سے پودے کی طرح ہے جو زمین سخن پر اگ رہا ہے۔ علی ظہیر کا شعری رویہ خالص شاعرانہ ہے۔ اور ان کی نظمیں مختصر ہیں۔ لیکن کم الفاظ میں اس کیفیت کے اظہار میں کامیاب ہیں جو شاعر کے دل و دماغ میں کا نیا ٹھلا استعمال ایک پیاس کو باقی رہنے دیتا ہے اور یہی پیاس ہے جو علی ظہیر کے کلام کو جمیت کا رنگ برقرار رکھنے دیتی ہے۔ علی ظہیر کی بلند آہنگ میں کسی عہد نامہ ہونے کا دعویٰ کرتی ہے نہ تو رومانی عمرانیات سے تعلق رکھتی ہے۔

علی ظہیر کی یہ مختصر نظمیں کسی طویل نظم کا مختلف حصہ لگتی ہیں اور شاید وہ طویل نظم ان کی شاعری ہے۔ علی ظہیر کا موضوع ہے فرد کی صحت ان کا شکوہ ہے کہ انسانیت ریت رسم، وقت اور سماجی پابندیوں سے اتنی متاثر ہو گئی ہے کہ معصومیت میں وہ سادگی نہیں۔ ان نظموں کے موضوع ہیں اور ان ہی کے کرب و توہمات کو شاعر خاص کلائمکس کے مقام پر سے اٹھا لیتا ہے۔ ان مختصر نظمات کو ڈرامائیت اور تیکھی سادگی سے آراستہ کرتا ہے کہ پورا منظر سامنے آجاتا ہے۔

علی ظہیر کی نظم جدید تر طرز کی نظم ہے۔ اس کا ماحول نئی زندگی اور نیا شہر ہے۔ ان کا لب و لہجہ انتہائی سادہ ER SIMPLIFIED زمان و مکاں کا تعین ممکن نہیں۔ یوں تو نظموں میں وقت کی کوئی خاص علامت متعین نہیں ہوتی لیکن ان نظموں میں ہر کرب و درد کو آفاقی حقیقت کیا گیا ہے۔ علی ظہیر کی شاعری تازہ اور متفکر ذہن کی پیداوار ہے اور ابھی نئی نویلی ہے۔ اور آہستہ آہستہ اس میں نو خیز پودے سے گھنے درخت ہے۔ اس کی تازگی میں غضب کا حسن ہے اور میں بڑے ادب دوست سے اس کتاب کے مطالعہ کی سفارش کروں گا۔ علی ظہیر قارئین کی نذر ہیں۔

— جب مرا لطف سخن چھینا گیا
ٹھنڈے لاوے کی چٹانوں کی طرح
سوچ سینے کے سیہ خانوں میں خاموش ہوئی
زرد سوکھے ہوئے پتوں کی قطاریں ہر سو
راستے ڈھکتی گئی۔
آج راہوں کے مقدر میں کوئی چاپ نہیں — جب مرا لطف سخن چھینا گیا۔

— میرے اپنے سکول کے اندر
دوسرے بچے کھیل رہے ہیں
میں لمہ کھڑکی پر ٹھہرا ہوا۔ — منظر

— میں تمہاری آنکھ کی پتلی میں رہتا تھا کبھی
اب کنویں کے پانی میں جھانکتا ہوں۔
کوئی دیواروں پہ بیٹھا/ میں سناتا ہوں فسانے
لوگ سب سنتے ہیں اور/ سن کر گذر جاتے ہیں
جیسے میں کوئی آسیب ہوں ــــ میں تمہاری آنکھ کی پتلی میں رہتا تھا کبھی۔

کتابت اور طباعت اچھی ہیں۔

(اسلم عمادی)

نادیدگل شاعر: مختار شمیم ــ ۵۲ صفحات ' قیمت: پانچ روپے ۔ سنہ اشاعت ۱۹۸۸ء
ناشر- بھوپال بک ہاؤس ۔ بدھوارہ بھوپال۔

"نادیدگل" مختار شمیم کا پہلا مختصر مجموعۂ کلام ہے ۔ اس میں نظمیں اور غزلیں دونوں شامل ہیں ۔ یہ مجموعۂ کلام اختصار کے ساتھ شاعر کی فکری توانائی اور شعور فن کی نشاندہی کرتا ہے ۔ غزلوں اور نظموں کا مطالعہ مجھے اس نتیجہ پر پہونچاتا ہے کہ مختار شمیم بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور غزل میں جو خلش اور دل سوزی کا مطالبہ کرتی ہے وہ ان کے کلام میں بدرجۂ اتم موجود ہے ۔ شاعر فریب ذات اور فریب رنگ و بو سے بلند و برتر ہو کر حیات و کائنات کا مشاہدہ کراتا ہے ۔ اس کی نگاہ کو آفتاب و ماہتاب کی روشنیاں خیرہ نہیں کر سکتیں ۔ وہ تو خاک کے ذروں میں بھی تنویر بنایت تلاش کر لیتا ہے ۔

مجھے مسرت ہے کہ اس کساد بازاری علم و فن کے دور میں ایک متوازن اور باسلیقہ مجموعۂ کلام پڑھنے کو ملا ۔ یہ مجموعۂ کلام شعور فن اور دل و شوق کا مجموعہ ہے ۔ یقین ہے کہ ارباب بصیرت میں خاطر خواہ پذیرائی ہوگی ۔

(ڈاکٹر فضل امام)

ماہنامہ افکار (کراچی) "نذر اقبال نمبر" ــ ایڈیٹر صہبا لکھنوی۔   پتہ: ماہنامہ افکار ۔ رابسن روڈ ۔ کراچی (پاکستان)

پاکستان سے نکلنے والے جرائد میں "افکار" کا اپنا مقام ہے ۔ اس کے ایڈیٹر صہبا لکھنوی پچھلے ۴۲ سال سے اس کو پابندی سے شائع کر رہے ہیں ۔ زیر نظر شمارہ اقبال صدی تقاریب کے پیش نظر اقبال کے حضور نذرانۂ عقیدت ہے ۔ ادارۂ افکار نے اس کو دلچسپ اور یادگار بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا ۔ یہ شمارہ اگرچہ پاکستان سے نکلنے والے جرائد کی طرح ضخیم نہیں لیکن کم ضخامت میں بھی جامع اور مکمل ہے ۔ دو تین مضامین خاصے کی چیز ہیں ۔ شمارے کی ایک اہم خصوصیت گاندھی جی کے اس خط کا عکس ہے جو اردو رسم الخط میں چودھری محمد حسین کے نام ۹ رجون ۱۹۳۸ کو لکھا گیا تھا ۔ جس میں گاندھی جی نے مختصراً مگر فلسفیانہ انداز میں اقبال کو ہدیۂ عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کی مشہور نظم "ترانۂ ہندی" کا ذکر کیا ہے ۔ دوسری خصوصیت خواجہ حسن نظامی مرحوم کے مدون کردہ رسالے "پریم سنگم" کی شمولیت ہے ۔ خواجہ صاحب نے ۱۹۲۸ء میں اس کو شائع کیا تھا ۔ یہ رسالہ علامہ اقبال کے "پیام مشرق" میں "لالۂ طور" کے عنوان کے تحت مشمولہ قطعات پر مہاراجہ کشن پرشاد شاد کے لکھے ہوئے قطعات ہیں ۔ جن میں مہاراجہ نے اسی ردیف قافیہ کی پابندی کی ہے جو اقبال کے قطعات میں ہے ۔ اگرچہ ان کی وہ ادبی قدر و قیمت نہیں لیکن جیسا کہ خود مہاراجہ نے اعتراف کیا ہے یہ ایک طرح سے اس کی خدمت میں نذرانۂ عقیدت ہے ۔ اقبال کے طالب علموں کے لئے عموماً اور ہم حیدرآبادی محبت مندان اقبال کے لئے خصوصاً یہ ایک قیمتی تحفہ ہے ۔

[illegible] کا مضمون "بھوپال میں اقبال" کی شاعری کا پس منظر بہت اہم اور معلومات افزا ہے۔ جس میں علامہ کے معالجہ بھوپال میں کہی ہوئی نظموں کا پس منظر اور ان کی شانِ نزول بیان کی گئی ہے۔ ایسے ہی دو مختصر مضامین "ضربِ کلیم" [illegible] کے پس منظر پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جس کا مطالعہ اقبال کے طالب علموں کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے جس سے ان نظموں کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ دوسرے مضامین بھی اپنی کیفیت اور کمیت کے اعتبار سے کچھ کم اہمیت کے حامل نہیں۔ بالخصوص ڈاکٹر یوسف حسین خاں کا مضمون "حافظ اور اقبال" جو ان کی مشہور کتاب "حافظ اور اقبال" سے ماخوذ ہے۔ ڈاکٹر سید محمد یوسف نے بڑی محنت سے اپنے مقالے "[illegible]" میں اپنے ملک کے مخصوص حالات کے پس منظر میں اقبال کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اقبال کے ساتھ [illegible] اہل دل اور عوام [illegible] نے [illegible] میں کھینچنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن یہ کچھ ایسے معیاری نہیں۔ [illegible] ایک بڑا مشکل فن ہے اور بقول [illegible] یہ ایک [illegible] ہے جس کا یہ مضامین بھی کہیں کہیں شکار ہوئے ہیں۔

اس کے علاوہ اقبال کی مدحت میں منظوم خراجِ عقیدت بھی ہے، اور اقبال پر نظمیں بھی۔ خصوصاً [illegible] لئے ہوئے ہے۔ اقبال کی فارسی نظم "حیات جاوید" (پیامِ مشرق) کا منظوم ترجمہ [illegible] نے کیا ہے۔ [illegible] کا یہ [illegible] اقبالیات میں ایک اہم اضافہ ہے اور [illegible] صاحب اس کے لئے [illegible] مستحق ہیں۔ طباعت و کتابت [illegible] نہیں ہے [illegible] ہے۔ سرورق پر [illegible] کے ایک بند کی بنیاد پر [illegible] کا بنایا ہوا [illegible] ہے [illegible] صفحات کی قیمت ۱۱ روپے [illegible] زیادہ نہیں معلوم ہوتی۔
(مظفر [illegible])

اردو طباعت اور اشاعت کے مسائل (سمینار کی رپورٹ اور مقالے) مرتبہ: [illegible] کمال حسینی
۱۴۴ صفحات، قیمت ۷ روپے۔ نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، نئی دہلی۔

جناب [illegible] کمال حسینی نے مضمون زیر بحث کے ماہرین اور قلم کاروں کے مقالات اور مقالات سننے کے بعد ان پر مباحث کی رپورٹ بڑی محنت، جانفشانی اور ایمانداری سے مرتب کی ہے۔ یہ سمینار اردو والوں کے لئے وقت کی اہم ترین ضرورت تھی، وہ تکمیل پا گئی۔ سفارشات کافی غور و فکر کے بعد مرتب کی گئی ہیں۔ کسی سفارش پر کس جانب سے عملی قدم اٹھائے جائیں یہ بھی تعین کر دیا گیا ہے۔ اس طرح یہ کام تو بحسن و خوبی انجام پا گیا۔ اس سمینار میں سرگرم حصہ لینے والے [illegible] ارباب اثر اور اس سمینار کی رپورٹ جہاں جہاں پہنچی ہے ان اداروں اور تمام اردو والوں سے اب ہماری توقعات وابستہ ہیں کہ عملی میدان میں بھی کچھ کر دکھائیں، ورنہ سارا کیا دھرا "نشستن و گفتن و خوردن و برخاستن" پر ختم ہو جائیگا۔ (غلام ربانی)

[illegible] مصنف: [illegible] مترجم: [illegible] ۲۰۲ صفحات قیمت [illegible] روپے
ناشر: نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا [illegible] گرین پارک نئی دہلی ۱۶ ۔ تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی۔

[illegible] نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا [illegible] کوئی [illegible] ہے [illegible] ایک نظر ڈالے۔ جناب [illegible] کے ترجمہ میں یہ خوبی بدرجہ اتم موجود ہے۔ کتاب کی کتابت، طباعت [illegible] قابل ستائش ہے۔ [illegible] امید ہے [illegible] کتاب [illegible] میں مقبول ہوگی۔ ([illegible])

اُردو نامہ

اُردو کی علمی، ادبی اور تہذیبی خبریں

یکم مارچ مشہور مورخ پروفیسر ہارون خان شروانی کا علوم مشرقیہ اور تاریخ دکن سے گہری دلچسپی کے پیش نظر نشنل کونسل آف ہسٹری ریسرچ نے اعزازی فیلو نامزد کیا ہے اس اعزاز کے لئے پروفیسر شروانی کو مبارکباد دی جاتی ہے۔

۴ مارچ حلقۂ ارباب ذوق کا ماہانہ ادبی اجلاس جناب مرزا ظفر الحسن کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جناب اختر حسن مددگار معتمد ریاستی اردو اکیڈیمی نے جواں عمر صحافی، سخنور اور ادیب جناب محمود خاور کی نئی کتاب "اثر لکھنوی: حیات اور کارنامے" پر سیر حاصل تبصرہ سنایا۔ صدر جلسہ نے اس کتاب کو جاری کرنے کی رسم انجام دیتے ہوئے محمود خاور مدیر "برگ آوارہ" کی صحافتی اور علمی خدمات کا ستائش کی۔ اس ماہ کتاب میں ہندوستان اور پاکستان کی صحافت اور ادبی اقدار پر تبصرہ کیا جناب عبدالمحمود ڈائرکٹر تقاسم ٹرسٹ اردو لائبریری نے خیرمقدمی تقریر کی۔

● کل ہند مشاعرہ جبیں علی کا تیسرا سالانہ مشاعرہ جشن شرف الدین صاحب کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ [illegible] خصوصی [illegible] مہمان خصوصی [illegible] شاعر [illegible]

اور حیدرآباد کی ادبی، شعری نیز تہذیبی روایات کو بھرپور خراج عقیدت ادا کیا اور کہا کہ اردو ادب کے فروغ میں حیدرآباد کو ہندوستان گیر مقام اور مرتبہ حاصل ہے۔ نامور عثمانین ادیب جناب مرزا ظفر الحسن نے سادونیر کی رسم اجرا انجام دی۔ جناب عابد علی خاں صدر ادبی ٹرسٹ نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے اردو والوں کی طرف سے نامور عثمانین کے چیف منسٹری کے عہدہ پر انتخاب پر مبارکباد دی۔ اس مشاعرہ میں مسرز شرما بھوپالی، کاوش بدری، بیکل اتساہی، نذیر بنارسی اور ندرت نواز کے علاوہ امیر احمد خسرو، سعید شہیدی، اشاذ نکہت، اوج یعقوبی، کنول پرشاد کنول، علی احمد جلیلی، ڈاکٹر عنایت صدیقی، حضرات ندیم خواجہ شوق، صلاح الدین نیر، وقار خلیل، رحمن اختر، ڈاکٹر الحسن رضوی، ناصر کرنولی، فیض الحسن خیال، منوہر لال بہار، نایاب سلطانہ اور عزیز النساء صبا نے کلام سنایا۔

● ۵ مارچ ہفت روزہ ہمارے لوگ اور شالیمار پبلیشرز کے زیر اہتمام جشن عید جناب مرزا ظفر الحسن کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جناب کاوش بدری جناب شرما بھوپالی اور محمود خاور نے حضرت جگر کی شخصیت اور فکر و فن پر روشنی ڈالی۔ امیر خسرو اور عزیز نظامی نے منظوم خراج عقیدت ادا کیا۔ انور مسعود سب ایڈیٹر روزنامہ "نوید دکن" نے شکریہ ادا کیا۔

● ادارۂ شعر و حکمت کی طرف سے ادبی محفل میں مسز گیان سنگھ شاطر نے اپنی "خود نوشت" کے چند دلچسپ باب سنائے محترمہ خدیجہ عالم خوندمیر نے صدارت کی۔

۶ مارچ جناب اظہر کے نعتیہ مجموعہ "تجلیات ورسالت" کی رسم اجرا جناب الحاج عبدالقادر جیلانی سب ایڈیٹر روزنامہ رہنمائے دکن نے انجام دی۔

۸ مارچ ممتاز غزل گو سربلند سخنور حضرت خورشید احمد جامی کی آٹھویں برسی کے موقع پر ہفت روزہ "برگ آوارہ" کی طرف سے سالانہ فاتحہ اور قرآن خوانی کا اہتمام کیا گیا اور مزار جامی پر رشید النساء جامی نے چادر گل چڑھائی۔

● بزرگ مورخ و دانشور پروفیسر ہارون خان شروانی نے ڈاکٹر ایم چنا ریڈی کے چیف منسٹر منتخب ہونے پر مبارکباد کا پیام روانہ کرتے ہوئے اردو والوں کے ریاستی مسائل کے تشفی بخش حل کی توقع ظاہر کی۔

۱۰ مارچ آندھرا پردیش کانگریس آئی وزارت کے دو مسلم وزراء مسٹر ایم ہاشم وزیر [illegible] اور مسٹر احمد شریف [illegible]

نمائندگی مجموعوں میں اُردو میں رواداری کا حلف
لیا۔

۱۱؍ مارچ بزمِ انقلابِ ادب کا
طرحی مشاعرہ حکیم مرزا اکبر بیگ محمود محمد تمر
کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مسز رشید احمد رشید
محسن کمال، سردار چرن سنگھ، عارف بیابانی
علی سرور اور دیگر شعراء نے کلام سنایا۔

● مرکزی ساہتیہ اکیڈیمی کی طرف سے
اکیڈیمی ایوارڈ کی تقسیم کے سلسلے میں ایک خوش
گوار تقریب کی صدارت کرتے ہوئے اکیڈیمی کے
صدر مسٹر اوما شنکر جوشی نے شعر و ادب کے سلسلے
میں مصنفوں کے رول کی ستائش کی اور ریاستی
زبانوں میں تراجم کی اہمیت پر زور دیا اور
بتایا کہ ہندوستانی ادب کے ہندی اور انگریزی
تراجم کا ایک مرکزی پول قائم کیا جانا چاہیے۔ اس
جلسہ میں اُردو کی نمائندگی ماہر غالبیات جناب
مالک رام نے کی۔

۲۱؍ مارچ یومِ محمد قلی قطب شاہ کا
سولہواں سالانہ اجلاس بمقام گنبد محمد قلی
۵ بجے شام منعقد ہوا۔ اس کا افتتاح ریاستی
گورنر محترمہ شاردا مکرجی نے کیا اور جسٹس ایس
اوبل ریڈی چیف جسٹس آندھرا پردیش نے
صدارت کی۔ حیدرآباد کے نامور موسیقاروں
اور عزیز احمد خاں وارثی نے سازوں پر محمد قلی
اور دکن کے شعراء کا کلام سنایا۔ مسٹر عابد علی خاں
ایڈیٹر روزنامہ سیاست، مسٹر خواجہ حمید احمد
مسز رمن راج سکسینہ معتمد یومِ محمد قلی نے قطب
شاہی تہذیب اور ادب پر مخاطب کیا۔

● شب میں بمقام قلعہ گولکنڈہ عہدِ قطب
شاہی پر آواز اور روشنی کا دلچسپ پروگرام
گولکنڈہ سوسائٹی کی طرف سے پیش کیا گیا۔

● یومِ محمد قلی قطب شاہ کے افتتاحی
اجلاس سے قبل گنبد محمد قلی پر ادیبوں، شاعروں
اور صحافیوں کی طرف سے پاٹ لک کا اہتمام
کیا گیا تھا جس میں پچاس سے زائد اہلِ قلم
نے حصہ لیا۔ اس موقع پر ڈاکٹر راج بہادر
گوڑ نائب صدر مرکزی انجمن ترقی اُردو کی
صدارت میں ایک محفلِ مشاعرہ بھی منعقد
ہوئی۔ جناب رمن راج سکسینہ مہمانِ خصوصی
تھے۔ اس مشاعرہ کی نظامت ڈاکٹر ناظم
مرزائی نے کی۔ کلام سنانے والوں میں سعید
شہیدی، ڈاکٹر غیاث صدیقی، خیرات ندیم
شمس الدین تاباں، وقار خلیل، بھاندار
افسر، جمیل شیدائی، محمد منظور احمد، بھرت
سنگھ نیر، منوہر لال بہار، راجہ لال راجہ،
عزیز بھارتی، داؤد نصیب، ولادر حمیا
مسلم عبیدی، ذاکر محمود شاہی، رئیس اختر
معین بزمی، مراد خاں وکیل، سعادت جہاں
رضوی سحر اور ناظم مرزائی شامل تھے۔

● اقبال اکیڈیمی کا خصوصی اجلاس
جناب خلیل اللہ حسینی کی صدارت میں منعقد
ہوا۔ جناب مرزا اظفر الحسن نے پاکستان
میں اقبالیات کے موضوع پر مخاطب کیا۔
جناب منظور احمد ایڈیٹر سہ ماہی "اقبال
ریویو" نے مرزا صاحب کا تعارف کرایا اور
ان کی خدمات و تحقیق شناسی کا اور دکن سے

والہانہ عشق کو زبردست خراجِ
۱۳؍ مارچ یومِ محمد قلی قطب
اجلاس جناب نریندر لوتھر کی صدارت
منعقد ہوا۔ جناب مرزا اظفر الحسن
یادگارِ غالب کراچی اور ماہرِ غالبیات
مالک رام نے مہمانانِ خصوصی کی حیثیت
شرکت کی۔ مسز تقی علی مرزا، مسٹر
سراج الدین، ڈاکٹر غلام عمر
سیدہ جعفر، آمنہ انصاری
نے مقالے اور باقر رضوی
عبدالکریم ماہر، ڈاکٹر غیاث
وقار خلیل نے محمد قلی کو منظوم خراج
ادا کیا۔ جناب محمد منظور احمد نے
اجلاس کے فرائض انجام دیے
پر ادارۂ ادبیاتِ اُردو کی
ایک سیٹ جناب مرزا اظفر الحسن
یادگارِ غالب کراچی کی لائبریری
دیا گیا۔

۱۴؍ مارچ بزمِ سالک
میں مرحوم صدر جمہوریہ ہند جناب
احمد کو خراجِ عقیدت ادا کیا
اختر حسن مددگار معتمد
نے جلسہ کی صدارت کی۔
احمد شریف اور جناب
میں پُرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔
(تہذیبی سفیر) مہمانِ خصوصی
میں سعید شہید
تمکنت، اختر حسن، وقار خلیل

نیز علی اللہ بیل اور فاروق شکیل نے کلام

● یوم محمد قلی قطب شاہ کے سلسلے میں اجلاس ڈاکٹر دیسی رانا ناگی ماؤ سکریٹری تیہ اکیڈیمی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ری تلگو اور دکنی شاعری اور انکی کے میں زبانوں کی ترقی پر تلگو کے نامور اب قلم حضرات نے مخاطب کیا۔ فیسر یم، ایل نرسمہوا لو راؤ نے معتمد کے فرائض انجام دیئے۔

۲۱ر مارچ آندھرا پردیش اردو ڈمی کی طرف سے حیدرآباد کے ادیبوں تصانیف کو انعام کا مستحق قرار دیا گیا ان میں ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید، ڈاکٹر سف سرمست، شاذ تمکنت، عوض سعید اکرالہ امیر عارفی، مصحف اقبال توصیفی اور مظہر مجاز شامل ہیں۔ ان کے علاوہ ب اشاعتی ادارے شاہکار پبلیکیشنز بہتر ادبی کتابوں کی اشاعت پر انعام پا گیا۔ ادارۂ سب رس ان اصحاب دلی مبارکباد پیش کرتا ہے۔

۲۲ر مارچ بزم طالب رزاقی کی رف سے بہ یاد طالب محفل شعر منعقد ہوئی ناب عبدالکریم ناصر نے صدارت کی۔ مد بزم جناب سیف موقع کی مناسبت سے مرزا فرید ساجدی، سیف الملا، ... ضیا شکیل ... جمیل ... اور ... نے کلام آغا قلق نے کلام سنایا۔

● آرٹس کالج جامعہ عثمانیہ میں پروفیسر مسعود حسین خاں شیخ الجامعہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے "زبان اور زبان شعر" کے موضوع پر لکچر دیا۔ پروفیسر وی ایل شرما نے ڈین فیکلٹی آف آرٹس نے جلسہ کی صدارت کی۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ صدر شعبۂ اردو نے مسعود صاحب کا خیر مقدم کرتے ہوئے ان کی لسانی اور ادبی خدمات کو خراج تحسین ادا کیا۔

● نظام ٹرسٹ اردو لائبریری کی طرف سے ایک ادبی اجلاس میں پروفیسر مسعود حسین خاں صاحب نے "مسجد قرطبہ" مقالہ سنایا۔ پروفیسر رفیعہ سلطانہ نے صدارت کی۔ جناب عبدالمجید ڈائرکٹر نظامس اردو ٹرسٹ لائبریری نے شکریہ ادا کیا۔

۲۳ر مارچ بزم اردو محکمہ برقی آندھرا پردیش کی طرف سے جناب سید مصطفیٰ کمال ایڈیٹر "ماہنامہ شگوفہ" کی صدارت میں مزاحیہ مشاعرہ منعقد ہوا۔ مصطفیٰ علی بیگ، ہمایت، اگلی ملنڈوی، بوگس حیدرآبادی، گرز بیزار، سرپٹ، اسمٰعیل ظریف، رشید الٹکا، جمیل اور طالب خوندمیری صاحبان نے کلام سنایا۔ جناب میر کمال الدین علی خاں معتمد بزم اردو نے شکریہ ادا کیا۔

۲۴ر مارچ اساتذہ عثمانیہ

یونیورسٹی کی طرف سے چیف منسٹر ڈاکٹر چنا ریڈی کو ایک استقبالیہ دیا گیا۔ ڈاکٹر ریڈی نے جامعہ عثمانیہ کے کردار کو خراج ادا کرتے ہوئے کہا کہ "اسی جامعہ میں پہلا مرتبہ ایک ہندوستانی زبان اردو میں جامعاتی سطح پر ذریعہ تعلیم کا کامیاب تجربہ کیا گیا تھا جسے دور اندیشانہ اور دانشمندانہ اقدام قرار دیتے ہوئے موصوف نے بتایا کہ آج پھر ہندوستان میں علاقائی زبانوں میں اعلیٰ تعلیم کی طرف توجہ کی جا رہی ہے۔

● آندھرا پردیش اردو پریاڈیکلس اسوسی ایشن کی جانب سے چیف منسٹر ڈاکٹر ایم چنا ریڈی کا پُر تپاک خیر مقدم کیا گیا۔ اس خوشگوار تقریب کی صدارت صدر اسوسی ایشن جناب رحیم قریشی نے کی۔ جناب ملک محمد علی خاں اور مسز مہندر سر لیا ستو نے بھی مخاطب کیا۔ چیف منسٹر کو جو کہ وزیر اطلاعات بھی ہیں ایک محضر نامہ پیش کیا گیا۔ ڈاکٹر ریڈی نے جوابی تقریر میں کہا کہ چھوٹے اخبارات اپنا معیار اونچا کرنے کی طرف پوری توجہ دیں۔ محکمہ اطلاعات کی طرف سے برتی جانے والی بے اتفاقی کو دور کیا جائے گا۔

۲۹ر مارچ جناب حیات اللہ انصاری صدر نشین مرکزی مجلس ترقی اردو بورڈ نے پریس کانفرنس میں بتایا کہ ترقی اردو بورڈ نے پریس کانفرنس میں بتایا کہ

[illegible] تعلیم [illegible] اور
[illegible] کا سلسلہ جاری ہوا آغاز کرنے
والا ہے۔ موصوف نے بتایا کہ حیدرآباد
میں بورڈ کی طرف سے اردو انسائیکلوپیڈیا
کی چار جلدیں اشاعت کے مراحل طے کر رہی
ہیں۔

۲۰ مارچ حلقۂ ارباب دانش
دہلی کی طرف سے ہمدرد خطبات کا پہلا
ادبی اجلاس جناب حیات اللہ انصاری کی
صدارت میں ایوانِ غالب انسٹی ٹیوٹ کے آڈیٹوریم
میں منعقد ہوا۔ پروفیسر عالم خوندمیری نے
"دانشوری کی روایت سرسید سے اقبال
تک" کے زیرِ عنوان فکر انگیز مقالہ سنایا۔
ابتداً جناب ابوالفیض سحر سکریٹری حلقۂ
ارباب دانش دہلی نے ہمدرد خطبات کے
آغاز اور حکیم عبدالحمید صاحب ہمدرد
وقف بورڈ کو خراجِ تحسین ادا کیا اور
دانشوروں کا خیرمقدم کیا۔

(ع - ح)

خوشی اعلان

ادارہ مجلس مشاورت نے طے
کیا ہے کہ مارچ ۱۹۷۸ء سے سبکا
کا زرِ سالانہ طباعت اور کتابت کے میٹریل
کی مہنگائی کے پیشِ نظر پندرہ روپے
(Rs 15/-) کر دیا جائے۔ اُمید ہے
سب رسں کے باذوق خریدار اس اضافہ
کو قبول کریں گے۔ (ادارہ)

مولانا محمد علی کو مشاہیر کا خراجِ

★ مولانا محمد علی زبردست قوت عمل کے مالک تھے اور وہ اپنے مقاصد کو نہایت اہل ہند کے سامنے پیش کرتے تھے۔ ان کی ہمت اور جرأت کو دیکھتے ہوئے ہمارے "قابل" کا جذبہ موجود ہے (لارڈ ریڈنگ)

★ میں مولانا محمد علی سے تیس سال سے واقف تھا ان کی شخصیت شاندار اور اس میں شک نہیں کہ وہ اپنے ملک سے بہت محبت کرتے تھے اور ان کی صفات ایسے وہ تھے کہ ہندوستان کو ان کی ضرورت تھی (سر تیج بہادر سپرو)

★ مولانا محمد علی کا دل نپولین کا دل تھا۔ مولانا کی زبان برک کی زبان تھی اور میکالے کا قلم تھا (ایچ جی ویلز)

★ مولانا محمد علی میرے بہت اچھے دوست، پکے مسلمان اور ہندوستان کی زندہ شخصیت تھے (موتی لال نہرو)

★ مولانا شوکت علی نے مولانا محمد علی کی نسبت سچ کہا ہے کہ میرا بھائی سپاہی تھا اور سپاہی کے لئے اس سے بہتر اور کیا انجام ہو سکتا ہے کہ لڑتے ہوئے اپنی جان دی (حسرت موہانی)

★ مولانا محمد علی آزادیٔ ہند کے سب سے بڑے علمبرداروں میں سے تھے۔ اپنے ملک کی سیاسی نجات کے ساتھ خاص شغف تھا۔ ان کی نظر سیاسی اور فقہی معاملات میں اس بلندی پر پہنچ جاتی تھی جہاں ہر شخص کی رسائی محال ہے۔ (حسین احمد مدنی)

★ مولانا ایک بلند ارادہ اور ایک عدیم النظیر قائد تھے جو صفِ اول کے جنگ تھے۔ آپ کی سرگرمیاں صرف مادرِ وطن تک محدود نہ تھیں بلکہ اتحادِ اسلامی اور اتحادِ مشرق آپ کی زندگی کا خواب تھا۔ مولانا میرے ذاتی دوست تھے ان کی زندگی آنے والی نسلوں کے لئے ہمیشہ ایک قابلِ تقلید مثال ہوگی۔

★ مولانا محمد علی نے اپنی زندگی کے آخری لمحے تک [illegible] بھرپور جدوجہد اسلام کی۔ (سر آغا خاں)

سنِ اجراء : ۱۹۳۸ء فون : ۳۸۲۶۹۰

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد

نگران :
سید علی اکبر ایم اے (کنٹب)

معتمد مجلس مشاورت :
غلام جیلانی

مرتب :
وقار خلیل

جلد : ۴۱ شمارہ : ۵
مئی ۱۹۷۸ء

زرِ سالانہ : ۱۵ روپے
ششماہی : ۸ روپے
فی شمارہ : ایک روپیہ پچاس پیسے

مجلسِ مشاورت :
ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
ڈاکٹر غلام عمر خان
رمن راج سکسینہ
عابد علی خان
محمد منظور احمد

پرنٹر پبلشر : سید علی اکبر
مطبوعہ : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد
اشاعت : ادارۂ ادبیاتِ اردو پنجہ گٹہ حیدرآباد

ترتیب

ترقی و کامرانی کا مرکز

گزشتہ برسوں کے دوران میں اس ریاست کو تیز رفتاری کے ساتھ صنعتیانے کے لئے بھرپور زوردار مہم چلائی گئی ہے۔ اس کے نتیجے میں بندھیا چل کے جنوب میں واقع آندھرا پردیش ترقی و کامرانی کا مرکز بن گیا ہے۔ ریاستی صدر مقام حیدرآباد میں اور اس کے اطراف و اکناف میں مرکزی شعبے کے تحت بہت سے بڑے مقدار صنعتی اداروں کے قیام کے باعث ہندوستان کے صنعتی نقشے میں اس ریاست کی روز افزوں اہمیت میں مزید اضافہ ہوا ہے۔

اپنے ماضی پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ ۱۹۵۶ء میں ہمارے یہاں صرف ۲۵ بڑی اور اوسط صنعتیں تھیں جن میں مصروف سرمایہ کی کل مقدار ۴۳ کروڑ روپے تھی۔ اب صنعتی یونٹوں کی تعداد ۱۵۰ ہو گئی ہے اور ان میں مصروف سرمائے کی مقدار ۶۲۰ کروڑ روپے تک پہنچ گئی ہے چھوٹی صنعتوں کے شعبے میں نمایاں ترقی ہوئی ہے۔

سورج کی کرنوں سے روشن سرزمین دکن میں واقع ریاست آندھرا پردیش ایسے صنعت کاروں کو جو یہاں کے پسماندہ اور قبائلی علاقوں میں نئی نئی صنعتیں قائم کرنا چاہتے ہیں۔ وسیع اقسام کی ترغیبات کی پیشکش کرتی ہے۔ سال ۷۹-۱۹۷۸ء کے سالانہ منصوبے میں صنعتوں کے لئے ۱۱٫۵۴ کروڑ روپیوں کی متاثر کن گنجائش فراہم کی گئی ہے۔

ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ
آندھرا پردیش ۔ حیدرآباد

ADVT -821/78/②/SS 25-4-78

اپنی بات

یہ بات ڈھکی چھپی نہیں کہ لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں اصحاب اُردو زبان سے وابستگی اور محبت رکھتے ہیں اس کے باوجود ہم یہ محسوس کر رہے ہیں کہ اس کے وجود ہی کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ ایسی صورت حال کیوں درپیش ہے اس کی وضاحت میں اُلجھنا چنداں ضروری نہیں بلکہ ان حالات پر قابو پانے کی بھرپور کوشش کی ضرورت ہے۔ کسی زبان کی ترقی و بقاء کی کوشش کے پیچھے اگر ٹھوس کام نہ ہو تو صرف زبانی جمع خرچ پر بات ختم ہو جاتی ہے۔ حکومتوں کے تعاون سے ایسی تحریکوں کو تقویت مزید ملتی ہے لیکن صرف یہی تقویت کافی نہیں ہوتی۔ اس سے زیادہ ضرورت مالیاتی استحکام (FINANCIAL BACKING) کی ہوتی ہے۔ ہمیں مسرت ہے کہ انجمن ترقی اُردو (ہند) شاخ حیدرآباد نے اس خصوص میں ایک کارآمد اقدام کیا ہے۔ "اُردو کے ہمدردوں سے درخواست" کے زیر عنوان ایک اپیل کی گئی ہے تاکہ ایک اُردو کے تعلیمی فنڈ کا ٹرسٹ قائم ہو سکے اور اس ٹرسٹ کی جانب سے اُردو کے ماڈل اسکول چلائے جائیں اور اسی طرح ابتدا ہی سے اُردو میڈیم اسکولوں میں مستحکم بنیادوں پر تعلیم دی جا سکے تاکہ موجودہ بحرانی صورت حال پر پوری طرح قابو حاصل ہو سکے۔

چنانچہ انجمن ترقی اُردو کے پلیٹ فارم سے یہ آواز اُٹھائی گئی ہے کہ کرسچین مشنری اسکول کی طرح اب ایسے ماڈل اُردو اسکولوں کے قیام کی سخت ضرورت ہے جو تدریس کے اعلیٰ معیار کی بنا پر اُردو ذریعہ تعلیم کے اداروں کے وقار میں اضافہ کا سبب بنیں۔ اس غرض سے پندرہ لاکھ روپیے جمع کئے جا رہے ہیں تاکہ تعلیمی ٹرسٹ قائم کیا جائے۔ انجمن کی اپیل پر امریکہ، یورپ اور عرب ممالک میں مقیم ہندوستانی اور حیدرآبادی اصحاب کے عطایا ملنے شروع ہو گئے ہیں اور نئے تعلیمی سال سے حیدرآباد شہر میں ابتداءً چند اُردو ماڈل اسکول بھی قائم کئے جا رہے ہیں۔

اُردو تعلیمی فنڈ کی اپیل کرنے والوں میں حیدرآباد کے نامی گرامی اصحاب شامل ہیں جن کا اُردو زبان اور اس کے کلچر سے مستحکم رشتہ رہا ہے۔ ان میں پروفیسر حبیب الرحمٰن، جناب عابد علی خاں، نواب میر احمد علی خاں، ڈاکٹر راج بہادر اور ڈاکٹر سید عبدالمنان قابل ذکر ہیں۔ تعلیمی فنڈ کے لئے عطایا "سکریٹری انجمن ترقی اُردو، اُردو ہال حمایت نگر حیدرآباد۔ ۲۹" کے پتے پر روانہ کئے جا سکتے ہیں۔

جس سے ملے، جہاں سے ملے، جس قدر ملے ہمارا اصول ہے اور ہمیں یقین ہے کہ اپیل کے مقرر کردہ نشانے کو ہم بہت جلد عبور کر لیں گے۔

غلام جیلانی

ڈاکٹر سید حامد حسین

اقبال اور ٹینی سن

علامہ اقبال کے ابتدائی کلام میں اُن کی کئی ایسی نظمیں شامل ہیں جو یا تو براہ راست کسی مغربی نظم کا ترجمہ ہیں یا اُن پر کسی مغربی شاعری کی تخلیق کا اثر ہے۔ ایک ایسی ہی نظم "عشق اور موت" ہے جو کہ "بانگِ درا" کے حصۂ اول (سلسلہ نمبر ۲۷) میں شامل ہے یہ نظم پہلا سر شیخ عبد القادر کے رسالے "مخزن" کے نومبر ۱۹۰۲ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ اُس وقت اس میں کل ۲۹ اشعار تھے لیکن بعد میں "بانگِ درا" کی ترتیب کے دوران اقبال نے اس میں سے ۲۳ شعر منتخب کئے اور ۶ شعر خارج کر دیئے۔

"عشق اور موت" کو اقبال نے ٹینی سن سے ماخوذ بتایا ہے۔ الفرڈ ٹینی سن (ALFRED TENNYSON) اپنے وقت انگلستان کے انتہائی مقبول شعراء میں سے تھا۔ وہ ۱۸۰۹ء میں پیدا ہوا تھا۔ ۱۸۵۰ء میں اُسے ولیم ورڈز ورتھ کی وفات کے بعد انگلستان کا ملک الشعراء مقرر کیا گیا تھا۔ ۱۸۹۲ء میں اُس نے انتقال کیا۔ اپنے خیالات اور موضوعات کی بنا پر ٹینی سن کو وکٹورین عہد کا جائز نمائندہ کہا جاتا ہے۔ لیکن اس نے اپنا سب سے زیادہ اثر اپنی شعری حسن کاری کی بناء پر پیدا کیا۔ اس کی منظومات اپنے صوتی حسن اور موسیقیت کی وجہ سے خاص طور پر ممتاز ہیں۔

اقبال کی ابتدائی دور کی نظمیں یہ ظاہر کرتی ہیں کہ انھوں نے انگریزی زبان کے شعراء کا گہری دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کیا تھا اور بالخصوص انیسویں صدی کے رومانی رجحانات رکھنے والے شعراء سے اثر قبول کیا تھا وہ ٹینی سن کی فنکاری کے بھی معترف تھے چنانچہ جب "مخزن" اگست ۱۹۰۲ء میں "گائیتری" کا ترجمہ شائع ہوا تو اُس کے ساتھ اقبال کا ایک طویل تعارفی نوٹ بھی شامل تھا اور اُس "گائیتری" کے حوالے سے اور ترجمے کی دشواریوں کے بارے میں جو باتیں کہی گئی تھیں اُن میں یہ اظہارِ رائے بھی کیا گیا تھا۔

"ملک الشعراء ٹینی سن مرحوم .... [نے] ..... اپنے اشعار میں ایسے الفاظ استعمال کئے ہیں جن میں حروف علت اور صحیح کی قدرتی ترتیب سے ایک ایسی لطیف موسیقیت پیدا ہو جاتی ہے جس کا غیر زبان میں منتقل کرنا ناممکنات میں سے ہے۔"

لہٰذا جب تقریباً ایک سال بعد اقبال نے ٹینی سن کی نظم کو ترجمے کے لئے منتخب کیا تو اس کی دشواریاں پوری طرح اُن کے ذہن میں تھیں۔

ان کی نظم "عشق اور موت"، ٹینی سن کی اسی عنوان کی نظم (LOVE AND DEATH) پر مبنی ہے ٹینی سن کی نظم میں ۱۵ مصرعے ہیں جب کہ "بانگِ درا" میں شامل ترمیم شدہ نظم میں ۲۳ شعر ہیں ان میں سے ابتدائی دس شعر کر نظم کی فضا بندی کرتے ہیں اقبال کا اپنا اضافہ ہیں۔ ٹینی سن نے اپنے پہلے مصرعے میں پس منظر کے طور پر صرف یہ

کیا ہے۔

جس وقت معبود (مہتاب) اپنا نور حاصل کر رہا تھا

اقبال نے اپنی نظم کے پہلے دو شعروں میں اس کیفیت کا یوں اظہار کیا ہے۔

سہانی نمودِ جہاں کی گھڑی تھی — تبسم فشاں زندگی کی کلی تھی
کہیں مہر کو تاجِ زر مل رہا تھا — عطا چاند کو چاندنی ہو رہی تھی

اس کے بعد آفرینشِ کائنات کا منظر پیش کرتے ہوئے اقبال نے آٹھ شعر اور تحریر کئے ہیں جن کا ٹینی سن کی نظم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

سیہ پیرہن شام کو دے رہے تھے — ستاروں کو تعلیم تابندگی تھی
کہیں شاخِ ہستی کو لگتے تھے پتے — کہیں زندگی کی کلی پھوٹتی تھی
فرشتے سکھاتے تھے شبنم کو رونا — ہنسی گل کو پہلے پہل آ رہی تھی
عطا درد ہوتا تھا شاعر کے دل کو — خودی تشنہ کامِ مئے بیخودی تھی
اٹھی اول اول گھٹا کالی کالی — کوئی حور چوٹی کو کھولے کھڑی تھی

زمیں کو تھا دعویٰ کہ میں آسماں ہوں
مکاں کہہ رہا تھا کہ میں لامکاں ہوں

غرض اس قدر یہ نظارا تھا پیارا — کہ نظارگی ہو سراپا نظارہ
ملک آزماتے تھے پرواز اپنی — جبینوں سے نورِ ازل آشکارا

ٹینی سن نے اپنی نظم کے دوسرے مصرعے میں ہی عشق کو متعارف کرا دیا ہے اور اس سے موت کے مکالمے کو اس طرح پیش کیا ہے۔

عشق بہشت کی چمکدار روشوں پہ چہل قدمی کر رہا تھا
اور اپنے اردگرد اپنی تابندہ نگاہیں ڈال رہا تھا
جب وہ ایک تیز پات کے درخت کے گرد گھوم کر نکلا تو بالکل نظر آ گیا سامنے
موت ایک قبرستانی درخت کے پاس بالکل تنہا گھوم رہی تھی
اور اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھی
"یہاں سے دفع ہو" موت نے کہا "یہ گزرگاہیں میری ہیں"

اقبال نے عشق کا تعارف نظم کے گیارہویں شعر میں کرایا ہے اور اس سے موت کی گفتگو کو زیادہ تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔

فرشتہ تھا اک، عشق تھا نام جس کا — کہ تھی رہبری اس کی سب کا سہارا
فرشتہ کہ پتلا تھا بے تابیوں کا — ملک کا ملک اور پارے کا پارا
پئے سیرِ فردوس کو جا رہا تھا — قضا سے ملا راہ میں وہ قضارا

یہ پوچھا ترا نام کیا ہے، کام کیا ہے — نہیں آنکھ کو دید تیری گوارا
ہوا سن کے گویا قضا کا فرشتہ — اجل ہوں، مرا کام ہے آشکارا
اڑاتی ہوں میں رختِ ہستی کے پرزے — بجھاتی ہوں میں زندگی کا شرارا
مری آنکھ میں جادوئے نیستی ہے — پیامِ فنا ہے اسی کا اشارا
مگر ایک ہستی ہے دنیا میں ایسی — وہ آتش ہے میں سامنے اس کے پارا
شرر بن کے رہتی ہے انساں کے دل میں — وہ ہے نورِ مطلق کی آنکھوں کا تارا
ٹپکتی ہے آنکھوں سے بن بن کے آنسو — وہ آنسو کہ ہو جن کی تلخی گوارا

ٹینی سن کی نظم میں پہلے موت خطاب کرتی ہے اور اس کے لہجے میں ایک جارحیت ہے اور جیسا کہ بعد کے مصرعوں سے اندازہ ہوتا ہے عشق اس سے وقتی طور پر خوفزدہ ہو جاتا ہے۔ لیکن اقبال کی نظم میں عشق سوال کرنے میں پہل کرتا ہے اور موت، عشق کی طاقت کی معترف اور اس سے خائف معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ ٹینی سن کی نظم میں موت کا کلام حقارت آمیز اور مختصر ہے اور عشق کا جواب نسبۃً طویل ہے جب کہ اقبال کی نظم میں موت کی گفتگو طویل ہے اور عشق صرف تبسم سے جواب دیتا ہے۔ ٹینی سن کی نظم میں عشق کی بیچارگی اور اس کا جواب ملاحظہ فرمائیے۔

عشق رو پڑا اور پرواز کے لئے اس نے اپنے چمکدار بازو پھیلائے
لیکن رخصت ہونے سے قبل بولا۔ "یہ وقت تیرا ہے"۔
تو زندگی کا سایہ ہے جیسے کہ درخت
جب دھوپ میں کھڑا ہوتا ہے تو سایہ سارا اس کے تلے رہتا ہے۔
اسی طرح بسیط ابدیت کی روشنی میں
حیات معروف موت کا سایہ پیدا کرتی ہے
جب درخت گرتا ہے تو سایہ کہاں جاتا رہتا ہے
لیکن میں ہمیشہ ہمیشہ حکمراں کروں گا۔

ٹینی سن نے عشق کی ابدیت کے لئے فلسفیانہ جواز تلاش کیا ہے۔ لیکن اقبال کی نظم میں عشق کو اپنی برتری کے اظہار کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اس کا صرف ایک تبسم موت کی بلا انگیزیوں کا جواب ہے۔ اپنی نظم کے آخری تین شعروں میں دیکھئے

سنی عشق نے گفتگو جب قضا کی — ہنسی اس کے لب پر ہوئی آشکارا
گری اس تبسم کی بجلی اجل پر — اندھیرے کا ہو نور میں کیا گزارا

بقا کو جو دیکھا فنا ہو گئی وہ
قضا تھی، شکارِ قضا ہو گئی وہ

اس طرح ٹینی سن سے اقبال کی نظم میں عشق کے کردار میں ایک نمایاں فرق معلوم ہوتا ہے۔ [illegible] عشق [illegible]
کو اقبال [illegible]

ایک مثال اس بات کی ہے کہ انگریزی کے مشہور شاعر ٹینی سن کی [illegible] عشق کا [illegible]
[illegible] پیغام اعلیٰ ہے اور جس سے موت خود خائف ہے عشق کا یہ تصور اس موضوع پر اقبال کے کلام [illegible]
اقبال نے اس نظم کے لئے نسبتاً چھوٹی بحر کا انتخاب کیا ہے اور اس میں انھوں نے ان معانی اور [illegible]
کرنا چاہا ہے جو ٹینی سن کے ترجمے کا تقاضا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے مصرعوں میں جا بجا حرف اور لفظ تکرار سے کام لیا ہے مثلاً
مصرع "ستاروں کو تعلیم تابندگی تھی" میں حرف "ت" کی تکرار یا شعر

اٹھا اول اول گھٹا کالی کالی
کوئی حور چوٹی کو کھولے کھڑی تھی

میں حرف "ک" کی تکرار اور "اول اول" اور "کالی کالی" میں لفظ تکرار یا مصرع "فلک کا فلک اور پارے کا پارا"
میں "فلک" اور "پارے" کی تکرار۔

اقبال نے اردو کے شعری ادب کو جس موسیقیت اور آہنگ سے روشناس کیا ہے اور ایک مفکر شاعر کی حیثیت سے ان کی جو دین ہے اس پر بحث کرنے کے لئے اس مختصر مضمون میں گنجائش نہیں ہے لیکن اقبال نے اپنے شعری اسلوب میں صوتی حسن پر جو توجہ دی ہے اس میں ٹینی سن کے براہ راست یا بالواسطہ اثر کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ٹینی سن کی نظم "عشق اور موت" جس سے اقبال کی نظم ماخوذ ہے درج ذیل ہے

LOVE AND DEATH

WHAT TIME THE MIGHTY MOON WAS GATHERING LIGHT
LOVE PACED THE THYMY PLOTS OF PARADISE,
AND ALL ABOUT HIM ROLL'D HIS LUSTROUS EYES;
WHEN TURNING ROUND A CASSIA, FULL IN VIEW;
DEATH, WALKING ALL ALONE BENEATH A YEW,
AND TALKING TO HIMSELF, FIRST MET HIS SIGHT;
YOU MUST BEGONE, SAID DEATH, THESE WALKS ARE MINE.
LOVE WEPT AND SPREAD HIS SHEENY VANS FOR FLIGHT:
YET ERE HE PARTED SAID, THIS HOUR IS THINE,
THOU ART THE SHADOW OF LIFE, AND AS THE TREE
STANDS IN THE SUN AND SHADOWS ALL BENEATH,
SO IN THE LIGHT OF GREAT ETERNITY
LIFE EMINENT CREATES THE SHADOW OF DEATH;
THE SHADOW PASSETH WHEN THE TREE SHALL FALL,
BUT I SHALL REIGN FOR EVER OVER ALL.

فرزانہ علوی

سجاد حیدر یلدرم ۔ ایک رومانی انشاء پرداز

اردو ادب کی تاریخ میں رومانیت پسندی اور ادب لطیف کے عروج کے زمانے میں انشاپردازی کا رنگ جس قدر نمایاں ہو کر سامنے آیا، دوسری مثالیں کسی اور زمانے میں نہیں ملتی۔

یلدرم نے چونکہ ادب لطیف کے رجحان کو ایک مستقل تحریک کی حیثیت دی تھی اس لئے ان کی تحریروں میں انشائیہ کے عناصر بھرپور انداز میں پائے جاتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں خوش مذاقی اور دلکشی کے ساتھ ان دبے ہوئے جذبات کا بھی اظہار ملتا ہے جن کی راہ میں اس عہد کا سماجی مذہبی اور اخلاقی رکاوٹیں مسلسل ہی حائل رہیں۔ رومانیت، اختصار اور جامعیت کی خصوصیات کے علاوہ ان کا ہر لفظ جذبات اور محسوسات کا ترجمان ہے۔ یلدرم کے انشائیے ان کی ذہنی ترنگ، ان کے بے تکلف انداز بیان اور ان کے غیر رسمی طریقہ کار کے مظہر ایک ذہین، رنگین مزاج فن کار کے جذبات و احساسات کا پرتو دکھائی دیتے ہیں۔ غلام جیلانی یلدرم کی تحریروں کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"ایک بڑی بات یہ ہے کہ وہ صرف پُر معنی ہی نہیں بلکہ معنی خیز ہیں۔ صرف معنی خیز ہی نہیں بلکہ خیال انگیز ہیں، گویا یہ خیالات ہی نہیں بلکہ خیالات کے تخم بھی ہیں۔" (خیالستان ص ۳۱۷)

رومانیت کے خاص اجزائے ترکیبی جوش، آزادی اور شدت جذبات ہیں۔ رومانی ادیب کی جولانگاہ محبت اور عورت ہے۔ فطرت کا بیان رومانیت کا جزو لازم نہ سہی لیکن اہم جزو تو ضرور ہے۔ رومانوی ادیب کے ہاں محبت اور مناظر فطرت کا امتزاج زندگی کو عام سطح سے مختلف اور بلند کر دیتا ہے اور انسان کو وقتی طور پر معلوم و موجود مصائب و آلام سے بے نیاز کر کے ایک پُر فضا اور خواب کی دنیا میں پہنچا دیتا ہے۔

سجاد حیدر مزاجاً رومان پسند ہیں اس لئے انھوں نے اپنے دور کی عقلیت پرستی کے مقابلے میں جذبات اور تخیل کو اہمیت دی لیکن انھوں نے رومان پسندی کے شوق میں زندگی کے حقائق سے یکسر منہ نہیں موڑا۔ وہ جذبہ کی قدر کرتے ہیں لیکن سستی جذباتیت کا ان کے ہاں گذر نہیں۔

یلدرم کی تحریروں میں جس طرح عورت، جنس اور حسن و عشق کا ذکر آیا ہے اس سے پہلے اردو میں شاذ و نادر ہی تھا وہ ان کا ذکر بڑی بے باکی سے کرتے ہیں اور عورت کو ایسا پیکر تصور کرتے ہیں جو شعریت اور لطافت کا مظہر ہے۔ ان کے یہاں عورت نذیر احمد کی اصغری، اکبری کی طرح بے رنگ اور سپاٹ نہیں بلکہ ان کے ہاں عورت کا مثالی تصور یہ ہے:

"وہ عمرِ نو کی ...ہے جو معاشرے کا حسیات کے لئے مرہم رنگ و ... ہے"

[illegible]

بیزاری نے "غربت وطن"، "سیل زمانہ" میں اُبھرتا ہے۔ "مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ" کا بنیادی خیال ایک انگریز عالم کے قول سے ماخوذ ہے اسی میں یلدرم نے مجلسی زندگی سے بیزاری کا اظہار کیا ہے لکھتے ہیں:

"یہ سب میرے عنایت فرما اور خیر طلب ہیں، مگر طبیعت کو کیا کروں صاف صاف کہتا ہوں کہ ان میں سے ہر ایک سے کہہ سکتا ہوں۔ مجھ پر احسان وہ جو نہ کرتے تو احسان ہوتا۔" (خیالستان ص۲۹۱)

یلدرم ہنگاموں سے دور سکون اور سکوت کی فضا کے آرزومند ہیں وہ بزم آرائی سے نفرت کرتے ہیں اور خلوت و تنہائی کو پسند کرتے ہیں۔ انھیں کوئی محرم اور مخاطب صحیح نہیں ملتا اور یہ بیزاری انکا شیوہ ہے گو انھیں کوئی عنایت و دہنی فطرت نہیں آتی بیزاری کا یہ رویہ رومانیت ہی کی ایک شکل ہے۔

"سیل زمانہ" حقیقتاً زندگی سے بیزاری کا مظہر ہے اور اپنے آپ کو زندگی کے رحم و کرم پر چھوڑ دینے کے سپر ڈال دینے کی ایک انفعالی کیفیت ہے۔

"اے سیل زمانہ! بہے جا، بہائے لئے جا اور اس بحر ناپیدا کنار میں ۔۔۔۔۔ اس اوقیانوس ابد میں اب یا جب تیرا دل چاہے گرا دے۔" (خیالستان ص۲۱۳)

زندگی سے بیزاری اور فرار کے بعد محبوب کا قرب ان کی سب سے بڑی پناہ گاہ ہے۔ خیالستان کے افسانوں میں اس کا بار بار اظہار ہوا ہے۔ یلدرم محبت کے روایتی روپ کے بجائے زندہ اور شاداب عشق کے قائل ہیں۔ یلدرم نے عورت کو نسائیت، بشریت اور لطافت کا ایک مجسمہ بنا کر پیش کیا ہے اور عشق کو حاصل زندگی اور خوش مذاقی کا آئینہ قرار دیا ہے۔ وہ عورت کو سنگھاسن پر ضرور بٹھاتے ہیں لیکن اس کی پوجا نہیں کرتے۔ ان کے افسانے زلفوں کی مہک اور آغوش کی حرارت میں پر برکت ہوتے ہیں۔"

(اردو ادب میں رومانوی تحریک محمد حسن ص۴۹)

یلدرم کی فکر کا بنیادی آہنگ ماورائی ہے۔ ان کا تخیل ارضی نہیں ہے وہ جب بھی تصویر کھینچتے ہیں ہماری آبادیوں سے دور چلے جاتے ہیں ان کی آرزوئیں عہد وسطیٰ کے محل سراؤں میں اسیر شہزادیوں کی طرح ہیں، جن کی سانسوں میں خوشبو بسی ہیں۔ اور جن کا ماحول سوائے نور و رنگ کے کسی مادہ پرستی سے آشنا نہیں۔

یلدرم نے تراشوں اور مرکبات کو وضع کرنے میں عربی اور فارسی سے استفادہ کیا مرکبات بنانے کا یہ شعور انھیں ترکی زبان سے ملا کیونکہ ایک امتزاجی زبان ہے اور جس میں آسانی کے ساتھ مرکبات ڈھالے جا سکتے ہیں۔ یلدرم کی نگارشات میں مرکبات کے ایک امتزاجی پہلو کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ جو ان کی بے تکان قلم آفرینی کا نتیجہ ہے۔ یلدرم نے جو نئے لفظ اور تراکیب وضع کی ہیں ان سے یلدرم کے اسلوب کی انفرادیت اور ندرت نکھر کر سامنے آتی ہے، اس کی مثالیں یہ دیکھئے:

جلوۂ حیات۔ گرد بادِ حیات۔ نیم خندہ سحر۔ ہوا کا پاک سرسراہٹ۔ گلہائے رقص و آہنگ وغیرہ

یلدرم کا انقلاب الفاظ اور امتزاجی تراکیب ہمارے ادب میں یگانہ اور منفرد حیثیت رکھتے ہیں اس سے نہ صرف ہمارے اپنے عہد کے تہذیبی ادب میں ایک چونکا دینے والا انداز کیا، بلکہ بعض دوسرے لکھنے والوں کے طرز نگارش پر بھی گہرا اثر ڈالا۔ [illegible] [illegible] ابوالکلام آزاد کی طرح کے جوش اور حسین الفاظ، [illegible] آغوش تراکیب سے [illegible] [illegible] کرتے ہیں۔ اور [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] کرتا رہا۔

علوم استفہام یلدرم کے اسلوب نگارش کا دو درجہ [illegible] ہیں:
یلدرم نے انشائیہ طرز نگارش کو ایک مخصوص اور انفرادی انداز بیان کی بنیاد ڈالی جس میں ظرافت کو بڑا دخل ہے۔ [illegible] بہت کچھ اس کی خوش گوار چاشنی؛ انداز اور بیان دونوں میں بو قلمونی کے ساتھ سحر انگیز ہے۔ اردو زبان میں طنز و ظرافت کا ایک بہت نگار خانہ پہلے سے موجود تھا لیکن یلدرم نے اپنا اسلوب لطیف کا ایک نیا عالم اور سبک انداز بخشا جس سے بہت سے بعد کے لکھنے والوں نے حسب صلاحیت فیض حاصل کیا" (یلدرم [illegible] ص ۶۳)

یلدرم کا اسلوب نگارش بلا شبہ اس سیماب صفت طبیعت، اس کی حسن پرست نظر، اس کے پر جوش اور گرم دل اور اس کے سلیقہ انتخاب کی کچھ ایسی کیفیات سے مرکب اور انھیں کا عکاس ہے۔

یلدرم کے اسلوب نگارش کے ذیل میں اور مثال میں "خیالستان" کے بعض خیال افروز اور بلیغ جملوں اور تراشوں کو پیش کر دینا بے محل نہ ہوگا۔

"زندگی میں شعر ..... ایک نغمۂ ماتم موسیقی ..... ایک فغان یاس، پھول .... ایک منجمد قطرۂ گریہ، روشنی ..... ایک امید گریزاں کے علاوہ اور کچھ نہیں ..... " (خیالستان ص ۱۳۰)

"اور اچھا ہے جو بچے کہہ دیا کہ [illegible] کھینچتی ہیں؛ پروانوں سے پوچھئے کہ شمع پہ آ کر کیوں گرتے ہیں؟ سورج مکھی سے کہ پرستندۂ آفتاب ہے۔ سوال کیجئے کہ اس نے آفتاب کو کیوں قبلہ بنا رکھا ہے .....؟" (خیالستان ص ۲۱)

آخر میں یلدرم کے اسلوب کے بارے میں [illegible] کا مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ ہو۔

"شائستہ خوش ذوقی اور پر تکلف طرز معاشرت، شستہ مذاق، رعنائی خیال، نزاکت جذبات اور رومانی حسن کے اظہار کے لئے سجاد حیدر نے ایک نئی زبان کا تار و پود جمع کیا اور اسے پروان چڑھایا اور اردو نثر کو ایسی سحر تاثیری عطا کی جو ابھی تک محض شعر و شاعری سے منسوب کی جاتی تھی۔ انھوں نے زبان کو ایک نیا ترنم، آہنگ اور وزن بخشا جس نے بہت سے طرز ابہام و جملوں کو بدلا اور ان بے کیفی اور بھدا پن کو دور کیا جو نثر میں چھا چکی تھی۔ (یلدرم تذکرہ ص ۱۰)

ان اقتباسات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یلدرم کسی تخلیقی اپج اور انشا پردازانہ صلاحیتوں کے مالک تھے۔ انھوں نے اپنا ترجمہ کردہ [illegible] سے آزاد کرنے کے علاوہ اردو ادب کو ایک کھلی فضا میں سانس لینا سکھایا اور اپنے رومانی تصورات سے اردو ادب کی تاریخ میں ایک ایسا تنوع پیدا کیا جو اس سے پہلے کم از کم اردو نثر میں ناپید تھا۔ ••

"ابتدائے عمر یعنی عنفوان شباب میں مجھے ادبی رسائل کے مطالعہ کا بڑا اشتیاق تھا اور ان سب میں مجھے مخزن سے زیادہ دلچسپی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سجاد حیدر یلدرم ترکی انشاء عالیہ کے تراجم پیش کر رہے تھے اور اس کا ایسا [illegible] جب ان کا "خارستان و گلستان" و "شیراز" شائع ہوا تو [illegible] متعدد مقامات میں اس رنگ کے عکاس "ایک شاعر کا انجام" "پارسی [illegible]" "مقابلہ" "عبرت" اسی تاثر کا نتیجہ ہے۔"

نیاز فتح پوری

سید ابراہیم علی اختر

جامعہ عثمانیہ

جون ۱۹۳۸ء میں جب میں نے جامعہ میں داخلہ لیا تو تعلیم اڈیکمیٹ کی عارضی عمارتوں میں ہوتی تھی۔ اور شہر کے منتشر مکانات سے یونیورسٹی اڈیکمیٹ کے پُرفضا ماحول میں منتقل ہو چکی تھی۔ مستقل عمارتوں میں اقامت خانہ الف اور ب اور طعام خانے بن چکے تھے۔ اور آرٹس کالج کی عمارت زیر تعمیر تھی۔ سائنس کالج لائبریری اور بقیہ عمارتیں صرف ہال روم میں دیکھی جا سکتی تھیں۔ ہاسٹل سے کالج جانے کے راستے میں آرٹس کالج کی عمارت کے سامنے تنگ پٹریوں کی ریلوے لائین پڑی ہوئی تھی اور اس کے اطراف جنگلوں میں مزدور سنگ خارا کو تراشنے میں مصروف رہتے اور ان کے ہتھوڑوں کی آوازیں ابھرتی رہتیں۔ انہیں مزدوروں کے بارے میں وجد نے کہا تھا —

نظم کہسار کیا درہم و برہم ہم نے
کر دیا قوم کا اک خواب مجسم ہم نے

سال اول میں داخلہ کے لئے پرو وائس چانسلر اور پرنسپل وغیرہ ایک مختصر سا انٹرویو لیتے۔ یہ انٹرویو اسی کمرے میں لیا جاتا جو عارضی آرٹس کالج کی دوسری منزل پر واقع تھا اور اس وقت سارے کالجوں میں واحد دوسری منزل کا کمرہ تھا اور بالاخانہ جامعہ کہلاتا تھا۔ داخلے جون میں مکمل ہو جاتے اور تعلیم ۱۵ر جون سے شروع ہو جاتی۔ جامعہ میں نیوی بلو رنگ کی شیروانی یونیفارم تھی۔ اور جامعہ کے مونوگرام کی تکمیاں اس کے ساتھ استعمال ہوتیں — اس زمانے میں جامعہ کے چانسلر یا امیر جامعہ وزیراعظم ہوتے تھے۔ سر اکبر حیدری جو جامعہ کے معمار کہے جا سکتے ہیں جلسہ تقسیم اسناد میں اپنے آپ کو امیر جامعہ کہتے۔ اصلاً ان کے جانشین نواب صاحب چھتاری اس قدر بارعب شخصیت رکھتے تھے کہ اب وہی یاد رہ گئی ہیں۔ ان کے الفاظ میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ معین امیر جامعہ نواب مہدی یار جنگ وزیر تعلیمات تھے اور برسوں وائس چانسلر رہے۔ یہ بڑے خوش مذاق آدمی تھے اور نہایت دھیمی آواز میں تقریر کرتے لیکن طلبہ سے براہ راست مخاطب ہونے کے ارادے سے [illegible] تقریر کرتے [illegible] وائس چانسلر کو ان کی تقریر [illegible] دی۔ وہ ان تقریروں میں کبھی کبھی [illegible] تقریر سن کر سمجھ کر اطلاع ہوتا کہ کوئی مزیدار بات کہی گئی ہے۔

پھر [illegible] حسین صاحب پرو وائس چانسلر یا نائب معین امیر جامعہ رہے اور اسی زمانے میں جامعہ کے نظم و نسق کے ذمہ دار تھے — قاضی صاحب بڑے [illegible] آدمی تھے۔ جامعہ عثمانیہ کے بارے میں [illegible] "علم [illegible]" [illegible] قاضی صاحب اپنی [illegible] ایک بات [illegible] اور آخر میں [illegible] بات [illegible] زبان اور [illegible] [illegible] دنیا [illegible] کیا [illegible]۔

[illegible] اور [illegible] تھے۔ [illegible] پرو وائس [illegible]

کی باوجود شخصیت بیحد نرم اور مہربان دل چھپائے ہوئے تھی ۔ جو وقت پڑنے پر لڑکوں کی مدد کرنے سے کبھی پیچھے نہ ہٹتی ۔ پروفیسر حسین ابقان اپنی قابلیت کی وجہ سے مشہور تھے ۔ جغرافیہ کے شعبہ پر حبیب احمد انصاری صاحب، الیاس برنی صاحب اور ڈاکٹر سید حسین صاحب رہے ۔ اور ڈاکٹر عزیز قاضی کے جو اس زمانے کے بہترین مقرروں میں شمار کئے جاتے تھے، اس زمانے میں یونیورسٹی قاضی محمد حسین کے خلوص حسین علی خاں کے اور سید حسین کی محنت کے سہارے چلتی تھی ۔ جامعہ کے نظم و نسق کے ذمہ دار اصحاب کے سلسلہ میں جناب رشید الدین شمیم کا تذکرہ ضروری ہے جو صاحب کے پی اے رہے ۔ مختصر، کم رو اور چہرے مہرے پر لیکن بلا کے ذہین، اچھے مقرر اور شاعر ۔ ان کی ایک نظم کے دو شعر مجھے یاد ہیں جو مجھ سے شخص نے اپنی گرجدار اور کشش آواز میں تحت اللفظ سنائے تھے ۔

تمنا یہ نہیں ہے کام کچھ نایاب ہو مجھ سے ، دعا یہ ہے شگفتہ خاطر احباب ہو مجھ سے
پھروں بن چشمہ ساں دنیا میں سرگشتہ و آوارہ کوئی سوکھی ہوئی کھیتی کبھی شاداب ہو مجھ سے

نظم و نسق سے متعلق اصحاب کے بعد میں چند مشہور اساتذہ کا ذکر کروں گا ۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جن کا میں ذکر نہ کر سکوں وہ مشہور یا دلچسپ نہیں تھے ۔ میرے اپنے مضمون حیوانیات کے پروفیسر ڈاکٹر بی ۔ کے ۔ داس بڑے قابل آدمی تھے ۔ انہیں کی وجہ سے شعبۂ حیوانیات کا میوزیم ہندوستان کی جامعات کے بہترین میوزیمس میں شمار ہوتا ۔ ان کے متعلق یہ قصہ مشہور تھا کہ جب ابتدا میں آئے تھے تو اردو سیکھنی پڑی ۔ اور پڑھانے کی ابتدا میں جب کلاس میں آئے تو "کام" کی اہمیت پر تقریر کی لیکن تختۂ سیاہ پر چاک سے بار بار "کال" لکھتے اور اسے کام پڑھتے ۔ غرض داس صاحب کے پاس علم حیوانیات کی کمی تو نہ تھی لیکن اردو کا "کال" تھا ۔ موجودہ صدر شعبہ ڈاکٹر ستیہ نارائن سنگھ اس زمانے میں لکچرر تھے، مگر وہیں بہت ہر دلعزیز ۔ نباتیات کے صدر شعبہ پروفیسر سعید الدین صاحب خاموش اور پر خلوص آدمی تھے ۔ نباتیات کے ریڈر عبد الباری صاحب بہت اچھے استاد تھے لیکن اپنی مذہبی جبلت یعنی گھٹے ہوئے سر اور لمبی ڈاڑھی کی وجہ شعبۂ دینیات کے استاد نظر آتے ۔ لیکن طلبا ان کے گھنٹے میں ادب سے رہنے پر مجبور تھے وہ اب دلچسپ معلوم ہوتی ہے ۔ دیر سے آنے والے طلبا کو باری صاحب ہمیشہ "از صبح تا نصف النہار" کہہ کر مخاطب کرتے ۔ ہمارے کالج چھوڑنے کے کچھ سال بعد انہوں نے بند کمروں میں چارکول کے ساور کے استعمال سے کاربن مانو آکسائیڈ گیس کے زہر سے موت سے طلبا کو آگاہ کیا ۔ اور اس کے فوری بعد خود بھی اسی طرح بے احتیاطی کر کے انتقال کر گئے ۔ خدا ان کی مغفرت کرے ۔ نباتیات کے موجودہ صدر شعبہ اس زمانے میں لکچرر تھے مگر ان کی قابلیت کا چرچا اس زمانے میں شروع ہو چکا تھا ۔

طبیعیات کے پروفیسر وحید الدین صاحب تھے اور جامعہ کی ابتدا ہی سے اقامت خانوں کے مودب رہے ۔ ہاسٹل کے لڑکے انھیں ابھی بعض اپنی شرارتوں کی زد میں لے آتے تھے لیکن ہمارے زمانے میں یہ سینئر مودب تھے اور ہم لوگ صرف ان کے لطیفوں کو دہرا لیا کرتے ۔ ان کی اردو کی چند مثالیں یاد رہ گئی ہیں وہ دیتا ہوں ۔ کالج کے corridor کو گلی کوچے، کمرہ بیٹھک کو کمرۂ عرض، روپیہ اور جیبوں کو چاولوں کے لفافے وغیرہ وغیرہ ۔ میرے دوران طالب علمی میں یہ وظیفہ پر علاوہ ہوئے اور اپنی تقریر میں ایک دلچسپ بات کہی تھی ۔ جو مجھے یاد رہ گئی ۔ انہوں نے کہا تھا کہ "جامعہ کی ابتدا سے ہر جلسے کے انتظامات کی دیکھ بھال کرتا رہا ہوں اور شاید یہ پہلی دعوت ہے جس کے انتظامات میں نے نہیں کئے ہیں لیکن مجھے بتا ہوتا ہے کہ ابھی تو رخصت ہونے سے پہلے ان انتظامات کو مکمل کرنے کی ہدایت دے کر گیا ہوں ۔" طبیعیات کے دوسرے اساتذہ میں ڈاکٹر سید احمد قادری صاحب اپنی خوش مزاجی اور طلبا سے اپنی دلچسپی کی وجہ سے بڑے ہر دلعزیز تھے ۔ شعبۂ کیمیا کے صدر ڈاکٹر مظفر الدین قریشی تھے جو سخت گیر آدمی تھے ۔ مجھے شخصی طور پر خلیل الرحمٰن صاحب نے متاثر کیا ۔

دوسرے مضامین کے اساتذہ میں سب سے زیادہ دلچسپ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب تھے جو فلسفہ کے صدر شعبہ تھے۔ اور ان کو کسی شعبے کا [illegible] مشابہت نہ تھی۔ ان کی علمیت، قوتِ تقریر، حاضر جوابی، ظرافت، شاعری اور خوش مزاج شخصیت بڑی متاثر کن تھی۔ یہ یونیورسٹی کی ان شخصیتوں میں سے ایک ہوتے جہاں ڈاکٹر یوسف حسین خاں اور صلاح الدین، تمیم وغیرہ کی موجودگی سے غیر معمولی دلچسپی پیدا ہو جاتی۔ ان کی شخصیت کے دو پہلوؤں کے چند نمونے ظاہر ہوں گے۔ ظرافت کا نمونہ یہ ہے۔

ملکِ فرنگ عجیب ہے بستی
گرمی، مہنگی، لڑکی سستی

اور سنجیدگی کا نمونہ ان کی ایک لمبی نظم "اک حسرت دل میں رہتی ہے جس حسرت کا کچھ نام نہیں" سے لیا گیا ہے

گو لاکھ انساں کو دنیا میں راحت، عیش و آرام ملے
یا ہستی کے میخانہ سے تلخابۂ غم کا جام ملے

بے لطف مشقت میں گذرے یا شانِ بہت ہی کام ملے
گمنامی میں آسودہ ہو یا شہرت یا کہ نام ملے

جس وقت طبیعت بیداری کر لی ہو خیال خام نہیں
محسوس یہ ہوتا ہے کہ ہر تک ہے یہ میری ہا ہے یا نہیں

ایک حسرت دل میں رہتی ہے جس حسرت کا کچھ نام نہیں۔

دوسرے اساتذہ جو طالب علموں میں اپنی علمیت اور صلاحیت کی وجہ سے ہر دلعزیز تھے میں اب محض ان کا ذکر کر دینے پر اکتفا کروں گا تاکہ اسٹوڈنٹس یونین ہاسٹل کی زندگی، اور دوسرے پہلوؤں کا بھی مختصراً ذکر کر سکوں۔

فلسفہ کے اساتذہ میں ڈاکٹر میر ولی الدین، پروفیسر صلاح الدین، پروفیسر رشید موہن لال خلیفہ صاحب سے بالکل مختلف مگر اپنی انفرادی شخصیتیں رکھتے تھے۔ تاریخ کے پروفیسر ہارون خاں شروانی، پروفیسر عبدالمجید صدیقی، پروفیسر جمیل الرحمٰن، ڈاکٹر ثریا، اور ڈاکٹر یوسف حسین خاں، اردو کے ڈاکٹر زور (؟)، ڈاکٹر سجاد اور سروری صاحب، انگریزی کے پروفیسر ویرابھدرا راؤ، پروفیسر دورا سوامی، پروفیسر کرشنن اور عزیز احمد (جو شاید انگریزی سے زیادہ "مرمر اور خون" کی وجہ سے مشہور ہیں)۔ معاشیات کے ڈاکٹر انور اقبال قریشی، اختر حسین، لطیف رضوی، اور امتیاز حسین صاحبان، ریاضی کے ڈاکٹر رضی الدین اور پروفیسر کشن چند، قانون کے ڈاکٹر حمید اللہ اور پروفیسر حسین علی مرزا، انجینئرنگ کے حسن لطیف، گیڈگل رنجو اور انصاری صاحبان، کیمیا اور طبیعیات کے پروفیسر ستیہ نارائن مدوڑا، یونس وفاقانی، ایل سیتارام راؤ، اور ڈاکٹر نذیر احمد طاہر، دینیات کے مولانا مناظر احسن گیلانی، سید نجیب اور عثمان شریف صاحبان، فارسی کے ڈاکٹر انعام الدین، کلیم اللہ قادری اور لطیف احمد فاروقی صاحبان کا ذکر کئے بغیر اس دور کی جامعہ کا تصور نامکمل رہے گا۔ لیکن مضمون کے اختصار کے پیشِ نظر ان میں سے ہر ایک کے بارے میں لکھنا ممکن نہیں ہے۔

اساتذہ کے ذکر کے بعد ہی اسٹوڈنٹس یونین کے صدر محمد رت عمر، عباس علی خاں، عمر مہاجر، عبدالحئی خاں، عاقل علی خاں کا ذکر کروں گا۔ متقدمین میں احمد علی خاں اور احمد خاں مجھے یاد رہ گئے ہیں۔ کچھ عرصہ کے لئے یونین کو بند کر دیا گیا تھا۔ اس زمانے میں یونین نے جن باہر کے مقررین کو بلایا تھا ان میں بہادر یار جنگ، محمد علی جناح اور نفیس خاں نون قابلِ ذکر ہیں۔ یونین کے جلسے اور الیکشن کے ہنگامے بھلائے نہیں جا سکتے۔ [illegible] نظم حکومت تاریخ قدیمہ میں اپنے پوائنٹ آف آرڈر کے لئے مشہور تھے۔ اس لئے کہ یہ اپنے ایک دوست کو پوائنٹ آرڈر کے لئے شعبہ کر کھڑا کر دیتے اور جب یونین کا صدر ان سے مخاطب ہوتا تو یہ اپنے دوست کو یہ نہیں بتاتے تھے کہ پوائنٹ آف کس لئے اٹھایا گیا ہے۔ وہ اسے خفیف ہو کر بیٹھ جانا پڑتا اور یہ تماشہ اسی دوست کے ساتھ بار بار ہوتا۔ عاقل کے الیکشن کے بعد ایک دلچسپ نغمہ لکھا گیا تھا جس میں کئی مشہور طلباء کا ایک ایک شعر میں [illegible] سیتے پور صدر پر شعر کہنے والے کے nickname یا اس کی اپنی ذاتی شخصیت کا عکس ہوتا۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

[illegible] ہے	[illegible] ہے	([illegible])
[illegible] ہے	[illegible] ہے	([illegible])
[illegible] ہے	[illegible] ہے	(جمال)
ایمان [illegible] کہیں ہے	دیدہ [illegible] کہیں ہے	(غیاث)

کالج کے [illegible] ہوسٹل کی زندگی کا تذکرہ کرنا جو میری رائے میں نوجوان طلباء کی کردار سازی میں کالج سے زیادہ موثر ہوتی ہے۔ مخدوم اور [illegible] کو کالج چھوڑے کئی سال ہوچکے تھے لیکن ہمارے زمانے میں بھی ان دونوں کی ادبی اور غیر ادبی شرارتوں کا ذکر رہتا ۔ مخدوم کی نظم [illegible] بہت مشہور تھی ۔ ہمارے زمانے میں بھی بہت سی شریر نظمیں بڑے اونچے معیار کی ہوئیں لیکن شاعروں کے مشہور نہ ہونے کی وجہ سے ان کی شہرت نہ ہوسکی ۔

سال اول کے طالب علم کے لئے دو چیزیں اہم ہوتی تھیں ۔ ایک ٹریڈیشن اور دوسرا (ACTIVITY) ۔ ٹریڈیشن نئے لڑکوں کے تعارف کی رسم تھی سال کے شروع میں کسی رات سارے سینئرز کرنے لڑکوں کے کمروں پر جاتے ان پر آوازے کستے نام رکھتے اور ٹھنڈے پانی کا [illegible] دو [illegible] لائٹ بند کرکے پھینک دیتے جس سے کچھ عرصہ کے لئے ان کا جوش جوانی ذرا سرد پڑ جاتا ۔

(ACTIVITY) رات کے سناٹے میں کسی سوتے ہوئے لڑکے پر پانی پھینک دینے کا نام تھا ۔ لیکن اس کا شکار صرف انہیں صرف وہی ہوتے جن میں کوئی دماغی خرابی یا جسمانی خلا ہوتی ۔ اس کے لئے پہلے ہوسٹل کے دالانوں کی روشنیاں بند کی جاتیں اور بکٹ یا فٹ بال کے پمپ کی مدد سے صاف پانی یا کبھی [illegible] کے ساتھ مناسب میں پھینکا جاتا ۔ بکٹ فرش پر زور سے گرائی جاتی اور ایک دل خراش چیخ لگائی جاتی تاکہ دوسرے سونے والے جاگ جائیں اور جونیئر لڑکے کو اپنی عدم شہرت کی شکایت نہ رہے ۔

نئے طالب علم [illegible] کے لئے طعام خانے بڑے کارآمد ثابت ہوتے ۔ سینئر طلباء میز کے پر اس طرح بیٹھتے کہ درمیان میں کرسیاں خالی رہتیں اور نئے طلباء ان پر بیٹھنے پر مجبور ہو جاتے ۔ ہر نئے آنے والے سے چھیڑ ہوتی ۔ لیکن چند چھیڑ انگیز طلباء ہر سال داخل ہوتے جن کے اخلاق اور [illegible] کی خرابی یا چہروں کی خوبی انہیں دوسروں سے زیادہ مرکز پریشان رکھتی ۔ ڈائننگ ہال کی دوسری شرارتوں میں "چپاتیوں کی بنی ہوئی گڑیا" کا [illegible] آب رسانی" قابل ذکر ہیں ۔ ڈائننگ ہال میں ٹیبل کلاتھ کے نیچے موم جامہ بچھا ہوتا ۔ کسی نئے طالب علم سے چھیڑ مقصود ہوتی تو سارے سینئر ٹیبل کلاتھ کو اوپر اٹھا لیتے اور موم جامہ کو موڑ کر ایک نالی سی بنا دیتے جو اس جونیئر کی گود میں ختم ہوتی ۔ ٹیبل کے دوسرے سرے سے ایک جگ بھر پانی انڈیل دیا جاتا جو ٹیبل کی لمبائی طے کرکے ان کی گود میں آگرتا ۔ اور اس غریب کے کپڑے کھانا اور موڈ سبھی خراب ہو جاتے ۔

اب چند دلچسپ شرارتوں کا ذکر کرتا ہوں ۔ ایک نئے طالب علم آواز کرنے والے سلیپر پہنتے تھے ۔ ان سے ربر کی چپل خریدنے کو کہا گیا تاکہ رات میں لوگوں کی نیند خراب نہ ہو ۔ لیکن جب انہوں نے نہ مانا تو ایک دن طعام خانے سے ایک بڑے جلوس کی شکل میں ان کے لئے ربر کے چپل لائے گئے اور ان کے سلیپر ضبط کرکے ان کو چپل پہنا دئے گئے ۔ جلوس اس شعر کا کورس گا رہا تھا ۔

ٹوکرو [illegible] سلیپر چلایا جا رہا ہے — ایک شخص [illegible] کو دکھایا جا رہا ہے ۔

ایک نئے طالب علم آئے جو عام لڑکوں سے زیادہ ذہین اور شہرت کے خواہش مند تھے ۔ جماعت کی ہر چیز پر اعتراض کرتے اور کہتے رہتے کہ "میں ہوسٹل کی [illegible] کا بلایا ہوں" ان کا علاج یہ ہوا کہ ایک دن ان کے نام ایک خوبصورت سی پارسل ڈاک سے آئی لیکن [illegible] آئی ۔ والدہ [illegible] جو اس شرارت میں شریک تھے ایک بڑے مجمع کے ساتھ پارسل لے کر ان صاحب کے کمرے پر گئے کہ ضرور کوئی کھانے کی چیز گھر سے آئی ہوگی ہم بھی شریک ہونا

چاہتے ہیں۔ پارسل کھولا تو اس میں سے ایک اور پیکٹ نکلا۔ اور اس میں سے ایک [illegible] کا پیکٹ کھولنے کے بعد بالآخر اس میں سے [illegible] سلیم شاہ کی جانب سے [illegible] اور مجھے خوب ہنسی آئی تھی۔ اب اس بولی میں اور مجھ پر پیکٹ کھلنے شروع ہوئے۔ [illegible] سنٹرل کمروں کے بعد ایک [illegible] آدھ [illegible] پرانی [illegible] ہو آدھی [illegible] اور [illegible] لکھا تھا "جواب کی امید رکھئے"

ایک دن ہاسٹل میں یونس [illegible] قاسمی [illegible] خصوصی اوقات میں [illegible] ۔ اسی بات کو [illegible] پر ایک مرحوم [illegible] جس میں [illegible] سے بڑی منت سماجت کی گئی تھی کہ ہم لوگ ضرورت کے [illegible] وقت کی پابندی ممکن نہیں ہے لہٰذا [illegible] نظر ثانی کی [illegible]

کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند — کس کی حاجت رفع کرے کوئی۔

ہاسٹل میں شاعروں کی دنیا بھی الگ تھی۔ حنیف عقیل، رشید احمد رشید، رکن الدین حسان، سردار الہام اور مظہر الدین صدیقی وغیرہ نے بہت سے [illegible] اسکیچ، خاکے، نظمیں اور غزلیں لکھیں۔ کسی نے میرا اسکیچ اس طرح لکھا تھا کہ مجھے اب بھی یقین نہیں آیا کہ یہ میرا ہی خاکہ ہے۔

چھلکتے ہیں آنکھوں سے میری محبت کا پیام — [illegible] آگے میرے شمال رخ [illegible]
نگاہ وصل میں کالے [illegible] پرست [illegible] — میں ہر [illegible] کی شمع ہوں ہر عشق کا پروانہ
[illegible] عشق [illegible] کی الجھن میں میرا افسانہ

یا پھر جوش کی ایک مشہور نظم "ادھر آ اے میرے شاعر ادھر آ" کی نقل میں جس میں مناظر قدرت شاعر کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ چند اسکیچ لکھے گئے تھے مثلاً

میرے عارض میں کندن کی دمک ہے — میرے ہر موئے تن میں اک لچک ہے
گو میری کم سنی باقی نہیں ہے — ابھی تک خوف باقی ہے جھجک ہے
ادھر آ اے میرے شاعر ادھر آ

ایک بھلائی والی شخصیت کا اسکیچ یہ تھا

الوکھا ہی تکلم ہے ہمارا — فقط عاشق کو ہے جو گوارا
نہ گھبرا اے میرے شاعر ادھر آ — مدہ میں نے تو تجھ کو پکارا
ادھر آ اے میرے شاعر ادھر آ

ہاسٹل کے ذکر کے ساتھ دواخانے کا ذکر ضروری ہے جہاں کبھی کو کبھی نہ کبھی جانا پڑتا۔ ڈاکٹر عنایت علی خاں اور ڈاکٹر [illegible] الدین [illegible] اچھے لوگ تھے لیکن لڑکوں میں ہیلتھ کیمپ کے ڈاکٹر [illegible] ہوتے چنانچہ جب تک خود ڈاکٹر [illegible] ہیلتھ کیمپ میں تھے وہ زیادہ پسند کئے جاتے تھے۔ اقامت خانہ [illegible] قدوسی صاحب سال میں ایک مرتبہ سارے ہاسٹل والوں کے لئے ٹی پارٹی کرتے جو اقامت خانے مدنی کے عقب میں [illegible] پر ہوتی تھی [illegible] ایک دوسرے پر [illegible] زیادہ جاتے تھے۔ میں نے دارالترجمہ، بزم اردو، یونیورسٹی کلب اور بعض دوسری باتوں کا ذکر نہیں کیا ہے۔ [illegible] کے اختتامی جلسے کا ذکر مناسب سمجھتا ہوں جب [illegible] نے یہ رسم انجام دی تھی۔ اس جلسے کے [illegible] سیکھنے کے [illegible] اصطلاحات [illegible] کے طور پر استعمال کی جاتی ہیں ۔۔۔ کالج چھوڑنے کے ۲۴ برس بعد اس زمانے کی یاد خوب [illegible] ہو آتی ہے۔ اور میں حنیف عقیل کے ان اشعار پر اپنا مضمون ختم کرتا ہوں۔

[illegible] وہ کالج کی رنگین زندگی — [illegible] کی [illegible]
[illegible] [illegible] — [illegible] بے

[illegible] [illegible]

طیب انصاری

جامعہ عثمانیہ کا تہذیبی کردار

۱۹۱۹ء تا ۱۹۴۸ء

بلاشبہ میرا شمار ان لوگوں میں نہیں۔ جنھوں نے جامعہ عثمانیہ کو حرکت دیکھا ہے اور جو خود بھی سنگ خارہ کی طرح اُس عظیم عمارت کا جزو بن گئے جو بجا طور پر اردو زبان کی طرح ہندو اور مسلمان قوموں کے طرز سے مرکب ہے اور جس کے ستونوں اور در و دیوار کے نقش و نگار میں دونوں قوموں کی کاریگری اور ان کے تمدن و تہذیب کی جھلک نظر آتی ہے اور جو ایک علامت ہے اس آپسی میل جول اور باہمی دوستانہ مراسم اور خوشگوار تعلقات کی جو صدیوں سے ریاست حیدرآباد مرحوم کی مختلف قوموں میں چلے آتے ہیں۔ لیکن میرا تعلق یقیناً اس جامعہ کے فکری ثانی سے ہے جو انقلاب زمانہ کے باوجود بھی سرچشمہ اور جواہر بہائی قدروں اور روایات کے ساتھ سرچشمۂ فیضان بنی ہوئی ہے اور میں ان لوگوں میں سے ہوں جو اس درسگاہ کے منقش دیواروں اور بلند و بالا ستونوں کو ٹٹول ٹٹول کر ماضی کے نقش و نگار تلاش کرتے ہیں عظمت کے نشان ڈھونڈتے ہیں اور اسی طرح حسرت و یاس سے عہد گذشتہ کا صرف تصور کر سکتے ہیں۔ ہم نے ایک قدم آگے بڑھ کر جامعہ عثمانیہ کے ان سپوتوں کو جنھوں نے ادب، صحافت اور سیاست کے میدانوں میں انمٹ نقوش چھوڑے ہیں ٹٹول کر چاہا ہے، ان کے کارناموں کا دل و جان سے اعتراف کیا ہے اور ان کے سراپا کو صفحۂ قرطاس پر محفوظ کرنے کی اپنی سی کوشش کی ہے اس کے ثبوت میں میری دونوں کتابیں "میرا شہر میرے لوگ" اور "نابغان شہر" پیش کی جا سکتی ہیں۔ اس گئے گذرے زمانہ میں بھی جب کہ انقلاب زمانہ نے جامعہ عثمانیہ کی روح کو مسخ کر دیا ہے۔ جب ۱۹۶۷ء میں ایم اے کی تکمیل کے بعد چھوڑ رہا تھا تو میرے جذبات و احساسات بھی وہی تھے جو ۱۹۴۸ء سے قبل کے تقریباً تمام عثمانیوں کے رہے ہیں۔

جامعہ عثمانیہ کا قیام دراصل ایک نئی تہذیب کی ابتداء تھی۔ آصفجاہ اول سے لے کر میر محبوب علی خان تک یقیناً دکن ایک تہذیب کا مرکز تھا لیکن یہ تہذیب لے دے کر شاید وہی تھی جو عرف عام میں "مغلئی تہذیب" کہلاتی تھی۔ یعنی خود حیدرآباد کی اپنی کوئی تہذیب نہیں تھی۔ لیکن ۱۹۱۱ء میں جب حضور نظام میر عثمان علی خان آصف جاہ سابع نے اپنی تاج پوشی کی مسرت میں قیام جامعہ عثمانیہ کا اعلان کیا تو گویا اپنے مضبوط ارادے سے ایک عالی نظریہ حیات اور اعلیٰ معیار امتیاز و اتحاد کی داغ بیل ڈالی جو ان قوموں کی کسی مشترکہ جماعت کے دل و دماغ پر حاوی ہو جاتا ہے جس کے زیر اثر وہ جماعت دنیا میں زندگی بسر کرنے کے مختلف طریقوں میں سے کسی خاص طریقے کو اختیار کر لیتی ہے۔ تہذیب کی اس تعریف کی روشنی میں اگر ہم جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد کے واقعات پر غور کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اسی "مغلئی تہذیب" کی بنیاد پر ایک نئی تہذیب کی عمارت تعمیر ہوئی جو آگے چل کر حیدرآباد کی تہذیب کہلائی۔ اور جسے اللہ تعالیٰ نے کشش رکھی ہے۔ جامعہ عثمانیہ کا قیام ۱۹۱۹ء میں عمل میں آیا اور اردو زبان ذریعۂ تعلیم قرار پائی۔ لیکن اردو کو یہ حیثیت پہلی مرتبہ نہیں ملی تھی۔ جامعہ کے قیام سے پہلے

[illegible]

[illegible] استفادہ کیا ہے۔

جامعہ عثمانیہ نے حیدرآباد کی تہذیب کی نشو و نما میں صرف نمایاں کردار ہی ادا نہیں کیا ہے بلکہ یہ تہذیبی تسلسل [illegible]
کا جاری رہا۔ اور جس طرح یہ ہمارے لطیف احساسات و جذبات کی [illegible]
کے سوا کہیں اور نہیں تھا۔ جامعہ عثمانیہ نے جو تاریخی رول ادا کیا ہے [illegible]
علم و ادب، آرٹ، کلچر اور ثقافتی [illegible]
کو اردو زبان کو ذریعۂ تعلیم بنا کر [illegible] جامعہ عثمانیہ نے جس وسیع النظری [illegible]
رہنما مہاتما گاندھی نے اس اقدام کو استحسان کی نظر سے دیکھا تھا۔

"میں اس دن کا منتظر تھا جب [illegible] تعلیم [illegible] آزاد [illegible]
اور ملک کے لوگ آسانی سے تعلیم حاصل کر سکیں۔"

[illegible]

[illegible]
سمجھنے کے قابل ہے۔

[illegible]

مور[illegible] میں ہوتا رہا۔

بہار اجہ کو جامعہ عثمانیہ اور جامعہ کے طلباء سے غیر معمولی دلچسپی تھی چنانچہ اکثر ان کی صدارت میں مشاعرے بھی ہوا کرتے تھے وہ مشاعرہ جو شاہزادہ اعظم جاہ کی آمد کے سلسلے میں منعقد ہوا تھا یادگار مشاعرہ ہے۔ اس مشاعرہ میں حفیظ جالندھری نے اپنی مشہور غزل "یہ بہار کا زمانہ ہے پیارے"

سنا کر داد و تحسین حاصل کی تھی۔ اسی مشاعرہ میں تراب یار جنگ سعید نے

بے اختیاریوں کا میری کچھ حساب ہے ٭ تم اختیار کے ہو، نہ دل اختیار کا

شعر سنا کر مہاراجہ سے سونے کا پین بطور تحفہ حاصل کیا تھا۔ غلام دستگیر رشید کا یہ شعر بھی کافی پسند کیا گیا تھا ؎

تیرے قدم قدم پہ کھلے جا رہے تھے پھول ٭ آیا چمن میں یاد ہے مجھ کو بہار کا

جامعہ عثمانیہ کے اقامت خانے تہذیب کا ادبی مدرسہ گاہ ہوا کرتے تھے طلباء میں کی شعری، ادبی اور ذہنی صلاحیتوں کے اُبھار کرنے میں ان اقامت خانوں کا غیر معمولی رول رہا ہے۔ چاہے یہ اقامت خانے "مسرت منزل"، "فرحت منزل" کے ہوں یا "اے بی سی" (؟) اپنی سرگرمیوں کی وجہ سے منفرد مقام رکھتے تھے۔" ان اقامت خانوں میں مسابقتی رقابت رہتی۔ ہر وارڈن اس بات پر گہری نظر رکھتا کہ اس کے اقامت خانے کے طلباء پسندیدہ کلچر کا مظاہرہ کریں۔ لباس، عام رکھ رکھاؤ، آداب و مراتب، انداز گفتگو یہاں تک کہ ڈائننگ ہال میں کھاتے وقت بات اور آواز کے حجم پر بھی نگرانی رکھی جاتی تھی۔ بے ہنگام قہقہے اور قہقہوں کی بلند آہنگی ہاسٹل کے وارڈن اور وارڈن کی عدم موجودگی میں سینئر ساتھیوں کی تیوریوں پر بل ڈال دیتے تھے۔ عاقل علی خاں نے اپنے زمانہ کی اقامتی زندگی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "ہاسٹل کی زندگی میں جونیروں کی طرف سے سینیروں کا احترام اور سینیروں کی طرف سے جونیروں کی برادرانہ حفاظت ور ہنمائی کی کوشش ہوتی اس روایت کو بڑی عقیدت سے برقرار رکھا گیا تھا۔ ہم نے اپنے دور میں اپنے ہاسٹل میں ایک اور روایت کا اضافہ کیا تھا۔ وہ یہ تھی کہ سینیر جماعتوں کے طلباء اپنے اپنے مضامین میں جونیر ساتھیوں کو ہاسٹل کے کامن روم میں پڑھائیں، ان سے تحریری مشقیں لیں اور اس بات کی اجتماعی کوشش کی جائے کہ ہاسٹل کے امتحانی نتیجہ کا فیصد دوسرے ہاسٹل سے زیادہ ہو۔ یہ روایت لے ہاسٹل سے نکل کر دوسرے ہاسٹلوں میں بھی پھیلی۔ اس کا جامعاتی امتحانات کے نتائج پر اچھا اثر مرتب ہوا تھا۔"

اقامت خانوں کی زندگی کا ذکر کرتے ہوئے ہاشم علی اختر نے لکھا ہے کہ "سال اول کے طالب علم کے لئے دو مصیبتیں اہم ہوا کرتی تھیں ایک ٹرپڈیشن اور دوسرا ACTIVITY ۔ ٹرپڈیشن نئے لڑکوں کے تعارف کی رسم تھی۔ سال کے شروع میں کسی رات سارے سینیر نئے لڑکوں کے کمروں پر جاتے اور پھر آواز سے کہتے، نام رکھتے اور ٹھنڈے پانی کی ایک دو بالٹیاں الٹ پلٹ کر کے چھینک دیتے جس سے کچھ عرصے کے لئے ان کا جوش جوانی ذرا سرد ہو جاتا۔ ACTIVITY رات کے سناٹے میں کسی سوتے ہوئے لڑکے پر پانی پھینک دینے کا نام تھا"

ان شرارتوں کے علاوہ ڈائننگ ہال کی شرارتیں خاص مزہ دیتے تھے جو ایک بات جو قابل ذکر ہے وہ یہ کہ ان شرارتوں کے پیچھے طلبہ کی ذہانت کارفرما ہوا کرتی تھی۔ اس ذہانت کا مظاہرہ اس وقت شاندار طور پر ہوتا جب سالانہ میثاقی ڈنر کے موقع پر جشن مشاعرہ رکھا جاتا تھا۔ یہ [illegible] ایک ڈنر ہوتا تھا اور اس موقع پر مزاحیہ اور ان لطیفوں کا [illegible]

منعقد ہوا کرتے تھے۔ اکثر مشاعرے مسرت منزل میں منعقد ہوتے تھے اور ان مشاعروں میں طلباء کے علاوہ اساتذہ بھی
ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ وحید الدین سلیم کا یہ مصرعہ زبان زد عام تھا ہے۔ دل مسرت کلبہ منزل اے ویران نہ کر
ہے۔ وہ اپنی عجیب زبان اور ذہین طلباء کی وجہ سے دلچسپ لطیفے بھی جنم لیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے۔ وحید الرحمن صاحب اکثر
انت اور ان کی شرارتوں کا شکار رہتے تھے۔ شریر لڑکوں میں شرافت حسین صاحب کا بھی شمار ہوتا تھا۔ ایک دن انھوں
حسن صاحب سے چھیڑ کی۔ وحید الرحمن صاحب نے گوشمالی کرتے ہوئے کہا کہ تمھارا نام تو شرافت ہے مگر شیطانوں کی
ہو" اس پر شرافت حسین نے معصومانہ انداز میں کہا" جی نہیں میرا نام تو شر اور آفت سے مرکب ہے!" اس جواب
ہنس پڑے اور انھیں معاف کر دیا۔ مشاعروں میں مزاحیہ شاعری کو خوب خوب داد ملتی اس طرح کی شاعری میں مرزا شکور
بلند رکھتے تھے۔ انھوں نے حافظ کی زمین میں ایک نظم کہی تھی جس کا شعر یہ ہے

دنی تو سالن بدمزہ بے گھی کی پھیکی دال
کجا دانند حال ما طعام بے مزہ منزل ہا

نظم کہا پہلا دوشالہ "فرحت منزل" کی دین ہے
دور کے مشاعرے اپنے میں بڑی افادیت رکھتے تھے۔ وحید الدین سلیم حالی کے خاص شاگردوں میں سے تھے ان کی وجہ سے
میں مقصدی شاعری کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ چنانچہ "شعرائے عثمانیہ" کا مطالعہ اس بات کا ثبوت ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے
کو شہرت دوام حاصل ہوئی ان میں مخدوم اور وجد نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ غلام احمد شریف، آرام، اشک
محمد امیر، باقی، بلند، بابر، بیتر، برقی، شعیب حزیں، ذکی، ارشد، ذور، زیبا، ساز، مہراج سکینہ، سروش
سکینہ، بلند شکیب، شمیم، موہن لال شنکر، میر حسن الدین، ملکش، لطیف النساء اور تو شابہ خاتون اپنے دور کے ممتاز

علاوہ قاضی محمد حسین پرو وائس چانسلر کی دلچسپی کی وجہ سے ٹاؤن ہال میں مختلف علوم پر مفید عام لیکچر بھی ہوا کرتے
سے فلسفیانہ ذہن کو خاص فائدہ ہوا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ انجمن اتحاد طلباء اور بزم اردو کے ادبی جلسے، انجمن فلسفہ... کی
بزم تمثیل کے ڈرامے اپنی سرگرمیاں تھیں جن کی وجہ سے اندرون و بیرون یونیورسٹی طلبا کو اپنی ذہنی صلاحیتوں کو
کے مواقع حاصل تھے۔ طلباء کی تحریری صلاحیتوں کو جلا بخشنے میں "مجلۂ عثمانیہ" کو غیر معمولی اہمیت حاصل رہا۔
۱۹۲۷ء میں معین الدین قریشی کی وجہ سے پہلی مرتبہ "مجلۂ عثمانیہ" شائع ہوا تھا۔ جو آج تک جاری ہے۔ جامعہ عثمانیہ
صلاحیتوں کو جلا بخشنے میں انجمن اور بزم کے علاوہ مجلہ کو خاص اہمیت حاصل رہا ہے۔ مجلہ کے مدیران میں جن طلبا
حاصل ہوئی ان میں معین الدین قریشی، ڈاکٹر زور، اکبر وفاقانی، جلال الدین اشک، شیخ چاند، بنی الحسن، شمیم
سعادت علی رضوی، سید محمد مرتضیٰ، بلند شکیب، عزیز احمد، مخدوم محی الدین، عاقل علی خاں، جی۔ ایم۔ خاں، سعادت
نظر علی، عزیز احمد، سکندر علی وجد، صاحبزادہ میکش، اشفاق حسین، شہاب الدین، وحید الدین، اکبر علی، ناصر...
حسن الدین فاروقی اور مبارز الدین رفعت خاص اہمیت رکھتے ہیں۔
طلبا کی سرگرمیاں جامعہ کی جان ہوا کرتی تھیں۔ انتخابات زور و شور سے ہوا کرتے تھے۔ امیدواروں کے
... لکھا کرتے تھے۔ انجمن اتحاد طلباء جامعہ عثمانیہ کے انتخابات میں بڑی امیدوار

تک ہوتا جو سب سے [illegible] ہیں اور جنگ سے [illegible] کا احتمال کم سکتا ہو اس لئے ان میں ذہانت کا کمیل تھا۔ انجمن
[illegible] عبد الرحمن [illegible] اور [illegible] کی حیثیت علاقہ نامور تھے۔ جامعہ کے دوسرے مقرروں میں
رشید [illegible] مشہور ہوئے۔ میر حسن، ظفر الحسن، مخدوم، اشفاق، [illegible]، شکر بیگ کی دوستی تھی
اور عزیز [illegible] کر [illegible] عابد علی خاں اور محبوب حسین جگر بھی شامل ہوگئے۔ ان لوگوں کا دوستی
اردو ادب کی بہت [illegible] مخدوم کی شاعری اور اشفاق کی نثر نگاری زبان [illegible] اور بھی [illegible] ہے۔ جامعہ عثمانیہ
کے فرزندوں میں [illegible] افسانہ [illegible] شہرت [illegible] اور کم [illegible] نصیب ہوئی۔ حیدرآباد میں ترقی
پسند افکار کی ترویج و اشاعت میں ان لوگوں نے اہم حصہ لیا۔ جامعہ کے نثر نگاروں میں میر ولی الدین، عبد المجید صدیقی، زور،
میر محمود علی، معین الدین قریشی، سردار [illegible]، [illegible] رضی الدین صدیقی، حمید اللہ، جہاں بانو نقوی، غلام
دستگیر رشید، نفیس [illegible] حسن الدین، ضیاء الدین انصاری، ایم۔ خان، [illegible] حسن، [illegible] رشید، حبیب النساء،
محسن بن شبیر، عبد الرحمن رئیس، [illegible] خان، ہاشم علی اختر، محبوب حسین جگر، [illegible] شاہد، نزہت ساجد
رشید قریشی، [illegible] شعیب اللہ، احسن علی مرزا اور [illegible] شاہد اور ایسے کئی ہی افسانہ نگار، صحافی اور ڈرامہ نگار
پیدا ہوئے جنھوں نے ادب کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ [illegible] جانب متوجہ کیا۔ ان کے [illegible] عبد القادر کی سرپرستی
میں [illegible] کا ایک [illegible] ابھرا جو ترقی پسندانہ انداز فکر کی وجہ سے مشہور تھا۔ [illegible] کے بعد جن [illegible] نے ملک گیر شہرت حاصل
کی ان میں [illegible] اور محبوب حسین جگر [illegible] ترقی پسندی، وطن دوستی اور [illegible] نوازی کی وجہ سے نمایاں ہیں۔ انجمن طلباء
نے [illegible] حیدرآبادی [illegible] کو [illegible] موقع فراہم کیا۔ ان انجمن کے تحت [illegible] تعلیمی و فنی [illegible]
ہیں۔ حیدرآباد کی تہذیبی زندگی میں اس انجمن کی خدمات کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس انجمن کے قیام اور ترقی کے [illegible]
کو بھول نہیں سکتے۔ [illegible] ۱۹۲۸ء [illegible] انجمن ترقی اردو [illegible] کارنامے [illegible] ہیں۔ مولوی
نے جس انجمن کی بنیاد [illegible] ڈالی تھی وہ حیدرآباد پہنچ کر برگ و بار لائی۔ خصوصاً ۱۹۳۸ء میں جب انجمن کو جامعہ سے
گیا اور جامعہ کے [illegible] بنیادی تبدیلی لائی گئی تو یہی وہ انجمن تھی جو ان [illegible] میں [illegible] مولوی عبد الحق کی سرکردگی
میں آگے بڑھی۔ اس سلسلے میں ہم راج بہادر گوڑ، عابد علی خاں اور ان کے رفقاء کے کارناموں کو منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ڈاکٹر زور
ایوان اردو کی بنیاد رکھ کر [illegible] اردو ادب کو نئی آب و تاب عطا کی ہے۔ تحقیق کے میدان میں ادارہ ادبیات [illegible] گیر شہرت
[illegible] ۱۹۱۹ء تا ۱۹۴۸ء تقریباً ان تیس سالوں میں جامعہ عثمانیہ [illegible] علم سے آراستہ کی وہ جامعہ سے نکل کر
زندگی [illegible] وسیع النظری، قابلیت اور ذہانت سے [illegible] نمایاں [illegible]
[illegible] ادب [illegible] ادب، انجینیر [illegible] کے میدان میں [illegible] شہرت حاصل [illegible]
[illegible] سے [illegible] اور دکن کا [illegible] کی وجہ سے [illegible]
[illegible] بات یہ تھی کہ [illegible] کے اعتبار سے اقبال اپنے [illegible]
[illegible] دستگیر رشید اور ڈاکٹر [illegible] نثر [illegible]
[illegible] حیدرآباد [illegible] ہے۔ [illegible]

[illegible] تہذیب [illegible] جس تہذیب [illegible] [illegible] لکھنؤ کے [illegible] ایک شہر [illegible] تہذیب [illegible] حیدرآبادی تہذیب [illegible] [illegible] جس نے [illegible] میں جامعہ عثمانیہ کو باقیات السالحات میں سے سمجھتا ہوں۔ جامعہ عثمانیہ کی زرخیزی [illegible] ۱۹۴۸ء [illegible] کئی نامور ادیب، شاعر، دانشور اور فنکار پیدا ہوئے اور جو ہمارے ملک کے [illegible] اپنی خدمات اور قابلیت کا لوہا منوا چکے ہیں [illegible] کا ذکر ابھی باقی ہے۔

۱۹۴۸ء کی سیاسی تبدیلی کا اہم اثر جامعہ عثمانیہ کے سیکولر کردار پر پڑا۔ یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ ایک عوامی حکومت کے ہاتھوں جامعہ عثمانیہ سے اس زبان کو نکال باہر کیا گیا تھا جو عوامی اتحاد کے نتیجہ میں پیدا ہوئی تھی اور جو ہندوستانی تھی۔ اس کی جگہ ایک ایسی زبان کو مسلط کیا گیا جو نہ صرف [illegible] تھی بلکہ اس زبان کے بولنے والوں کے خلاف برسہا برس تک جدوجہد کرتے رہے تھے۔ اس کے نتیجہ میں [illegible] جو فضاء بے چینی کی پیدا ہوئی تھی وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ جامعہ کے دور اول میں جہاں بہت سے مسلم نوجوان ابھرے وہیں رام کشن راؤ، مسز سروجنی نائیڈو، وی نارائن ریڈی، [illegible] ریڈی، [illegible] رام لال، مہندر راج سکسینہ، [illegible] بھاؤ صاحب [illegible]، [illegible] راج بہادر گوڑ، نارائن [illegible]، [illegible] ڈاکٹر روپ کرن، [illegible] راج سکسینہ، ڈاکٹر [illegible]، [illegible] ریڈی اور [illegible] وزیر اعظم [illegible] ہماری تہذیب کو [illegible] رہا ہے۔ یہ واقعہ بڑا افسوسناک اور [illegible] جامعہ عثمانیہ کے اس تہذیبی کردار کو جس زمانہ میں مسخ کیا گیا وہ ایک طلبا یونین کا دور حکومت تھا یعنی —

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے ●●

۱۹۷۸ء میں مطبوعہ کتابوں پر انعام

آندھرا پردیش اردو اکیڈمی کے پریس نوٹ میں بتایا گیا ہے کہ اردو کی کتابوں پر اکیڈمی کی جانب سے ایوارڈ دینے کی اسکیم کے تحت آندھرا پردیش کے [illegible] مصنفین سے خواہش کی جاتی ہے کہ ۱۹۷۸ء کے دوران میں [illegible] ۳۱ دسمبر [illegible] مطبوعات ڈائرکٹر اردو اکیڈمی (۲۳۲-۳-۱۱) [illegible] حیدرآباد ۲ کے پتہ پر روانہ فرمائیں۔ [illegible] مختلف علوم و فنون کی کتابیں نیز [illegible] کی کتابیں [illegible] کیا جائے گا۔ البتہ [illegible]

۱۹۷۸ء کے دوران میں چھپنے والی [illegible] کتابیں [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

اختر انصاری اکبر آبادی
(پاکستان)

رُباعیات

پوشاک نئی گرد میں اَٹ جائے گی
باقی ہے جو آن وہ نمٹ جائے گی
خاموش رہو، وقت کے تیور دیکھو
بولے تو ابھی زبان کٹ جائے گی

کچھ نور قرابت ہیں نہ سیلاب ہیں
کیا کہیے نامراد بے چارے ہیں
کیا جا کے چمن میں اپنا دامن پھیلائیں
سمجھے ہیں جنھیں پھول وہ انگارے ہیں

بدلا جو زمانہ تو قباحت ہوگی
پھر اور ہی حالات کی صورت ہوگی
جلسے میں جو بیٹھے ہیں انھیں ہوش نہیں
دیوار گری تو کیا قیامت ہوگی

اک شور فضاؤں میں ہے ماتم جیسا
ہر پھول کھلا ہے دل پُر غم جیسا
یہ رنگِ مکافاتِ عمل ہے اختر
ماحول ہے جنّت کا جہنم جیسا

آئے گی سمجھ میں بات آتے آتے
کھلیں گے ہر ایک راز جاتے جاتے
اب تک جو کلاونت بنے ہیں اختر
بن جائیں گے خود گیت وہ گاتے گاتے

پوشیدہ دھوئیں میں آگ رکھتی ہے دنیا
ساری دنیا کو ٹھگ رہی ہے دنیا
اک روز یہ اُڑ جائے گی شعلہ بن کر
دھیرے دھیرے سلگ رہی ہے دنیا

امکان و محالات کو روشن رکھو
ہر رنگ سے حالات کو روشن رکھو
مٹ جائے گی تیرگی جہاں کی اختر
تم اپنے خیالات کو روشن رکھو

○

زیب غوری

غزل

سنگ ریزہ تھا میں دنیا کو خبر ہونے تک
مجھ کو کھونا پڑا ہاتھوں سے گہر ہونے
کیسے دامن کو بس خاک نوا ہاتھ آ
بجھ گیا شعلہ ہواؤں کا گزر ہونے
راکھ کا ڈھیر سہی پل میں سوادِ وحشت
دشت روشن ہے فضاؤں میں شرر
کس نے کی تھی یہ تگ و تازِ مسلسل
یاد ہی کچھ نہ رہا ختم سفر ہونے
جب پرستش کو بٹھائے لوگ تو بت تو
خود سے منکر میں ہوا قدرِ ہنر ہونے
قید رو کے تھی اُمڈتے ہوئے سیلاب کا
غرقِ دریا ہوا دیوار میں در ہونے
اُس کے بھی نام کی اک شمع جلائے
زیب کیا جانے کہاں ہوگا سحر ہو

○

غلام جیلانی

ابوالمکارم فیض محمد صدیقی

چھتیس سال گذر جانے کے بعد ادارے میں بیٹھے ہوئے کسی حوالے کی کتاب، یا کسی ٹیلیفون کے انتظار کے دوران تصوراتی آنکھ کے سامنے وہ شخصیتیں آجاتی ہیں جو اس دور میں سرگرم کار رہتی تھیں۔ ڈاکٹر زور، پروفیسر سروری، پروفیسر عبدالمجید صدیقی، پروفیسر سید محمد، نصیر الدین ہاشمی۔ فیض محمد صدیقی، سید بادشاہ حسینی، حمید الدین شاہد، حفیظ صدیقی کن کن کے نام گناؤں۔ آج ان شخصیتوں میں سے ایک کے بارے میں اپنے شخصی تاثرات قارئین سب رس کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں کہ میں برسوں ان کے قریب رہا اور بہت قریب رہا۔

فیض صاحب کو میرے ماموں کے ہم جماعت کی حیثیت سے کم عمری سے جانتا تھا۔ لیکن اس جان پہچان کے درمیان بزرگ خوردی کا فاصلہ تھا۔ دھندلا سا خیال ہے کہ ایک مرتبہ فیض صاحب ایک تصنیف میں مصروف تھے اور مسودے ساتھ لائے تھے دوران پر بحث ہو رہی تھی۔ غرض یہ تعارف تھا ان کی تصنیفی صلاحیت کا۔ عجیب اتفاق ہے کہ یہی تعارف دیرپا ثابت ہوا اور ان کی بوقت موت تک قائم رہا۔ رفتہ رفتہ درمیانی فاصلہ گھٹتا گیا، تکلف بے تکلفی میں بدلتا گیا اور بالآخر ہم پیالہ و ہم نوالہ ہو گئے۔ اس ضمن میں فیض صاحب کی عجیب و غریب خصوصیت بیان کرنا بے محل نہ ہوگا۔ فیض صاحب کے بے تکلف دوستوں میں ایک ہی خاندان کے بزرگ و خورد، دفتروں کے اعلیٰ عہدیدار، اہلکار اور بعض وقت اس سے کم درجہ کے لوگ بھی شامل ہوتے۔ میں نے انھیں سیکریٹری کے انگریزی افسروں اور دفتر کے چپراسی کے ساتھ ایک ہی انداز میں گفتگو کرتے دیکھا ہے۔

فیض صاحب لکھنے پڑھنے کے معاملے میں مشینی بے تکان لکھنے کے مالک تھے۔ ۱۹۴۸ء سے قبل جبکہ حیدرآباد کا اپنا ریڈیو اسٹیشن تھا روزانہ ایک معلوماتی تقریر نشر ہوا کرتی تھی جس کا دوران پندرہ منٹ ہوا کرتا تھا۔ ہر دس یا پندرہ دن میں ایک مرتبہ فیض صاحب کی تقریر نشر ہوا کرتی تھی۔ حکام اسٹیشن کو فیض صاحب پر اس قدر اعتماد تھا کہ انھیں کسی وقت مضمون بغرض جانچ پہلے نشر داخل کرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ بسا اوقات عنوان ٹیلیفون پر لکھوا دیا جاتا اور تاریخ سے مطلع کر دیا جاتا البتہ ایک دن قبل تقریر یاد دلائی جاتی اور بالعموم اسی یاد دہانی کے بعد ہی مضمون لکھا جاتا۔ کبھی یہ مضمون ملازمت کے خالی پیریڈ میں مرتب ہوتا اور کبھی دوست احباب کے ساتھ ہی کھیلتے بیٹھے لکھا جاتا۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ دوستوں کے گھیرے میں تک پکڑ یا دوستوں کے ہاں گذار کر واپسی کے بعد اس مضمون کا خیال آتا اور یہ مضمون تیار رہتا۔

یہی حال فیض صاحب کے دیگر تصنیفی و تالیفی مصروفیات کا تھا۔ ایک مرتبہ ایک نصابی کتاب کی تالیف کی بات چلی اور چند جلدی سب کچھ انھوں نے صرف اڑتالیس گھنٹوں میں مکمل کیا تھا اور زندگی کے یہ اڑتالیس گھنٹے پڑھنے لکھنے [illegible] کام کرتے ہوئے میں نے متعدد بار محسوس کیا تھا کہ دوسرے صاحب قلم جس عرصہ میں ایک صفحہ لکھ سکتے تھے اسی عرصہ میں فیض کئی صفحات لکھ جاتے تھے لیکن تحریر کا معیار کبھی پست نہ ہوتا تھا۔

پیشے کے لحاظ سے سائنس اور ریاضی کے استاد تھے۔ ہائی اسکول کی کلاس لیتے تھے لیکن ان کا تصنیفی اور تالیفی میدان صرف یہیں تک محدود نہ تھا۔ جنرل سائنس، طبیعیات، حیاتیات اور علم الحساب جیسے مختلف مضامین پر مختلف جماعتوں کے لئے ان کی متعدد کتابیں شریک نصاب رہیں۔ ۱۹۲۷ء یا ۱۹۲۸ء سے ان کی وفات یعنی ۲۱ ڈسمبر ۱۹۵۵ء میں [illegible]، محکمہ نصابی کتب کی تصنیف و تالیف جاری رہی اس طویل مدت میں کسی وقت بھی ان کی چار چھ کتابوں سے کم شریک نصاب نہیں رہیں یعنی دس کو دس بارہ کتابیں شریک نصاب رہ چکی ہیں۔ نصابی کتب کے علاوہ "مسلمانان تعلیم، ابن سعود، ہز ہائینس آغا خان وغیرہ" ان کے سوانحی ادب میں اپنا مقام رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر زور کی فرمائش پر انھوں نے کم عمر بچوں کے لئے کئی معلوماتی و سوانحی کتب لکھیں جن کے نام یہ ہیں۔ آبدوز، دسرکس، پانی کی کہانی، بچوں کے گاندھی، عماد الملک، سالار جنگ اور دادا بھائی نوروجی۔

قارئین سب رس کو یاد ہوگا کہ ۱۹۴۲ء میں ادارہ ادبیات اردو نے بڑے پیمانے پر اردو انسائیکلوپیڈیا (مخزن علوم و فنون) کی طباعت کا بیڑہ اٹھایا تھا۔ اس کی مجلس ادارت کے دو معتمد تھے۔ ایک ابوالکلام فیض محمد صدیقی اور دوسرے سید شاہ حسین۔ اس انسائیکلوپیڈیا کا ایک نمونہ جو ستر (۷۰) صفحات پر مبنی ہے ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا۔ اس نمونے میں جو کچھ پیش کیا گیا اس سے سو گنا زیادہ کام تکمیل پا چکا تھا اور آج بھی ادارہ کی الماریوں میں محفوظ ہے۔ نمونہ شائع ہونے کے بعد مالی مشکلات اور دیگر پیچیدگیوں کے باعث ادارہ نے اس کام کی تکمیل کو ملتوی کر دیا۔ کس قدر تعجب کی بات ہے کہ آج یہی کام اسی حیدرآباد کے ایک دوسرے ادارے کے تحت انجام پا رہا ہے۔ پتہ نہیں تنگ نظری کے باعث یا باہمی رقابت کی وجہ سے اس بیش بہا ذخیرہ کی قیمت کے بعد تیار کردہ مسودات کو استعمال کرنا تو کجا استفادہ تک نہیں کیا جا رہا ہے۔ یہ بات تو تذکرۃً آ گئی ورنہ قابل ذکر تو فیض صاحب کا طریقۂ کار تھا۔ انھوں نے اس کام کے لئے طویل رخصت لے لی تھی۔ اس زمانے میں مجھ کو بھی فرصت تھی اور صبح نو بجے ہمارے مکان پر آتے اور پھر ہم دونوں ان کی موٹر سائیکل پر ادارہ پہنچتے۔ دن بھر کام کرتے رہتے۔ دفتر برخاست کر کے سر پادشاہ حسن اور سید کاظم حسین اور دوسرے اصحاب بھی آ جاتے اور پھر رات تک یہ کام جاری رہتا۔ یہاں ایک اور بات کہہ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ادارہ ادبیات اردو کو اس کام پر راغب کرنے والے صدیقی اور شاہ صاحب تھے۔ فیض محمد اور سید [illegible] نے اپنے طور پر کئی سال پہلے یہ کام شروع کیا تھا اور [illegible] اس کا نام رکھا تھا۔ اور ایک جلد شائع بھی۔ انھوں نے جب یہ محسوس کیا کہ بلحاظ وسعت یہ کام تنہا تکمیل پانا دشوار ہے کہ جس [illegible] پر شروع کیا گیا ہے اس کی تکمیل وسیع پیمانے پر ہونا چاہئے تو انھوں نے ڈاکٹر زور [illegible] اسکیم [illegible] اور کام شروع کیا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں ایک اور بات قابل ذکر ہے وہ یہ کہ جب [illegible] کام ملتوی کیا بلکہ ختم کر دیا تو فیض صاحب کو سب سے زیادہ [illegible]

[illegible] تو ظاہر ہے بات کی گئی [illegible]
[illegible] ایک اور [illegible]
[illegible] فیض صاحب [illegible] ساتھ [illegible] فیض صاحب [illegible]
[illegible] انسائیکلوپیڈیا تیار کرنا شروع کر دیا ہے۔ بچوں کا انسائیکلوپیڈیا [illegible]
[illegible] جو خیال پیدا ہوا تھا وہ [illegible] میں [illegible] یا اردو انسائیکلوپیڈیا کی اسکیم کا [illegible]
اس کام کو بند کر دیا لیکن فیض صاحب کے [illegible] یہ [illegible] میں [illegible] بچوں کی انسائیکلوپیڈیا
[illegible] اس پر کام کرتے رہے۔ ان کی زندگی کچھ اور دن وفا کرتی تو اس قلندر صفت انسان کے [illegible]
نہ لگ پاتا۔

جن تصانیف و تالیفات کا اس وقت تک ذکر کیا گیا ہے ان کے علاوہ فیض صاحب لاتعداد عنوانوں پر تقریریں [illegible] زیر نشر کر چکے ہیں۔ اگر ان تمام تقریروں کو جمع کیا جاتا تو ایک مفید اور معلوماتی کتاب تیار ہو سکتی تھی۔ افسوس کہ [illegible] کو محفوظ رکھنے اور کسی اشاعت کی جانب توجہ کی۔

اب آئیے فیض صاحب کی زندگی کے ایک اور پہلو سے آپ کو واقف کرائیں۔ جس شخص کی بیسیوں کتابیں [illegible] رہی ہیں اور ساری ریاست میں فروخت ہو رہی ہیں۔ جس شخص کی پچاسوں تقریریں نشر ہوئی ہوں جس شخص نے [illegible] عام فہم زبان میں پچاسوں مضامین اردو کے رسائل میں شائع کروائے ہوں اس شخص سے متعلق قیاس یہی ہے کہ وہ دولت اکٹھا کر چکا ہوگا۔ لیکن فیض صاحب کا حال کچھ اور ہی تھا۔ زندگی بھر انہیں تنگدستی رہی لیکن ایسی [illegible] نصیب نہ تھی جیسی کہ ہونی چاہیئے تھی۔ وقتاً فوقتاً وہ قرضدار بھی ہو جاتے تھے اور وفات کے وقت تقریباً [illegible] تک [illegible] یہ حالت تو اردو کے ہر ادیب کی ہوتی ہے لیکن فیض صاحب کی مستقل تنگدستی ان کے طرز زندگی کی وجہ سے تھی [illegible] کے ادیب اور ناشروں کی چیرہ دستی کی وجہ فیض صاحب علم حساب کے استاد ہوتے ہوئے شخصی معاملات میں حساب کے قائل نہ تھے بلکہ حساب دوستاں در دل ان کا اصول تھا۔ اردو کتب کے ناشرین جہاں بھی مصنفین کو [illegible] بنا معاوضہ دینے کے قائل نہیں ہوتے اس پر طرہ یہ کہ فیض صاحب [illegible] میں [illegible] آپ کا معاوضہ انہیں وہ چار ہزار ملنا ہوتا تو وہ چار سو پر معاملہ ختم ہو جاتا۔ جہاں کسی کتاب سے [illegible] فیض صاحب کا [illegible] جیبیں پچاس [illegible] حاصل کر لیتے [illegible] پچاس کے [illegible] اُن کے [illegible] میں چڑھتے۔ یہ [illegible] حاصل کرنے کا [illegible] کسی وقت [illegible] روپیہ گھر سے [illegible] شام میں واپس پر دو چار روپے [illegible] پر ہونے والی تقریروں کا معاوضہ [illegible]
[illegible]
[illegible] ہوٹل میں کھانا کھاتے [illegible]

[illegible] کر محروم واپس ہوتے۔ اس طرح تفریح سے بنا ہوا معاملہ چند گھنٹوں میں ختم ہوجاتا۔ یہی حال دوسری آمدنی کا تھا۔ ایک مرتبہ کسی شاعرانہ انعام میں انھیں کثیر رقم ملی تھی۔ بعض احباب کے مشورے کر انھوں نے مان لیا کہ کچھ رقم پس انداز کرنی چاہیے۔ ایسے مواقع بار بار تھوڑی ملتے۔ لیکن فیض صاحب کی لاأبالی طبیعت نے یہاں بھی اپنا رنگ دکھایا۔ رقم نہ گھر میں رکھی اور نہ بنک میں ایک مخلص دوست کے ہاں محفوظ کروادی اور پھر وہاں بھی وہی علی الحساب کا قصہ چلا۔ اور ایک وقت وہ آیا جبکہ اس مخلص دوست نے رقم ختم ہوجانے کی اطلاع دیدی۔ ظاہر ہے کہ فیض صاحب کو اس اطلاع سے رنج ہوا ہوگا مگر نہ اس کو ظاہر کیا اور نہ دوست سے تعلقات خراب ہونے دیئے۔ کبھی اس حادثے کا ذکر بھی ہوتا تو فیض صاحب کہتے "ہٹاؤ جی پھر کما لوں گا"

غرض فیض صاحب کھیل اور تفریح کے انداز میں کام کرتے تھے اور کام کی سی سنجیدگی سے کھیل تفریح میں حصہ لیا کرتے۔ گویا ان کی مختصر سی حیات ایک طویل تفریح تھی۔ اور آج جب ان کی بے وقت موت سے متعلق سوچتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ اس میں بھی ایک تفریح کا سا انداز تھا۔ نہ بیمار پڑے نہ کسی کو تکلیف پہونچائی۔ رات گیارہ بجے تک میرے ساتھ اپنے بڑے لڑکے کی ملازمت کے سلسلہ میں ایک بڑے عہدیدار سے ملاقات کا وقت لیا گیا تھا۔ صبح اٹھ کر نہایا۔ لڑکے کو ساتھ لے کر جانے کے لئے تیار ہوئے اور ناشتہ کرنا چاہتے تھے کہ قلب پر حملہ ہوا اور منٹوں میں چل بسے۔ رات گیارہ بجے انھیں گھر پہ چھوڑا تھا۔ اور صبح دفتر پہونچنے کے چند ہی منٹ بعد ان کے منجھلے لڑکے نے ٹیلیفون کیا اور روتے ہوئے کہا "ابا کا انتقال ہوگیا" باور کرنا دشوار تھا۔ بار بار پوچھنا پڑا۔ اور جب گھر پہونچ کر ان کے جسد خاکی کو دیکھا تو یہ احساس ہوا کہ "ابھی کچھ لکھتے لکھتے سوگیا ہے۔" ••

اقتباس از "سب رس" جنوری ۱۹۵۶ء

"ابوالمکارم مولوی فیض محمد صدیقی صاحب ادارۂ ادبیات اردو کے ابتدائی رفیقوں اور اسی طرح اندرون میں ایک خاص مقام رکھتے تھے۔ مجھے تقریباً تیس سال سے ان سے تعلق خاطر رہا۔ وہ جامعہ عثمانیہ کے ایک اقامت خانہ مسرت منزل میں میرے کمرے سے متصل مقیم تھے۔ اور اپنے عجیب ڈھب سادگی اور بے تکلف اور البیلی گفتگو کی وجہ سے اپنے ہم چشموں میں بہت ممتاز اور ملاقاتیوں اور دوستوں کے محبوب تھے۔ تصنیف و تالیفات کا طالب علمی کے زمانے ہی سے شوق تھا اور ہمیشہ کچھ کچھ لکھتے پڑھتے رہتے تھے۔ لیکن محض اسی کے ہو کر نہ رہے، محفل آرائی اور دوستوں اور کھیل تماشوں کے بھی ہمیشہ دلدادہ رہے دوستوں کے ساتھ آخر وقت تک نبھاہا۔ ان کے قریب ترین احباب میں بعض بڑے عہدوں پر بھی فائز ہوئے اور اب تک ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک ہمیشہ فیض محمد کی دوستی پر ناز کرتا رہا حالانکہ وہ اپنی اعلیٰ لیاقت اور مسلسل محنت کے باوجود مرتے تک مدرسہ کی مدرسی ہی پر کارگزار رہے۔ مولوی میر مظہر حسین صاحب ناظم بند و بست اور مولوی غلام حیدر صاحب نائب آف انفانیوز کے ساتھ ان کے برادرانہ تعلقات رہے۔ اور اول الذکر کے یہاں تو وہ رات میں دیر تک بے تکلف اور خوش وقت گزار کر گھر آتے تھے اور جب صبح اٹھے اور مدرسہ کو جانے کی تیاری کرنے لگے تو اچانک فوت ہوگئے۔ وہ زندگی میں جس طرح ہر شے یعنی خاص بے پروائی کے ساتھ لاأبالی انداز میں نبیڑتے تھے موت سے بھی ویسا ہی سلوک گوارا رکھا۔ کبھی کسی کشمکش یا زحمت حالت سے دوچار نہیں ہوئے۔

ادارۂ ادبیات اُردو کے تقریباً ہر کام اور ہر شعبے سے ان کا تعلق رہا۔ کسی وقت بھی کسی کام سے منہ نہیں موڑا۔ جب
نے اُردو انسائیکلوپیڈیا مرتب کرنے کا تہیہ کیا تو فیض محمد صاحب سے بڑھ کر ہمہ جہتی معلومات رکھنے اور بے تکان
نے والا کوئی نظر نہ آیا اور انہی کو اس شعبہ کا معتمد مقرر کیا گیا۔ چنانچہ وہ اس کام میں ایسے کھو گئے کہ گھر والے بیوی
ملازمت کی بھی فکر نہ رہی۔ مجبور کر کے رخصت کی درخواست دلائی اور محکمہ سے نصف تنخواہ پر رخصت منظور
مدعرصہ تک ادارے سے اس کا تکملہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ کئی سال اس طرح انھوں نے ادارے میں گزار دیئے
سے لے کر اہلکار اور چپراسی تک کا کام کرنے میں بھی دریغ نہیں کیا۔ وہ دُھن کے پکے تھے لیکن بعض اوقات
سے جی اچاٹ ہو جاتا تو اپنے مذکورہ بالا دوستوں کے یہاں پہنچ جاتے اور دو دو تین تین دن اپنے کام اور
سے غائب ہو جاتے۔

افسوس ہے کہ حیدرآباد میں ۱۹۴۶ء سے جو سیاسی طوفان شروع ہوا وہ جیسے جیسے بحرانی کیفیت میں مبتلا ہوتا
دو انسائیکلوپیڈیا کا کام پیچھے پڑتا گیا۔ اس وقت کے عہدہ دار اس کی اہمیت سے واقف نہ تھے یا واقف ہونا نہیں
ے۔ امداد اور ہمت افزائی کے فقدان سے فیض محمد صاحب اور ارباب ادارہ کا دل کھٹا ہو گیا۔ آخر کار فیض محمد صا
ملازمت میں رجوع ہو گئے اور تعلیمات کی مدرسی سے ترقی کر کے اس وقت کے وزیر تعلیم کے پرسنل مددگار بن گئے۔
یہ سیاسی بحران ختم ہوا اور وہ وزارت ٹوٹ گئی تو فیض محمد صاحب پھر اپنی قدیم خدمت مدرسی پر لوٹا دیئے گئے
کہ ۲۱ر دسمبر ۱۹۵۵ء میں صبح ۹ بجے ان کا انتقال ہو گیا۔

فیض محمد صاحب نے متعدد کتابیں لکھیں جن میں سے اکثر ادارۂ ادبیات اُردو کی طرف سے شائع ہوئیں۔ وہ ایم ایڈ
تعلیم و تدریس کے اصولوں پر ماہرانہ دسترس رکھتے تھے۔ ایک کتاب مصلحان تعلیم لکھی تھی جو تقریباً پچیس (۲۵)
شائع ہوئی۔ مسولینی اور ابن سعود کے حالات زندگی پر بھی دو کتابیں شائع کیں۔ ادارے نے جب بالغوں
معلوماتی کتابوں کا سلسلہ شروع کیا تو فیض محمد صاحب نے "آمدورفت اور سرنگ" "پانی کی کہانی" "عجائب الملک" "تولوا
رفتگاں" اور دیگر متعدد کتابیں اس کے لئے لکھ دیں جو شائع ہو چکی ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا کے لئے سینکڑوں مضامین
ئے۔ نصابی کتابوں اور ان کی شرحوں کا سلسلہ الگ جاری رہا۔ غرض لکھنے اور چھپوانے سے کبھی نہیں گھبراتے اور ہر
ایک نیا کام اور نیا سلسلہ ان کے پیش نظر رہتا تھا۔ زندگی کو رجائی انداز میں دیکھتے اور برتتے تھے۔ ناامیدی
ں پر بھی اگر وہ مضمون لکھتے تو امید اور خوشی و خرمی سے معمور ہو جاتا۔

افسوس ہے کہ ادارہ ایک ایسے باہمت اور شگفتہ ساتھی سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گیا۔

(ڈاکٹر زینت)

مضامین صاف اور خوش خط لکھئے، جواب طلب امور کے سلسلے میں ٹکٹ یا لفافہ بھی بھیجئے (ایڈیٹر)

ادبی رسائل خرید کر پڑھئے۔

ڈاکٹر [illegible]

بلقیس [illegible]

اذنِ سخن

ہو کر [illegible] سکو تو ہو تو بات کر — لفظوں میں گر ندا کا اثر ہو تو بات کر
رنگِ قدیم میں ہو کہ طرزِ جدید میں — تیرا سخن حریفِ تصور ہو تو بات کر
وہم و گماں کی باتیں بنانے سے فائدہ — زندہ حقیقتوں پہ نظر ہو تو بات کر
حق گوئی پہ جو دار و رسن سے ہو ہمکنار — وہ دل وہ حوصلہ وہ جگر ہو تو بات کر
عقل و خرد کے کھوکھلے دعوے فضول ہیں — دامن میں کچھ متاعِ ہنر ہو تو بات کر
جو تیرگیٔ شب سے ہیں سہمے ہوئے بہت — ان کے لئے نویدِ سحر ہو تو بات کر
[illegible] نہ کچھ سفر بیتِ صحرا ئے زندگی — ہاں تو بھی ہم سا خاک بسر ہو تو بات کر
جو زخم دوستوں نے دیئے ہیں انہیں نہ گن — کہتے وہ کتنے ہیں یہ خبر ہو تو بات کر

مقطع ہے بات جب کہ اترجائے دل میں بات
اس بات کا یقین اگر ہو تو بات کر

O

مجاہد شوقی

غزل

تیرے [illegible] کی فضا ساتھ کہاں تک دے گی — یہ صداؤں کی صدا ساتھ کہاں تک دے گی
زیست [illegible] جہاں تک بھی رہا دیکھیں گے — دیکھنا یہ ہے قضا ساتھ کہاں تک دے گی
یہی عالم جو رہا درد کے سناٹوں کا — کوئی آواز بھلا ساتھ کہاں تک دے گی
ہم بھی خوش فہمیٔ حالات کے قائل ہیں مگر — حرفِ تسکین و آنا ساتھ کہاں تک دے گی
اپنا انجام سمجھ کر ہمیں کرنا کیا ہے — تم ہی سوچو کہ جفا ساتھ کہاں تک دے گی
[illegible] — کس کو معلوم ہوا [illegible] ساتھ کہاں تک دے گی
[illegible] — [illegible]
[illegible] — [illegible]

O

میرے آدرش میرے خواب

میرے آدرش [illegible] میری دنیا [illegible]
میری دنیا، میرے آدرش سے ٹکرا [illegible]
میرے خوابوں کی جبیں، خوں میں نہا [illegible]

ہجر کی رات کڑی، سیل کی طرح [illegible]
یوں دھڑکتا ہے کہ مری سانس [illegible]

وصل کے ذکر سے تسکین ہوئی ہے دل [illegible]

بزمِ یاراں میں حدیثِ لب و رخسار [illegible]
رقصِ مے تیز ہو، گرمیٔ [illegible]
تم [illegible] میں [illegible]

جامِ آدرش کے خوں [illegible]
تذکرے ہوں [illegible]

غمِ فرقت ہے [illegible]
[illegible]

O

[illegible]

آزادی کے بعد
حیدرآباد میں افسانہ نگاری

ہندوستان تقسیم ہوا اور پاکستان عالم وجود میں آیا تو ہمارا افسانہ ترقی و تقلید سے اپنی معراج کو پہنچ چکا تھا۔ اس زمانے میں [illegible] زندگی کے حقائق، فن کے احساس اور شخصیت کی انفرادیت کا [illegible] ہے۔ کچھ شک نہیں [illegible] ہیں جنہوں نے [illegible] اس حقیقت کو پوری طرح پہچان [illegible] زندگی کے [illegible] فن کی کاوش، [illegible] اپنی ذات کے [illegible] ہوتی۔ چنانچہ اس دور کا ہر افسانہ نگار زندگی اور فن کے [illegible] امتزاج کا ترجمان اور عکاس ہے۔ اس [illegible] فن کی [illegible] ہیں وہیں [illegible] بھی پائی جاتی ہیں۔

۱۹۴۷ء سے [illegible] افسانوں کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ عہد بلاشبہ ہماری افسانہ نگاری کا عہد زریں ہے۔ اس عہد کے [illegible] عباس حسینی، حجاب امتیاز علی، مجنوں گورکھپوری، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، [illegible] کے علاوہ غلام عباس، حسن عسکری، ممتاز مفتی، احمد ندیم قاسمی، [illegible] مسرور، خدیجہ مستور، قرۃ العین حیدر، ممتاز شیریں، [illegible] الرحمٰن، [illegible]، آغا بابر کے نام ملتے ہیں۔

حیدرآباد میں جن لوگوں نے آزادی کے بعد افسانہ نگاری شروع کی ان میں اقبال متین، جیلانی بانو، واجدہ تبسم، عاتق شاہ، [illegible] ابراہیم شفیق، عفت موہانی، آمنہ ابوالحسن، اور نعیم زبیری کے نام قابل ذکر ہیں۔ اگرچہ عاتق شاہ، ابراہیم جلیس، اقبال متین [illegible] انسان کے دکھ درد کی [illegible] دیتی ہے۔

افسانہ فن کی [illegible] تقسیم کے [illegible] روایات کے [illegible] اور ایک [illegible]۔ لیکن [illegible] [illegible] [illegible]

ہے۔ اجڑی ہوئی گودیں' اجڑتے ہوئے سہاگ اور لٹتی ہوئی عصمتوں کے افسانے لکھے۔ لیکن تقسیم کے اس المیہ کو پیش کرنے کے رجحان کی وسعت تو
ایک بہتا ہوا ہی تھی۔ دوسرے یہ کہ بعض نے تہذیبی سطح پر بھی پیش کئے گئے۔ اس کے بہترین علمبردار قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین ہیں۔ حیدرآباد کے بھی بیشتر
لکھنے والے فنکاری کی بہ پہلو ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کے ہاں خیالی اہمیت فرد کو حاصل ہے۔ یہ زندگی کے غیر مرئی یعنی زیادہ حقیقی حقائق کو پہچاننے کی
کوشش کرتے ہیں۔ ایسے افسانہ نگاروں میں جیلانی بانو' واجدہ تبسم' عفت موہانی' ابراہیم شفیق' عوض سعید' اکرام جاوید' نعیم زبیری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان
لوگوں میں علاقائی رجحان بہت زیادہ پایا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے بلونت سنگھ پنجاب کے سچے عکاس ہیں۔ یا کرشن چندر بمبئی کی بھاگتی ہوئی زندگی کے۔

احتشام حسین لکھتے ہیں "اگر اس وقت کے افسانہ نگاروں نے فسادات پر افسانے لکھے تو تعجب کی کیا بات ہے۔ ہر تخلیقی کام کرنے والا مواد اور
موضوع کے لئے یا تو ماضی میں جائے گا یا مستقبل یا حال میں رہے گا۔ جب وہ ماضی میں جائے گا تو اس کا مواد اور پیشکش کے طریقے مختلف ہوں گے۔ جب وہ
مستقبل میں جائے گا تو تخیلی کارنامے پیش کرے گا۔ اور جب اپنی دنیا کو پیش کرنے کی کوشش کرے گا تو اپنے آپ کو ان اہم واقعات سے جو اس کے گرد و پیش
ہو رہے ہیں' بچا نہیں سکے گا۔"

۱۹۴۷ء کے بعد جو مسائل پیدا ہوئے تھے تو جلسی موضوعات کم ہو چکے تھے۔ فن کے ساتھ پورا خلوص برتنا' اسے پوری سنجیدگی اور انہماک کے ساتھ ماحول
اور شخصیت کے عناصر کے ساتھ ہم آہنگ کرنا' افسانہ نگاروں کا معمول بن گیا تھا۔ وہ ہر افسانہ لکھنے سے پہلے اسے اپنی شخصیت کے جذباتی فکری اور تخیلی عناصر
میں پوری طرح رچا کر پھر قدم اٹھاتے تھے۔ کچھ پرانے افسانہ نگاروں نے لکھنا بند کر دیا تھا اور کچھ افسانہ نگار بہت کم لکھ رہے تھے۔ اور نئی پود بڑی
ہی شدت سے یہ محسوس کر رہی تھی کہ فسادات افسانے کا اچھا موضوع نہیں ہیں۔ اور زندگی صرف تلخیوں کا نام نہیں اس میں کہیں کہیں لذت' شیرینی
اور حسن بھی ہے اور یہ حسن سب سے زیادہ مظاہر قدرت میں نمایاں ہے۔

آزادی کے بعد افسانوی افق پر ابھرنے والے ستاروں میں اقبال متین سب سے پہلے اور تابندہ ستارے ہیں۔ متین کی ادبی زندگی کا آغاز
ایک شاعر کی حیثیت سے ہوا۔ بعد میں وہ افسانہ نویسی ہی کے ہو کر رہ گئے۔ یہ لگ بھگ ۱۹۴۸ء کی بات ہے۔ متین کے متعلق مرزا ادیب کا خیال ہے کہ
"وہ ذہنی طور پر اس دبستانِ فکر سے متعلق ہیں جسے دبستانِ رومانیت کہا جا سکتا ہے۔ لیکن ان کی بعض اہم کہانیاں بے رحم حقیقت نگاری کی کامیاب
مثالیں ہیں"۔ محمود ہاشمی نے کہا تھا "متین کی کہانیوں میں زندگی کے حسن اور اس کی ڈھکی چھپی قباحتوں اور فرد اور سماج کی کشمکش کی نقاشی اور
پردہ کشائی بڑی چابکدستی سے کی گئی ہے۔ اس کی کہانیاں سماجی ناانصافیوں سے نفرت' انسان سے ہمدردی اور زندگی سے پیار کرنا سکھاتی ہیں"۔
متین کے کئی چار افسانوی مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ جن میں "اجلی پرچھائیاں" "تم بھی" افسانہ میں بھی کہانی' بے حد مقبول ہوئے۔ متین کا اپنا رنگ
انداز ہے اور وہ آج بھی پوری جانفشانی سے لکھتے ہی جا رہے ہیں۔

اور سات کتابوں کے مصنف عاتق شاہ نے بھی لگ بھگ اسی زمانے میں افسانہ نگاری کا آغاز کیا۔ مائی ڈیئر شکنتلا' عاتق شاہ کا پہلا افسانوی
مجموعہ ہے جس پر حکومت آندھرا پردیش نے ۱۹۵۳ء میں پہلا انعام دیا۔ اس کے بعد ہفت پاتال کی شہزادی' ایک وقت کا کھانا' اندھیری' عابد روڈ
سے سکندرآباد اسٹریٹ تک' "چالیس قدم" اور خالی ہاتھ --- طیب انصاری لکھتے ہیں' عاتق شاہ کے اندر اپنے وطن کے لئے جو جذبہ ہے وہ
اس کے تنہا ملک نہیں ہے .... وہ ہماری ٹوٹتی جڑتی تنہائیوں کا ترجمان ہے۔ وہ ہماری زبان و تہذیب کا خادم ہے۔ وہ اسی سرزمین کی خاک
کا ہے اور اسی خاک کو آسمان کرنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔

"خالی ہاتھ" میں عاتق شاہ نے لکھا "..... لیکن اس زندہ حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ آزادی کے بعد اردو ایک جنم بھومی اور اپنے

ہے ایک بیضوی کی طرح آوارہ گھوم رہی ہے "
یہ حقانی شاہ ایک شخص کا نام ہوتے ہوئے بھی صرف ایک شخص کا نام نہیں ہے ۔ کردار اور جذبے کا نام ہے ۔ ایک ایسا کردار جو عام طور پر
ہر شہر میں فٹ پاتھ پر چلتا اور سڑکوں پر مل جاتا ہے ۔

جیلانی بانو نے اس وقت لکھنا شروع کیا جب ادب میں موضوع کم ختم سے ہو رہے تھے ۔ یعنی وہ ایک خاص فضا نہیں تھی جب موضوعات
ا ہے ۔ اور شاعروں اور افسانہ نگاروں کی بن آتی ہے ۔ جیلانی بانو حیدرآباد کی واحد خاتون افسانہ نگار ہیں جنہوں نے ہر نقاد کو اپنی طرف متوجہ کیا ۔
اپنے فن کی داد وصول کی ۔ " روشنی کے مینار " اور " نروان " بانو کے دو افسانوی مجموعے ہیں جن میں کچھ کہانیاں وقتی تاثر کے تحت لکھی گئی ہیں ۔
یاروں کے مجبور کیے ہے ۔ ان کہانیوں کا محور آندھرا کی سرخ مٹی اور نیلے پتھروں والی خوبصورت دھرتی ہے ۔ اس فضا نے انہیں قلم کی اہمیت
نئے نئے موضوع دیئے ۔ " موم کی مریم " ، " تلچھٹ " ، " ایک انار " ، " آگ اور پھول " ، " دیوداسی " وغیرہ ایسی کہانیاں ہیں جو سب سے زیادہ پسند کی گئیں ۔
اور مختلف انتخابی سلسلوں میں منتخب کی گئیں ۔

اپنی افسانہ نگاری کے بارے میں خود بانو کا خیال ہے " اگر میں زیادہ غور سے دیکھیں تو میری افسانہ نگاری پر آن آبیاؤں کی چھاپ بھی
نگر علم و تہذیب کے چراغ جلاتے پھرے ۔ ایران و عجم کی ثقافت بھی میرے خون کا جزو ہے جو میرے آباؤ اجداد اپنے ساتھ لائے تھے ۔

اس طرح تقسیم ہند کے بعد اردو افسانے میں جو نئے فن کار ابھرے ہیں ان میں حیدرآباد کی ملک جیلانی بانو کا نام سرفہرست ہے ۔ اس عرصہ میں
جو مقام پیدا کیا وہ کہنہ مشق فن کاروں سے زیادہ مسلّم اور پائیدار ہے ۔ اور جس میں انفرادیت کو بہت زیادہ دخل ہے ۔ انہوں نے اردو افسانے
میں پیدا کیں اور اسے نئی منزلوں سے ہمکنار کیا ۔ آج کا افسانہ بانو کے بغیر نامکمل رہے گا ۔ آج کے افسانوں کا کوئی بھی انتخاب بانو
کے بغیر نامکمل کہلائے گا ۔ ان کے ابتدائی افسانوں میں بڑا بالغ اور پختہ شعور ملتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ بڑا نکھرا ہوا سماجی شعور بھی ۔ وہ تنقیدی نظر رکھتی
ہیں اور اپنی ہر تخلیق کو اس پر پہلے جانچ کر پیش کرتی ہیں ۔ عورت ان کا محبوب موضوع ہے اور ان کا آئیڈیل بھی ۔ وہ ہندوستانی عورت
سے ہمدردی رکھتی ہیں ۔ اس پر ظلم برداشت نہیں کر سکتیں ۔ بلکہ اسے موجودہ سطح سے اوپر لا کر اسے پاک بنانا چاہتی ہیں ۔ چنانچہ وہ اسی سلسلہ میں
لکھتی ہیں "

" میں نے یہ کہانیاں نہیں لکھیں ، تین لکیریں کھینچی ہیں ۔ تاکہ دنیا کی سب بیٹیاں امن اور حفاظت کے حصار میں رہیں تو
رہیں اور ساری دنیا کے راونوں کی آنکھوں میں مرچیں بھر کر انہیں الٹا لٹکا دیا جائے ۔ یہی میری کہانیوں کا اولین ہے "

" موم کی مریم " جو فلش بیک کی تکنیک پر لکھا گیا ہے بہت ہی شاندار اور موثر افسانہ ہے ۔ " نغمہ کی جہاد آتی " بانو کا ہے اس کے علاوہ
لکھے گئے ہیں جس میں بانو نے عورت اور خصوصاً ہندوستانی عورت کو مختلف روپ میں پیش کیا ہے ۔ بانو کے کردار میں موضوع اور
طبقے کی شکست اور بیدار ی جینے کی امنگ اور الجھن ہے ۔ ہر افسانہ ختم کرنے کے بعد قاری کچھ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے ۔
معلوم ہوتے ہیں کہ " وہ سماج کا مطالعہ نہایت ہمدردی اور خلوص کے ساتھ کرتی ہیں اس لئے وہ کردار اور سماج کی تصویر کشی کر کے سامنے
لانے میں زیادہ کامیاب ہیں ۔ معاشرہ پر تنقید کرتے ہوئے وہ افراد کا داخلی کردار بھی ہمارے سامنے مخصوص انداز میں پیش کرتی ہیں "
جیلانی بانو کی افسانوں میں سماجی اور زندگی جیسی کہانیوں میں مذہبی ڈھکوسلے ، فرسودہ رسومات اور ضعیف الاعتقادی کا اس طرح تجزیہ کیا ہے
اپنی ایک کہانی " تین " میں واقعات کو مکالمہ اور خود کلامی کے انداز میں پیش کیا ہے ۔ مرکزی کردار ...

نعیمہ جمال صاحبہ نے مختلف عنوانات کے تحت اپنی زندگی کے تجربات کو افسانوں میں پیش کیا ہے۔ [illegible] کے تاثرات جن کا تعلق ان کے ماحول سے ہے دلچسپ بھی ہیں۔ وہ خواب بھی دیکھتی ہیں جن کو [illegible] کے پھول [illegible] سے [illegible] بہت [illegible] کے مقابلے میں کچھ خلوص ہے۔ اس کے علاوہ ایسا بھی ہے جو کہ [illegible] کی [illegible] کو [illegible] دیا ہے۔

واجدہ تبسم نے [illegible] سے لکھنا شروع کیا۔ وہ تین چار سال میں "شہرِ ممنوع" "کیسے سمجھاؤں" "[illegible]" جیسی کہانیاں [illegible] کی وجہ سے وہ مختلف نگاروں کی صفوں میں نمایاں ہوگئی ہیں۔ ان کا ایک [illegible] "[illegible]" "[illegible]" [illegible] شائع ہو چکا ہے۔ واجدہ کے "شہرِ ممنوع" کے افسانے فن پر [illegible] کی [illegible] معلوم ہوتے ہیں [illegible] ہے [illegible] کی خصوصیات [illegible] ابھر کر سامنے آتی ہے۔ اور مصنفہ کا نظریہ [illegible] کے [illegible] پردوں میں [illegible] پیچیدہ شکل اختیار کر لیتا ہے۔ انہوں نے سماج کے مختلف طبقوں کی زندگی پر ایک خاص زاویے سے نظر ڈالی ہے۔ ان کا افسانہ "[illegible]" انداز بیان اور اسلوب کے لحاظ سے بہت ہی دلکش افسانہ ہے قاری ان کے افسانے کے ماحول میں بری طرح کھو جاتا ہے۔ اسے [illegible] اس ماحول کا ایک جزو محسوس کرنے لگتا ہے۔ —— "دیوار گر گئی ہے بیٹا" [illegible] اب پار ہی نہیں —— دیوار [illegible] عظمت گر جاتی ہے۔ دیوار گرتی ہے تو عظمت بھی گر جاتی ہے۔ [illegible] کے ساتھ وہ [illegible] وہ پیار بھی گر جاتا ہے جو اس [illegible] کے ذرے ذرے [illegible] ہے" اس افسانے میں [illegible] آیا ہے۔ [illegible] گر رہا ہے۔ [illegible] ہے۔ دیوار [illegible] ہیں پھر بھی [illegible] کو یہ یقین ہے کہ ان کے [illegible] سے پھر [illegible] تو [illegible] پھر سے کھڑی ہو سکتی ہیں۔"

[illegible] کہانیوں کی خالق واجدہ تبسم کے قلم نے چند سال قبل ایک کروٹ لی۔ اور انہوں نے حیدرآباد اور حیدرآباد کے [illegible] نوابوں کی [illegible] سے اینٹ بجادی تھی۔ یہیں انہوں نے جنس نگاری کو بھی اپنایا۔ اور ان کے قلم سے ایسے ایسے افسانے [illegible] ہوئے جو ہر لحاظ سے [illegible] کہے جا سکتے ہیں۔ "[illegible]" ان کا دوسرا مجموعہ ہے۔ تیسرا افسانوی مجموعہ "اترن" خالصتاً جنس [illegible] ہے۔ جس میں انہوں نے حیدرآباد کے نوابوں اور عیاشیوں کو مزے لے لے کر بیان کیا ہے۔ انہوں نے [illegible] کی دیگر خوبیوں کا تو کہیں ذکر نہیں کیا۔ [illegible] یہ [illegible] کی کہ حیدرآباد کے [illegible] پرست تھے اور عورت ان کی [illegible] تھی۔

[illegible] "[illegible]" [illegible] ماحول کو پیدا کرتی ہیں۔ ان کے متعلق یہ بحث کہ وہ فنی نقطہ نظر سے اچھی یا بری ہیں، اتنی اہم نہیں ہے جتنی یہ بحث کہ ان کا استعمال فن کے لئے اچھا ہے یا برا؟ مختصر افسانے میں جو چیز قاری پر اس قدر اثر انداز ہوتی ہے اس کی اہمیت [illegible] ہے۔ کیونکہ [illegible] کسی مختصر افسانے کا ہوگا اتنا [illegible] اس کا افسانہ قابل [illegible] ہوگا [illegible] خیالات کے [illegible] مختصر کہانیوں سے نوجوانوں اور لڑکیوں کے اخلاق پر برا اثر پڑتا ہے۔ اس قسم کے افسانوں میں [illegible] ہیں [illegible] کہانی کی خصوصیت ہوتی ہے۔ ایک [illegible] اپنے [illegible] کا اظہار نہایت [illegible] کرنا چاہیے اور وہ بھی [illegible] ہے۔ [illegible] مختصر افسانے کو عظمت بخشتی ہے۔

[illegible] نے اس [illegible] پہلا قدم اس وقت اٹھایا جب اردو افسانہ [illegible] ہو چکا تھا۔ [illegible] اور [illegible] بھی [illegible] تھے۔ [illegible] اسالیب [illegible] [illegible]

[illegible] گی اجارہ داری ختم کی۔ پھر اسے اپنا خاص فن بنا لیا۔ حیثیت سے دلچسپ نے ان سے بہت سی کہانیاں لکھوائیں۔ جن [illegible]
گل، شیریں کا ہیولا، "شب سہ پہر اور انجم" ہیں۔
[illegible] ہیں۔" ان کی کہانیوں کا محور ساجی زندگی کے وہ مسائل ہیں جن سے متوسط اور نچلے طبقے کے [illegible]
مسائل نئے ہیں اور نہ ان کا ردعمل ہی نیا ہے۔ لیکن عوض انہیں اس ڈھنگ سے پیش کرتے ہیں کہ ہم ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں
مشاہدے میں گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی۔ یہی وجہ ہے کہ بعض وقت وہ ایسے گوشوں کو اجاگر کرتے ہیں جن تک عام ذہن کی رسائی

کے دو افسانوی مجموعے "سائے کا سفر" اور "میرا مجسمہ" منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان کے کردار اسی معاشرے کی پیداوار ہیں جس میں آپ ہم
ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ زندگی لمحہ بہ لمحہ تیزی سے بدلتی جا رہی ہے۔ ادبی زندگی کی ترقیوں نے جن تقاضوں اور خواہشوں کو جنم دیا [illegible]
ن تجربات و مشاہدات سے دوچار ہوا ہے یہ کہانیاں ان ہی کی تفسیر ہیں۔ ان کا موضوع وہ انسان نہیں جو کسی احتجاج یا ضد کے [illegible]
۔ وہ انسان بھی نہیں جو کسی طرزِ حیات یا عقیدے کی نشاندہی یا نمائندگی کرتا ہے۔ ان کی کہانیوں کے کردار معمولی افراد ہیں۔ ان کا [illegible]
ن کہانیوں کی تخلیق کا محرک بنا ہے۔ اور یہی وہ وصف ہے جو تجسس کا عنصر ابھار کر شخصیت اور خود کہانی کو دلچسپ بناتا ہے۔
نیوں میں کرداروں کا مطالعہ خارجی نوعیت کا ہوتا ہے۔ وہ کرداروں کو بالعموم دوسرے شخص کے نقطۂ نظر سے پیش کرتے ہیں۔ [illegible]
اس طریقے سے انحراف کیا گیا۔ "پہلی تنخواہ" میں عبدالصمد کی کردار کشی ایک ہمہ داں راوی کے نقطۂ نظر سے کی گئی ہے۔ یہ ایک
ہے۔ اس میں کردار کے خارجی احوال کے ساتھ ذہنی کیفیات اور داخلی کشمکش کو بھی ابھارا گیا ہے۔
[illegible] کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو "اُسے اپنے کپڑے تقسیم کرنے سے زیادہ اس بات کا دکھ تھا کہ اس نے جو کپڑے تقسیم کئے تھے
بوسیدہ تھے۔ جو کسی طرح ایک دو دفعہ سے زیادہ پہننے کے قابل نہ تھے۔ اسے اس بات کا بہت رنج تھا کہ وہ اپنے ان [illegible]
گیا تھا۔ اگر وہ وہاں نہ گیا ہوتا تو وہ لوگ یہ کیوں کر سمجھتے کہ وہ تقسیم کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اور اس محفل میں اپنی ساکھ قائم رکھنے
کے کپڑے تقسیم کر دیئے کہ کہیں دو اطلاع کے نچلے طبقے کے لوگ یہ نہ سمجھیں کہ وہ کچھ لا دینے کے بعد بدل گیا ہے۔"
کے اسلوب میں بڑا تنوع ہے۔ ان کی ذات میں شاعر کی طرح ہر چیز سے متاثر ہونے، ہر خوشی یا غم میں شریک ہونے اور [illegible]
[illegible] ہو جانے کا خداداد ملکہ ہے۔ تاثر کی شدت ہر ادبی تخلیق کو انتہائی بلندی پر لے جاتی ہے۔ تاثر ہی کی شدت سے بیان میں [illegible]
ہے۔ عوض محمد بڑی فنکاری سے۔ مخلص افسانہ نگار اپنے افکار سے اس قدر متاثر ہوتا ہے کہ اس کی تخلیق گویا اس پر طاری ہو جاتی ہے
اس کا بیان بے پناہ زور اختیار کر لیتا ہے۔ اور فن کی تمام خوبیاں مرکوز ہو کر ایک نقطے پر آ جاتی ہیں۔
[illegible] لکھتے ہیں "عوض سعید نے کرداروں کی تصویر کشی میں جزئیات نگاری سے زیادہ کام نہیں لیا۔ چند آڑے ترچھے خطوط کھینچ
[illegible] ہیں لیکن ہر خاکہ اتنا جاندار ہوتا ہے کہ تصویر بول اٹھتی ہے۔"
[illegible] کہانی کی پہلی شرط اس کا بیان ہے کہ وہ دلچسپ ہو۔ ساتھ ہی کہانی لکھنے والے میں یہ ہنر ہونا چاہیے کہ وہ حقیقت کو [illegible]
ہے۔ عوض کو اس ہنر پر پوری دسترس حاصل ہے کہ وہ پہلے ہی جملے سے قاری کے ذہن میں تجسس پیدا کر دیتے ہیں [illegible]
[illegible] ہیں۔ وہ قاری کے تخیل کو مختلف امکانات پر غور کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیتے ہیں۔ لیکن [illegible]

[illegible]

[illegible] ہیں ، [illegible]

[illegible] ۔ یعنی ان کا فلسفہ حقیقت ہی [illegible] [illegible]
[illegible] انسانی فطرت کے مرکب تہ دار [illegible] کا انتخاب کرتا ہے [illegible] ایسے آ گئے ہیں [illegible]
[illegible] ـــــ غرض [illegible] ان چند افسانوں میں سے ہیں جن [illegible]
اور [illegible] میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے ۔ وہ کہانی کے [illegible] رکھنے کے علاوہ بیان کی [illegible] کی اعلیٰ
[illegible]

[illegible] افسانہ نگاروں کے نام [illegible] ان میں آمنہ ابوالحسن اور [illegible] قابل ذکر ہیں ۔ عفت حمید
[illegible] مستقل لکھتی ہیں ۔ ان کے کئی ناول شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں ۔ وہ بیسیوں افسانوں کی خالق ہیں ۔ [illegible] تقریباً تمام [illegible]
[illegible] ان کا انداز بیان نکھرا ، سنورا اور لطیف ہوتا ہے ۔ عفت کی شخصیت [illegible] اکثر [illegible] میں جلوہ گر ہوتی ہے ۔
[illegible] آمنہ ابوالحسن بھی اہم مقام رکھتی ہیں ۔ ان کی تین کتابیں " کہانی " ، " سیاہ ، سرخ ، سفید " اور " تم کون ہو "
[illegible] بہت سے خوبصورت افسانے لکھے اور سائنسی موضوعات کو بھی اپنایا ۔ " اژدہان " ان کے چند بہترین افسانوں میں سے
ایک [illegible] ہر لحاظ سے کامیاب افسانہ کہا جا سکتا ہے ۔ آمنہ کے یہاں زندگی کی [illegible] تبدیلیوں کا احساس بھی ہے اور [illegible]
[illegible] کی [illegible] بھی ۔

اکرام [illegible] نے افسانہ نگاری کی ابتدا آزادی کے بعد ہی کی ۔ اس زمانے میں ادب پر ترقی پسند تحریک کا غلبہ تھا ۔ [illegible]
[illegible] انہوں نے بھی [illegible] جیسے موضوعات کو [illegible] ۔ " [illegible] " ، " [illegible] " [illegible]
[illegible] ۔ [illegible] کے بیچ [illegible] ہیں ۔ " زندگی [illegible] نے دیکھا
[illegible] ۔ [illegible] " انسان " " میری محبت کا مرکز " [illegible] ـــــ ابراہیم [illegible] نے سائنسی موضوعات کو اپنایا ۔ [illegible]
[illegible] " [illegible] " [illegible] انسانی [illegible] " [illegible] " [illegible] نفسیاتی [illegible] مسائل [illegible] ان کے موضوعات [illegible]
[illegible] " کون بڑا ہے " " پھول رو رہے ہیں " ، [illegible] " [illegible] " " [illegible] " [illegible] ہیں [illegible]
[illegible] ان کے کامیاب افسانے ہیں ۔ [illegible]
[illegible] ہے ۔ یہ دنیا کا شہری [illegible]
[illegible] ۔ [illegible]
[illegible] ایک نئی راہ تلاش کی ہے ۔ اب ان کا فن عمری [illegible] سے زیادہ ہم آہنگ ہو گیا ہے ۔

[illegible] انہوں نے [illegible] ۔ [illegible]
[illegible] بعض ناقدین کا خیال ہے کہ [illegible]
[illegible] مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ عشق میرا بنیادی موضوع نہیں رہا ۔

[illegible]

نقش کیا کرتے ہیں [illegible] اکثر ہم لوگ
پردۂ تحیر میں جب دیکھتے ہیں منظر ہم لوگ

اپنی ہستی کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے
رہتے ہیں اپنے تعاقب میں برابر ہم لوگ

[illegible] فرصت ہی کہاں ہے کہ کہیں آ کر یہاں
ٹال دیتے ہیں غم زیست کو ہنس کر ہم لوگ

زاویہ اپنا نگاہوں کا بدل کر دیکھو
عہد رفتہ کے نہیں ہیں کوئی منظر ہم لوگ

ایک وہ بوند کی، کیا پوچھتے ہو گنجائش
اپنی پلکوں میں چھپا لیتے ہیں ساگر ہم لوگ

[illegible] لیتی ہے جو قدموں کے [illegible]
ایسی منزل کو لگا دیتے ہیں ٹھوکر ہم لوگ

غزل

[illegible]

اپنی ادا سے آپ ہی [illegible] ہو گیا
وہ آئینے کو دیکھ کے [illegible]

مجھ سے بچا کے [illegible] کو نہ سکے
اک آئینہ تھا [illegible]

ہر وقت تیری یاد ہے ہر دم ترا خیال
ملنا مجھے [illegible]

[illegible] تو ہم [illegible]
اپنی تو زندگی کا یہ [illegible]

[illegible] حیات [illegible] تحقیق کی مگر
[illegible] اپنی عقل سے [illegible]

[illegible]

[illegible] تنظیر [illegible]

[illegible]

جو وہ تھا مجھے جمال میرا تھا
[illegible] میرا تھا

[illegible] کہ وہ بھی بچھڑ گیا مجھ سے
[illegible] ایک ہم عنان میرا تھا

[illegible] میرا غم ہوا اکثر
[illegible] وہ جلال میرا تھا

[illegible] تھا جس نے مجھے کیا گمراہ
[illegible] میرا تھا

[illegible] میرا قتل ہوا
آپ کا تھا یا گمان میرا تھا

[illegible]

لئیق صلاح

خدا بخشے

حکیم صاحب (علامہ حکیم کبیر الدین) سے غائبانہ تعارف ۱۹۶۲ء میں ہوا۔ لیکن اُن سے ہم [illegible] نہیں ملا پائے تھے۔ حسنِ اتفاق کہیے کہ ایک سال بعد انھیں قریب سے دیکھنے کا شرف حاصل ہوا۔ تعلقات یا مراسم دیرینہ تھے وہ قریباً بھابی کی بہن اُن کی بہو تھیں۔ شادی میں ملاقات تو نہیں ہوئی تھی، صرف تصاویر میں اُن کی جھلکیاں ضرور دیکھی تھیں۔ امتحان کے سلسلہ میں علی گڑھ جانا پڑا۔ بالکل آخری وقت ہاسٹل والوں نے اطلاع دی کہ خانگی امیدواروں کے لئے وہ کوئی انتظام کرنے سے قاصر ہیں۔ بڑی پریشانی کا عالم تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کریں۔ کوئی دور اور نزدیک کا رشتہ دار وہاں نہیں تھا جس کے پاس چند دن قیام کی سہولت میسر آتی۔ بہرحال! اسی عالمِ بے کسی میں بھابی کے بہنوئی ڈاکٹر جمال نے کچھ امید بندھائی۔ انھوں نے کہا کہ وہ اپنے والدین سے دریافت کر لیں گے کہ وہ ہمارا وہاں رہنے کا انتظام کر سکتے ہیں کہ نہیں۔ بالآخر اُن کو اطلاع دی گئی اور انھوں نے خوش آمدید کہا۔ میرے ساتھ ایک اور لڑکی تھی۔ ہم نے امتحان سے دو دن قبل وہاں پہنچنے کا پروگرام ترتیب دیا تاکہ سفر کی تھکن دور ہو سکے۔

جیسے ہی ٹرین اسٹیشن پہنچی، چند لڑکے ڈبے کے پاس آئے۔ اور دریافت کرنے لگے کہ "کیا آپ حیدرآباد سے آئی ہیں"۔ "علی گڑھ" کے متعلق بہت سی روایات مشہور ہیں اور جانے سے قبل بہت ساری باتوں سے ہم واقف ہو چکی تھی جن میں سے ایک مشہور [illegible] بات یہ تھی کہ وہاں کے طلبا باہر سے آنے والی لڑکیوں کا خوب مذاق اڑاتے ہیں۔ ہم نے اُن لڑکوں کے اس "سوال" کو ہم نے اسی نظر سے دیکھا اور بالکل سادگی سے نفی کا جواب دیا۔ تصور یہ تھا کہ وہ تصویر والی صورت یہاں نظر آئے گی۔ اب ہم نے ادھر اُدھر دیکھنا شروع کیا۔ یکایک وہ چہرہ سامنے آیا۔ اور پھر اُن کے ساتھ وہی نوجوان لڑکے۔ [illegible] حکیم صاحب [illegible] ایک ایک لمبے [illegible] آ رہے ہیں۔ ہم نے اپنے ساتھی سے کہا یہ ہی وہ حکیم صاحب ہیں۔ اس دفعہ جب اُن لوگوں نے دریافت کیا تو ہم نے کہا "ہاں! ہم حیدرآباد سے آئے ہیں"۔ جملہ ختم ہونے بھی نہ پایا تھا کہ وہ لوگ ڈبے میں آئے اور فوراً ہمارا اسباب اٹھانے لگے۔ حکیم صاحب نے اپنا حسب [illegible] تعارف کرا کر مزید تشفی کر دی۔ تقریباً دو بجے دن ہم اُن کے مکان پہنچے۔ مکان کیا تھا۔ ایک عالیشان [illegible] جو وہاں کے امرا کی ایک [illegible] اور [illegible] تصویر تھی۔ وہ "[illegible]" کے نام سے مشہور تھا۔ علی گڑھ کا [illegible] اور تصویر محل اُس کے [illegible] خصوصاً وہ حصہ جس میں حکیم صاحب فروکش تھے۔ وہ اس عمارت کا سب سے [illegible] کہا جاتا ہے کہ وہ "مہمان خانہ" تھا۔ ایک کافی کشادہ ہال جس کی چھت بہت بلند اور نقش و نگار [illegible] کے [illegible] چار چاند لگا دیے۔ یہ مبالغہ آرائی نہیں بلکہ حقیقت ہے "ہال" تو اس قدر [illegible] مناسبت سے [illegible] تھے وہ [illegible] سمجھتے تھے۔ اس عیب [illegible] لوگوں نے [illegible]

سے کی [illegible] سے بکھاو [illegible] سے نکالتے تھے جس سے وہ [illegible] بادی النظر میں اپنی اصل سے اونچے دکھائی دیتے تھے۔

حکیم صاحب کی بیگم صاحبہ یعنی "اماں جان" اور اُن کی بھتیجا [illegible] نے خوش اور گرمجوشی سے خیر مقدم کیا۔ غسل خانے میں پانی تیار تھا نہانے سے فارغ ہوتے ہی میز پر کھانا چن دیا گیا۔ تسلی کیجئے کہ تکلف برطرف تھا کھانے پر حکیم صاحب کی فرمائش [illegible] ہو گئی۔ بہ سے کہنے لگے "بیٹو! [illegible] تم نے تو ہمیں بے حد پریشان کیا۔ ہم یہی خوش آتا تھا کہ تم کی ہر بات کا خوب [illegible] ہے۔ مزید پریشانی کا باعث تمہارا انکار کر کے بیٹھنا باری نہیں۔" تب ہم نے صراحت کر دی کہ حقیقت چھپانے کا محرک کیا تھا۔ اس پر [illegible] زور دار قہقہہ لگایا اور کہنے لگے۔ اب تو ان لڑکوں سے کچھ ان کا کر خوب کھینچائی ہو گی وہاں کی مخصوص زبان میں شرمندگی کو کچھ [illegible] کھانا ختم ہوتے ہی وہیں میز پر گرم گرم چائے آ گئی۔ پھر ہم سفر کا بوجھ اُتارنے کے لئے اپنے کمرے میں دراز ہو گئے۔

شام کے کھانے پہ بے تکلفی میں مزید اضافہ ہوا۔ یوں محسوس ہونے لگا کہ ہم اپنے گھر والوں سے دور نہیں بلکہ انھیں [illegible] ہیں۔ جب ہم مطالعہ شروع کرتے تو تمام گھر پر سکوت طاری ہو جاتا۔ خواہ وہ دن ہو کہ رات۔ اماں جان، عائشہ اور حکیم صاحب آپس میں کسی قسم کی گفتگو نہ کرتے بے حد ضروری امور پہ اگر انھیں تبادلۂ خیال کرنا ہوتا تو وہ بھی سرگوشیوں کے انداز میں [illegible] اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھی رہتیں اور حکیم صاحب اپنے خاص آلات کے ساتھ صحن میں جا نکلتے۔ وہاں انھوں نے ایک چھوٹا سا خوبصورت چمن بنا رکھا تھا۔ "بوگن ویلا" کی بیل سے ایک کمان بنائی تھی۔ گویا یہ اس کی داخلہ گیٹ تھی۔ سمنٹ کی بنی ہوئی دو، تین چوکیاں مختلف زاویوں پر بنی ہوئی تھیں۔ نیچے لان اور چند خوبصورت و نفیس پھولوں کے پودے۔ خود ہی چمن کی تراش خراش، نفاست اور نزاکت سے کرتے تھے۔ [illegible] سرسبز و شاداب چمن کی آبیاری میں اُن کے ہر دلعزیز نوکر نسیم کا بھی ہاتھ تھا۔ پانی پھولوں تک پہنچانا اُسی کا کام تھا۔ وہ بھی ہر ایک اور سے [illegible] تھا۔ غالباً اُس کی یہ ہنر مندی حکیم صاحب کی صحبت کا نتیجہ ہو۔ عموماً ہم کھانے کے وقت "پودوں سے [illegible] بیٹھ کر" پردے کے پیچھے سے مزے مزے کی باتیں کیا کرتے تھے۔ علیگڑھ میں پھر کثرت سے ہوا کرتے ہیں۔ پھر وہ [illegible] استعمال کرنے کے باوجود فوج کی فوج، چھاپہ مار دستوں کی طرح پھر وہاں میں گھس پڑتی۔ اب ہمارا کام یہ ہوتا کہ پڑھنا کم اور پھروں سے حفاظت [illegible] مار دھاڑ شروع ہوتی۔ کتابوں اور کتابوں سے دھڑا دھڑ مارنے لگتے۔ شاید وہ یہ آوازیں سنا کرتا تھا۔ اُس نے دوسرے [illegible] سے کہا "حکیم صاحب! رات خوب تو ہی چلیں۔" حکیم صاحب نے پوچھا۔ کیا مطلب؟ کہنے لگا رات میں پھروں سے [illegible] بول دیا تھا۔ اور وہ اُن کی پٹائی کر رہے تھے۔ ایک دن کہنے لگا کہ حکیم صاحب! حیدرآبادی آچار کھانے سے [illegible] آ گئے۔ اس پر بھی خوب ہنسا اور کہنے لگے "مسٹر! سینما دیکھ کر یہ سب باتیں سیکھا ہے۔" اُس کے ساتھ ہم [illegible] آتے۔ وہ ملازم نہیں بلکہ "بالک" محسوس ہوتا تھا۔

[illegible] کی خصوصیت یہ تھی کہ حکیم صاحب اپنے کام میں مصروف رہتے اور ادھر اُدھر سے [illegible] حکیم صاحب کے پاس کھنچے کھنچے چلے آتے۔ جنوں میں ایک اور حکیم صاحب رہا کرتے تھے۔ اُن سے [illegible] حکیم صاحب کے [illegible] بیٹھے اور دیگر [illegible] حکیم صاحب کے پاس ہوتا۔ [illegible] اور کچھ ہیں تو خوش [illegible] اور [illegible] کی۔ ان تمام لوگوں [illegible] حکیم صاحب کے تعلقات بھی [illegible] لیکن [illegible] حکیم صاحب کا [illegible] تھا۔

[illegible] رہا [illegible] اچھا ہے [illegible] سے منہ

[illegible] تھا۔ ہمیشہ [illegible] اختیار [illegible] DISTURBANCE [illegible] تھا

[illegible] اب وہ [illegible] پھر [illegible] وہ کہاں

[illegible] ایک [illegible] DISTURBANCE [illegible] کیا۔ DISTURBED [illegible] تم [illegible]

[illegible] ایسے تنگ مزاج آدمی [illegible] صاحب تعلقات نہ رکھے

ہوں تو اس میں بڑی [illegible] تھی۔ حکیم صاحب اتنے فراخ دل تھے کہ برائی [illegible] نہیں کی۔ وہ خود [illegible] حکیم صاحب

بیٹھے تو فوراً پہنچتا اور حکیم صاحب سے کچھ دیر گفتگو کرنے کے بعد کہتا کہ چلیے مولانا [illegible] ساتھ چلیں [illegible] صاحب کہتے کہ بابا

[illegible] نہ ہوگی۔ تمہیں اگر بات ہی کرنی ہو تو بیٹھ کر کرو۔ اب یہیں سے مذاق شروع ہوتا [illegible] کے ساتھ گفتگو

[illegible] صاحب میں [illegible] ہوں تو انکار [illegible] مستقبل کی پیش [illegible] مستقل [illegible] میں خرچ [illegible]

[illegible] حکیم صاحب [illegible] خیال۔ [illegible] تاکہ [illegible] آپ تو مجھ پر طنز کرتے ہیں۔ میرا مذاق

[illegible]۔ اس قدر [illegible] مزاج آدمی [illegible] شکایت نہ کرتے تھے۔ [illegible] بات ضرور کرتے۔

حکیم صاحب کا ایک خاص وصف یہ تھا کہ لوگ اُن کا احترام کرتے، لیکن بزرگ [illegible] وہ [illegible] اس عقیدت اور احترام کے

[illegible] ہو [illegible] ہیں۔ اس قدر بے تکلفی اور سادگی سے پیش آتے کہ سن و سال کا اُس وقت خیال تک نہ رہتا۔

[illegible] موسم [illegible] شدید رہتی کہ اچانک CYCLONES چلنے سے ٹھنڈک آ جاتی۔ ناواقفیت

[illegible] ہو گیا۔ حلق کی تکلیف کے سبب [illegible] FLU [illegible]

[illegible] آپ لوگ [illegible] سب نے [illegible] کیا کہ ہم بھی نہ کھائیں گے۔ تم اگر کوئی

[illegible] ایک دفعہ [illegible] دیر ہو گی اور [illegible] دوپہر کا کھانا [illegible] تین بجے تک [illegible]

حکیم صاحب نے فرمایا کہ [illegible] تاخیر ہوئی تو شاید [illegible] پہنچ جاتا۔

[illegible] ہو [illegible] ہم دونوں نے مل کر

بہت جلدی [illegible] فرش پر [illegible]

[illegible] حکیم صاحب آ پہنچے۔ ہم کو [illegible] دیکھ کر [illegible] شعر پڑھا ؎

[illegible] کی [illegible] ہے [illegible]

[illegible] قریب [illegible] تھے۔ شاید [illegible]

[illegible] بہت [illegible] کرنا

[illegible]

[illegible] تھا۔ [illegible] صاحب [illegible]

[illegible] کرتے تھے۔ [illegible]

[illegible] نہیں [illegible] صاحب

[illegible]

[illegible]

[illegible] سمجھتے تھے۔ ہاں اگر [illegible]

[illegible] تھے۔

[illegible] بہت سا [illegible]

[illegible] حیثیت شاعر [illegible] تھی۔ جس کا سبب [illegible]

[illegible] صاحب [illegible] "بہاری" تھا [illegible]

[illegible] "بہادر" کے [illegible]

[illegible] کا ترجمہ ہے۔ اُن کا مطالعہ کافی وسیع تھا۔ اردو، فارسی اور عربی [illegible] واقف تھے۔

[illegible] صاحب دو تین بار حیدرآباد [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

حیدرآباد کے شاعر

(۱۹)

اسلم عمادی

۱۹۶۲ء میں مطبوعہ ریاستی ساہتیہ اکیڈمی
کے تذکروں کا سلسلہ

نئی نسل کے بے حد ذہین اور جدید شاعر اسلم عمادی ۱۵؍ دسمبر ۱۹۵۱ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ عمادی خاندان کو علامہ عبداللہ العمادی کے سبب سے روشن دبدبہ رہا ہے۔ اس گھرانے میں آج بھی زبان و ادب، مذہب اور کلچر کی ہشت روایات استوار نظر آتی ہیں۔ اسلم عمادی، بھارت ہیوی الیکٹریکل لمیٹڈ حیدرآباد میں ٹسٹنگ انجینئر ہیں۔ دسمبر ۱۹۷۳ء میں انھوں نے عثمانیہ یونیورسٹی سے بی۔ ای (میکانیکل) امتیاز سے کامیاب کیا۔ نثر اور نظم کے علاوہ دیگر زبانوں سے تراجم میں روانی اور مہارت رکھتے ہیں۔ ہندوستان کے تمام معیاری ادبی جرائد میں ان کی تخلیقات شائع ہوتی رہتی ہیں اور نئے ذہن کی شادابی، مشینی عہد کے شعور اور منفرد اسلوب نگارش کے سبب پہچانے جاتے ہیں۔

اسلم عمادی کا پہلا شعری مجموعہ "نیا جزیرہ" کے نام سے ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا۔ شعر و ادب کا عصری ذوق رکھنے والوں نے اس مجموعے کو دکن کی نئی اور بہتر تخلیق کا نام دیا۔

اسلم کا تجرباتی اور تخلیقی مزاج ان کے اپنے عہد کی نمائندگی کرتا ہے۔ ان کی غزلوں اور نظموں میں مشینی آہنگ اور سائنسی معلومات کا خوشگوار امتزاج ملتا ہے جو انھیں کلاسیک کی [illegible] دوسرا شعری مجموعہ "اجنبی پرندے" اور نثری تحریروں کا انتخاب "شناخت" ترتیب کی منزلوں میں ہے۔ (وہاب [illegible])

ایک [illegible] آئینہ ہوں
ایک ہر عکس بکھرا ہوا آئینہ ہوں
جس پہ پہچان سے آتی ہوئی کرنیں چلیں
ایک بے عکس چمکتا ہوا آئینہ ہوں
شہر کے لوگ سمجھتے نہیں میری باتیں
ایک طاق میں رکھا ہوا آئینہ ہوں

اپنا ہر جرم مرے چہرے پہ عکس ہو تو ہیں
ہر نئے چہرے سے سہما ہوا آئینہ ہوں
ہے مرے چہرے پہ کچھ عکس تو کچھ بے اسلم
آنکھیں رکھتا ہوا جیتا ہوا آئینہ ہوں

●

(بوقت سحر)

آنکھوں میں ابھی خمار سا ہے
شاید کوئی خواب کھو گیا ہے
سورج کا سپید لب حسن سا یہ
گلیوں میں خروش گھومتا ہے
پھر جاگ اٹھیں گے راہرو سب
پھر راستہ منتظر پڑا ہے
بستر کے شکن ابھی نہ جاگے
اور گھر سے ہنسا نکل چکا ہے
گل شاخوں پہ کھلنے پائے
گل نام روانہ ہو چکا ہے
کل کی ہی شکن ابھی نہ اتری
پھر دن کا پسینہ آگھلا ہے
اسلم کوئی گھر کی سمت دیکھے
تھوڑا سا اندھیرا بچھا ہے

●

جیون اگر مرے جینے کا کچھ [illegible]
اُمید چپکے دیتی تجھ سے لیکن [illegible]
یہ کیا ہے ٹوٹتے رہنا مرا [illegible]
وہ جس [illegible] تھا اک بار وہ [illegible]
یہ [illegible] کو مجھ سے ہی [illegible]
میں ایک قطرہ بھی ہوں اس کو یہ [illegible]
یہ دن ہی دن ہے یہ چلیں سا [illegible]
وہ جس میں خواب ابھرتے ہیں [illegible]
یہ رنج کیا ہے، یہ آنکھوں میں [illegible]
اسے اسلم اس کی ہو تو جینے کیا [illegible]

●

مرا تپاک ستاتا رہا یوں ہی
ہر ایک چاپ ستاتا رہا یوں ہی
میں انتظار میں [illegible] مجھ کو [illegible]
یہی خیال جگاتا رہا یوں [illegible]
ہمارے بیچ میں حائل کئی سمت [illegible]
وہ بار بار بلاتا رہا یوں ہی
نہ ملنے کی خواہش تھی اور نہ [illegible]
وہ اپنا وقت ستاتا رہا یوں [illegible]
میں اک غریب ہوں مل سکتا [illegible]
گمان بھی وہم دکھاتا رہا یوں [illegible]

بادۂ کہن

حکیم مظفر الدین خاں مزاجؔ

عہدِ آصفی میں حضرت حافظ میر شمس الدین فیضؔ کے دورِ سخن کو دکن کی ادبی تاریخ میں نمایاں مقام حاصل رہا ہے۔ حضرت فیضؔ کے ارشد تلامذہ نے دکن میں شعر و ادب کے جذبات عالیہ کے چراغ کو روشن رکھا۔ اُدھر شمالی ہند میں حضرت فیضؔ اور ان کے تلامذہ کے معاصرین میں انشاؔ، مصحفیؔ، نظیرؔ، رنگینؔ، ذوقؔ، آرزوؔ، غالبؔ، شیفتہؔ اور انیسؔ اور دبیرؔ نے اپنا رنگ جما رکھا تھا۔

حکیم محمد مظفر الدین خاں مزاجؔ (۱۲۳۱ھ — ۱۲ ذی الحجہ ۱۳۱۸ھ) حضرت فیضؔ کے پرگو اور قادر الکلام شاگردوں میں تھے۔ عالم و فاضل، خداشناس، صوفی مزاج اور طبیب حاذق ہی نہیں اپنے وقت کے بے نہایت اور ہر دلعزیز شاعر بھی تھے۔ نواب خورشید جاہ کی پائیگاہ سے منصب پاتے رہے۔ حضرت فیضؔ سے تیس سال تک کلام پر اصلاح لینے کا شرف انھیں حاصل رہا۔ سلسلہ رشد و ہدایت میں بھی استاد سے بیعت تھی۔ ایک دیوان شائع ہو چکا ہے۔ "مرقع سخن" (جلد دوم) مطبوعہ ادارۂ ادبیات اردو (۱۳۵۳ھ) میں محمد اکبر الدین صدیقی نے مزاجؔ پر مضمون لکھتے ہوئے بتایا ہے کہ "مزاجؔ کے کلام میں سب سے پہلی بات جو مطالعہ کرنے والے کو متاثر کرتی ہے وہ سلاست اور سادگی ہے۔ ان کی زبان سے اشعار ایسے بے ساختہ نکل جاتے ہیں کہ گفتگو اور مکالمہ کے جملے معلوم ہوتے ہیں اور یہ خصوصیت کسی شاعر کو اس وقت تک حاصل نہیں ہوتی جب تک وہ اسالیب پر قادر نہ ہو جائے اور سرتاپا خود شعر نہ بن جائے۔ غرض مزاجؔ کے کلام میں سادگی، روزمرہ اور داخلی کرب اور کسک کی کیفیات ظاہر کرتی ہیں۔ وہ خواجہ میر دردؔ سے بے حد متاثر تھے۔ ۸۷ سال کی عمر میں رحلت کر گئے۔ کلام کا انتخاب درج ذیل ہے۔ (ز۔ا)

پیدا بتوں کے عشق سے عشقِ خدا ہوا — آئینہ مجاز حقیقت نما ہوا
رکھو دستِ اختیار میں کیفیت کمال — آمادہ ہے چھلکنے کو ساغر بھرا ہوا
ہے ماجرائے دیدۂ گریاں بھی دیدنی — طوفانِ نوح کا تو ہے قصہ سنا ہوا
کیا خاک منہ دکھائیں خدا کو مزاجؔ ہم — ہم سے نہ کوئی کام یہاں کام کا ہوا
[illegible] جمعیتِ خاطر ہے کہاں — دل پریشان گیا اور پریشان آیا
[illegible] دلِ زار کو دیکھا افسوس — ایک مہمان گیا دوسرا مہمان آیا

کام دنیا کے [illegible] سمجھے کیا یہ مزاج
تو تو [illegible] آیا

جان مجھ [illegible] عشق [illegible] کچھ غم نہیں
[illegible] محبت تو ادا ہو گیا

زندہ ہمیشہ ہیں شہیدان عشق
اور اسکو بقا ہے جو فنا ہو گیا

غنچۂ دل ترے عاشق کا شگفتہ نہوا
ہر برس فصل بہار آئی نیا سال آیا

عشق بتان سے اپنا دامن بچائے رکھنا
پچھتائیگا جو دھبہ پھر کون دھو سکے گا

مسافران عدم کا وہیں خیال آیا
نظر سے راہ میں جب کوئی نقش پا گزرا

کہیں ملال گزشتہ کو دل سے دور کرو
اب اوسکا ذکر ہی کیا ہو لیا گیا گزرا

کبھی قرار گیا دل سے گاہ تاب و توان
یہ صدمہ ہجر میں ہمپر جدا جدا گزرا

مکدر آج زیادہ مزاج ہے کل سے
مگر فراق میں کچھ سانحہ نیا گزرا

دل کے جلنے کا مزا آج ہے کیا ہے غم
بس نصیبوں میں جو تھا ہونا ہوا

اوس دہان تنگ کا کیونکر ہو وصف
رہ گیا لب پر سخن آیا ہوا

کیا ہے اس عالم میں حیرت کے سوا
آئینہ خانہ ہے یہ دیکھا ہوا

جو مَنْ عَرَفَ کی مجھے پہلے سے خبر ہوتی
تلاش یار میں اپنی ہی جستجو کرتا

آئینہ خانہ ہے اسے ششجہت
محو جو ہے یار کے دیدار کا

گل شبنم رسیدہ کی طرح گلزار ہستی میں
جسے ہنستا ہوا دیکھا وہی روتا نظر آیا

چراغ صبح کا عالم ہے موسم پیری
رہے رہے نہ رہے اعتبار کیا اپنا

شہرہ [illegible] غیرت گلشن کا ہے گلشن گلشن
شور مجھ وحشی رسوا کا ہے صحرا صحرا

گل میں نکہت ہے تو بلبل میں خوش آہنگی ہے
گل و بلبل نے ترا رنگ اوڑایا کیسا

اصل تہذیب کا حد سے نہیں بڑھتا ہے قدم
با ادب بیٹھ کے تہہ کرتے ہیں زانو اپنا

عمر کی کاسد بار عشق میں صرف
اور پھر کام کاج کچھ نہ کیا

دیکھنے والے تیری آنکھوں کے بیخود کیوں نہ ہوں
[illegible] میں رہنا بہت دشوار ہے پیکر شراب

ماہ و انجم جام بن کر کیوں نہ آئیں دور میں
جب پئے وہ غیرت مہتاب کوٹھے پر شراب

[illegible] آج کل چرچا ہے حشمت کا
[illegible] کھینچے گی دیکھنا گھر گھر شراب

کیا بھروسہ زندگی کا ایک دم خالی نجائے
دم بدم ہمکو دے ساقی جام بھر بھر کر شراب

یار مہمان ہوا ہے مرے گھر آج کی رات
تا قیامت نہو اللہ سحر آج کی رات

موت کا مذہب عشاق میں ہے نام وصال
ہے شب ہجر نہیں موت کا [illegible] آج کی رات

ساقی سے بس یہ کام [illegible] تین چار یا پانچ
[illegible] چار یا پانچ

شوخی نگاہ و غمزہ و انداز حسن و ناز یا [illegible]
[illegible] چار یا پانچ

سب رنگ

اس عنوان کے تحت ہند و پاک کے معیاری ادبی رسائل و کتب سے
مضامین، نظم و نثر کا انتخاب شائع ہوا کرے گا۔ (ادارہ)

صباح

مولانا عبدالماجد دریابادی

احمد کمال صاحب طوسی صحافی

مولانا عبدالماجد دریابادی، بہ یک وقت مفسّرِ قرآن بھی تھے، ادیب بھی، ناقد بھی اور صحافی بھی۔ لیکن اگر ان کی ادبی زندگی کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ بنیادی طور پر صحافی تھے۔ اب سے تقریباً ۷۰ برس پہلے، ان کا ایک مراسلہ ۱۹۰۸ء میں جب کہ وہ صرف بارہ برس کے تھے (پیدائش ۱۸۹۲ء) لکھنؤ کے مشہور روزنامے "اودھ اخبار" میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد سے اردو کے تقریباً ایک درجن سے زیادہ روزناموں، ہفتہ وار اور ماہانہ رسائل میں ان کا قلم کچھ نہ کچھ گوہر باری کرتا رہا۔ مضمون کبھی علمی اور سیاسی ہوتے، کبھی ادبی، کبھی مذہبی، کبھی اڈیٹوریل نوٹ اور کبھی تنقید و تبصرے۔ دو ہفتہ وار اخبارات سچ اور صدق (بعد میں صدقِ جدید) کے تو وہ باقاعدہ ایڈیٹر ہی تھے۔ مگر ان کے علاوہ جن اردو اخبارات اور جرائد میں کسی نہ کسی مبحث پر ان کے مراسلے، نوٹ، تبصرے اور مضامین نکلتے رہے، ان کے نام یہ ہیں۔ اودھ اخبار، وکیل، الاسلام، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، الناظر، الندوہ، العصر، ادیب، صبح امید، معارف، ہمدم، ہمدرد، حقیقت (ان اخبارات اور رسائل کے نام آگے چل کر اپنے معلومات کی بنیاد پر یا تو مضمون ہی میں یا فٹ نوٹوں میں مختصر الفاظ میں کچھ وضاحت کر دی گئی ہے)۔

جس طرز کے مضامین ایڈیٹوریل، نوٹ، تبصرے وغیرہ ۷۰ برس کی طویل مدت تک مختلف رسائل و اخبارات کے صفحات کی زینت بنتے رہے، جس مہتم نے ایڈیٹری یا مضمون نگاری کے علاوہ بعض اہم اخبارات کے مہتمم کی حیثیت سے بھی کام کیا ہو اور جس نے ایک طویل مدت تک دو نہایت مشہور و معروف ہفتہ (سچ اور بعد میں صدق و صدق جدید) کی ادارت ہی نہ کی بلکہ ان کے تقریباً سارے صفحات تحریر کرنے کے ذمہ دار رہے ہوں، اسے بنیادی طور پر صحافی ہی تسلیم کرنا پڑے گا۔ اور صحافی ہی نہیں بلکہ اس کی مخصوص طرزِ نگارش کی بنا پر "صاحبِ طرز صحافی"۔

مولانا عبدالماجد نے اردو ہی میں نہیں، بعض انگریزی اخبارات اور رسائل میں بھی مراسلہ نگاری اور مضمون نگاری کی۔ ان اخبارات اور رسائل کی فہرست یہ ہے: "انڈین ڈیلی ٹیلی گراف لکھنؤ، ایڈوکیٹ لکھنؤ، نیچر لندن، سٹرڈے ریویو لندن، ایسٹ اینڈ ویسٹ بمبئی،

تھیوسوفسٹ مدراس، ماڈرن ریویو کلکتہ، انڈین ریویو مدراس وغیرہ، انڈین ڈیلی ٹیلی گراف جو آئی ڈی ٹی کے نام سے مشہور تھا لکھنؤ کا روزنامہ تھا۔ "ایڈوکیٹ" لکھنؤ کے مشہور سیاسی اور سماجی کارکن منشی گنگا پرشاد ورما کا اخبار تھا۔ نیچر لندن کا سائنسی جریدہ تھا۔ سٹرڈے ریویو بھی لندن کا مشہور اخبار تھا۔ باقی جریدے ہندوستان میں شائع ہوتے تھے۔ ماڈرن ریویو میں مولانا کے قلم سے اکثر اردو کتابوں پر تبصرے شائع ہوتے رہتے تھے۔ ان تبصروں کے آخر میں مولانا کے پورے نام کی جگہ "اے۔ ایم (A.M.) لکھا ہوتا تھا۔ اسی رسالے میں مولانا کے کچھ اور مضامین کے علاوہ گاندھی جی کی ستیہ گرہ کی تائید میں ایک مضمون "ستیہ گرہ اور اسلام" بھی شائع ہوا تھا جس میں مذہبی نقطۂ نظر سے ستیہ گرہ کی تائید اور حمایت کی گئی تھی۔ خود مولانا نے انگریزی رسائل اور اخبارات میں شائع شدہ اپنے بعض مضامین کی بابت ان الفاظ میں ایک مرتبہ لکھا تھا،

" ایک زمانہ تھا کہ ناز اپنی عقل پر تھا، اور غرور اپنی فلسفہ دانی کا۔ زندگی کی آرزو سب سے بڑی یہ تھی کہ اپنا بھی شمار کسی دن اگر افلاطون اور ارسطو کی صف میں نہیں تو ان کے شاگردوں کے زمرے میں ضرور ہو جائے۔۔۔۔ ادھر دو ایک چھوٹے سے مراسلے لندن کے سائنسی ہفتہ وار نیچر میں نکل گئے تھے اور ایک مراسلہ لندن کے سٹرڈے ریویو میں۔ اور ہندوستانی ماہ ناموں میں دو چار مضمون "ایسٹ اینڈ ویسٹ بمبئی" اور تھیوسوفسٹ مدراس اور ماڈرن ریویو کلکتہ اور انڈین ریویو مدراس میں بھی چھپ چھپا گئے تھے۔ اب کیا تھا دماغ عرشِ معلیٰ پر تھا۔۔۔۔۔۔ الحمد للہ کہ وہ نشہ مدت دراز ہوئی اتر چکا، یونانیوں اور فرنگیوں کی وہ ساری نکتہ سنجیاں محض لفاظی کا طلسم اور اصطلاحات کی بھول بھلیاں نظر آنے لگیں"۔

بہر حال جہاں تک اردو اخبارات میں مضمون نویسی کا تعلق ہے جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے، مولانا عبدالماجد دریابادی ابھی اسکول کے ایک کم عمر طالب علم ہی تھے کہ انھیں مضامین لکھنے کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ ابتدا میں عام طور سے اپنے نام نہیں لکھتے تھے۔ یہ مضمون یا تو بغیر کسی نام کے لکھے جاتے تھے یا دوسروں کے نام سے۔ کم عمر طالب علم کو شاید اس دور میں یہ خیال ہو کہ معلوم نہیں اس کا مضمون شائع ہو نہ ہو۔ یا شائع ہو تو پتہ نہیں گھر کے بزرگ اس مضمون نویسی کو پسند کریں یا نہ کریں۔ وجہ کچھ ہو، مولانا کی غیر مطبوعہ آپ بیتی کے مطابق ان کا پہلا مراسلہ ان کے نام سے اودھ اخبار لکھنؤ میں ۱۹۰۴ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد امرتسر کے ضیاءالاسلام اور اسی شہر کے ایک مشہور اخبار وکیل میں مختلف موضوعات پر اپنے مضامین بھیجنے لگے اور وہ شائع بھی ہونے لگے۔ وکیل نے طالب علم عبدالماجد کے مضامین ہی شائع نہیں کیے بلکہ ان کے دو مضمونوں "محمود غزنوی" اور "[illegible]" کو اتنا اہم سمجھا کہ کتابچوں کی شکل میں الگ الگ شائع کیا۔ ان مضمونوں کو لکھتے وقت مولانا ایف اے کے طالب علم تھے مگر یہ مضامین اتنے ٹھوس اور وقیع تھے کہ وکیل بک ڈپو نے غالباً یہ سمجھ کر کہ ان کا لکھنے والا طالب علم تو کیا کوئی "مولانا" ہی ہوگا مضمون نگار کے نام کے پہلے "مولانا" بھی لکھ دیا اور اس لقب کا پتہ طالب علم مضمون نگار کو اس وقت چلا جب ان کتابچوں کی کاپیاں انہیں موصول ہوئیں۔

ایف اے پاس کرنے کے بعد مولانا نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور یونیورسٹی کے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں اپنے مضامین لکھنے لگے۔ یہ دور مولانا کا "دورِ الحاد" تھا۔ انھیں ادب کے ساتھ فلسفے سے بھی خاصی دلچسپی پیدا ہو گئی اور آخر اس نے اتنی شدت اختیار کی کہ مغربی فلسفیوں اور ان کے فلسفے پر مولانا شبلی کی مشہور کتاب "الکلام" کی تردید میں "طالب علم" کے نام سے لکھنؤ کے مشہور ماہ نامے الناظر میں متعدد قسطوں میں ایک طویل مضمون لکھا۔ اس مضمون کی خاصی شہرت ہوئی۔ کیونکہ مولانا عبدالماجد نے ایک نئے انداز میں مولانا شبلی اور ان کے نظریات کی تردید کر ڈالی تھی۔ اس طویل مضمون میں جگہ جگہ اسلام کی مخالفت کے پہلو بھی واضح تھے۔ بعد میں مولانا عبدالماجد فلسفہ موشگافیاں کرتے کرتے اسلام اور خدا کے پھر قائل ہو گئے۔ اور الحاد پسندی میں انہوں نے جو شدت دکھائی تھی اس سے کہیں زیادہ شدت سے

اور شریعت اسلام سے انھیں پیدا ہوگیا۔ لیکن مولانا کے اس مضمون میں ان حصوں کو چھوڑ کر جن سے اسلامی نظریات کی مخالفت ہوتی تھی، باقی مضمون کی افادیت اپنی جگہ تھی۔ مولانا کے احباب کو بھی اب پتہ چل گیا تھا کہ یہ مضمون کس کا ہے۔ اس لئے بعض نے اصرار کیا کہ مضمون کے قابل اعتراض حصے نکال کر اسے ایک کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے لیکن مولانا نے یہ گوارا نہیں کیا کہ ان کے دور الحاد کی یہ یادگار کتابی شکل میں چھپے۔ پھر بھی مولانا کے دوسرے فلسفیانہ اور ادبی مضامین کا سلسلہ جاری رہا۔ اور الندوہ، ادیب، العصر اور الناظر میں یہ مضامین برابر شائع ہوتے رہے۔

مہاراجہ محمود آباد سر علی محمد خاں کی ملکیت اور اردو کے مشہور صحافی سید جالب دہلوی کی ادارت میں لکھنؤ سے ۱۹۱۶ء میں روزنامہ "ہمدم" جاری ہوا اور ایک عرصہ تک بڑی آب و تاب سے نکلتا رہا۔ اس وقت بحیثیت ایک مصنف اور صحافی مولانا عبدالماجد کی شہرت اس قدر زیادہ ہو گئی تھی کہ ایڈیٹر ہمدم نے اخبار کی پہلی ہی اشاعت کے لئے ان سے ایک طویل مضمون مانگا۔ اور مولانا نے اسے لکھ بھی دیا۔ اس طویل مضمون کے بعد مولانا کے چھوٹے بڑے مضمون اس میں شائع ہوتے رہے۔ البتہ کسی مضمون میں تو مولانا اپنا نام دے دیتے تھے اور کوئی بغیر نام کے شائع ہوتا تھا۔ مولانا محمد علی کے اردو اخبار "ہمدرد" کے دور اول میں بھی مولانا عبدالماجد کے کچھ مضامین اس میں شائع ہوئے۔ جس سال لکھنؤ سے ہمدم نکلنا شروع ہوا اسی سال یعنی ۱۹۱۶ء میں دارالمصنفین، اعظم گڑھ سے (جو مولانا شبلی کی یاد میں اور ان کے کام کو آگے بڑھانے کے لئے قائم ہوا تھا۔ ایک مذہبی، علمی، ادبی اور تاریخی ماہ نامہ معارف شائع ہونا شروع ہوا۔ (اب بھی سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے)

معارف کے پہلے ایڈیٹر مولانا شبلی کے جانشین اور اردو کے فاضل ادیب اور مورخ مولانا سید سلیمان ندوی تھے۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی اس میں "اخبار علمیہ" کے عنوان کے ماتحت کثرت سے نوٹ اور تبصرے لکھتے رہے اور ان کے علاوہ انگریزی کے بعض مضامین کے ترجمے بھی ان کے قلم سے شائع ہوئے۔ مولانا سلیمان ندوی کی تحریک خلافت کے سلسلہ میں یورپ اور حجاز گئے تو معارف کے ایڈیٹوریل نوٹ بھی مولانا عبدالماجد ہی لکھتے رہے۔ مولانا سلیمان ندوی وفات تک معارف کی مجلس ادارت میں مولانا عبدالماجد کا نام شائع ہوتا رہتا تھا۔

اردو کے نامور شاعر پنڈت برج نارائن چکبست نے ۱۹۱۸ء میں لکھنؤ سے ایک ماہ نامہ صبح امید نکالنا شروع کیا۔ پنڈت کشن پرشاد کول بھی ان کے شریک کار تھے۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی نے اس رسالے میں بھی کئی ادبی مضامین لکھے جو میں "ہندو مصنفین اردو" بہت مقبول اور مشہور ہوا۔ افسوس کہ یہ رسالہ غالباً دو برس بعد ہی بند ہو گیا۔ صبح امید کی اشاعت کے ایک سال بعد ۱۹۱۹ء میں مولانا کے شاگرد اور عزیز انیس احمد عباسی صاحب نے ایک ہفتہ وار حقیقت لکھنؤ سے جاری کیا۔ (جو بعد میں عرصہ تک روزنامے کی حیثیت سے نکلتا رہا۔ اور اب انیس احمد عباسی صاحب کی یاد میں ان کے بھانجے احمد توفیق صاحب ہفتہ وار پرچے کی حیثیت سے نکال رہے ہیں۔ حقیقت کی اشاعت کے کئی مہینوں تک زیادہ تر مولانا عبدالماجد ہی اس کے ایڈیٹوریل اور نوٹ لکھتے رہے۔ اور بعض علمی مضامین کے ترجمے بھی ان کے قلم سے اس میں شائع ہوئے۔ البتہ اس کے بعد یہ سلسلہ قائم نہ رہ سکا۔ لکھنؤ سے رسالہ الناظر اب بھی نکل رہا تھا۔

مولانا نے ۲۲ء کے بعد دو سال تک "فیہ ما فیہ" کے عنوان کے ماتحت "چلبی" کے نام سے اس میں ادبی نوٹ بھی لکھے جو کتابی صورت میں چھپ چکے ہیں۔ اسی اثنا میں مولانا محمد علی کا اخبار ہمدرد بند ہو گیا تھا۔ مگر ۱۹۲۴ء میں وہ دہلی سے پھر نکلنا شروع ہوا۔ اس بار مولانا محمد علی کے اصرار پر مولانا عبدالماجد نے اس کے مستقل کالم اور میں بھی حصہ لینا شروع کیا اور جب ۱۹۲۸ء میں مولانا محمد علی اپنے علاج کی غرض سے یورپ گئے تو اخبار

کی ادارت [illegible] عبدالماجد کے سپرد کر گئے۔ اس دور میں بھی مولانا عبدالماجد کے قلم سے کئی مضامین [illegible]
جیسے [illegible] "نیم دروپوش" ناصح کے مضامین تھے۔ جنہیں عام طور سے بہت پسند کیا گیا۔

مولانا کا مشہور ہفتہ وار "سچ" ۱۹۲۵ء میں لکھنؤ سے نکلا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا عبدالرحمٰن ندوی نگرامی شریک ا[illegible] سچ کے پہلے صفحہ پر "سچی باتیں" کے عنوان سے مولانا عبدالماجد نے ایسے انداز میں نوٹ لکھنا شروع کیا کہ یہ نوٹ تو نوٹ ان کا عنوان بھی ایک خاص شہرت کا حامل ہوگیا۔ ایسے اکثر نوٹوں کے نیچے صرف حرف "م" لکھا ہوتا تھا۔ بہر حال کچھ ہی عرصہ بعد سچ کی ادارت کامل مولانا کے سپرد ہوگئی۔ اور مولانا ظفر الملک علوی اس کے ناشر اور مہتمم بن گئے۔ گویا سچ پہلا اخبار تھا جس کے باقاعدہ ایڈیٹر عبدالماجد تھے۔ ان کے قلم سے نکلی ہوئی سچی باتیں مولانا کے انداز تحریر کا بڑا اعلانیہ ہوتیں۔ اردو کے متعدد اخبارات انہیں اپنے ماتحت نقل کرتے تھے۔ اور عنوان دیکھ کر ہی ہر پڑھنے والا یہ سمجھ لیتا تھا کہ "سچ" سے انہیں نقل کیا گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں "سچی باتیں" اور مولانا عبدالماجد دریابادی لازم و ملزوم ہوگئے تھے۔

"سچ" قوم پرور اخبار تھا اس نے تحریک آزادی کی ہمیشہ حمایت کی اور یہ بتانے کی برابر کوشش کرتا رہا کہ مسلمانوں کا مسلک ہے محبت اور غیروں کی غلامی سے آزاد ہونا ہے۔ اس کے ساتھ سچ کے صفحات پر اسلام کے خلاف حملوں کا جواب بھی ہوتا۔ اور مغربی تہذیب اور رجحانات سے بچنے کی بھی مسلمانوں کو تلقین کی جاتی تھی۔ سچی باتیں میں بعض اوقات اتنا گہرا اور شدید طنز ہوتا تھا کہ مخالف تلملا اٹھتا۔ میں اس کے بعض مضامین کی بنا پر انگریز حکومت نے سچ سے ضمانت طلب کی اور چونکہ ضمانت داخل نہیں کی گئی اس لئے اخبار بند کر دیا گیا۔ کے آخر میں اسے پھر نکالا گیا۔ لیکن ۱۹۳۳ء میں بعض وجہوں سے اسے بالکل بند کر دیا گیا۔

اور دو برس بعد یعنی ۳۵ء میں یہی پرچہ مولانا کے دوسرے شاگرد عزیز عبدالرؤف عباسی صاحب کے زیر اہتمام و انتظام [illegible] سے جاری ہوا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی بدستور اس کے ایڈیٹر رہے۔ اخبار کی پیشانی پر لکھا ہوتا تھا کہ جملہ اخلاقی امور اور مضامین کے لئے ایڈیٹر صدق دریاباد کے پتے پر خط و کتابت کی جائے۔ کیونکہ مولانا دریاباد میں رہتے تھے۔ اور وہیں سے ہفتہ کو پرچہ میں شائع ہونے والا [illegible] بھیج دیا کرتے تھے۔ حسابی امور نیز ترسیل زر کے سلسلے میں منیجر صدق سے لکھنؤ کے پتہ پر۔ صدق پہلے دو روزہ پھر سہ روزہ ہوا، کچھ عرصہ کے لئے سہ روزہ بھی رہا۔ صدق میں بھی سچی باتیں کے عنوان سے مولانا کے شذرات نکلتے اور ہندوستان (اور قیام پاکستان کے) اخبارات میں بکثرت نقل ہوتے رہے۔ صدق کی عمر سچ کے مقابلہ میں کافی طویل رہی۔ اور وہ [illegible] پابندی سے [illegible] کر [illegible] میں وہ بہ وجوہ بند ہوگیا۔ اور دسمبر ۱۹۵۰ء میں مولانا کی ادارت اور حکیم عبدالقوی کے اہتمام میں "صدق جدید" شروع ہوا۔ مولانا صاحب مستقل دریاباد سے مضامین بھیجتے تھے۔ اور کتابت، پروف خوانی، طباعت، خریداروں کو ترسیل، حکیم صاحب کے نگرانی میں ہوتی رہی۔ یہ سلسلہ مولانا کی وفات تک پابندی سے جاری رہا۔ مارچ ۷۶ء میں مولانا پر فالج کا [illegible] ہوا [illegible] پورا افاقہ تو نہیں ہوا پھر بھی وہ اخبار کے لئے کچھ نہ کچھ لکھتے رہے۔ لیکن اب انہیں لکھنے میں تکان ہونے لگی۔

مولانا تقریباً ۵۰ برس تک مسلسل اور مختلف موضوعات پر لکھا [illegible] ہونے لگی [illegible] بھی ہر ایک کے لئے پڑھنا مشکل تھی اب اسے پڑھنے میں اور دقت ہونے لگی۔ اس پر غضب یہ کہ [illegible] حکیم عبدالقوی جو ان کی طرز خط سے کامل طور پر آشنا تھے یہ جملے [illegible]

[illegible] کا ایک بات کو پرکھ [illegible] سے وہ صاحب [illegible]
آخر ہار جوری ۱۹۷۷ کو وہ قلم جو ۵۰ برسوں سے ہزاروں صفحوں پر [illegible] ہمیشہ کے لئے چھٹے [illegible]
[illegible] انکا لتے رہے تھے ان کا [illegible] پر حکیم صاحب کی امانت میں [illegible]

مولانا عبدالماجد دریابادی [illegible] سیاست، مذہب، وطنیت اور صحافت کے بارے میں ایک خاص نقطۂ نظر [illegible] صدق و صدق جدید
[illegible] ان دونوں پرچوں میں عام ملکی معاملات، سیاسی جماعتوں، مالی و اقتصادی مسائل، بین الاقوامی
[illegible] سیاسیات عالم وغیرہ پر نہ مضامین چھپتے تھے نہ مراسلے۔ لیکن جن معاملات کا تعلق مسلمانوں سے، ان کے کلچر سے، ان کے مذہب سے
کی تعلیم سے ہوتا تھا یا مغربی تہذیب، جنسی جرائم، عصبیت وغیرہ کی کوئی مثال سامنے آتی تھی تو سچ اور صدق کے کالموں میں [illegible]
[illegible] بھرپور شذرات ضرور لکھے جاتے تھے۔ بہرحال ان دونوں اخباروں کا دائرہ ایک محدود دائرہ تھا۔ مولانا اس [illegible]
[illegible] کرتے رہتے تھے۔ مثلاً صدق جدید مورخہ ۹ ر ستمبر ۱۹۶۶ء میں ایک مراسلہ نگار کو مخاطب کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں "الصدق کا
موضوع بہت ہی محدود اور تنگ ہے۔ چھوٹے بڑے ہر پبلک مسئلے پر رائے زنی کرتے رہنا اس کا شعار نہ پہلے تھا نہ اب ہے۔ اس کی
[illegible] بہرحال انفرادی ہے"۔ صدقِ جدید ہی کی ایک دوسری اشاعت مورخہ ۱۴ ر اکتوبر ۱۹۶۶ء میں ایک اور مراسلہ نگار سے کہتے ہیں "صدق کا
مخصوص انداز و مزاج ہے۔ اس سے باہر کی چیزوں کے لئے ملک کے وسعت پرچے موجود ہیں۔ اپنے ایک مضمون "ہفتہ وار صحافت کے آداب"
[illegible] جدید ۲۹ ر مارچ ۱۹۶۵ء میں انہوں نے اپنے پرچے کی پالیسی اور واضح کر دی ہے۔ صحافت کو تجارت نہیں بلکہ ایک قسم کی عبادت قرار
دیتے ہوئے مولانا نے ہفتہ وار صحافت کے یہ آداب مختصر لفظوں میں متعین کئے ہیں:

مقصود دین و ملت کی خدمت رکھیئے۔ (عام خدمت خلق بھی اس کے تحت میں آجاتی ہے) ملک کے جذبات اور مذاق کی اصلاح [illegible]
[illegible] ہے جس طرح پڑوسی کے ساتھ اور کے اہل خاندان کے ہوتے ہیں۔ البتہ مسلمان "پرستار" وطن کا نہیں ہو سکتا۔ معبودیت کا [illegible]
صرف ذات حق کے لئے مخصوص ہے۔ اپنی مقبولیت کے جذبے کو اپنے اوپر غالب نہ آنے دیجئے۔ کسی کی دل شکنی نہ کیجئے، [illegible]
[illegible] کرنے جائیں۔ ہفتہ وار میں اپنے تبصرے یا کم از کم خبر کی سرخی ہی سہی، ہر چیز کو با مقصد بنا کر پیش کیجئے۔ ملک کی اکثریت [illegible]
[illegible] مرعوبیت اور احساس کمتری کی حد تک نہ پہنچئے۔ صلح و [illegible] دوسری چیز ہے بزدلی اور خوشامد بالکل دوسری [illegible]
[illegible]۔ مزاح اور پھکڑ پن کے فرق کو نظر میں رکھیئے۔ اپنی غلطی کا اعتراف کرنے میں عذر نہ کیجئے۔

[illegible] کی ایک خوبی یہ بھی حالانکہ بہت کم ہے۔ مولانا کی تحریر کا طرز بہت گہرا ہی نہیں ہوتا تھا بلکہ ان کا اسلوب [illegible] بعض اوقات
[illegible] پر تیز اور تند و تلخ بلکہ کبھی کبھی درشت ہو جاتا تھا۔ اردو کے ایک جید ناقد ڈاکٹر خورشید الاسلام نے تو ان کے [illegible] تحریروں کا خلاصہ
[illegible] اسلام، وطنیت، قوم پرستی، اردو، [illegible] زندگی کے مقاصد، [illegible] تہذیب و ثقافت [illegible]

ریہ کو منفرد اور ان کی صحافت کو ایک مخصوص طرز کی صحافت بنا دیا تھا ۔ البتہ ان کے قلم سے کسی کے خلاف توہین آمیز یا نازیبا کلمات نہیں نکلتے ہ بقول مولانا ضیا احمد بدایونی ان کا روئے سخن شخصی نہیں بلکہ شخصیت کی طرف ہوتا تھا ۔

سچ اور صدق میں شائع شدہ مولانا کی تحریروں میں کچھ خصوصیتیں بھی پائی جاتی ہیں ۔ ایک تو ان کے شذرات یا مضامین کی سرخیاں متعلق مولانا نے لکھا ہے کہ اپنے تبصرے یا کم از کم سرخی ہی سے ہر چیز کو با مقصد بنا کر پیش کیجئے ۔ دوسرے نہایت دلچسپ اور موثر انداز عایت لفظی کا استعمال ' رعایت لفظی کا یہ استعمال بعض اوقات بڑے بڑے مضمونوں کا کام کر جاتا تھا ۔ مختصر جملے اور مختصر تبصرے ان کی تحریر سے امتیازات تھے ۔ تبصرے کے آخر میں نہایت برمحل شعر بھی لکھ دیتے تھے ۔

مولانا کی دی ہوئی سرخیوں اور تحریریں رعایت لفظی کی کچھ مثالیں ذیل میں درج کی جا رہی ہیں (سرخیوں کے ماتحت جو تحریریں ہیں وہ یا تلخیص طوالت کے خیال سے پیش نہیں کی جا سکتیں ۔ لیکن یہ سمجھ لیجئے کہ یہ شعر تبصرے پر پوری طرح چسپاں بلکہ اس کی تلخیص ہوتے تھے) زبان خنجر تو مرحبا کہیئے ' مصطفیٰ نایاب و ارزاں بولہب ' سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں ' دل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے ' ن کو اک ادا میں رضامند کر گئی ' اک کشمکش برق و شرر دونوں طرف ہے ' شیر اور فقیر تالین ' قال میں حال ' فتح سنگھ کی فتح گرانی کا لطف ' ی نادانی ' مظلوم کا ظلم ' بلندیوں کی پستیاں ' بزدل سورما ' جدت کی قدامت ' ـــــ ذاکر حسین کی کتاب پر ایک ریڈیو تقریر کی (جو بعد چھپی بھی) سرخی دیتے ہیں " ذکر حسین ذاکر حسین کی زبان سے " ایک مرتبہ لاہور میں مولانا ظفر علی خاں کا جشن منایا گیا اور مولانا سے پیغام یا ۔ مولانا نے یہ پیغام بھیج دیا ۔ اور اخبارات میں بھی شائع ہوا ۔ پیغام میں صرف یہ مصرع لکھا ہوا تھا ؎ کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں ۔ مرتبہ علی گڑھ جاتے ہوئے پروفیسر آل احمد سرور کا ساتھ ہو گیا ۔ اس سفر اور قیام علی گڑھ کی روداد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں " جب سرور یا سفر ہو تو اب ختم کیا '

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے جامعہ ملیہ کے جلسۂ تقسیم اسناد کے سلسلے میں جو ڈاکٹر ذاکر حسین ' صدر جمہوریہ کی زیر صدارت ہوا تھا اپنی تقریر اردو کی کسمپرسی کا بھی ذکر کیا تھا ۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے صدق جدید میں لکھتے ہیں " خوب ہوا جو 'رشید' کے یہ ارشادات 'مرشد' کے ح پہلے تک براہ راست پہونچ گئے ۔

اب مولانا کے کچھ شذرات کے اقتباسات دیکھئے ۔

الفاظ کا جادو : اگر آپ کا تعلق اونچے طبقے سے ہے تو کسی سرا میں ٹھہرنا آپ کے لئے باعث توہین ۔ لیکن کسی "ہوٹل" میں قیام کرنا را بھی باعث شرم نہیں ۔ حالانکہ دونوں میں کیا فرق ہے بجز اس کے کہ "سرا" مشرقی ہے ' دیسی ہے اور "ہوٹل" مغربی ہے انگریزی ہے ولایتی ہے ۔ بھلا اگر یہ کہہ دے کہ سرا کے فلاں بھٹیارے سے آپ کا یارانہ ہے تو آپ اس کا منہ نوچ لینے کو تیار ہو جائیں ' لیکن فلاں ہوٹل کے "مینیجر" سے پ کا بڑا ربط ضبط ہے اسے آپ فخریہ تسلیم کرتے رہتے ہیں ۔ حالانکہ سرا کے "بھٹیارے" اور ہوٹل کے "مینیجر" کے درمیان بجز ایک کے دیسی اور دوسرے کے ولایتی ہونے کے اور کوئی فرق ہے ؟ ـــــ "سچ ۱۹۳۱ء"

سازندو کا اعزاز : (وائلن بجانے والے مشہور امریکی فن کار یہودی منوہن کو ملکہ برطانیہ کی طرف سے کے بی ای کا خطاب دیئے جانے پر) " جو کہیں آپ کسی کی زبان سے بہ طور افواہ بھی یہ سن لیں کہ ' کسی طبلچی ' کسی سارنگئے ' کسی پکھاوجی کو فلاں شہنشاہ دہلی نے پنج ہزاری یا ہفت ہزاری منصب سے سرفراز کر دیا تھا یا فلاں شاہ اودھ نے اسے اپنے دربار کے امرا میں شامل کر لیا تھا تو شرم سے آپ کی آنکھیں نیچی ہو جائیں اور عجب

نہیں کہ تحقیر و تمسخر کے ساتھ آپ خبر پر ہنس بھی پڑیں۔ لیکن یہی خبر جب برطانیہ سے، فرانس سے، امریکہ سے آتی ہے تو اسے آپ احترام کے کانوں سے سنتے ہیں اور آپ کا دل و دماغ اسے آرٹ نوازی، فن کی قدردانی، اور فن کا حوصلہ افزائی قرار دیتا ہے۔

سرفرازی ہوا دشمنوں کی تو گردن کاٹیے ان کی — اگر بندوں کی بن آئے تو نفیس ارتقا کہیے (صدق جدید ۱۷ نومبر ۶۵ء)

داغ اپنی جمائے جاتا ہے: (لکھنؤ میں پتنگ بازی کے مقابلے پر تبصرہ کرتے ہوئے)

"شاباش لکھنؤ! اور زندہ باد ملتِ اسلامیہ! ایسے میدانوں کے مردِ میدان سوا "خیرِ امت" کے اور کہاں مل سکتے ہیں۔ ہوش رُبا گرانی نے مزہ نیم فاقہ کشی کا چکھا دیا ہو — خطۂ قحط کے بگل پر بگل بجتے جا رہے ہوں، لیکن لکھنؤ والوں کے ہاتھ سے پتنگ کی ڈور نہ چھوٹنے پائے۔

محشر میں خلق اپنی مصیبت میں مبتلا — یاں یہ تلاش آئے کوئی خوبرو پسند (صدق جدید ۱۷ دسمبر ۶۵ء)

ایک نئے طائفہ کی سرافرازی: (ہندوستان میں روس کے ایک ثقافتی وفد کی آمد کے سلسلے میں)

ناچ مجرے کی محفلیں کوئی راجہ مہاراجہ، نواب گرم رکھے تو گردن زدنی۔ لیکن "انڈو سوویٹ فیسٹول" نام رکھ کر ایک سوشلسٹ اسٹیٹ جو بھی کرے قابلِ داد و لائقِ تحسین!! (صدق جدید ۱۳ مئی ۶۶ء)

زبان پر ڈاکہ: ("تیج" دہلی کی اس خبر پر کہ مردم شماری میں منشی گوپی ناتھ امن اور پنڈت آنند نارائن ملا کی زبان ہندی لکھی گئی)

مال و جائداد و عزت و آبرو پر ڈاکہ پڑتے سنا تھا۔ زبان پر ڈکیتی اور رہزنی کی مثالیں اب دیکھنے میں آئیں۔ (صدق جدید ۱۹ر جولائی ۶۱ء)

یہ مولانا عبدالماجد دریابادی کی طرزِ تحریر کے چند نمونے اور ان کی صحافتی زندگی کا ایک مختصر خاکہ ہے۔

مولانا نے "سچ" کی ادارت سنبھالنے سے پہلے مختلف اخبارات و جرائد میں مضمون نگار، تبصرہ نگار، مراسلہ نگار وغیرہ کی حیثیت سے جو حصہ لیا تھا اسے اگر نہ بھی شامل کیا جائے تو بھی باقاعدہ ایڈیٹر کی حیثیت سے ان کی صحافتی زندگی کی مدت ۴۹ برس ہوتی ہے۔ مولانا نے صدق جدید کی اشاعت مورخہ ۲۹ مارچ ۱۹۶۸ء میں لکھا تھا کہ "صدق" اپنے پہلے نام "سچ" کے ساتھ جنوری ۲۵ء میں جاری ہوا تھا، شروع کے چھ مہینے چھوڑ کر جب ادارت کی پوری ذمہ داری اپنے سر نہ تھی اور درمیان کے بھی ڈیڑھ سال کے ناغہ کو چھوڑ کر کہنا چاہیے کہ پورے ۴۰ برس کا صحافتی تجربہ ہے"۔

اس میں ۹ برس کا اور اضافہ کر لیجیے تو ۴۹ برس کی صحافتی زندگی بجائے خود ایک بڑی مدت ہوتی ہے۔ اس مدت میں انہوں نے جس انداز میں صحافت کی، اور اردو صحافت کو جو نیا رنگ دیا وہ انہیں کا حصہ تھا۔ ان کی پالیسی اور نظریات سے بہتوں کو اختلاف ممکن ہے لیکن ان کے "صاحبِ طرز صحافی" ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

(ماہنامہ "نیا دور" لکھنؤ، عبدالماجد دریابادی نمبر ۷۸ء)

—— "جبر زوریہ مجسم تھا" ان کی مدح و توصیف میں مجھ جیسا کمزور قلم اٹھا ہی کیا سکتا ہے۔ ادارۂ ادبیاتِ اردو کے تو خیر وہ بانی ہی تھے۔ باقی حیدرآباد سے کونسی ایسی ادبی تحریک ادھر ۲۵، ۳۰ سال میں اٹھی جس کے روحِ رواں وہ نہ تھے۔ کوئی لکھنے کو قلم اٹھائے تو کیا کیا لکھے اور کہاں تک لکھتا جائے۔ ان کے کمالات کو سمجھ لینا اور ان کی داد پر آمادہ ہو جانا، یہ خود ہی ایک کمال ہے۔ آفتاب کو روشن دیکھنا، خود اپنی صحتِ بصارت کا اعلان کرنا ہے۔" —— (عبدالماجد دریابادی)

نقد و نظر

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

مکتوباتِ جوش ملسیانی بنام رضا

مرتبہ: کالیداس گپتا رضا ضخامت: (۱۷۶) صفحات
قیمت: انیس روپے پچاس پیسے ناشر: دِل پبلیکیشنز بمبئی۔

عربی کہاوت ہے کہ "المکتوب نصف ملاقات" مکتوبات میں ملاقات کا رنگ اُردو میں سب سے پہلے غالب نے بھرا۔ غالب کے بعد اُردو کے دوسرے نامور مشاہیر نے اس رنگ کو اپنایا۔ یہ بات اور ہے کہ اُردو مکتوبات کے مجموعے پڑھنے کے بعد بھی یہ کہنا پڑتا ہے کہ "غالب کا ہے اندازِ بیاں اور" لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ دوسرے نامور مشاہیر مثلاً سرسید، حالی، شبلی، مہدی حسن افادی، شاد عظیم آبادی، نیاز فتح پوری اور ابوالکلام آزاد وغیرہ کے مکاتیب اُردو ادب کے شہ پاروں میں شمار نہیں ہوتے۔ یہ سب کے سب صاحب طرز ادیب تھے اور ان کے خطوط میں ان کی انفرادیت جھلکتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ہمیں یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ غالب کے بعد کا ہر ادیب غالب کا خوشہ چیں ہے زیر تبصرہ مجموعے کے مطالعہ سے قاری کا خیال فوراً "اُردوئے معلّیٰ اور "عودِ ہندی" کی طرف جاتا ہے کیونکہ یہ مکاتیب اپنی طرزِ نگارش، صاف گوئی، خلوص اور مشفقانہ مخاطبت کے باعث مکتوبات غالب سے قریب تر نظر آتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس مجموعے کی ایک اور خصوصیت قابل ذکر ہے۔ وہ اصلاح کلام کا دلنشیں طریقہ ہے۔ دل شکنی نہ کرتے ہوئے ہمت افزائی اور ستائش کے ساتھ جو غلطیاں سامنے آتی ہیں انھیں نمایاں کرنا کمالِ استادی ہے اور حضرت جوش ملسیانی کی میں ہم یہ سب کچھ پاتے ہیں۔ ان مکتوبات کا مطالعہ خصوصاً آج کل کے شعراء کے لئے جو محروم استاد ہوتے ہیں ضروری اور بے حد کارآمد ہوگا۔ جوش ملسیانی کے مکتوبات میں ان کے کردار کی بلندی اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ انسانی ہمدردی کے ساتھ ساتھ "حساب دوستاں در دل" کی بجائے کھرے پن سے ایک ایک پائی کا حساب لکھ دینا کوئی مدد قابل ہو تو نہ صرف خود مدد کرنا بلکہ انھیں بھی متوجہ کرنا جو مدد دینے کے قابل ہیں۔ زیر تبصرہ مجموعہ مکتوبات کا مطلعہ آفرینی کے ساتھ ساتھ حضرت جوش کے مشہور و معروف فرزند عرش ملسیانی کا تعارف اور پھر اپنے والد پر متعلق مضمون اور خود رضا صاحب کا مضمون "چند یادیں" کتاب کی افادیت اور وقعت میں اضافہ کا مناسب کتاب خوبصورت طباعت

ایسے کاغذ اور اچھے روپ میں شائع ہوئی ہے ۔ اگرچہ قیمت کچھ زیادہ نظر آتی ہے اس پر بھی خرید کر پڑھنے اور بار بار پڑھنے کے قابل ہے ۔

(غلام جیلانی)

اقرار (شعری مجموعہ) شاعر : رؤف خیر
پبلشر : گل نو پبلیکیشنز صفحات (۱۲۰) قیمت دس روپے

نوجوان شاعر رؤف خیر اپنی شاعری کا بھرپور تنقیدی سمتوں کا تعین کرتے ہیں ۔ بار بار چونکا دینے والی بات کہتے ہیں ۔ سہل نگاری اور اکتا دینے والی یکسانیت سے دور رہ کر نئے زاویوں سے سوچتے ہیں ۔ وہ نعت کہیں یا غزل ۔ سانٹ کہیں یا نظمیں ۔ ہر صنف میں ان کا انفرادیت نمایاں ہے ۔ انھوں نے غزلیات بھی خوب کہی ہیں ، خوبصورت اور دلنشیں شعر کہہ گئے ۔ مثلاً :

تمہیں یہ وہم اشارہ تمہاری ذات سے تھا ۔ غلط نہ مجھو مخاطب میں کائنات سے تھا
فساد شہر نہ تھا بے سبب کہ ربط اس کا ۔ معاشیات سے تھا یا سیاسیات سے تھا
مزاج ہی نہیں بدلے بدل گئے چہرے ۔ اتار ڈالے ہوا نے نقاب کتنوں کے
جو سوچتا تھا تو دھندلے تھے منزلوں کے نشاں ۔ جو چل پڑا تو کھلے راستے سجھائی دیے
بے گناہوں کو سزا دینی پڑی ۔ ہم بھی کن ہاتھوں کے پتھر ہو گئے تھے

اسی طرح نظم ، سانٹ اور ترائیلے بھی چونکا دینے والی باتوں سے پُر ہیں ۔ اچھوتے خیال بالکل تشبیہیں جوان حوصلوں کا اس مختصر سے مجموعے کے اوصاف ہیں ۔ البتہ رؤف خیر سے ہم کہیں گے کہ زبان اور محاورے کو بگاڑنا کسی طرح جدیدیت کا شیوہ نہیں اور چیزوں کے ساتھ وہ اس بات پر بھی غور کریں اور احتیاط سے کام لیں تو بہت جلد جدید دور کے شاعروں میں ممتاز مقام حاصل کرلیں گے ہم پھر ایک بار اور صاف طور پر کہنا چاہتے ہیں کہ زبان اور محاورے کا خیال نہ رکھا جائے تو دلچسپ تشبیہیں ، انوکھے خیال چونکا دینے والے اشارے اور شاعر کے شعور و مشاہدے کے عکس سب کے سب بھونڈے پن کا روپ دھار لیتے ہیں اور رؤف خیر کے ہاں کہیں کہیں ایسا ہوا ہے ۔ کتاب کی کتابت ، طباعت اور گٹ اپ (GETUP) تینوں چیزیں معیاری ہیں ۔

(غلام جیلانی)

افکار سیدین مرتبہ : مالک رام و عابد رضا بیدار ناشر : خواجہ غلام السیدین یادگار کمیٹی نئی دہلی
تقسیم کار : مکتبہ جامعہ دہلی صفحات (۲۶۲) قیمت : پندرہ روپیہ

خواجہ غلام السیدین ایک بیدار مغز مفکر اور ماہر تعلیم تھے ۔ زیر تبصرہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے ۔ پہلا اور سب سے بڑا حصہ تعلیمی خطبات کا ہے اور ایسا ہونا بھی چاہیئے تھا کیونکہ یہی وہ میدان ہے جس کے معماروں کی صف اول میں خواجہ غلام السیدین کا مقام ہے دوسرا حصہ اسلام کے بارے میں ہے جس کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ [illegible] تنگ نظری [illegible] نہ صرف یہ بلکہ [illegible] بھی یہی نصیحت کرتے ہیں کہ تنگ نظری چھوڑ دیں اور چھوٹے چھوٹے اختلافات [illegible] اہم مسائل کے حل [illegible] ۔ تیسرا حصہ خود ان کے بارے میں ہے [illegible]

ہے اور رفیق حیات کی یاد میں عقیدت کے پھول بھی ہیں۔ جن تین حصوں یا ابواب میں زیر تبصرہ کتاب قارئین کے ہاتھ میں آئی ہے وہ تینوں کے تینوں ایسے ہیں کہ صرف سنے جائیں اور لطف اٹھاتے رہیں لیکن جیسا کہ جناب مالک رام صاحب نے لکھا ہے کہ خواجہ غلام السیدین کی کہی ہوئی باتیں اشاعت کے بعد بھی دلچسپ اور مدلل ہیں اور ہم جناب مالک رام صاحب کے اس خیال سے بھی پوری طرح متفق ہیں کہ " ہمیں یقین ہے کہ سیدین مرحوم کے یہ خطبات اور مضامین نوجوانوں کے لئے کارزار حیات میں " مشیر اور راہبر کا کام دیں گے۔ اور بزرگوں کے لئے دوست اور رفیق کار کا۔"

(غلام جیلانی)

مصنف : اخلاق اثر

اُردو ڈرامے کا مطالعہ

ناشر : پرنسپل ریجنل کالج آف ایجوکیشن بھوپال

اُردو میں ڈرامہ نگاری اور ڈراموں کی بنیادوں کے ساتھ ہی ساتھ ڈرامہ نگاری نے آغاز سے آج تک جن منازل کو جس انداز میں طے کیا اور جن جن روپ میں منظر عام پر آئے ڈرامے کے اس سفر طویل میں کس نے کیا خدمت انجام دی ان سب باتوں کا مکمل جائزہ جناب اخلاق اثر صاحب نے بڑے کامیاب انداز میں انجام دیا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب کے مطالعہ کے بعد ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ ہندوستانی اسٹیج، تھیٹریکل کمپنیوں اور ان کے لئے خصوصی طور پر لکھے ہوئے ڈراموں اور ڈرامہ نگاروں کا بیان کسی قدر تشنہ ہے ریڈیو ڈرامہ یا ٹیلیویژن کے لئے لکھے ہوئے ڈراموں پر جتنی توجہ دی گئی وہ اُردو ڈرامے کے سنگ ہائے بنیاد کو نصیب نہ ہو سکی۔ زیر تبصرہ کتاب کی پہلی سطر ہی سے قاری کو اس کتاب سے متعلق غلط فہمی ہو سکتی ہے اور ممکن ہے کہ قاری ساری کتاب کو اسی طرح کی باتوں سے پُر تصور کرتے ہوئے کتاب کو بازو نہ رکھ دے اور اگر قاری نے خریدا ہو تو اُس کو یہ خیال بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ اس نے خواہ مخواہ اپنا جیب پر بار ڈالا۔ اگرچہ حقیقت کچھ اور ہے۔ اس کتاب کی تکمیل کے لئے مصنف کو کئی کتب خانوں کے چکر لگانے پڑے ہوں گے متعدد کتابوں کی ورق گردانی کرنا اور کام کی باتیں ڈھونڈ نکالنا یہ سب آسان کام نہیں۔

زیر تبصرہ کتاب کے بغور مطالعہ سے ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ مہینوں محنت کرنے کے بعد اس شکل میں پیش ہونے کے قابل ہوئی ہے۔ کتاب اچھے روپ میں اچھی طباعت و کتابت کے ساتھ (۲۵۲) صفحات میں پیش ہوئی ہے البتہ قیمت کا کہیں ذکر نہیں ہے۔

(غلام جیلانی)

سہ ماہی شیرازہ (اقبال نمبر)

سرپرست مرتب : محمد یوسف ٹینگ

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ اقبال صدی منائی گئی اور اس سلسلہ میں تقریباً تمام اُردو رسائل نے اقبال نمبر نکالنا ضروری سمجھا لیکن اقبال نمبر اقبال سی ہمہ گیر ہستی کے شایان شان نکالنا ہر ایک کے بس کا روگ نہ تھا۔ شیرازہ کا اقبال نمبر دیکھنے کے بعد ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ شیرازہ نے نہ صرف شایان شان نمبر شائع کیا ہے بلکہ اقبال اور اقبال کے کلام کے بعض اچھوتے پہلوؤں کو بھی اُجاگر کیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اس نمبر کو کتابی شکل میں بھی منظر عام پر لایا جائے گا تاکہ ہر اُردو داں کے لئے یکساں استفادہ کا موجب ہو سکے۔

(غلام جیلانی)

اُردو نامہ

علمی ادبی اور تہذیبی خبریں

…یکم اپریل ۷۸ء : بزمِ ناراتش واسن کا
…رلی مشاعرہ جناب مرزا اسرفراز علی
…سابق نائب ناظم تعلیمات کی صدارت
…عقد ہوا۔ قدیم طرزِ سخن کے کئی شاعروں
…سنایا۔

● جناب محمد منظور احمد لکچرار اردو
…نٹ سٹی کالج وظیفہ حسنِ خدمت پر
…ش ہوئے۔ جناب منظور طلباء
…ی میں اپنے حسنِ سلوک اور اردو
…یات کی تدریس میں مہارت کے
…، بہحد مقبولیت کے حامل رہے ہیں۔
…مصروفیات کے باوجود انھوں نے
…آباد کے ادبی ماحول کو اپنی علمی و شعری
…یتوں کے سبب اونچا اٹھانے میں
…کردار ادا کیا۔ اردو مجلس کے معتمد
…ادبی مجلس کے صدر کی حیثیت سے
…خدمات یادگار رہیں گی۔ وظیفہ کے
…منظور صاحب نے خود کو علمی و ادبی
…کاموں کے لئے مخصوص وقف کیا
…اور ان دنوں ایک مجموعۂ نثر کی ترتیب
…اعت میں مصروف ہیں۔
…ر اپریل ۷۸ء : ریاستی انجمن

ترقی اُردو کی طرف سے اُردو تعلیمی کمیٹی کا ایک
اجلاس پروفیسر حبیب الرحمٰن معتمد انجمن
ترقی اردو کی صدارت میں منعقد ہوا۔
ڈاکٹر حسینی شاہد پرنسپل اُردو کالج،
جناب محمد منظور احمد سابق لکچرر سٹی کالج،
جناب سر سیزاس لاہوتی، جناب سعادت
نیئر (پبلک اسکول) جناب رشید قریشی
(اردو اکیڈیمی) اور محترمہ رفیع رؤف
لکچرار انوار العلوم ویمنس کالج نے شہر میں اُردو
کے تدریسی مسائل پر اظہارِ خیال کیا اور انجمن
کی طرف سے چلائی جانے والی اردو تعلیمی اسکیموں
پر اپنے تعاون کا یقین دلایا۔ انجمن کی
طرف سے اردو گرائمر اسکولوں کی کارکردگی
پر کنوینر تعلیمی کمیٹی جناب غلام یزدانی
نے رپورٹ پیش کی۔ اس اجلاس میں
اساتذۂ اُردو کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔
۱۰ اپریل ۷۸ء : پروفیسر حبیب الرحمٰن
معتمد ریاستی انجمن ترقی اردو نے پریس
کانفرنس کو مخاطب کرتے ہوئے بتایا کہ
انجمن کی طرف سے اردو تعلیم کو عام کرنے کی
غرض سے ۱۰ لاکھ روپیہ کا اردو تعلیمی
ٹرسٹ قائم کیا گیا ہے۔ جس کے ذریعہ
شہر میں اُردو ذریعہ تعلیم کے چار ماڈل پرائمری
اسکول قائم کئے جائیں گے۔ انجمن کے صدر
نواب میر احمد علی خاں اور شریک معتمد جناب
عابد علی خاں نے بھی پریس کانفرنس سے
خطاب کیا۔ عابد صاحب نے تعلیمی ٹرسٹ
کے طریقۂ کار کی وضاحت کرتے ہوئے
بتایا کہ ٹرسٹ کا ٹارگٹ تین سال میں
مکمل کر لیا جائے گا۔ جناب عابد علی خاں
نے کہا کہ اردو کی ترقی اور اشاعت کے کام
میں ہمیشہ حکومت پر تکیہ کرنا ٹھیک نہیں ہے
بلکہ اردو والوں کو اپنے بل بوتے پر بھی
کچھ کرنا چاہیئے۔

۱۲ اپریل ۷۸ء : ممتاز مجاہد مولانا
محمد علی جوہر کی صد سالہ تقاریب کے سلسلے میں
قائم کردہ کمیٹی کا مشاورتی اجلاس جناب میر
اکبر علی خاں سابق گورنر اڑیسہ کی صدارت
میں منعقد ہوا اور طے پایا کہ مولانا محمد علی
جوہر کی حیات اور کارناموں پر ایک مبسوط
کتاب شائع کی جائے اور مولانا کی یاد میں
ریاست کی کسی ایک جامعہ کے شعبۂ جرنلزم
میں "محمد علی جوہر چیئر" قائم کی جائے۔

● حضرت مغنی اورنگ آبادی کی
یاد میں ایک ادبی انجمن "ادب مغنوی" کے
نام سے قائم ہوئی ہے جس کے صدر ڈاکٹر
حنیف قیصی صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ
نائب صدر جناب امیر احمد خسرو اور معتمد عمومی
جناب شمس الدین تاباں منتخب ہوئے
ہیں۔

۱۴ اپریل : بزم اردو ادب دکن ... ایک شعری نشست کے بعد شاعر جناب مجیب خیر آبادی کا خیر مقدم کیا گیا۔ جناب مظفر حسن سید نگار معتمد اردو اکیڈیمی نے محفلِ شعر کی صدارت کی۔ مسرز راشد آذر، عزت خیام، سعید شہیدی، سید حسن اور حلیم افسر نے کلام سنایا۔

● ۱۵ اپریل : حلقۂ ارباب ذوق کا ماہانہ ادبی اجلاس نظامس ٹرسٹ اردو لائبریری میں ڈاکٹر سعالم خوندمیری کی صدارت میں ہوا۔ ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز لیکچرار اردو اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز لندن یونیورسٹی نے دکنی ادب پر عالمانہ لیکچر دیا۔

۱۶ اپریل : اقلیم ادب کا ماہانہ ادبی اجلاس ڈاکٹر یوسف کمال کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جناب مصلح الدین سعدی نے جناب شمس الدین تاباں کی شخصیت اور فن پر انٹرویو لیا۔ "آج کا شاعر" کے زیر عنوان جناب مظفر مجاز نے اپنا کلام تنقید کے لیے پیش کیا۔ ہندی افسانہ نگار نہپال سنگھ ورما نے کہانی سنائی۔ جناب اختر حسن نے اردو کے ادبی رجحانات پر مخاطب کیا۔ محفلِ شعر میں برق یوسفی، سعید بن محمد نقش، ڈاکٹر ڈیوسف کمال، حامد مجاز، قدیر انصاری اور کئی شعراء نے کلام سنایا۔ جناب غنی نعیم نے شکریہ ادا کیا اور سابقہ اجلاس کی رپورٹ سنائی۔

۲۰ اپریل : حیدرآباد کے افسانہ نویس ابراہیم شفیق کی کہانی پر ... میموریل سوسائٹی کی طرف سے منعقد کی گئی۔

● مس رضوانہ فردوسی کو جامعہ عثمانیہ نے ایم فل کی ڈگری کا مستحق قرار دیا۔ مس فردوسی نے "ڈپٹی نذیر احمد کے مذہبی خیالات" پر ڈاکٹر انور معظم صدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز کی نگرانی میں مقالہ تکمیل کیا تھا۔

۲۲ اپریل : "ادبستانِ شلب" کا اجلاس بشیر وارثی صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا۔ سلطان محی الدین سیف اور عارف بیابانی صاحبان نے مضامین، زاہد رضوی اور علی سرور نے نظمیں سنائیں۔

● بزم اردو جامعہ عثمانیہ کے ایک غیر معمولی جلسہ میں "اقبال چیئر" کے قیام کے فیصلے پر وائس چانسلر پروفیسر رام ریڈی اور اراکین سینٹ کا ایک قرارداد کے ذریعہ شکریہ ادا کیا گیا۔

۲۵ اپریل : لندن یونیورسٹی کے اردو پروفیسر ڈاکٹر میتھیوز نے ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹیٹیوٹ اور انسٹی ٹیوٹ آف ایشین اسٹڈیز کی جانب سے بلائے گئے ایک اجلاس میں "محمد قلی قطب شاہ" کی شاعری پر لیکچر دیا اور دکنیات و صحیفۂ اردو کو متعارف کروانے میں ڈاکٹر زور اور دکنی محققین کی خدمات کو خراجِ تحسین ادا کیا۔ جناب خواجہ محمد احمد نے

اس جلسہ کی صدارت کی۔ ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب نے پروفیسر میتھیوز کا دانشورانہ علمیت اور انسانی تجربہ پسندی سے ملتے ہوئے ان کا تعارف کرایا۔

۲۸ اپریل : معروف افسانہ نویس جناب عاتق شاہ کے افسانوں کا نیا مجموعہ "مدراستے کی کہانی" کے نام سے اشاعتی مراحل میں ہے۔ اب تک شاہ کی پانچ کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں اردو تحریک پر ایک رپورتاژ "چالیس قدم" قابلِ ذکر ہے۔

۲۹ اپریل : اقبال اکیڈیمی کے زیر اہتمام دو روزہ سمینار کا افتتاحی اجلاس ڈاکٹر عالم خوندمیری کی صدارت میں منعقد ہوا۔ "اقبال اور عصریت" کے موضوع پر ڈاکٹر ظ انصاری، ڈاکٹر غلام دستگیر رشید، جناب سکندر توفیق نے مقالے سنائے۔ جناب خلیل اللہ حسینی نے افتتاحی تقریر کی۔

۳۰ اپریل : اقبال سمینار کا دوسرا اجلاس پروفیسر سراج الدین کی صدارت میں منعقد ہوا۔ پروفیسر اسلوب احمد انصاری، ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب اور پروفیسر سراج نے "فکرِ اقبال کے سماجی اور عمرانی پہلوؤں" پر مقالے سنائے۔

● گورنمنٹ پریس کے ملازمین کی طرف سے لہو پھنکا کا ملا جلسہ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ کئی ترقی پسند شعراء نے کلام سنایا۔

● ●

۳۸۳۴۹ ... ۶۱۹۴۴ ...
بہ یادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
ماہنامہ
سب رس
حیدرآباد
نگران :-
سید علی اکبر ایم اے کنٹیب
معتمد مجلس مشاورت
غلام جیلانی
مرتب :-
وقار خلیل

جلد : ۴۱
شمارہ : ۶
جون ۱۹۷۸ء
... ـــــ ۱۵ روپے
... ـــــ ۸ روپے
... ـــــ ایک روپیہ پچاس پیسے
مشاورت :
ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
ڈاکٹر غلام عمر خاں
رمن راج سکسینہ
عابد علی خاں
محمد منظور احمد
ناشر : سید علی اکبر
... نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان حیدرآباد۔۲
... ادارۂ ادبیات اردو پنجہ گٹہ حیدرآباد۔۴

ترتیب

چیف منسٹر سکریٹریٹ میں عوامی شکایات کے شعبہ کا قیام

عوام کی سہولت کی خاطر حکومت کے زیرِ غور عوامی کارروائیوں کی یکسوئی کے لئے درخواستیں اور شکایتیں وصول کرنے کے لئے چیف منسٹر سکریٹریٹ میں ایک علحدہ عوامی شکایات کے شعبہ کی تشکیل عمل میں لائی گئی ہے۔ یہ شعبہ جنرل ایڈمنسٹریشن ڈپارٹمنٹ سکریٹریٹ کی بلڈنگ حیدرآباد کی دوسری منزل پر قائم کیا گیا ہے۔

عوام سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ اپنی شکایتوں اور درخواستوں کی تیموکا پیلی اپنی کارروائیوں کی تفصیلات اور حوالوں و نیز ضروری مواد کے ساتھ مسٹر کے۔ کے معین الدین ڈپٹی سکریٹری حکومت آندھرا پردیش (کمپلینٹ سیل) آفس آف دی چیف منسٹر سکریٹریٹ حیدرآباد ۵۰۰۰۲۲ کو روانہ کریں۔

ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ

حکومت آندھرا پردیش حیدرآباد

9/78-79/821/16-6-78.

اپنی بات

جب بھی کسی ادیب یا شاعر کے سانحۂ ارتحال کی خبر سنی جاتی ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے جانے والی کی جگہ بساطِ شعر و ادب میں خالی ہی رہے گی۔ ہمارے ادب کو ایسے کتنے ہی سانحے برداشت کرنے پڑے۔

■ ۱۰ر مئی کو حیدرآباد کے ایک وضعدار بزرگ اور نئے لہجے کے بانکے سخنور حکیم یوسف حسین خاں طویل علالت کے بعد رحلت کر گئے۔ حکیم صاحب نظامیہ شفاخانہ یونانی کے طبیب حاذق اور طبّی کالج کے پرنسپل تھے، شعری مجموعہ "خواب زلیخا" شائع ہو چکا ہے۔ مشرقی اور مغربی علوم پر خاصی دستگاہ تھی، مزاج میں خلوص، لہجے میں مٹھاس اور فکر و نظر میں قدامت کا حسن اور جدیدیت کی مہک تھی۔ کلام سنانے اور کہنے کا انداز منفرد اور خوشگوار تھا۔ شرافت اور نیکیوں کا مجسمہ تھے۔ آخری زمانہ علالت اور تنہائی میں گزارا۔ 'مصر کا بازار' کے نام سے دوسرا شعری مجموعہ اشاعت کا منتظر ہے۔ خدا بخشے بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے۔

■ ۱۱ر مئی کو سعودی عرب کے صدر مقام جدہ میں ہند و پاک کے نامور شاعر مولانا منظور حسین ماہر القادری (۳۰ر جولائی ۱۹۰۷ء کیسر ضلع بلند شہر یو۔پی) محفل مشاعرہ میں اچانک خالقِ حقیقی سے جا ملے اور جنت المعلیٰ میں سپرد خاک کئے گئے۔ ماہر القادری مشہور ادبی و مذہبی ماہنامہ "فاران" کے ایڈیٹر تھے، ۱۹۲۸ء سے ۱۹۴۶ء تک حیدرآباد میں رہے، ماہر کے شعری اور ادبی شعور میں حیدرآباد کا بڑا حصہ رہا ہے۔ ابتدائی زمانے کا بیشتر کلام "سب رس" میں شائع ہوا۔ ۱۹۴۹ء میں کراچی گئے اور وہیں کے ہو رہے، غزلیہ اور نعتیہ شاعری میں ماہر القادری نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ خدا کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔

■ یکم جون کی دوپہر علی گڑھ میں ہند و پاک کا نامور نقاد، سخنور خلیل الرحمٰن اعظمی ایسا روشن ستارہ اپنے زیرِ تعمیر مکان 'اردو باغ' میں کینسر کے سبب بجھ گیا۔ پروفیسر اعظمی (۹/اگست ۱۹۲۷ء) اعظم گڈھ کے مذہبی اور علمی گھرانے کے فرد تھے، علی گڈھ نے ان کے فکر و فن کو جلا بخشی، پروفیسر رشید احمد صدیقی کے چہیتے شاگرد اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پروفیسر تھے، گزشتہ چار دہوں میں جن چند نقادوں اور سخنوروں نے نام کمایا اور ادبی دنیا سے اپنا سکہ منوایا ان میں خلیل الرحمٰن اعظمی سرِ فہرست نظر آتے ہیں۔ ترقی پسندی سے جدیدیت تک اعظمی نے تخلیقی اور تنقیدی نیز شعری اصناف کو آبرو بخشی، ہندوستان میں نئی غزل کی روایت اعظمی سے عبارت رہے گی۔ کلاسیکیت سے بھی ان کا رشتہ روشن رہا، ان کی پوری زندگی صلہ و ستائش سے بے نیاز خدمتِ شعر و ادب میں گزری۔ درجنوں اہم کتابوں کے مصنف کی حیثیت سے دنیائے ادب پروفیسر اعظمی کو یاد رکھے گی۔ خدا بخشے صاحبِ کردار دانشور تھے۔

تاخیر سے 'سب رس' کی اشاعت کے بارے میں ہم شرمندہ ہیں اور اس امر کے کوشاں ہیں کہ یہ وقفہ دور ہو اور ہر ماہ بروقت پرچہ منظر عام پر آئے۔ قارئین اور خریداروں نیز قلمی معاونین سے بھی اس باب میں بھرپور تعاون کی خواہش کرتے ہیں۔

(م غ ارشد)

★ اکبر رحمانی

اقبال سے لمعہ حیدرآبادی کے مراسم

اقبال اردو کے ایک عظیم فلسفی شاعر تھے۔ اگرچہ اُن کی شاعری ایک مخصوص فلسفہ اور طرزِ فکر کی نمائندہ ہے تاہم انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ جو پیغام دیا ہے وہ کسی خاص فرقہ اور قوم کے لئے نہیں بلکہ تمام بنی نوعِ انسان کے لئے ہے۔ اس لئے اقبال کی شاعری "جزویت پیغمبری" ہے اس حیات آفریں شاعر نے انسانوں کو جمود سے نفرت سکھائی۔ اِن میں حرکت و عمل کا جذبہ پیدا کیا۔ انھیں مقصدِ تخلیق سے آشنا کیا اور خودی کے اسرار و رموز بتاکر "ہزاروں سجدوں" سے نجات پانے کی تعلیم دی۔ وحدانیت اور بنی آدم[2] کا وہ تصور پیش کیا جہاں مشرق و مغرب ایک دوسرے سے گلے ملتے ہوئے نظر آتے ہیں اور رنگ و نسل، قوم و وطن اور حسب و نسب کے تمام بُت ضربِ لا الٰہ سے پاش پاش ہوکر بنی نوعِ انسان کو اخوت و محبت کے رشتہ میں منسلک کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

اقبال نے صرف "عظمتِ رفتہ" ہی کے گیت نہیں گائے بلکہ ماضی کے اُس سرمایۂ فکر کو بھی ہدفِ تنقید و ملامت بنایا جس نے "اقوامِ مشرق" کو بے عملی اور رہبانیت کی تعلیم دی تھی۔ ساتھ ہی حال کے مادہ پرستانہ افکار اور "مغرب" کی چیرہ دستیوں اور مکر و فریب سے بھی اقوامِ مشرق کو آگاہ کیا۔ اقبال نے عشق کا وہ لافانی تصور پیش کیا جس کے سامنے آتشِ نمرود سرد ہوجاتی ہے تو قضا خود "شکار" ہوجاتی ہے۔

اقبال کی شاعری الہامی، آفاقی اور عالمگیر قدروں کی حامل ہونے کی وجہ سے ہر دور میں مقبول رہی ہے۔ اس شاعری نے اپنے عہد اور مابعد عہد کے تمام شاعروں اور ادیبوں کو متاثر کیا۔ اس لئے موجودہ عہد کو "عہدِ اقبال" سے تعبیر کیا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔

اقبال کو اُن کی زندگی ہی میں عوامی مقبولیت و شہرت کا تاج مل گیا تھا۔ کونسی "بزم" تھی جہاں اقبال کی شاعری کا آوازہ نہ تھا۔ مسجد کے منبر سے لیکر ایوانِ سیاست تک ہر جگہ اقبال کی شاعری کی گونج تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کے عقیدت مندوں اور متاثرین کا حلقہ ہندوستان سے لیکر یورپ تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ سچ ہے کہ اقبال کے تعلقات نہایت وسیع ہونے کے باوجود اُن کا حلقۂ اربابِ زیادہ وسیع نہیں تھا۔ مگر اُن کے حلقۂ احباب میں زندگی کے مختلف شعبوں اور ہر مرتبہ و حیثیت کے لوگ تھے۔ اِن میں عالمِ دین بھی تھے اور سیاسی رہنما بھی۔ کالجوں کے پروفیسر اور نوجوان طالب علم بھی۔ ڈاکٹر، وکیل، ادیب، شاعر، نقاد، صحافی اور نوابانِ ریاست بھی۔ یہ کہنا غلط ہے کہ اقبال کے مراسم اعلیٰ مرتبت اور بڑے لوگوں ہی سے زیادہ تھے۔ ادنیٰ اور کم رُتبہ لوگوں کے ساتھ بھی اُن کے ویسے ہی گہرے اور بے تکلفانہ مراسم تھے۔ ---------------------------------- نوجوانوں اور طالب علموں سے تو انھیں والہانہ لگاؤ اور محبت تھی۔ وہ ہمیشہ اُن سے احترام سے پیش آتے اور اُن کی ہمت افزائی کرتے تھے۔ انھیں نوجوانوں اور طالب علموں میں سے ایک حیدرآباد کے ڈاکٹر عباس علی خاں لمعہ بھی تھے۔ اس نوجوان سے اقبال کو بڑی گہری محبت تھی۔ اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ وہ اکثر ڈاکٹر لمعہ کو "محسنِ اِناثق" کے لقب سے یاد فرمایا کرتے تھے۔

---

[1] سیاحِ اقبال نامہ حصہ اول۔ عطاء اللہ

ویسے حیدرآباد میں اقبال کے متاثرین و معتقدین کی کوئی کمی نہ تھی لیکن جنھیں اقبال کے دوست ہونے کا شرف حاصل رہا اور جن سے اُن کی مراسلت رہی ایسے چند ہی خوش نصیب ہیں۔ ان میں بھی ڈاکٹر لمعہ اس لحاظ سے زیادہ خوش نصیب ہیں اور اس بنا پر انھیں ان سب پر فوقیت حاصل ہے کہ اب تک اقبال کے حیدرآبادی دوستوں کے جو مکاتیب منظر عام پر آئے ہیں اُن میں سب سے زیادہ خطوط ڈاکٹر لمعہ کے نام ہیں۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مکاتیبِ اقبال کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ڈاکٹر لمعہ نے صرف اس وجہ سے ضائع کردیا کہ اُن میں "اقبال کی نجی زندگی" سے متعلق چند ایسی باتیں تھیں جن کا فاش کرنا لمعہ کی نظر میں "گناہِ عظیم تھا"۔ اقبال نامہ حصہ اوّل میں لمعہ کے نام جس قدر خطوط شائع ہوئے ہیں اُن سے لمعہ اور اقبال کے درمیان گہرے اور بے تکلفانہ مراسم کا پتہ چلتا ہے۔

ڈاکٹر لمعہ کو بچپن ہی سے علامہ اقبال اور اُن کی شاعری سے ایک خاص عقیدت رہی ہے " اقبال کے اکثر اشعار نوکِ زبان پر تھے لمعہ، کلام اقبال سے متاثر ہوکر اشعار کہتے تھے اور اپنے اشعار کو نذرِ عقیدت کے طور پر اقبال کے پاس روانہ کیا کرتے تھے"۔ [۱] اقبال سے اُن کے مراسم کی بنیاد ۱۹۲۸ء میں پڑی۔ اقبال سے اپنی مراسلت کے آغاز پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر لمعہ کہتے ہیں۔

"مجھے بچپن ہی سے شعر و شاعری کا ذوق تھا۔ کلام اقبال کا شیدائی تھا اور اُن کے اشعار کو ازبر کرلیا کرتا تھا۔ کلامِ اقبال ہی نے میری خوابیدہ شعری صلاحیتوں کو بیدار کیا۔ کلام اقبال سے متاثر ہوکر میں غزلیں اور نظمیں کہتا تھا۔ لیکن کسی 'رہنما' کے بغیر اس کوچہ میں قدم رکھتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ میری دلی تمنا تھی کہ علامہ اقبال میرے کلام پر اصلاح فرمائیں اور اس کوچہ میں رہنمائی کریں۔ اسی خیال اور جذبہ کے تحت میں نے علامہ اقبال سے خط و کتابت کا سلسلہ شروع کیا۔ ۱۹۲۸ء میں علامہ اقبال کو میں نے پہلا خط لکھا تھا۔ مجھے اُس خط کی تاریخ اور مہینہ صحیح طور پر آج یاد نہیں ہے۔ جو کچھ کہتا اقبال کی خدمت میں نذرِ عقیدت کے طور پر روانہ کردیا کرتا تھا۔ اور ہر بار اُن سے اصلاحِ کلام کی التجا کرتا تھا"۔ [۲]

۱۹۲۹ء میں لمعہ حیدرآباد میں انٹرنس کے طالب علم تھے۔ اسی زمانہ میں اُن کی علامہ اقبال سے پہلی ملاقات ہوئی۔ علامہ اقبال کا حیدرآباد کا یہ دوسرا سفر تھا۔ ۴ ارجنوری ۱۹۲۹ء کو وہ توسیعی لکچروں کے سلسلہ میں حیدرآباد تشریف لے گئے تھے [۳]۔ اقبال سے اپنی پہلی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لمعہ کہتے ہیں۔

" اقبال سے میری پہلی ملاقات جنوری یا فروری ۱۹۲۹ء میں حیدرآباد میں ہوئی تھی۔ اس وقت میں انٹرنس کا طالب علم تھا ایک دن اخبارات کے ذریعہ معلوم ہوا کہ علامہ اقبال حیدرآباد تشریف لارہے ہیں۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں کہ اقبال سے مجھے بڑی عقیدت تھی اور انھیں میں اپنا روحانی پیشوا مانتا تھا۔ اُن سے خط کتابت بھی تھی۔ اُن کے اکثر اشعار وردِ زبان تھے۔ اس لئے ان کا دیدار کرنے اور اُن سے ملنے کی دیرینہ تمنا تھی جب یہ خبر ہوئی کہ علامہ اقبال تشریف لارہے ہیں تو ہم تمام طلبہ بے چینی سے اُس وقت کا انتظار کرنے لگے جب اُن کی گاڑی تشریف لانے والی تھی۔ شاید وہ صبح یا دوپہر کی ٹرین سے حیدرآباد آئے تھے۔ پورے شہر میں علامہ کے آمد کی خبر پھیل چکی تھی اور ہر کوئی اُن کے دیدار و استقبال کے لئے بے قرار تھا۔ میں سیدھا اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ ریلوے

---

[۱] مرقعِ سخن جلد دوم۔ مرتبہ ڈاکٹر زورؔ
[۲] ڈاکٹر لمعہ سے ایک انٹرویو ــ از راقم
[۳] اقبال اور حیدرآباد از نظر حیدرآبادی ص۱۲

اسٹیشن پہنچا۔ وہاں لوگوں کا اس قدر اژدحام تھا کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں اسکولوں کے ننھے منے بچے، ہائی اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ، اساتذہ اور پروفیسر، صحافی، ڈاکٹر، وکیل، جوان، بوڑھے، سماجی اور سیاسی کارکن سب شامل تھے۔ جوں ہی علامہ اقبال ڈبے سے اُترے لوگوں نے "اسلام زندہ باد" "اقبال زندہ باد" اور نعرۂ تکبیر۔ "اللہ اکبر" کے نعروں سے اُن کا پرجوش استقبال کیا کسی مدرسۃ الاطفال کے بچے بھی پلیٹ فارم پر ایک قطار میں کھڑے ہوئے تھے۔ ان ننھے منے بچوں نے اقبال کی مشہور نظم ؎

چین و عرب ہمارا، ہندوستان ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے، سارا جہاں ہمارا

نہایت خوش الحانی سے پڑھا۔ عقیدت کے پھول اس قدر نچھاور کئے گئے کہ پورا پلیٹ فارم پھولوں کی خوشبو میں نہا گیا۔ بعد از آپ نواب صاحب کی بھیجی ہوئی کار میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہوئے۔ اس زمانہ میں حیدرآباد کے تخت پر نواب میر محبوب علی خاں جلوہ افروز تھے۔ اور وزیر اعظم کے عہدہ پر مہاراجہ سر کشن پرشاد متمکن تھے۔ مہاراجہ ایک اچھے شاعر ہونے کے علاوہ علم دوست اور ادیبوں و شاعروں کے قدر دان تھے۔ علامہ اقبال کو سرکاری گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرایا گیا تھا۔

میرے والد محمد ابراہیم علی خاں نظام سرکار میں مہتمم شکارگاہ تھے۔ بعد میں نواب سر نظامت جنگ نے اُن کی بہتر کارکردگی کو دیکھ کر انھیں موٹر خانہ کا انچارج بھی مقرر کر دیا تھا اس طرح سرکار عالیہ کے بڑے بڑے افسروں اور وزیروں سے والد بزرگوار کے نہایت خوش گوار تعلقات تھے۔ انھیں تعلقات کی وجہ سے مجھے علامہ اقبال کے اعزاز میں مہاراجہ کی طرف سے دی گئی پرتکلف دعوت میں شریک ہونے اور علامہ کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔

مہاراجہ نے علامہ کے اعزاز میں ایک شاندار مشاعرہ بھی منعقد کیا تھا۔ اسی مشاعرہ میں علامہ سے پہلی بار گفتگو کرنے کا موقع ملا۔ چند رسمی سی باتیں ہوئیں۔ اس ملاقات سے دل کو تسلی نہ ہوئی تھی۔ تنہائی میں ملنے اور کھل کر بات چیت کرنے کو طبیعت چاہتی تھی۔ ایک دن سرکاری گیسٹ ہاؤس پہنچ گیا۔ وہاں بھی ملاقاتیوں کا ہجوم تھا۔ آخر باریابی کی اجازت ملی.... دیکھ کر بہت خوش ہوئے مصافحہ کیا۔ اپنے پاس بٹھایا۔ تعلیم اور دیگر مشاغل کے متعلق دریافت کیا۔ میں نے پھر اپنی اسی دیرینہ تمنّا کا اظہار کیا کہ میرے کلام پر اصلاح فرمادیں۔ علامہ نے نہایت محبت آمیز لہجہ میں جواب دیا۔ "آپ کی بھیجی ہوئی نظمیں دلچسپی سے پڑھتا ہوں۔ آپ میں شعر کہنے کی فطری صلاحیت ہے۔ لیکن میری یہ نصیحت ہے کہ آپ کو تعلیم کی طرف زیادہ اور شعر و سخن میں کم وقت صرف کرنا چاہیئے۔" اس پہلی ملاقات نے میرے دل پر اثر کیا اور مجھے ایک قسم کی روحانی مسرت حاصل ہوئی۔

ڈاکٹر لمعہ نے اپنے روحانی پیشوا کی نصیحت پر پوری طرح عمل کیا۔ انٹرنس کے امتحان میں خوب محنت کی اور امتیازی نمبروں سے کامیاب ہوئے۔ امتحان ختم ہونے کے بعد چھٹیوں کا زمانہ تھا۔ فرصت کے رات دن تھے۔ علامہ اقبال نے لمعہ کی شاعرانہ صلاحیتوں کے متعلق جو الفاظ کہے تھے اُن سے لمعہ کی ہمت بندھی اور انھوں نے فرصت کے اوقات میں پھر شعر و سخن کی طرف توجہ کی۔ کلام اقبال سے متاثر ہو کر نظمیں لکھنے لگے اور انھیں علامہ کی خدمت میں روانہ کرنے لگے۔ اقبال نے بھی دل شکنی نہیں کی۔ اُن کی ہر نظم کو پڑھتے اور اس کی رسید بھیجتے تھے۔

لاہور
۵ر اپریل ۱۹۲۶ء

جناب من

نوازش نامہ ملا جس میں آپ کی نظم ملفوف تھی ابھی ابھی موصول ہوا جس کے لئے ممنون ہوں۔ مجھے اس اطلاع سے مسرت ہوئی کہ میرے اشعار کے مطالعہ سے آپ کو فائدہ پہنچا۔ آپ نے اپنی نظموں میں مجھ ناچیز کے متعلق جن جذبات کا اظہار فرمایا

اُن کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ نیاز مند۔ محمد اقبال

ٹمکو کے نام اقبال کا یہ پہلا خط ہے جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے ٹمکو اور اقبال کے درمیان مراسلت کا آغاز ۱۹۲۸ء میں ہوچکا تھا مگر افسوس اس دور کا کوئی خط دستیاب نہیں ہوا۔ ڈاکٹر ٹمکو لکھتے ہیں کہ ۔

"میں نے مکاتیبِ اقبال کا بہت بڑا ذخیرہ جس میں تقریباً پچاس ساٹھ خطوط تھے عطاء اللہ (مرتب اقبالنامہ) کے حوالے کردئیے تھے۔ انھیں خطوط میں ۱۹۲۸ء کے بھی چند ایک خطوط تھے"

اگر عطاء اللہ یہ ابتدائی خطوط بھی اقبالنامہ میں شائع کردیتے تو اس سے اقبال اور ٹمکو کے درمیان مراسلت کی صحیح تاریخ اور موضوع (SUBJECT MATTER) کے تعین کرنے میں بڑی مدد ملتی۔ تاہم ٹمکو کے بیان اور مندرجہ بالا مکتوبِ اوّل کی روشنی میں یہ قیاس آرائی کی جاسکتی ہے کہ اقبال کے ٹمکو کے نام ابتدائی خطوط کے مضامین بھی مکتوبِ اوّل کی نوعیت کے ہوں گے اور شاید مضامین کی یکسانیت کے پیشِ نظر عطاء اللہ نے ان ابتدائی خطوط کو اقبالنامہ میں شامل کرنا ضروری نہ سمجھا ہوگا۔

ڈاکٹر ٹمکو نے انٹرنس کا امتحان پاس کرنے کے بعد ۱۹۲۹ء میں کالج آف فزیشینز اینڈ سرجنز کے ڈپلومے کے لئے میڈیکل کالج بمبئی میں شرکت کی۔ بمبئی میں ان کو پانچ سال تک رہنا پڑا۔ بمبئی کے دورانِ قیام ٹمکو کے محبوب مشاغل۔ مطالعۂ کتب بینی اور سیرِ دریائے نربینس ([illegible]) تھے۔ دریائے نربینس کے کنارے ہی اُن کی شاعری پھلی پھولی۔ یہیں کے دلفریب نظاروں کے مضراب نے ان کی شاعری کے خوابیدہ ساز کو چھیڑا اور انھوں نے اپنے دلی جذبات کو اشعار کی شکل میں ظاہر کرنا شروع کردیا۔ یوں تو ٹمکو کی شاعری کی ابتدا نو دس برس کی عمر ہی سے ہوتی ہے لیکن گلشنِ شعر و شاعری میں دریائے نربینس کی آبیاری کے بعد ہی بہار آئی۔ بمبئی کے قیام کے دوران ہی ٹمکو نے اُردو کے علاوہ فارسی اور انگریزی زبانوں میں بھی شاعری کی۔ یہیں انھوں نے "گیتانجلی" کا مطالعہ کیا اور اسی دریا کے کنارے اُن کی گرو دیو ٹیگور سے ملاقات بھی ہوئی۔ بمبئی میں ٹمکو کے فرصت کے اوقات کا بیشتر حصہ شعر و شاعری میں گذرتا تھا

ٹمکو نے بڑی ہنس مکھ طبیعت پائی تھی۔ تکلف و تصنع سے ہمیشہ دُور دُور رہے۔ گفتگو کرنے کا انداز اس قدر پیارا ہوتا تھا کہ ایک بار ملاقات کرنے کے بعد دوسری ملاقات کی تمنا دل میں از خود پیدا ہوجاتی تھی۔ جس محفل میں جاتے اپنی دلچسپ باتوں سے رنگِ محفل نکھار دیتے تھے۔ بمبئی کی کسی محفل میں عطیہ فیضی سے اُن کا تعارف ہوا۔ اور اس کے بعد اُن کا شمار عطیہ کے دوستوں میں ہونے لگا۔ جب بھی عطیہ فیضی کے یہاں شعر و سخن کی کوئی محفل جمتی یا کوئی تقریب ہوتی ٹمکو ضرور مدعو کئے جاتے۔

علامہ اقبال سے ٹمکو کی دوسری ملاقات عطیہ فیضی کے دولت کدہ پر ہوئی اس ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے ٹمکو لکھتے ہیں۔ ۱۹۳۱ء یا ۱۹۳۲ء کا ذکر ہے علامہ اقبال لندن میں دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کرنے کے بعد بمبئی پہنچے تھے۔ انہی دنوں ایک سہ پہر کو محترمہ عطیہ فیضی نے اپنے دولت کدہ 'ایوانِ رفعت' میں اُن کے اعزاز میں ایک چائے پارٹی دی تھی۔ مجھے بھی مدعو کیا گیا تھا۔ اس پارٹی میں شہر کے اکابرین و عمائدین شریک تھے۔ یہ پارٹی ایک حسین و خوبصورت لان میں دی گئی تھی۔ ہر طرف پھولوں کی روشیں تھیں جس نے ماحول کو کیف آگیں اور فضا کو معطر بنادیا تھا۔ عطیہ بیگم نے علامہ کا تمام حاضرین سے تعارف کرایا۔ اقبال نے بھی مختصر تقریر کی اور اپنا ایک فارسی شعر سنایا جو اب تک مجھے یاد ہے ۔

چناں بزی کہ اگر مرگِ تست مرگِ دوام ۔۔۔ خدا ز کردۂ خود شرمسار تر گردد

[illegible]

سے میرے دل کو بڑی تکلیف پہنچ رہی تھی۔ ابھی میں یہ سوچ رہا تھا کہ کس طرح اپنے جذبات کو علامہ تک پہنچاؤں کہ عطیہ فیضی میرے پاس آ
اور ایک کاغذ مجھے تھما دیا جس پر ذیل کے اشعار درج تھے ؎

ترسم کہ تو می رانی زورق بہ سراب اندر | زادی بہ حجاب اندر میری بہ حجاب اندر
ہر کشت و بیاباں ہیچ و ہر کوہ و بیاباں ہیچ | برقے کہ بہ خود پیچد میرد بہ سحاب اندر
ایں صوتِ دلآویزے از زخمۂ مطرب نیست | مہجورِ جہاں حورے نالد بہ رباب اندر

یہ اشعار اقبال نے تحریر کئے تھے۔ پڑھ کر فوری طور پر ایک شعر نے میرے ذہن میں جنم لیا جسے صفحۂ قرطاس پر
کر کے اس چٹ کو عطیہ فیضی کی طرف بڑھا دیا۔ عطیہ بیگم نے وہ چٹ اقبال تک پہنچا دیا۔ اقبال کچھ دیر تک وہ شعر پڑھنے
گم صم سے رہے۔ آج بھی وہ شعر مجھے اچھی طرح یاد ہے۔

از مطرب و نے لمعہ مارا چہ سروکاریم | با چشمِ جنوں دیدم مطرب بہ رُباب اندر

عطیہ بیگم سے انھوں نے دریافت کیا کہ لمعہ کہاں ہے؟ مجھے بُلایا اور برمحل و موزوں شعر کہنے پر مبارکباد دیتے ہوئے کہا
"مجھے طاؤس و رُباب سے کبھی سروکار نہیں رہا مگر آج یہاں صرف میزبان کے جذبات کے احترام میں بیٹھا ہوا ہوں"۔

ڈاکٹر لمعہ کی اقبال سے تیسری اور آخری ملاقات مارچ یا اپریل ۱۹۳۷ء میں ہوئی۔ علامہ اقبال اس وقت سخت علیل تھے۔ ب
میں فرق آگیا تھا۔ اختلاجِ قلب کی شکایت پیدا ہوگئی تھی اور یہ محسوس کر رہے تھے کہ امتحان کی گھڑی قریب آگئی ہے۔ ڈاکٹر لمعہ اُن
کے لئے لاہور گئے تھے۔ چند گھنٹے اقبال کی معیت میں انھوں نے گذارے اور فوراً حیدرآباد واپس آگئے کیونکہ اُس وقت اُن کی والدہ
بیمار تھیں۔ لمعہ نے جتنے گھنٹے اقبال کے درمیان گذارے وہ انتہائی مسرت آفریں تھے۔ اس کا اندازہ علامہ اقبال کے ۲ر مئی ۳۷ء
کے خط سے ہوتا ہے۔ اس خط کے مطالعے سے لمعہ کی شخصیت کے کئی تابناک پہلو اُجاگر ہوتے ہیں۔ اس خط کی اہمیت اس وجہ سے بھی
ہے کہ علامہ اقبال نے اس میں اپنے فلسفۂ زندگی پر روشنی ڈالی ہے۔ نیز اقبال کے آخری ایام سے متعلق بھی ہمیں معلومات حاصل ہوتی ہے۔ علامہ
لکھتے ہیں۔ "نوازش نامہ ابھی ملا۔ خدا کا شکر ہے کہ اب جناب کی والدہ صاحبہ کی صحت اچھی ہے۔ آپ کے تشریف لے جانے کے بعد
دو روز تک ہمارے عزلت کدہ میں وہ کیفیت تھی کہ جس کو غالب نے شاید ہماری صحبت کے بارے میں موزوں کیا ہوگا۔ "اے تازہ وار
بساطِ ہوائے دل" سے آغاز کیا اور "ایک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے" پر اختتام کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ دنیا عجیب قسم کی فرحتی کامیڈی کا ٹریجڈی پر مبنی انجام ہے جس ڈرامہ کی ایکٹنگ ہم آپ جیسے انسان ا
رہے ہیں۔ اس کے ڈائرکٹر کی انسان نوازی پر فخر کرنا چاہیئے کہ اُس نے اپنے ڈرامے کی شوٹنگ کے لئے انسان کو منتخب فرمایا۔ دنیا کی
کامیابی یا ناکامی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ یہ دونوں بے معنی لفظ ہیں اور اسی دھن میں دنیا کی اکثریت مبتلا ہے۔

انسان صرف جویائے محبت اور اپنے یارِ حقیقی کی دُھن میں لگا رہے باقی تمام عبث اور خیالی دنیا کا یہ وہ فلسفہ ہے۔ ہم اس کو
رہیں جو ہم کو ڈھونڈنا چاہتا ہے۔ اس کو ڈھونڈیں، خوب ڈھونڈیں اور اتنا ڈھونڈیں کہ اپنے آپ کو پالیں۔

آپ کی چند ساعت صحبت میں میرے دل کو سرور حاصل ہوا۔ آپ درحقیقت مسرت فروش ہیں۔ خدا آپ کو ہر طرح بامراد
رکھے۔ میری صحت خراب ہو رہی ہے۔ بینائی میں فرق آگیا ہے۔ اختلاج بہت بڑھ گیا ہے۔ میں تو قائل نہیں معلوم ہوتا ہے کہ
کا وقت قریب آگیا ہے۔ تقریب نصیب ہو رہا ہے۔ ہم آخر شی بھی مل جائیں گے۔ انشاء اللہ۔

آپ کی والدہ صاحبہ قبلہ کی خدمت میں میری جانب سے قدمبوسی عرض کیجئے ۔

اس فکر انگیز خط سے اقبال کی دلی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے ۔ کیسی غم انگیز اور کرب کی حالت میں انھوں نے یہ خط لکھا ہوگا! ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے موت سامنے کھڑی مسکرا رہی ہے اور علامہ بھی اس مسکراہٹ کا جواب زیرِ لب تبسم سے دے رہے ہیں ۔ دنیا کو عجیب قسم کی طربیہ کامیڈی کا ٹریجیڈی پر مبنی انجام کہنا اس فانی دنیا کی کتنی سچی اور حقیقی تصویر ہے!

اقبال نے اس خط میں زندگی کا حقیقت آمیز فلسفہ بیان کیا ہے ۔ اُن کے نزدیک مادّی کامیابی و ناکامی بے معنی الفاظ ہیں ۔

ع　　برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی

حقیقی کامیابی اور سچی خوشی وہ ہے جو انسان کو آخرت میں نصیب ہوگی ۔ اور اس کی حصول کے لئے اقبال نے یہ راہ بتائی ہے کہ انسان کو چاہئے کہ وہ دنیا میں عشقِ حقیقی کی جستجو کرے اور معبودِ حقیقی کی دھن میں لگا رہے اس مقصد کے علاوہ کسی اور مقصد کو پانے کی جستجو عبث اور بیکار ہے ۔ مادہ پرستانہ افکار و نظریات نے انسان کو اس راہِ مستقیم سے گمراہ کیا ہے اس لئے اقبال انسانی زندگی کی معراج اور کامیابی اس بات میں سمجھتے ہیں کہ انسان اپنے معبودِ حقیقی کی جستجو میں ڈوب جائیں اور اتنا ڈوب جائیں کہ اپنے آپ کو پالیں ۔

لمو کی صحبت میں دل کو سرور حاصل ہونا اور انھیں "مسرت فروش" کہنا، لمو کی دلآویز شخصیت کی بہترین عکاسی کرتا ہے ۔

اس خط میں اقبال نے اپنے مرنے کی پیشین گوئی بھی کر دی تھی ۔ اس خط کے چند ماہ بعد ہی وہ اپنے معبودِ حقیقی سے جا ملے تھے ——●●

بقیہ "اُردو نامہ"
صفحہ ۴۶ سے آگے

اس سے پہلے ڈاکٹر ضیاء کی ایک اور کتاب "دکنی زبان کی قواعد" حیدرآباد اور کراچی سے شائع ہو چکی ہے ۔

۷ مئی ۔ نیشنل میوزک سوسائٹی کی طرف سے "جلسۂ یادِ مخدوم" جناب جہاندار افسر سب ایڈیٹر روزنامہ "انگارے" کی صدارت میں منعقد ہوا ۔ مسز احسن علی مرزا ہادی عابدی، الہ باشی اور حبیب مصطفےٰ نے بت اور مت کے عظیم سخنور مخدوم کی ادبی و سیاسی خدمات کو خراجِ عقیدت ادا کیا آخر میں سوسائٹی کے فنکاروں نے ساز پہ کلامِ مخدوم سنایا ۔

۱۸ مئی کو اُردو مجلس کا ماہانہ اجلاس ڈاکٹر غلام عمر خاں ریڈر شعبۂ اُردو عثمانیہ یونیورسٹی کی صدارت میں منعقد ہوا ! جناب محمد منظور احمد نے "پروفیسر سید محمد کی وضعدار شخصیت اور ان کی علمی و ادبی خدمات" پر مقالہ سنایا ۔ جناب طبیب انصاری (لکچرار گورنمنٹ کالج ہاسن ۔ کرناٹک) نے "جامعہ عثمانیہ کا تہذیبی کردار" کے موضوع پہ مضمون پیش کیا ۔ محفلِ شعر میں قدیم و جدید دبستانِ سخن کے شعراء نے کلام سنایا ۔ جناب صلاح الدین نیر معتمد اُردو مجلس نے شکریہ ادا کیا ۔

● ادارۂ ادبیاتِ اردو کے شش ماہی امتحانات حیدرآباد شہر کے مراکز اور اضلاع آندھرا و تلنگانہ کے علاوہ مہاراشٹرا اور دہلی میں ایک ساتھ (۷ تا ۲۰ مئی) منعقد ہوئے ادارہ کے امتحانات اُردو عالم اور اُردو فاضل جامعہ عثمانیہ کے مسلمہ ہیں ۔

نیاز فتح پوری

قندِ مکرر

اُردو کا رنگِ تغزل

دنیا کی مختلف زبانوں میں سب سے پہلا شعر یا مصرعہ کب موزوں ہوا ۔ اسے کوئی نہیں جانتا ، اور شعر کیا ، خود الفاظ کی پیدائش کا بھی علم صحیح کسی کو نہیں ۔ آفرینش عالم کے کروروں سال بعد جب زمین پر انسان نمودار ہوا تو اس کے نشو و نما کے چند مخصوص خطے تھے ۔ غالباً انھیں خطوں میں دو تین مختلف زبانوں کی بنیاد پڑی ہوگی اور انھیں دو تین بولیوں سے آج دنیا کی ہزاروں بولیاں بن گئی ہیں ۔

کسی چیز کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس کا ذکر سنتے ہی سراپا تو جہ بن جائیں اور اس سے مانوس ہونے کے بعد بھی کبھی کبھی اس کے تصور سے چونک اٹھیں ۔ افلاطون کا قول ہے کہ فلسفہ یا عرفان ، حیرت سے شروع ہوتا ہے ، لیکن شاید وہ ختم بھی حیرت ہی پر ہوتا ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنی زبان سے اس قدر مانوس ہیں کہ اس کی پیدائش یا نشو و نما کی کہانی بھول جاتے ہیں اور ہم میں سے اکثر وہ کہانی جانتے ہی نہیں ——— اُردو زبان ، اُردو نثر ، اردو نظم کی کہانی بار بار کہی جا چکی ہے اور کہی جائے گی ۔ لیکن آج ایک سرسری گفتگو اردو تغزل پر بھی سن لیجئے ۔

اردو کی پہلی غزل ، ردیف و قافیہ کی پابندی کے ساتھ کب کہی گئی ، اس کا صحیح علم نہیں ، لیکن اگر اس کو صحیح مان لیا جائے کہ اردو تغزل فارسی تغزل کی نقل ہے تو شاید ہم ایک ناقص سا اندازہ کر سکتے ہیں کہ اردو تغزل کی ابتدا کب سے ہوئی ، لیکن میرے نزدیک یہ خیال ہی قابل قبول نہیں کہ اردو غزل گوئی ، فارسی تغزل کی نقل ہے ۔ یہ کہکر گویا ہم یہ مراد لیتے ہیں کہ اردو غزل گوئی میں خود اپنی کوئی چیز نہیں ہے ، درانحالیکہ فارسی تغزل میں خود مقامی رنگ اس قدر کم ہے کہ تقلید کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ آپ اس کے جواب میں شاید گل و بلبل ، شراب و ساقی ، شیریں فرہاد ، مقتل و خنجر ، کعبہ و بت خانہ ، منزل و کارواں صحراد گلستاں ، مجنوں و گریباں وغیرہ کو پیش کریں گے ، لیکن غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ " مقامیت " سے وسیع تر چیزیں ہیں ۔ اور ان کو صرف اسلامی یا ایرانی نہیں کہا جا سکتا ، فارسی تغزل میں ان باتوں کا ذکر محدود یا مادی معنے میں بہت کم آیا ہے بلکہ ان کا استعمال عموماً تمثیلی حیثیت سے ہوا ہے ، کیونکہ یہ الفاظ ہر زبان ہر مقام اور ہر تہذیب و تمدن میں انسانی زندگی کے داخلی پہلو کی ترجمانی کر سکتے ہیں ۔ علاوہ اس کے اردو غزلوں میں الفاظ شاید دس پندرہ فی صدی سے زیادہ ہوں گے بھی نہیں اور اس لیے اگر ان کو ہم بدیسی چیز خیال کریں تو بھی اس کا اثر اردو تغزل میں بہت کم ہے اور جتنا ہے وہ بھی کوئی معیاری چیز نہیں سمجھا جاتا ۔

حقیقت یہ ہے کہ تغزل جغرافی صنف سخن تھا ہی نہیں، اس کا موضوع انسان و انسانیت ہے اور اسی لیے اس میں ...ران کی تفریق ہی خارج از بحث ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اردو غزل کی داغ بیل ہندوستان میں ادب پرست مسلمانوں نے ڈالی اور اسی لیے ...ے اسلوب میں وہ باتیں بھی آگئیں جن سے تعلیم یافتہ مسلمان طبقہ صدیوں سے متاثر و مانوس تھا یعنی فارسی تغزل لیکن ...رسی تغزل پر مقامی رنگ اتنا تیز نہ تھا کہ وہ ہندوستان کے باشندوں کے لیے بالکل بدیسی چیز ہوتا ورنہ ظاہر ہے کہ ...شاعری میں غزل پیدا ہی نہ ہوتی اور ہوتی بھی تو اس قدر مقبول نہ ہوتی۔

اردو غزل میں ان تمثیلات کا عنصر جنھیں ایرانی کہا جاتا ہے اتنا زیادہ نہیں ہے جتنا خود ہماری زبان کا یعنی اردو ...ا خود ہماری بولی ٹھولی اس طرح گھلی ملی ہوتی ہے کہ سارا شعر اپنی جگہ ایک مقامی چیز ہوتا ہے اور جن ٹکڑوں میں ہم اپنے ...ا دھڑکن محسوس کرتے ہیں، وہ اپنی زبان ہی کے ہوتے ہیں نہ کہ ایرانی تمثیلات کے!

غزل کی زبان عام طور پر سہل و نرم ہوتی ہے اور ہمیشہ انھیں شعراء کی غزل کو معیاری چیز سمجھا جاتا ہے جن کی غزل ...ا میں ہندی کے مہذب اور رچے ہوئے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ اس لیے غزل کو زبان و خیال دونوں حیثیت ...ے دیس کی چیز ماننا پڑے گا ورنہ اس کے ہزاروں اشعار ان لوگوں کی زبان پہ نہ ہوتے جو فارسی جانتے ہی نہیں۔ ...ل میں ہمارے کاروبار، ہمارے دفتر، کارخانے اور کھیتوں کا ذکر نہیں ہوتا نہ اس میں علوم و فنون کا بیان ...نہ دنیا کی اقتصادی و سیاسی تحریکوں کا، لیکن اس میں ان سے زیادہ اہم اور اساسی چیزوں کا ذکر پایا جاتا ...یعنی اس میں ہم آپ ہوتے ہیں۔ کائنات کے مجموعی تاثرات ہوتے ہیں اور ہمارے وہ مرکزی جذبات ...یثیت عالمگیر ہے۔

غزل کو ہماری عملی زندگی کے مادی پہلو سے کوئی غرض نہیں، غزل کی شاعری ایک مہذب اور رچی ہوئی بیکاری ...شاید ایسی بیکاری جو فلسفہ و تمدن کی روح و رواں بن سکتی ہے۔

انسان کیا کرے، اس سے زیادہ اہم سوال شاید یہ ہے کہ انسان کیا محسوس کرے اور غزل اسی مقصد کو اپنے ...انداز میں پورا کرتی ہے۔ غزل سمیٹ اور لپیٹ ہوتی ہے اس کے اسلوب میں مختصر حقائق کو جامعیت و ترنم کے ...ل کی گہرائیوں میں اتار دینے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ غزل میں ایک معاملہ یا کیفیت کا ہر پہلو اپنی پوری کلیت کے ...یدان پر چھا جاتا ہے اور یہیں سے غزل اور نظم کا فرق نمایاں ہو جاتا ہے۔ غزل کا ہر شعر اپنی جگہ ادھوری بات ...ا ملک وجدان، تخیل اور تصور کا تعلق ہے نظم و غزل کی کیفیتیں بالکل ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ غزل کی اہم ...ت یہ ہے کہ اس کا لہجہ مانوس ہو، اس لیے شعور انسانی غزل کے اشعار سے فوراً حقائق تک پہنچ جاتا ہے اور ...شعر ہمارے وجدان کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔

...ردو تغزل پر کئی پہلوؤں سے نظر ڈالی جا سکتی ہے مثلاً دہلی اور لکھنؤ اسکول کا تغزل، تغزل میں حسن و عشق کا معیار ...خلاق، تغزل و فلسفہ، تغزل و نفسیاتی حقائق وغیرہ وغیرہ، لیکن اس وقت ان میں سے کسی پہلو پر گفتگو نہیں کروں گا۔

بلکہ ان سب سے ہٹ کر کچھ اور باتیں کہوں گا ۔

اردو غزل کا ذکر چھیڑتے ہی سب سے پہلے میر کا نام ہمارے سامنے آتا ہے ۔ ہر چند ان کے زمانہ میں اور بھی کئی شاعر ایسے ہوئے ہیں جن کی غزلوں میں جان ہے، لیکن غزل کو بلند ادب کا مرتبہ دینے میں اوّلیت کا فخر میر کو حاصل ہے اور اس کے بعد سوداؔ اور دردؔ کو ۔

کہا جاتا ہے کہ اردو غزل کا آغاز اور ایک صدی تک اس کا نشو و نما ہماری زندگی کے انحطاطی دَور کی یادگار ہے جب ہندوستان میں ہندوستانی حکومت کا چراغ جھلملا رہا تھا، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا بابرؔ و اکبر کے زمانہ میں میرؔ، سوداؔ اور دردؔ کی سی عشقیہ شاعری ممکن نہ تھی. شیکسپیر اپنی قوم کے انتہائی عروج کے زمانہ میں پیدا ہوا تھا پھر بھی اس کی شہرت کا راز اس کی المیہ تمثیلوں ہی میں پوشیدہ ہے ۔

یہ درست ہے کہ زمانہ کی حالت سے شعوری یا غیر شعوری طور پر شاعر ضرور متاثر ہوتا ہے لیکن اس کلّیہ کو استعمال کرنے میں کسی قدر احتیاط کی ضرورت ہے کیونکہ شاعر کے ذاتی حالات اور فطری افتادِ مزاج کو بھی اس میں بڑا دخل ہے ذوقؔ کی عمر کا بڑا حصہ مفلسی میں گزرا لیکن قناعت و خود داری انھوں نے کبھی نہ چھوڑی. برخلاف اس کے غالبؔ کو دیکھئے کہ ہر طرف سے روپیہ ان کو ملتا رہا لیکن ان کی قنوطیت کا عنصر بدستور قایم رہا. یہی وجہ ہے کہ ذوقؔ کا کلام ہمارے دل کی کلی کھلا دیتا ہے اور غالبؔ ہم کو ہنساتا بھی ہے تو ہمارا دل دُکھ کر رہ جاتا ہے. بہر حال میر اور غالب کے زمانہ کی شاعری میں جو فرق پایا جاتا ہے ۔ اس میں دو خاص باتیں دیکھنے کی ہیں. ایک یہ کہ حسن و عشق کے واردات میں کوئی تبدیلی نظر آتی ہے یا نہیں، دوسری بات زبان کی صفائی، روانی اور بندش کی چستی ہے. زبان تو پھر پیچیدہ بھی ہوتی گئی اور سلجھتی بھی رہی، لیکن جہاں تک جذباتِ محبت کا تعلق ہے، میر کا حوصلہ شکن احساس غالب کے دور میں بدل جاتا ہے اور عشق کی طبیعت اگر بہل نہیں جاتی تو کچھ سنبھل ضرور جاتی ہے ۔

میرؔ کے یہاں جو وسعت اور گہرائی پائی جاتی ہے وہ اس کے معاصرین میں بہت کم پائی جاتی ہے میر کے یہاں محض غم و غصہ، سوز و گداز، حسرت و بیدلی ہی نہیں بلکہ ایک خاص داخلی بصیرت بھی اس کے یہاں پائی جاتی ہے اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اگر میر کے سے محبت کرنے والے اس دور میں ہوتے بھی تھے تو وہ شاعر نہیں تھے اور اپنا درد دکھ اپنے ساتھ قبروں میں لے گئے. رہا ذوقؔ و غالبؔ کا زمانہ سو یہ ہر اعتبار سے مختلف تھا. ظفرؔ کی عشقیہ شاعری میں غم کے عناصر پائے جاتے ہیں لیکن کمزور اور پھیکے پھیکے سے ۔ اس زمانہ میں مومنؔ بیشک ایک ایسا شاعر ہوا ہے جس کی انا کی شدت تسلیم کرنا پڑتا ہے، لیکن وہ کلیہ تمام کر رہ جانے کی جگہ نفسیاتی کیفیات کی تلخیاں پیش کرتا ہے جن سے ہمیں خاص دلچسپی پیدا ہونے لگتی ہے. وہ جذبات سے مغلوب ہونے کی بجائے، وقوفِ جذبات کو اپنی شاعری کا خاص مقصد قرار دیتا ہے. مومنؔ پہلا شخص ہے جس نے نفسیاتی واقعیت کی داغ بیل اردو تغزل میں ڈالی جو نہ جی کھول کر رونے دیتی ہے نہ کھل کر ہنسنے دیتی ہے، لیکن افسوس ہے کہ لوگوں نے غالب کے مقابلہ میں مومن کی طرف کم توجہ

کی اور اس کا سبب غالباً یہ تھا کہ غالب کے یہاں صرف الفاظ کا اشکال ہے اور مومن کے یہاں مفہوم کا۔ غالب کا مشکل سے مشکل شعر آسان ہو جاتا ہے اگر آپ الفاظ کے معنے اور ان کی ترکیب کو سمجھ لیجے لیکن مومن کا آسان سے آسان شعر سمجھنا مشکل ہے اگر ہم کو جذبات کے نفسیاتی ادراک کا شعور حاصل نہیں۔

میر اگر اپنے زمانہ کا تنہا شاعر تھا تو مومن بھی اپنے عہد کا ایک ہی شخص تھا۔ اور ان دونوں کا فرق یہ تھا کہ میر کا فن دلوں میں آگ سلگاتا تھا اور مومن کا فن ہمارے سینوں کے اندر نشتر توڑتا۔ اس کے بعد بھی دلی میں اچھے اچھے شاعر ہوئے لیکن ان میں سے کوئی بھی کسی ایسی خصوصیت کا حامل نہ تھے جسے مرکزی حیثیت دی جاتے۔ البتہ داغ کے تغزل کو علٰحدہ جگہ دینی پڑے گی، کیونکہ وہ میر اور مومن دونوں سے مختلف تھا، یعنی اس وقت تک لوگوں کی نگاہیں تغزل کی صرف وسعت اور گہرائی کی طرف تھیں، لیکن اب سطح پر بھی انہیں کچھ دلچسپیاں نظر آنے لگیں اور کھلنڈرے پن سے الجھنے لگیں۔ داغ کا رنگ میر و مومن کے رنگ کا انحطاط نہ تھا بلکہ ان سے علٰحدہ بالکل دوسری چیز تھی جو دلی سے باہر کی پیداوار تھی اور اس سلسلہ میں لکھنؤ اسکول کی شاعری کا ذکر کرنا ناگزیر ہے۔

جب دلی مٹی تو لکھنؤ کی زندگی میں ایک زمانہ ضرور ایسا آیا جس میں خاصی چہل پہل پائی جاتی تھی اور رنگ رلیوں کی بھی کمی نہ تھی، لیکن اس جگمگاہٹ میں آتش بازی کی روشنی سے زیادہ کوئی بات نہ تھی جسے ہم ایک "دلفریب انحطاط" کہہ سکتے ہیں۔

یہاں میر بھی آئے سوز بھی آئے۔ لیکن "پورب کے ساکنوں" سے وہ گھل مل نہ سکے اور نہ یہاں کا رنگ ان کی شاعری میں کوئی تغیر پیدا کر سکا۔ البتہ مصحفی نے اردو تغزل کو ایک معتدل مزاج عطا کیا اور اسی اعتدال کے بدولت وہ سنگلاخ زمینوں سے اس طرح گزر جاتا ہے جیسے پانی کا ریلا کنکر پتھر سے۔ مصحفی نے اردو غزل کو گویا حسن کا سکون اور عشق کا خرام ناز عطا کیا جو معمولی بات نہیں۔

انشا کی غزل گوئی کو لوگ دھیان میں نہیں لاتے، لیکن وہ چیز جسے انگریزی میں (Fancy) اور (CONECIT) کہتے ہیں یعنی خیال و تصور میں گدگدی سی پیدا کرنا اور استعارات و تشبیہات سے کھیلنا صرف انشا کے یہاں ملتی ہے۔ جرأت نے نفسیاتی کیفیات کی جتنی مصوری کی ہے وہ بھی اپنی جگہ بے مثل ہے یہاں تک کہ داغ بھی اس کی تقلید میں کامیاب نہ ہوا۔

مصحفی اور انشا کے بعد ناسخ و آتش کا دور شروع ہوتا ہے۔ ناسخ نے خارجی تغزل کو اپنا کر گورکھ دھندا بنا دیا کہ وہ غالب بھی نہ رہا اور حسن و عشق اس کے نتائج سے فیصدی اشعار سے اس طرح غائب ہوا کر لڑکے لڑکیوں کے کورس میں داخلہ کے لیے ناسخ کی غزلیں ہر وقت حاضر ہیں۔ آتش نے جہاں اس رنگ کی تقلید کی ناسخ کی طرح بگڑ گئے اور ناسخ نے جہاں آتش کی نقل کی مار کھا گئے۔ آتش کے کلام میں حسن و عشق زیادہ نہیں، لیکن جتنا کچھ ہے وہ میر، غالب، مومن، جرأت، انشا، سب سے الگ ہے۔ آتش کی عشقیہ شاعری ایک صاحب باطن کی مجاز پرستی معلوم ہوتی ہے۔ آتش نے عشقیہ تغزل کو ایک نیا مزاج دیا۔ نئی بانکپن کی سرمستی، نیا ابھار، نیا نکھار، نئی مادیت، نئی روحانیت بخشی اور مصحفی نے اس کی زبان کو کوثر و تسنیم بنا دیا۔ آتش

کا تغزل اس شخص کا تغزل نہیں ہے جو انفرادی زندگی کے پیچیدہ مسائل کا حل ڈھونڈ رہا ہو بلکہ اس شخص کا تغزل ہے جو ان مسائل کو حل کرنے کے بعد جسم کو بنا رہا ہے۔ یہ نشاط اور رنگینی سودا کے یہاں بھی ہے لیکن آتش کے یہاں اس کی [illegible] بہر حال ہندوستان میں مذاقِ زندگی اور مذاقِ محبت میر اور سودا کے زمانہ سے آتش کے زمانے تک بدلا ہو یا نہ بدلا ہو، لیکن شاعری کے اندر مذاقِ زندگی اور مذاقِ محبت دونوں بہت کچھ بدلتے رہے ہیں۔

اردو تغزل کا جاندار عنصر اور رچا ہوا حصہ لکیر کا فقیر کبھی نہیں تھا۔ اس کا قالب ہمیشہ بدلتا رہا اور یہ بات معنی، ادا اور اندازِ بیان کی تبدیلی تک محدود نہیں تھی۔

آتش اور ناسخ کے بعد امیر مینائی نے لکھنؤ میں غزل سرائی شروع کی اور ان کے تغزل میں ناسخ، مصحفی، آتش کے تینوں رنگوں کا امتزاج ہمیں ملتا ہے۔ امیر نے مصحفی کے رنگین البیلے پن کو ناسخ کی تصنع کی چاشنی دیکر اردو تغزل کو نئے انداز سے رچایا اور سنوارا۔ ناسخ کے بگڑے ہوئے رنگ اور داغ کے خطرناک کامیاب رنگ کی لالچ میں پڑکر امیر نے اکثر غزلوں کو بگاڑا بھی مگر یہ حیرت سے خالی نہیں کہ امیر خاندانِ آتش و مصحفی کے فرد ہوتے ہوئے اپنے تغزل میں بار بار ناسخ کا نافہ دبا کر بیٹھتے ہیں اور امیر سے کچھ ہی کم مشہور ان کے ہمعصر جلال خاندانِ ناسخ سے ہوتے ہوئے اپنے متعدد اشعار میں وہ سوز و گداز اور نغمگی بھر دیتے ہیں جن کی تاثر و لطافت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ وہی زمانہ ہے جب لکھنؤ کے اجڑنے پر دہلی والے اور لکھنؤ والے سب رام پور پہونچ گئے تھے اور ایک دوسرے کے رنگِ تغزل سے متاثر ہو چلے تھے۔ امیر اور داغ حیدرآباد میں پیوندِ خاک ہوئے اور کچھ دنوں بعد جلال لکھنؤ میں۔ ان کے ساتھ اردو تغزل کا دور ختم ہو گیا۔ صرف اردو تغزل کا نہیں بلکہ ہندوستانی تہذیب اور ہندوستانی زندگی کا بھی۔ اب ہندوستانی سماج اور ہندوستانی کلچر اور ادب کی دنیا بدلنے والی ہے بیسویں صدی کا آغاز ہے۔

امیر، داغ اور جلال کے شاگردوں کی آوازیں ابھی فضا میں گونج رہی ہیں۔ ان کی جانشینی کے بھی چرچے ہیں ابھی یہ بات کسی کو معلوم نہیں کہ جن کی جانشینی کی بحثیں جاری ہیں۔ وہ اپنی ملکیت اور ملوکیت لیکر دنیا سے سدھارے ہیں لیکن امیر، داغ اور جلال کے زمانہ ہی میں اردو تغزل حالی پانی پتی، شاد عظیم آبادی، آسی غازی پوری کے ہاتھوں نیا قالب اختیار کر رہا تھا۔ ان کی آوازوں میں جو خلوص تھا، جو معصومی تھی اور جو رس تھا وہ رفتہ رفتہ دلوں کو موہنے لگا کم سے کم ان دلوں کو جنہیں دھڑکنا آتا تھا۔ یہ بھی سو فی صدی داخلی اور معنوی انقلاب تھا جس میں اگر کوئی دخل ہے تو ہماری تہذیب اور زندگی کی نئی بیداری کو اور شعراء کے انفرادی وجدان کو نہ کہ طرزِ بیان اور طرزِ ادا جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اردو تغزل کے ہر دور میں ایک طرح کی لفظ پرستی دوسری طرح کی لفظ پرستی سے بدلتی رہی ہے، وہ خود لفظ پرستی کے دام میں گرفتار ہیں۔ زندگی بدلتی رہی اس لیے اردو غزل بدلتی رہی۔ جیسا ابھی گذارش کر چکا ہوں ہندوستان کی دنیا بدل رہی تھی اور ہمارے ادب کی ہر صنف کا بدل جانا لازمی تھا۔ ناول میں سرشار کا دور ختم ہو کر افسانہ نگاری کا دور شروع ہونے والا تھا، پرانے طرز کے قصائد اور قطعات کا دور ختم ہو کر آزاد، حالی، اسماعیل اور اکبر کا دور آنے والا تھا۔ پرانے تذکروں کی جگہ حالی اور شبلی تاریخ و تذکرہ کو نئے راستہ پر لا رہے تھے

علمی کتابوں کی تصنیف و تالیف کا دور شروع ہوگیا تھا۔ ہندوستان کا وسطی طبقہ مغربی کلچر کی روشنی اور آنچ کو جذب کر رہا تھا۔ شاعری کو سننے اور پڑھنے والوں کے دل و دماغ بدل رہے تھے، پرانا نظام ہندوستان کو خیرباد کہہ رہا تھا۔ اگر ہندوستان کے اس عالمگیر ذہنی انقلاب کا احساس کسی کو ہو تو اس انقلاب میں اردو غزل کی بدلی ہوئی آواز میں جو ہم آہنگی ہے وہ سمجھ میں آجاتی ہے گو یہ بات نہیں کہ نئے تغزل کے نمائندے کبھی کبھی قدما کی آواز نہ دیں۔ لیکن ان کے یہاں جو چیز دیکھنے یا سننے کی ہے وہ ان کی بازگشت آوازیں نہیں بلکہ نئی آوازیں ہیں۔ اگر ہمارے کان کے پردے ان نئی آوازوں کو پہچان سکیں۔

دہلی (اور اس کے اطراف) میں غالباً داغ ہی کی کچھ کامیاب اور نہ کامیاب تقلید ہوتی رہی اور لکھنؤ و بہار لکھنؤ میں امیر کی۔ لیکن لکھنؤ میں صفی، عزیز، محشر، نوبت رائے نظر وغیرہ نے بیسویں صدی کے ابتدائی دس پندرہ سال میں اردو غزل کو نئی شستگی اور شائستگی دی اگرچہ ایسا کرنے میں انھوں نے بار بار مرثیت کا سہارا لیا۔ میں اسے جذباتی اسکول کی شاعری کہتا ہوں۔ اس اسکول کے کئی شاعر سنجیدگی اور خلوص پیدا کرنے کے لیے امیر مینائی کے نشاطیہ رنگ کے بجائے غم کا سہارا لیتے ہیں اور غم کو عموماً بستر علالت، نزع، جنازہ اور گور غریباں کے تصورات تک محدود کر دیتے ہیں۔ لیکن یہ نہیں کہ اس اسکول کے تغزل میں حسن و عشق کی داستان نہیں۔ قبل کی عشقیہ شاعری کے کچھ اثرات جذباتی مدرسہ کی عشقیہ شاعری میں ضرور نظر آتے ہیں۔ مگر اس اسکول کے اچھے عشقیہ اشعار محض قدما کی تقلید نہیں ہیں۔ غالب کی پرچھائیں اور کہیں کہیں میر کی ہلکی سی پرچھائیں ان اشعار پر ضرور پڑتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میر اور غالب کے جذبات میں وہ مرکزیت و ہمہ گیری ہے کہ ان کی آوازیں پچاسوں اور سیکڑوں برس بعد بھی دلوں میں اتر کر پھر ابھرتی ہیں۔ لیکن ان کے یہاں غالب کی آواز ایک نیا چٹیلا پن اور ایک نئی تلخی لیے ہوئے اور میر کی آواز بھی کچھ پہچانی کچھ نئی صورت میں نظر آتی ہے۔ وسعت و تنوع البتہ جذباتی اسکول کی عشقیہ شاعری میں کم ہے۔ اس شاعری میں جو نکھار ہے وہ عموماً ایک بند کلی کا نکھار ہے کھلے ہوئے پھول کا نکھار نہیں ہے۔ بہر حال یہ گھٹے ہوئے غنچہ سربستہ بھی ایک رنگ و بو رکھتے ہیں گو اس رنگ و بو میں سیاہی مائل فاسد خون کا رنگ بھی جھلکتا ہے۔

اس رقتی ماتمی یا جذباتی اسکول سے ثاقب لکھنوی کا تغزل کچھ الگ تھلگ ہے اور کچھ ملتا ہوا بھی۔ ثاقب کے یہاں پر خلوص عشقیہ اشعار کا فقدان ہے اور حسن و عشق کا بیان جہاں جہاں ہے وہ لطافت و رنگینی سے خالی ہے انھوں نے حیات و کائنات پر ذاتی شکوہ و شکایت اور غم پرستی سے آگے بڑھ کر بہت کم کہا ہے۔ مگر گل و بلبل اور اردو تغزل کی روایتی تمثیلوں کی بنیاد پر ثاقب نے ایسے اشعار بھی ضرور کہے ہیں۔ جن پر کچھ ہیں اکثر ہلاقہ ہیں۔ آرزو تو ثاقب سے بھی زیادہ جذباتی اسکول کے شعراء سے علٰحدہ ہیں۔ انھوں نے میر کی لمبی بحروں میں اور میر کے انداز کی مشابہت لیے ہوئے غزلیں کہی ہیں اور حسن و عشق کی کیفیات کی کہیں کہیں بڑی کامیاب مصوری کی ہے لیکن چونکہ بوساطت اپنے استاد جلال کے وہ خاندان ناسخ کے شاعر ہیں اس لیے زیادہ تر خارجی اور کم تر داخلی کیفیات حسن و عشق کی مصوری آرزو کے یہاں ملتی ہے۔ آرزو کے یہاں زبان و طرز ادا میں وہی سنگار اور بناؤ پایا جاتا ہے جو مسجع و مرصع

تر معلوم ہوتا ہے ۔ الغرض غالب کی شاعری کو دیکھیے تو جذباتی اسکول سے بہت الگ نظر آتے ہیں ۔ لیکن آرزو کو جذباتی اسکول کا شاعر نہیں کہا جا سکتا ۔

جذباتی اسکول کی تپ زدہ شاعری کے عروج کا زمانہ ۱۹۱۰ء سے ۱۹۲۵ء یا اس کے کچھ پہلے بعد تک سمجھیے ۔ لیکن آخر کار دبی ہوا ابھرنا تھا ، یعنی مرزا یاس نے ان منہ بند کلیوں پر وہ چنگاریاں برسائیں کہ ان کی افسردگی دھوپ میں تبدیل ہو گئی ۔ یگانہ کے تغزل میں حسن و عشق کی داستان بہت کم آتی ہے اور جب آتی ہے تو اس میں جذباتی اسکول کے نسائی جلاپے کے انداز نہیں ہوتے بلکہ مردانہ زور ہوتا ہے ان کے تخیل و احساس کی گرمی خود بخود کو دیدیتی ہے ۔ یگانہ عاشق نہیں لیکن ان کے عشقیہ اشعار میں حسن کا احساس و مشاہدہ ہے اس لیے وہ بڑے پتہ کی کہہ جاتے ہیں ۔ یگانہ کے زیادہ تر اشعار براہ راست حسن و عشق کے بیان سے متعلق نہیں بلکہ حیات و کائنات کے دوسرے پہلوؤں سے متعلق ہیں اور ان اشعار میں بلا وہی چوٹ کھائے ہوئی تلملاہٹ پائی جاتی ہے جو ان کی عشقیہ شاعری میں ہے کلام یگانہ میں گرمی دھوپ کی آنچ ضرور ہے لیکن تو ناسلنے کے ساتھ ساتھ وہ ہمارے سینے ایک طاقت بخش فرحت کو اپنے اندر رکھتا ہے ۔

یاس ادھر لکھنؤ کے رقت پسند جذباتی اسکول کی شاعری پر آگ برسا رہے تھے ، ادھر حسرت موہانی قید فرنگ کی چکیوں کے سنگیں پاٹوں سے جو چنگاریاں اُڑتی تھیں ، ان کو نرم اور رسیلے نغمہ میں تبدیل کر رہے تھے ۔ حسرت نے اپنی جنبش کو روح تغزل میں بالکل حلول کر دیا تھا ۔ جرأت ، مصحفی اور مومن کے انداز احساس اور وجدان کی مختلف تھرتھراہٹوں کا وہ لطیف و مکمل امتزاج حسرت کے تغزل میں ملتا ہے جسے ہم اپنے قلب و گوش کے لیے صرف ایک نعمت کہہ سکتے ہیں ۔ حسرت کے کلام کی واقعیت ایک ایسی نرم راست گوئی اور رنگین سچائی بن گئی ہے جسے ہم جانِ تغزل کہہ سکتے ہیں ۔ بیان و وجدان کی اس یکجائی کی مثال حسرت کی غزلوں میں ملتی ہے ان کے اشعار میں شعور کی وہ سادگی و پرکاری اور کیف و اثر کی وہ رنگینی نظر آتی ہے جو بیک وقت سامنے کی چیز بھی معلوم ہوتی ہے اور درکِ انسانی کی آخری منزل بھی اردو تغزل میں اتنی لطیف و رنگین داخلیت اس سے پہلے مفقود تھی ۔ حسرت کا تغزل ہمیں تخیل کی بلند پروازیوں سے فلسفیانہ معنویت سے اور تصوف و عرفانیت سے بے نیاز کر دیتا ہے اور وہ ہمارے اندر ایک ایسی رفاقت (COMPANATIONSHIP) کی صلاحیت پیدا کر دیتا ہے جس کی مثال اردو کے کسی غزل گو کے کلام میں نہیں ملتی یہاں تک کہ امیر و غالب کے کلام میں بھی نہیں ۔

فانی بدایونی نے بھی اپنے انداز تغزل سے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا شروع کیا ۔ لیکن ان کی غزل گوئی ایسی ہے جیسے چوٹ کھائی ہوئی بجھی ہوئی طبیعت کو کرید کرید کر خاک کی ڈھیر سے چنگاریاں اڑائی جا رہی ہیں ۔ وہ لکھنؤ کے جذباتی اسکول اور لکھنؤ کے عام رنگ سے کافی حد تک متاثر معلوم ہوتے ہیں لیکن وہ لکھنؤ کے رنگ سے صرف غمگینی اور نکھرا ہوا انداز بیان لے لیتے ہیں اور مرثیت نہیں ہے ۔ باقیات اور عرفانیاتِ فانی کو چھوڑ دیا اور قدر دانی کے ساتھ پڑھ چکنے کے بعد کائنات اور حیات بجائے کوئی وسیع ڈراماتی کیفیت رکھنے کے بہت

ہوئی چیز معلوم ہونے لگتی ہے ۔ فانی کا شیوۂ تسلیم و رضا ، محاسنِ کائنات و حیات کا احساس پیدا نہیں کرتا ۔ ان
یہاں نہ تحیر ہے نہ تحیر کی سپردگی ۔ محبت کی تلخیاں ان کے یہاں شدید سے شدید تر یا تلخ تو ہوتی گئی ہیں ۔ لیکن شاید
کہنہ ہونے کے بجائے وہ تیزاب ہو کر رہ گئی ہیں ۔

فانی کے ساتھ ہی ساتھ اصغر گونڈوی بھی ابھرے ۔ اصغر نے اپنا پینتیس یا چالیس برس کی عمر تک کا کلام شایع
ہونے سے روک دیا ۔ مذہب کے اثر سے جو ذہنی و اخلاقی انقلاب چالیس برس کی عمر میں اصغر کی زندگی میں ہوا
اس نے ان کی طبیعت میں نئی لطافت پیدا کر دی تھی اور اسی لیے ان کے کلام میں داخلی طہارت ، روحانی نشاط اور
لیف سرمستی کی کمی نہیں ۔

اصغر کے کلام میں انسان کا انسان سے عشق قریب قریب مفقود ہے ۔ آب و گل کی دنیا ، ماہ و انجم ، دریا و
صحرا ، بادہ و ساغر یہاں تک کہ پیکرِ انسانی اور تمام مادی چیزیں اصغر کے یہاں سماوی ہو گئی ہیں ۔ بات شاید یہ ہے کہ
اصغر کی جوانی نے جنسیات و شہوانیات میں روحانیت کا عنصر پایا ہی نہیں تھا ۔ عاشق و محبوب کے تعلقات جنسی کو
ان کا شعور لطیف بنا ہی نہ سکا تھا ، اسی لیے ان کی روحانیت سونی نظر آتی ہے ۔

اسی کے ساتھ جگر کو دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ وہ ہماری گوشت و پوست کی رگوں پر زخمہ زن ہیں ۔ ان کے
تغزل میں ان کے پڑھنے کا انداز چار چاند لگا دیتا ہے ۔ جگر جیتے جی اپنی طرزِ زندگی کی وجہ سے ایک سنسنی پیدا
کرنے والی روایت (Tradition) بن گئے اور چونکہ ان کے تغزل میں دعوتِ فکر کم اور دعوتِ کام
و دہن زیادہ ہے ۔ اس لیے اپنی شاعری و شخصیت کے اُبال سے جلد ابھر آئے ۔ لوگ کہتے ہیں کہ جگر کی شاعری
کا والہانہ انداز ہے ۔ کہیں مجھے ایک ہیجانی اضطراب کی کیفیت نظر آتی ہے ۔ بیمار کی لڑکھڑاتی ہوئی چال اور
شرابی کی لغزشِ مستانہ میں جو فرق ہے وہی جگر کے ہیجان اور سچے والہانہ انداز میں ہے ۔ جگر کی کامیابی کا اک راز
یہی ہے کہ ان کے تغزل میں جتنی زندگی ہے اس سے کہیں زیادہ "شاعری" ہے اور زندگی بھی ایک بیتاب
جسمانی خواہش والی زندگی ہے لیکن اور برے دونوں معنوں میں جو "شاعری" جگر کی غزلوں میں پائی جاتی
ہے ۔ اس کی وجہ سے ان کی کامیابی ایک حد تک لازمی تھی کیونکہ داغ دہلوی کی روایتیں اور لکھنؤ کی لفظ
پرستی کی روایتیں اب تک ان کی شاعری کی دنیا میں جمہور کے لیے ایک کشش و دلفریبی رکھتی ہیں ۔ لیکن اس
کے یہ معنے نہیں کہ جگر کی زندگی اور شاعری کے یہ محرکات ان کے تغزل میں کوئی محاسن پیدا کر ہی نہیں سکے ۔
کلام جگر کے اگر اس حصے کا انتخاب کیا جائے جو ذرا سنبھل کر کہا گیا ہے یا جہاں ان کے وجدان کا ہیجان اپنے
اظہار میں کامیاب ہو گیا ہے تو یہ مجموعہ ہمارے کبھی کبھی کے توجہ کی چیز ضرور رہے گا ۔ چونکہ ہیجان و اضطراب بہت جلد
ختم ہو جانے والی اور حقیقی مستی و والہانہ پن سدا بہار چیزیں ہیں ۔ اسی لیے جگر کا تغزل جتنا سنتے ہی ہمیں متاثر
کرتا ہے اتنا بعد کو نہیں ۔ اس میں شہرت کی بو اور اڑان ہے لیکن شراب کہنہ کا دیرپا اثر اس میں نہیں جگر
کے اشعار ایسے ہیں جن میں وہ روک تھام ہو کر ہم انھیں تنہائی کے لمحوں میں گنگنا گنگنا کر محسوس کریں ...

متاثر ہو سکیں، ان میں رنگِ شاعرہ یا رنگِ محفل زیادہ ہے اور خلوت کے جلوے بہت کم ہیں۔

یہ ہے مختصر سا حال آج تک کے اردو تغزل کا۔ دورِ حاضر کے اردو تغزل کو ہم پچھلے ادوار کے تغزل سے کچھ باتوں میں مختلف پاتے ہیں۔ "جذباتی" "رقتی" "ماتمی" مدرسۂ تغزل کے بعد کے شعراء کسی ایک مدرسہ یا اسکول کے نہیں ہیں۔ حسرت، یگانہ، اصغر، فانی، جگر ان سب کا الگ الگ مزاج ہے الگ الگ تغزل ہے لب و لہجہ، آوازیں اور فضائیں ضرور دورِ حاضر کی ہیں لیکن جو تنوع و اختلافِ مزاج ان میں ہے وہ ہمیں مجبور کرتا ہے کہ ہم انہیں دورِ حاضر کے متغزلین کا ایک گروہ کہیں نہ کہ ایک مدرسہ یا اسکول کا۔ چند اور امور بھی قابلِ لحاظ ہیں۔ اردو زبان و ادب پر خصوصاً اردو شاعری پر اور اس سے بھی زیادہ اردو غزل پر جو حکومت دہلی اور لکھنؤ کی تھی اور جہاں تک اردو تغزل کا سوال ہے حسرت اور ان کے غیر دہلوی اور غیر لکھنوی معاصرین کے کارناموں کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مٹ گئی۔ اردو رسائل نے جہاں تک شہرت قائم ہونے یا قائم کرنے کا سوال تھا اب مشاعروں کی جگہ لے لی ہے۔ اس طرح ہر پڑھا لکھا آدمی ملک کے مشہور شعرا کو جان پہچان گیا ہے اور شعراء کی اہمیت کے متعلق اہلِ ملک کا خیال منظم ہو چلا ہے۔ اب ایک تعلیم یافتہ جمہوریت اس کا فیصلہ کرتی ہے کہ کون شاعر کیا ہے اور اسے کتنا بڑا اور کتنا چھوٹا سمجھا جائے۔ یونیورسٹیوں میں اردو ادب کے مطالعہ اور رسائل میں تنقیدی مضامین کے اثر نے نئی آزادی اور نئی ذمہ داری اردو خواں پبلک کے لیے پیدا کر دی ہے۔ اردو ادب کی یہ ترقی ہندوستان کی اس نشاۃ ثانیہ کا نتیجہ ہے جو غدر کے بعد شروع ہوا اور جس نے پچھلے پندرہ بیس سال کے اندر ہمارے ملکی ادب میں ایک انقلاب رونما کر دیا۔

▲▲ (نگار سالنامہ ۱۹۴۱ء سے)

غزل

فیض احمد فیض

وہ بتوں نے ڈالے ہیں وسوسے کہ دلوں سے خوفِ خدا گیا
وہ پڑی ہیں روز قیامتیں کہ خیالِ روزِ جزا گیا

جو نفس تھا خارِ گلو بنا، جو اُٹھے تو ہاتھ لہو ہوئے
وہ نشاطِ آہِ سحر گئی، وہ وقارِ دستِ دعا گیا

جو طلب پہ عہدِ وفا کیا تو وہ قدرِ رسمِ وفا گئی
سرِ عام جب ہوئے مدعی تو ثوابِ صدق و صفا گیا

وہ دولتِ درد کی ابتدا وہ کہ جس سے یار تھے آشنا
وہ ادائے موسمِ گل گئی، وہ مزاجِ بادِ صبا گیا

ابھی بادبان کو تہہ رکھو، ابھی مضطرب ہے رُخِ ہوا
کسی راستے میں ہے منتظر وہ سکوں جو آ کے چلا گیا

(سویرا، لاہور ۱۹۴۸ء)

غزل

چتے ہیں اب کہیں آکر دلِ دیوانہ ہم
حقیقت کون سی ہے جس کا ہیں افسانہ ہم
ندر ہی سہی لیکن خبر بھی ہے تجھے
نگی ہی تشنگی ہیں ساقیِ میخانہ ہم
ے وہ باطن کے ابن الوقت وہ ظاہر کے دوست
کو دیتے رہ گئے اخلاص کا نذرانہ ہم
ڑی تھی بزمِ یاراں میں چھلکتے کیوں ہے
دۂ مہر و وفا کا بن کے اک پیمانہ ہم
جسے سمجھا تھا دریا وہ بھی نکلا تشنہ لب
لیے جاکر سنائیں پیاس کا افسانہ ہم
سمندر کی کہانی تھی پُرانی ہو چکی
ب خلا میں جاکے لکھنے کو ہیں اک افسانہ ہم
کو جو پانا تھا تم نے فکر و فن سے پا لیا
ب رہیں گے عمر بھر شرمندۂ یارانہ ہم

ناتھ آزاد

اِنفلیشن

برکتوں کا وہ زمانہ تھا عجب
جب کوئی فکر نہ پاس آتی تھی
دن بسر کرنے کو آہوں کی ذرا سی پونجی
دیر تک یاروں کے کام آتی تھی
شب گذاری کے لئے
تھوڑے اشکوں کے زرِ سرخ بہت ہوتے تھے
لیکن اب
زندگانی ترے بازار کا ہے رنگ عجب
نقدِ غم، آہوں کے دینار و درہم
دیکھتے دیکھتے ہاتھوں سے نکل جاتے ہیں
ہم بھی مجبور کبھی ہو کے ضرورت کی گرانباری سے
دونوں ہاتھوں سے لُٹا دیتے ہیں
اشکوں کے زر و لعل و زمرّد
پھر بھی
ہاتھ آتی نہیں
تسکین کی اک نانِ جویں!

مضطر مجاز

غزل

آگ، ہے خواب ہے سایہ ہے کہ چہرہ کیا ہے
روز آنکھوں کے دریچوں میں سُلگتا کیا ہے
آسماں تیرا، زمیں تیری فلک بھی تیرا
تو بھی اب میرا نہیں تو یہاں میرا کیا ہے
میں ترے لمس سے پتھر نہیں بن جاؤں گا
تو مجھے ہاتھ لگاتے ہوئے ڈرتا کیا ہے
مجھے منظور کہ سب کچھ تری کاوش کا صلہ
میری تخلیق میں لیکن مرا حصّا کیا ہے
پہلے کچھ بات تو کر لیتا تھا آتے جاتے
آج کل بچ کے گذرتا ہے یہ قصّا کیا ہے
جب اُٹھی ہے تو برس جانے دے اشکوں کی گھٹا
دیکھ پھر راکھ میں چنگاری کہ شعلہ کیا ہے
رات بھر شہر کے ویران گلی کوچوں میں
چشمِ افلاک سے ہر لمحہ برستا کیا ہے
توڑ ڈالوں گا ابھی اپنی اَنا کا دربن
پہلے بتلا مری تقدیر میں لکھا کیا ہے
ہو مناسب تو اسے شعر کا قالب دیدوں
کوئی پرواز پڑھے بھی تو یہ لکھا کیا ہے

نصیر پرواز

ابراہیم یوسف

جشنِ پرستان

(ایک اہم اندرسبھا)

سید مسعود حسن رضوی ادیب ناٹک بزم سلیمان مصنفہ خادم حسین افسوس کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:
"چالیس پینتالیس سال پہلے بزم سلیمان کا ایک کہنہ اور خستہ مطبوعہ نسخہ میرے ہاتھ آگیا وہ نسخہ میں نے ایک صحاف رضا حسین کو مرمت کے لئے دیا وہ اس کو دیکھ کر بولے کہ بڑی مدت کے بعد آج یہ کتاب پھر دکھائی دی، کے زمانے میں لکھنؤ میں چار اندرسبھائیں کھیلی جاتی تھیں۔ اندرسبھا امانت، اندرسبھا مداری لال۔ بزم سلیمان اور اندراسبھا امانت عام طور پر دستیاب ہے۔ اندرسبھا مداری لال اگرچہ عام طور پر نہیں ملتی مگر پھر بھی نایاب نہیں کو پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب نے نقوشِ لاہور میں شائع فرما دیا ہے مگر غیر ملک میں شائع ہونے کے باعث تقریباً نایاب ہے۔ جشنِ پرستان کا مطبوعہ نسخہ رضا لائبریری رام پور میں موجود ہے۔ جشنِ پرستان کے لالہ بھیرون سنگھ عظمت ہیں۔ عظمت نے بطرزِ اندرسبھا اپنا جشنِ پرستان لکھا ہے جیسا کہ اس کے سرورق سے معلوم ہوتا ہے۔

بعون صناع مکیں و مکاں و فضلِ خلاقِ زمیں و زماں
جشنِ پرستان
بہ طرز اندرسبھا تصنیف لالہ بھیروں سنگھ عظمت

تصویر

حسب فرمائش لالہ نانک چند صاحب تاجر کتب
چوک لکھنؤ در مطبع دبدبۂ احمدی بہ اہتمام
احمد علی خاں لکھنؤ منطبع ہوئی۔

کتاب کے آخر میں دو قطعات تاریخ ہیں۔ پہلا منشی شنکر دیال فرحت کا کہا ہوا ہے ؎

عجب یہ دلکش و دلچسپ ہے سانگ پسند خاطر عشرت پرستاں
کہو فرحت جدا کر کے سر آہ عجائب نسخۂ جشن پرستاں ۱۸۶۳ء

دوسرا قطعہ منشی خادم حسین افسوس مصنف بزم سلیمان کا ہے ؎

لعقد رشک لالہ ورق نسترن ہے عجب گلستاں ہے یہ جشن پرستاں
یہی روئے بہت سے افسوس کہدو پسند جہاں ہے یہ جشن پرستاں سنہ ۱۲۷۳

اندرسبھا امانت کا سنہ تصنیف ۱۸۵۲ء اور بزم سلیمان کا ۱۲۸۵ھ ہے گویا جشن پرستان اندرسبھا کی تصنیف کے چودہ سال اور بزم سلیمان کے چار سال بعد عالم وجود میں آئی۔ جشن پرستان بطرز اندرسبھا ضرور لکھی گئی ہے مگر بزم سلیمان کی طرح غلامانہ تقلید نہیں کی گئی ہے بلکہ عظمت نے قصہ میں بھی تبدیلیاں کی ہیں۔

شہزادی گلفام (اندرسبھا امانت میں گلفام شہزادہ ہے) خواب میں شہزادہ شمشاد کو دیکھ کر عاشق ہو جاتی ہے اور وزیرزادی کو اپنا ہمراز بناتی ہے۔ وزیرزادی شہزادی کو ایک فقیر کے پاس لے جاتی ہے جو اپنی کرامات سے شہزادی اور شہزادہ کی ملاقات کرادیتا ہے۔ شہزادہ شمشاد بھی شہزادی گلفام کو دیکھ کر عشق کا دم بھرنے لگتا ہے۔ دونوں میں عہد و پیماں ہوتے ہیں۔ ایک دن شہزادہ شکار کھیلنے جنگل میں جاتا ہے کہ وہاں صنوبر پری اس پر عاشق ہو جاتی ہے اور اُسے لے اڑتی ہے اور پرستان میں لے جاکر اس سے وصل کی خواہش کرتی ہے۔ شہزادہ انکار کرتا ہے مگر صنوبر اسے اس وقت تک چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوتی جب تک وہ اس کی خواہش پوری نہ کردے۔ صنوبر پری ایک دن فیروزشاہ کی محفل میں ناچ گا رہی ہوتی ہے کہ کالا دیو چغلی کھاتا ہے کہ وہ ایک انسان پر عاشق ہے۔ فیروزشاہ اسی وقت دیو کے ذریعہ شہزادہ شمشاد کو پکڑ بلواتا ہے۔ شہزادہ ہرچند اپنی صفائی پیش کرتا ہے مگر فیروزشاہ اسے قاف کے قیدخانے میں قید کرادیتا ہے اور پری کے پر نچوا کر محفل سے نکال دیتا ہے۔ جب شہزادہ کئی دن تک واپس نہیں آتا تو شہزادی بے چین ہو جاتی ہے اور جوگن بن کر اس کی تلاش میں نکلتی ہے اور پرستان میں پہنچ جاتی ہے۔ کالا دیو اس کے گانے کی تعریف فیروزشاہ سے کرتا ہے اور اس کی خواہش پر جوگن کو دربار میں لاتا ہے۔ فیروزشاہ اس کے گانے سے خوش ہو کر اس کی کوئی خواہش پوری کرنے کا وعدہ کرتا ہے۔ جوگن شہزادہ شمشاد کی رہائی کی خواہش کرتی ہے۔ فیروزشاہ پہلے تو بہت بگڑتا ہے مگر جوگن کے یاد دلانے پر کہ بادشاہوں کو اپنا وعدہ پورا کرنا چاہیئے شہزادے کو آزاد کردیتا ہے۔ مبارکباد گائے جانے کے بعد قصہ ختم ہو جاتا ہے۔

اگر جشن پرستان کے اس قصہ کا تجزیہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جشن پرستان کے قصہ کی تعمیر میں امانت اور مداری لال کی اندرسبھاؤں کو سامنے رکھنے کے علاوہ عظمت نے کچھ دلچسپ اضافے بھی کئے ہیں۔ مثلاً شہزادی گلفام کا شہزادہ شمشاد کو خواب میں دیکھ کر عاشق ہونا اور فقیر کی کرامات سے شہزادی اور شہزادے کی ملاقات۔ خواب میں عاشق ہونا اور فقیر کی دعا یا کرامات سے مقصد دلی حاصل کرنا کوئی نئی چیز نہیں ہے اردو کی داستانیں اور مثنویاں اس قسم کے عشق اور کرامات سے بھری پڑی ہیں۔ داستانوں اور مثنویوں کی اسی روایت کو اپنی سبھا میں شامل کرکے عظمت نے قصہ کو دلچسپ بنانے کی کوشش کی ہے۔ شہزادہ کا شکار کو جانا مداری لال کی اندرسبھا کی یاد دلاتا ہے مگر برخلاف مداری لال کی اندرسبھا کے شہزادے کی ملاقات کسی شہزادی سے نہیں ہوتی بلکہ پری سے ہوتی ہے یہ جنگل اس کی شکارگاہ ہے۔ یہاں پری اور شہزادے میں جو گفتگو ہوتی ہے وہ اندرسبھا مداری لال اور جشن پرستان میں ایک سی ہے۔ اندرسبھا امانت میں شہزادہ گلفام اور سبزپری راجا اندر کے غصہ کا شکار ہوتے ہیں۔ جشن پرستان میں شہزادہ شمشاد اور صنوبر پری پر فیروزشاہ کا عتاب نازل ہوتا ہے لیکن سبزپری کی طرح صنوبر پری جوگن بن کر شہزادے کی تلاش میں نہیں جاتی بلکہ شہزادی گلفام جوگن بن کر

شہزادے کی تلاش میں جاتی ہے۔ اندرسبھا مداری لال میں جوگن موجود ہے مگر وہ نہ تو پری ہے اور نہ شہزادی بلکہ وزیرزادی ہے جو شہزادی کے لیے مصیبتیں جھیلتی ہے۔ اسی لئے جشنِ پرستان کے قصہ کے تعمیری عناصر امانت اور مداری لال دونوں سے لئے گئے ہیں۔ مگر رنگ آمیزی عظمت نے کی ہے۔ جو اس لحاظ سے دلچسپ ہے کہ اس میں اندرسبھا امانت و مداری لال اور ناٹک بزم سلیماں کے مقابلہ میں تنوع کا احساس ہوتا ہے اگرچہ قصے میں تنوع اور دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے مگر اسی کے ساتھ ساتھ بعض جگہ کڑیوں کے بکھرنے کا بھی احساس ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر جب شہزادی گلفام شہزادے کو تلاش کرنے جاتی ہے تو کہتی ہے۔

دل میں آتا ہے کہ عظمت میں رہوں خانہ بدوش   کوچۂ عشق کی ذلت بھی ہے توقیر مجھے

جس کا جواب وزیرزادی دیتی ہے۔

میں بھی ہمراہ قدم ہوں بخدا اے عظمت   دیکھو لے جائے کہاں گردشِ تقدیر مجھے

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شہزادی کے ساتھ وزیرزادی بھی جاتی ہے لیکن وہ پھر کہاں گم ہو جاتی ہے اس کا آخر تک پتہ نہیں چلتا۔ اسی طرح جب صنوبر پری فیروز شاہ کی محفل سے نکال دی جاتی ہے تو پھر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کہاں گئی اور کس حال میں ہے۔ اندرسبھا امانت اور بزم سلیمان کے برخلاف جشن پرستان میں شہزادی جوگن بنتی ہے اور پرستان میں پہنچ جاتی ہے۔ لیکن وہ پرستان میں کیونکر پہنچی اور کیسے پہنچی اس کا عظمت نے کوئی حوالہ نہیں دیا۔ ویسے تو یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ایسی ہی غیر مربوط کڑیاں اندرسبھا امانت اور مداری لال نیز بزم سلیمان میں بھی موجود ہیں لیکن چونکہ عظمت نے تعمیر قصہ کی طرف بھی تھوڑا بہت دھیان دیا ہے۔ اسی لیے یہ بات کھٹکتی ہے ورنہ اس دور کا عام رواج سمجھ کر اسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔

اندرسبھا امانت کی طرح جشن پرستان کو بھی ایکٹ اور سین میں تقسیم نہیں کیا گیا ہے لیکن اگر ہم قصہ کے تسلسل ا واقعات کی بنا پر اسے سین میں ترتیب دیں تو اس کی صورت یہ ہوگی۔

پہلا سین۔ شہزادی کا محل ۔ شہزادی کی آمد، وزیرزادی کو طلب کرنا اور وزیرزادی کا فقیر کے بارے میں اطلاع د

دوسرا سین۔ فقیر کی جائے قیام۔ شہزادی کا فقیر سے مراد مانگنا اور فقیر کا شہزادے اور شہزادی کا ملاقات کرانا۔

تیسرا سین۔ شہزادی کا باغ ۔ شہزادے کا شکار کے لیۓ جانا اور شہزادی کو اطلاع دینا۔

چوتھا سین۔ جنگل ۔ صنوبر پری کا شہزادے پر عاشق ہونا اور اپنے ساتھ پرستان میں لے جانا۔

پانچواں سین۔ صنوبر پری کا محل۔ صنوبر پری کا اظہار عشق کرنا

چھٹا سین۔ فیروز شاہ کی محفل۔ پریوں کا ناچ گانا۔ کالے دیو کا صنوبر پری کے عشق کی چغلی کھانا۔ پری کا محفل سے نـ جانا اور شہزادے کا قید کیا جانا۔

ساتواں سین۔ شہزادی کا محل۔ شہزادی کا پریشان ہونا اور جوگن بن کر شہزادے کی تلاش میں جانا

آٹھواں سین ۔ پرستان ۔ جوگن کی پرستان میں آمد اور یاقوت پری سے ملاقات کرنا۔

نواں سین ۔ فیروز شاہ کی محفل ۔ کالے دیو کا فیروز شاہ کو جوگن کے بارے میں اطلاع دینا ۔
دسواں سین ۔ پرستان ۔ کالے دیو کی جوگن کو فیروز شاہ کی محفل میں لے جانے کی کوشش ۔
گیارہواں سین ۔ فیروز شاہ کی محفل ۔ جوگن کا گانا اور فیروز شاہ سے شہزادہ شمشاد کو حاصل کرنا ۔

بظاہر اس میں پرستان کے چھ سین ہیں ۔ اگرچہ عظمت نے اس کی وضاحت نہیں کی ہے لیکن یہ چھ سین بھی تین جگہوں پر ہوتے ہیں ۔ صنوبر پری کا باغ ۔ فیروز شاہ کا دربار اور پرستان میں کوئی کھلی جگہ یا باغ وغیرہ ۔ اس طرح پوری سبھا آٹھ مقامات پر ہوتی ہے ۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عظمت کے پیش نظر یہ بات رہی ہے کہ مقامات کی تبدیلی اور سین کا مختصر ہونا دلچسپی کا سبب ہے ۔ اندر سبھا امانت سے جشن پرستان تک چودہ سال کا عرصہ ہے اور ان چودہ سالوں میں اندر سبھاؤں کا یہ ارتقائی سفر نمایاں ہوکر سامنے آیا ہے ۔

جس دور میں یہ سبھائیں لکھی گئیں اس دور میں کردار نگاری کا وہ تصور نہیں تھا جو آج ہے ۔ امانت نے اہم کرداروں کی آمد اور حسب حال شعر خوانی کے ذریعہ ان کرداروں کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات فراہم کی ہیں لیکن ان کو صرف معلومات ہی کہا جاسکتا ہے ۔ کردار نگاری نہیں ۔ اگر کہیں امانت کے یہاں کردار نگاری کی کوئی معمولی جھلک ہے تو مداری لال کی اندر سبھا اس جھلک سے بھی محروم ہے اور اگر کچھ ٹوٹی پھوٹی کردار نگاری تلاش کر بھی لی جائے تو وہ صرف اتفاق کا نتیجہ ہے ۔ جشن پرستان میں اگرچہ کردار نگاری کا کوئی بہتر نمونہ تو نہیں ہے ۔ مگر مداری لال اور امانت سے قدرے بہتر ہے ۔ عظمت نے شہزادی گلفام کی صورت میں کسی حد تک ایک فعال کردار دینے کی کوشش کی ہے ۔ شہزادہ شمشاد کی تلاش میں اس کا پرستان تک پہنچ جانا اس کے عزم کی طرف اشارہ کرتا ہے اور جب وہ فیروز شاہ سے انعام میں شہزادہ شمشاد کو مانگتی ہے تو فیروز شاہ کہتا ہے ۔

بشر ہے زبس مجرم و نابکار　　　پری سے کیا اس نے بوس و کنار
رہائی زبس اس کی دشوار ہے　　　کہ وہ اس سزا کے سزاوار ہے
سوا اس کے جو تجھکو درکار ہو　　　عنایت ابھی حسب اقرار ہو

اس پر شہزادی گلفام جو جوگن کے بھیس میں ہے ایک غزل گاتی ہے اور کہتی ہے ۔

شاہوں سے ہیں بعید یہ وعدہ خلافیاں　　　اقرار کیا کیا تھا ذرا یاد کیجئے
جب قول کر چکے تو تامل پھر اس میں کیا　　　جو کچھ میں مانگتی ہوں ادا کیجئے

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف ذہین ہے بلکہ بادشاہوں کی مزاج شناس بھی ہے اس میں عزم و حوصلہ ہے وہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے فقیر کے پاس جاتی ہے جوگن بنتی ہے اور فیروز شاہ کو اپنی ذہانت سے مجبور کر دیتی ہے کہ وہ شہزادے کو آزاد کر دے ۔

شہزادہ شمشاد امانت کے شہزادے گلفام کی طرح بظاہر بے عمل نظر آتا ہے لیکن اس کی کچھ مجبوریاں ہیں کہ ان پر قابو پانے کا اور کوئی تدبیر اس کے سوا نہیں کہ وقتی طور پر وہ حالات سے سمجھوتہ کرلے اور موقع ملنے پر رہائی حاصل کرنے کی کوشش کرے ۔ اگر ہم امانت کے شہزادہ گلفام اور عظمت کے شہزادہ شمشاد کا مقابلہ کریں تو ہمیں شہزادہ شمشاد کا کردار زیادہ جاندار نظر آتا ہے ۔

شہزادہ گلفام صنوبر پری کی خواہش اس شرط پر پوری کرتا ہے کہ وہ اسے راجا اندر کی محفل دکھلا دے گی۔ شہزادہ شمشاد کسی خواہش کا شکار نہیں ہے بلکہ اس ناگہانی آفت سے چھٹکارا پانے کی زبردست خواہش ہے چنانچہ جب وہ پری کے سامنے پیش کیا جاتا ہے تو وہ صاف صاف کہتا ہے۔

صنوبر پری نے بلایا ہے مجھے   یکایک بلا میں پھنسایا مجھے
مری کیا خطا اس میں اے نامدار   خدا کی قسم میں ہوں بے اختیار
پری آپ کی ہاں گنہگار ہے   یہ بندہ نہیں کچھ خطاوار ہے

اسی کے ساتھ ساتھ اسے اپنے انسان ہونے اور دیگر مخلوقات سے بلند ہونے کا بھی احساس ہے اور اس کا اظہار کرنے سے بھی نہیں چوکتا۔ ملاحظہ فرمائیے۔

دوہرہ صنوبر پری کا

پیارے تو صحبت مری آج غنیمت جان   کوہِ قاف کی میں پری اور تو ہے انسان

دوہرہ شہزادہ کا

کرتی ہے تو حسن کا اپنے عبث گمان   ایسے ایسے ہیں بشر کہ پریاں ہیں قربان

صنوبر پری

نخرے تلے تمہیں اے جان بہت آتے ہیں   چونچلے ایسے تو بندی کو نہیں بھاتے ہیں
دیکھ تو مجھ سی پری طالب دیدار ہوئی   دفعتہً میں تری صحبت کی طلبگار ہوئی

شہزادہ شمشاد

تجھ سی پریاں میرے محلوں میں پڑی رہتی ہیں   ہاتھ باندھے ہوئے ہر وقت کھڑی رہتی ہیں
تلوے سہلاتی ہے ملتی ہے کوئی ہاتھ مرے   مور چھل جھیلتی رہتی ہے کوئی ساتھ مرے
صدقے ہوتی ہے کوئی گرد پھرا کرتی ہے   مثل سایہ کوئی قدموں پر گرا کرتی ہے
بات تک ان سے میں کرتا نہیں آگاہ کبھی   منہ لگاتا نہیں اے ہوں کو تو واللہ کبھی

صنوبر پری

تجھ سے شہزادے مرے عشق میں جی کھوتے ہیں   آہیں بھرتے ہیں تڑپتے ہیں پڑے رہتے ہیں
سب سسکتے ہیں مرا شوق سے منہ تکتے ہیں   سر پٹکتے ہیں مگر اُف نہیں کر سکتے ہیں
منہ نہ پھیرو مری باتوں کو ذرا دھیان کرو   ایک بوسہ جو مجھے دو تو یہ احسان کرو

شہزادہ

اے پری وصل کے ہے نام سے نفرت مجھ کو   تجھ کو عادت ہے وہ ہرگز نہیں عادت مجھ کو

اس یکطرفہ عشق اور خواہش وصل سے شہزادہ شمشاد کو کس قدر نفرت ہے وہ ایک ایک لفظ سے

ہانے شہزادہ شمشاد کے کردار کو امانت کے شہزادہ گلفام سے بلند کر دیا ہے جو راجا اندر کی محفل دیکھنے کی امید میں سبز پری کی ہر خواہش پوری
نے کو تیار ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ شہزادی گلفام سے ٹوٹ کر محبت کرتا ہے پری کی خواہش وصل سے نہ صرف نفرت کرتا ہے بلکہ
نے انسان ہونے اور دیگر مخلوقات سے بلند ہونے کا احساس بھی رکھتا ہے وہ موقع شناس بھی ہے اور وقتی طور پر حالات سے سمجھوتہ بھی
سکتا ہے اور موقع ملنے پر ان حالات سے نکلنے کی کوشش بھی کرتا ہے اس طرح اندر سبھا امانت سے جشنِ پرستان تک ہمیں یہ احساس
ا ہے کہ ارادی یا غیر ارادی طور پر کردار نگاری کا ایک روپ ابھرنے لگا تھا۔ جشنِ پرستان کے کردار بے جان مورتیاں نہیں رہے تھے بلکہ
ون نے چلتے پھرتے اور حساس انسانوں کا روپ دھارنا شروع کر دیا تھا اور اندر سبھائی انداز میں لکھے جانے والے ڈراموں میں ترقی کے
رنمایاں ہونے شروع ہو گئے تھے۔ اگر امانت نے اندر سبھا کے انداز سے اردو ڈرامے کو روشناس کرایا تو بلاشک عظمت نے اس میں
آمیزی کی اور ترقی کی طرف قدم بڑھایا۔

پورے جشنِ پرستان میں دو سو باسٹھ اشعار ہیں جو غزل، غزل مسلسل، دو غزلہ، مثنوی، آمد اور حسب حال شعر خوانی پر مشتمل ہیں۔
گرہ بند ہیں جس میں ایک ساون ہے۔ ان تین گرہ بندوں میں کل اٹھائیس بند ہیں۔ تین چھند۔ گیارہ دوہے۔ تین ٹھمریاں۔ ایک ہولی۔
بھاگ۔ ایک بھیروں اور ایک ساون ہے۔ یہاں بھی عظمت نے تنوع کا خیال رکھا ہے۔ پوری سبھا میں ۲۸ جگہ عظمت تخلص آیا
چار جگہ بھیروں سنگھ استاد۔ ایک جگہ بھیروں داس ایک جگہ صرف بھیروں اور دو جگہ بھیروں سنگھ آیا ہے۔ امانت اور افسوس
یتوں میں استاد تخلص استعمال کیا ہے مگر عظمت نے گیتوں میں بھی اکثر جگہ عظمت ہی تخلص استعمال کیا ہے۔ غزلیں صرف پانچ گائی گئی ہیں
پانچ غزلوں میں سے ایک یاقوت پری ایک صنوبر پری اور تین جوگن گاتی ہے۔ جوگن کی گائی ہوئی غزلوں میں سے دو قصے سے مربوط ہیں اور
صرف گانے کے لیے گائی گئی ہے۔ اندر سبھا مداری کے برخلاف گرہ بند کا صرف ایک ایک بند سوال و جواب کے طور پر پڑھا جاتا ہے۔
بکہ اندر سبھا مداری لال میں ترجیع بند کے سات سات بند سوال و جواب کے طور پر پڑھے جاتے ہیں اور اگر کردار ان سے مطمئن نہیں
تے تو ایک ایک غزل بھی پڑھ دیتے ہیں جس سے شدید اکتاہٹ کا احساس ہوتا ہے۔ امانت کے پیشِ نظر قصہ گوئی کے مقابلے میں رقص
رور کی محفل سجانا تھی اسی لئے ان کے یہاں بھی کردار ایک غزل کے بعد دوسری غزل، ہولی اور بسنت وغیرہ مسلسل گائے جاتے ہیں
سے قصہ کی روانی میں فرق پڑتا ہے لیکن جشنِ پرستان میں اختصار نے خوشگوار فضا اور ماحول پیدا کیا ہے اس سے قصہ کا تسلسل
رار رہتا ہے اور قصہ تیزی سے اختتام کی طرف بڑھتا ہے۔ عظمت نے امانت اور مداری لال سے استفادہ کے باوجود قصہ کے
سل اور موسیقی میں ایک توازن برقرار رکھا ہے جس سے وہ بہت سے عیوب جو امانت اور مداری لال کے یہاں پیدا ہوئے ہیں یا تو ختم
ئے ہیں یا پھر نظر انداز کر دینے کے قابل رہ گئے ہیں۔

اندر سبھا امانت کی طرح جشنِ پرستان میں بھی ہر اہم کردار کی آمد گائی جاتی ہے اور حسب حال شعر خوانی بھی ہوتی ہے مگر عظمت
خاص طور پر اس بات کا اہتمام کیا ہے کہ باوقار کردار یعنی شہزادی گلفام، عزیز زادی اور فیروز شاہ حسب حال شعر خوانی نہیں
صرف وہ لونڈیاں یہاں حسب حال شعر خوانی کرتی ہیں۔ اس سے اول تو باوقار کردار کا وقار مجروح نہیں ہوتا نیز کمتر درجے کے
اروں سے تفریق پیدا ہوتی ہے۔ مداری لال کے یہاں دو جگہ آمد گائی گئی ہے اور دونوں جگہ بے موقع۔ کیونکہ ایک جگہ آمد تو
ناہ کی گائی جاتی ہے مگر اسٹیج پر شہزادہ نمودار ہوتا ہے۔ دوسری جگہ شہزادہ خود اپنی آمد گاتا ہے مگر آمد کے بجائے وہ شکار

کو جاتا ہے نالک بزم سلیمان میں کلی طور پر امانت کی غلامانہ تقلید کی گئی ہے۔

اندرسبھا امانت اور مداری لال نیز بزم سلیمان میں گانوں کی دھنوں کی طرف واضح اشارے کیے گئے ہیں؛ کوئی [illegible] جشن پرستان میں موجود نہیں ہے۔

جشن پرستان کی ادبی حیثیت اندرسبھا مداری لال اور بزم سلیمان سے ہر حیثیت سے بلند ہے۔ مداری تو کئی لوگوں کی کاوشوں کا نتیجہ ہے اس لیے مختلف جگہوں پر ادبی معیار بھی مختلف ہیں نیز اس میں شعری سقم کی بہتات ہے۔ بزم سلیمان خادم حسین افسوس کی تخلیق ہے وہ بھی ادبی حیثیت سے جشن پرستان سے بہت کمتر درجے کی چیز ہے۔ عظمت کے ہم عصر تھے اور انھوں نے جشن پرستان کا قطعہ تاریخ بھی کہا ہے لیکن وہ عظمت سے اچھے شاعر نہ تھے۔ ان کے یہاں شعری سقم کی بہتات نہیں تو کمی بھی نہیں ہے۔ عظمت اچھے شاعر تھے خاص طور پر جہاں انھوں نے مثنوی کا استعمال کیا ہے اس میں روانی کا احساس ہوتا ہے۔ مثلاً

مثنوی زبانی وزیرجادی کی۔

فقیر اک یہاں پر ہے عاجز نواز غریبوں کا فریادرس چارہ ساز
کرامات کی ہر طرف دھوم ہے زمانے کو خلق ان کا معلوم ہے
تپ و درد و غم سے نہ ہو بدحواس مرے ساتھ بے پردہ چل ان کے پاس
عجب کیا کریں تجھکو دلشاد وہ کریں قید کلفت سے آزاد وہ

شہزادی گلفام

بہار اے دایم رہیں برقرار ریاضت کا گلشن رہے باردار
نہیں تم سا دنیا میں ہے دادرس رہو تم غریبوں کے فریادرس
کرم کر کے اب کیجیے مجھکو شاد عطا کیجیے مجھکو نقد مراد

چغلی کھانا کالے دیو کا بادشاہ کے سامنے

خداوند دائم رہیں برقرار ہمیشہ رہے فضل پروردگار
جو بدخواہ ہوں دل میں ناشاد ہوں جو دشمن ہیں وہ خانہ برباد ہوں
صنوبر پری کا ہے یہ ماجرا کہ ہے ایک انسان پر مبتلا
یہ مرتی ہے اس پر یہ حال تباہ ہوئی ہے زلیخا کو یوسف کی چاہ

اندرسبھا میں امانت نے بھی مثنوی کا فارم استعمال کیا ہے لیکن ان کا میدان مرثیہ اور غزل ہے سرمایہ میں صرف ایک عشقیہ خط مثنوی کی شکل میں ملتا ہے۔ اندرسبھا میں جب بھی وہ مثنوی کا فارم استعمال کرتے ہیں میر حسن ان کے ذہن و دماغ پر چھا جاتے ہیں یہاں تک کئی جگہ انھوں نے میر حسن سے استفادہ بھی کر لیا ہے۔ کا وہ حصہ جو مثنوی کی شکل میں اندرسبھا امانت سے قدرے بہتر معلوم ہوتا ہے۔

جشنِ پرستان میں صرف پانچ غزلیں گائی گئی ہیں جب کہ اندر سبھا امانت میں ۷ اغزلیں اندر سبھا مداری لال میں ۱۸ غزلیں اور ناٹک بزم سلیمان میں ۱۰ غزلیں ہیں۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ عظمت کو غزل گوئی سے کچھ زیادہ لگاؤ نہیں تھا۔ ان غزلوں کا انداز بھی اس دور کے عام مذاق سے مختلف نہیں ہے۔ خارجی تکلفات حسن زلف و گیسو اور لب و رخسار کا بیان ہے۔ تلاش کے بعد بھی کوئی قابلِ اعتنا شعر نہیں ملا۔ ایسے شعروں کی زیادتی تو نہیں مگر موجود ہیں۔

اگر لیتا ہوں بوسہ یار کے پائے حنائی کا ؛ رقیبِ رو سیہ مہندی کی صورت ہاتھ ملتے ہیں

بہار اس نخل قد پر ہے قیامت بار پستاں کا ؛ نہال سرو بھی بار خدا شاید کہ پھلتے ہیں

اشتیاق بوسہ رخسار جاناں رہ گیا ؛ واہ ری تقدیر دل کا دل میں ارماں رہ گیا

نور الٰہی محمد عمر صاحبان نے جب اندر سبھا امانت کو ایڈٹ کیا تھا تو اس میں بارہ شعر اور ایک ٹھمری کے دو بول حذف کر دیئے تھے کیونکہ ان میں بھی اسی قسم کی عریانی پائی جاتی تھی۔

جشن پرستان میں سات گیت ہیں۔ جو برج بھاشا میں ان سادگی اور جذبات نگاری ہے ایک بھیرویں آپ بھی ملاحظہ فرمایئے۔

بھیرویں زبانی جوگن کی

دیکھو سکھی بچھڑے ہمرے سیاں ؛ سلگ سلگ ساری رین گنواوت ہوت یہاں جریاں

ڈھونڈ پھری میں جنگل جنگل ؛ دھوپ بھئی مونہ چھیاں

تا ہو پے جو میں نہ بالم ؛ دھیرج کون دھریاں۔ دیکھو سکھی بچھڑے ہمرے سیاں

اگم اگا روپ رس ساگر ؛ بارہت چھن چھن جہاں

بن پیا عظمت ماہی بچارت ؛ کو ہے پار لگیاں ــ دیکھو سکھی بچھڑے ہمرے سیاں

جشنِ پرستان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اندر سبھا امانت سے جشن پرستان تک جو چودہ سال کا عرصہ ہے اس میں ایک خالص ہندوستانی طرز کے ناٹک کا روپ پیدا ہو رہا تھا اور آہستہ آہستہ یہ روپ سنورنا بھی شروع ہو گیا تھا جس کو پارسی تھیٹر کی مغربی نقالی نے ابھرنے سے روک دیا اور مغربی نقالی سے جو ڈراما پیدا ہوا وہ ہمارے مزاج اور ماحول کے مطابق نہیں تھا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈرامے کی ترقی محدود ہو کر رہ گئی۔

بادۂ کہن

مرزا جمال اللہ عشق اورنگ آبادی

مرزا جمال اللہ عشق اورنگ آبادی (متوفی ۱۱۹۵ھ) ولی اور سراج کی سرزمین کے قادر الکلام ان کے والد مرزا داؤد بیگ (۱۱۰۰ھ - ۱۱۶۸ھ) سراج کے معاصر اور عہدِ آصف جاہ اول کے ممتاز شعرا جانے تھے۔

داؤد، عہد آصف جاہ اول میں اپنے وطن اورنگ آباد سے دیگر کئی شاعروں کے ساتھ حیدرآباد منتق[illegible] اور عبدالولی عزلت کے تلامذہ میں شامل ہوگئے۔ کلام کا ایک انتخاب "دیوانِ عشق" کے نام سے ۱۹۶۰ء ادبیاتِ اردو" کی طرف سے چھپ چکا ہے جسے جناب محمد اکبر الدین صدیقی نے مرتب کیا ہے۔ دیوانِ عش[illegible] میں مرتب نے لکھا ہے کہ "عشق، نجمی، نارانؔ، شفیق اور اسد علی خاں تمنا کی طرح انعام اللہ خاں یقین[illegible] نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری بالکل عاشقانہ ہے۔ تشبیہیں نادر اور انوکھی پیش کی ہیں۔ عشق کے کلام میں[illegible] بھی ہے، زورِ بیان بھی ملتا ہے اور محاوروں کا استعمال بھی۔ وہ اپنے دور کے شعراء میں استاد کا[illegible] تھے : اشعار کا انتخاب درج ذیل ہے۔ (د۔ غ)

ہے عشق کسی چشم کے جادو کا دوانہ — کہتے ہیں سیانے "اُسے سایہ ہے پری کا"

مجھ کو تو ظاہر و باطن سے بسر کا ہے نت — چشم گریاں و دل زار ہوں سارکن کا آن کا

ہے دو بادام کا لے عشق تصور کا نی — میں ریاضت کش دیدار ہوں کن کا اُن کا

یہ گرد و باد نہیں دشت میں علم ہے قیس — کسو دوانے کی تعظیم کو اُٹھا ہوگا

یارب شتاب یار کا دیدار ہو نصیب — آنکھیں اُٹھا رہی ہیں مژہ سے دُعا کے ہات

گل بدن کے عرق میں آتی ہے — باس عطر گلاب کی سی طرح

کاسۂ دل ہمارے آہ سے عشق — ٹوٹتا ہے حباب کی سی طرح

ہر گل کا سینہ ہے پُر خوں ہر اک گل چاک جیب — ظاہرا گلشن میں تو گزرا تھا ہو کر سرخ پو[illegible]

آکے سارے آرام جاں تجھ عشق نے غارت کیا — صبر و طاقت عیش و راحت خواب و خورد و عق[illegible]

تعجب نہیں ہے ابھی آب سے بوئے گلاب آئے
پڑے گر عکس اس گلرو کے رُو کا جس لب جُو میں

ہے کس کے زلف کا سودا تجھے اے عشق بتلا دے
ہمیشہ عطر عنبر کی سی بُو آتی ہے تجھ خو میں

یاں طبع میں باریکی وہاں موئے کمر ہے
یاں خاطر نازک وہاں نازک بدن ہے

کھوتا ہے خودی اپنی کچھ اس میں ہے کیفیت
میخانے میں جو جاوے ہو بے خبر آتا ہے

آئینہ میں جب عکس پری رُو کا نظر آئے
تب عالم حیرت کا تماشہ نظر آوے

اس مست نین کا جو خیال آئے یکایک
زاہد کے تئیں نشۂ مئے کا اثر آوے

سخت حیرت ہے دیکھ آئینہ
کس طرح ناز خود نما نہ کرے

آنکھیں کسی کی رہ پہ لگائے ہیں خوش نین
نرگس کی جا کے حلقۂ مجلس کو دیکھئے

وہ زلف عنبریں جب ماہرو رخسار پر چھوڑے
حذر کر وصل سے اے دل قمر عقرب کے اندر ہے

ہماری چشم سے ملے عشق دریا کو ہے کیا نسبت
کہ جو آنسو نکلتا ہے سو وہ گوہر سے بہتر ہے

پلک سے جس طرح آنسو گزر جاتا ہے اک پل میں
صراط اوپر خدا کا فضل شامل ہو تو چل سکئے

پڑے خاک ایسے جینے پر میں تجھ سے صاف کہتا ہوں
خدا ناکردہ جو مجھ سے ترے دل میں غبار آئے

سینۂ صاف میں بستا ہے خیال رخ یار
یہ جو مشہور ہے شیشہ میں پری رہتی ہے

دل دینے کا بھی کام کچھ آسان نہیں ہے
وہ شخص جو دل دیوے اسے جان نہیں ہے

جیتے ہیں خشک چشمے عالم کے بھر رہیں گے
گر عاشقوں کے دیدے اک لحظہ تر رہیں گے

وہ خوش نین چمن میں گذرے تو دیکھنے کو
نرگس کی چشم میں ہم بن کر نظر رہیں گے

تقلید عشق کرکے روتا ہے ابر نیساں
اس رو سے موتیوں کی قیمت گراں ہوئی ہے

جام جم سے نہیں کچھ چشم تری کم ساقی
کہ عیاں اس میں ہے کیفیت عالم ساقی

لوگ ناحق اس کو کہتے ہیں کہ ہے لالہ کا پھول
داغ دل لے کے بات عالم کو دکھاتی ہے بہار

لگن میں شعلہ رو کے تو قدم گاڑ
بھسم ہو جا پتنگ شمع جل کر

پروا کسی کے گریہ کی نہیں ہے کہ ابر تو
روتا ہے زار زار غریبوں کے گھر پہ

اس ہوا میں میکشی کی پھر دلانے ہم کو یاد
بے طرح اٹھا ہے ابر برشگالی الحفیظ

پرستش عشق ان سنگیں دلوں کی کفر ہے باز آ
یہ شیوہ بت پرستی کا مسلماں کے نہیں لائق

بہاروں میں تھا وہ ہنگامہ جا دیکھا خزاں کے دن
چمن میں خاک اڑتی ہے کدھر گل اور کہاں بلبل

خاطر سے غبار دھو گئے ہم
جیتا کہ ہنسنے تھے رو گئے ہم

گئے گذرے نہیں ہیں عشق دیوانوں سے کچھ ہم بھی
وہ اپنی سدھ بسرتے ہو گئیں گے ہم تو خود کو کھوتے ہیں

حیدرآباد کے شاعر

(۱۷)

جہاندار افسر

۱۹۷۲ء میں مطبوعہ ریاستی ساہتیہ اکیڈمی کے تذکروں کا سلسلہ

ریاست حیدرآباد میں خانوادۂ آصفی کے جن چند افراد نے شعر و ادب اور زبان و قلم کے ذریعہ جمہوری روایات اور اردو کلچر کو عوامی بنایا ان میں صاحبزادہ میکش مرحوم کا نام روشن حرفوں میں لکھا جاتا ہے اسی سلسلۂ ماہ کا ایک نام جہاندار افسر بھی ہے۔ پورا نام صاحبزادہ میر جہاں دار علی خاں ہے۔ ۱۵ مئی ۱۹۲۹ء کو پیدا ہوئے ۔ ۱۹۴۸ء میں ثانوی درجوں کی تعلیم مکمل کی، ادبی، شعری اور ترقی پسند ماحول نے عوامی تحریکات کی طرف رجوع کیا۔ دکن کے قادر الکلام استاد سخن صفی اورنگ آبادی کے شاگرد ہوئے۔ ۱۹۵۲ء سے ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم کارکن ہیں۔ ۱۹۵۶ء میں حیدرآباد میونسپل کارپوریشن کے رکن بھی منتخب ہوئے۔
۱۹۵۵ء سے اُردو صحافت سے منسلک ہیں۔ تقریری اور تحریری صلاحیتوں کے سبب تہذیبی، صحافتی اور ادبی حلقوں میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ۔ افسر کی شاعری قدیم اور جدید کا امتزاج ہوتی ہے۔ ترقی پسند اقدار اور محبت و محنت کی روایات کو سلیقے سے برتنے کا شعور رکھتے ہیں۔ ان دنوں روزنامہ "انگارے" میں سب ایڈیٹر اور کرنٹ نیوز سروس کے نیوز ایڈیٹر ہیں۔ مزاج میں سادگی، انسانیت اور طبیعت میں جدوجہد کی مہک جولاں نظر آتی ہے۔ غزل اور نظم خوب کہتے ہیں۔ پڑھنے کا انداز بھی چونکا دیتا ہے۔ قدیم حیدرآباد اور پرانے شہر کا جہاندار افسر کو اگر انسائیکلوپیڈیا کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ مخدوم، صفی اور پرانا حیدرآباد کسی موضوع پر انھیں چھیڑیئے پھر دیکھئے گل افشانیٔ گفتار۔ کلام سے چند منتخبات پیش ہیں۔

(و۔ خ)

دل کا مسیح چارہ گرِ جاں کوئی تو آئے — لے کر جاہے درد کا درماں کو
ہر ہر روش پہ آج بگولوں کا رقص ہے — آئینہ دارِ فصلِ بہاراں کو
اس دور کے نصیب میں جو انبیاء نہیں — اس دور کی نجات کو انساں کو

افسر فضائے کوچۂ جاناں ہے منتظر
جوشِ جنوں میں چاک گریباں کوئی تو آئے

○

غم کا جو ہو شعور تو غم بھی حیات ہے — حساس آدمی کو خموشی بھی با
اندازِ گفتگو ہے کہ قند و نبات ہے — اس گل بدن کی بات تو پھولوں کی با
وہ دن کہاں حیات ہو خوابوں کی چاندنی — اب تو حیات کا نپتے سایوں کی را
ہر ناشناسِ دردِ محبت کو کیا خبر — یہ زندگی کی بات سمجھنے کی با
اے گشتگان بے گنہی کچھ نہ کچھ کرو — کیا انقلاب صرف کتابوں کی با
کیوں بندگانِ عام سے یہ سخت امتحاں — پروردگار یہ تو رسولوں کی

افسر حیاتِ نو کے لئے جستجو کرو
یہ زندگی تو سلسلۂ حادثات ہے

○

وجود اپنا بکھرتا ہے ستم تقسیم ہوتے ہیں — سمیٹ اے زندگی ہم کو کہ ہم تقسیم
کہاں تک وحدتِ تہذیب کے مٹنے کا غم کیجے — وہ بٹوارے کا عالم ہے کہ ہم تقس

رہِ ہستی میں کیا ہوتا ہے اس کے ماسوا افسر
میں چلتا ہوں مرے نقشِ قدم تقسیم ہوتے ہیں

متفرقات

شبِ فرقت سحر تک میں بھی رویا شمع بھی روئی — مرے مانند وہ بھی دل جلی معد
ضبط کرنے سے تو رونا ہی بھلا ہے افسر — دل کی تسکین بھی ہے درد کا اظہا
اہلِ دل خاک بہ سر اہلِ ہوس تاج بہ سر — اے زمانے تری رفتار پہ

قطعہ

جن کے آبا بصد جلال و حشم — خوشنما مقبروں میں سوتے
وہ بصد یاس و خانۂ ویرانی — سر چھپانے گھروں کو روتے

نی شروانی

لفافے بدلنا

چند سال قبل "سب رس" کے صفحات پر " لفافے بدلنا" کے موضوع پر دلچسپ اور سیر حاصل بحث شروع ہوئی تھی
عری کی اس روایت پر تنقیدی نظر سے جائزہ لیا گیا تھا کہ اکثر شعراء متقدمین کے افکار یا اشعار کے مرکزی تخیل کو معمولی
ساتھ اپنے اشعار میں استعمال کرتے ہیں اور بالخصوص حضرت جگرؔ کے کلام کو دیگر شعراء کے کلام سے "خوشہ چینی" کی مثال
ن کیا گیا تھا ("سب رس" مارچ ۱۹۴۱ء) ظاہر ہے شاعر کا انفرادی تخیل ضروری نہیں کہ بالکل اوریجنل ہو، الفاظ بندشیں
و قافیہ بھی دوسرے شعراء کے کلام سے میل کھا سکتے ہیں اور بعض مرتبہ نادانستہ اور کبھی کبھی دانستہ دو مختلف شعراء
یکسانیت ملتی ہے۔

ریختہ رتبہ کو پہنچایا ہوا اس کا ہے معتقد کون نہیں میرؔ کی استادی کا

ے موثر شعر کا پورا مضمون الفاظ کی ذراسی تبدیلی کے ساتھ ناسخؔ نے استعمال کرلیا۔

معترف کون نہیں میرؔ کی استادی کا آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میرؔ نہیں

میرؔ ہی کی توصیف میں غالبؔ نے ناسخ کا دوسرا مصرعہ بآسانی اپنے شعر میں استعمال کرلیا۔

غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخؔ آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میرؔ نہیں

و غالبؔ سے یہ تذکرہ شروع ہوا ہے تو خود میرؔ کی اسی مرصّع اور خوبصورت غزل سے متعدد شعراء نے نہ صرف
ی کی بلکہ قافیہ اور ردیف میں بھی کوئی کسر نہ چھوڑی۔

آگے سجادہ نشین قیس ہوا میرے بعد نہ رہی دشت میں خالی کوئی جا میرے بعد

غزل کا دوسرا شعر:

اب تو ہنس ہنس کے لگاتا ہے وہ مہندی لیکن خوں رلائے گا اسے رنگ حنا میرے بعد

بالکل معمولی ردو بدل سے خود غالبؔ نے ایک رنگین شعر بنالیا

خون دل خاک سے احوال بتاں پر یعنی ان کے ناخن ہوئے محتاج حنا میرے بعد

ر کی اسی زمین اور طرز ادا کے مطابق اکثر شعراء نے اچھے شعر کہے ہیں۔ ۱۸۹۰ء میں حضرت غافل دہلوی

کے دیوان میں پوری غزل بالکل میر کے انداز میں ہے جس کا مطلع ہی مرصع ہے۔

میاں میں اس نے جو کی تیغ قضا میرے بعد   خل گرفتہ کوئی کیا اور نہ تھا میرے بعد (حافظ)

اسی طرح سید آغا حسن امانت نے (جن کا دیوان "گلدستہ امانت" مطبوعہ مجیدی پریس کانپور ۱۳۳۱ھ میں شائع ہوا) میر کی اسی غزل پر مخمس ترتیب دیا جس کے ہر بند میں خود میر کا رنگ جھلکتا ہے

میری وحشت کا جو کچھ حال سُنا میرے بعد
ہوگیا جوشِ جنوں حد سے سوا میرے بعد
سونا جنگل جو نظر اس کو پڑا میرے بعد
آ کے سجادہ نشیں قیس ہوا میرے بعد
نہ رہی دشت میں خالی کوئی جا میرے بعد

مرگیا اب جو امانت تو پھری کچھ تقدیر
غم ہوا اس کو بہت ہوگئی حالت تغئیر
جیتے جی تو نے خبر لی نہ ذرا کی تدبیر
بعد مرنے کے مری قبر پہ آیا وہ میر
یاد آئی مرے عیسیٰ کو دوا میرے بعد

سلطان بہادر شاہ ظفر کی مشہور غزل ہے جس کا مطلع زبان زد خاص و عام ہے :-

یا مجھے افسر شاہانہ بنایا ہوتا   یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا

صرف قافیہ کے ردو بدل سے اسی زمین پہ اسی ردیف میں غالب کے خسر نواب الٰہی بخش خاں معروف نے بے حد مرصع غزل کہی جو قارئین کی دلچسپی کے لئے پوری نقل کی جاتی ہے۔

یا مجھے شبنم گریاں ہی بنایا ہوتا   ورنہ یارب گل خنداں ہی بنایا ہوتا
داغ پہ داغ اگر دے کے جلانا تھا مجھے   یک قلم سرو چراغاں ہی بنایا ہوتا
تجھ کو مطلب تھا اگر میری پریشانی سے   سربسر زلف پریشاں ہی بنایا ہوتا
مجھ کو دنیا میں سیہ بخت اگر کرنا تھا   رنگ خال رخ جاناں ہی بنایا ہوتا
تھا جو حیراں مجھے اس شکل میں رکھنا منظور   صاف آئینہ حیراں ہی بنایا ہوتا
گر خوشی تیری یہی تھی کہ یہ نالاں ہوئے   تو مجھے بلبل بستاں ہی بنایا ہوتا
ایک عالم کی جو آنکھوں سے گرایا جوں اشک   کاش کہ گوہر غلطاں ہی بنایا ہوتا
یوں رلا کر جو کیا اب مجھے انگشت نما   اس سے تو شمع شبستاں ہی بنایا ہوتا

تھا اگر قابل زنداں ہی ازل سے معروف
ابدا طفل دبستاں ہی بنایا ہوتا

غالب کی فارسی شاعری پر قادر الکلامی کا ثبوت ان کے ناظم ہروی کے اس "تمت بالخیر" شعر پر استادانہ گرہ لگانے ملتا ہے۔ ناظم کا مشہور شعر ہے۔

زخسرو چو نوبت بہ جامی رسید — ز جامی سخن را تمامی رسید

اس پر غالب نے کہا اور خوب کہا :۔

ز جامی بہ عرفی و طالب رسید — ز عرفی و طالب بہ غالب رسید

ایک ہی موضوع پر متقدمین سے متاخرین تک سب شعراء نے طبع آزمائی کی ہے۔

حضرت اصغر گونڈوی کا خوبصورت شعر ہے :۔

بس اتنے پر ہوا ہنگامۂ دار و رسن برپا — کہ لے آئینہ کیوں آغوش میں پیر درخشاں کو (اصغر گونڈوی)

حضرت قدیر لکھنوی نے کچھ ایسے ہی خیال کو اپنے الفاظ کے سانچے میں بڑی نزاکت سے ڈھال دیا۔

قریب شام وہ بیٹھے ہیں آئینہ لے کر — غروب ہو کے نہ ہو آفتاب کیا کہئے (قدیر لکھنوی)

یا جگر نے برملا کہا :

شیشۂ دل وہ ہستیٔ نازک ٹھیس لگی اور ٹوٹ گیا — اس پہ کسی کے تیر ستم کی مشق ستم کیا کہئے (جگر)

تو حضرت جلیل مانکپوری نے اپنا رنگ جمایا :

موجِ ہوا احباب کو سنگ گراں ہوئی — لیتے ہی سانس شیشۂ دل چور چور تھا (جلیل)

یا جب حالی نے کہا :

یاران تیز گام نے منزل کو جا لیا — ہم محوِ نالۂ جرس کارواں رہے (حالی)

اسی زمین اور تخیل میں ایک اور شاعر اپنی بلند خیالی کا سکہ جما گئے۔

اُترنے والے ابھی تک نہ بام سے اُترے — تڑپنے والے تڑپ کر فلک کو چھو آئے

شعری تجلیات کی یہ یگانگت اور خیال و فکر کا یہ یکساں رنگ صرف شعراء کے جمالیاتی ذوق کی ہم آہنگی کی دلیل ہے اور "لفافے بدلنے" کی یہ روایت اکثر غیر شعوری ہی ہوتی ہے۔ ●●

خلیل الرحمٰن اعظمی

○

ہم بانسری پہ موت کی گاتے رہے نغمہ ترا — اے زندگی، اے زندگی، رتبہ رہے بالا ترا

اپنا مقدر تھا یہی اے منبعِ آسودگی — بس تشنگی، بس تشنگی گو پاس تھا دریا ترا

اِس گام سے اُس گام تک زنجیرِ غم کے فاصلے — منزل تو کیا ہم کو ملے، چلتا رہے رستہ ترا

تو کون تھا، کیا نام تھا، تجھ سے ہمیں کیا کام تھا — ہے پردۂ دل پہ ابھی دھندلا سا اک چہرہ ترا

اک ایک کر کے بجھ گئی سینے میں جلتی آگ تھی

اب اے چراغِ آگہی زندہ رہے شعلہ ترا

جھک کے سجدے جو ترے نقشِ قدم تک پہنچے
لوگ کہتے ترے دیوانے حرم تک پہنچے

اَن کہی رہ گئی رودادِ تمنا کتنی
کتنے افسانے ہیں جو نوکِ قلم تک پہنچے

تیرے در تک بھی رسا ہو نہ سکے ہم لیکن
چاہنے والے تری زُلف کے خم تک پہنچے

پھول بھی زیست کی راہوں میں بچھے کانٹے بھی
کبھی خوشیوں تک ہم آئے کبھی غم تک پہنچے

آبرو اور بھی بڑھ جائے مرے اشکوں کی
ان کا دامن جو مرے دیدۂ نم تک پہنچے

توڑنی ہوگی روایات کی دیوار عزیزؔ
میری آواز ہر اک اہلِ قلم تک پہنچے

عزیزؔ احمد جلیلی

جس آدمی پہ ہے لازم وجود پہچانے
اس آدمی کو تو سارا شہود پہچانے

دلوں کی سرحدیں تقسیم ہو گئیں لیکن
نظر کہاں تلک اس کے حدود پہچانے

یہ مسئلہ ہیں فنا و بقا کی ہوں زندہ
حیات کشمکشِ ہست و بود پہچانے

تلاشِ حق ہیں، جو مٹی میں مل گئے اُن کا
جسے ہو شوق وہ نام و نمود پہچانے

تمام عمر تو زنداں میں سانس لی ہم نے
تمام عمر جو حالِ قیود پہچانے

کچھ ایسی ہستیاں گذری ہیں اپنی دنیا میں
جنھیں قرآن و صلوٰۃ و درود پہچانے

ہر اک در نہیں سجدے کے واسطے دانشؔ
کمالِ ذوق مقامِ سجود پہچانے

دانشؔ گوہر
(سعودی عرب)

سُن کے میری داستانِ غم وہ گھبرانے لگے
کر کے حیلہ نیند کا "بس بس" وہ فرمانے لگے

بے حجابانہ وہ میرے سامنے تو آ گئے
جب پڑی مجھ پہ نظر اُن کی تو شرمانے لگے

اُٹھ کے پہلو سے ہمارے وہ روانہ کیا ہوئے
ساتھ ساتھ اُن کے ہمارے ہوش بھی جانے لگے

طبعِ نازک پہ گراں گذری نہیں جب کوئی بات
پھول سے رخسار پھر کیوں اُن کے مرجھانے لگے

پھر کسی نے دلنوازی کی ہماری اس طرح
جھک گئیں نظریں تو مژگاں تیر برسانے لگے

انتہائے عشق کا ہوگا کوئی تو امتیاز!
"اے جنوں اتنا تو ہو کانٹوں پہ نیند آنے لگے"

پھر سکونِ دل کا ساماں کیا بہم پہنچے فہیمؔ
جب خیالِ یار ہی فرقت میں تڑپانے لگے

ہیم چندر پرشاد فہیمؔ حیدرآبادی

غزلیں

سب رنگ

اس عنوان کے تحت ہند و پاک کے معیاری ادبی رسائل و کتب سے
مضامین، نظم و نثر کا انتخاب شائع ہوا کرے گا۔ (ادارہ)

ہرمن ہیس
جرمن زبان سے ترجمہ: محمد اسحٰق میر

شاعر

بیان کیا جاتا ہے کہ جوانی میں چینی شاعر ہان فوک کے دل میں ایک عجیب و غریب دُھن سمائی ہوئی تھی۔ وہ سب کچھ
سیکھنا اور ہر اس شئے پر، جس کا شاعری سے کوئی نہ کوئی رشتہ ہو، کامل دسترس حاصل کرنا چاہتا تھا۔ یہ اس وقت کی بات
ہے جب وہ ہنوز دریائے زرد کے کنارے اپنے آبائی وطن میں مقیم تھا۔ حسب الخواہش اور شفیق والدین کے اعانت۔
اس کی نسبت ایک ذی وجاہت خاندان کی دختر نیک اختر سے ہو چکی تھی اور شادی کی تقریب کے لیے بھی عنقریب کسی مبارک
دن کا انتخاب ہونے والا تھا۔ اس وقت ہان فوک کی عمر تقریباً بیس سال تھی۔ وہ ایک خوبرو نوجوان تھا۔ اس کے مز
میں انکسار کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اور اس کے طور طریقے دلوں کو موہ لینے والے تھے۔ وہ علوم مروجہ کی تعلیم سے ا
ہو چکا تھا اور اپنی جواں سالی کے باوجود مقامی شاعروں اور ادیبوں سے بھی متعارف ہو چکا تھا۔ اگرچہ وہ صحیح معنے
میں امیر نہ تھا مگر اسے ایک معقول جائیداد ملنے کی توقع تھی جس میں اس کی دلہن کے جہیز کا اضافہ بھی ہونے والا تھا۔
اس کی منگیتر نہ صرف بے حد حسین بلکہ خوش خصائل اور نیک سیرت بھی تھی اسی لیے اب بظاہر ہان فوک کی مسرتوں میں
کوئی بھی خامی باقی نہ رہی تھی۔ لیکن ابھی تک اس کے قلب کو تسکین نہ حاصل ہوئی تھی، اسی واسطے کہ اس کے دل میں
ایک کامل شاعر بننے کی تمنا، ہر لمحہ، سمائی ہوئی تھی۔

ایک شام، جب دریا کے ایک کنارے پر چراغاں کا میلہ منایا جا رہا تھا، یوں ہوا کہ ہان فوک دریا کے دو
کنارے پر تن تنہا ٹہلنے لگا۔ جب وہ دریا کی جانب ایک عمر رسیدہ درخت کے تنے کا سہارا لے کر جھکا تو اس نے آ
آب میں ہزارہا روشنیوں کو تیرتے اور لرزتے ہوئے دیکھا۔ پھر اس نے یہ بھی دیکھا کہ کشتیوں اور بیڑوں پر بیٹھے
ہوئے مرد، عورتیں اور نوجوان لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے کو اس تہوار کی مبارکباد دے رہے ہیں اور ان کے
زرق برق لباس خوش نما پھولوں کی طرح چمک دمک رہے ہیں۔ اس نے اپنے کانوں سے ... روشنیوں سے منور آ
رواں کی لطیف سرسراہٹ، گانے والیوں کے گیت، ستار کے تاروں کا ارتعاش اور بانسری نوازوں کی ...

تانیں بھی سنیں۔ جب طبیعت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نوجوان نے عالم تنہائی میں اس سارے حسن کا مشاہدہ کیا تو اس کا دل بے تاب ہو کر اچھلنے لگا۔ اگرچہ اس کا جی بھی چاہتا تھا کہ دریا کے پار جاکر اپنے دوستوں اور اپنی منگیتر کی معیت میں یہ تہوار منائے، لیکن اس سے کہیں زیادہ اس کا دل اس بات کے لیے بیقرار تھا کہ ایک حساس انسان کی حیثیت سے یہ سب کچھ اپنے اندر جذب کر کے ایک خیالی نظم میں ڈھال لے۔ رات کی نیلاہٹ، دور پانی میں روشنیوں کا رقص میلہ منانے والوں کی مسرتیں اور ایک خاموش تماشائی کی تمنا، جو اس وقت ایک درخت کے سہارے جھکا ہوا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ دنیا کے سارے تہواروں اور زمین کی ساری مسرتوں کے درمیان بھی اسے کبھی قلبی اطمینان اور حقیقی راحت میسر نہ ہوگی اور وہ زندگی کی گہما گہمی میں بھی اپنے آپ کو تنہا اور ایک قسم کا اجنبی اور بیگانہ ہی محسوس کرے گا۔ اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ دوسری بے شمار روحوں میں سے صرف اسی کی روح کو یہ امتیازی خصوصیت حاصل ہے۔ وہ دنیا کے رنگ و بو کے حسن و جمال اور ایک بیگانے انسان کی تمناؤں کو بیک وقت محسوس کر سکتا ہے۔ یہ سوچتے ہی وہ غمگین ہو گیا اور اس نے اس حقیقت پر غور و فکر کرنا شروع کر دیا۔ اس کے خیالات کا منتہا یہ تھا کہ اسے حقیقی مسرت اور قلبی تسکین صرف ایسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے کہ وہ دنیا کو اپنے گیتوں میں کامل طور پر منعکس کرنے میں کامیاب ہو جائے اور پھر ان عکسی تصویروں کے روپ میں ایک پاکیزہ اور ابدی دنیا کا مالک و مختار ہو جاتے۔

جب ہان فوک خواب اور بیداری میں تمیز کرنے کے قابل نہ رہا تو اس نے اچانک ایک ہلکی سی سرسراہٹ سنی اور درخت کے تنے کے قریب ایک اجنبی کو کھڑا پایا۔ وہ ایک بوڑھا انسان تھا۔ اس نے بنفشی رنگ کا لباس پہن رکھا تھا اور اس کے چہرے سے جلال ٹپک رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی ہان فوک کھڑا ہو گیا اور اس نے اس بزرگ اور معزز ہستی کو بڑے مناسب طریقے سے مودبانہ سلام کیا۔ لیکن اجنبی نے صرف مسکرا کر چند اشعار سنائے۔ ان اشعار میں ہان فوک کی حالیہ وارداتِ قلبی کی اتنے کامل حسین اور دلنشین انداز میں تصویر کشی کی گئی تھی کہ یہ نوجوان مارے حیرت کے دم بخود ہو گیا۔

"ارے آپ کون ہیں؟" وہ ایک بار پھر مودبانہ سلام کرتے ہوئے چلّایا "آپ کی نگاہ تو میری روح میں اتر گئی ہے اور آپ کے اشعار ان تمام شعروں سے زیادہ حسین ہیں جو میں نے آج تک اپنے سارے استادوں سے سنے تھے۔"

اجنبی ایک صاحبِ کمال انسان کے انداز میں دوبارہ مسکرا کر بولا "اگر تو شاعر بننا چاہتا ہے تو میرے پاس آجا۔ تو میری جھونپڑی کو شمالی پہاڑوں پر اس عظیم دریا کے ماخذ کے قریب پائے گا۔ میرا نام قادر الکلام ہے۔" یہ کہتے ہی بوڑھا درخت کے مختصر سے سائے میں داخل ہو کر غائب ہو گیا۔ ہان فوک نے اسے لاکھ ڈھونڈھا مگر کوئی سراغ نہ ملا۔ بالآخر اسے یقین ہو گیا کہ مارے تھکن کے اس کی آنکھ لگ گئی تھی اور یہ منظر اس نے عالم خواب میں دیکھا ہے۔ اس کے بعد وہ فوراً دریا پار جاکر میلے میں شریک ہو گیا۔ لیکن دوستوں کی گفتگو اور بانسری کے نغموں کے درمیان بھی اس کے کانوں میں اس پُراسرار اجنبی کی آواز رہ رہ کر گونج رہی تھی اور اس کو ایسا

محسوس ہوتا تھا کہ جیسے اجنبی اس کی روح کو اپنے ساتھ ہی لے گیا ہے۔ کیونکہ وہ اس محفلِ عیش و طرب میں بھی اپنے آپ کو بیگانہ محسوس کر رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں ہنوز نیند کا خمار بھرا ہوا تھا۔ یار دوست اسے مریضِ عشق سمجھ کر طعن و تشنیع کر رہے تھے۔

چند دنوں کے بعد جب ہان فوک کے والد نے شادی کی تاریخ مقرر کرنے کے لیے اپنے عزیز و اقارب اور دوستوں کو اکٹھا کرنا چاہا تو دولہا نے اس تجویز کی شدید مخالفت کرتے ہوئے کہا "اگر آپ کو میری باتیں والدین کی لائقِ اطاعت کے منافی نظر آتیں تو میں اس کے لیے آپ سے معافی کا خواستگار ہوں۔ لیکن آپ خوب جانتے ہیں کہ میرا دل صنفِ شاعری میں کمال حاصل کرنے کے لیے کس قدر بیقرار ہے۔ اگرچہ کئی دوست میرے گیتوں کو بے حد سراہتے ہیں لیکن میں خوب جانتا ہوں کہ میں ہنوز ایک مبتدی ہوں اور میں نے اس راہ میں ابھی پہلا قدم ہی اٹھایا ہے، لہٰذا میں آپ سے درخواست کروں گا کہ مجھے کچھ دیر کے لیے مجرّد ہی رہنے دیا جائے تاکہ میں مشقِ سخن جاری رکھ سکوں۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر میں ابھی سے ہی گھر بار کے چکر میں پڑ گیا تو پھر میں اس نعمت سے محروم ہو جاؤں گا۔ ابھی تو میں جوان ہوں اور میری کوئی خاص ذمہ داری بھی نہیں، اس ہی واسطے میں چند دنوں کے لیے اپنے آپ کو صرف شاعری کے لیے وقف کر دینا چاہتا ہوں کیونکہ مجھے شاعری سے شہرت اور مسرت حاصل ہونے کی توقع ہے۔"

یہ باتیں سن کر اس کا باپ مبہوت ہو کر بولا "معلوم ہوتا ہے کہ شاعری تمہیں دنیا کی ہر شئے سے عزیز ہے حتیٰ کہ تم اس کی خاطر اپنی شادی تک ملتوی کروانے پر تلے ہوئے ہو۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم اپنی منگیتر سے کسی بات سے ناراض ہو گئے ہو۔ اگر یہ بات درست ہے تو پھر مجھے صاف صاف کہہ دو تاکہ میں تمہاری صلح کروا دوں یا پھر کوئی نیا رشتہ تلاش کر سکوں۔"

بیٹے نے باپ کو قسم کھا کر یقین دلایا کہ اسے اپنی منگیتر سے آج بھی اتنی ہی محبت ہے جتنی کہ پہلے تھی اور ان کے باہمی تعلقات میں ناراضگی کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔ اس کے بعد ہان فوک نے اپنے باپ کو یہ بھی بتایا کہ اس نے جھاڑ فونس کے میلے کے دن خواب میں ایک استاد دیکھا ہے اور اس استاد کی شاعری اسے دنیا کی ساری خوشیوں سے بھی زیادہ عزیز ہے۔

"اچھا" باپ نے کہا "میں تمہیں ایک سال کی مہلت دیتا ہوں۔ اس عرصے میں تم اپنے خواب کی پیروی کر سکتے ہو۔ ہو سکتا ہے کہ کسی دیوتا نے اس خواب کے ذریعہ تمہاری رہنمائی کی ہو۔"

"ممکن ہے اس کام میں مجھے دو سال لگ جائیں" ہان فوک جھجکتے ہوئے بولا "آخر اس بات کا فیصلہ کون کر سکتا ہے؟" باپ نے بیٹے کو سفر کی اجازت تو دے دی مگر وہ دل ہی دل میں بہت پریشان ہوا۔ بیٹے نے جھٹ اپنی منگیتر کے نام ایک خط لکھا اور الوداع کہہ کر وہاں سے چل پڑا۔

کافی مسافت طے کرنے کے بعد جب وہ دریا کے منبع تک پہنچا تو اسے اس سنسان و بیابان مقام پر ایک بانس کی جھونپڑی نظر آئی، جس کے سامنے ایک بانس کی بنی ہوئی چٹائی پر وہی بوڑھا بیٹھا تھا جسے اس نے اس سے پہلے دریا کے کنارے

ایک درخت کے تنے کے قریب دیکھا تھا۔ وہ یہاں بیٹھا بربط بجا رہا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کا مہمان بڑے مودبانہ انداز میں اس کی جانب آ رہا ہے تو وہ نہ پیشوائی کے لیے اٹھا اور نہ اس نے خوش آمدید ہی کہا۔ بلکہ اس نے صرف ایک بار مسکرا کر دیکھا اور پھر اپنی نازک انگلیوں سے بربط کے تاروں کو چھیڑ لگا۔ آناً فاناً ایک سحر انگیز موسیقی کسی بادل کی طرح ساری وادی پر چھا گئی۔ شاگرد کے قدم دفعتہً رک گئے۔ وہ بہت متعجب ہوا اور اس خوشگوار حیرت کے عالم میں دنیا و مافیہا سے غافل ہو گیا۔ لیکن جب استادِ قادر الکلام اپنی چھوٹی سی بربط کو پرے رکھ کر جھونپڑی میں داخل ہوا تو ہان فوک نے تعظیماً اس کی پیروی کی اور اس کے بعد وہ اپنے استاد کا خادم بن گیا۔

ایک مہینے کے بعد ہان فوک اپنے سابقہ شعروں سے خود بخود متنفر ہو گیا اور اس نے انہیں اپنی یاد سے کلیتاً محو کر دیا۔ چند مہینوں کے بعد اس کی یاد سے وہ تمام شعر بھی مٹ گئے جو اس نے اپنے وطن میں اپنے استادوں سے سنے تھے۔ استادِ قادر الکلام نے ابھی تک اس سے بات بھی نہ کی تھی۔ البتہ وہ اسے زبانِ خاموشی سے بربط نوازی کی تعلیم دیتا رہا حتیٰ کہ موسیقی شاگرد کی روح میں اچھی طرح سرایت کر گئی۔ ایک بار ہان فوک نے ایک مختصر سا گیت لکھا جس میں موسم خزاں کی فضا میں دو پرندوں کی پرواز کی تصویر کشی کی گئی تھی۔ اسے ذاتی طور پر یہ گیت بہت پسند آیا لیکن اس کی ہمت نہ پڑی کہ وہ یہ گیت اپنے استاد کو بھی دکھاتے۔ ایک دن اس نے جھونپڑی کے پیچھے بیٹھ کر یہ گیت گانا شروع کر دیا۔ استاد بھی یہ گیت سن رہا تھا لیکن اس نے کچھ کہنے کی بجائے اپنی بربط کو ہلکے سروں میں بجانا شروع کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے فضا پر خنکی چھا گئی۔ جھٹ پٹا سرعت سے پھیلنے لگا اور ایک تیز و تند ہوا چلنے لگی حالانکہ موسم سرما ہنوز اپنے پورے شباب پر تھا۔ اچانک سرمئی آسمان پر دو بگلے جذبۂ سفر سے سرشار پرواز کرتے ہوئے دکھائی دیے۔ یہ منظر ہان فوک کے گیت سے اس قدر زیادہ حسین تھا کہ وہ مایوس ہو کر خود بخود خاموش ہو گیا اور اسے اپنی کمی کا ثبوت مل گیا۔ اسی طرح استاد ہر موقع پر اپنے شاگرد کی رہنمائی کرتا۔ ایک سال کے بعد ہان فوک بربط نوازی پر تقریباً کامل طور پر حاوی ہو گیا لیکن شاعری کا فن اس کے لیے دن بدن پہلے سے زیادہ مشکل اور بلند سے بلند تر ہوتا چلا گیا۔

جب دو سال گزرے تو شاگرد کو گھر، عزیزوں اور منگیتر کی یاد نے بری طرح ستانا شروع کر دیا۔ بالآخر اس نے ایک دن بالکل مجبور ہو کر اپنے استاد سے سفر کی اجازت مانگی۔ استاد نے مسکرا کر گردن ہلائی۔ "تم آزاد ہو" وہ بولا "تم جہاں بھی جانا چاہو جا سکتے ہو اور تمہیں واپس آنے یا نہ آنے کا بھی پورا اختیار ہے۔"

چنانچہ شاگرد نے اپنے سفر کا آغاز کیا اور راستے میں ستائے بغیر مسلسل چلتا رہا حتیٰ کہ ایک دن علی الصبح وہ اپنے شہر کے سامنے دریا کے کنارے تک پہنچ گیا۔ اس نے دریا کے محراب دار پل پر کھڑے ہو کر اپنے آبائی وطن پر ایک چھپتی ہوئی نگاہ ڈالی۔ پھر چپکے سے اپنے آبائی باغ میں داخل ہوا اور خوابگاہ کی کھڑکی کے قریب سے اپنے باپ کے سانسوں کی آواز سنی جو ہنوز محوِ خواب تھا۔ اس کے بعد وہ چوری چھپے اپنی منگیتر کے باغ میں پہنچا اور ایک ناشپاتی کے پیڑ کی چوٹی پر چڑھ کر اس نے اپنی منگیتر کو دیکھا جو اس وقت اپنے کمرے میں کھڑی بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔ جب اس نے اس آنکھوں دیکھے منظر کا اس ذہنی تصویر سے موازنہ کیا جو اس کے تخیل نے وطن کی یاد میں اسی موقع کے بارے میں

بانی تھی تو اس پر یہ حقیقت نمایاں طور پر واضح ہو گئی کہ شاعر بننا اس کا مقدر ہو چکا ہے۔ پھر اس نے یہ بھی دیکھا کہ جو حسن اور سحر شاعر کے خوابوں میں ہوتا ہے وہ حقیقی اشیاء میں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا۔ اس کے بعد وہ درخت سے نیچے اترا اور بھاگ کر باغ سے باہر چلا گیا۔ اس نے آبائی دطن کو پیچھے چھوڑا، پل کو عبور کیا اور بالآخر وہ پہاڑوں کی بلند وادی میں واپس پہنچ گیا۔ یہاں پہلے کی طرح اب بھی بوڑھا استاد اپنی جھونپڑی کے سامنے ایک معمولی سے چٹائی پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کی انگلیاں بربط کے تاروں سے کھیل رہی تھیں۔ شاگرد کو خوش آمدید کہنے کی بجائے استاد نے فن کی لذتوں پر صرف دو شعر سنائے جن کی معنویت اور حسن نے ہان فوک کو آبدیدہ کر دیا۔

ہان فوک دوبارہ استاد قادر الکلام کے پاس رہنے لگا۔ بربط نوازی میں تو وہ پہلے ہی سے کمال حاصل کر چکا تھا۔ اس لیے استاد نے اب اسے ستار نوازی کی تعلیم دینی شروع کر دی اور دن اس طرح گزرتے چلے گئے جیسے طرح پر دائی ہوائیں برف کے گالے اڑنے لگتے ہیں۔ وطن کی یاد نے ہان فوک کو مزید دو بار مغلوب کیا۔ ایک دفعہ تو وہ رات کی تاریکی میں چھپ چھپا کر بھاگ نکلا لیکن ابھی وہ وادی کے آخری موڑ تک ہی پہنچا تھا کہ رات کی ہوا نے جھونپڑی کے دروازے میں لٹکی ہوئی ستار کے تاروں سے کھیلنا شروع کر دیا اور موسیقی کی تانیں ہان فوک کے تعاقب میں دوڑنے لگیں اور اسے پکار پکار کر واپس بلانے لگیں۔ دوسری بار اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ اپنے باغ میں ایک پودا لگا رہا ہے۔ اس کی بیوی بھی پاس کھڑی ہے اور اس کے بچے اس پودے کو شراب اور دودھ سے سینچ رہے ہیں۔ جب وہ خواب سے بیدار ہوا تو جھونپڑی کے اندر چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ وہ پریشان ہو کر اٹھا تو اس نے اپنے قریب استاد کو محو خواب دیکھا جس کی سفید ریش قدرے لرز رہی تھی۔ استاد کو دیکھتے ہی اس کے دل میں نفرت کا طوفان برپا ہو گیا۔ اس نے سوچا اس شخص نے میری زندگی کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے اور میرا مستقبل مجھ سے چھین لیا ہے۔ وہ قتل کرنے کی غرض سے اس پر جھپٹنے ہی والا تھا کہ بوڑھے نے اچانک آنکھیں کھول دیں اور وہ اتنے معصوم اور قابل رحم انداز سے مسکرایا کہ ہان فوک کا سارا غصہ دھواں بن کر اڑ گیا۔

"ہان فوک!" بوڑھے نے عاجزی سے کہا۔ "یہ بات کبھی نہ بھولنا کہ تو آزاد ہے اور تو جو بھی چاہے کر سکتا ہے تو اپنے وطن کو لوٹ کر پودے لگا سکتا ہے۔ تو مجھ سے نفرت کر سکتا ہے حتیٰ کہ تو مجھے قتل بھی کر سکتا ہے۔ بہر کیف میں ان باتوں سے بے نیاز ہوں۔"

"آہ! یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ میں آپ سے نفرت کروں۔" ہان فوک دفور جذبات میں بولا "اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ میں آسمان سے نفرت کرنا چاہتا ہوں۔"

اس کے بعد وہ استاد کے پاس ہی رہا۔ اس نے ستار نوازی میں کمال حاصل کرنے کے بعد بانسری بجانی بھی سیکھ لی۔ اس کے بعد اس نے استاد کی نگرانی میں گیت لکھنے شروع کر دیئے اور رفتہ رفتہ اسے اس اسرار فن کو سیکھنے لگا جو بظاہر نہایت سادہ اور مانوس الفاظ میں کچھ کہنے کا نام ہے لیکن درحقیقت یہ الفاظ سننے والے کی روح کو اس طرح جھنجوڑ کر رکھ دیتے ہیں جس طرح ہوائیں سمندر کی سطح کو متلاطم کر دیتی ہیں۔ پھر اس نے طلوع آفتاب کی منظر کشی کی۔

کس طرح سورج پہاڑوں کی اوٹ سے رونما ہونے میں متامل ہوتا ہے۔ مچھلیوں کی خاموش اچھل کود، جب و
طرح پانی کی تہہ میں ادھر ادھر دوڑتی ہیں، یا بادِ بہاری میں بید کے درخت کا وجد میں آکر جھومنا ـــــ اگر
آواز بن کر بھی سنائی دیتا تو پھر بھی معلوم ہو جاتا کہ یہ انفرادی طور پر نہ تو سورج ہے، نہ مچھلیوں کی کلیلیں ا
کے درخت کا سرسراہٹ بلکہ ہر ایک مشاہدے میں آسمان اور زمین کے امتزاج سے ایک کامل راگ ظہور
اور اس آواز کو سن کر ہر شخص کے دل میں مسرت یا حزن کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور اسے وہ شے
یاد آجاتی ہے جس سے وہ محبت یا نفرت کرتا ہے۔ بچے کو کھیل، جوان کو اپنی محبوبہ اور بوڑھے کو اپنی موت۔

ہان فوک کو اب یہ یاد نہ رہا تھا کہ وہ کتنے سالوں سے عظیم دریا کے مانند کے پاس اپنے استاد کے
رہا ہے۔ بعض اوقات وہ محسوس کرتا کہ شاید وہ کل ہی یہاں آیا تھا اور استاد نے بربط بجا کر اس کا استقبال کر
کبھی کبھی اسے یوں لگتا کہ جیسے اس کے پیچھے ساری انسانی نسلیں اور سارے زمانے مٹ کر بے جان ہو چکے ہ
ایک صبح جب وہ بیدار ہوا تو اس نے اپنے آپ کو جھونپڑی میں تن تنہا پایا۔ اس نے اپنے استاد کو ہر
اور پکار پکار کر بلایا مگر استاد غائب ہو چکا تھا۔ راتوں رات موسم خزاں نمودار ہو گیا اور ایک تند
جھونپڑی کو جھنجھوڑنا شروع کر دیا۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر موسمی پرندوں کے بڑے بڑے غول اڑتے ہوئے
لگے، حالانکہ ابھی ان پرندوں کی آمد کا موسم شروع نہ ہوا تھا۔

ہان فوک اپنے جھونپڑے سے بربط کو اٹھائے پہاڑوں سے اتر کر سرزمینِ وطن کی جانب چل پڑا۔ ر
اسے جو شخص بھی ملتا وہ اسے ایک بزرگ اور واجب التعظیم ہستی سمجھ کر بڑے مودبانہ انداز میں سلام کرتا۔
آبائی شہر میں پہنچا تو اس کا باپ، اس کی منگیتر اور اس کے سارے رشتہ دار مر چکے تھے اور ان کے مکا
اجنبی انسان رہائش پذیر تھے۔ شام کے وقت جب دریا کے کنارے چراغوں کا تہوار منایا جا رہا تھا تو ہان
کے دوسرے کنارے ایک قدیم درخت کے سہارے جھکا ہوا تاریکی میں کھڑا تھا۔ جب اس نے اپنے بربط
کی تاروں کو چھیڑا تو عورتوں نے آہیں بھرنی شروع کر دیں اور وہ بے خود و مضطرب ہو کر تاریکی میں
نوجوانوں نے اس بربط بجانے والے کو پکار پکار کر بلایا۔ مگر تلاش کرنے کے باوجود وہ اسے نہ ڈھونڈ
وہ زور زور سے چلا رہے تھے۔ بخدا ہم نے آج تک بربط کی ایسی تانیں نہیں سنیں۔ لیکن ہان فوک و
رہا۔ اس نے دریا پر نگاہ ڈالی تو اسے پانی میں ہزارہا روشنیوں کے عکس تیرتے ہوئے نظر آتے۔ مگر
وہ اصل اور پرتو میں تمیز نہ کر سکا۔ بالکل اسی طرح اسے اس تہوار اور اس تہوار میں کوئی فرق نہ محسوس
اس نے یہیں کھڑے ہو کر ایک انجان استاد کی باتیں سنی تھیں ـــــ۔

("سویرا" لاہور [illegible])

نقد و نظر

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدوں کا آنا ضروری ہے)

نیاز فتحپوری

معنف امیر عارفی ناشر انجمن ترقی اُردو (ہند) دلی صفحات ۴۰۸ قیمت پندرہ روپے

زیر تبصرہ کتاب اُردو کے قادر قلم صاحب طرز ادیب و صحافی نیاز فتحپوری کی ادبی، علمی، سیاسی مذہبی اور سماجی زندگی پر تحقیقاتی مقالہ ہے جو آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ جب کسی شخصیت پر مقالہ لکھا جاتا ہے تو بالعموم انتخاب اعتقاد کی بناء پر ہوتا ہے اور اعتقاد کا لازمی نتیجہ جانب داری ہے۔ لیکن ہمیں زیر تبصرہ کتاب کے مطالعہ سے مسرت ہوئی کہ جناب امیر عارفی صاحب نے جانب داری اختیار نہیں کی بلکہ خوبیوں کے ساتھ خامیوں کو بھی گنایا ہے۔ چونکہ یہ مقالہ ڈاکٹریٹ کے حصول کے ضمن میں لکھا گیا ہے اور اس کی نگرانی مجنوں گورکھپوری اور آل احمد سرور جیسی ہستیوں نے کی ہے اس لئے ہمیں اس مقالہ میں وہ ساری خوبیاں ملتی ہیں جو ایک پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے لکھے جانے والے مقالے میں پائی جانی چاہئیں۔ ہمارے اپنے خیال میں یہ کتاب اُردو کے ہر کتب خانے میں اور ہر اُردو ادب کے پرستار کے گھر میں ہونی چاہیئے۔　(غلام جیلانی)

ہندستانی مشرقی افریقہ میں (جلد اول)

معنف کالیداس گپتا رضا ویل پبلیکیشنز بمبئی قیمت دس روپے پچاس پیسے

زیر تبصرہ کتاب جناب کالیداس گپتا نے بڑی محنت سے لکھی ہے اور ان تمام معلومات کو فراہم کر دیا ہے جو مشرقی افریقہ کو سمجھنے اور وہاں جاکر کاروبار یا ملازمت کرنے والے ہندستانیوں کی معروضیات، رہنے سہنے کے انداز سے واقف ہونے کے لئے ضروری ہیں۔ ہندستانی افراد تلاش معاش یا کاروبار کے سلسلہ میں دیگر ممالک میں بسے رہتے ہیں۔ حال حال تک مشرقی افریقہ میں بسنے والوں کی تعداد قابل ذکر تھی ایسے ہی اصحاب میں سے ایک جناب کالیداس گپتا رضا ہیں جو بیس سال وہاں گذار چکے ہیں، لیکن مسرت کی بات ہے کہ صرف کاروبار سے الجھے رہنے کی بجائے جناب رضا نے اپنے علمی مشاغل کو جاری رکھا اور ہندستانی بھائیوں سے ربط قائم رکھا اور ان کے ساتھ ساتھ مقامی حالات کا بغور مشاہدہ بھی کیا۔ زیر تبصرہ کتاب ان ہی مشاہدات پر مبنی ہے۔ آج کل دنیا بہت چھوٹی ہو گئی ہے اور دنیا کے بسنے والے سمٹ کر یکجا ہوتے نظر آ رہے ہیں۔ ایسی صورت میں دیگر ممالک اور خصوصاً ایسے ممالک جہاں ہندستانی بھائی بستے ہیں ان کے حالات سے واقف ہونا ضروری ہوتا جا رہا ہے۔ اس وجہ جناب رضا کی یہ تصنیف ہاتھوں ہاتھ لئے جانے کے قابل ہے۔ کتابت طباعت، کاغذ اور رنگ و روپ سب اچھے ہیں لیکن صفحات کے لحاظ سے شاید قیمت بہت زیادہ ہے۔　(غلام جیلانی)

اردو کے مسائل

مصنف ڈاکٹر حکم چند نیّر صفحات ۱۹۲ قیمت ۱۲ روپیہ

ڈاکٹر حکم چند شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی سے متعلق ہیں۔ انھوں نے وقتاً فوقتاً اردو کے مسائل پر تحقیقی مضامین لکھ کر ملک کے نامور رسائل میں چھپوائے تھے۔ اب ان کو اتر پردیش اردو اکاڈمی کی مالی امداد سے (مضامین کا مجموعہ) شائع ہوا ہے۔ ان مضامین کے مطالعہ سے آپ پر یہ بات کھل جائے گی کہ اردو زبان نے اپنی عمر کا نصف حصہ سے زیادہ مسائل و مشکلات سے الجھتے ہوئے گزارا ہے۔ علامہ اقبال کے پیش نظر غالباً کی تمنائے آبرو ہی تھی جو ان سے یہ شعر کہلوائی ؎

تمنا آبرو کی ہے اگر گلزارِ ہستی میں ⁂ تو کانٹوں سے الجھ کر زندگی کرنے کی خو کر لے

ڈاکٹر نیّر کے تحقیقاتی مضامین پڑھنے کے بعد ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ یہ کام جوئے شیر لانے کے برابر تھا۔ اور ہمیں اس اردو جو ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کا مقدس اثاثہ ہے اس کے شیدائیوں میں ڈاکٹر نیّر جیسے "صاحب جنون" موجود ہیں۔ محنت سے یہ مضامین لکھے گئے ہیں اس کا اندازہ ہر کس و ناکس کے بس کا روگ نہیں۔ بنارس ہندو یونیورسٹی کے ان طلباء پر جنھیں ڈاکٹر نیّر جیسے استاد نصیب ہوئے ہیں۔

(غلام جیلانی)

ماہنامہ "سب رس" (اقبال نمبر حصہ اول و دوم) کراچی

مقام اشاعت "ایوان اردو" کراچی۔ ایڈیٹر خواجہ حمید الدین شاہد

زیر تبصرہ سب رس کراچی کی دو جلدوں کو دیکھ کر کئی باتیں کا وہ دور یاد آتا ہے جب کہ حیدرآباد میں ایوان اردو ادارہ ادبیات اردو ڈاکٹر زور کے رہائشی مکان کی نچلی منزل میں قائم تھا اور خواجہ حمید الدین شاہد مہتمم ادارہ و مدیر سب رس کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ یوں تو ڈاکٹر زور کے سینکڑوں شاگرد ہندوستان و پاکستان میں آج بھی موجود ہیں لیکن جناب کو جس اعتقاد سے ادا کیا ہے وہ اپنی آپ مثال ہے۔ "ایوان اردو" اور "سب رس" دونوں ڈاکٹر زور کے پسند کردہ نام ہیں شاہد نے ڈاکٹر زور کو شایانِ شان خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ اب آیئے سب رس کے اقبال نمبر کے ان دو حصوں کی ترتیب کریں۔ اگرچہ اقبال نے یہ کہا تھا کہ ؎

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں ⁂ یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

لیکن جہاں تک ہم غور کر سکے یہی نتیجہ نکلا کہ اقبال کے رازداں و ہم زبان بننے کی جن سے توقع تھی وہ بھٹکے ہوئے، اور اقبال اس میدان میں تنہا رہ گئے۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ نصف صدی میں اقبال پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ آج اور آئندہ بھی لکھا جاتا رہے گا۔ سب رس کے اقبال نمبر کے حصہ اول و دوم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ سمندر کو کوزے زماں و مکاں کا ایک نیا کلیہ ہمیں عطا کیا ہے کہ نصف صدی کے دوران ہندوستان و پاکستان کے گوشے گوشے میں اقبال ان کا انتخاب ان دونوں حصوں میں موجود ہے۔ ایسے شہ پاروں کو یکجا کرنا سمندر کی تہہ سے گہر ہائے نایاب ڈھونڈ قدر کم نہیں۔ ہم جناب شاہد کو پُرخلوص مبارکباد پیش کرتے ہوئے دست بدعا ہیں کہ دلِ بے قرار کا ذوق و شوق ا

(غلام جیلانی)

اُردو نامہ

اُردو کی علمی، ادبی اور تہذیبی خبریں

یکم مئی ـ بزمِ اُردو اکاؤنٹنٹ جنرل س کے زیرِ اہتمام جلسہ یادِ اقبال منعقد ! ڈاکٹر غلام دستگیر رشید، ڈاکٹر اسلوب ماری (علیگڈھ) ڈاکٹر عالم خوندمیری اور اعباس رضوی نے اقبال کے فکر و فلسفہ پر شنی ڈالی۔ شاذ تمکنت اور علیم افسر نے نظمیں ائیں۔ اڈیشنل اکاؤنٹنٹ جنرل صدر تھے کشن سنگھ ورما نائب صدر نے شکریہ کیا۔

● اقبال اکیڈمی کی طرف سے "مدینہ ش" میں ڈاکٹر ظ انصاری کو ایک استقبالیہ گیا۔ جناب خلیل اللہ حسینی پرنسپل انوار العلوم نے صدارت کی۔ ڈاکٹر ظ انصاری نے کہا کہ "اقبال رہا تو لاہور والے ہی کچھ لکھ سکتے ہیں یا پھر درآباد والوں نے اقبال کی فکر و نظریے مضامین اور تصانیف سے ثابت کر دکھایا کہ وہ اقبال فہمی کا حق ادا کر رہے ہیں" ظ صاحب نے اشفاق حسین مرحوم کی اقبال نامی کو اقبالیات میں گرانقدر حصہ قرار دیتے ہوئے اپنا خراجِ عقیدت پیش کیا ب ظہیر الدین اور کریم رضا صاحبان نے قبال اکیڈمی مہمانوں کو متعارف کرایا۔

۲ر مئی ـ آندھرا پردیش سوشیل ایڈمنسٹریٹری اسوسی ایشن (اپسیلا) کے زیرِ اہتمام ایک علمی محفل جناب احسن علی مرزا کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ جناب مہدی عابدی ایڈیٹر ہفت روزہ "حیات" دلی نے مولانا آزاد اور اُردو صحافت" کے موضوع پر مقالہ سنایا۔

۴ر مئی ـ اُردو مجلس کا ماہانہ ادبی اجلاس مرزا سرفراز علی صاحب سابق نائب ناظم تعلیمات کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر ڈیوڈ میتھوز پروفیسر لندن یونیورسٹی نے "انگلستان میں اُردو" کے موضوع پر روانی اور سلاست کے ساتھ مخاطب کیا۔ محفلِ شعر بھی منعقد ہوئی۔ جناب صلاح الدین نیّر نے شکریہ ادا کیا۔

● "بزمِ اُردو" ریاستی الکٹریسٹی بورڈ کی طرف سے ڈاکٹر ڈیوڈ میتھوز کا پُرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ پروفیسر میتھوز نے دکنی اور اُردو لسانیات نیز دکنی شعر و ادب کے موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے حیدرآباد کے ادبی ماحول کو زبردست خراجِ تحسین ادا کیا۔ مسٹر لیس اے شرما سکریٹری بورڈ نے جلسہ کی صدارت کی۔ مسٹر ایم اے عظیم معتمد بزمِ اُردو نے شکریہ ادا کیا

● جنتا پارٹی لیڈر نواب میر احمد علی خاں و صدر ریاستی انجمن ترقی اُردو نے پارٹی کارکنوں کے ایک جلسہ کو مخاطب کرتے ہوئے ریاستی حکومت سے اس امر کا مطالبہ کیا کہ وہ اُردو کے ساتھ انصاف اور اقلیتوں کے مسائل کی یکسوئی کے لئے موثر اقدامات کرے۔ مسٹر کے ایم خان (رکن ترقی اُردو بورڈ) نے کہا کہ "ماضی میں حکومت نے اُردو کے ساتھ سوتیلی ماں جیسا سلوک روا رکھا۔ اب جبکہ حالات سدھر گئے ہیں ریاستی حکومت کو چاہیئے کہ وہ اُردو والوں کے مطالبات کی تکمیل کر دے"

۵ر مئی ـ ریاستی وزیر پنچایت راج جناب ایم۔ باگاریڈی (نائب صدر اُردو اکیڈیمی) نے مرکزی وزراء جناب سکندر بخت اور جناب موہن دھاریہ کو اپنی اُردو تصانیف پیش کیں جسے ہر دو وزراء نے خوشنودی کے ساتھ قبول کیا اور کہا کہ اُردو ہندوستان کے مشترکہ ثقافتی ورثہ کی روشن علامت ہے۔ مسٹر موہن دھاریہ نے کہا کہ وہ تیزی سے اُردو سیکھ رہے ہیں۔

۱۷ر مئی ـ بزمِ نارائن داس کا ماہانہ طرحی مشاعرہ جناب معین فاروقی ایڈیٹر روزنامہ "انگارے" کی صدارت میں منعقد ہوا ۴۲ شعراء نے طرحی کلام سنایا۔

● حیدرآباد کے ایک بزرگ شاعر جناب غلام غوث یقین (شاگرد حضرت صفی اورنگ آبادی)

۷۰ سال کی عمر میں کراچی میں انتقال ہو گیا
یقین مرحوم نے صفی کا شعری مجموعہ دس سال
قبل "پراگندہ" کے نام سے چھپوایا تھا۔
۹ مئی ۔ آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی
کی طرف سے اکیڈیمی کے نائب صدر جناب یم
باگاریڈی کے وزیر منتخب ہونے اور نئے
وزیر تعلیم مسٹر وینکٹ رام ریڈی کے اعزاز
میں خیر مقدمی تقریب منعقد ہوئی۔ اکیڈیمی کے
صدر جناب آصف پاشا نے ہر دو وزراء کی
گلپوشی کی اور اس توقع کا اظہار کیا کہ ان
اصحاب کی کابینہ میں موجودگی ریاست کے
اردو مسائل کے حل کے باب میں سود مند ثابت
ہوگی مسٹر باگاریڈی وزیر پنچایت راج
نے اکیڈیمی سے اپنی وابستگی کا ذکر کرتے
ہوئے اردو والوں کو اس امر کا یقین دلایا
کہ وہ اپنے عہد وزارت میں تعلیم اور ادب
کے مسائل کا حل خوشگوار طریقہ پر ڈھونڈھ
نکالنے میں وزیر تعلیم اور چیف منسٹر صاحب
کو آمادہ کریں گے۔ وزیر تعلیم مسٹر ریڈی نے
کہا کہ وہ اردو کے حل طلب مسائل کو طے
کرنے میں اکیڈیمی کے ارباب کار سے ہر وقت
صلاح و مشورہ کرنے کے لئے تیار ہیں۔ موصوف
نے اردو نصابی کتب کی ترتیب، تیاری اور
طباعت کے سلسلے میں ماہرین کی ایک کمیٹی کے
تقرر کا اعلان کیا۔ جناب عابد علی خاں صدر
نشین مجلس انتظامی اردو اکیڈیمی نے خیر مقدمی
تقریر کرتے ہوئے اکیڈیمی کی سرگرمیوں کا
ذکر کیا اور کہا کہ اکیڈیمی کے دیرینہ رفیق

باگاریڈی صاحب کا وزارت کے عہدۂ جلیلہ
پر فائز ہونا اردو والوں کے لئے خوشی اور
اطمینان کا باعث ہے۔ اکیڈیمی کی طرف سے
ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید کی مطبوعہ کتاب
"تلگو ادب اور فنون لطیفہ" کی رسم اجراء جناب
باگاریڈی نے اس جلسہ میں انجام دی اور
تلگو اردو کی لسانی ہم آہنگی کو خراج تحسین
ادا کیا۔ جناب سجادت چنگھٹہ ڈائرکٹر
اکیڈیمی نے شکریہ ادا کیا اس تقریب
میں ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور اساتذہ
و طلباء کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔
۱۰ مئی ۔ سنبھلے کے سخنور حکیم یوسف
حسین خاں (موظف پرنسپل نظامیہ طبیہ کالج)
کا طویل علالت کے بعد انتقال ہو گیا۔ حکیم
صاحب کا شعری مجموعہ "خواب زلیخا" کے نام سے
شائع ہو چکا ہے۔
۱۲ مئی ۔ انڈین رائٹرس لینڈ آرٹسٹس
اسوسی ایشن سکندرآباد کے زیر اہتمام
ادبی اجلاس اور مشاعرہ عظیم حسینہ آبادی کی
صدارت میں منعقد ہوا شکیل صدیقی اور
رامن سریو ستو ماجیالی نے شعر و ادب
کے مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ محفل شعر
میں خیرات ندیم، عظیم، عزیزہ صادق، شمیم
نصرتی، عزیز النساء صبا، علی سرور، گوہر
اسحاق، محمودی سروشی، عبرت اور ناگپال عظیم
دہلوی نے کلام سنایا۔
۱۳ مئی ۔ ادبی ٹرسٹ کا تیرھواں
سالانہ کل ہند مشاعرہ اردو آرٹس کالج کے

امداد کے سلسلے میں شیخ احمد
مسلم اتفاف کی صدارت
ریاستی وزیر حیدانات
میر احمد علیخاں صدر ریاست
کے علاوہ جناب مرزا ظفر ا
خصوصی کی حیثیت سے شرکت
خاں بانی و معتمد ادبی ٹرسٹ
علمی و ادبی خدمات کا ذکر کر
تقریر کی۔ صدر مشاعرہ نے
انجام دی اور ٹرسٹ کے بانی
خراج تحسین ادا کیا۔ اس
شعراء اختر الایمان، مختار
بے پوری، تسنیم فاروقی، والی
ڈاکٹر بشیر بدر، اور رضا کو
شعراء کنول پرشاد کنول، ا
شہیدی، خیرات ندیم، اور
صلاح الدین نیر، علی احمد
اور عزیز النساء صبا نے
بشیر بدر نے نظامت کے فرا
۱۴ مئی ۔ آجید اک
میں جناب ماہر القادری کی
عقیدت ادا کیا گیا۔ اس
بھی عمر یوسفی صاحب کی صدا
کی گئی۔

● ادبی ٹرسٹ اور انجمن:
اردو ہال میں ایک سمینار "اردو
کے مسائل" پر ڈاکٹر سید عبا
پرنسپل پبلیکیشنز آفیسر مرکزی

ںدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر مغنی تبسم (ایڈیٹر
جہاد اردو جامعہ عثمانیہ) نے کلیدی خطبہ پڑھا اور
ینار کی کارروائی انجام دی۔ جناب خواجہ عبد الغفور
لمریری اچار یاسٹر اردو اکیڈیمی، جناب اختر حسن
ددگار معتمد آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی) اور
رجانکی رام (پبلیشر دتی) نے مخاطب کیا۔ ڈاکٹر
ارب نے اس موضوع پر اہم مقالہ سنایا۔
باحث میں پبلیشروں اور مصنفوں نے حصہ لیا
ر میں جناب مجتبیٰ حسین نے کتابوں پر ایک
مدہ فکاہیہ بھی سنایا۔ سمینار میں ایک
ارداد بھی منظور کی گئی جس میں کہا گیا ہے کہ ترقی
ہلکتابوں اور کتب خانوں کی ایک
بسوط فہرست شائع کرے اور ملک کے
امات پر ہر سال بورڈ کی طرف سے کل ہند
نے پر کتابوں کا میلہ بھی منعقد ہوا کرے
سیمنار میں ادبی ٹرسٹ کی طرف سے مطبوعہ
رت ندیم اور احسان علی مرشی کے شعری مجموعوں
مژگاں" اور "فردوسِ نظر" کے علاوہ
رنامہ سیاست کی طرف سے شائع شدہ
تابوں "شہر حیدرآباد" اور "برجستہ اشعار"
ہندی اردو) کی رسم اجرا جناب آصف پاشاہ
رریاستی اردو اکیڈیمی کے ہاتھوں انجام
۔ جناب عابد علی خان ایڈیٹر سیاست و
تداہی ٹرسٹ نے تفاریحی تقریر کی اور
وکتابوں کو خرید کر پڑھنے کی روایت کو
م بخشنے پر زور دیا۔

● "ادارہ قندِ ادب" کی محفل
مجتبیٰ رؤف ارسلان صاحب کی صدارت
میں منعقد ہوئی۔ روشن صدیقی کی شعری خدمات
پر جناب عبد الکریم ماہر نے مضمون سنایا۔
محفلِ شعر میں کئی شعرا نے نئی رباعیاں پیش
کیں۔

● یوم قومی یکجہتی اور یادِ فخر الدین
علی احمد تقریب کو مخاطب کرتے ہوئے ریاستی
وزیر آبکاری مسٹر پی رنگا ریڈی نے کہا کہ وہ
اردو کے دیرینہ پرستاروں میں سے ایک ہیں
انہوں نے مشاعروں کو اردو کلچر اور ہندوستانی
تہذیب کا سرچشمہ قرار دیتے ہوئے اردو
شعرا کی سماجی قدر و منزلت کو خراج تحسین
ادا کیا۔ تلگو، ہندی اور اردو کے کئی شعراء
نے کلام سنایا جن میں سعید شہیدی، کنول پرشاد
کنول، امیر احمد خسرو، وقار خلیل، صلاح الدین
نیر، خیرات ندیم، ڈاکٹر احسن رضوی، صادق
نقوی، فیض الحسن خیال، علی الدین نوید،
غیاث متین، محمد معین الدین برتری، ڈاکٹر
اسعد انصاری، بیکس الہ آبادی اور
اسمٰعیل ظریف قابلِ ذکر ہیں۔ جناب عارف
الدین سلیم "سب ایڈیٹر" ملاپ" نے نظامت
کے فرائض انجام دیئے۔

۵ ار مئی: انجمن ترقی اردو شہرِ حیدرآباد
کے جلسہ میں تعلیمی اور تدریسی مسائل کا جائزہ
لیا گیا اور چار مینار کے اس حصے میں "اردو
گھر" تعمیر کرنے کے سلسلے میں ایک اسکیم کا
خاکہ بنایا گیا۔ اس جلسہ کی صدارت جناب
منوہر راج سکسینہ (صدر انجمن شہر حیدرآباد)
نے کی۔ مباحث میں مسرز احسن علی مرزا، امجد
باقی (ایڈیٹر "نیا آدم") تجمل اظہر، غلام صادق
الدین، ایس اے سرینواس ریڈی اور ابراہیم جلیل نے
حصہ لیا۔

۱۶ ار مئی: حیدرآباد لٹریری فورم (وصف)
کے زیر اہتمام جلسۂ تعزیت میں حکیم یوسف حسین خاں
کی شعری خدمات کو خراج عقیدت پیش کیا گیا
اور ایک قرارداد کے ذریعہ ریاستی اردو
اکیڈیمی سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ حکیم صاحب
مرحوم کا شعری سرمایہ شائع کرنے کی طرف
توجہ دے۔ مسرز مجتبیٰ حسین، رؤف خلش
حسن فرخ، اور ابراہیم یوسف نے مخاطب کیا
جناب تاج مہجور نے جلسہ کی صدارت کی۔
یوسف اعظمی صاحب نے نظامت کے فرائض
انجام دیئے۔

۷ ار مئی: ادارۂ ادبستانِ دکن کی
مجلس عاملہ کا اجلاس جناب امیر احمد خسرو کی
صدارت میں منعقد ہوا۔ حضرت صفی اورنگ
آبادی کے کلیات کی ترتیب و اشاعت کے
تعلق سے ایک کمیٹی کا قیام عمل میں آیا جس میں
مسرز شمس الدین تاباں، ڈاکٹر غیاث صدیقی،
خیرات ندیم اور غلام محبوب خاں سلم شامل ہیں۔

● بزم اردو اسٹیٹ الیکٹریسٹی بورڈ
کی طرف سے جناب مجتبیٰ حسین کا پُر تپاک خیر مقدم
کیا گیا۔ مسٹر سلیم اے عظیم صدر بزم نے صدارت
کی اور مسٹر میر کمال الدین علی خان معتمد بزم نے
جلسہ کی کارروائی چلائی۔ مجتبیٰ حسین نے
طنز و مزاح پر مشتمل دو مضامین سنا کر
داد حاصل کی۔

۱۹ر مئی۔ ریاستی اُردو اکیڈیمی کے ایک خبرنامہ کے بموجب کتب خانوں کو کتابوں کی امداد کے سلسلے میں حسب قاعدہ درخواستیں بھیجولنے کا اعلان کیا گیا۔

● ہندی لیکھک سنگھ کے ادبی اجلاس میں اُردو کے مشہور رنگارنگ ادیب جناب مجتبیٰ حسین کا پُر تپاک خیر مقدم کیا گیا۔ اس موقع پر مجتبیٰ نے اپنے دو مضامین سنائے اور داد پائی۔ ہندی والوں کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے مجتبیٰ حسین نے بتایا کہ وہ اپنے مضامین ایک ہی نشست میں لکھتے رہے ہیں اور اُردو ہی میں وہ ہندی جرائد کو اپنی تخلیقات بھیجولتے ہیں۔

۲۰ر مئی ادارۂ بیدار کا ایک تعزیتی جلسہ پروفیسر مجید بیدار (پونے کالج) کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جس میں حکیم یوسف حسین خاں کی وفات پر گہرے رنج و الم کا اظہار کیا گیا۔

● عوامی لائبریری قدیم ملک پیٹ کا سالانہ جلسہ ریاستی وزیر حیوانات مسٹر رام دیو کی صدارت میں منعقد ہوا۔ وزیر موصوف نے نئی نسل پر زور دیا کہ وہ مطالعہ کے ذوق کو فروغ دیں اور اُردو اخبارات، رسائل اور کتابیں ماہانہ بجٹ بناکر خریدا کریں۔ موصوف نے کتب خانوں کی افادیت کا ذکر ہوئے انھیں انسانی اقدار کے مقدس مرکز قرار دیا۔

۲۱ر مئی اقلیم ادب کا ماہانہ اجلاس جناب مصلح الدین سعدی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جناب احسن علی مرزا نے "اردو صحافت کی تاریخ" پر سیر حاصل مقالہ سنایا۔ "آج کا شاعر" کے زیر عنوان جناب خیرات ندیم نے اپنا کلام پیش کیا۔ محفل شعر میں شمس الدین تاباں، رحمٰن جامی، محمد مجاز، رؤف خیر، برق یوسفی، سعدی، حسام الدین سلیم، حسن فرخ، روشن خیال، ماہر حیدرآبادی نے کلام سنایا۔ صدر بزم رحمٰن جامی نے ماہر القادری، حکیم یوسف حسین خاں اور یعقوب عثمانی کی وفیات پر قرار داد تعزیت پیش کی۔

● صاحب طرز عثمانین ادیب جناب مرزا ظفر الحسن ایڈیٹر سہ ماہی "غالب" کراچی کی دو تصانیف "عمر گذشتہ کی کتاب (تذکرہ فیض و مخدوم) اور "ذکر ادا آس ہے یار و" کے حیدرآبادی ایڈیشنوں کی رسم اجرا کے سلسلے میں انجمن ترقی اُردو، ادبی ٹرسٹ، اُردو اکیڈیمی ادارۂ سیاست، زندہ دلانِ حیدرآباد ادارۂ پونم اور حسامی بک ڈپو کی طرف سے جلسۂ تہنیت منعقد ہوا۔ جناب فضل الرحمٰن ایڈیٹر اُردو انسائکلو پیڈیا بورڈ نے صدارت کی۔ ڈاکٹر زینت ساجدہ ریڈر شعبہ اُردو عثمانیہ یونیورسٹی، جناب عابد علی خاں ایڈیٹر روزنامہ سیاست ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز، مولوی تصدق حسین تاج اور محترمہ سلیم النساء نے مرزا ظفر الحسن کے طرزِ نگارش، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد، ترقی پسند تحریک، فیض اور مخدوم سے اُن کی رفاقت پر اپنے ا اظہار کیا۔ مرزا صاحب کی جانب سے گلپوشی پ منظور احمد نے منتخد جلد دیئے۔

۲۲ر مئی مرکز مشاعرہ ڈاکٹر اسد اللہ منعقد ہوا۔ (۳۶) غزلیں سنائیں۔

● اُردو تعلیم کے ایک نوجوان انجینئر علی خاں خسرو نے جناب سیاست کی ترغیب پر دو سفر ایران کے موقع کا عطیہ دیا ہے۔

۲۵ر مئی۔ و مشاعرہ جناب علی ا میں منعقد ہوا۔ مسٹر ڈ ان کے مقالے "راج حیات اور کارنامے ڈی کی ڈگری کا مستحق مبارکباد دی گئی اور اور اُردو کے شاعروں سنایا۔ عزیز بھار اُردو سبھا راجہ لال دا

۲۶ر مئی د اُردو کالج کا مقالہ حیات اور ادبی خد

(باقی صـ۹)

ایک عظیم نعمت

آندھرا پردیش میں خشک سالی سے متاثر ہونے والے علاقوں کے لئے "ڈراوٹ پرون ایریا پروگرام" ایک عظیم نعمت کی حیثیت رکھتا ہے۔ فی الوقت یہ پروگرام اضلاع اننت پور۔ چتور۔ کڑپہ۔ کرنول۔ محبوب نگر۔ پرکاشم اور نلگنڈہ میں روبہ عمل لایا جارہا ہے۔

یہاں اس امر کی وضاحت کی جاسکتی ہے کہ اس پروگرام کا مقصد عام طور پر کسی علاقے میں خشک سالی کے حالات کو ختم کرنا ہے اور خاص طور سے برادری کے ان طبقات کی مصیبتوں کو دور کرنا ہے جو راست طور پر خشک سالی کے مضر اثرات کا نشانہ بنتے ہیں۔

حکومت ہند نے ۱۹۷۸ – ۷۹ء کے دوران میں اس پروگرام کے لئے اپنی جانب سے امداد کے طور پر ۸۲۶ لاکھ روپے مختص کرنا ظاہر کیا ہے۔ ریاستی حکومت کی جانب سے بھی اپنے حصے کے طور پر اتنی ہی رقم مہیا کرنے کے بعد ۱۹۷۸ – ۷۹ء کے بجٹ میں اس پروگرام کو پوری قوت کے ساتھ روبہ عمل لانے کے لئے ۱۶۵۲ لاکھ روپے کی خطیر رقم میسر ہو جائے گی۔

بلاشبہ آندھرا پردیش میں خشک سالی سے متاثر ہونے والے علاقوں کے لئے "ڈراوٹ پرون ایریا پروگرام" ایک عظیم نعمت ہے۔

ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ

حکومت آندھرا پردیش۔ حیدرآباد

ترتیب

سن اجراء ۱۹۳۸ء فون: ۳۸۴۴۹

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

ماہنامہ

سب رس
حیدرآباد

نگران:
پروفیسر سید علی اکبر ایم اے کنٹیب
معتمد مجلس مشاورت:
غلام جیلانی
مرتب:
وقار خلیل

جلد: ۴۱ جولائی ۱۹۷۸ء شمارہ (۷)

سالانہ: ۱۵ روپے ششماہی: ۸ روپے
فی شارہ: ایک روپیہ پچاس پیسے
نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان
حیدرآباد
اشاعت: ادارۂ ادبیات اردو ... ۳۰۰۰۴

ابنِ کنول

ذوق کی قصیدہ نگاری

عجیب بات ہے کہ جس شاعر کے جیتے جی کسی نے قدر نہ کی اس کے انتقال کے سو سال بعد اس کو سب سے بڑا شاعر تسلیم کیا گیا ہے اور جس شاعر نے اپنی زندگی میں ہی شہرت کی بلندیوں کو چھو لیا تھا بادشاہوں نے اسے خطابات جیسے نوازا، آج اسے ایک دوسرے درجہ کا شاعر سمجھا جاتا ہے۔ میری مراد غالب اور ذوق سے ہے۔ ان دونوں شاعروں کا تعلق ایک ہی عہد اور ایک ہی مقام سے تھا لیکن ادب میں ان دونوں کا مقام الگ ہے۔ غزل غالب کی سہی لیکن یہ کھلی حقیقت ہے کہ اگر قصیدہ کا ایک پایہ سودا کے کندھے پر ہے تو دوسرا ذوق کے۔ ذوق اردو قصیدے کے آسمان پر درخشاں ستارہ ہیں۔ انیسویں صدی تک کے تقریباً سب ہی شعراء نے چند کو چھوڑ کر ایک دو قصیدے ضرور کہے ہیں لیکن شمالی ہند میں سودا اور ذوق ہی ایسے شاعر ہیں جنہیں قصیدے کا استاد کہا جاتا ہے۔

قصیدہ نگاری کا فن سب سے مشکل فن سمجھا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ قصیدہ گو بہت کم نظر آتے ہیں غالب تو قصیدہ نگاری کو تکمیلِ فن کا آلہ سمجھتے ہیں ان کا کہنا ہے جو قصیدہ نہیں لکھ سکتا اس کو شعراء میں شمار کرنا نہیں چاہیئے اسی بناء پر وہ ذوق کو مکمل اور شاہ نصیر کو ادھورا شاعر جانتے ہیں۔

سودا کے بعد ذوق ہی ایسے شاعر نظر آتے ہیں جنہوں نے قصیدہ نگاری میں خوب خوب کمال دکھایا ہے۔ ذوق نے بہت قصیدے کہے۔ تمام کا موضوع درباری مداحی کے سوا کچھ نہیں۔ انھوں نے اپنا تمام زورِ قلم اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کی مدح گوئی پر ہی صرف کیا ہے۔ ذوق کے تقریباً ۲۰ قصیدے ملتے ہیں بعض قصیدے مخمس، رباعی اور مسدس کی ہیئت میں بھی ہیں۔ ان میں سے ایک دو کے علاوہ تقریباً سبھی قصیدے اکبر شاہ اور بہادر شاہ کی مدح میں ہیں۔ ذوق نے بہت قصیدے لکھے بقول آزاد:۔

"ذوق ہر جشن میں ایک قصیدہ کہتے تھے اور خاص خاص تقریبیں الگ تھیں"

اجزائے قصیدہ میں مطلع کی خاص اہمیت ہوتی ہے چونکہ قاری یا سامع کا سب سے پہلے مطلع سے ہی سابقہ پڑتا ہے اس لئے مطلع کو برجستہ، شگفتہ اور بلند ہونا چاہیئے تاکہ وہ سامع کی توجہ کو اپنی جانب مبذول کرائے۔ ذوق کو مطلع کہنے سے خاص دلچسپی تھی۔ غزل میں انھوں نے بڑے لاجواب مطلع کہے ہیں۔ ذوق کے مطلعوں میں روانی اور صفائی کے ساتھ شعریت، کیف و اثر، لوچ اور نغمگی بھی بدرجہ اتم موجود ہے یہ مطلع دیکھئے عربی فقرے کے استعمال کے باوجود روانی مجروح نہیں ہوتی۔

الٰہی کس بے گناہ کو مارا، سمجھ کے قاتل نے کشتنی ہے ؎ کہ اس کے کوچے میں آج شورِ بأیِّ ذنب قتلتی ہے

مطلع میں سہلِ ممتنع کی کیا اچھی مثال ہے۔

جس جگہ بیٹھے ہیں با دیدۂ نم اُٹھے ہیں ؎ آج کس شخص کا منہ دیکھ کے ہم اُٹھے ہیں

اسی طرح ذوقؔ نے اپنے قصائد کی ابتدا بھی بڑے زوردار مطلعوں سے کی ہے ۔

یوں کرسیٔ زر پر ہے تری جلوہ نمائی ٭ جس طرح کہ مصحف ہو سرِ اصل طلائی
ایک خورشید لقا طرفہ جوانِ نو ارشق ٭ تابِ رخسار خلق سرخیٔ رخسار شفق
ساون میں دیا پھر مہِ شوال دکھائی ٭ برسات میں عید آئی قدح کش کی بن آئی

ذوقؔ کے مطلعوں میں معنی کی جدت، خیال کی ندرت، بیان کی دلکشی، برجستگی اور شگفتگی نمایاں ہے ۔

تشبیب قصیدے کا وہ حصہ ہے جس پر شاعر اپنا تمام تر جوشِ بیان صرف کرنے کی سعی کرتا ہے ۔ اس جزو میں قصید اور قابلیت کے اظہار اور قادرالکلامی کے جوہر دکھانے کا پورا موقع ملتا ہے کیوں کہ اس میں ہر طرح کے موضوعات پر کی ج کو تشبیب کے بیان میں قدرتِ کاملہ حاصل تھی انھوں نے تشبیب میں مختلف النوع مضامین نظم کئے ہیں۔ سوداؔ نے اگر خا تقلید کی تو ذوقؔ نے سوداؔ کی راہ اختیار کی۔ تشبیب میں وہی مضامین جو سوداؔ نظم کر چکے تھے ذوقؔ نے ان پر اپنا رنگ چڑ بعض قصائد میں خوشی کا سراپا کھینچا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی حسینہ کا مجسمہ ان کی نظروں کے سامنے ہے اور اعضاوکے حسن کو تشبیہات کے ذریعے یکے بعد دیگرے بیان کرتے چلے جاتے ہیں ۔

وہ گوش پر زیب کہ کلاہی جو دیکھو بینی تو یا الٰہی ٭ دہن میں غنچہ لبوں میں گلبرگ وہ رخ روشن مہ
نگاہ ساغر کش تماشا بیاض گردن صراحی آسا ٭ وہ گول بازو وہ گوری ساعد وہ پنجہ رنگیں بجو
کمر نزاکت سے لچکی جائے کہ بیچ نزاکت کا بار اٹھائے ٭ اور اس پہ سو نور لہر کھائے پھر اس پہ ہیں دو قمریا

ایک دوسرے قصیدے میں سراپا نگاری میں اس طرح کمال دکھایا ہے ۔

سرو قامت، سمن اندام، گلستان رخسار ٭ ہونٹ گل برگ، دہن غنچہ و بینی رنبق
شکر آمیختہ بادام، مقشر دندان ٭ سیب فردوس زنخداں لب خنداں فستق
نازک ایسی کمر اس کی کہ سمجھنا مشکل ٭ جس طرح شوخ خیالی میں ہوں معنی ادق
ہے گراں اس پہ نزاکت سے نہ باندھو ہرگز ٭ گر ہو تارِ نظر دیدۂ عنقاب منطق

ذوقؔ کی تصویر کشی سوداؔ اور انشاؔ سے مختلف ہے سوداؔ اور انشاؔ سراپا بیان کرنے میں اتنا بہہ جاتے ان کے یہاں آجاتا ہے لیکن ذوقؔ سراپا نگاری میں اس کا لحاظ رکھتے ہیں اور عریانیت کے بیان سے دامن بچائے ر حسن و عشق کے مضامین ان کے مزاج سے مطابقت بھی نہیں رکھتے تھے یہی سبب ہے کہ ان کا پیکر تراشی میں تکلف ہے ۔ ذوقؔ کی دلچسپی اصلاً حکیمانہ خیالات اور اخلاقی نظریات کی جانب تھی ۔ جب وہ اس طرح کے مض تھے تو انھیں ذہن پر زور نہیں لگانا پڑتا بلکہ مضمون خود بخود آتا چلا جاتا تھا ۔ دوسرے موضوعات میں انھیں پیش کردہ تصاویر کی نقل اتارنا پڑتی تھی ۔

اُردو قصائد میں وہ تمام مضامین اپنائے گئے جو فارسی قصیدہ گو شعراء نے نظم کئے تھے ۔ تشبیب میں، کا ذکر ہوتا ہے ان میں موسمِ بہار، وارداتِ حسن، رندی و سرمستی، دنیا کی بے ثباتی، آسمان کا شکوہ، پند و موا

نزہ، علمی اور اخلاقی مضامین وغیرہ شامل ہیں۔ ذوق نے ان سب کو اپنے قصائد میں پیش کیا ہے۔ تشبیب ہی سے اُن کے علم کی وسعت
ہمہ گیری کا اندازہ ہوتا ہے۔ بہادر شاہ ظفر کی مدح میں جو قصیدہ " شب کو میں اپنے سر بستر خواب راحت " کہا ہے اس کی
بیب کو پڑھ کر ذوق کی عالمانہ اور فاضلانہ حیثیت کو بلا شبہ تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ اس تشبیب میں مختلف علوم وفنون کی اصطلاحات
جو مرقع اور کامیاب خاکہ ذوق نے پیش کیا ہے۔ اُردو میں شاید کسی دوسرے شاعر نے پیش نہیں کیا۔ نجوم، طب، منطق،
سفہ، فقہ، تصوف، تفسیر، حدیث، تاریخ اور موسیقی وغیرہ کی اصطلاحات کی کثرت نے علمی فضا تیار کردی ہے۔ ایک سو ستر
عار کے اس قصیدے کے تقریباً ایک سو بیس اشعار تشبیب پر مشتمل ہیں۔ اتنی طویل تشبیب سامعین پر بار گزرتی ہے اور یہ داخلی
یب ہے۔ چونکہ قصیدے کا مقصد مدح کا بیان کرنا ہے اس لئے تشبیب کے اشعار مدح سے کم ہونا چاہئیں۔ انسانی فطرت ہے
جب اسے معلوم ہو کہ فلاں شخص میری تعریف کرنے والا ہے تو ممدوح کو اس بات کا شدت سے انتظار رہتا ہے کہ جلد از جلد
یف کا باب شروع ہو، ذوق نے اپنی علمیت کے اظہار کے سبب اس تقاضے کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ اس تشبیب کے
حصے میں مدح کی طرف بڑھتے ہوئے گریز میں ذوق نے صبح کے منظر کی جو تصویر کھینچی ہے وہ ذوق کی جزئیات نگاری کی
اعلیٰ مثال ہے ؎

بے تک آیا نظر حسن مہ و انجم و چرخ ÷ ہو گیا زرد رُخ شمع و چراغ خلوت
چونکے مرغ سحری عرش سے آوازِ خروس ÷ ہو گئی خواب کو آوازۂ کوس رحلت
دی ہے مسجد میں موذن نے اذاں بہر نماز ÷ باوضو ہو کے نمازی لگے باندھنے نیت
ہوئی بت خانے سے ناقوس کی پیدا آواز ÷ چلے جپنا کو برہمن کوئی لے کر مورت
اُٹھے میخوار صبوحی کے لیے لے کے سبو ÷ کہ عداوت ہے اگر کیجیے ترک عادت
اک طرف سے ہوئی گھڑیال کی آواز بلند ÷ ایک جانب سے لگی آنے صدائے نوبت

ایک قصیدے کی تشبیب میں بزم فلک کا بیان ہے آغاز اس طرح کیا ہے ؎

صبحدم فکر جو تھا سیر فلک کا مشتاق ÷ عرش پر اُڑ گیا اک آن میں مانند براق

اس میں پورے آسمان کی سیر کرائی ہے ستاروں کا بیان کیا ہے جب تک سننے والا ستاروں کے نام اور ان کے وصف
واقف نہیں ہوگا وہ تشبیب سے لطف حاصل نہیں کرسکتا۔ ایک اور تشبیب میں مختلف علوم کے بیان کے ساتھ شاعری کی
لاحات کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ فخریہ مضامین فارسی اور اُردو میں بہت نظم کئے گئے ہیں شاعر اپنے کلام کی تعریف کرتا ہے
نے بھی ایک تشبیب میں اپنی شاعری کی تعریف کی ہے ؎

خضر نصیب کا گر دنیا میں رہبری ہو ÷ اور شاہ راہِ دل پہ چشم ہنروری ہو
منظور ہر نظر میں تب شکل آئینہ ہوں ÷ روشن قلم سے میرے تاج سکندری ہو
تارہ کی طرح چمکے ذرہ مرے سخن کا ÷ اور نام میرا روشن جوں مہر و مشتری ہو
ہیں دستِ معانی اور سیاں سخن ہے ÷ دیتا جو شوقِ قسمت دل کو تونگری ہو

ذوق کے قصائد کی تشبیب کو سمجھنے کے لئے منطق و فلسفہ، حدیث و فقہ، طب و حکمت، نجوم و ہیئت، صرف و نحو اور دوسرے علوم کی اصطلاحات سے واقفیت ضروری ہے بصورت دیگر ان کی تشبیبیں سننے والے کے لئے بے اثر ہیں۔ ذوق نے وہ تمام مضامین تشبیب میں نظم کر دیئے ہیں جن پر قدما طبع آزمائی کر چکے تھے۔ انھوں نے تشبیب کو قصیدے کا جزوِ خاص سمجھ کر برتا ہے اپنی علمیت اور فضل و کمال کو محفوظ رکھنے کی خاطر وہ شعریت کو بھی کھو دیتے ہیں کچھ قصیدے ذوق نے بغیر تشبیب کے بھی کہے ہیں۔

تشبیب کے بعد وہ گرہ آتی ہے جو تشبیب اور مدح میں تعلق پیدا کرتی ہے۔ ان دونوں بے جوڑ موتیوں کو ایک لڑی میں پروتی ہے۔ گریز کی یہ خوبی ہے کہ اس گرہ کا احساس سننے والے کو نہ ہو تشبیب اور مدح کا یہ جوڑ بھدا نہ معلوم ہو ایسا لگے جیسے بات میں بات نکل آئے۔ ذوق کے یہاں یہ خوبی موجود ہے وہ اس طرح تشبیب کو بیان کرتے کرتے مدح کی طرف مڑ جاتے ہیں کہ احساس نہیں ہوتا کہ شاعر نے راہ تبدیل کر دی۔ ذوق کے اکثر قصائد میں گریز مکالماتی انداز میں ہے مثلاً ؎

یہ کہہ رہا تھا میں جو یکبار عقل بولی ∴ وہ بات کہہ کہ جس میں میری بھی دلبری ہو
تجھ کو خبر نہیں کیا ہے دورِ شاہ اکبر ∴ رفعت سے پست جس کی شانِ سکندری ہو

ایک اور قصیدے میں خوبی کا سراپا کھینچنے کے بعد بہ زبانِ خوشی گریز کرتے ہیں ؎

جو نام پوچھا کہا خوشی ہوں جو وصف پوچھا تو دلبری ہوں ∴ سبب جو پوچھا تو ہنس کے بولا کہ ذوق تو بھی عجیب ہے ناداں
وہ شاہ جم ہے محمد اکبر جہاں میں رشکِ جم و سکندر ∴ جلوسِ جشن اس کا ہے فلک پر اسی کے پرتو میں سب یہ ساماں

بہادر شاہ ظفر کی مدح میں جو قصیدہ ہے اس میں "نوید بہجت" شاعر کو مخاطب کرتی ہے ؎

آج وہ دن ہے کہ آغوش میں لے کر تجھ کو ∴ کہے طوبیٰ لک ہر شاہدِ طوبیٰ قامت
اب ہیں بیدار ترے بخت مددگار نصیب ∴ اب قوی ہیں ترے طالع تری یاور قسمت
فکر کر تہنیتِ عید کا اس شاہ کے تو ∴ در میں جس کے ہے ہر صبح صباحِ دولت

ذوق گریز کو صرف دو تین اشعار ہی میں ختم کر دیتے ہیں گریز کا مختصر ہونا بھی اس کی خوبی ہے بعض گریزوں میں ایک ہی انداز اپنانے کے سبب مصرعے اس طرح ٹکرا گئے ہیں۔

کون وہ یعنی شہنشاہ محمد اکبر ∴ دستِ بخشش سے خجل جس کے ہے بحرِ آفاق

ایک دوسرے قصیدے میں ہے ؎

کون وہ یعنی محمد شاہ اکبر دیں پناہ ∴ نیک صورت نیک سیرت طالع نیک نام

ایک اور قصیدے میں ہے ؎

وہ کون یعنی اکبر ثانی کہ جس نے وا ∴ تیرے بھی کامِ دل سے ہے کی با بیا گرہ

شاہ محمد اکبر ہی کی مدح میں ایک اور قصیدہ ہے ؎

کون وہ ظلِ خدا شاہ محمد اکبر ∴ جس کے ہاتھ سے ہوں دریوزہ گر اربابِ ہمم

گریزوں میں ذوق نے کوئی خاص جدت پیدا نہیں کی، سبھی قصائد میں کچھ کو چھوڑ ایک ہی انداز اختیار کیا ہے۔

میں ذکر کرتے ہیں اور پھر ایکدم چونک کر مدح شروع کر دیتے ہیں بقول ڈاکٹر محمود الہٰی ان کی گریزیں پامال اور فرسودہ سہی لیکن اتنا ضرور ہے کہ ان کے یہاں بہترین گریزوں کے نمونے بھی مل جاتے ہیں۔ ایک قصیدے کی تشبیب میں زمانے کی ستم ظریفی اور فلک کے ظلم کا ذکر کرتے ہیں پھر بڑے لطیف انداز میں گریز شروع کر دیتے ہیں :-

مگر تعدّی ایام کیوں کروں اے چرخ ÷ نہیں رہا تری گردش سے کچھ مجھے سروکار
لے آیا آج مقدر اس آستاں پہ مجھے ÷ کہ سجدہ کرتے ہیں جھک جھک کے جس پہ لیل و نہار

قصیدے کا بنیادی مقصد مدح کا بیان کرنا ہے ممدوحین کی مناسبت سے مدح بھی دو طرح کی ہوتی ہے ایک امراء و سلاطین کی مدح، دوسری بزرگانِ دین کی، ذوق نے بزرگانِ دین کی شان میں کوئی قصیدہ نہیں کہا۔ ان کے تقریباً تمام قصائد بادشاہ وقت کی مدح میں ہیں۔ اہلِ دول کی مدح میں جو قصیدے کہے جاتے ہیں۔ ان میں عموماً چار اوصاف کا ذکر کیا جاتا ہے۔ عدالت، سخاوت شجاعت اور عفت۔ باقی تمام جزئیات ان ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔ ذوق کے قصائد میں ان چاروں کا ذکر ہے۔ مدح کا جو سانچہ فارسی میں یا ذوق سے قبل تیار ہو چکا تھا اسی سے ذوق بھی مدح کے نمونے ڈھالتے رہے، جب کہ اگر تاریخ کی روشنی میں دیکھا جائے تو مغلوں کا وہ جاہ و جلال ختم ہو چکا تھا جو اکبر کی تلوار اور اورنگ زیب کی رکاب میں تھا انیسویں صدی کے مغل بادشاہ صرف نام کے شہنشاہ تھے ان کی حکومت پوری دلی میں بھی نہ تھی۔ اُن کے بازوؤں میں وہ قوت نہیں تھی جو ان کے اجداد میں تھی، ذوق کے ممدوح مغل سلطنت کے آخری ٹمٹماتے چراغ تھے جن کے بارے میں کہا نہیں جا سکتا تھا کہ ایک ہوا کا جھونکا کب انہیں بجھا دے گا ان سب باتوں کو ذہن میں رکھا جائے تو ذوق کی مدح صرف مبالغہ ہی لگتی ہے لیکن یہ سب کچھ ہونے کے باوجود یہ بات بھی صحیح ہے کہ مغلوں کے نام سے عظمت وابستہ تھی ایسی حالت میں بھی برطانوی حکمراں ان سے خائف تھے۔ ذوق نے ان کی مدح اسی طرح کی ہے جس طرح ایک شہنشاہ کو زیب دیتی ہے انھوں نے ان تمام روایتی معیاروں اور علامتوں کو جو فارسی قصیدہ گویوں نے سلاطین و امراء کے لئے متعین کئے تھے، مدنظر رکھا ہے

سلاطین کی مدح میں جن چار کلیات پر تمام جزئیات کا پھیلاؤ ہوتا ہے ذوق بالترتیب ہر قصیدے میں ان چاروں کا ذکر کرتے ہیں مثلاً محمد شاہ اکبر کی مدح میں ایک قصیدہ ہے :-

تری عدالت میں ہے یہ قدغن کتاب کو دیکھے نہ ماہ روشن ÷ دگرنہ ہالہ ہو طوق گردن کہ ہو دلی میں بہت پشیماں

اس شعر میں عدالت کا بیان تھا سخاوت کا ذکر اس طرح کیا ہے :-

تری سخاوت کو سن کے عالم امنڈ پڑا ہے عالم ÷ عرب سے آیا ہے چل کے حاتم بلب سوال و بدست داماں

شجاعت کے بیان میں بادشاہ کی تلوار، خنجر، ہاتھی اور گھوڑے کا تذکرہ کیا ہے۔

شجاعت کا بیان قریب قریب تمام قصائد میں یکساں ہے صرف الفاظ کا فرق ہے کوئی بھی قصیدہ نام بدل کر کسی بھی ممدوح کے سامنے پیش کیا جا سکتا ہے اپنے ممدوح اوّل اکبر شاہ کے جاہ و جلال کو ایک قصیدے میں یوں بیان کیا ہے۔

دیکھا ہے جس ابرو آئینہ جبیں میں ÷ کیوں کر نہ تن میں اس کے ہیبت سے تھرتھری ہو
کیا تاب ہے فلک کی جنبش کرے جگہ سے ÷ گر بہر پائے بندی ایما سرسری ہو

یہ آستان دولت ہے سجدہ گاہ عالم ؛ دل کو تری عقیدت اورنگ سروری ہو
دارا کو تیرے در تک ہو کس طرح رسائی ؛ دربان جو تیرے در کا کرتا سکندری ہو
دکھلاتے آ یارب جب تیغ شعلہ دم کی ؛ شیروں کے دل میں ٹھنڈا خون دلاوری ہو

بہادر شاہ ظفر کی شجاعت اور بہادری ملاحظہ ہو۔

روشن شیشہ ہر اک سنگ ہو ریزہ ریزہ ؛ پڑے البرز پہ گر گرز کی تیرے ضربت
سر کشف دار چھپا۔ ہے فلک زیر سپر ؛ کیا غضب ہے تری شمشیر غضب کی ہیبت
اٹھے طوفاں جو ترے قہر کی طغیانی پر ؛ کشتئ نوح بھی اعدا کو ہو گرداب صفت

ذوقؔ نے مدح میں ممدوحین کی سخاوت و شجاعت و عدالت کا بیان بڑے شان دار انداز میں کیا ہے کہ اس سے زیادہ بہادر اور عادل روئے زمین پر دوسرا نہیں۔ اس میں مبالغہ سے ضرور کام لیا گیا ہے لیکن قصیدے کا ایک جزو مبالغہ بھی ہے! مبالغہ کے بغیر مدح میں وہ شدت پیدا ہی نہیں ہوگی جسے شاعر پیش کرنا چاہتا ہے اور سننے والا سننا چاہتا ہے۔ ذوقؔ نے تلمیحات و تشبیہات و استعارات کی مدد سے اور بھی شدت میں اضافہ کیا ہے۔ بہادر شاہ کے ہاتھی کی تعریف بڑے اچھے انداز میں کی ہے:۔

کیا ترے فیل کے اوصاف لکھوں میں کہ وہ ہے ؛ ابر رفتار، جبل پیکر، گردوں رفعت
اس کی خرطوم ہے گر طرۂ لیلیٰ کی مثال ؛ تو ہیں دندان صفا ساعد سلمیٰ کی صفت

اپنی بات کو تشبیہی پیرائے میں کہہ کر عجب حسن پیدا کر دیا ہے ہاتھی کے دندان کو ساعد سلمیٰ کی تشبیہ نے خیالی پر پیدا کر دی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ذخیرۂ الفاظ کے ساتھ ساتھ ذوقؔ کے ذہن میں تشبیہات کا بھی خوبصورت خزانہ موجود تھا۔ گھوڑے کی تعریف میں لکھتے ہیں:

تن میں اس طرح سے ہے اس کے بھرا کی شوخی ؛ قفس تن میں ہو جیسے طائر جان عشاق
ماہ زیر زمیں لوٹ کے ہو جائے کباب ؛ جا پڑے گر سُم نعل سے اپنے چقماق
یوں اڑے موشۂ فلک جیسے بتفریح شام ؛ بوئے گل جائے تنفس میں دم استنشاق

ذوقؔ کی مدحیات میں تخیل اور تمثیلی انداز نکھر نمایاں ہے۔ مبالغے کے زور شور کے ساتھ ایک خاص رکھ رکھاؤ کے سبب میں سنجیدہ مزاج کی شان پیدا ہو گئی ہے۔ ذوقؔ نے بادشاہ کی صفات طرح کا ذکر کیا ہے تو اس کے ساتھ عالمانہ [illegible] بنگاہ فضائل کی مدح سرائی بھی کی ہے ذوقؔ دیندار آدمی تھے یہی سبب ہے کہ وہ اپنے ممدوح کی دینداری کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ بعض قصائد میں ممدوح کی صورت و سیرت کا بیان بھی ہے۔

کچھ قصیدے شادی کے موقع پر لکھے گئے ان میں برات کی دھوم دھام، جلوس، دولہا کا بیان شاعرانہ اسلوب اور ڈھنگ سے کیا ہے ایسے قصائد میں حقیقی تصویر کشی کی گئی ہے۔

مدح کے بعد شاعر بڑے خوبصورت انداز میں ممدوح کو اپنے مطلب کی طرف متوجہ کرتا ہے یہاں شاعر کو کافی ہوشیار

پڑتا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ حسن طلب مدح سے بنائی ہوئی فضا کو مجروح کر دے۔ ذوق نے صرف ایک آدھ ہی قصیدے میں حسن طلب کے اشعار کہے ہیں ورنہ وہ مدح کے فوراً بعد دعا پر آ جاتے ہیں البتہ درمیان میں کہیں نہ کہیں شاہ کی سخاوت کا ذکر کر کے یا کسی اور ڈھنگ سے اس طرح کے اشعار شامل کر دیتے ہیں جس سے حسن طلب کا مقصد پورا ہو جاتا ہے ایک قصیدے میں حسن طلب کا اظہار یوں کیا ہے :-

شاہا یہ تیرا ذوق ہے امیدوار لطف ÷ جو حال پر نگاہ اس آشفتہ حال کے
تا جلد اس کا کوکب طالع پہ عروج ÷ آ جائے سمت اوج پہ گھر سے وبال کے
کر دے بہار نام سے اپنے اسے نہال ÷ جھونکوں میں آ گیا ہے سموم ملال کے

مخمس کی ہیئت میں ایک قصیدہ ہے جس میں حسن طلب کے اشعار ہیں :-

جس پر عنایت ہو تری اس کو نہیں پروائے زر ÷ جس کا حامی تو ہو کیوں اس کی شکستہ ہو کمر
اللہ نے تجھ کو کیا بے چارگاں کا چارہ گر ÷ اے خسرو والا گہر تیرے تلطف کی نظر
ہے مفلسوں کو کیمیا ٹوٹے دلوں کا مومیا

دعا پر ذوق نے خاص زور دیا ہے قصیدے کے حسن میں مقطع یا خاتمہ کا بھی حصہ ہوتا ہے۔ اسی لئے ذوق نے نئے نئے انداز سے خاتمہ کرنے کی سعی کی ہے اکثر اشعار میں دعا کئی کئی اشعار پر مشتمل ہے بعض قصیدوں میں خاتمہ اس طرح کرتے ہیں کہ اب قلم میں طاقت نہیں کہ تیری مدح کر سکے اس لئے ختم کرتا ہوں :-

تیرا جو وصف خجستہ شاہا لکھے قلم کو کہاں ہے طاقت ÷ ثنا دعا پر ہے ختم کرتا جو ذوق تیرا تہنیت خواں
کہ رہے تجھ کو خوشی ہو افزوں عدو ہوں سرنگوں و محزوں ÷ یہ جشن ہو فرخ و ہمایوں بصد فر و شوکت و شاں

دوستوں کو دعا اور دشمنوں کو بد دعا دینے والا انداز بھی موجود ہے :-

تہنیت کو ہے دعا پہ ذوق کرتا مختصر ÷ ہو مبارک تجھ کو یا عیش و طرب عید صیام
جو کہ ہیں بدخواہ وہ ناشاد اور غمگیں رہیں ÷ اور ہوا خواہوں کے دل ہوویں ہمیشہ شادکام

ذوق کی دعاؤں میں بزرگانہ انداز نظر آتا ہے ان کی مدح میں جا بجا جذبۂ دل کارفرما نہ ہو صرف پرواز تخیل ہو لیکن ان کی دعاؤں میں خلوص اور شفقت کا احساس ہوتا ہے۔

عید ہر سال مبارک ہو تجھے عالم میں ÷ با شکوہ و حشم و جاہ و بعمر و صحت
خیر خواہوں کے ترے چہرے پہ ہو رنگ نشاط ÷ اور بدخواہوں کے رخسار پہ اشک حسرت

قصیدے میں زبان کی بہت اہمیت ہے قصیدے کی زبان شاندار اور لہجہ پُرشکوہ ہوتا ہے الفاظ کی شان و شوکت، بندشوں کی بلند آہنگی جوش و جزالت اس کا معیار ہیں اس کے علاوہ صنعتوں کا استعمال، تشبیہوں اور استعاروں کی فراوانی اور لازمی ہیں ان کو اپنانا قصیدہ گو کا کمال ہے۔ ذوق اس میدان میں پورے اترتے ہیں اور بعض جگہ قدما سے بھی آگے بڑھ جاتے ہیں۔
قصیدے کی زبان کا تعلق دقت پسندی سے ہے۔ قصیدے کی دکان کو بڑے بڑے الفاظ سے سجایا جاتا ہے لیکن یہ سجانے والے پر منحصر ہے

کہ وہ انہیں کتنا اچھا سجاتا ہے۔ ذوقؔ لفظوں کو سجانے پر قدرت رکھتے تھے۔ ایک قصیدے کے اشعار ملاحظہ ہوں۔ الفاظ کی نشست نے ایک عجب جھنکار سی پیدا کر رکھا ہے ؎

صبح سعادت، نور ارادت، تن بریاضت، دل بہ تمنا ٭ جلوۂ قدرت، عالم وحدت، چشم بصیرت، محو تماشا
قصر رفیع، صحن وسیع، طرز مسجع، سطح مربع ٭ باغ ارم یا روضۂ رضواں، خلد بریں یا جنت ماویٰ

اس طرح کی مثال کے لئے پورے پورے قصیدے پیش کئے جا سکتے ہیں لفظوں کی تکرار ایسا حسن پیدا کر دیتی ہے جو کانوں کو بھلا معلوم ہوتا ہے ذوقؔ زبان کے بڑے ماہر تھے لفظوں سے کھیلنا ان کے لئے بازیچۂ اطفال تھا لفظی صنعت گری میں کھو کر وہ یہ بھول جاتے تھے کہ ان کے کلام کی شعریت مجروح ہو رہی ہے ذوقؔ کے یہاں تکلف اور تصنع کے ساتھ صفائی اور سادگی پر بھی زور دیا گیا ہے ہندی کے الفاظ بھی بڑی خوبصورتی سے استعمال کئے ہیں۔ صنائع بدائع کا استعمال بھی کثرت سے ہوا ہے۔ حسن تعلیل مراۃ النظیر، تلمیح، لف ونشر وغیرہ کی اچھی مثالیں نظر آتی ہیں۔ لف ونشر مرتب کی ایک مثال ملاحظہ ہو:۔

حاتم دوراں، منذر نعماں، رستم دستاں، ضیغم نیستاں ٭ تو بہ سخاوت، تو بہ عنایت، تو دم جرأت، تو سر ہیجا

نادر تشبیہوں اور استعاروں کو ذوقؔ نے بڑے فنکارانہ ڈھنگ سے نظم کیا ہے بادشاہ کو گھوڑے پر سوار ہونے کیلئے اسطرح تشبیہ دی ہے:۔

تو اس پہ بر سر زیں جوں رحل پر ادب سے ٭ ام الکتاب لیکر جبرئیلؑ نے دھری ہو۔

ہاتھی کیلئے کہا ہے ؎ پیل تیرا گل سوسن کا بڑا ہے انبار ٭ گل مہتاب کے گلدستہ ہیں اس کے دندان
اس کی خرطوم کسی دلبر لیلیٰ وش کی ٭ جو رہ شکیں ہے کہ کاکل عنبر افشاں

سراپا نگاری میں خاص طور سے ذوقؔ نے تشبیہات کا استعمال کیا ہے ایک آدھ جگہ متبذل تشبیہیں بھی آگئی ہیں ؎

ہر بوچے پہ یہ جوبن ہے کہ جیسے کوئی شوخ ٭ اپنے ابھرے ہوئے پستاں پہ چڑھا دے محرم

لیکن اس طرح کے اشعار بہت کم ہی نظر آتے ہیں۔

ذوقؔ نے قصیدے کے پُر جلال لہجہ کو پیش نظر رکھ کر الفاظ کا انتخاب کیا ہے بعض قصائد میں قافیوں کی تلاش کی تعریف کرنی پڑتی ہے بعض میں لمبی ردیفیں استعمال کی ہیں۔ مختصر یہ کہ ذوقؔ کے قصیدوں میں جو رنگین بیانی، شکوہ الفاظ، قوت الفاظ کے کرشمے اور استادانہ فنکاری ہے وہ ذوقؔ کے بعد کسی دوسرے قصیدہ گو شاعر کو نصیب نہیں ہو سکی۔

مولانا محمد حسین آزاد کے اس اقتباس پر مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

"کلام کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مضامین کے تارے آسمان سے اتارے ہیں۔ مگر اپنے لفظوں کی ترکیب سے انہیں ایسی شان وشکوہ کی کرسیوں پر بٹھایا ہے کہ پہلے سے بھی اونچے نظر آتے ہیں انہیں قادر الکلام کے دربار سے ملک سخن پر حکومت مل گئی ہے کہ ہر قسم کے خیال کو جس رنگ میں چاہتے ہیں کہہ جاتے ہیں کبھی تشبیہ کے رنگ سے سجا کر استعارہ کا جوبن بناتے ہیں کبھی سادہ لباس میں جلوہ دکھاتے ہیں۔"

قندِ مکرر

پروفیسر سید شبیر علی کاظمی

اُردو کے مختلف نام

اُردو زبان کا ارتقاء اور اس کی عہد بہ عہد ترقی کو سمجھنے کے لئے اس کے مختلف ناموں سے واقفیت ضروری ہے کیونکہ دراصل یہ نام اس کی راہ ترقی کے سنگ میل ہیں۔ لسانی دریافت ہماری زبان کے ڈانڈے آریوں کی آمد اور اس عہد کی زبان سے ملا دیتی ہے۔ سنسکرت سے پراکرت کی تشکیل ہوئی لیکن عوام کے دلوں پر اس کی حکمرانی صدیوں تک قائم رہی۔ آگے چل کر جب سنسکرت دیو بانی بن بیٹھی تو مقامی زبانیں اور بولیاں اپنے اپنے علاقوں میں من مانے طور پھولنے پھلنے لگیں۔ پنڈتوں نے اپنی مقدس زبان پر پہرے بٹھا کر اسے عوام سے دور رکھا مگر خود ان کو روزانہ کی زندگی میں پراکرت سے منہ لگانے بغیر نہ بن پڑا۔ شمالی ہندوستان میں مختلف بولیاں اپنی اپنی صورتوں میں پروان چڑھ رہی تھیں، مسلمانوں کی آمد کے بعد ان کی لائی ہوئی زبان کی چھاپ مقامی زبانوں پر کس طرح پڑی، اب یہ بتانا ذرا مشکل ہے۔ مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مغربی ہندی وہ زبان تھی جس نے مسلمانوں کی زبان کو اپنانے میں نہایت فراخ دلی سے کام لیا۔ بالآخر مقامی زبانوں کی ایک ہونہار بیٹی زمانے کے گرم و سرد سہتی اردو کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کو اپنے ارتقاء کے لئے یہاں وہاں نت نئے چولے بدلنے اور طرح طرح کے روپ دھارنے پڑے مگر ہر رنگ گزشتہ سے چوکھا رہا اور اب نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ وہ جدید زبانوں میں اپنا سر اونچا کر کے کسی جھجک کے بغیر بات کر سکتی ہے۔

قبل اس کے کہ اردو کے مختلف نام گنائے جائیں۔ ایک بات کے حسب و نسب کے متعلق بھی عرض کر دوں جو اس کے نجیب الطرفین ہونے کا بیّن ثبوت ہے۔ زبانیں عموماً مادری کہلاتی ہیں مگر اس زبان کو پدری کہلانے کا بھی شرف حاصل ہے۔ منشی اقبال ورما سحر بحوالہ اپنے استاد مولوی ضیاء احمد صاحب فرماتے ہیں "ہماری مادری زبان ہندی ہے، ہمارے ملک کا نام ہند یا ہندوستان ہے کیونکہ ہم اس نام سے عرب و فارس اور مصر میں یاد کئے جاتے تھے۔ شاہی دربار سے تعلق رکھنے والوں میں ایک پدری زبان مستعمل ہونے لگی جس کو اُردو نام بعد کو دیا گیا۔ کنہیا لال کپور نے اپنے افسانے "برج بانو" میں اسی خیال کے حامی نظر آتے ہیں۔ اس درباری تعلق کی بناء پر اس کو "شاہی زبان" بھی کہا گیا ہے۔ مگر ہندی کے اکثر ادیبوں کا خیال ہے کہ اردو کا دراصل حکومت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اُردو تو دربار کے ایرانی تورانی امیروں سے متعلق تھی اب اُردو کے نام سنئے۔ ہندی، ہندوی، بھاکا، بھاشا، یعنی جگ کی بھاشا، مسلمانی بولی، ترکوں کی زبان، ناگری، کھڑی بولی، زبانِ اورنگ آبادی، زبان گجراتی، دکھنی زبان، ریختہ (ریختی) زبان ہندوستانی، زبان دہلوی، زبان پنجابی، ہندوستانی، زبان معلّٰی، اُردو، ہندوستانی، انڈین ورناکیولر، اُردو ــــ

ان ناموں میں کچھ ایسے ہیں جو لفظ سے ہند سے ماخوذ ہیں۔ جو خود لفظ "سندھ" کی مفرس صورت ہے۔ مگر یہی لفظ یونان پہنچ کر "انڈ" ہو جاتا ہے۔ شمالی ہندوستان میں عوام کی زبان ہمیشہ ہندی رہی ہے، خواہ وہ مشرقی ہندی ہو یا مغربی ہندی۔ مسلمان بادشاہوں نے اس میں شاعری کی سرپرستی کی اور اس کے ادیبوں کو نوازا ہے۔ مثل عہد تغلق ہندی کا عہدِ جدید کہلاتا ہے مسلمانوں کی زبانیں عربی، فارسی اور

تر کی تھیں۔ لہذا انھوں نے ہمیشہ مقامی زبان کو ہند کی مناسبت سے ہندی کہا۔ لیکن جہاں پرانی ہندی اور نوزائیدہ اردو زبان مع منظور ہوتا تھا تو ہندی محض کو زبان اہل ہنود کہتے تھے۔ اس لفظ کی اشاعت میں علاقائی عصبیت بھی کارفرما رہی ہے صوبوں او کے نام سے زبان کو پکارنا دلی پیر ہتک کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ اس ذہنیت کا ایک ادنیٰ کرشمہ یہ رہا ہے کہ پورے ہندوستان کو یوپی میں محدود کر دیا جاتا تھا۔ پنجاب، بنگال اور دکن کے رہنے والے آج تک یوپی کے باشندوں کو ہندوستانی اور ان کی زبان کو کہتے ہیں۔

اُردو ہندی کے قضیے سے پہلے ہندی کا لفظ اُردو کے لئے ضرور مستعمل ہوتا تھا۔ ہندی ادیبوں کے خیال سے ہندی اور اُردو عالمگیر ثانی کے عہد سے شروع ہوتا ہے۔ ہندی کے فاضل جناب چندر بلی پانڈے فرماتے ہیں۔ "عالمگیر ثانی کے زمانے میں سب سے خراب کام جو ہوا وہ لوک بھاشا اور لوک بانی وہشکار تھا۔ عالمگیر کی نیتی نے ہندو مسلم جھگڑوں کو پیدا کیا تو فقیر عالمگیر ثانی سے ہندی اردو سوال پیدا ہوا۔ اورنگ زیب نے مسلم مت کی تو عزیز الدین نے اُردو رچنا کی کوشش"

مسلمان ادیبوں نے اُردو کے لئے ہندی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ حکیم یوسفی اپنے قصیدہ در لغات ہندی میں جو دسویں صدی ہجری ہے۔ فرماتے ہیں "نام ہر چیزے بہ ہندی بشنواز من اے پسر" مولانا قطب الدین دہلوی کی اُردو کتاب احکام العیدین جو نول کشور لکھنؤ میں چھپی ہے، اس کے دیباچے کی عبارت میں لکھا ہے: "اگرچہ یہ شرح زبان ہندی میں اہل علم جس کی طرف التفات نہیں کی گئی ہے" دکن میں بھی اُردو کو ہندی کہا گیا۔ ملا محمد کاظم اورنگ زیب کے متعلق عالمگیر نامے میں لکھتے ہیں "بہ جمع از اہل ہند کہ نمی دانند یا نیکو نمی توانند گفت بہ ضرورت بہ لغت ہندی زبان می کشایند" مولانا باقر سنہ ۱۸۰۵ء میں اپنے ایک رسالے کی زبان کہتے ہیں (تو ہندی زبان یہ رسالہ ہوا)۔

اورنگ زیب کے متعلق یہ مشہور رہے کہ وہ ہندی زبان میں بات چیت کرتا تھا۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ وہ ہندی زبان سے بخوبی واقف تھا لیکن اس کی ہندی یقیناً فارسی آمیز تھی۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مخلوط و مشترک زبان جو آہستہ آہستہ اذیت کی طرف گامزن ہندی کہلاتی تھی۔ اور فارسی داں طبقہ اس کو منہ لگانا کسر شان سمجھتا تھا۔ دیوناگری رسم الخط کی ہندی اپنی بالکل جدا حیثیت حاتم اپنے "دیوان زادہ" مرتبہ ۱۷۸۵ء میں لکھتے ہیں "میں نے تحریر کے لئے وہ زبان اختیار کی ہے جو ہندوستان کے تمام صوبوں میں مستعمل ہے یعنی جس کو بھاکا بھی کہتے ہیں کیونکہ عوام اس کو سمجھتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ خواص میں بھی مقبول ہے۔ یہاں بھاکا اور ہندی استعمال ہوئے ہیں اور یہ حقیقت بھی ہے کہ بھاکا اس زبان کے لئے مستعمل تھا جس کا تعلق سنسکرت سے کم ہوتا تھا۔ بھاشا سے بھاکا سے تبدیل کیا گیا جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اصل بھاشا ہے "ٹھیٹ بھاکا" میں بھی یقیناً تبدیلیاں کی گئیں۔ بھاشا در اصل ہندی زبان کو کہتے ہیں اور اسی وجہ سے اُردو شاعری کی زبان کو بھی "بھاشا" کہا گیا ہے جہاں تک حاتم کے "دیوان زادہ" کا تعلق ہے، یہ کہ ادب میں سب سے پہلی بغاوت تھی جس کے علم بردار گلشن اور شاہ حاتم تھے۔

امیر مینائی اپنے ایک شاگرد کو لکھتے ہیں "میاں اصل میں بھاکا ہے، ہندی میں "کھا" اور "شا" کا بدلہ ہوتا ہے۔ اُردو میں زبان پر اکثر بھاکا اور کمتر بھاشا مستعمل ہے" میر غلام علی آزاد کا خیال ہے کہ "بھاکا کی نثر اچھی نہیں ہوتی"۔ اکبر الہ آبادی فرماتے ہیں

ہماری اصطلاحوں سے زباں نا آشنا ہو گی
لغات مغربی بازار کی بھاکا سے ضم ہوں گے

اصل یہ ہے کہ "بھاکا" بولنے والے مسلمان ہندی محض کو گنوارو زبان تصور کرتے تھے اور یہ وہ زبان تھی جس

کی تہذیب کا اثر نہیں پڑا تھا۔

کرنل ٹاڈ نے اپنی تاریخ راجستھان میں لکھا ہے: اس وقت ملک بھر کی زبان بھاشا تھی۔ راجپوتانہ میں بھی یہی بولی جاتی تھی۔ گھروں میں بھی، بازاروں میں بھی، سرکاروں میں بھی اور درباروں میں بھی اس کا رواج تھا، رنواسوں میں جہاں تک مسلمانوں کی ہندو رانیوں اور محلاتِ شاہی کی راجپوت نژاد بیگمات کا تعلق ہے بھاشا ہر طرف چھائی ہوئی تھی جو سنسکرت الفاظ کی آمیزش سے خالی تھی۔ اس کے متعلق پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی نے اپنے لیکچر موسوم "ناگزیر قیل و قال" میں بہ صراحت تحریر فرمایا ہے: بڑے اور اونچے خاندانوں میں جو زبان تھی وہ اور بھی آسان تھی بے تکلف ذرا سی کوشش سے سمجھ میں آجاتی ہے" موصوف نے اس کی نظیر میں ایک خط جنوری ۱۱۹۲ء کا تحریر شدہ نقل کیا ہے۔ سال مذکور میں سلطان محمد شاہ غوری اور مہاراجا پرتھی راج میں تراین کے مقام پر آخری فیصلہ کن جنگ ہوئی۔ پرتھوی راج کا داماد یعنی پرتھا بائی کا شوہر، چتوڑ کا راول سمر سنگھ بھی اس میں شریک تھا وہ بھی کام آیا۔ رانی پرتھا نے ستی ہونے سے پہلے اپنے بیٹے کو یہ خط لکھ کر چتوڑ بھیجا تھا۔ "سری حضور سمر (جنگ) میں مارے گئے اور ان سنگ رشی کیش بھی دے کنٹھ کو سدھارے، رشی کیش جگان اچار لوگوں میں سے ہیں جو دلی سے مرے سنگ دہیز میں آئے تھے، اس لئے ان کی خاطر رکھنا ہے۔ دونے (اور) باپجے جیاری گراں (چاکری کراں) کی منشاء کی خاطر راکھو۔"

خواجہ عشرت لکھنوی کی تحقیق یہ ہے کہ برج بھاشا یعنی بھاکا جو کسی وقت عام زبان ہند تھی اور جس میں عربی، فارسی الفاظ کثرت سے شامل تھے اسی سبب سے مقدس پنڈتوں نے اس زبان یعنی بھاکا کو "ملیچھ زبان" کا لقب دیا تھا۔ "امرائے ہنود" و "دولت مغلیہ" میں لکھا ہے کہ ہندو مدتوں تک مسلمانوں کی زبان کو ملیچھ بھاشا سمجھ کر نفرت کرتے تھے۔ صحت اس کی یہ ہے کہ اس وقت شمالی ہندوستان میں عام طور سے دو زبانیں مستعمل تھیں۔ ایک جس میں سنسکرت کا ترجمہ ہوتا تھا یا شاعری کی زبان تھی، بھاشا کہلاتی تھی اور دوسری زبان جو فاتح اور مفتوح کے درمیان تبادلۂ خیالات کا ذریعہ بنی ہوئی تھی ہندی یا ہندوی کہلاتی تھی اور یہ نام مسلمانوں کا ہی دیا ہوا تھا۔ ملک محمد جائسی کا ایک شعر ہے

ترکی عربی ہندوی بھاشا جیتی آہی جا میں مارگ پریم کا سبھی سراہیں تاہی

ان اقوال کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بھاشا اور بھاکا میں مرزوی امتیاز تھا لیکن "بھاشا" "بھاکا" اور "ہندی" نو زائیدہ زبان کے لئے بھی مستعمل تھے۔ بےجا نہ ہوگا اگر ہم یہاں کچھ برج بھاشا اور کھڑی بولی کے متعلق عرض کر دیں۔ برج بھاشا سے مراد ہے وہ زبان جو برج کے علاقے میں بولی جاتی تھی۔ برج کا علاقہ دراصل میرٹھ اور متھرا کے آس پاس کا تھا لیکن اس علاقے کی زبان یعنی برج بھاشا اس وقت آگرہ، متھرا، گوالیار، بھرت پور، گڑگاؤں، بلند شہر، علی گڑھ، ایٹہ، مین پوری، بدایوں، بریلی، مرادآباد اور پرگنہ نینی تال وغیرہ میں بولی جاتی تھی۔ یعنی شمالی اور درمیانی دوآب علاقے کی بھی زبان تھی۔ شیرانی صاحب کا خیال ہے کہ مسلمانی عہد میں اس زبان میں موسیقی اور شعر کا بہت رواج رہا ہے۔ ابتداءً اس زبان کو محض مقامی حیثیت حاصل تھی۔ لیکن نویں صدی ہجری کے نصف دوم میں موسیقی کی بنا پر اس زبان نے ادبی امتیاز حاصل کر لیا۔ اس سلسلے میں راجہ مان سنگھ گوالیار کا نام ہمیشہ یاد رہے گا۔ راجہ مان سنگھ کے تعلق سے یہ زبان گوالیاری کہلانے لگی اور ایک زمانے تک اس میں راگ راگنیوں کا ایجاد ہوتی رہی۔ دربار شاہی میں بھی موسیقی کے ذریعہ اس کی رسائی تھی چونکہ ہندو مسلم دونوں اس میں حصہ لے رہے ہیں اس لئے یہ وہی مشترک زبان ہے جو آگے چل کر اردو کہلائی۔

مسلمانوں کی آمد سے بہت قبل ہندوستانی پراکرتوں کا نادر قریب قریب ختم ہو چکا تھا۔ مسلمان اپنی آمد پر ہندی یا ہندوی زبان کو مختلف صورتوں میں دیکھتے ہیں اور یہ اختلاف علاقائی پراکرتوں کی وجہ سے تھا۔ سب سے پرانی پراکرت کا نام "آرشا" تھا کیونکہ ہیم چندر نے اپنی کتاب "پراکرت شبد انوشاسن" میں اس کو رشیوں کی زبان بتایا ہے۔

اس کا دوسرا نام "رشٹا بھاشا" بھی ہے۔ عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اردش بھاشا بھی ویدک زبان کے ساتھ ساتھ وجود میں آئی لیکن جوں جوں زمانہ آگے بڑھتا گیا۔ بہت سی علاقائی پراکرتیں وجود میں آتی گئیں۔ ایک زمانے کے بعد ایک نئی بولی زبان وجود میں آئی جو اردھ ماگدھی کیونکہ اس میں شورسینی اور ماگدھی کی آمیزش تھی اور اب یہ مہاراشٹری کی جانشین بن بیٹھی۔ مہاراشٹری بھی مخلوط پراکرتوں کا نتیجہ تھی پراکرت تیلی کہا جاتا تھا۔ اب آگے چل کر اس پراکرت کی جگہ بھاشا نے لی جس کے متعلق گزشتہ صفحات میں بحث ہو چکی ہے۔ مسلمانوں کو لغتِ زبانوں کے اختلاف سے ایک گونہ دشواری ہوتی ہوگی اور ان کو فیصلہ کرنا پڑا ہوگا کہ وہ کس بولی کو اپنی ضروریات کے لئے منتخب کریں لہذا ان بولیوں میں سے اس بولی کو منتخب کیا جو ان میں سب سے زیادہ بہتر اور صاف تھی اور اس کا نام ریختہ رکھا۔ کچھ عرصے بعد ہندوؤں نے ہندی کی اس جدید شاخ کو ناگری کہا۔ ناگری سے مراد نگر یعنی شہر کی بولی ہے۔ یہ بات بھی نہ بھولنی چاہیئے کہ مخلوط پراکرتوں کے سبب جو اردھ ماگدھی کہلاتی تھی۔ اس کو بھی ناگر کہتے تھے کیونکہ وہ بھی قصبات اور شہروں میں بولی جاتی تھی، اسی کو ناگری کھڑی بولی بھی کہا، یا کھڑی، ہندی زبان میں صاف اور پاک کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور اس کا تلفظ دونوں طرح صحیح ہے لہذا کھری یا کھڑی بولی سے مراد مخلوط زبان ہے جو آہستہ آہستہ اور ہیئت کی طرف گامزن تھی۔ آگے چل کر ریختہ، کھڑی بولی یا کھری بولی اور ناگری ہم معنی الفاظ ہو گئے، ہندوستان کے لوگوں کے ذریعۂ اظہار کے لئے بھی زبان مخصوص ہو گئی۔ کھڑی بولی کا علاقہ مراد آباد، رام پور، بجنور اور سہارن پور کا علاقہ آج کل بھی مراد آباد اور اس کے قریب و جوار کی زبان صرف اور نحو کے اعتبار سے کتابی اردو ہے اور یہ برج بھاشا کی ترقی یافتہ صورت جانشین بھی ہے اور اسی پر اردو کی بنیاد ہے۔

ریختہ عام طور پر شعر کی زبان کو کہتے تھے۔ گو اس لفظ سے ایک ذم کا پہلو بھی نکلتا ہے کیونکہ درباری زبان سے اس نوخیز بولی کا رنہ تھا۔ فارسی کا اس کو منہ لگانا کسرِ شان تھا۔ ریختہ زبان کے علاوہ ایک بحر کا نام بھی ہے جس میں کبیر نے طبع آزمائی کی ہے۔ اس کو ریختہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں طرح طرح کے الفاظ اور رنگ برنگ کی ترکیبیں موجود ہیں۔ فیلن صاحب کا خیال ہے کہ ریختہ "مردوں کی زبان" ہندوانی نام اندرا ویدی ناگری تھا کیونکہ یہ گنگا و جمنا کے دوآب میں بولی جاتی تھی۔ ہندو اس کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال نہیں کرتے تھے، دونوں اس کو بولتے تھے۔ مسلمانوں کی حکومت کے استحکام اور ہندوؤں کی فارسی دانی کی وجہ سے روز بروز فارسی عربی کے الفاظ بڑھتے گئے تو یہ بھی فارسی رسم الخط میں لکھا جانے لگا۔ اردو کا موجودہ رسم الخط پنڈت تک کا شمیری پنڈتوں کی ایجاد ہے۔ اہلِ کشمیر فارسی ادب سے خاص لگاؤ رکھتے تھے کے عہد میں انھوں نے اسلامی تہذیب کو اس طور سے اپنا لیا تھا کہ آج تک ان کی زبان و لباس اور رہن سہن اس گزشتہ تعلق کا آئینہ دار ہے۔

"اہلِ خطہ اپنے آپ کو اہلِ زبان کہتے ہیں۔"

میر امن کے پیرو تو یہاں تک کہتے ہیں کہ ریختہ نام ایرانی شاعروں نے شاہ جہاں کے عہد میں اس علاقائی زبان کو دیا تھا۔ لیکن اسے مغلیہ دور سے پہلے کی ہے ریختہ سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ لیکن امیر خسرو نے اسے خود ہندی یا ہندوی کہا۔ کبیر خسرو کے بعد ۱۳۲۵ء خسرو سے ۱۲۰ سال بعد اور انھوں نے ریختہ میں شاعری کی ہے

سوانگ تو ساہو کا کام ہے جو رکا　　کپٹ کی چھوٹ میں بہت دھاوے
بات بہت کہے جھوٹ جھوٹ سے نہیں　　ٹکہ لے کچھ کھا کھانڈ کھاوے

کبیر کے بعد نانک ۱۴۶۹ء میں پیدا ہوئے اور انھوں نے اسی زبان میں شاعری کی ہے جو ریختہ یا کھڑی بولی سے مشابہ اس میں پنجابی زبان کی آمیزش ضرور ہے جیسے

یا سعادت رنگیلا سپنا کہیں دیکھا کہیں نہیں دکھایا
سوچ بچار کرے مت من میں جس نے ڈھونڈھا اسی نے پایا

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مغربی ہندی کی ترقی یافتہ شاخ ریختہ کہلاتی تھی۔ ممکن ہے یہ نام فارسی شعراء نے بھی رکھا ہو لیکن یہ بات ہرگز عقل معذور کی نہیں۔ اغلب یہ ہے کہ سکندر لودھی کے عہد میں ایسا ہوا جب کہ کائستھوں نے فارسی زبان کا پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ مسلمان ریختہ کو فارسی رسم خط میں لکھتے اور ہندو ناگری رسم خط استعمال کرتے تھے۔ مولانا باقر آگاہ کا خیال ہے کہ جب سے ہندی میں عربی فارسی کا میل ہوا تب ہی سے اس کا نام ریختہ ہوا اور شعر کی زبان کے لئے مخصوص ہو گیا کیونکہ مسلمان فارسی داں ہوتے لیکن مطالبہ وقت کے تحت یا خوش گپی کے لئے فارسی ہندی ملا کر شعر کہتے اور اس مخلوط زبان کو ریختہ کہتے تھے:

اب یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ دہلی جو شاہی پایۂ تخت تھا وہاں دو جماعتیں تھیں۔ ایک تو وہ جماعت جس کے شاعر و ادیب نو وارد ایرانی تورانی تھے اور دوسری جماعت میں وہ ہندوستانی نوجوان شامل تھے جن کے باپ دادا تو ایرانی تورانی تھے لیکن وہ اب خود ہندوستانی تھے۔ جہاں تک زبان کا تعلق ہے ایرانی ہمیشہ ہندوستان والوں کو بہ نظر تحقیر دیکھتے تھے جس کے نتیجے کے طور پر ہندوستان میں بھی وطن پرستی کا زور ہوا۔ ہندی کا ایرانی کا جھگڑا عام ہوا ایرانی تورانی شاعروں اور فارسی گویوں کے توڑ پر دلی کے ریختہ گویوں نے مجلس مراختہ کی بنا ڈالی اور اب یہ عقدہ رفتہ رفتہ نثر کی زبان کے لئے بھی مستعمل ہونے لگا۔ ادھر ایک نیا گل کھلا۔ ہندی فضا میں دستور رہا ایران سے بالکل مختلف ہے۔ ریختہ والوں نے اپنے ایرانی مذاق کو خیر باد نہیں کہا بلکہ زبان کی تانیث کر ڈالی یعنی ریختہ سے ریختی بھی پیدا ہو گئی۔

ہندی ادب کی تاریخ میں کھڑی بولی کے تذکرے میں لکھا ہے کہ اپ بھرنش بھاشاؤں میں صرف ایک کا ذکر کیا جائے گا۔ پہلے یہ زبان میرٹھ سے آگے نہیں تھی مگر مسلمان فاتح اس کو ہندوستان کے کونے کونے میں لے گئے اور اس کو اپنا کر ملک بھر میں پھیلا دیا۔

ہندی محققوں کا خیال ہے کہ کھڑی بولی کے سب سے پہلے شاعر امیر خسرو ہیں اور عام طور پر یہی اردو کے بھی پہلے شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ مگر حالیہ دریافت نے اسے غلط ثابت کر دیا ہے۔ البتہ اس سے انکار نہیں کہ کھڑی بولی اور امیر خسرو کی زبان میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ یعنی کھڑی بولی اور اردو دونوں ایک ہیں۔ امیر خسرو نے سب سے پہلے فارسی بحور کو ہندی میں داخل کیا اور اردو شاعری نے آگے چل کر انھیں بحروں کو استعمال کیا۔ لیکن ہندی میں صرف لاونی بحر لکھنے والوں نے ان کا اتباع کیا اور یہ لاونی دراصل ہندی کے ناٹک چھند (بحر) کا دوسرا نام ہے۔ ریختہ کھڑی بولی خاندانے ہمیشہ فارسی بحر کو استعمال کرتے کیونکہ کھڑی بولی میں ہندی بحر کا نبھنا مشکل ہے۔ بھراچین اور نوین کاویہ دھارا کے مصنف سورج بلی سنگھ لکھتے ہیں "بیت اور دوہی کے استعمال پر کھڑی اپنا پورا دعوے کر چکا تھی۔ ادھر پنڈت چندر دھر گلیری کی تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ "کھڑی بولی یا پکی بولی یا ریختہ بعد کی ابتدائی نظم و نثر کو دیکھ کر جان پڑتا ہے کہ اردو رچنا میں فارسی اور عربی تت سموں کو نکال کر سنسکرت تت سموں کو رکھنے سے ہندی بنائی گئی ہے"

دکن کی نسبت سے زبان اور نگ آبادی کہلائی۔ دکنی اور اورنگ آبادی زبان میں بہت فرق ہے۔ قطب شاہی خاندان نے دکنی کو مکمل زبان ہونے کی سند عطا کر دی۔ اس زبان پر مقامی اثرات نمایاں ہیں۔ مغلوں کی آمد سے قبل گجرات اور دکن میں اردو شاعری شروع ہو چکی تھی۔ شیرانی صاحب کا خیال ہے کہ "تیمور کے زمانے میں ہندو مسلم ربط ضبط اور روزمرہ مراسم نے جنوبی ہند میں بھی ایک زبان کی بنیاد ڈالی جسے آج دکنی کے لفظ سے یاد کرتے ہیں" دکنی سعدی شیرازی کا دکنی شاعر مثنوی خاور نامہ میں لکھتا ہے: "کیا ترجمہ دکنی ہوا دل پذیر"

مصنف "پنجاب میں اردو" تحریر فرماتے ہیں کہ "آل غزنیہ کی حکومت ہندوستان میں کم و بیش ایک سو ستر سال رہی اور اس عرصے میں ہندو مسلم قوم کا یکجا ملنے سے ایک نئی زبان کا پیدا ہو جانا لازمی بات ہے کیونکہ اس حکومت کا پورے پنجاب پر تسلط تھا اور اس لئے "وہ کہلانے سے پنجابی

بھی کہا :

امیر خسرو اپنی مثنوی "نہ سپہر" میں اُردو کو زبان دہلوی کہتے ہیں۔ خوب محمد گجراتی نے ۱۵۷۰ء میں اردو کو گجری بولی لکھا ہے اُن کا مصرع من بولی گجراتی" وجہی نے اس کو سب رس کے دیباچے میں "زبان ہندوستان" کہا ہے۔

کچھ غیر معروف نام بھی ملتے ہیں۔ ہاشمی صاحب تحریر فرماتے ہیں "پہلے شمالی ہند کے بعض آثار پر نظر کیجئے جن کا زمانہ دکن کی شاہیوں سے انقلاب کی تباہی اور تلاش و تحقیق کی کوتاہی کے باوجود ہمیں اس نئی مخلوط زبان کے دور دور تک نشان ملتے ہیں۔ آج بھی اقصائے مشرق و جنوبی جی کا بھاشا، مسلمانی بولی یا ترکوں کی "کہنے والے مل جائیں گے"۔ یہ نام دراصل سلاطین مغلیہ سے پہلے کا زبان کی یادگار ہیں۔ جسے بنائے سے تھے اور ممالک ہند کے بعید ترین گوشوں میں لے جا رہے تھے۔ فرہنگ شرف نامہ منیری سے اس چیز پر کافی روشنی پڑتی ہے فاضل ابراہیم قوام فاروقی نے تالیف کیا اور کئی قدیم ماخذوں کے علاوہ ہم عصر بنگالی ادیبوں سے مدد لی۔ انھیں زبان دانوں بنگالہ امیر فخر الدین کا نام شامل ہے۔

اس زبان کو زبان مور بھی کہا گیا۔ کرنل یول کے قول کے مطابق ۱۸۳۰ء میں شاہی فوج کے افسران اور مدراس کے دیگر اس نام کو استعمال کرتے تھے اور بہار میں تو یہ نام ۱۸۹۲ء تک مستعمل تھا۔ فوجی افسران اس کو سیاہ زبان بھی کہتے تھے۔

روسی اسی زبان کو اردا کہتے ہیں گو یہ لفظ ایشیائی زبانوں اور باشندوں کے لئے حقارتاً استعمال کیا جاتا ہے۔ قبل اس کے ماخذ اور اس کی وجہ تسمیہ پر بحث کی جائے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ لفظ ہندوستانی کا کچھ تذکرہ ہو جائے کیونکہ یہ لفظ مرادف استعمال ہوتا ہے عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ یہ نام فورٹ ولیم کالج کا عطیہ ہے اور آج تک انگریز اور دوسرے غیر کا اس مشترکہ زبان کو ہندوستانی ہی کہتے ہیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اس مخلوط زبان کو مغل بادشاہوں ہی کے زمانے میں ہندوستانی ملا عبد الحمید لاہوری "بادشاہ نامہ" میں لکھتے ہیں "بیشتر بہ فارسی در کمال فصاحت و بلاغت تکلم می فرمایند و بعضے کہ فارسی۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پادریوں اور دوسرے یورپین لوگوں کے استعمال سے یہ لفظ عام ہوا۔ میر امن "باغ و بہار" کے د "اب خداوند نعمت جان گلکرسٹ نے فرمایا کہ اس قصے کو ٹھیٹھ ہندوستانی میں جو اردو کے لوگ بولتے ہیں ترجمہ کرو" اس سے میر امن کے دور تک ہندوستانی اور اردو میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور تھا۔ بول چال کی زبان جو عوام میں رائج تھی ہندوستانی تھی او زبان تھی جو فارسی داں طبقہ تحریری مقاصد کے لئے استعمال کرتا تھا۔

بہر صورت لفظ "ہندوستانی" میر امن نے اپنے خداوند سے سیکھا۔ ڈاکٹر ڈنکن فاربس نے باغ و بہار کے متعلق اپنا لکھا ہے کہ "باغ و بہار ہندوستانی زبان میں تفریح کی ایک کتاب ہے جس کو میر امن نے تصنیف کیا ہے" انسائیکلو پیڈیا تحریر ہے کہ انگریزوں نے ابتدائی آریائی زبان کو جو شمالی ہند کے دوآب میں بولی جاتی تھی ہندوستانی کے نام سے یاد کیا نے اپنے تیسرے خطبے بابت ۵ ستمبر ۱۸۵۲ء میں فرماتے ہیں "لفظ ہندوستانی اس زبان کے حق میں جس کے لئے یہ استعمال کیا۔ البتہ اس کو ہندوستانین (HINDUSTANIAN) کہا جا سکتا ہے۔ ہندوستانی اہل ہندوستان کی زبان حقیقی سرحد سے باہر بھی بولی جاتی تھی۔ خصوصاً مسلمان اور سپاہی اس کو تمام جزیرہ نمائے ہندوستان، ایران، تبت اور تھے۔ پس اس زبان کے لئے لفظ ہندی یا انڈین جو ابتداً اس کو دیا گیا تھا اور جس نام سے اکثر باشندے اب تک ا[illegible] یورپ نے اختیار کیا ہے"

لفظ ہندوستانی ہندی اردو کے جھگڑے کو ختم کرنے کے لئے بھی استعمال کیا گیا ۱۹۳۹ء میں علیگڑھ یونیورسٹی کی اردو ہفتہ کی ایک کارروائی میں اردو کے بجائے اس زبان کو ہندوستانی تجویز کیا گیا تھا جو کثرت رائے سے منظور ہوا تھا۔ یوپی میں ہندوستانی اکیڈمی کا قیام اور اسی طرح کی دوسری اور کوششیں بھی عمل میں آئی تھیں۔

ہندوستان کے ہر صوبے میں اپنی ہر دل عزیزی سے بتدریج تمام اختیار کرتی ہوئی ہماری زبان دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہی تھی۔ میر امن کا خیال ہے کہ جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تو تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم قدردانی اور فیض رسانی اس خاندان لاثانی کی سن کر حضور میں آکر جمع ہوئی۔ لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدی جدی تھی۔ اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین سودا سلف سوال جواب کرنے سے اور ایک زبان اردو کی مقرر ہوئی۔ یہاں تک کہ شاہجہانی دور آپہنچا۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ " اردوئے شاہی اور دربار میں ملے جلے الفاظ بولتے تھے وہاں کی بولی کا نام اردو ہو گیا۔ سر سید احمد خاں کا خیال ہے کہ " جب شاہجہاں بادشاہ ہوا اور شاہجہاں آباد آباد کیا اسی وقت شہر میں تمام ملکوں کے لوگوں کا مجمع ہوا۔ یہ لوگ جب معاملہ کرنے ناچار ایک لفظ اپنی زبان کا دو لفظ اس کی زبان کے تین لفظ دوسروں کی زبان کے ملا کر بولتے اور سودا سلف لیتے، رفتہ رفتہ اس نے ایسی ترکیب پائی کہ یہ خود بخود ایک زبان بن گئی " سیماب اکبرآبادی اپنے خطبات شاعری میں لکھتے ہیں " عہد جلال الدین محمد اکبر میں جو مردانہ اور زنانہ بازار قلعہ آگرہ میں لگتا تھا اسے اردو کہتے تھے۔ جہانگیر کے عہد میں یہ بازار آباد تھا۔ وہاں لین دین بدستور اسی زبان میں ہوتا تھا۔ شاہجہاں نے اسے اور رونق دی "

لفظ اردو دیگر فقہ اللغت کے اعتبار سے جانچا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ التائی زبان کا ہے اور ترکی پر اکرات میں مختلف صورتوں میں ملتا ہے مثلاً اوردو " اردو " اور آرت وغیرہ۔ اور یہ خیمہ " قیام گاہ " حویلی " چھاؤنی " فوجی افسر کی قیام گاہ وغیرہ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے یہ تاتاری خان کی لشکر گاہ کے لئے بھی مستعمل ہوا ہے اور اس سے انگریزی کا لفظ (HORDE) بھی ماخوذ ہے۔ والگا کے کنارے والا گولڈن ہورڈ کوئی تاتاری قبیلہ نہ تھا " بلکہ اس سے مراد شاہی کیمپ کا ایک خاص انداز و طرز تھا جس نے بعد کو بالطبع کے شاہی محلات کی صورت اختیار کر لی۔ ہندوستان میں مغلوں کی آمد پر بابر کے زمانے کے لفظ اردو کا استعمال شروع ہوا۔ بابر ۱۵۲۶ء میں ہند کا بادشاہ ہوا۔ " بابر نامہ " میں دلی و آگرہ کی فتح پر اس نے اپنی فوج کو " اردوئے نصرت شعار " لکھا ہے۔ لغات کبریٰ اور اقبال نامہ جہانگیری میں بھی لفظ اردو بہ معنی شاہی خودگاہ کے مستعمل ہے۔ مغلوں کے سکوں پر بھی ٹکسال کے لئے " اردوئے ظفر قرین " لکھا ہوا ملتا ہے۔ جہانگیر کے سکے پر یہ عبارت ہے ؎

بر اردو سکہ زد در راہ دکن شاہ بحر و بر شہنشاہ زماں شاہ جہانگیر ابن شاہ اکبر

اور کچھ سکوں پر " دار الضرب اردو در راہ دکن " بھی ملتا ہے علاء الدین جوینی نے تاریخ جہاں کشا میں اور رشید الدین فضل اللہ نے جامع التواریخ میں چنگیز خاں اور اس کی اولاد کی قیام گاہ اور چھاؤنی کو اردو لکھا ہے۔ اور کبھی کبھی لفظ اردو دار السلطنت کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔

ترکستان اور تاشقند میں اردو ابھی لشکر شاہی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے یہ لفظ بابر کے ہمراہ ہندوستان پہنچا اور دہلی کے شاہی محلات اردو کہلائے۔ پشاور کی سرحد پر ابھی تک فوجی کیمپ کو اردو کہتے ہیں۔ گارساں دتاسی کا خیال ہے کہ لشکر شاہی اور اردوئے معلیٰ دو لفظوں کی ترکیب سے ایک لفظ بنا پیدا ہو گیا اور اس نسبت سے اس کو زبان اردو کہنے لگے۔ کثرت استعمال سے زبان کا لفظ محذوف ہو گیا اور اسے صرف اردو کہا جانے لگا پنڈت دتاتریہ کیفی اردو کی وجہ تسمیہ اس طرح بیان کرتے ہیں۔ " اردو کے معنی جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے لشکر اور بہت حقارت سے کہا جاتا ہے کہ اردو لشکری بولی ہے لشکر جس میں یہ بولی بولی جاتی تھی جا ہو کے آدمیوں پر مشتمل تھا۔ ہندا نہ یہ پہلے مانسوں کی بولی اور نہ دیسی بولی ہے۔ یہ ایک دیسی چیز ہے۔ لفظ اردو میں الف، ر، د، و اصل حروف ہیں اور یہی تینوں حروف الف کی مختلف حرکتوں کے ساتھ اور لفظوں میں بھی آتے ہیں جیسے آردی بہشت، آرغلی، اردبل، اردشیر

ہوتا۔ لفظاً اُردو کے معنی ہیں مثل یا مانند۔ وائو نسبتی جڑھانے سے اردو بنا، معنی ہوئے مماثل اجزاء سے بنا ہوئی چیز اور یہ نام
کہ یہ جو فارسی اور پراکرت دو آرین زبانوں کے میل سے بنی، بہت مناسب ہے۔ اردو کا لفظ بطور زبان مصحفی نے
استعمال کیا ہے۔ لیکن شیرانی صاحب کا قول ہے کہ خان صاحب یعنی خان آرزو غالباً پہلے شخص ہیں جو اردو کا لفظ بہ معنی زبان استعمال کرتے

مختصر یہ کہ اردو اپنے ابتدائی دور میں مختلف ناموں سے معروف رہی اور بالآخر اب اردو اس زبان کا نام ہے جو پورے ہند
میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ ہندوستان میں کسی زمانے میں ہندی یا ایرانی تفریق تھا اس کی جگہ ہندی اردو جھگڑے نے لی۔ پاکستان میں بھی
بنی اور ابھی تک بنی ہوئی ہے۔ اس کی ترقی و راس اس کی مخالفت میں پوشیدہ ہے۔ یہ آکاش بیل کی خاصیت رکھتی ہے۔ یہ تمام جھگڑے
اور معاشی تھے۔ ورنہ اردو کے حروف تہجی کی ابتدائی ترتیب سے لے کر اس وقت تک ہندو مسلم اور انگریز تینوں قوموں نے اس کی مساوی
اس طرح اس کو مختلف زبانوں سے سنوارا ہے۔ فطرت لین دین کے تحت یہ زبان پھولتی پھلتی رہی اور اس کی ترویج و اشاعت میں کسی حکم یا پالیسی
مگر ہندوستان میں اس کی بدقسمتی نے اسے ذات پات کے چکر میں ڈال دیا۔ اس کی بہن ہندی دیو بانی جانشین ہو کر آکاش بانی بن بیٹھی۔
کا بھنڈا دماغ دے کر جلا وطن کر دیا گیا ہے۔ کل تک یہی رام کی دلاری تھی اور سب کی آنکھوں کا تارا تھی مگر کیکئی کی طرف دار اردو کا بن آئی ا
کو دیس نکالا مل گیا۔ یہ بن باس کے دن ہیں اس کے بعد رام کی لیلا کیا ہو گی۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس کا فیصلہ وقت کرے گا البتہ یہ اپنی
تنہائی میں تنہا کر گایا جاتا ہے۔ وہ پکار پکار کر کہہ رہی ہے۔

نیا ہے لیجئے جب نام میرا بہت وسعت ہے میری داستاں میں

(سہ ماہی "الکوثر" کراچی)

بقیہ "سرسید کی اُردو خدمات" صفحہ ۲۸ سے آگے۔

طرز بیان اختیار کرنے کی کوشش کی جو خود سرسید کا تھا چونکہ یہ سلسلہ عرصۂ دراز تک قائم رہا لہٰذا ایک ذخیرہ
عام فہم اُردو زبان کا تیار ہو گیا۔ رفتہ رفتہ لوگ اسی رنگ میں لکھنے کے عادی ہو گئے۔ چنانچہ اس کے بعد ہر انشاء پرداز
کی حتیٰ کہ ان کے مخالفین بھی سرسید کی فیض پذیری سے انکار نہیں کر سکے اور سرسید کے اثرات اس دور کی تمام ادبی فضاء
اور ہیئت ہر لحاظ سے وہ اس زمانے کے اعلام ملنے جلتے ہیں۔ آج جو اُردو کا رنگ روپ ہے وہ سرسید کی دین ہے۔
کہ انھوں نے ایسا رنگ پیدا کیا جو موسم کے مطابق تھا۔ انھوں نے انشا پردازی کو ترقی دینے کے لئے بہت سے اعلیٰ درجے
کو اُردو زبان کا قالب پہنایا۔ مثال کے طور پر "اُمید کی خوشی" ایک انگریزی مضمون سے ماخوذ ہے۔ انگریزی خیالات
کے ساتھ یوں ادا کیا گیا ہے کہ وہ ترجمہ نہیں طبع زاد مضمون معلوم ہوتا ہے۔ سرسید کی افکار پردازی کا ایک
علمی اصطلاحات، علمی الفاظ، علمی تلمیحات سے ہماری زبان کو مشکل سے مشکل مسائل کو واضح اور دل آویز انداز
فلسفہ کے ادق مسائل کو اُردو میں بخوبی اور دلکش طرز پر ادا کیا۔

سرسید احمد خاں کی تحریروں میں جا بجا ظرافت اور شوخی بھی ملتی ہے لیکن نہایت تہذیب اور لطافت
تہذیب اور اخلاق کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ سرسید پیشہ ور ادیبوں اور انشاء پردازوں سے بہت
[illegible] خشک فلسفیانہ مباحث میں وہ اپنے طرز بیان

امیر احمد خسرو

مجھ پہ کس واسطے میخانے کا در بند ہوا
میں کوئی بندۂ حق، کوئی پیمبر تو نہ تھا

دل کے دروازے پہ پھر درد نے دستک دی ہے
ہے پتہ وقت کو شاید مری تنہائی کا

ہم فقط خواب نہیں خواب کی تعبیر بھی ہیں
کاش تم نے ہمیں دیکھا نہیں سمجھا ہوتا

میرے افسانے کو یارب کوئی عنواں تو ملے!
بھیڑ میں لفظوں کی میں کب سے کھڑا ہوں تنہا

پھر مرے دل میں سمٹ آئے ہیں غم دنیا کے
پھر مرے دل کو رشتوں کا سا انداز ملا

ہم سدا کرتے رہے اس کی پرستش خسرو
وہ سدا اپنی اداؤں کا پرستار رہا!

صلاح الدین نیر

زیاد بن کے جانا ہے کس کس کے گھر مجھے
تم نے نہیں تو کس نے کیا در بہ در مجھے

میری نگاہ جلوہ طلب ہے تو کیا کروں
تم نے ہی خود کیا ہے شریک نظر مجھے

تیرے بغیر شہر تمنا اداس ہے
لگتا ہے اجنبی سا خود اپنا بھی گھر مجھے

شاید تری تلاش کا مقصد تمام ہو
اے زندگی! تو دیکھ تو لے اک نظر مجھے

حالانکہ چھین گئی مری آنکھوں سے روشنی
دنیا سمجھ رہی ہے ابھی دیدہ ور مجھے

تنقید روشنی پہ اس اہل نظر کی ہے
جس نے عطا کیا ہے شعور نظر مجھے

نیر، یہ شخص لگتا ہے مجھ سے بھی معتبر
رسوائی لے کے آئی بھی تو کس کے گھر مجھے

کشمکش

صادقہ فرید

ایک لمحے کی آرزو لے کر
کتنی صدیاں گذار آیا ہوں

کتنی صدیوں کا بن گیا ایندھن
کتنی صدیوں سے جل رہا ہوں میں
کتنی صدیوں سے آگ پی پی کر
جب بھی بھڑکا ہوں روشنی دی ہے
کتنی صدیوں سے دار پہ چڑھ کر
حق کی آواز کو جلا دی ہے

آج بھی وقت نے پکارا ہے
کوئی عیسیٰ صفت کو پیش کرو
کوئی موسیٰ کی شان سے آئے
کوئی ایسا ہو جس کی قربانی
وقت کے بے کراں اندھیرے میں
شمع حق کا جواز بن جائے

آج پھر کشمکش کا عالم ہے
اک طرف تو ہے پیار کی دنیا
اک طرف ظلم کے اندھیرے ہیں
اک طرف تیری بزم عیش و نشاط
اک طرف دار کے تقاضے ہیں

جانے کس سمت مجھ کو جانا ہے
رہبر وقت پھر پکار مجھے

لئیق صلاح

فیضِ جاری

میر شمس الدین فیضؔ اپنی منظوم لغت "فیضِ جاری" میں اس طریقے پر کاربند ہیں کہ ہر شعر میں کسی لفظ کے عربی، فارسی اور ہندی مترادفات بیان کئے جائیں۔ دوسرے لغات میں اس طریقے پر عمل کیا جاتا ہے کہ کسی ایک زبان کے الفاظ دے کر معنی دوسری زبانوں کے ہم معنی الفاظ کے ساتھ لکھے جاتے ہیں جس سے یہ فائدہ ہوتا ہے اس زبان کو جاننے والے بآسانی دوسری زبان کے الفاظ کا مفہوم سمجھ لیتے ہیں۔ "اشرف باری"، اور "واحد باری" کے مصنفین نے ہر لفظ کا مترادف صرف ایک ہی زبان میں تحریر کیا ہے۔ اس کے برخلاف فیضؔ نے محض ایک زبان کے لفظ ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بیک وقت تین زبانوں کے الفاظ کے ذریعے اس خاص لفظ کے مفہوم کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ فیضؔ کو ان چاروں زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ ان کی اسی علمیت، ہمہ دانی اور مختلف زبانوں سے واقفیت کی محمد حبیب الرحمٰن سابق آنریری مجسٹریٹ برہان پور نے دل کھول کر داد دی ہے۔ وہ فیضؔ کو "علوم عربیہ وفارسیہ" میں "یکتائے عصر" تسلیم کرتے ہیں۔ ڈاکٹر زورؔ "تذکرۂ مخطوطات" (ادارۂ ادبیاتِ اردو) میں رقم طراز ہیں کہ "فیضِ جاری" عربی، فارسی اور اردو الفاظ پر مشتمل ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس میں ہندی الفاظ کے مفہوم کی بھی بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ وضاحت کی گئی ہے۔

"فیضِ جاری" فیضؔ کی ایک منظوم تصنیف ہے جو "خالق باری" اور "واحد باری" کی طرز پر لکھی گئی ہے۔ "مرقع سخن[1]" "تذکرہ شعرائے دکن[2]" اور "داستان ادب حیدرآباد[3]" میں فیضؔ کی اس تصنیف کا ذکر موجود ہے۔ اس کے دو مخطوطے راقمۃ الحروف کو دستیاب ہوئے ہیں۔ ایک نسخہ ادارہ ادبیاتِ اردو کا مخزونہ[4] ہے اور دوسرا ادارۂ تحقیقات علوم مشرقی میں موجود ہے[5]۔ ان نسخوں کو الف اور ب سے موسوم کیا جا رہا ہے۔

نسخۂ الف: یہ رسالہ کُل چھبیس[26] اوراق پر مشتمل ہے اور ہر صفحہ پر چودہ سطور ہیں اس کی تقطیع ۷ x ۱۲ ہے۔ یہ نسخہ نہایت اہتمام سے خوش خط نستعلیق میں نقل کیا گیا ہے۔ چونکہ یہ نسخہ ۱۲۵۶ھ میں یعنی مصنف کی زندگی ہی میں لکھا

۱۔ مرزا سرفراز علی۔ مرقع سخن جلد اول ص (۱۳۶) ۲۔ عبدالجبار خاں۔ تذکرۂ شعرائے دکن جلد دوم ...
۳۔ ڈاکٹر زورؔ۔ داستانِ ادب حیدرآباد ص (۱۳۹) ۴۔ میر شمس الدین فیضؔ فیضِ جاری مخطوطہ نمبر (۱۳۵) ادارۂ ادبیات حیدرآباد ۵۔ میر شمس الدین فیضؔ۔ مخطوطہ نمبر (۳۸۲۹) ادارہ تحقیقات علوم مشرقی حیدرآباد۔

یا ہے اس لئے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ ڈاکٹر زورؔ نے فہرستِ مخطوطات ادارۂ ادبیاتِ اردو میں لکھا ہے کہ اس رسالہ کو نواب شمس الامراء کے مدرسہ کے طلبار کے لئے قلم بند کیا گیا تھا۔ اور دوسرے یہ کہ نواب صاحب کے سنگی چھاپے خانے میں طبع بھی تھا۔ یہ رسالہ اٹھہتر صفحات پر مشتمل ہے۔ اس دیباچے سے بھی ڈاکٹر زور کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس کے سرِ ورق لکھا ہے :

"رسالہ فیضِ جاری عہد میں نواب فلک جناب بندگان عالی حضرت آصفجاہ نظام الدولہ فتح جنگ میر فرخندہ علی خاں بہادر مدظلہٗ العالی کے شہر فرخندہ بنیاد حیدرآباد میں واسطے تعلیم طلباء کے سرکار شمس الامراء بہادر امیر کبیر کے سنگی چھاپے خانے کے درمیان ۱۲۵۶ھ میں چھپا۔"[1]

ادارۂ ادبیاتِ اردو میں "فیضِ جاری" کا جو مخطوطہ موجود ہے۔ اسے ڈاکٹر زورؔ نے میر تراب علی خاں باز سے نومبر ۱۹۴۰ء کو چھ روپے میں خریدا تھا۔ سرِ ورق کی عبارت اس پر درج نہیں۔ اس کے بجائے یہ عبارت اور یہ تحریر کیا ہوا ملتا ہے :

ع طاق وجفتی بافتم با ابروشں دلدار ہر طاق بود ابروی او من جفت گفتم یا ابرو
"مرزا نادعلی مرزا ظاہر گوید"

فیضِ جاری کی تاریخ تصنیف اس نظم کے آخر میں منظوم کی گئی ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں :

فیض جاری ہوا مرتب جب — تب کہا سب نے ہے نصاب عجب
اس کی تاریخ مجھ کو یوں آئی — فیض کا یہ رسالہ ہے بھائی

اس رسالے کے ترقیمے میں بھی سنہ تصنیف کی نشاندہی کی گئی ہے اور اسے محمد تقی کاتب نے ۱۲۶۷ھ میں نقل کیا اس کا ترقیمہ یہ ہے :-

"رسالہ فیض جاری تصنیف کیا ہوا۔ مولوی حافظ میر شمس الدین محمد کے چھ سو اناسی بیت پر سوائے دو بتیس تاریخ بارہ سو چھپن۔ ہجری میں مرتب ہوا۔"

تمام شد این رسالہ در سن ۱۲۶۷ یکہزار دو صد و شصت و ہفت ہجری بید محمد تقی غفر اللہ والوالدیہ[1]

ترقیمے کے برابر دو مستطیل مہریں سید جعفر حسینی بادشاہ قادری اور جعفر علی فاروقی کی ثبت ہیں۔ بالکل آخری صفحے پر

معمائی و ۲۰۰

لہ مظہر لطف خانخاناں — معشوقہ مہ کا مہ جبین است
گر سر طلبد دہم دلیسکن — پیشے سر خواہد ولے چہ مشکل

تحریر کیا ہوا ملتا ہے۔

---

[1] میر شمس الدین فیض فیضِ جاری مخطوطہ نمبر ۱۳۵ ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد

اس مثنوی میں فیضی نے اپنا اور کتاب کا نام بڑی خوبی سے اشعار میں ظاہر کیا ہے۔ بعض تذکرہ نویسوں کو فیضی کے سلسلہ میں جو غلط فہمی ہوئی تھی وہ ان اشعار کے پڑھنے کے بعد دور ہو جاتی ہے۔ وہ اشعار ملاحظہ ہوں جن میں فیضی نے اپنا نام بتایا ہے ؎

ہے وہ حافظ جسے ہو قرآن یاد — شور ہنگامہ ہے فغاں فریاد
کہہ نبی فاطمہ کو سید میر — ہے مرمت کا ترجمہ تعمیر
شمس ہے آفتاب دینِ اسلام — ایک معنی رکھیں درود و سلام
فیض جاری رکھا ہے اس کا نام — تا ہوں سیراب اس تشنۂ امام

یہ لغت اُردو، فارسی، عربی، ہندی اور دکھنی الفاظ کی مدد سے مرتب کیا گیا ہے۔ اس میں شمالی ہند میں اس والے الفاظ کی بہتات ہے لیکن جہاں تہاں دکھنی الفاظ کی نشاندہی بھی کی گئی ہے "نوائے ادب" کے مدیر نے لکھا۔ "فیض جاری" میں الفاظ کے جو معنی بتائے گئے ہیں وہ ٹھیٹ دکنی ہیں۔ ان کا یہ بیان درست نہیں۔ مثلاً چند پیش کئے جاتے ہیں ؎

چولہا دیگدان پران ہے جان — بڑے چچے کو تو ملاغہ جان
اوکھلی پاؤن استری ہے زن — چھلنی غربال کیا ہے پرویزن
ہے جو سیہ ادی کو تو مہ جان — ہے جو سالن اسے تو قورمہ جان
سن جسے بولتے ہیں وہ ہے سیہ — اخت خواہر ہیں پھوپی عمہ
کہ ہے سخن حدیث ہے بات — کہیں مصری کو فارسی میں نبات
جَو کی روٹی کو بول نان جوین — ہے جو داماد بول اسکو جوین

نسخۂ ب: "فیض جاری" کا دوسرا مخطوطہ ادارۂ تحقیقات علوم مشرقی میں موجود ہے۔ یہ نسخہ کی نظر سے نہیں گزرا۔ نصیر الدین ہاشمی نے بھی "فہرست مخطوطات کتب خانہ آصفیہ" میں اس کا ذکر نہیں کیا۔ کی اس کتاب کو "رسالہ فیض" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس کا سائز ۴½" x ۶" ہے۔ کل چھتیس ۳۶ صفحات ہیں۔ میں کچھ صفحے غائب ہیں۔ تقریباً پچانوے اشعار موجود نہیں ہیں۔ ہر صفحے پر چھ تا آٹھ سطور ہیں۔ یہ نسخہ زیادہ لیکن بعض صفحات کرم خوردہ ہیں اور بعض حروف بھی واضح نہیں۔ اس کی جلد چرمی ہے۔ چرمی جلد کے پہلے میں درج ذیل عبارت تحریر کی گئی ہے جس کا ترجمہ: "آخری رجب ۱۳۲۳ھ میں یہ کتاب دی گئی ہے" اس کتاب کے آخری صفحے پر "مالک ابن کتاب" کی نامکمل عبارت تحریر کی گئی ہے۔

اس میں کوئی ترقیمہ موجود نہیں ہے اس لئے کاتب کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ تاریخ کتابت درج کی پتہ چلتا ہے کہ یہ نسخہ فیضی کی زندگی میں ہی ۱۷ ربیع الاول ۱۲۶۹ھ میں نقل کیا گیا تھا۔ سب سے آخری "شعر ناتمام رسید" اس کے بعد غیر واضح دستخط دکھائی دیتے ہیں۔

کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں بھی اس کا ایک مطبوعہ نسخہ موجود ہے۔ اس کتاب میں نسخہ الف سے نو اشعار زیادہ ہیں چونکہ طے کا پہلا صفحہ غائب ہے اس لئے یہ اشعار موجود نہیں ہیں۔ ڈاکٹر نقشنے "فہرست مخطوطات" میں جن اشعار کا حوالہ ہے۔ وہ اس میں موجود ہیں۔ اسکو چھوٹی تقطیع پر لکھا گیا ہے۔ ہر صفحہ پر دس بارہ[؟] شعر درج ہیں۔

رسالہ "فیض جاری" کا ایک اور نسخہ مطبع نولکشور لکھنؤ میں بھی طبع ہوا تھا۔ یہ نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں موجود ہے۔ اس کی تقطیع ½۹" × ۶" اور صفحات چھیالیس ہیں۔ آغاز و اختتام وہی ہے جو ادارۂ تحقیقات علوم مشرقی کے طے کا ہے۔ اس کے دیباچے سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ "نصاب الصبیان" اور "خالق باری" کی بہ اس لغت کو ترتیب دیا گیا تھا تاکہ مبتدی آسانی سے مختلف الفاظ کے معانی یاد رکھ سکیں۔ ابتدا میں یہ عبارت پر کی گئی ہے :

"رسالہ فیض جاری چشمۂ رواں لغات اردو فارسی بطرز نصاب الصبیان و خالق باری کہ در قوافی ہر دو مصرعہ ابیاتش التزام صنعت تحسین مرعیت تحفظ لغاتش سود مند مفید بہ مبتدی"

اس لغت کی افادیت کو محسوس کرتے ہوئے فیض کے ایک قدر داں مولوی محمد حبیب الرحمٰن سابق آنریری مجسٹریٹ ضلع برہان پور ضلع منار نے سنہ ۱۸۸۲ء میں مطبع نولکشور سے اسے شائع کیا تھا۔ "فیض جاری" کے اس میں فیض کی ہمہ دانی، وسعت معلومات اور ان کی عالمانہ و ادیبانہ شخصیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ساتھ ہی اس بی اعتراف کیا گیا ہے کہ اس جامع کمالات ہستی کے ہزار ہا شاگرد تھے۔ فیض صوفی ہونے کے باوجود دنیوی کاموں سے دلچسپی بھی رکھتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں :—

مولوی صاحب موصوف در علوم عربیہ و فارسیہ یکتائے عصر بودند خصوصاً در محاورات عربی و فارسی مرجع و سند اہل دہر در اشعار فارسی و اردو دواوین عطیۂ شان مشہور و معروف در ملک دکن خصوصاً در بلدہ "فرخندہ" بنیاد حیدرآباد حفظہا اللہ تعالیٰ عن ..... الفساد ہزاران تلامذۂ جناب ممدوح موجود لا بیشمار در علم عروض و بیان و بدیع ہمہ شریف وضع زر رہائی مائدہ سراسر فائدہ حضرت موصوف مستفید و باوجود این کمالات ظاہری بالکل وارستگی از امورات دنیوی میداشتند و مدام در ذکر و شغل و عبادت الٰہی و علم حقائق و تصوف مستغرق و مقتدائی سالکان طریقت ۲

بودند و در ۱۲۸۳ھ از دار فانی انتقال نمودہ و اصل حق گردیدند"

آخری ورق پر جو عبارت درج ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب ۱۲۵۶ھ میں مطبع نواب شمس الامراء امیر کبیر بہادر چھپ چکی تھی۔ لیکن نایاب ہونے کی وجہ سے دوبارہ شائع کی گئی تھی۔

جہاں آرا، ایم اے

قرۃ العین حیدر ۔ ایک جائزہ

ادب کی کسی صنف کے قیام اور استقلال کے لئے پچاس سال کا عرصہ کافی ہوتا ہے۔ اُردو کے افسانوی ادب نے گذشتہ نصف صدی میں اتنی ترقی کرلی ہے کہ اس میں اس صنف کی تمام تر خوبیاں آگئی ہیں جو دنیا کی کسی بڑی اور ترقی یافتہ زبانوں کے بلند پایہ افسانوں میں نظر آتی ہیں۔ خواتین افسانہ نگاروں نے نقد و فن کے میدان میں آج اتنی ترقی کرلی ہے کہ یقین نہیں آتا کہ یہ وہی نازک ہاتھ ہیں جو صرف انسان کی تربیت ہی نہیں کرتیں بلکہ زندگی اور ادب کے ہر شعبے میں آگے آگے بڑھتی چلی جارہی ہیں۔ خواتین افسانہ نگاروں کی فہرست کافی طویل ہوگی ان میں سے بعض نے تو امتیازی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے اور بڑے جوہر دکھائے ہیں۔ اُن سب میں عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، ممتاز شیریں کے نام سرِ فہرست آتے ہیں۔ اُن میں بھی قرۃ العین کو جو شہرت ملی ہے اور جو بلند مقام حاصل ہوا ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ ان کی شخصیت کی طرح اُن کی افسانہ نگاری بھی بڑی حسین اور خوبصورت ہے۔ ان کے افسانے کوئی قاری ایک بار پڑھ لیتا ہے تو گویا اس ماحول میں اس قدر ڈوب جاتا ہے کہ اس کے اطراف ایک حصار سا بن جاتا ہے۔ اُن کا ماحول زیادہ تر رنگین اور دلچسپ ہے اس لئے کہ آج کی ماڈرن سوسائٹی کے لحاظ سے وہ تمام چیزیں اُن کے یہاں مل جاتی ہیں جن کا آج انسان متمنی ہے۔

کلبوں کی رنگین روشنی اور قیمتی کاریں اور زرق برق لباس جس کے پیچھے آج کا ہر انسان دوڑ لگائے ہوئے ہے ایک حد تک ذہنِ انسانی کو سکون فراہم کرتے ہیں جوں ہی افسانہ ختم ہوتا ہے قاری کی آنکھیں اس دنیا کے اندھیرے میں کچھ تلاش کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔

ممتاز شیریں نے "میرے بھی صنم خانے" پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ "میرے بھی صنم خانے" میں تو خیر صنم کا نام ہی لیا، سو یہ سوال ہی نہیں اٹھتا کہ اُن کے یہاں انسان کا کیا تصور ہے اور انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اُن کے کرداروں کی حیثیت معاشرے کے نمائندوں کی ہے۔ جی ہاں، یہ بات ممتاز شیریں نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ معاشرے میں ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ لیکن جن کرداروں کا جائزہ انھوں نے لیا ہے اُن کی ترجمانی آج تک کسی ادیب نے کم ہی کی ہے۔ اور وہ کردار اکثر اونچے طبقے کے نمائندے ہیں جس کا پتہ ہمیں ایک حد تک "ہوسائنگ سوسائٹی" کے کردار اور "پت جھڑ کی آواز" کے خشونت سنگھ وغیرہ سے چل جاتا ہے اگر قرۃ العین حیدر اس طبقے کی ترجمانی نہ کرتیں تو عوام سے یہ حقیقتیں چھپی ہی رہتیں۔

قرۃ العین کے یہاں جتنی خوبیاں ملتی ہیں اتنی ہی بعض اوقات خامیاں بھی نظر آتی ہیں۔ ان کے افسانوں کی سب سے بڑی

خوبی اُن کی تحریر کی رنگینی، دلکشی اور کیفیات کا بیان اور ایک ایسی فضا کی تعمیر ہے جس میں رومان ہی رومان نظر آتا ہے۔ ایک نقاد
نے قرۃ العین کے تعلق سے ٹھیک ہی لکھا ہے کہ "کرشن چندر اور دوسرے افسانہ نگار رومانیت کو جہاں آگے بڑھایا تھا
وہیں وہ حقیقت نگاری کا راستہ اپنا نہ سکے۔ قرۃ العین حیدر نے رومانیت کی طرف اس رجحان کو اور آگے بڑھایا اور
اسے ایک نیا سانچہ بھی دیا (یہ اور بات ہے کہ کرشن چندر آگے چل کر ایک حقیقت پسند افسانہ نگار ہو چکے تھے) قرۃ
العین حیدر نے اپنا اس دنیا کی ترجمانی کی ہے جو ہمارے لئے کوئی خاص وقعت نہیں رکھتی اس کے باوجود بھی اس میں ایک نیا پن اور
دلچسپی ملتی ہے۔ یہی وہ تمام چیزیں ہیں جن کی طرف قاری کا ذہن فوراً مائل ہو جاتا ہے۔ لیکن ان کے افسانے عوام کی زندگی سے کچھ دور رہے ہیں
اس لئے کہ وہ جن باتوں کی ترجمانی کرتی ہیں وہ ایک حد تک ہمارے ملک اور ہماری زندگی سے دور نظر آتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُن پر کافی
حد تک ورجینیا وولف کا اثر رہا ہے اس کے باوجود مخصوص ادبی حلقوں میں اُن کے افسانوں کی آج بھی مانگ ویسی ہی ہے جیسی پہلے تھی۔
انھوں نے اپنی رنگین شخصیت کا رنگ افسانوں میں اس خوبی سے بھر دیا ہے کہ اُن کے افسانے ہر وقت ایک نیا زاویہ لئے ہوئے
نظر آتے ہیں۔ زندگی کی اہمیت اور فن کی رنگینی افسانے کو اس قدر خوبصورت بنا دیتی ہیں کہ قاری انھیں تانوں بانوں میں اُلجھ کر
رہ جاتا ہے۔ انھوں نے جو کچھ بھی دیا ہے اس سے ادبی حلقے وسیع پیمانے پر مستفیض ہو چکے ہیں۔ ان کے کردار زیادہ تر شہر
سے تعلق رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ شہر کی رنگینیاں اور اُن کی مصروفیات افسانے میں زیادہ ہی نظر آئیں گی۔
جہاں تک افسانے کے لوازم کا تعلق ہے۔ قرۃ العین حیدر آزاد تکنیک کی پابندی کرتی ہیں۔ اسی واسطے بعض اوقات اُن کے
یہاں خیالات بکھرے بکھرے سے نظر آتے ہیں۔ وہ ویسے پلاٹ اور کردار کو بھی کوئی خاص اہمیت نہیں دیتیں۔ اُن کے ہاں
پلاٹ بالکل مبہم سا رہتا ہے۔ ان تمام خامیوں کے باوجود اگر اُن کو خامیاں کہا جائے تو بکھری ہوئی چیزیں کچھ نہ کچھ تاثر قاری
پر چھوڑ ہی جاتی ہیں۔ یہ اُن کے افسانوں کی ایک ایسی خوبی ہے جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔
ان کے انفرادی نقطۂ نظر اُن کے جذبات اور اُن کے سوچنے کے ڈھنگ میں تقسیم ہند کے بعد کافی تبدیلیاں نظر آتی ہیں انہوں
نے بعض افسانوں میں مسلمانوں کی زندگی کا جو المیہ ہے اسے موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ "ہوسائنگ سوسائٹی" اس کی بہترین
مثال ہے۔ اُن کا شاعرانہ تخیل اور اچھوتی تکنیک افسانے کو ایک نئی زندگی بخشتے ہیں۔ اُن کا رومانی تخیل اتنا تیز ہے کہ بعض
اوقات اُن کے یہاں یاس انگیز فضا میں بھی امید کے نئے چراغ جل اٹھتے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک حد تک رجائی
نقطۂ نظر کی مالک ہیں۔ جو نہ صرف زندگی کو بقائے دوام بخشتا ہے بلکہ ایک صحت مندانہ اثر قاری پر بھی چھوڑ جاتا ہے۔ ان
کے اپنے تجربات اُن کی بصیرت اور اُن کی مغرب سے واقفیت افسانوں کی سطح کو کافی بلند کر دیتی ہیں۔ بعض اوقات اُن کے افسانے
پڑھنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ اُن کا موضوع مہاجرین کی کشمکش اور جلاوطنی کا شدید احساس ہے۔ ان کی وسعت نظر اور گہرائی
افسانوں میں ایک عجیب سا لطف پیدا کر دیتی ہے۔ ان کے یہاں عصرِ حاضر کی روشنی اور موجودہ تہذیب کی جھلک دکھائی دیتی ہے
جو نہ صرف پوری طرح مغربی ہے اور نہ ہندوستانی۔ ایک عجیب ایسی تہذیب ہے جو مشترک ہے۔
ان کے افسانوں اور ناولوں کا معیار کافی بلند ہے جس کا اعتراف خود انھوں نے اپنے الفاظ میں یوں کیا ہے
"اظہار کا وسیلہ کیا ہوتا ہے بلکہ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس کے فن کا معیار کیا ہے" اس سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں
نے اپنے خیالات کو ظاہر کرنے کا وسیلہ افسانے کو بنایا ہے اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی چاہتی ہیں کہ وہ معیاری

ہو۔ ہاں البتہ یہ بات ٹھیک چاہیے کہ مصنف اپنے خیالات کو اگر ظاہر کرنے کی کوشش کرے، چاہے وہ کوئی بھی ادب ہو اگر اس کی زبان اس کا انداز۔ اور اس کے خیالات معیاری ہوں تو خود بخود اس کی شہرت اور مقبولیت کا باعث ہو جائیں گی۔

ان کے یہاں کرداروں کی فراوانی نے بھی ایک عجیب الجھن سی پیدا کر دی ہے لاتنے کرداروں کی تخلیق کے باوجود ان کے یہاں ہمیں کوئی ایسا کردار نظر نہیں آتا جو ابھر ہو۔ ویسے دوسروں کے یہاں کئی ایسے کردار ہمیں نظر آتے ہیں جو بین الاقوامی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ ان کے کرداروں میں اکثر ایک بے نام سی، عجیب سی تشنگی پائی جاتی ہے۔ ایک سونی سونی سی نظر آنے لگتی ہے۔ کسی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ اس کے باوجود ان کی تحریروں میں عجیب سی بے خودی نظر آتی ہے۔ عصمت چغتائی نے ٹھیک ہی بتایا ہے کہ "قرۃ العین کے قلم میں شہد کی شیرینی اور شمپین کا نشہ ہے" صالحہ عابد حسین نے اپنے مضمون "ادب اور خواتین" میں قرۃ العین کے تعلق سے لکھا ہے کہ "قرۃ العین کا اپنا الگ اسٹائل تھا وہ سب سے زیادہ مشہور عورتیں کیا پڑھے لکھے مرد بھی ان کے مطالعہ کی وسعت، اندازِ بیان کے نئے پن، جدید ترین تکنیک اور گنگا جمنی زبان سے متاثر ہوگئے"۔

ان کی زبان میں دھیرے دھیرے روانی آتی جا رہی ہے۔ بیان میں پیچیدگی بھی کم ہوتی جا رہی ہے۔ ان کی کہانیاں پسند کی جانے لگی ہیں۔ ان تمام خوبیوں اور خامیوں کے باوجود انہوں نے اردو افسانوی ادب میں اپنا جو الگ مقام بنایا ہے کسی کو انکار نہیں۔ انہوں نے اپنے اندازِ تحریر کے ذریعہ اردو افسانے کو ایک آفاقی حیثیت عطا کی ہے ●●

غیر مطبوعہ نگارشات کی طباعت کے لئے اکیڈیمی کی گرانٹ

اُردو اکیڈیمی آندھرا پردیش کے ایک پریس نوٹ میں کہا گیا ہے کہ آندھرا پردیش سے تعلق رکھنے والے اردو کے اہلِ قلم غیر مطبوعہ اُردو نگارشات کی طباعت کیلئے اکیڈیمی کی گرانٹ حاصل کرنے کی غرض سے مقررہ فارم پر درخواستیں بھیج سکتے ہیں۔ اکیڈیمی کے دفتر پر درخواستیں وصول ہونے کی آخری تاریخ ۱۶ راگست مقرر کی گئی ہے۔ درخواست کے مقررہ فارم اکیڈیمی کے دفتر سے بذریعہ ڈاک طلب کیے جا سکتے ہیں یا کام کے دنوں میں دست بدست حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

کسی بھی صنفِ ادب یا علوم و فنون کے کسی بھی شعبے سے تعلق رکھنے والی کتاب کا مسودہ روانہ کیا جا سکتا ہے۔ مسودہ کسی صورت میں واپس نہیں کیا جائے گا اس لئے مناسب ہوگا کہ اہلِ قلم اپنے مسودے کی نقل روانہ فرمائیں۔

درسی کتابوں یا ان کا شرحوں کے مسودے قبول نہیں کیے جائیں گے۔ اس سلسلے میں مزید تفصیلات مطلوب ہوں تو ڈاک یا فون نمبر ۲۲۸۰۱ کے ذریعہ یا بلاواسطہ اکیڈیمی کے دفتر سے رابطہ پیدا کیا جا سکتا ہے۔

(پتہ)
ڈائرکٹر اردو اکیڈیمی، اے سی گارڈز۔ حیدرآباد ۴

محمد علی اثر

ہر طرف رات کا پھیلا ہوا دریا دیکھوں
کس طرف جاؤں کہاں ٹھہروں کہ چہرہ دیکھوں

کب سے میں جاگ رہا ہوں یہ بتاؤں کیسے
آنکھ لگ جائے تو ممکن ہے سویرا دیکھوں

ناخدا ذات کی پتوار سنبھالے رکھنا
جب ہوا تیز چلے خود کو شکستہ دیکھوں

اب یہ عالم ہے کہ تنہائی ہی تنہائی ہے
یہ تمنا تھی کبھی خود کو بھی تنہا دیکھوں

دیدۂ خواب کو اُمیدِ ملاقات نہ دے
کس طرح اپنے ہی خوابوں کو سسکتا دیکھوں

دن جو ڈھل جائے تو پھر درد کوئی جاگ اُٹھے
شام ہو جائے تو پھر آپ کا رستہ دیکھوں

رنگ دھل جائیں غبارِ غمِ ہستی کے اثر
اب کے منظر کوئی دیکھوں تو انوکھا دیکھوں

اختر نعمان

کیا فکر تم اگر ستم ایجاد ہو گئے
ہم بھی حریفِ خطرۂ اُفتاد ہو گئے

وہ جن کو زندگی کے سبق یاد ہو گئے
آلامِ صبح و شام سے آزاد ہو گئے

پائی ہے ہم نے یاس میں بھی آس کی جھلک
وہ اور تھے جو مضطر و ناشاد ہو گئے

اتنی ہے بس حکایتِ تغیرِ گلستاں
جو صید تھے کل، آج وہ صیاد ہو گئے

کرتے رہے سبھی غمِ جاناں کا تذکرہ
اور ہم غمِ حیات کی رُوداد ہو گئے

لے کر شبِ ملال تصور کا آسرا
ہم خود انیسِ خاطرِ ناشاد ہو گئے

اختر بہ فیضِ حادثۂ گردشِ جہاں
رازِ آشنائی لذتِ بیداد ہو گئے

ایمن جعفری

ہر گام نفس ایک گرہ کاٹ رہی ہے
لمحوں کی چھری بھی بڑی سفاک چھری ہے

چہروں پہ تہِ وقت کی تہذیب کا غازہ
جسموں پہ گھنی گرد کدورت کی جمی ہے

میں آج کہاں آیا ہوں صحرا سے نکل کر
دیوانوں کی اک بھیڑ مرے گرد لگی ہے

اُمید کی خوشبو سے مہک اُٹھی ہے سانسیں
احساس کو یادوں کی ہوا چوم رہی ہے

پھر سنگ زنی کا کوئی اِلزام ترا شو
پھر خواب سے وحشت مری بیدار ہوئی ہے

جینے کے لئے آؤ کوئی راہ نکالیں
مرنے کے لئے تو ابھی اِک عمر پڑی ہے

کس کس کی زباں بند کروگے اس بھیڑ میں آ
یہ شہر ہے، بہتر یہاں بیگانہ روی ہے

عابد النساء
ایم اے (عثمانیہ)

سرسیّد کی اُردو خدمات

سرسید احمد خاں کا شمار اُردو کے اولین معماروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی ہنگامہ پرور زندگی سیاسی، تعلیمی، مذہبی، ادبی، تہذیبی، تخلیقی غرض کہ ہر قسم کے علمی اور قومی کاموں میں نمایاں حصّہ لیا اور ہر میدان میں اپنے نقوش چھوڑے۔ سرسید احمد خاں نے اردو زبان کی جو عدیم المثال خدمت کی ہے اس کے احسان سے اُردو زبان سبکدوش نہیں۔ سرسید کے زمانے تک اُردو تصنیفی زبان نہ تھی صرف بول چال اور کسی قدر مراسلت اور عدالتی کاموں میں اس کا رواج ہو چلا اس کے باوجود مصنفین، معززین اور شرفاء کی زبان فارسی ہی تھی۔

سرسید احمد خاں نے ادبیات پر جس حد تک مجتہدانہ رنگ چڑھایا لائق تحسین ہے۔ یہ ان ہی کے قلم کی آواز بازگشت ہے کہ ملک میں بڑے بڑے مصنفوں کے لئے راہیں کھُل گئیں۔ آج جو خیالات بڑی آب و تاب اور عالمانہ رنگ اور نئے لباس میں جلوہ گر نظر آتے ہیں وہ دراصل اِسی نمایاں شخصیت کے رہینِ منت ہے۔

سرسید احمد خاں نے اُردو نثر کے حدود کو وسیع تر کر کے نہ صرف اُردو زبان کی حفاظت کی بلکہ اس کو غیر معمولی وسعت دے کر اُردو ادب کی نشو و نما میں نمایاں حصّہ ادا کیا۔ سرسید سے پہلے تک اُردو زبان کا بیشتر سرمایہ شاعری پر مشتمل تھا۔ نثر کا سرمایہ بہت قلیل تھا اور جو کچھ تھا وہ قصّوں، فرضی کہانیوں اور خیالی داستانوں پر مشتمل تھا۔ اسلوب اور اظہار کے لحاظ سے نثر و نظم تصنّع، تکلّف اور مبالغہ سے پُر تھیں۔ مسجّع اور مقفّیٰ طرزِ تحریر عام تھی جس میں خیالات کا اظہار آسانی سے نہیں ہو سکتا تھا۔ سادہ بے تکلف، رواں اور سلیس طرزِ تحریر سے لوگ نا آشنا تھے۔ غالبؔ نے خطوط میں سلاست اختیار کی۔ میر امّن نے ٹھیٹ اُردو میں "باغ و بہار" لکھی مگر اُردو نثر کی رفیع الشان عمارت کی تعمیر کا کام ابھی باقی تھا۔ یہ کام سرسید کے ہاتھوں انجام پایا۔ انھوں نے نثر اُردو کو اجتماعی مقاصد سے روشناس کیا اور اس کو سہل اور سلیس بنا کر عام اجتماعی زندگی کا ترجمان اور علمی مطالب کے اظہار کا وسیلہ قرار دیا۔ ان کے زمانے تک نثر میں عموماً مضمون و معنی کو نہیں بلکہ طرزِ ادا کو اوّلین اہمیت دی جاتی تھی۔ مگر سرسید نے مضمون کو اوّلیت بخشی اسی طرح تکلف اور تصنّع کو جو یہ نثر کا امتیازِ خاص تھا، ترک کر دیا۔ سرسید سے پہلے اُردو زبان اس قابل نہ تھی کہ علمی و ادبی مسائل کے دقیق اور پیچیدہ

و اپنے دامن میں سمیٹ سکے انھوں نے سادہ رواں اور سلیس طرزِ نگارش رائج کیا اور وہ مستقبل کے لئے جرس کارواں ثابت ہوئے۔

اُردو مضمون نگاری کی صنف کے بانی سرسید ہی تھے۔ وہ ایک عہد آفریں نثر نگار تھے۔ اُردو مضمون نگاری سرسید کی رہین منت ہے اس سے پہلے اُردو میں یہ صنف معدوم تھی، سرسید کو مضمون نگاری کا موجد کہنا بجا ہوگا۔ اس صنف کو جس کا انگریزی نام "EASSY" ہے یورپ سے حاصل کی گئی۔ انگلستان کے دو ادیب ایڈیسن اور ٹیلہ دنیائے ادب میں شہرتِ عام حاصل کر چکے تھے۔ سرسید احمد خاں نے "تہذیب الاخلاق" میں مضمون نگاری کا سلسلہ جاری کیا تو ان کے پیش نظر ایڈیسن کی تحریریں موجود تھیں۔ اُردو زبان اور شعر و ادب کی اصلاح کا جو خیال اُنھیں پیدا ہوا اس میں ان پرچوں کا بڑا حصہ ہے۔ وہ مغربی ادب سے ان ہی پرچوں کے ذریعہ متعارف ہوئے۔

سرسید احمد خاں کے مضامین کو ہم تین حصّوں میں تقسیم کر سکتے ہیں ۱۔ خالص مذہبی اور دینی مضامین ۲۔ سیاسی مضامین ۳۔ اصلاحِ اخلاق و معاشرت سے متعلق مضامین۔

سرسید احمد خاں کے مضامین میں جو فلسفۂ اخلاق پیش ہوا ہے اس کی غنایت "علمیت" اور "مقصدیت" ہے۔ انھوں نے اپنے پرچے "تہذیب الاخلاق" کے ذریعہ ہندوستان میں تقریباً ویسی ہی خدمات انجام دیں جیسی انگلستان میں ایڈیسن اور اسٹیل نے۔ اسپیکٹر اور ٹیلہ کے ذریعہ انجام دیں۔

سرسید احمد خاں نے مقصد اور نصب العین سے روشناس کروایا۔ سرسید کا مقصد ہمہ گیر تھا۔ ان کو ہر قسم کے خیالات اور مطالب بیان کرنے کے لئے جس زبان کی ضرورت تھی اُردو کے قدیم سرمایہ میں اس کا کوئی نمونہ موجود نہ تھا۔ اُردو زبان میں گو طرزِ مرصع اور "خانہ عجائب" نثر نگاری کے ابتدائی نمونے تھے۔ انھیں اپنے مشن کے تقاضوں کے مطابق جس نئی زبان کی ضرورت تھی اس کی راہیں انھیں خود ہموار کرنی پڑیں۔ بقول آل احمد سرور

> "سرسید نے اپنی تبلیغی اور عملی کوششوں سے اُردو کو کام کی زبان میں کام کی باتیں کہنا سکھایا۔ سرسید کی تحریک کا سہارا پاکر اردو نثر نے جو ترقی کی زمانہ اس کا معترف ہے۔"

سرسید احمد خاں نے انشا پردازی کی پرانی رسموں کو توڑ کر نثر کو تمام علمی اور ادبی مضامین کے لئے ذریعۂ اظہار بنا دیا طرزِ ادا کے مقابلے میں مدعا نویسی اور مطلب نگاری کو تحریر کا مقصدِ اصلی ٹھیرایا۔ سرسید اس کی عبارت عام طور سے تشبیہات استعارات، صنائع و بدائع سے پاک ہے جس بات کو لکھتے ہیں اس کو دلیل سے مضبوط کرنے کی کوشش کرتے ہیں مشکل سے مشکل مضمون کو نہایت آسانی کے ساتھ ادا کرتے ہیں ان کی تحریر کا خاص وصف سچائی اور بے باکی ہے۔ وہ روزمرہ کے سیدھے سادے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ تحریر میں کہیں کہیں بذلہ سنجی اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔ وہ اپنی تحریر میں منظر اور واقع کی تصویر الفاظ کے ذریعہ نہایت خوبی کے ساتھ کھینچتے ہیں جس کی بنا پر بعض بعض دفعہ عبارت بے لطف ہو جاتی ہے۔ وہ اصلاح کے جوش میں قواعد کی پابندی اپنے لئے زیادہ ضروری نہیں سمجھتے جو لفظ مفہوم پورا کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے فوراً استعمال کر جاتے ہیں۔ "تہذیب الاخلاق" میں جتنے مضامین شائع ہوئے زیادہ تر اخلاق کا پہلو نمایاں ہیں۔ "تہذیب الاخلاق" میں سرسید

کا ایک مضمون "بحث و تکرار" کے عنوان سے شائع ہوا ہے اس میں زبان کی شوخی اور بیان کی نُدرت کے علاوہ سادگی
بھی روشن نظر آتی ہے ، تعلیم اخلاق کا نہایت دلنشین طریقہ استعمال کیا گیا ہے ۔
سرسید کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ زندہ زبان میں نئے نئے الفاظ ہمیشہ داخل ہوتے رہتے ہیں جب ا
محدود ہو جاتی ہے تو وہ مردہ کہلاتی ہے چنانچہ نئے الفاظ کے استعمال سے سرسید نے اُردو کی لسانی توسیع میں بھی حا
سرسید نے زبانِ اُردو کی خدمت اصلاحی حیثیت سے کی اس کو اس طرح پالا پوسا جیسے کوئی نونائیدہ بچے کی پرور
پرداخت کرتا ہے ۔ سرسید نے نہ صرف شعر و ادب اور مضامین کی اصلاح کی بلکہ انشاء ، اِملا ، عبارت ، طرزِ
و معنی پر بھی اُنھوں نے خاص توجہ دی جس طرح معمار کسی عمارت کو بنیاد سے اُٹھا کر اوپر تک لے جاتا ہے انھوں نے بھی
علمی و ادبی زبان بنانے میں ایسی ہی کوشش اور ہمت صرف کی ۔ آل احمد سرور " علی گڑھ میگزین " کے علی گڑھ
ہیں کہ " وہ نثر کی روح کو سمجھتے ہیں اور اس کے تعمیری حُسن کو جانتے ہیں ، وہ معلومات عطا کرتے ہیں اور ذہن کو
ہیں اور اُنھیں ان معلومات کو خوشگوار ڈھنگ سے پیش کرنا بھی آتا ہے ۔
حالی نے سرسید کو " اردو زبان کا باوا آدم " کے لقب سے یاد کیا ہے ۔ حالی نے سچ کہا ہے کہ اُردو جو راہ ا
سال میں طے کر سکتی تھی سرسید نے اُسے چند سال میں طے کروا دیا " سرسید کے ساتھ علی گڑھ تحریک کو الگ نہیں
ادبی لحاظ سے علی گڑھ تحریک کے اثرات وسیع ہیں نہ صرف اسلوب بیان روح مضمون میں بلکہ ادبی انواع کے معاملہ
ان علی گڑھ کی توسیعی کوششوں نے بڑا کام کیا اور ایسی اصنافِ ادب کو رواج دیا اور تنقیدِ جدید کا آغاز
اور رفقاء سرسید سے ہوتا ہے ۔ مکالمہ نگاری کو بھی ان ہی کے طفیل اُردو میں ایک مقام حاصل ہوا ۔ "تہذیب الاخلاق"
نگاروں میں بیشتر سرسید کے رُفقاء تھے ۔ ان کے زیرِ اثر کچھ مدت بعد اُردو میں مقالہ نگاری کا فن ادبی درجہ
ہے ۔ محسن الملک ، وقار الملک ، چراغ علی ، شرر ، شبلی ، حالی کے مقالے اردو ادب میں بلند مقام رکھتے ہ
سرسید اور ان کے نامور رفقاء نے جو بھی ادبی خدمات انجام دیں وہ ایسی غیر فانی ہیں کہ صفحۂ تاریخ سے ا
جا سکتا ۔ حالی ، شبلی ، نذیر احمد ، محسن الملک اور وقار الملک نے گلستانِ ادب میں وہ سدا بہار پھول کھلائے ہ
عرصۂ دراز گذر جانے کے بعد بھی باقی ہے اور صدیوں تک باقی رہے گی ۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ " سرسید کے اد
جو چیزیں مستقل حیثیت سے امتیاز اور انفرادیت بخشتی ہیں ان کو مجموعی لحاظ سے تین چار جملوں میں جا
ہمارے ملک میں سرسید ہی وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے فکر و ادب میں روایت کی تقلید سے ہٹ کر آزا
اور آزادئ خیال کی رسم جاری کی اور ایک ایسے مکتب کی بنیاد رکھی جس کے عقائد میں عقل ، نیچر ، تہذیب او
کو بنیادی حیثیت حاصل ہے ۔
انھوں نے ادب میں ایک نیا پن ، ایک ہمہ گیری ، ایک مقصد ، ایک سنجیدگی اور ایک خاص قسم کی مع
یوں تو سرسید کی تصانیف کئی ہیں مثلاً "خطباتِ احمدیہ" ، "آثار الصنادید" "تاریخ سرکشیٔ بجنور" وغیرہ لیکن سب
اُردو پر "تہذیب الاخلاق" کا پڑا ۔ جب چھیڑ چھاڑ اس رسالے سے شروع ہوئی تو جواب دینے والوں
بقیہ صفحہ

غلام جیلانی

پروفیسر عبدالقادر سروری

سروری صاحب سے پہلی ملاقات ان کے ہم زلف فیض محمد صاحب کے مکان پر ۱۹۴۳ء میں ہوئی تھی۔ اس سے پہلے صرف اس قدر جانتا تھا کہ ڈاکٹر زور کے رفیق ہیں اور ان دونوں کا نام ہمیشہ یکجا نظر آیا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک آدھ افسانہ اور ایک آدھ مضمون اُردو رسائل میں پڑھ چکا تھا۔ پہلی ملاقات کا تاثر کچھ اس طرح کا تھا۔ خوش پوشی، نفاست پسند اور کم گو۔ بات کرنے کا انداز تکلف آمیز، سننے والا یہ سمجھنے پر مجبور ہو تا کہ وہ ٹھیٹ اہلِ زبان یعنی دہلی اور لکھنؤ کی بول چال اختیار کرنا چاہتے ہیں اور یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید ادھر ہی کے ہوں۔ رفتہ رفتہ معلوم ہوا کہ ان کے جدِ امجد کشمیر سے آئے تھے لیکن یہ خود ٹھیٹ حیدرآبادی تھے۔ دن گذرتے گئے۔ ملاقاتیں ہوتی گئیں تو اندازہ ہوا کہ سروریؔ کا کسی سے بھی بے تکلف ہونا ممکن نہ تھا۔ ان کے قدیم ساتھی اور رفیق ڈاکٹر زورؔ یا ہم زلف فیض محمد صاحب سے بھی بے تکلف انداز میں بات چیت کرتے نہیں دیکھا گیا۔ ہمیشہ فیض صاحب یا زورؔ صاحب کہہ کر مخاطب ہوتے اور شاید اسی کا ردِ عمل تھا کہ یہ دونوں بھی انھیں ہمیشہ سروری صاحب ہی کہہ کر مخاطب ہوتے۔

سروری صاحب بانیان "ادارۂ ادبیاتِ اُردو" میں سے ایک تھے۔ 'ادارۂ ادبیاتِ اُردو' کے قیام اور استحکام میں سروری صاحب، ڈاکٹر زور کے برابر کے شریک تھے۔ اس کے ساتھ ہی کئی اور چیزیں ان دونوں میں مشترک تھیں۔ دونوں کے آبا و اجداد بزرگانِ دین میں سے تھے۔ دونوں کا بچپن ایک ہی فضا یعنی پرانے شہر کے قدیم ترین محلہ جات سلطان شاہی و مغل پورہ میں گذرا تھا۔ دونوں نے اُردو و فارسی کو اختیاری مضمون بنایا۔ دونوں نے عثمانیہ یونیورسٹی میں مددگار پروفیسر کی حیثیت سے اپنی علمی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ دونوں کو دکھنی ادب سے دلچسپی تھی اور دونوں نے یہ ثابت کر دکھایا کہ اُردو زبان کی ترقی میں دکھنی کا حصہ دلّی اور لکھنؤ سے کسی طرح کم نہ تھا۔ دونوں نے تخلیقی ادب کے ساتھ تنقیدی ادب کا سرمایہ چھوڑا ہے اور سب سے آخر میں دونوں کی زندگی کے آخری ایام کشمیر میں گذرے ہیں۔ یہی وجہ ہیں کہ جب بھی ان کا نام لیا جاتا ہے، ایک ساتھ ہی لیا جاتا ہے۔ کسی نے ایک مرتبہ مزاحیہ انداز میں کہا تھا کہ سروری، زورؔ کا سایہ ہے اور جسم سے سایہ جدا نہیں کیا جا سکتا اور سایہ کے بغیر جسم کا وجود قائم نہیں کیا جا سکتا۔ اس مزاحیہ جملہ کا مطلب نہیں کہ سروری صاحب انفرادی خصوصیت سے محروم تھے اور نہ ڈاکٹر زورؔ۔ اب آیئے ان دونوں کے کردار اور زندگی کے ایسے پہلوؤں پر غور کریں جن میں یہ دونوں ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے۔ ڈاکٹر زورؔ شاعر بھی تھے اور اپنے والد کے تخلص زورؔ کی مناسبت سے زورؔ تخلص اختیار کیا تھا۔ جو ان کے نام محی الدین قادری سے زیادہ مشہور ہے لیکن سروریؔ

عرصہ قبل شعر کہنا ترک کر دیا تھا۔ اس کے برخلاف سروری صاحب صرف شعر فہم تھے۔ ڈاکٹر زورؔ زود نویس بھی تھے اور بسیار نویس بھی لیکن شاید ہی کبھی اپنے لکھے ہوئے مسودوں پر نظرِ ثانی کرتے تھے۔ اس کے برخلاف سروری صاحب کے لکھنے کا انداز دوسرا تھا۔ وہ جو کچھ لکھتے بڑی کاوش و محنت سے لکھتے تھے اور اپنی تحریر کو اس وقت تک منظرِ عام پر نہ لاتے تھے جب تک کئی مرتبہ اس کی صحت کو جانچ نہ کر لیتے۔ ڈاکٹر زورؔ کے ہاں حصولِ مقصد کو بڑی اہمیت تھی۔ دکھن والوں کی اردو خدمات کا اعتراف کروانا اور ادارۂ ادبیات اردو کو بلند سے بلند کرنا، یہ تھا ان کا مقصد۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر وہ اپنوں سے بگڑ جاتے۔ غیروں کو اپناتے۔ نہ کسی کے معترض ہونے کی پرواہ کرتے اور نہ کسی کی ستائش پر تکیہ کرتے۔ اس کے برخلاف سروری صاحب منکسر المزاج آدمی تھے دوستی ہر حال میں نباہے جاتے اور کسی سے رنجش ہو جاتی تو اپنی جگہ خاموش ہو جاتے، کنارہ کشی کر لیتے۔ ڈاکٹر زورؔ ریاست حیدرآباد کے جملہ ارباب اقتدار سے کسی نہ کسی طرح تعلق پیدا کر لیتے اور ادارہ کے مفاد کے لئے اس تعلق کو استعمال کرنے میں کوئی تکلف محسوس نہ کرتے۔ اس کے برخلاف سروری صاحب کو اپنے کام سے غرض ہوتی اور کچھ نہیں، ہمیشہ پسِ منظر میں رہنے کی عادت تھی۔

سروری صاحب کی تصنیفات میں ہمیں تنقیدی، تحقیقی اور تخلیقی ادب کے شاہکار ملتے ہیں جہاں تک ہمیں علم ہے ان کی تصنیفات حسب ذیل ہیں۔

(۱) جدید اردو شاعری (۲) دنیائے افسانہ (۳) کردار اور افسانہ (۴) افسانوں کا مجموعہ (۵) حیدرآباد کی تعلیمی ترقی (۶) مثنوی پھول بن (۷) کلیات سراج اورنگ آبادی (۸) مثنوی قصۂ بے نظیر (۹) کشمیر میں اردو ادب کی تاریخ (۱۰) کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ۔

مندرجہ بالا فہرست کی آخری دو کتابیں غیر مطبوعہ ہیں۔ ان کے علاوہ کئی کتابوں پر سروری صاحب کے لکھے ہوئے مقدمات ملتے ہیں۔ دنیا کے شاہکار افسانوں کا سلسلہ بھی انھوں نے شروع کیا تھا۔ غرض سروری صاحب دکھن کے ان خادمانِ زبان اردو میں سے ایک تھے جن پہ دکھن ہمیشہ ناز کرتا رہے گا۔ سروری صاحب کی وفات کشمیر میں بتاریخ ۱۱ر مارچ ۱۹۷۱ء ہوئی جہاں سے ان کے جد امجد حیدرآباد تشریف لائے تھے۔

۷۲

بقیہ (ادبی سرگرمیاں "اردو نامہ" صفحہ ۴۶ سے آگے)

کے سنٹر کا نائب صدر سٹی انجمن مسٹر لیس، سرینواس ریڈی نے افتتاح کیا۔ اِس سنٹر میں (۲۵) خواتین نے حصول تعلیم کے لئے اپنے نام رجسٹر کرائے۔

۲۴ر جون: انٹرنیشنل کلچرل لائبریری کے زیر اہتمام اردو ذریعہ تعلیم کے ایک مرکز کا افتتاح کرتے ہوئے جناب عابد علی خاں صدر نشین مجلس انتظامی اردو اکیڈمی نے اردو کے گرتے ہوئے معیارِ تعلیم اور اردو والوں کی بے حسی پر انتہائی تشویش و تردد کا اظہار کرتے ہوئے کہا اس سلسلے میں ریاستی انجمن نے ایک جامع منصوبہ تیار کیا ہے جس میں اردو ذریعہ تعلیم کے ماڈل طرز کے مدارس کا قیام بھی شامل ہے جن کے ذریعہ ابتدائی اور ثانوی درجوں میں تعلیم کے معیار کو بہتر بنایا جا سکے گا۔ جناب نصرت محی الدین نے اس جلسہ کی صدارت کی۔

۲۵ر جون: اردو مجلس کا ماہانہ ادبی اجلاس جناب بھارت چند کھنہ ڈائرکٹر ریاستی اردو اکیڈمی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر اکبر علی بیگ نے "عزیز مرزا کی شخصیت اور ان کی علمی خدمات" پر مقالہ سنایا۔ جناب احمد جلیس پروگرام اگزیکیٹو آل انڈیا ریڈیو نے "ریڈیائی ڈرامے کے آغاز اور ارتقاء" پر معلومات آفریں مضمون پڑھا۔

محبوب

کوئی چاہے اگر

چاہیے، ملے انہیں کو
ت! تشنگی!! چاہت!!!
دل، سکونِ روح — لا حاصل!!
رہے خطِ فاصل —
یہ ہیں اس کی
ت و ریخت لکھی ہو
ح و قلم ہوں خندہ زن اس پر
ت نارسا سے ہٹ کے اس کو
نعمت مل نہیں سکتی

○

ڈاکٹر راہی

اس قدر قابو ہے دل پر غم سے گھبراتا نہیں — بے بسی یہ ہے تڑپ کر بھی سکوں پاتا نہیں
بھولنا چاہوں تو یاد آتا ہے کوئی اور بھی — یاد کرتا ہوں تو پھر دل کو قرار آتا نہیں
زہرِ غم پیتے رہے ہم کل تلک ان کے ہجر میں — ساتھ ہیں اب وہ تو امرت بھی پیا جاتا نہیں
کھولتا ہوں لب تو آ جاتا ہے خود داری پہ حرف — اور چپ رہنے کا فن کیا ہے مجھے آتا نہیں
آسماں بھی ہے وہی اور میری نظریں بھی وہی — چاند پہلے کی طرح پھر کیوں نظر آتا نہیں
جب وہ آ سکتا نہیں نزدیک میرے حشر تک — کیوں خیال اس کا مرے دل سے چلا جاتا نہیں
روکئے راہی اب اپنے اشک پیہم روکئے
جانے والا اس جہاں سے لوٹ کر آتا نہیں
!

عبدالمتین نیاز

پھر گلِ درد سرِ شام کھلا چپکے سے — میرے کانوں میں ہواؤں نے کہا چپکے سے
جب کبھی دل نے اُسے یاد کیا چپکے سے — ایک سایہ سا مری سمت بڑھا چپکے سے
کب بہار آئی یہ محسوس بھی ہونے نہ دیا — زرد موسم نے بدل ڈالی قبا چپکے سے
میں ابھی سوچ میں ہی تھا کہ اُسے دیکھوں گا — چاند نے اوڑھ لی بادل کی ردا چپکے سے
میں پتنگا تو نہ تھا شمع یہ ہوتا جو نثار — آگ میں اپنی جلا راکھ ہوا چپکے سے
زخم جاگیں گے اگر یاد کی آہٹ سن لی — کتنا اچھا ہو گذر جائے صبا چپکے سے
دھڑکنیں تیز ہوئیں خون کی گردش سے نیاز
میری سانسوں میں گھلی کس کی صدا چپکے سے

غزلیں

مجید ساقی

خواہشوں کی آگ میں جلتا ہوا اکثر لگا — آدمی ہر دور میں بس درد کا پیکر لگا
دور سے کتنا حسین تھا کس قدر تھا دلفریب — پاؤں جب رکھا تو شہر آرزو پتھر لگا
ٹھوکریں، مایوسی اور ناکامیوں کا غم ہی کیا — گردشِ دوراں نہ پایاب تو مجھے نشتر لگا
جب سے تیری یاد کے جلتے دیئے سب بجھ گئے — کیا بتاؤں کس قدر تاریک میرا گھر لگا
زندگی کی شام تو بے چینیاں دے کر چلی
[illegible] کا سورج نئی آفت کا [illegible]

بادۂ کہن

شیر محمد خاں ایمان

شیر محمد خاں ایمان (متوفی ۱۲۲۰ھ) عہدِ نظام علی خاں آصفجاہ ثانی کے باکمال سخنور تھے، وہ اپنے والد محمد عاقل خاں کے بعد شہر حیدرآباد کی وقائع نگاری اور اخبار گوئی کی خدمت پر مامور ہوئے۔ "بقول ڈاکٹر زور" دکن کے سارے واقعات ان کے دماغ کے خزانے میں محفوظ تھے' اس لیے دربار اور عوام دونوں جگہ ایمان کی قدر و منزلت یکساں تھی"۔ وزیر سلطنت ارسطو جاہ نے ایمان کو ان کی اعلیٰ حیثیت کے سبب اپنا متوسل بنالیا تھا۔ شعر فہمی اور شعر گوئی میں اپنے زمانے کے استاد اور میر تقی میر کے ہم عصر تھے۔ کلام میں شستگی، صفائی اور فن کی عظمت ملتی ہے: ایمان کے شاگردوں میں ماہ لقابائی چندا، محمد صدیق حسین قیس اور حفیظ الدین یاس ایسے نامی گرامی شعرا کے نام ملتے ہیں۔ ایمان کے کلام کا ایک انتخاب ۱۹۳۷ء میں "ایمانِ سخن" کے نام سے ادارۂ ادبیات اردو نے شائع کیا تھا جسے پروفیسر سید محمد مرحوم نے ترتیب دیا تھا۔

مرقع سخن جلد اول مطبوعہ ۱۹۳۵ء میں ایمان کی شخصیت اور فن پر سید اشفاق حسین کا مقالہ بھی شائع ہوا ہے۔ ایمان مثنوی، قصیدے، مرثیے اور مخمسوں کے علاوہ غزل کے بھی باکمال سخنور تھے۔ کلام کا انتخاب درج ذیل ہے:- (د، ع)

تجھ بن اے ساقی پیا ہم نے جو شب خونِ جگر
ہم پیالہ داغِ دل اپنا برنگِ لالہ تھا

چلنے لگی بادِ صبا غنچہ ہر اک کھلنے لگا
تو مجھ سے اے گل گوں قبا کب تک رہیگا ان ملا

ہاتھ سے کافر بتوں کے کیا کہوں ایمان اب
خانۂ دل جس کو کعبہ بولئے سو ڈھ گیا

خلقت میں اس کے ہرگز بوئے وفا نہیں ہے
جور و ستم ہزاروں میں نے سہا تو پھر کیا

برقع اٹھا جو رخ سے پری رو کے رات کو
اک اپنی کیا کہوں سبھی محفل نے غش کیا

تجھے جس روز سے دیکھا ہے نہیں اس روز سے پھر ہرگز
دم اپنا، ہوش اپنا اور دل اپنا جگر اپنا

کروں کیوں کر نہ ملنا ترک میں اب سارے عالم سے
مجھے رہتا ہے اندیشہ کسی کی بدگمانی کا

کیا ہم نے سب اس کی مرضی موافق
پہ اس کا مچلنا نہ زنہار چھوٹا

گھر سے جانے کا مرے عزم نہ کر آخرِ شب
کہ مسافر کو ہے چلنے میں خطر آخرِ شب

اب کی چمن میں آئی ہے وہ نو بہار مست
گل مست، غنچہ مست ہے اور خار خار مست

یہ بہارِ نوجوانی سمجھ اے صنم غنیمت
جو خوشی کے ساتھ گزرے وہی جانئے دم غنیمت

تندرستی بھی بڑی نعمت ہے
جان بہتر تو جہاں ہے بہتر

بتوں کے عشق میں کیا ہاتھ آئے گا پتھر
خدا کے واسطے ایمان کر خدا کی یاد

کیا قدر لعل کی ہے بدخشاں کے ملک میں
گر چاہتا ہے رتبۂ شاہی وطن کو چھوڑ

ہر رنگ پہ آتا ہے نظر اک دلِ پُر داغ
مژگاں ہیں تری یا ہیں خدنگِ پہلو دوز

دیکھ کرمانی و بہزاد ہیں نقشِ دیوار
یاد آتی ہیں عرق آلود وہ زلفیں مجھ کو

ظاہر کے عز و شان پہ نہ جاؤ تو ہما کو دیکھ
زاہد بہک گیا ہے یہ جوشِ بہار میں

غمزہ، ادا، نگاہ، تبسم، خرام سے
عمر بھر ساقی نہ چھوڑیں میکدے کی بندگی

عرصۂ ہستی میں کچھ مختار ہوں بھی اور نہیں
وصل سے ہوں دور اب تک باوجودِ اتحاد

حوصلہ روشن ہے میرا تجھ پہ اے خورشید رُو
سوزشِ عشق کو اے بوالہوس آساں نہ سمجھ

تم ہو اور گلشن ہو اور نرگس کی ستھری کیاریاں
دیکھ بدمست ہے عنبر کے ہمراہ مدام

شتابی ساقیا مے لا نہ کر دل کو مرے میلا
طلوعِ مہر کا ناگاہ ہوتا ہے گماں ہم کو
عجب ہی اک ادا سے یہ نقابِ شوخ حسن اپنا

چہرۂ نور فشاں یوں ہے ترا زیرِ نقاب
ہجومِ ناتوانی باغ تک بھی کیا پہنچنے دے ؟

یہ مکافات کی ہے جانے نہ رہیو غافل
لیا دوستی میں تو پہلے دل ہوا اب وہ دشمن جان ہے

دشمن کا دل بھی دیکھ کے مجھ کو پگھل گیا
رگِ جاں پر ہے کون ناخن زن

تیرے گھر میں جستہ غم و رنج و بلا
کبھو حرم میں کبھو دیر میں تجھے پیارے

تو ہر زنہ گردشیوں کا واں تماشا دیکھ
تو نے جفا ہزار کی گرچہ ہماری جان پہ

یہ بھی کوئی شعور ہے تک تو سمجھ، خدا سے ڈر
روتے تو روتے نہ فقط دیدۂ تر بیٹھ گئے

کھینچی اللہ نے ایسی تری تصویر کہ بس
جب اندھیری رات میں ہو آسماں اختر فروش

ہوتا ہے بادشاہی کا ایک مشتِ پر سے فیض
مانگے ہے بادہ جبّہ و دستار کے عوض
میں ایک اپنی جان بچاؤں کہاں تک

ایک ہی پیمانے پہ کرتے ہیں یہ پیمانا ہم
سایہ آسا صاحبِ رفتار ہوں بھی اور نہیں

ساغرِ مے کی طرح میخوار ہوں بھی اور نہیں
مثلِ شبنم لائقِ دیدار ہوں بھی اور نہیں

یہ وہ آتش ہے سمندر کے بھی پر جلتے ہیں
یاں مری آنکھوں میں بھرتی ہیں وہ آنکھیں پیاریاں

شیشۂ دل کے تئیں چور کروں یا نہ کروں
امنڈتے اور گرجتے بطرح سے بادل آتے ہیں

نکل آئینہ خانے سے وہ جب صورت دکھاتے ہیں
چھپتے ہیں کھلتے ہیں کھلتے ہیں چھپتے ہیں

جیسے خورشید ہو دامانِ سحر کی تہ میں
اگر صیاد میرے فصلِ گل میں بال و پر کھولے

اپنے ہی سامنے یاں اپنا کیا آتا ہے
مجھ کو ابھی خبر نہ تھی کہ ہے صلح میں بھی خفا لگی

آیا نہ رحم حال پہ میرے مگر تجھے
کچھ صدا یاں رباب کی سی ہے

اور کچھ اے عشق سراپا بھی ہے
کہاں کہاں نہ لئے تیری چاہ پھرتی ہے

جہاں سے کوچۂ لیلیٰ کو راہ پھرتی ہے
ابھی دعا تو ہے یہی تیرا خدا بھلا کرے

تجھ سے جو کوئی وفا کرے اس سے ہی تو جفا کرے
یہ خبر کا وہ ہے کہ جس سے کئی گھر بیٹھ گئے

حیدرآباد کے شاعر (۱۸)

رؤف خیر

۱۹۶۲ء میں مطبوعہ ریاستی ساہتیہ اکیڈمی کے تذکروں کا سلسلہ

ملک کی تقسیم کے بعد پیدا ہونے والی نئی نسل میں رؤف خیر بھی شامل ہیں۔ یہ ۵ نومبر ۱۹۴۸ء کو پیدا ہوئے جبکہ حیدرآباد شاہی سے رشتہ منقطع کر رہا تھا۔ اور جمہوریت سے ناطہ جوڑ رہا تھا۔ پرانے اور نئے دور کی کشمکش کا تہذیب و تمدن کے ہر شعبہ پر اثر پڑا —— رؤف خیر نے مذہبی گھرانے میں آنکھیں کھولیں، حیدرآباد کے روایتی ماحول میں اُن کی ابتدائی تربیت ہوئی، خدا شناسی اور خود شناسی کے جذبات نے رُخ اور سمت اختیار کی۔ فوقانی درجوں میں تعلیم کے دوران شاعری اور فکشن سے شغف رہا۔ پڑھنے سے لکھنے اور پھر چھپنے کی طرف توجہ مرکوز ہوگئی۔ اوّل اوّل بیشتر قلمکاروں کی طرح رؤف خیر نے بھی بچوں کے لئے کہانیاں اور نظمیں لکھیں، پھر حیدرآباد کے نئے اور ترقی پسند ادبی ماحول سے تاثر لینا شروع کیا۔ یہاں کے مشاعروں میں شرکت کر کے اپنی شناخت کرانے میں کامیابی حاصل کی۔ جدیدیت سے مثبت انداز میں متاثر ہونے والے صالح نوجوان شاعروں میں ان کا نام جانا پہچانا ہے۔ مخدوم، جامی اور اوج یعقوبی کی فکرِ سخن نے انہیں راہ اور سمت سے آشنا کیا۔ ذوقِ مطالعہ، علمِ شعر کی نالج اور کلاسیک شناسی کی بدولت رؤف خیر نے بالآخر اپنا "لہجہ" بنالیا۔ نئی غزل، نظم، سانیٹ اور ترائیلے کہنے اور بہتر شعرا میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ معیاری رسائل و جرائد میں کلام بکثرت اور پھر کم کم چھپتا رہا۔ ریاستی اردو اکیڈمی کی اعانت سے پہلا مجموعہ "اقراء" بھی شائع ہوا۔ رؤف خیر جامعہ عثمانیہ ریاستی محکمۂ عدلیہ میں شیٹو گرافر کی حیثیت سے کارگزار ہیں۔ ان دنوں "اقراء" کی اشاعت [illegible] پاداش میں حکومت کے عتاب کا شکار ہیں۔ ابھرتے شاعروں میں [illegible] جانے پہچانے جاتے ہیں۔ چند غزلوں سے انتخاب ملاحظہ فرمائیے۔ (د م خ)

دل دُکھ نہ جائے بات کوئی بے سبب نہ پوچھ
خانہ بدوش لوگوں سے نام و نسب نہ پوچھ

بے گھر ہوئے ہیں دیدۂ بے خواب کے طفیل
اب جگنوؤں سے لذّتِ روداد شب

تیرے لئے ہوں آئینہ پاش پاش میں
کیا کیا ہے میرے واسطے ایک تیرا

پیاسے ہیں جیسے ایک سمندر میں رہ کے ہم
تیرے بغیر زندگی کرنے کا ڈھب

ہم خود شناس بھی ہیں زمانہ شناس بھی
اس مرحلے میں جان سے گزرے

○

ہزار تہمتیں بھی ملیں، گِلے بھی ہوئے
مری کتاب پہ دیمک کے تبصرے

خمارِ خواب کے بے خواب تجربے بھی ہوئے
وہ دن بھی کیا تھے ترے نام

تمام جھوٹی انا تھی، یہی تو اک سچ ہے
نہیں تو ہونا تھا رسوا تیرے

زمیں سے ربط مگر ٹوٹ ہی نہیں پاتا
دراز اپنی اڑانوں کے سلسلے

ہزار قرب کے پہلو تھے درمیان مگر
پہاڑ جیسی روایت کے فاصلے بھی ہوئے

○

وقت وہ سازگار تھا، یہ تو فضا ہی اور ہے
وہ جو شریکِ جرم تھا اس

سب ہیں اسیر ماؤ تو، چیختی آنکھیں کو بکو
میں کہ ہوں سُرمہ در گلو، میں

عکسِ ہوس ہے آنکھ پر، خاک ہے آفتاب پر
ٹھیرو کہ آسمان پہ تھوڑی

منفی راستوں پہ ہی چل کر میں یہ سمجھ سکا
کیفِ ادا مگر اور ہے لطفِ نوا ہی اور ہے

○

کیا کیا نہ اس نواح میں ہم سے گلے ہوئے
تیرے لئے بنائے گئے تھے

میدانِ جسم و جاں میں بڑے معرکے ہوئے
ہم سے کبھی وہ صلح کے قا

ان بے ٹھکانیوں نے مجھے لامکاں کیا
پاؤں کہیں زمیں کہیں

اس پیرِ تسمہ پا کا ہمیں نے کیا لحاظ
ہم اور ورنہ رہے تھے

سجدہ گزار ہے تری چوکھٹ پہ چاندنی
مٹی کے اپنے پاؤں میں پتھر بندھے ہوئے

رنگ رنگ
اس عنوان کے تحت ہند و پاک کے معیاری ادبی رسائل و کتب سے مضامین، نظم و نثر کا انتخاب شائع ہوا کرے گا
(ادارہ)

انجم اعظمی

جدیدیت

آزادی کے بعد برصغیر کی زندگی ایک پُر آشوب دور سے گزر رہی ہے۔ اس نے بحیثیت مجموعی قدیم کو رَد کر دیا ہے اور جدید کو اپنانے کی ہمت نہیں رکھتی۔ ...لے میں شاعر اور ادیب کا کام آسان نہیں لیکن بنیادی ہے۔ اس کے بغیر جدید کی بصیرت اور اسے اپنانے کی ہمت کسی قوم میں پیدا نہیں ہوتی۔

صنعتی انقلاب کے بعد سے دنیا میں جس بڑے پیمانے پر ٹکنالوجی نے ترقی کی ہے اور آبادیوں کے نقشے میں جو فرق پڑا ہے اس سے زندگی کی ...یکسر بدل گئی ہیں۔ فرد کی آزادی کا مسئلہ ہمیں جمہوریت کے نت نئے تجربوں سے گزار رہا ہے۔ فرد کی آزادی کا اہم تقاضا یہ بھی ہے کہ فرد معاشی استحصال ...ت پاکر حقیقی معنی میں آزاد ہو۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ اشتراکی انقلاب کی راہ ہموار ہوئی۔ حیاتیات، طبعیات، نفسیات، عمرانیات اور دوسرے ...ں جو تحقیقات اور دریافتیں ہوئیں ان کے سبب اس عہد کے انسان کے فکر و احساس میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ برصغیر کی زندگی بھی ان ...ثر ہوئی۔ ڈارون، مارکس، فرائڈ، آئن اسٹائن، سارتر، ہیڈیگر وغیرہ کے نام عام طور پر مستعمل ہو گئے۔ ان کے حوالے دیئے جانے لگے لیکن جس حد تک ...ا زندگی جدید علوم سے واقفیت اور ٹکنالوجی کے عام استعمال میں پیچھے ہے اور جمہوریت اور اشتراکیت کے اصولوں سے پوری طرح استفادے کی صلاحیت پیدا کر سکی ہے، اتنا ہی اس کا رشتہ اس ماضی سے قائم ہے جو ہمارے درمیان بے روح رسم و رواج سے عبارت ہے اور مذہبی، نسلی اور علاقائی تعصبات کو ...نے کا ایک ذریعہ ہے۔

اپنے سارے محرکات کی بناء پر عہد جدید کی سب سے اہم خصوصیت رفتار ہے۔ زندگی کی رفتار آج بہت تیز ہے۔ گزری ہوئی صدیاں ایک طرف ...نا کے مقابلے میں اس صدی کے دس سال کہیں زیادہ تبدیلیوں سے دوچار ہوئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج کی زندگی اپنی تیز رفتاری میں سب ...سے جائے گی۔ آدمی اس پر قابو پانا چاہتا ہے لیکن اس کا طریقہ کیا ہو — یہ ایک ایسا سوال ہے جس کے جواب کی تلاش میں عہد جدید کا انسا... ...ہے کسی ایک معاشرے کے اندر واپس ماضی کی طرف لوٹ جانے سے اس کا کوئی حل نہیں نکل سکتا۔ کیونکہ اس رویے کا زندگی کی رفتار پر کوئی ...ا نہیں پڑتا۔ وہ اپنے جدلیاتی عمل میں ہر رکاوٹ کو دور کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ زندگی کی رفتار پر قابو پانے کے لئے زندگی سے بھرپور آگاہی اور ...وابستگی کی ضرورت ہے۔ سب سے پہلے ہم میں اس عہد کی بصیرت اور جدید کو اپنانے کی ہمت پیدا ہو تو زندگی کی جو رفتار باہر سے نظر آتی ہے اور ...یران و ششدر بنائے ہوئے ہے، وہ خود ہمارے وجود کے اندر موجود ہوگی اور اس طرح رفتار کا مسئلہ ختم ہو سکتا ہے کیونکہ ہمارے ...ر اندر کے نظام میں فرق کا ہی دوسرا نام رفتار کی تیزی کا احساس ہے۔

عہد جدید کی دوسری خصوصیت مسلّم روایات سے انکار ہے۔ مابعد الطبیعیاتی، اخلاقی، سیاسی، تہذیبی، قانونی، معاشرتی، جنسی اور ...اقدار سے مکمل انکار — اس انکار کی قوت نے قدیم کو رَد کرنے کی صلاحیت پیدا کی لیکن مغرب میں یہ انکار بجائے خود ایک مسئلہ کی ...نا اختیار کر گیا۔ وجودیت، ناذم اور ہپی ازم اس کی دو انتہائی شکلیں ہیں جو انکار کی تمام خصوصیات رکھتی ہیں لیکن اس طرزِ زندگی کو اپنانے والے

خود جنھیں جاننے کہ زندگی کس طرح گزاری جائے۔ جس کی وجہ سے ہپّی ازم کو مغرب میں آج وہ فروغ حاصل نہیں ہے جو ابتدا میں نظر آ وجودیت پسندوں کے ایک گروہ کے رہنما ہیڈیگر ہیں جو دروں بینی میں اس کا حل تلاش کرتے ہیں لیکن دروں بینی انھیں انسان کی عظمت سے آشنا کرنے کے بجائے ناامیدی کے ایسے غار میں لے گئی ہے جہاں زندگی کی بے معنویت کا گہرا اندھیرا چھایا ہے۔ ہیگل کی شک وہ احساس وجود اور مطلق نہیں ہے کہ بحث چھیڑ کر زندگی اور اس کی کشاکش سے بے نیاز ہو گئے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اا جنی اس خارجی کا ردعمل تھی جو انھیں راس نہیں آیا حالانکہ ہیگل کے مقابلے میں ان کی عینیت پسندی کی بنیاد بہت کمزور ہے۔ ہیگل کی جدلیات بہرحال زندگی کا عظیم ڈرامہ ہے لیکن ہیڈیگر نے اس عظیم ڈرامے سے خوف زدہ ہو کر اندرونِ ذات پناہ لی۔ اور دروں بینی کے عمل میں ان مثبت پہلوؤں اور بے حد و حساب امکانات کا جائزہ نہ لے سکے جن کے سبب آدمی آنے والی صدیوں کا مالک بنے گا۔ اور جب کارواں آگے بڑھتا جائے گا اگر ایک طرف اپنی تمام تر وسعتوں کے ساتھ باطن کے آئینے میں منعکس ہوگا تو باطن بھی اپنے آپ کو خارج چلا جائے گا اور اسے اپنے آپ سے علیحدہ نہیں ہونے دے گا۔

دراصل صرف انکار سے بات نہیں بنتی۔ انکار کسی چیز کو رد کرنے کا نام ہے۔ ماضی کے پھیلے ہوئے تارِ عنکبوت کو پوند رد کرنا عہدِ جدید کا ایک عظیم کارنامہ ہی لیکن اس میں جکڑے ہوئے انسان کو آزاد اور اسے نئی قوت اور بصیرت عطا کئے بغیر عہد ادھورا اور ناقص عہد ہے۔ اس کی تکمیل انکار کی منزل سے آگے کسی اثبات سے ہی ممکن ہے جو ایک نئے اقرار سے پیدا ہو رہا۔ اپنے عمل، اپنی سوچ اور مستقبل کی راہ استوار کرنے میں مکمل طور پر آزاد ہے۔ یہ آزادی، انارکی اور غلامی کے درمیان روشنی کی ایک لکیر صدیوں کے تجربات سے روشن ہو کر آنے والی صدیوں میں کھینچی ہوئی ہے۔ نظریۂ اضافیت سے، جو طبیعیات کی ایک اعلیٰ ترین تحقیق ہے۔ اا عہد وابستہ ہو گئی ہے حالانکہ اضافیت نے بدلتی ہوئی زندگی اور اس کی قدروں کو قبول کرنے کی ایک ایسی منطق کو جنم دیا ہے جو مستقبل رشتے کو روز بروز گہرا کرتی جا رہی ہے اور مطلق سے انکار کر کے انسان کی آزادی کے گرد لپٹی ہوئی سب سے مضبوط زنجیر کو توڑ چکی ہے ہمارے معاشرے میں تصوّف سے بڑھتی ہوئی وابستگی روایت کی پاسداری کے بجائے ماضی کے تارِ عنکبوت ہی کا پھیلاؤ ہے۔ جو معاشی اور سیاسی استحصال عام ہو تو جینے کا سہارا کیا ہو اور جب نئی قدریں ابھاگر نہ ہوں اور جدید کو اپنانے کی ہمت نہ ہو تو لوگ بازار میں بے شرمی سے فروخت ہو جاتے ہیں یا پناہ ڈھونڈنے والے مطلق میں پناہ ڈھونڈ لیتے ہیں اور اس جدید کو انکار کرتے ہیں جو اداس اور منفی صورت میں انھیں ملا ہے۔

اس عہد میں منطق کا انکار منطق ہی کے بل بوتے پر کیا گیا۔ انکار کرنے والوں کے ذہنی انتشار سے قطع نظر اس منطق کا اقرار اور کس طرح ممکن تھا۔ البتہ جب منطق کا استعمال حقائق کی پہچان ہی کے بجائے اپنے مفروضوں کو حقیقی ثابت کرنے اور ماضی کو جوں کے توں کیا گیا تو اس کے خلاف شدید ردِ عمل ہوا اور سرے سے منطق ہی کا انکار کر دیا گیا۔

انکار کا ایک پہلو شعور کی رہنمائی سے انکار اور لاشعور کی بے پناہ قوتوں کا اقرار ہے۔ لاشعور کو اگر انسان کی خفتہ صلاحیتوں کا نا انسانی شعور اسے احاطہ نہ کر سکے تو ایسے شعور کو رد کر دینا ہی بہتر ہے لیکن تحلیل نفسی کو برتنے کی جو روایت مصوّروں، شاعروں اور فن کاروں کے یہاں ملتی ہے۔ اس میں شعوری طور پر بے ترتیبی اور جبلت کو قبول کرنے کا رجحان ملتا ہے جبکہ تخیلِ انسانی ذہ اور اس کے امکانات کو ملا کر ایک نئی صورت تخلیق کرتا ہے جس کی اصل خارج کی اصل سے کہیں زیادہ گہری اور بامعنی ہوتی ہے۔ شعور اور لاشعور دونوں ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں۔ تحلیل نفسی نے تخیل کے اس تخلیقی عمل کو جس کا اظہار فن کی صورت مصوروں اور شاعروں کے شعوری عمل میں تبدیلی کر کے فن کو شدید ٹھیس پہنچائی اور فن جو زندگی اور اس کے امکانات کو نئی صو

رجحانات کو حسن کے معیار اور کسوٹی پر پرکھتا اور خاموشی سے تبدیل کرتا آیا تھا، تحلیلِ نفسی کے گورکھ دھندے میں اُلجھ کر اپنی ڈگر سے ہٹ کر انسان کی خفتہ صلاحیتوں کو جگانے کا اہل نہ رہ گیا۔ تحلیلِ نفسی کے سارے عمل میں ادھوری بے اثر اور غیر متحرک جنسی تاویلات کے علاوہ کچھ نہ ملے گا جبکہ تخیل ہی خفتہ صلاحیتوں کو بیدار کر کے آگہی کے تیز سیل میں اس طرح شامل کر دیتا ہے کہ اس کی تازہ ترین دریافتیں اس سیل کی سطح سے نمایاں طور پر ابھرتی ہیں۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ فرائڈ نے فن کا کوئی نظریہ پیش نہیں کیا تھا بلکہ انسان کے اندر دبے ہوئے جنسی رجحانات کی نشاندہی کی تھی جو ایک ایسے ماحول کی پیداوار تھے جہاں انسان معاشرتی اور اخلاقی طور پر آزاد نہیں تھے لیکن فرائڈ کے ماننے والوں نے مبالغہ سے کام لیا اور اس کی تحقیق سے ایک نظریہ تراش کر قوتِ انکار کو تقویت دی۔ جبکہ فرائڈ نے اپنے آخری تجزیے میں جنس کو بنیادی حیثیت دے کر گوشت پوست کے انسان کا اقرار کیا ہے اور فرائڈ کے لاشعور کو تحلیلِ نفسی کے بجائے فن کی مسلسل تخلیق کے ذریعہ چھایا جا سکتا ہے جو زندگی کے ہر موڑ پر موجود اور اس کے امکانات کو ملا کر ایک نئی دنیا کو ہماری بصیرت پر منکشف کرتا رہا ہے۔ اسی رعایت سے فن کو زندگی کا اگلا قدم قرار دیا جاتا ہے۔

شعور اور لاشعور کے درمیان زندگی کا جدلیاتی عمل مسلسل جاری رہتا ہے اور ان کی ہم آہنگی کی سطح ایک نیا تخیل (CREATIVE SYNTHESIS) ہے جس کے اظہار کا نام فن ہے لیکن المیہ تو یہ ہے کہ لاشعور کا اقرار کرنے والے اس سے محض انکار کی قوت میں اضافہ کا کام لیتے ہیں، کسی حقیقی اقرار کی طرف نہیں اٹھاتے۔ لاشعور، شعور اور فن کا رشتہ نہیں جوڑ پاتے اور مستقبل کی طرف سے آنکھیں بند کر کے سمجھتے ہیں کہ دروں بینی کی تپسیا میں صادقین اور عارفان حاصل کر چکے ہیں وہ اس سوال سے بھی بے نیاز ہیں کہ اجتناب کے غاروں میں جنس کے موضوع کو کس طرح اعلیٰ ترین روحانیت کی منزل ملی اور اس میں اس کنار کا تصور ہے جسے انسانی تخیل نے بڑی ہمدردی سے تخلیق کیا ہے۔ دراصل دروں بینی کے عمل میں نقطۂ حال کے آگے اور پیچھے ماضی اور مستقبل کے لامتناہی سلسلے۔ انکار کی منزل میں اٹک جانے والوں کا مستقبل سے تو کوئی تعلق ہوتا ہی نہیں، البتہ ماضی کو بھی تمام رد کر دینا بصیرت سے منہ موڑنے کے مترادف ہے نفی کی صرف اس صورت کو رد کرتے ہیں جو حال کے گرد مکڑی کے جالے کی طرح لپٹی ہوئی نظر آتی ہے ورنہ تاریخ کی بے پناہ قوت سے کون ناواقف ہے۔ انکار کے معنی اپنے وجود کے پھیلاؤ سے انکار ہے لیکن نقطۂ حال پر ٹھہر جانے اور ماضی اور مستقبل سے بے نیازی کا نتیجہ اس کے علاوہ اور کچھ بھی کیا ہوتا ہے۔

مابعد جدیدیت کا نظریہ ہر طرح کے استحصال کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کی کوششوں کے بامعنی ہونے سے بھی انکار پر مبنی ہے جو استحصال کو مٹانے کے درپے ہیں۔ ہپیوں کی یہ فکر مغرب کی اس معاشرتی زندگی کی پیداوار ہے جس نے استحصال کو اپنے معاشی، سیاسی اور تمدنی ڈھانچے میں جائز قرار دے رکھا ہے۔ اس ماحول میں ازم زندگی کو اپنے وجود (نقطۂ حال) تک ہی محدود رکھتا ہے۔ آنے والی صدیاں ان کے دائرہ فکر سے باہر ہیں۔ وہ تاریخ کے اس عظیم دھارے سے الگ ہوا فرد ہے جو مغرب و مشرق کے امتیاز کو مٹا کر ماضی سے مستقبل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس کے تخیل اور فن کا دائرہ بھی اس کی فکر ہی کی طرح محدود ہے اس کے برخلاف وہ لوگ جو فرد کی زندگی کو محدود اور انسان کو ماضی اور مستقبل کا مالک سمجھتے ہیں، مروجہ اقدار سے ہٹ کر بھرپور زندگی گزارنے کی سعی و کاوش میں ایک بامعنی زندگی گزارتے ہیں اور ان کی بدولت فن کی آب و تاب میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ ان کے یہاں انکار کی قوت اور اقرار کے حوصلے میں ایک میزان ہوتا ہے۔

۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب کے بعد یکے بعد دیگرے کئی ملکوں میں سوشلسٹ انقلاب آ چکا ہے جو فرد کی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لئے اجتماعی قوتوں سے نبرد آزما ہے۔ اشتراکی معاشرے اپنی اپنی تکمیل اور تعمیر کے کام میں مصروف ہیں۔ بعض اوقات ان سے غلطیاں بھی سرزد ہوتی ہیں مثلاً نظموں اور کہانیوں پر مبلغانہ نظموں کو فن کا درجہ دیا جاتا ہے جب کہ فن اس حقیقت کی دریافت کا نام ہے جو موجود اور اس کے امکانات سے مل کر ایک نئی بصیرت سے ہم کنار کرتی ہے۔ ہمارے ملک میں بے شمار اشتراکی نظریے کا دعویٰ کرنے والے اپنے معاشرے اور عہد سے بیگانہ

صورت حال سے آگاہی کے بجائے ہیجان انگیزی کا شکار ہیں۔ نہ معاشرتی طاقتوں کی بدلتی ہوئی قدروں کا کوئی خاکہ ان کے سامنے ہے، نہ پھیلتے بڑھتے ہوئے جدید علوم کے دائروں کا۔ انھیں جدید علوم میں ہونے والی نت نئی تحقیقات اور ان کے آپس کے رشتوں کا کوئی حال معلوم نہیں اور نہ ان کی پہچان میں کی طرف کوئی توجہ دیتے ہیں۔ وہ نہ تو استحصال کی ساری پیچیدگیوں سے واقف ہیں اور نہ فن اور فن کے معیار سے کوئی آشنائی ہے بس مزدوروں اور کسان کا ورد کرتے ہیں اور ایک خیالی انقلاب کا فیشن ایجاد کرکے اشتراکی سے غیر اشتراکی بن چکے ہیں۔ ناسمجھی کی اس فضا میں جو ملائیت پروان چڑھی ہے اس کی بنیاد جدید روایت پرستی ہے۔ وہ اپنے عہد سے بہت پیچھے ٹھہر گئے ہیں اور استحصال کو ختم کرنے کی کوشش میں فعال کردار ادا کرنے کے بجائے استحصال کے نگراں بن گئے ہیں اور جو لوگ واقعی استحصال کو مٹا کر انسان کو آزادی دلانا چاہتے ہیں اور انسان کے جدید و قدیم سرمایے کی حفاظت کرنا چاہتے ہیں یہ ان کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ہیں اور زندگی کے جدلیاتی عمل میں اپنا منفی رول ادا کرتے ہوئے زندگی کی پیکار میں انسان کی جانب سے شریک ہونے والوں پر شبخوں مارتے رہتے ہیں اور اس بات سے بالکل بے خبر ہیں کہ اشتراکیت ان کے معتقدات کے بجائے فرد کی مکمل آزادی اور بقا کے شعور کا نام ہے

عہد جدید دراصل اس انسان کا عہد ہے جو اپنے مسائل خود اپنی مسلسل کاوش سے حل کر رہا ہے اور ان کا شعور رکھتا ہے۔ وہ رفتہ رفتہ تضادات سے باہر نکل رہا ہے اور قدیم و جدید علوم کے سارے سرمایے کو اپنی بقا کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ معاشی انصاف کے کیا معنی ہیں، سیاسی حق سے کیا مراد ہے، عورت اور مرد کا رشتہ کیا ہے، اخلاق کا مفہوم کیا ہے، نیک و بد کی میزان کیا ہے، سچ اور جھوٹ میں تمیز کس طرح کی جائے انسان کس حد تک خارج میں اور کہاں تک باطن میں پھیلا ہوا ہے۔ مابعد الطبیعیاتی سہاروں کو رد کرکے ایسے سیکڑوں سوالوں کا جواب تلاش کرتے ہوئے اس نے یہ بنیادی نکتہ پالیا ہے کہ اسے سیاسی، معاشی، جنسی، تہذیبی اور معاشرتی زندگی میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا اور نہ طبقہ، نسل، رنگ، خون اور مذہب کے تعصبات میں بانٹا جاسکتا ہے۔ وہ ایک مکمل اکائی ہے جو اپنی بصیرت چاہتا ہے اور اس بصیرت کی ضمانت وہ متحرک اور فعال فن ہے جس کی بنیاد آگہی کے انسان کا تخیل ہے اس تخیل سے محرومی آج کے فن کار کی سب سے بڑی محرومی ہے۔

ہمارا ادیب زندگی کی دوڑ میں بہت پیچھے ہے۔ فرد معاشرے سے اور معاشرہ فرد سے کٹا ہوا ہے۔ آبادی کا بڑا حصہ حرص، دولت اور خود غرضی کے جنگل میں پھنسا ہوا ہے۔ اس کے پاس کوئی خواب نہیں۔ دردمندی کی بے بہا دولت ضائع ہو رہی ہے۔ یہ کام ہمارے شاعروں، مصوروں، دانشوروں اور ادیبوں کا ہے کہ اسے ایسے خواب بخش دیں جو اس کی زندگی کو فعال بنا سکیں۔ فن اس انسان کا اقرار ہے جس نے آج تک کبھی حوصلہ نہیں ہارا۔ فن میں اگر یہ قوت پیدا نہ ہو سکے تو صرف رنگوں اور لفظوں کے بیکار کھلونوں سے بھی بدتر ہیں ●●

(ماہنامہ "فنون" لاہور اکتوبر، نومبر ۱۹۷۷ء)

فضا ابن فیضی

غزل

چٹان تھا میں، ہواؤں سے ڈر گیا کیسے
بدن غبار کی صورت بکھر گیا کیسے

یہ بات میرے سوا کوئی اور سمجھ کیا
قلم کا زہر، لہو میں اتر گیا کیسے

کل اس سے مل کے میں آتش بجاں ہوا کتنا
وہ خود تو پھول تھا، شعلے کتر گیا کیسے

ابھی کھڑے ہیں کناروں پہ ڈوبنے والے
میں سوچتا ہوں کہ طوفاں گزر گیا کیسے

بہ کارِ خویش بہت ہوشیار تھے ہم لوگ
ہماری آنکھوں میں وہ دھول بھر گیا کیسے

ہمیں تھے جس نے اسے قطرہ قطرہ پی ڈالا
نہ پوچھو وقت کا دریا اتر گیا کیسے

(ماہنامہ آہنگ، گیا)

نقد و نظر

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں۔)

تاؤتے چنگ (چینی کلاسک)

مصنف:۔ لاؤتسُو مترجم۔ یوسف حسین خاں۔ صفحات (۱۴۲) کراؤن پاکٹ سائز
مجلد قیمت ۹/- روپے ناشر: ساہتیہ اکیڈمی۔ نئی دہلی

زیر نظر کتاب چینی فلسفہ کے شہ پاروں کا مجموعہ ہے۔ اس کا مصنف (لاؤتسُو) پانچویں یا چھٹی صدی قبل مسیح کا منطقی دانشور تھا۔ لاؤتسُو کے عہد میں معاشرہ غلامی سے نکل کر جاگیردارانہ عہد میں داخل ہو رہا تھا اور طبقاتی جنگ رفتہ رفتہ تیز ہو رہی تھی۔ پرانے دستورِ حکومت اور رسم و رواج مردہ ہو رہے تھے اور ایک نیا سماج تشکیل کے کرب میں تھا۔ لاؤتسُو کا اعتقاد پرانے سماج کی استواری اور نئے تشکیل پذیر سماج سے عدم مطابقت پر تھا۔ لاؤتسُو نے اپنے فلسفیانہ شہ پاروں میں انسان کو کبر و غرور سے بچ کر حلیم اور منکسر المزاج ہونے کی تعلیم دی ہے۔ چین میں بدھ مت کی ابتدائی تبلیغ کے وقت لاؤتسُو کے اصولوں نے بیج کی کرنوں کا کام کیا۔

مشہور ہندوستانی مورخ، دانشور ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے لاؤتسُو کے مقالہ "مراطِ حقیقت اور اس کی فضیلت" تاؤتے چنگ کا ترجمہ خاصی محنت اور فکر و نظر کے ساتھ کیا ہے (۸۱) فرمودات کو تشریحی نوٹ کے ساتھ شامل کیا گیا ہے۔ ایک نمونہ مشتے نمونہ از خروارے کے مصداق نقل کیا جاتا ہے "پیدائش کے وقت انسان نرم اور کمزور ہوتا ہے، مرنے پر وہ سخت ہو جاتا اور اکڑ جاتا ہے۔ دس ہزار کائنات پودے اور درخت جب زندہ ہیں، ملائم اور نازک ہوتے ہیں، مرنے پر وہ خشک ہو جاتے اور چھلکے بن جاتے ہیں۔ جو سخت اور اکڑا ہوا ہے وہ موت کا پیرو ہے۔ جو نرم اور کمزور ہے وہ زندگی کا پیرو ہے۔ چنانچہ جو ہتھیار حد سے زیادہ کڑا ہوتا ہے، وہ ٹوٹ جاتا ہے۔ جو درخت حد سے زیادہ سخت ہوتا ہے وہ بھی ٹوٹ جاتا ہے بجز چیز سخت اور کڑی ہے وہ نیچے رکھی جاتی ہے۔ جو ملائم اور کمزور ہے وہ اوپر رکھی جاتی ہے"۔ اس طرح چینی کلاسیکی فلسفے کے شاہکار نمونے اس کتاب میں شامل ہیں ایسی کتابوں کا بار بار مطالعہ فکر و نظر کو بالیدگی، بصیرت اور شعور عطا کرتے ہیں۔

(د ، ع)

ابر نیساں

مصنفہ طیبہ خسرو۔ قیمت ۱۰/- روپے۔ ملنے کا پتہ:۔ خدیو منزل، بنجارہ ہلز، روڈ نمبر ۱، حیدرآباد
طیبہ خسرو اس عمر کی چند دنوں سے کچھ زیادہ ہی چھپ رہی ہیں اور اپنے سادہ اور شستہ انداز تحریر کی وجہ سے شہرت و مقبولیت بھی حاصل کر رہی ہے۔

عرصہ پہلے طیبہ صاحبہ کی نگارشات کا پہلا مجموعہ ”جو ہی کی ڈالی“ شائع ہوا تھا۔ اب وہ خاکوں کا مجموعہ ”ابرنیساں“ لے کر ادبی دنیا میں وارد ہوئی ہیں۔ ویسے یہ الزام ابرنیساں کے پیش نظر طیبہ صاحبہ پر بآسانی لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے بیشتر رشتہ داروں کو اپنا موضوع بنایا ہے لیکن اس حقیقت کو کیا کیجیے کہ جن شخصیتوں کو موضوع بنایا گیا ہے وہ تمام کی تمام قد آور شخصیتیں ہیں اور طیبہ صاحبہ ان ہستیوں کی بجائے دوسری شخصیتوں پر قلم اٹھاتیں تو یقیناً ”چشم پوشی“ کا الزام ان پر عائد ہوتا۔ بہرحال ابرنیساں کے خاکے موضوعات کے اعتبار سے اہم ہیں اور بقول مصنفہ ”جو ہی کی ڈالی“ کے بعد میری یہ حقیر ادبی کاوش بھولے بسرے دنوں کی یاد بھی تازہ کردے گی۔ وہ یادیں جن کی وسعتیں بے کنار ہیں اور جن کی کیفیتیں گوناگوں ہیں۔“

”ابرنیساں“ میں مس لیلیٰ، جہاں بانو نقوی، زینت ساجدہ، فیروز جیلانی، ممتاز ناجرہ، قمرالنساء عباسی، طیبہ بیگم چشم بدور کے زیرعنوان اور میری مقدس ماں کے زیرعنوان سکینہ بیگم کے علاوہ نواب عماد الملک، ڈاکٹر خدیو جنگ، نواب علی یاور جنگ، سید حسین ظہیر، بشیر النساء بشیر، صغرا ہمایوں مرزا، سعد اور رشید احمد صدیقی شامل ہیں۔ چشم بدور کی شخصیتوں کے سہارے طیبہ نے ماں لب علمی کی یادوں کو تازہ کیا ہے اور کلیتہ اناث کے رومانی اور علمی ماحول کی مؤثر عکاسی بھی کی ہے۔ سکینہ بیگم، عماد الملک، خدیو جنگ، علی یاور جنگ اور حسین ظہیر ایسی شخصیتیں ہیں جن کے علمی کارنامے بے شمار ہیں۔ بشیر، صغرا اور رشید احمد صدیقی جیسی علمی و ادبی ہستیوں نے عقل و دانش کے چراغ روشن کیے۔ ”سعد! تم چپ کیوں ہو“ طیبہ کا ایسا خاکہ ہے جو فن کے معیار پر پورا اترتا ہے۔ یہ خاکہ طیبہ کے دل کا آئینہ ہے جس میں سعد کا عکس اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ اس خاکہ کی شمولیت نے جہاں ”ابرنیساں“ کو معیاری بنا دیا ہے وہیں فن خاکہ نگاری میں طیبہ کے مقام کا تعین بھی کرتا ہے۔ اگر اس خاکہ کے اسلوب و انداز کو وہ مستقلاً اپنالیں تو یقیناً وہ ہماری بہترین خاکہ نگار کہلائی جائیں گی۔ (طیب انصاری)

”لمحہ لمحہ“ (شعری مجموعہ) مصنف: عزیز بھارتی۔ ناشر: مرکز ادب حیدرآباد۔ صفحات (۱۱۲) قیمت ۱۰/ روپے

پیش نظر تصنیف عزیز بھارتی کا پہلا مجموعہ کلام ہے جس میں غزلوں کے علاوہ رباعیاں اور گیت بھی شامل ہیں لیکن شاعر کا میلان زیادہ تر غزل کی طرف ہے۔ ”لمحہ لمحہ“ کا پیش لفظ ڈاکٹر زینت ساجدہ نے لکھا ہے۔ اور علی احمد جلیلی نے ”عزیز بھارتی ایک جائزہ“ کے عنوان سے اظہار خیال کیا ہے۔ عزیز بھارتی حیدرآباد کے ایک ابھرتے شاعر ہیں وہ نئے الفاظ کو برتنے، نئی ترکیبیں تراشنے اور مضامین کو انوکھے ڈھنگ سے پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ عزیز اس گروہ کے شاعر نہیں ہیں جنھوں نے محض روایتی شاعری کو اپنے سینے سے لگائے رکھا ہے۔ دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

میرے ہمراہ نہ چلئے کہ میری راہوں میں ؛ دور تک دھوپ ہے بے سایہ شجر پڑتے ہیں
ایسے منظر کو تراشو کہ مری آنکھوں سے ؛ ایک لمحے کے لئے بھی نہ وہ منظر نکلے

غزل کے لیے جہاں خلاقی، دلسوزی اور ریاضت کی ضرورت ہے۔ عزیز کے ہاں اس کا فقدان محسوس ہوتا ہے وہ غزل کی روایت اور اس کے کلاسیکی سرمائے کو قدر کی نگاہوں سے دیکھنے کے بجائے اپنے دور کے پسندیدہ رجحانات سے رشتہ قائم اور ہنگامی مقبولیت ان کا مطمع نظر بن جاتی ہے۔

”لمحہ لمحہ“ میں بھرتی کے اشعار خاصی تعداد میں راہ پاگئے ہیں۔ غیر موزوں الفاظ کی بدولت جگہ جگہ اکھڑی اکھڑی سی کیفیت اور کھردرے پن کا احساس ہوتا ہے۔ بعض اشعار کچھ عجیب ہوگئے ہیں۔ مثلاً

لے کر ہم اپنے ہاتھ میں کنجی حیات کی ؛ ناحق مقدرات کے تالوں میں کھو گئے

وبیان اور کتابت کی بعض غلطیوں سے قطع نظر اس مجموعہ کلام میں ایسے اشعار بھی خاصی تعداد میں ملتے ہیں جو
ت متوجہ کر لیتے ہیں۔ بہر حال عزیز بھارتی کے ادبی سفر کا یہ پہلا سنگ میل ہے منزل نہیں۔ جوں جوں ان کے خیالات
پختگی اور جذبات و احساسات میں گہرائی اور گیرائی پیدا ہوگی فن میں بھی معنویت اور نکھار آئے گا۔ (محمود علی اثر)

...میں اردو

بمصنف ایم۔ اے نفر　ناشر۔ وارثی پبلیکیشنز کلکتہ　قیمت ۱۵ روپے

زیر تبصرہ کتاب مغربی بنگال میں اردو کی اشاعت کے سلسلہ میں جو کاوش کی جا رہی ہے اس کا تفصیل
. اردو ادب کا اس صوبے میں کیا مقام ہے اور اس کو اردو سے کس قسم کا لگاؤ ہے تفصیل سے ظاہر کیا گیا ہے۔ اُن
دیبوں کے حالات زندگی اور کارناموں کو بڑی خوش اسلوبی سے پیش کیا گیا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ ان کی قلمی تصویریں
ہیں گویا تاریخ ادب اردو میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا گیا ہے۔ کتابت و طباعت اچھی ہے لیکن جلد بندی ناقص
بے نشان غائب ہو گئے ہیں اور سب سے قابلِ اعتراض بات اس کی قیمت ہے جو اس مفید معلوماتی کتاب کی
ا ہو گئی ہے۔

(غلام جیلانی)

...ح (شعری مجموعہ)

شاعر۔ ناظم سلطانپوری۔ قیمت۔ دس/ پندرہ/ تیس روپے
ملنے کا پتہ:۔ سہیل پبلیکیشنز، ۱/۳۱، محمد علی روڈ، خضر پور، کلکتہ ۲۳

مظہری، مجروح سلطانپوری، ڈاکٹر ظ۔ انصاری، ڈاکٹر جاوید نہال اور ضیا عظیم آبادی نے اس کتاب پر مختلف عنوانات
صاحب کے فکر و فن کے بارے میں لکھا ہے۔ خود ناظم سلطانپوری نے بھی دو دو باتیں کی ہیں جس میں ان کا مکمل تعارف
کلکتوی کے دبستان سے وابستہ ہیں مگر اس سے برگشتہ ہو کر شاکر کلکتوی سے تعلقات شاگردی استوار رکھے ہیں۔
باغیانہ طبیعت کے جوہر یہاں بھی ٹکنے نہیں دیتے اور وہ اپنے مشاہدات و تجربات ہی کو اپنا استاد مانتے ہوئے
یں کا تنہا مقابلہ کرنے پر تل جاتے ہیں۔ ان کا یہ مجموعہ "حرفِ آگہی" ان کی ۲۵ سالہ ادبی کاوشوں کا نتیجہ ہے
آتا ہے۔ وہ شعر کہتے ہیں اور بڑے رواں دواں کہتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ناظم صاحب "اسم با مسمّیٰ" ہیں۔ ان
چھے ہیں۔ جیسے ؎

اقتضا وقت کا جو چاہے کرالے ورنہ ÷ ہم نہ تھے غیر کے احسان اٹھانے والے
یہ جہاں پتھروں کا نگر ہی تو ہے ÷ سانس لینا یہاں اک ہنر ہی تو ہے
ہیں سے صبح بنارس، ہیں سے شام اودھ ÷ ہیں سے دلّی کی گلیاں حسیں تھیں تاجور رہ
گواہی دیتے ہیں تاریخ عہد کے صفحے ÷ یہ اور بات ہے اب تم نہ اعتراف کرو
ڈھونڈھتا پھرتا ہوں اک عمر سے محفل محفل ÷ وہ جو اک چیز ہے معصوم نگاہی کا سی

ب، بہترین کتابت، طباعت اور گیٹ اپ کا نمونہ ہے جسے دیکھ کر ان اچھے شاعروں پر ترس آتا ہے جن کی
سے انداز میں بھی شائع نہیں ہو پاتی۔

(رؤف خیر)

...صباح

مرتبہ:۔ کالیداس گپتا رضا۔ قیمت ۱۰/- روپے
ناشر:۔ ولی پبلی کیشنز۔ ۱۰۷، اجوائی بھون، ۱۰۔ نو مری لائین۔ چرچ گیٹ۔ بمبئی ۲۰)

...ئے صباح" مع ترجمۂ نثر و نیز ترجمۂ منظوم مرزا اسد اللہ خاں غالب کا شعری کارنامہ ہے جو غالب کی زندگی

میں ان کے بھانجے مرزا عباس بیگ کے ایما پر نولکشور سے طبع ہوا تھا۔ اب اسی نسخہ کمیاب کو کالیداس گپتا رضا نے مقدمہ کے ساتھ دوبارہ شائع کیا ہے۔ اس طبع ثانی کے موقعہ پر کالیداس گپتا رضا لکھتے ہیں "حقیقت یہ ہے کہ یہ فارسی نظم غالب کے معیار پر پوری نہیں اترتی یہی وجہ ہے کہ باوجودیکہ مثنوی غالب انتقال سے تقریباً دو سال پہلے چھپ چکی تھی۔ مگر اس کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ غالب نے عمداً اس کا نام نہیں لیا اور اسے اپنے فارسی کلام میں شامل نہیں کیا۔"

"دعائے صباح" کی صنف مذہبی اہمیت ہے۔ یہ دعا حضرت علیؓ سے منسوب ہے جسے شیعی حضرات عموماً صبح کے وقت بعد نماز پڑھتے ہیں۔ اس دعا کے خواص اور فضائل سے متعلق مشہور ہے کہ جو شخص اسے جس حاجت کے لئے پڑھے گا اس کی دعا مستجاب ہوگی۔

(طیب انصاری)

اقبال۔ قومی یکجہتی کے پیامبر

مصنف۔ محمد ایوب جوہر — اردو سوسائٹی۔ سینٹ جوزف کالج۔ بنگلور

اقبال صدی تقاریب کے سلسلہ میں بے شمار ادیبوں اور نا ادیبوں نے مضامین لکھے ہیں اور کتابیں چھپوائی ہیں۔ یقیناً اس کے نتیجہ میں بعض اہم اور مفید کتابیں منظر عام پر آئیں جن کی افادیت سے انکار ممکن نہیں۔ اقبال پر جہاں سرکردہ اور بزرگ ادیبوں نے قلم اٹھایا ہے وہیں نوجوانوں نے بھی اس میدان میں اپنی سی کوششیں کی ہیں۔ ظاہر ہے ان کی یہ کوششیں غیر معمولی واقعہ تو نہیں ہیں تاہم ہمیں ایسی کوششوں کی ہمت افزائی ضرور کرنی چاہیئے۔ محمد ایوب جوہر بھی اسی بناء پر ہماری ہمت افزائی کے مستحق ہیں۔

محمد ایوب جو سینٹ جوزف کالج بنگلور کے طالب علم رہے ہیں۔ تحریری مقابلہ کے لئے "اقبال قومی یکجہتی کے علمبردار" کے موضوع پر مضمون لکھا تھا جسے انھوں نے اپنے اساتذہ قدیر امتیاز اور خالد عرفان کی تحریک پر اسی مضمون کو نظر ثانی کے بعد کتابچہ کی صورت میں شائع کیا ہے۔ اس مختصر سے مضمون میں جوہر نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ اقبال کے تعلق سے پھیلی ہوئی اس غلط فہمی کا ازالہ ہو کہ وہ ایک فرقہ پرست اور متعصب شاعر ہیں۔ چنانچہ کلام اقبال سے نیا شوالہ، صدائے درد، ترانۂ ہندی، گرونانک، رام اور سوامی رام تیرتھ جیسی نظموں کا حوالہ دے کر اقبال کو قومی یکجہتی کا علمبردار ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

محمد ایوب جوہر کا یہ کتابچہ یقیناً بچوں کے لئے مفید معلومات فراہم کرسکتا ہے۔ (طیب انصاری)

گھر کا نہ گھاٹ کا

(طنز و مزاح) مصنف یم اے نعیم — سائز: کراؤن صفحات (۹۶) قیمت -/۲ روپے سال اشاعت ۱۹۷۷ء ملنے کا پتہ:۔ مصنف، ۱۱/۳/۱۲۲-۳-۲۰ غالب کالونی شبلی گنج حیدرآباد

حیدرآباد کے جواں سال کہانی نویس ایم اے نعیم کے (۱۷) طنز و مزاح کے ہلکے پھلکے مگر چٹخارے دار مضامین کا پہلا مجموعہ "گھر کا نہ گھاٹ کا" چند ایک دلچسپ مضامین کے سبب قابلِ مطالعہ قرار پاتا ہے۔ نعیم میں طنز و مزاح لکھنے کی صلاحیت روشن نظر آتی ہے۔ انداز بیان میں کھنگی اور یکسانیت کے سبب مزاح اور طنز کی نشتریت آبدار نہ ہو سکی۔ ذرا لہجہ بدلے اور اندازِ تحریر سنبھلے۔ "وحشی خوشبو" "فتح میدان" "گھر کا نہ گھاٹ کا" "اللہ پلیز تکو" اور "ہم نے بھی مکان ڈھونڈا" اس کتاب کے سنبھلے ہوئے نگارشات ہیں جن سے لطف لیا جاسکتا ہے۔ (د۔ع)

اُردو نامہ

علمی ادبی اور تہذیبی خبریں

ح، عثمانیہ میڈیکل کالج گولڈن جوبلی
ہوتے ہوئے ریاستی چیف منسٹر ڈاکٹر
معہ عثمانیہ کے اولین دور کے مساعی
ذریعہ تعلیم کے تجربے کو خراج تحسین
مانیہ میڈیکل کالج نے ابتداء میں
دو کو طبی تعلیم کا ذریعہ بنا کر کامیاب
ہے۔

ر حیدرآباد کی شاخ انجمن ترقی اردو
م بالغان کے ایک مرکز کی افتتاحی
ریب کرتے ہوئے صدر انجمن مسٹر
نہ ایڈوکیٹ نے کہا کہ اردو تعلیمی
لیم کے فروغ کا ایک نیا اور مثبت
، تاکہ سرکاری اعانت پر تکیہ کیئے
لہ اپنی حرکت و عمل کا ثبوت

بناب جیوانندا افسر نے کہا کہ مادری
اہمیت اور اس کی افادیت کو
مجبور نگ شفیق ہوگئے۔ میر احمد علی خان
شہر حیدرآباد اور غلام صادق الدین
بلہ

جولائی، ہمدانی طب پندرہ روزہ
نامہ کا تو سیم اجرا اُردو کے پہلے
ادیب حضرت خواجہ بندہ نواز کے

سجادہ نشین مولانا محمد الحسینی نے انجام دی۔
ریاستی وزیر جیو انات مسٹر رام دیو نے اس
تقریب کی صدارت کی جناب طیب انصاری
حکیم لیئق احمد نعمانی نے مہانوں کا خیر مقدم کیا۔

۸ جون : ریاستی انجمن ترقی اردو کی
نگرانی میں قائم کئے گئے اُردو گرائی اسکول (مدرسہ
آصفیہ) کا افتتاحی جلسہ ڈاکٹر حسینی شاہد پرنسپل
اُردو کالج کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مسٹر غلام
یزدانی (کنوینر تعلیمی کمیٹی انجمن) نے کہا کہ شہر
حیدرآباد کے مختلف محلوں میں اور چند ضلعوں میں
بھی اُردو گرائی اسکول کی تحریک عوام میں مقبولیت
حاصل کر رہی ہے۔ انگریزی یا دیگر علاقائی
زبانیں بولنے والے بڑی تعداد میں ان اسکولوں
سے استفادہ کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر شاہد نے مادری
زبان کی تحصیل پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ
جن افراد نے گرائی اسکولوں میں اُردو تعلیم حاصل
کی ہیں انھیں مبارک باد دیتا ہوں۔ اُردو
زبان اور اس کا اظہار باہمی محبت اور یکجہتی
کا خزینہ ہے۔

۱۰ جون : بہار کے سال صحیفہ نگار
الیاس احمد بیری کا دل کا دورہ کے سبب ۴۳ سال کی
عمر میں انتقال ہوگیا۔ بیری کی وفات پر اردو

کے صحافتی اور تعلیمی حلقوں میں گہرے رنج و ملال
کا اظہار کیا گیا۔

۱۱ جون : ریاستی وزیر تعلیم مسٹر ڈی
وینکٹ رام ریڈی نے جامعہ عثمانیہ کے شعبہ تلگو
کی طرف سے قائم کردہ "گرائی تلگو انسٹی ٹیوٹ"
کی رسم افتتاح انجام دیتے ہوئے ثانوی اور
جامعاتی سطحوں پر علاقائی زبانوں بالخصوص تلگو
اور اُردو کے معیار تعلیم میں انحطاط پر افسوس کا
اظہار کیا اور جامعہ عثمانیہ میں اُردو میڈیم کے
ابتدائی کامیاب تجربے کا ذکر کرتے ہوئے
ایک علاقائی زبان کے اعلیٰ معیار اور لسانی
کردار کی ستائش کی۔

● ریاستی اُردو اکیڈیمی کے اعلان کے
مطابق علاقہ تلنگانہ میں اُردو میڈیم سے میٹرک
کا امتحان کامیاب کرنے والے چھ طلباء اور
آندھرا علاقہ کے چار طلباء کو ایک سال تک
ماہانہ پچیس روپے تعلیمی وظائف دینے کا اعلان
کیا۔ اسی طرح جونیر کالجوں میں داخلہ لینے والے
طلباء کو علی الترتیب تیس روپے اور ایم اے
میں داخلہ لینے والے پانچ طلباء کو جنھوں نے
بی اے میں پچاس فیصد سے زائد نشانات حاصل
کئے ہوں پینتیس روپے ماہوار وظائف دیئے
جائیں گے۔

ریاستی انجمن ترقی اُردو کے ایک
پانچ رکنی وفد نے ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نائب
صدر مرکزی انجمن کی قیادت میں ریاستی وزیر تعلیم
مسٹر وینکٹ رام ریڈی سے ملاقات کر کے ریاست
میں اُردو میڈیم جونیر کالجوں کے بارے میں توجہ دلائی

پر تبادلہ خیال کیا۔ مسٹر عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست، ڈاکٹر ایس اے خان، مسٹر سرینواس لاہوتی اور غلام یزدانی وفد کے دیگر اراکین تھے۔

● ریاستی انجمن ترقی اردو کی مجلس عاملہ نے شہر میں اردو ذریعہ تعلیم کے دو ماڈل اسکولوں کے قیام کا فیصلہ کیا۔

۱۲ جون: ریاستی وزیر پنچایت راج مسٹر ایم۔ باگا ریڈی جو اردو کے مصنف اور ریاستی اردو اکیڈیمی کے نائب صدر بھی ہیں اردو کے تعلیمی مسائل سے خاص دلچسپی رکھتے ہیں اپنے ایک بیان میں اردو کے ناقص نصاب پر تبصرہ کرتے ہوئے ریاستی وزیر تعلیم سے اس بارے میں مشاورت کو ناگزیر بتایا ہے۔ انجمن تحفظ اردو کے اراکین مسٹر چندر سری واستو اور مسٹر مصطفےٰ کمال نے جب اس سلسلے میں موصوف کی توجہ منعطف کروائی تو مسٹر ریڈی نے بتایا کہ وہ اردو کے تمام تعلیمی اور تدریسی مسائل پر ریاستی وزیر تعلیم سے مذاکرات کا ایک جامع پروگرام تیار کر چکے ہیں۔

۱۵ جون: ترقی اردو بورڈ کے زیر اہتمام ایوان اردو میں قائم کردہ مرکز خوشنویسی چند روز بند رہنے کے بعد دوبارہ کھول دیا گیا۔ بورڈ کی طرف سے طلباء اور اساتذہ کی بابت کے بروقت ایصال نہ ہونے کے باعث مرکز تعطل کا شکار ہوگیا تھا۔

۱۷ جون: انجمن تحفظ اردو آندھرا پردیش کی صدارت پر جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل، رکن اسمبلی مسٹر شیو راؤ شیلکا ایڈوکیٹ کا بلا مقابلہ انتخاب عمل میں آیا۔ انجمن کے دیگر اراکین میں مسٹر سید مصطفےٰ کمال، شیو پرشاد (ایم ایل اے)، ایم رنگا ریڈی اور سید احمد علی نائب صدور، مسٹر چندر سری واستو جنرل سکریٹری، ڈاکٹر ولی تنویر اور ملک محمد علی خاں معتمدین منتخب ہوئے۔ اراکین عاملہ میں عاقل شاہ، تاج مہجور، ماہر وہاب قیصر کے علاوہ کئی اصحاب شامل ہیں۔ اس موقع پر انجمن کے سابق صدر جناب ایم باگا ریڈی کی خدمات اور رہنمائی کو خراج تحسین ادا کرتے ہوئے جناب ریڈی کی وزارت میں ان کی شمولیت پر مسرت کا اظہار کیا گیا۔

۱۸ جون: اقلیم ادب کا ماہانہ شعری و ادبی اجلاس پروفیسر سید سراج الدین (نظام کالج) کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر امیر عارفی (دہلی یونیورسٹی) سے مسٹر مصلح الدین سعدی نے ادبی انٹرویو لیا۔ ڈاکٹر عارفی نے دلّی میں اردو شعر و ثقافت کی سرگرمیوں پر اظہار خیال کیا اور اپنا کلام بھی سنایا۔ دیگر کئی شاعروں نے محفل شعر میں کلام سنایا۔ جناب جمیل شیدائی معتمد اقلیم ادب نے شکریہ ادا کیا۔

● ہندوستان میں پاکستان کار گزار سفیر جناب شاہد امین نے ریاستی اردو اکیڈیمی کا معائنہ کیا۔ جناب آصف پاشاہ صدر اکیڈیمی اور مسٹر سجارت چند کھنہ ڈائرکٹر اکیڈیمی نے سرگرمیوں سے واقف کرایا اور سفیر موصوف کا خیر مقدم کیا۔

جناب امین نے ریاستی انجمن ترقی اردو اور اردو کالج کا بھی معائنہ کیا۔ انجمن کی طرف سے معتمد عمومی پروفیسر حبیب الرحمٰن، شریک معتمد جناب عابد علی خاں ایڈیٹر "سیاست" نے انجمن کی کارکردگی اور کالج کے بارے میں معلومات بہم پہنچائیں۔ سفیر موصوف نے حیدرآباد میں اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی پر مسرت کا اظہار کیا۔

● مسٹر امرت ریڈی نائب پردیش کانگریس کمیٹی نے ایک بیان میں کہا ہے کہ اردو زبان کسی ایک فرقہ کی زبان نہیں ہے۔ یہ ملک میں بسنے والے ہر فرد کی زبان ہے اور ہر شخص اس زبان کی قدر کرتا ہے اس لئے اس زبان کو اس کا مستحقہ حق دلانے کی مشترکہ طور پر کوشش کی جانی چاہیئے۔

۱۹ جون: انڈین رائٹرس اینڈ آرٹسٹس اسوسی ایشن سکندرآباد کا ادبی اجلاس عزیزالنساء صبا کی صدارت میں ہوا۔ جناب خیرات ندیم مہمان خصوصی تھے۔ مسز مسعودہ عظمت (بہار)، سری رام، نریندر سنگھ اور ستیش ورما نے شعر و ادب کے مسائل پر مخاطب کیا۔ آخر میں ایک محفل مشاعرہ بھی ہوئی۔

● ریاستی گورنر شاردھا مکرجی سے ادارہ فن خطاطی کے ایک وفد نے شیخ عبدالقادر محمود کی قیادت میں ملاقات کی اور ایک یادداشت پیش کی جس میں فن خطاطی کی افادیت اور کئی بیرونی ملکوں میں اس کی اہمیت کو ظاہر کرتے ہوئے ریاست میں اس فن کی مناسب حوصلہ افزائی اور ترقی کے لئے مرکزی حکومت کو سفارش بھجوانے کی خواہش کی گئی ہے۔

۲۲ جون: انجمن ترقی اردو شہر حیدرآباد کے زیر اہتمام خواتین کے لئے اردو تعلیم بالغان

(باقی صفحہ ۳۲ پر)

سن اجراء ۱۹۳۸ء فون ۳۸۴۶۹۰

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

ماہنامہ
سب رس
حیدرآباد

نگران: پروفیسر سید علی اکبر

معتمد مجلس مشاورت: غلام جیلانی

مرتب: وقار خلیل

جلد: ۴۱ اگست ۱۹۷۸ء شمارہ (۸)

زر سالانہ: ۱۵ روپے ششماہی: ۸ روپے
فی شمارہ: ایک روپیہ پچاس پیسے

مطبوعہ نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد
مقام اشاعت: ادارۂ ادبیات اردو پنجہ گٹہ حیدرآباد

ترتیب

دورِ حاضر کے نوجوانوں سے
ایک پُر زور اپیل

اسکولوں اور کالجوں کے طلبا وقت کے تقاضوں کا ساتھ دیں۔ ہرے بھرے اور لہلہاتے درخت خدا کی نعمت ہیں۔
بغیر کسی خرچ کے اپنے اسکولوں اور کالجوں کے احاطوں کو سرسبز و شاداب اور خوشگوار و فرحت بخش بنائیے۔

درخت لگانے کا موسم شروع ہو چکا ہے
ہمہ اقسام کے پودے اور مشورہ بالکل مفت

درج ذیل دفاتر سے ربط پیدا کیجئے

دونوں شہروں میں

ڈیویژنل فارسٹ آفیسر
اکسٹنشن ڈیویژن
حیدرآباد ۵۰۰۰۰۴
فون نمبر ۳۰۵۳۱ (اکسٹنشن ۴۵)

اضلاع میں

ضلع مستقر پر واقع
دفتر ڈیویژنل فارسٹ آفیسر

ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ
حکومت آندھرا پردیش حیدرآباد

No. 15/78-79

ڈاکٹر صفدر علی بیگ

ہندوستان کی آزادی کی تحریک

ایسٹ انڈیا کمپنی نے سنہ ۱۶۰۸ء میں اپنے جہاز ہندوستان روانہ کئے اور یہاں تجارت شروع کی پہلے بیس سال کے اندر ہی تقریباً ساڑھے پانچ لاکھ پونڈ کا سونا اور چاندی لے آئے جس کے عوض میں ہندوستان کی مصنوعات خرید لے گئے۔ ہندوستانی حاکموں نے انھیں خوش اخلاقی اور خلوص سے اپنے دامن میں جگہ دی۔ اس وقت یہاں شاہ جہانگیر تخت سلطنت پر رونق افروز تھے۔ اورنگ زیب کے انتقال کے بعد انھیں اپنی فوجی قوت ہندوستان کی سرزمین میں آزادی کے ساتھ استعمال کرنے کا موقع ملا۔ اور ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستانی سیاسیات میں دخل انداز ہونے لگے۔ یہاں اٹھارویں صدی عیسوی میں مغلیہ سلطنت کی چراغ گل ہوتے ہی جا بجا نئی طاقتیں ظہور پذیر ہوگئیں۔ اور مرکزی قوت کے کمزور ہوتے ہی مختلف صوبہ دار آزاد ہو گئے۔ انگریزوں کی مرکزی قوت ہندوستان کے صوبہ داروں کی منتشر اور متضاد قوتوں پر غالب آگئی اور ملک کا ایک ایک حصہ انگریزوں کے قبضے میں شامل ہونے لگا۔ کچھ ہی عرصہ بعد ہندوستان کی مرکزی طاقت انگریزوں کے ہاتھ میں پہونچ گئی۔ اب انگریزوں کی توجہ تجارت اور توسیع سلطنت کی طرف ہوگئی۔

اس طرح ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی عمل داری ۱۷۵۷ء میں قایم ہوگئی اور سب سے پہلے لارڈ کلائیو کو گورنر مقرر کیا گیا۔ لیکن اہل ہند کے دلوں میں اپنے ملک کی شاہی حکومتوں کی بہت قدر تھی۔ ان کے مقابلے میں کمپنی کی عملداری سے انھیں شکایتیں تھیں۔ ان حالات میں جب یورپ سے کسی ملک کے آزاد ہونے کی خبر آتی تو یہاں خوشی منائی جاتی اور جب اس کے برخلاف خبر آتی تو رنج ہوتا۔ چنانچہ جب ہسپانیہ میں آئینی حکومت قایم ہونے کی خبر ہندوستان آئی تو راجہ رام موہن رائے نے کلکتہ میں شاندار دعوت دی۔ اور جب فرانس کے انقلاب کی خبر آئی تو ہر وقت اسی کی باتیں ہوتی تھیں اور آزادی کی فتح پر خوشیاں منائی جاتی تھیں۔

اس وقت تک ہندوستان کی حیثیت انگریزوں کی دیگر نوآبادیات کے بالکل مشابہ تھی اور سب کی یکساں تمنا تھی کہ انھیں خود اختیاری حاصل ہو۔ بالآخر ۱۸۶۷ء میں کینیڈا کو حکومت خود اختیاری ملی اور اس کے بعد دس، بارہ سال کے اندر تمام نوآبادیات میں اسی قسم کا طرز حکومت قائم ہوگیا۔ مگر ہندوستان بجنسہٖ اسی غلامی کی حالت میں اپنی بدبختی پر خون کے آنسو بہاتا رہا۔ آئرلینڈ کے لئے مسٹر گلیڈسٹن کی وزارت کے زمانے میں ہوم رول کا مسئلہ چھڑا تو اس سے قدرتی طور پر اہل ہند متاثر ہوئے اور توقعات ان کے دلوں میں انگریزی عملداری سے قائم ہوگئیں۔ لیکن جب وہ پوری طرح مایوس کردیئے گئے تو ان کے دلوں میں

سیاسی احساس بیدار ہونے لگا۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ ہندوستان میں سیاسی حرکت پیدا کرنے میں اخبارات کا بڑا نمایاں حصہ رہا ہے۔ اخبارات کے اور اڈیٹرس ملک کی آزادی کے سلسلے میں تکلیفیں اٹھانے اور قربانیاں دینے میں سب سے زیادہ پیش پیش رہے۔ لیکن ۱۸۲۴ء میں مسٹر ایڈمس (Adams) گورنر جنرل نے ایک قانون جاری کیا جس کی رو سے پریس کی آزادی پر بندشیں لگائی گئیں جس کے خلاف ہندوستانیوں کی طرف سے احتجاج کیا گیا اور ایک عرضداشت پیش کی گئی۔ اس عرضداشت میں بتایا گیا تھا کہ مسلمانوں کی حکومت میں ہر قسم کے لوگوں کو جملہ سیاسی حقوق، بڑے سے بڑے عہدے، فوجوں اور صوبوں کی گورنریاں مسلمانوں ہی کی طرح تھیں اور مذہب یا مقام پیدائش کی بناء پر کوئی شخص ان مراعات سے محروم نہ رکھا جاتا تھا۔ عرضداشت میں یہ بھی لکھا گیا کہ وہ مراعات اگرچہ اب ہمیں حاصل نہیں ہیں تاہم پریس کی آزادی سے اس امر کی کسی قدر تلافی ہو جاتی ہے۔ لیکن اب اس کے بھی سلب ہو جانے سے تو سراسر نقصان ہی نقصان ہے۔ آخر میں اس افسوس کا اظہار کیا گیا کہ اگر ہندوستان پریس سے یہ بندش نہ ہٹائی گئی تو باشندگان ہند ہمیشہ کے لئے مظلوم اور ذلیل ہو جائیں گے۔ عرضداشت کا اچھا اثر ہوا اور ۱۸۳۵ء میں سرچارلس مٹکاف نے اخبارات کو آزادی دے دی جس سے بکثرت دیسی اخبارات نکلنے لگے۔ اس سے ہندوستانیوں نے ذہنی ترقی کی۔ ۱۸۷۸ء میں لارڈ لٹن نے دیسی اخبارات پر بندش لگائی۔ ۱۸۸۰ء میں جب لارڈ رپن آئے تو انھوں نے دیسی اخبارات پر سے بندشیں اٹھا کر اہل ہند کو ذہنی غلامی سے آزاد کیا۔ ساتھ ہی ساتھ لوکل بورڈوں میں طریقۂ انتخاب جاری کر کے حکومت خود اختیاری کی بنیاد قائم کر دی۔

کچھ ہی عرصہ بعد مسٹر اے۔ ہیوم (Hume) پنشنر سویلین ہندوستان کی سیاسی رہنمائی کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے جس کے نتیجہ کے طور پر ۱۸۸۴ء کے آخر میں "انڈین نیشنل یونین" قائم ہوئی۔ مسٹر ہیوم لارڈ ڈفرن وائسرائے ہند سے معاملات طے کر کے بعد انگلستان گئے اور وہاں پارلیمنٹ کے چند آزادی پسند لیڈروں، ممبروں سے ہمدردی اور امداد کے وعدے لئے اور ہندوستان واپس آ کر کانگریس کا پہلا اجلاس ڈسمبر ۱۸۸۵ء میں بمقام بمبئی منعقد کیا۔ ان خوشگوار حالات اور عمدہ فضا میں ایک پارلیمنٹ کی ابتداء ہوئی اور ہندوستان میں جو سیاسی احساس انگریزی عملداری کے شروع ہی سے پیدا ہوا تھا اس نے بتدریج بڑھ کر ۱۸۸۵ء میں کانگریس کی بنیاد ڈالی۔ اس طرح نیشنل کانگریس کے قائم ہونے کے بعد اس نے ایک مفید سیاسی احساس پیدا کیا لیکن ہندوستان کی بدبختی کا سنگ بنیاد اس وقت رکھا گیا جب یہاں فرقہ وارانہ احساس پیدا کیا گیا اور یہ احساس ان لوگوں نے پیدا کیا جو ذاتی مفادات اور منافع کی بناء پر ہندوستانیوں کی ترقی کی ہر تدبیر کی مخالفت کرنے لگے۔ اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرنے لگے کہ ہندوستانی خود اپنا انتظام کرنے کے اہل نہیں ہیں۔ وہ بڑے عہدوں کے اہل نہیں ہیں۔ ایسے لوگ کوشاں رہے کہ ہندوستانی متحد نہ ہونے پائیں۔ اپنے ناپاک ارادوں کے ساتھ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے انھوں نے ہندوستان میں فرقہ وارانہ جذبات پیدا کئے جن کا یہاں وجود نہ تھا۔ اس سے قبل ہندوستان میں کبھی مذہبی اختلافات پیدا نہ ہونے پائے تھے جس کی دلیل بے شمار اقوال سے ملتی ہے۔ مثلاً سر جان مینارڈ سابق ممبر انتظامی کونسل پنجاب نے لکھا تھا کہ "ہندو مسلمانوں کی عام مخالفت برطانیہ کے عہد میں شروع ہوئی" (ان ہپی انڈیا از لالہ لاجپت رائے صفحہ ۴۰۸) سر جان ملکم کہتا تھا "اس قدر وسیع سلطنت میں ہماری غیر معمولی قسم کی حکومت کی حفاظت اس امر پر منحصر ہے کہ ہماری عملداری میں جو بڑی جماعتیں

ان کی عام تقسیم ہو اور پھر ہر ایک جماعت کے ٹکڑے مختلف ذاتوں اور فرقوں اور قوموں میں ہوں۔ جب تک یہ لوگ اس طریقہ ایک دوسرے سے جدا رکھے جاتے رہیں گے۔ اس وقت تک غالباً کوئی بغاوت اٹھ کر ہماری قوم کے استحکام کو متزلزل نہ کرے گی۔ (کمپنی کے عہد کی تاریخ تعلیم انگریزی از میجر باسو۔ صفحہ ۱۱۲)۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے بہت سی تدابیر اختیار کی گئیں جن میں بعض عارضی ہوتی تھیں اور بعض مستقل۔ سر ہنری ایلیٹ جنہوں نے ہندوستان میں بڑے بڑے عہدے سنبھالے اور آخر میں حکومتِ ہند کے محکمہ خارجہ کے سکریٹری بن گئے تھے۔ انھیں یہ بات سخت ناگوار تھی کہ پڑھے لکھے ہندو، مسلمانوں کے گذشتہ عہدِ حکومت کی تعریف کیا کریں۔ اور انگریزی عہد کی عیب جوئی کریں۔ اس زمانے تک جس قدر کتابیں اور تاریخیں خود ہندو مصنفین نے لکھی تھیں ان سب سے مسلمانوں کی عظمت اور وقعت کا اظہار ہوتا تھا۔ نتیجتاً سر ہنری ایلیٹ نے ہندوستان کی ایک تاریخ لکھ کر اس کی پہلی جلد سنہ ۱۸۴۹ء میں شائع کی۔ یہی وہ سب سے پہلی تاریخ ہے جس نے زمانۂ قدیم اور بالخصوص مسلمانوں کے عہد کے خلاف خوب زہر اگلا تھا۔ تاریخ کے میدان میں یہی وہ پہلی کتاب آئی جس کے ترجمے دیسی زبانوں میں کرا کے ان کے ذریعہ اسکولوں میں پڑھنے والے بچوں کے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے غبار اور دشمنی کا بیج بویا گیا۔ تاریخ کے دیباچے میں مصنف موصوف تحریر فرماتے ہیں "بڑا افسوس ہندو مصنفین پر آتا ہے جن سے ہمیں توقع ہو سکتی تھی کہ اس قوم کے محسوسات، توقعات اور معتقدات ہمیں معلوم ہوتے مگر وہ تو احکامِ شرعی اور ہدایات کے مطابق لکھتے ہیں۔ "ماہِ محرم" کو "محرم شریف" اور قرآن کو "کلام پاک" کہتے ہیں۔ اپنی تحریرات کو "بسم اللہ" سے شروع کرتے ہیں"۔

ایلیٹ صاحب کو ہندو مصنفین کی اس بات پر بے حد غصہ تھا کہ وہ مسلمانوں کے مراسم اور مذہب کی اس قدر عظمت کیوں کرتے ہیں۔ آگے چل کر وہ لکھتے ہیں کہ "اب جب کہ ہندو اپنے ظالم مسلمان آقاؤں کے چنگل سے نکل کر آزاد ہو گئے ہیں اور بغیر روک ٹوک کے اپنے دل کی باتیں ظاہر کر سکتے ہیں تب بھی ان غلامانہ ذہنیت کے لوگوں میں سے ایک بھی اپنے ملک کے محسوسات کے مطابق نہیں لکھتا یا طویل زمانے کی مظلومیت کے خیالات اور جذبات کا اظہار نہیں کرتا"۔ اب حقیقت یہ ہے کہ اگر ہندوؤں کو مسلمانوں کے زمانے میں تکلیف پہنچی ہوتی تو وہ آزادی کے زمانے میں ضرور اس کا اظہار کرتے۔ لیکن ایلیٹ صاحب کو اس سے سخت تکلیف پہنچی تھی کہ ہندو، مسلمانوں کے عہدِ حکومت کی تعریفیں اور انگریزوں کی عیب جوئی کرتے تھے۔ اس سبب سے انھوں نے کوشش کی کہ تاریخوں کے پرانے اخباروں سے ایسے ایسے واقعات نکالیں جن سے یہ نتیجہ نکالا جا سکے کہ مسلمانوں کا عہد ظالمانہ اور انگریزوں کا عہد خدا کی رحمت تھا۔

ہندوستانیوں کی قسمت اسی روز پھوٹ گئی جب اس قسم کی کتابوں کی بناء پر دیسی زبانوں میں تاریخیں لکھی گئیں۔ اسکولوں میں جاری کی گئیں۔ رفتہ رفتہ وہی جھوٹ موجودہ تاریخوں کا جزو بنا دی گئی۔ اور شیطان کے بتائے ہوئے اس پھل کو چکھتے ہی ہندو مسلمان منافرت اور مباحثت کے میدان میں کود پڑے۔ مذہبی افتراق پیدا ہوا۔ سر جان مینارڈ کہتا ہے "ہندوستان میں خانہ جنگی کی طرف رجحان موجود ہے جس کا ایک نمونہ ہندو مسلم عناد ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر یہ رجحان نہ ہوتا تو ہماری حکومت قائم نہ ہو سکتی تھی۔ نہ برقرار رہ سکتی تھی۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ہندو مسلمانوں میں عام مخالفت برطانیہ کے عہد میں شروع ہوئی۔ . . . مذہبی افتراق کا احساس نہ تھا۔ خواہ ہندو ہو یا مسلمان دونوں ایک ہی معبد میں مصروف بہ پرستش ہوتے تھے"۔ (ان ہیپی انڈیا از لالہ لاجپت رائے۔ صفحہ ۴۰۱) مسٹر کیمپبل ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم نے بھی منافرت پھیلانے کی غرض سے ایک تاریخ لکھی۔ اس قسم کی کتابیں اسکولوں کے درس میں داخل کی گئیں۔ ان کے ترجمے کرا کے تمام ملک میں پھیلا دیئے گئے۔

سنہ ۱۹۲۰ء کے شروع میں جب کلکتہ میں انڈین نیشنل کانگریس کا خاص اجلاس ہوا تو اس کی صدارت لالہ لاجپت رائے نے کی۔ اس اجلاس کی غیر معمولی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ اس کے بعد سے کانگریس والوں نے انگریزی لباس ترک کیا۔ اجلاس میں انگریزی کے دیسی زبانوں میں تقریریں شروع ہوئیں۔ اسی سال کانگریس کمیٹی نے طے کر دیا کہ حکومت سے ترکِ موالات کیا جائے اور کانگریس کے ساتھ ساتھ مسلم لیگ نے بھی اپنے جلسوں میں ترکِ موالات کی تجویز منظور کر لی۔ مہاتما گاندھی اور مولانا ابوالکلام آزاد کے ذہنِ رسا نے نہتی رعایا کے لئے ترکِ موالات کا عجیب و غریب نسخہ تجویز کیا تھا۔ جس نے ہندوستانیوں کو خفیہ سوسائٹیاں قائم کرنے سے روک دیا۔ تمام مشورے اور بحثیں علانیہ کئے جانے لگے۔ جیلوں کو تفریح گاہیں سمجھا جانے لگا۔ بندوقوں اور پولیس کی لاٹھیوں کی ضرب خوشی خوشی برداشت کیا جانے لگا۔ ہندو اور مسلمانوں کی متفقہ قراردادوں کے مطابق سنہ ۱۹۲۱ء میں پوری قوت کے ساتھ مال، عدالتوں، وکالتوں، سرکاری ملازمتوں اور اسکولوں کا مقاطعہ کیا گیا۔ لاہور کے اجلاس میں جو بصدارت پنڈت جواہر لال ہوا تھا یہ تجویز منظور کی گئی کہ گول میز کانفرنس کی شرکت بیکار ہے۔ کامل آزادی کا اعلان کیا جائے اور کانگریس کمیٹی کو سیول نافرمانی کا اختیار دیا جائے۔ کانگریس میں کامل آزادی کی تجویز منظور ہونے کے بعد ۲۶ جنوری سنہ ۱۹۳۰ء کو تمام ہندوستان میں یوم آزادی منایا گیا۔ ہندوستانیوں اور حکومتِ برطانیہ کے درمیان سیول نافرمانی کی جنگ شروع ہوئی۔ گرفتاریوں، لاٹھیوں اور بندوقوں کے درمیان ہندوستانیوں کی پُرامن جنگ میں مسلمانوں کی شرکت انفرادی اور جماعتی دونوں حیثیتوں سے ہوئی۔ مہاتما گاندھی کی گرفتاری کے بعد مسٹر عباس طیب جی جیل گئے۔ اس کے علاوہ ایک جماعت جو مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر انصاری، ڈاکٹر سید تصدق احمد خاں شروانی، مسٹر رفیع احمد قدوائی، اور خان عبدالغفار خاں، پر مشتمل تھی پیش پیش رہا۔ اس کے علاوہ احرار اسلام اور خدائی خدمتگاروں نے بڑھ چڑھ کے بڑی قربانیاں دیں۔

ہندوستان میں سیاسی جدوجہد کے لئے سب سے پہلے چیز جو ضروری تھی وہ اتحاد و اتفاق، حب الوطنی اور ایثار و قربانی کا جذبہ تھا۔ ایسا جذبہ خصوصیت کے ساتھ شعر و ادب کے ذریعہ آسانی سے عام ہو سکتا تھا۔ اردو کے شعراء نے سب سے اس طرف توجہ کی اور قوم پرستی اور اتحاد و اتفاق کے تصور کو عام کرنے میں بڑی خدمت انجام دی۔ اس زمانے کی تمام سیاسی تحریکوں کو آگے بڑھانے میں شعرائے اردو کبھی پیچھے نہیں رہے۔ سنہ ۱۹۰۵ء اور سنہ ۱۹۰۶ء میں سودیشی تحریک چلائی اردو کے ادیبوں اور شاعروں نے اس تحریک کی تائید کی اور اردو ادب میں پہلی بار سامراج دشمن آزادی کے نغموں کی گونج سنائی دینے لگی۔ اس دور کے شعراء میں اسمٰعیل میرٹھی، برج نارائن چکبست، اکبر الہ آبادی اور حالی۔ بعد کے شعراء میں علامہ اقبال اور جوش ملیح آبادی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ سنہ ۱۹۰۶ء میں سلف گورنمنٹ کا مطالبہ کیا گیا تو اردو شاعری میں بھی اس نئے مطالبہ نے تازہ ولولہ پیدا کیا بلکہ ابھی کانگریس نے مکمل آزادی کا مطالبہ نہیں کیا تھا اور ملک معظم کے زیرِ سایہ ہوم رول کی مانگ کی تھی اس وقت سے شعراء اردو مکمل آزادی کا نعرہ لگاتے رہے۔ ہوم رول کی تحریک کو چکبست نے اپنی شاعری کا بنایا تھا۔ علامہ اقبال ہندوستانیوں کو بیدار کرنے کی کوشش کرتے اور کہتے رہے کہ ؎

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو ؎ تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں
چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے ؎ عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں
نشانِ برگِ گل تک بھی نہ چھوڑ اس باغ میں گلچیں ؎ تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں

...ستانیوں کی غیرت کو للکارتے اور کہتے رہے ؎

غیر کی خدمت گذاری باہمی خونریزیاں ÷ دوپہر کی دھوپ سر پر اور یہ خوابِ گراں

حیف اے ہندوستاں، صد حیف اے ہندوستاں

اہرمن کی پرستی، کچھ خبر بھی ہے تجھے! ÷ گلشنِ اعدا پہ تیری باہمی خوں ریزیاں

حیف اے ہندوستاں، صد حیف اے ہندوستاں

عورتیں تک دشمنوں کی موت سے ڈرتی نہیں ÷ آہ اے بیگانۂ ذوقِ حیاتِ جاوداں

...م اتحاد و اتفاق کی تمنا اور کوشش کرتے اور جوش و جذبے کے ساتھ جوش کہتے رہے ؎

تو نے روشِ خدمتِ اغیار نہ چھوڑی ÷ اب تک رسنِ سُبحہ و زنّار نہ چھوڑی

آشفتگیٔ اندک و بسیار نہ چھوڑی ÷ افسوس ہے اے جنسِ غلامی کے خریدار

بیدار ہو بیدار ہو بیدار ہو بیدار / بیدار ہو بیدار

یک رنگ ہے جو جیت ہے دنیا میں اسی کی ÷ اے صدکش کش یہ دو رنگی نہیں اچھی

یا اپنے کفِ پا میں لگا ناز سے مہندی ÷ یا جامۂ ہستی کو بنا خون سے گلنار

بیدار ہو بیدار ہو بیدار ہو بیدار / بیدار ہو بیدار

انگلستان کے بادشاہ کی تاج پوشی کے وقت جوش نے ایک نظم "وفاداران ازلی کا پیام شاہنشاہ ہندوستان کے" عنوان سے لکھی وہ کہتے ہیں ؎

تاجپوشی کا مبارک دن ہے اے عالم پناہ ÷ اے غریبوں کے امیر اے مفلسوں کے بادشاہ

اے گداپیشوں کے سلطاں مفلسوں کے تاجدار ÷ بے نوا ملک کے شاہ، دریوزہ گروں کے شہریار

آپ کے ہندوستاں کے جسم پر بوٹی نہیں ÷ تن پہ اک دھجی نہیں ہے پیٹ کو روٹی نہیں

...ہتے ہیں ؎

گرم ہے سوزِ بغاوت سے جوانوں کا دماغ ÷ آندھیاں آنے کو ہیں اے بادشاہی کے چراغ

...تان کے نوجوانوں کو برطانیہ کی حکومت کے خلاف جنگ پر اس طرح تیار کرتے ہیں ؎

اے جوانانِ مردو خدارا باندھ لو سر سے کفن ÷ سر برہنہ پھر رہا ہے غیرتِ قوم و وطن

پاؤں میں تا چند زنجیرِ غلامی کی خراش ÷ صرف اک جنبش ابھی ہوتی ہیں کڑیاں پاش پاش

"بغاوت" میں باغیانہ جذبات کا اظہار کرتے اور کہتے ہیں ؎

ہاں بغاوت، آگ، بجلی، موت، آندھی میرا نام ÷ میرے گردِ پیش اجل، میری جلو میں قتلِ عام

...ت کا نقشہ کھینچنے کے بعد کہتے ہیں ؎

جنگ کی صورت سے گو ہنگامہ کرتی ہوں شروع ÷ اس کی صبحیں مرے خنجر سے ہوتی ہیں طلوع

ہندوستانیوں کو آزادی، خوشحالی اور فلاح و بہبود کی خوشخبری دیتے ہیں ؎

مژدہ باد اے ایشیا اے سرزمینِ زرفشاں ؛ آگئی وہ ساعتِ بیداریٔ ہندوستاں

جوشؔ وطن کی محبت میں وطن کی اس طرح سراہتے ہیں ؎

اے وطن پاک وطن روحِ روانِ احرار ؛ اے کہ ذروں میں ترے بوئے چمن رنگِ بہار
ریزے الماس کے تیرے خس و خاشاک میں ہیں ؛ ہڈیاں اپنے بزرگوں کی تری خاک میں ہیں

کبھی وہ انگریزوں کو ہمت و جرأت کے ساتھ مخاطب کرتے اور ان کے ظلم و جبر، بے رحمی و ناانصافی کو اس بے پردہ کرتے ہیں ۔

کس زباں سے کہہ رہے ہو آج تم سوداگرو ؛ "دہر میں انسانیت کے نام کو اونچا کرو"
جب یہاں آئے تھے تم سوداگری کے واسطے ؛ نوعِ انسانی کے مستقبل سے کیا واقف نہ تھے
ہندیوں کے جسم میں کیا روح آزادی نہ تھی ؛ سچ بتاؤ کیا وہ انسانوں کی آبادی نہ تھی
اپنے ظلمِ بے نہایت کا فسانہ یاد ہے ؛ کمپنی کا پھر وہ دورِ مجرمانہ یاد ہے
دستکاروں کے انگوٹھے کاٹتے پھرتے تھے تم ؛ سرد لاشوں سے گڑھوں کو پاٹتے پھرتے تھے تم
اللہ اللہ کس قدر انصاف کے طالب ہو آج ؛ میر جعفر کی قسم کیا دشمنِ حق تھا سراج
کیا اودھ کی بیگموں کا بھی ستانا یاد ہے ؛ یاد ہے جھانسی کی رانی کا زمانہ یاد ہے
ہجرتِ سلطانِ دہلی کا سماں بھی یاد ہے ؛ شیر دل ٹیپو کی خونی داستاں بھی یاد ہے
تیسرے فاقے میں اک گرتے ہوئے کو تھامنے ؛ کس کے سر لائے تھے تم شاہِ ظفر کے سامنے
ذہن میں ہوگا وہ تازہ ہندیوں کا داغ بھی ؛ یاد تو ہوگا تمہیں جلیانوالا باغ بھی
پوچھ لو اس سے تمہارا نام کیوں تابندہ ہے ؛ ڈائر ناگرگ دہن آلودہ اب بھی زندہ ہے
وہ بھگت سنگھ اب بھی جس کے غم میں دل ناشاد ہے ؛ اس کی گردن میں جو ڈالا تھا وہ پھندا یاد ہے
خیر اے سوداگرو اب ہے تو بس اس بات میں ؛ وقت کے فرمان کے آگے جھکا دو گردنیں
اک کہانی وقت لکھے گا نئے مضمون کی ؛ جس کی سرخی کو ضرورت ہے تمہارے خون کی

غرض نہ صرف جوشؔ نے بلکہ بعد کے بے شمار اردو شعراء نے ہندوستان کی محبت، اتحاد و اتفاق، جذبۂ ایثار قربانی، آزادی کی لگن اور غلامی سے نفرت اور بیزاری اور انقلاب اور جدید جذبہ کا پیغام دیا۔ ان تمام لوگوں میں فنہ جاں نثار اخترؔ، سجاد ظہیر، ساحرؔ لدھیانوی، سردار جعفری، کیفی اعظمی اور مخدوم محی الدین کے علاوہ اور بھی کئی ذکر انقلابی شعراء پیدا ہوئے ۔

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو ؛ چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

— مخدومؔ

دو نئے شعر

ہزار درد شبِ آرزو کی راہ میں ہے
کوئی ٹھکانہ بتاؤ کہ قافلہ اُترے
قریب اور بھی آؤ کہ شوقِ دید مٹے
شراب اور پلاؤ کہ کچھ نشہ اُترے

فیض احمد فیض
اگست ۱۲

★

"مجھے پہلی بار "ادارۂ ادبیاتِ اُردو" سے متعارف ہونے کی سعادت اور مسرت حاصل ہوئی۔ جو کچھ دیکھا اور جو کچھ سُنا اس سے بہت دل خوش ہوا، اور ساتھ ہی ملول بھی کہ اس بے بہا خزینے کو جو یہاں یکجا ہے، کسبِ فیض و بصیرت کے لئے وقت اور فراغت میسّر نہیں ہیں اس ادارہ کی فلاح و ترقی کی تمنّا کے ساتھ یہ اُمید بھی لئے جارہا ہوں کہ شاید کسی دن دوبارہ اس کی زیارت کرسکوں۔"

—— فیض احمد فیض

۱۲ ۔ اگست ۱۹۷۸ء

صلی بزاد زیدی

چکبست کی قومی شاعری

اُردو میں قومی اور وطنی نظموں کا جو شاندار ذخیرہ ہے۔ وہ ہندوستان کی کسی بھی زبان کے لئے باعث فخر
ہے۔ اس میں ہماری قومی تحریک کے سارے اتار چڑھاؤ، ہماری وطنی جدوجہد کا ہر اہم موڑ اپنی پوری شدت اور توانائی
جلوہ گر ہے۔ ہمارا یہ ادبی ذخیرہ صرف جذباتی ہی نہیں ہے بلکہ اس میں نظریوں کی دھوپ چھاؤں بھی ہے اور فکری گہرا
میں نے اپنی کتاب " اردو میں قومی شاعری کے سو سال " میں وطنی شاعری کا نقطۂ آغاز ۱۸۵۷ء یعنی پہلی جنگ آزادی کو
لیکن ہماری قومی شاعری کی عمر اس سے بھی طویل ہے اور جن شعراء نے اس کی تشکیل و تعمیر میں حصہ لیا ہے ان کی تعداد
سینکڑوں تک پہونچتی ہے۔ ان سبھوں کے دل میں وطن کی محبت ہے، غلامی کے خلاف بغاوت کا جذبہ ہے اور آزادی کی
ہے لیکن ان بے شمار ناموں میں جو نام خاص طور سے اُبھرتے ہیں ان میں چکبست کا نام تقریباً سرِ فہرست ہے۔

اس میں شک نہیں کہ محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالی، محمد اسمٰعیل میرٹھی اور درگا پرشاد سرور جہان آبادی کو عمر
سے چکبست پر اولیت حاصل ہے اور اس میں شک نہیں کہ ان حضرات نے وطنی اور قومی شاعری کے ابتدائی خدوخال
کرنے میں رہبرانہ کام کیا ہے۔ لیکن چکبست کی دین زیادہ وزنی، زیادہ مؤثر اور زیادہ وقیع بھی ہے۔ وطن دوستی
نہیں ہوتے، کیونکہ وطن کی محبت بھی اُسی طرح ایک فطری جذبہ ہے، جیسے ماں کی محبت، لیکن اس وطن دوستی کے پیرا
اور حسی کیفیت میں ضرور فرق ہوتا ہے اور یہی فرق چکبست کو نہ صرف اپنے ہم عصروں سے بلکہ پیشروؤں سے بھی ممتا
حالی کے یہاں وطن پروری کا یہ تصور تھا۔

جز و انسان کی حیات ہے تو ؎ مرغ و ماہی کی کائنات ہے تو
ہر نباتات کا نمو تجھ سے ؎ روکھ تجھ بن ہرے نہیں ہوتے

اس کے لئے وہ باہمی اتفاق ضروری سمجھتے تھے اور علم و ہنر عام کرنے کی ترغیب دیتے تھے۔ محمد حسین آزاد
یہ تصور زیادہ صاف تھا۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ ؎

حبِ وطن اسے نہیں کہتے کہ باغ سے ؎ نکلا جو گل تو خاک ہو فرقت کے داغ سے
حبِ وطن نہ یہ ہے کہ پانی میں گر نہ ہو ؎ ماہی کی زندگی کسی صورت بسر نہ ہو

اور پھر حبِ وطن کی تشریح کرتے ہوئے ایک قدم آگے جاتے ہیں۔

اور معرکے میں جنگ کے پر جوشِ عزم میں ÷ گرز و کمند و تیغ سے میدانِ رزم میں
لڑتے تھے اور مرتے تھے اور جاں کھوتے تھے ÷ اپنے وطن کے نام پہ قربان ہوتے تھے

اس لئے اُن کا مشورہ یہ تھا کہ ؎

رکھو رفاہِ قوم پہ اپنا مدار تم ÷ اور ہو کبھی صلے کے نہ امیدوار تم

یہ بے لوث خدمت کا جذبہ اور دیانت دارانہ اصلاح پسندی کا حوصلہ آگے چل کر بیرونی غلامی سے نجات پانے کا احساس بن گیا اور رفتہ رفتہ آزادی کی آواز بھی سنائی دینے لگی۔ اسمٰعیل میرٹھی نے للکارا کہ ؎

ملے خشک روٹی جو آزاد رہ کر ÷ تو وہ خوف و ذلت کے حلوے سے بہتر
جو ٹوٹی ہوئی جھونپڑی بے ضرر ہو ÷ بھلی اس محل سے جہاں کچھ خطر ہو

سامراج کی گرفت جتنی مضبوط ہوتی گئی غلامی کا احساس اتنی ہی شدت اختیار کرتا گیا۔ سرورؔ جہاں آبادی نے تڑپ کر کہا۔

آہ اے خاکِ وطن اے دردمندِ بیقرار ÷ آہ اے شوریدہ قسمت اے پریشاں روزگار
اڑ رہا تھا پرچمِ شوکت ترا افلاک پر ÷ سرنگوں ہے تیری عظمت کا نشاں اب خاک پر

اسی کے پہلو بہ پہلو ہندوستان کی گزشتہ عظمت کا احساس بھی بیدار ہوتا گیا۔ اقبالؔ نے ترانۂ ہندی اور ہندوستانی بچوں کا قومی گیت وغیرہ میں اسی عظمت و جذبۂ محبت کے گیت گائے۔ محبت کا دوسرا پہلو غیر سے نفرت بھی ہے۔ اس کی چنگاریاں بھی اڑیں اور سرورؔ و حسرتؔ کے یہاں نمودار ہوئیں۔ چکبستؔ ان تمام احساسات و جذبات کے وارث تو تھے ہی لیکن خود ان کی دین بھی کم اہم نہیں ہے۔

چکبستؔ کو وطن سے والہانہ عشق ہے۔ وہ اس کے ذرّے ذرّے سے محبت کرتے ہیں لیکن ان کی یہ محبت صرف جذباتی نہیں ہے بلکہ اس میں سماجی اور سیاسی شعور نمایاں ہے۔ ان کا جذبۂ محبت انھیں صرف نعرہ زنی اور نیست گوئی پہ آمادہ نہیں کرتا بلکہ وہ جذبۂ عمل کا طالب ہے۔ وہ قربانیوں کی مانگ کرتا ہے اور وہ مصالحت سے انکار کرتا ہے۔ چکبستؔ اپنے زمانے کی آواز ہیں اس زمانے میں "ہوم رول" کا مطالبہ عام تھا اور وہ اسی مطالبے کو شدت سے دہراتے تھے۔ لیکن اس زمانے میں حکومت اس کو بھی جرم سمجھتی تھی۔ اور "ہوم رول" کا مطالبہ کرنے والوں کو قید و بند کی سزا بھگتنا پڑتی تھی۔ چنانچہ مسز بیسنٹ نے اسی الزام میں قیدِ فرنگ کاٹی، جب وہ گرفتار ہوئیں تو چکبستؔ کا دل چیخ اٹھا ؎

تو نے پودا جو لگایا تھا وہ پھل لایا ہے ÷ آبروئے قوم نے پانی ہے وہ دن آیا ہے
ہم نے بجھتے ہوئے دل کا نشاں پایا ہے ÷ مرنے والوں کی وفا کا یہی سرمایا ہے
دل تڑپتا ہے کہ سوراج کا پیغام ملے ÷ کل ملے، آج ملے، صبح ملے، شام ملے
حکمِ حاکم ہے کہ فریادِ زبانی رک جائے ÷ دل کی بہتی ہوئی گنگا کی روانی رک جائے
قوم کہتی ہے ہوا بند ہو، پانی رک جائے ÷ پر یہ ممکن نہیں ابھرتی جوانی رک جائے

بوں خبردار جنھوں نے یہ اذیت دی ہے ÷ کچھ تماشا نہیں یہ قوم نے کروٹ لی ہے

اگرچہ چکبست نے اس موقع پر "سوراج" کا لفظ استعمال کیا ہے لیکن ان کے عام خیالات سے باخبر حضرات جانتے ہیں کہ انھوں نے یہ لفظ "ہوم رول" کے مترادف معنوں میں استعمال کیا ہے "ہوم رول" کی مانگ انھوں نے بار بار اور واضح لفظوں میں کی ہے ؎

جو دل سے قوم کے نکلی ہے وہ دعا ہے یہی ÷ تھا جس پہ ناز مسیحا کو وہ صدا ہے یہی
دلوں کو مست جو کرتی تھی وہ ادا ہے یہی ÷ غریب ہند کے آزار کی دوا ہے یہی
نہ چین آئے گا بے ہوم رول پائے ہوئے ÷ فقیر قوم کے بیٹھے ہیں لو لگائے ہوئے
یہ جوشِ پاک زمانہ دبا نہیں سکتا ÷ رگوں میں خوں کی حرارت مٹا نہیں سکتا
یہ آگ وہ ہے جو پانی بجھا نہیں سکتا ÷ دلوں میں آ کے یہ ارمان جا نہیں سکتا
طلب فضول ہے کانٹوں کی پھول کے بدلے ÷ نہ لیں بہشت بھی ہم "ہوم رول" کے بدلے

۱۹۱۶ء میں جب انڈین نیشنل کانگریس کا اجلاس لکھنؤ میں ہوا تو انھوں نے ایک زوردار نظم پڑھی ایک شعر رام بابو سکسینہ نے ضمیمہ "تاریخ ادب اردو" میں نقل بھی کیا ہے ؎

برطانیہ کا سایہ سر پر قبول ہوگا ÷ ہم ہوں گے عیش ہوگا اور "ہوم رول" ہوگا

نظریہ "ہوم رول" اندرونی آزادی کے ساتھ ساتھ برطانوی اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرتا تھا، لیکن یہ جنگ آزادی کا ایک سنگِ میل ہی تھا۔ عملاً ہر حساس ہندوستانی برطانیہ کی برابری کا دعویدار تھا۔ چکبست کے اس شعر سے یہ مطلب لینا غلط ہوگا کہ انھوں نے برطانوی اقتدار سے مصالحت کر لی تھی۔ کلکتہ یونیورسٹی کا نووکیشن میں تقریر کرتے ہوئے لارڈ کرزن نے ہندوستان کے اخلاق و تہذیب پر کچھ ناروا حملے کئے تھے۔ یہ سن کر چکبست شیر گرسنہ کی طرح جھپٹ پڑے اور "ایک سے جھپٹ" کے عنوان سے ایک نظم لکھ کر "اودھ پنچ" میں شائع کرائی ؎

لیجئے سامنے میرے ہے شبیہ کرزن ÷ رنگ اس طرح بدلتی ہے کہ جیسے گرگٹ
اب مناسب ہے یہی کیجئے پنجرا خالی ÷ ہم بھی خوش آپ بھی خوش مٹ گئی ہر جھنجھٹ
یا الٰہی یہ چلی بادِ مخالف کیسی ÷ آ گیا اڑ کے جو لندن سے یہ کوڑا کرکٹ
یاد رکھو حشر تلک بھی نہ تجھے بھولے گی ÷ گو کھلے کی وہ جھاڑ اور وہ حبا کی ڈپٹ

چکبست کا دردِ قومی اُن کے مرثیوں میں دلِ شاعر کی آواز بن جاتا ہے۔ انھوں نے واقعتاً کچھ بہت ہی اچھے قومی مرثیے کہے ہیں جن کی گونج پڑھنے والوں کے دلوں میں آج بھی پوری شدت سے سنائی دیتی ہے۔ خصوصاً کرشن گوکھلے کے مرثیے کا یہ بند۔

اجل کے دام میں آنا ہے یوں تو عالم کو ÷ مگر یہ دل نہیں تیار تیرے ماتم کو
پہاڑ کہتے ہیں دنیا میں ایسے ہی غم کو ÷ مٹا کے تجھ کو اجل نے مٹا دیا ہم کو
جنازہ ہند کا در سے تیرے نکلتا ہے ÷ سہاگ قوم کا تیری چتا میں جلتا ہے

بال گنگا دھر تلک کے لئے ان کے حساس دل نے یوں فریاد کی ؎

اُٹھ گیا دولتِ ناموسِ وطن کا وارث ؛ قومِ مرحوم کے اعزازِ کہن کا وارث
جان نثارِ ازلی، شیرِ دکن کا وارث ؛ پیشواؤں کے گرجتے ہوئے رن کا وارث
تھی سمائی ہوئی پونا کی بہار آنکھوں میں ؛ آخری دور کا باقی تھا خمار آنکھوں میں

چکبست کی قوم پرستی تاریخِ ماضی سے گہری وابستگی کی وجہ سے بھی خاص امتیاز رکھتی ہے اور چونکہ ماضی کی تاریخ میں شمشیر و سناں اٹھانے کے مواقع بھی آتے ہیں اس لئے چکبست کے ہیرو تاریخِ ماضی کے نبرد آزماؤں کی صف میں بھی نظر آتے ہیں۔

گاندھی جی کو ہندوستان کے سیاسی افق پر آئے ہوئے کل چھ برس ہوئے تھے کہ موت نے چکبست کو ہم سے ہمیشہ کے لئے چھین لیا۔ لیکن وہ گاندھی جی کی سرگرمیوں سے ابتدا ہی سے رابطہ رکھے تھے۔ جب ۱۹۱۴ء میں مہاتما گاندھی نے جنوبی افریقہ میں اپنی تحریک شروع کی تو چکبست نے "فریادِ قوم" کے عنوان سے گاندھی جی کو مخاطب کرتے ہوئے ایک نظم لکھی اور انھیں وطن کے حالات کی طرف متوجہ کیا۔

وطن سے دور ہیں ہم پر نگاہ کر لینا ؛ ادھر بھی آگ لگی ہے ذرا خبر لینا

اسی طرح گاندھی جی کی قید و بند سے متاثر ہو کر بھی چکبست نے کہا تھا۔

وطن کے واسطے زنجیر و طوق گہنا ہے ؛ وفا کے شوق میں گاندھی نے جس کو پہنا ہے

چکبست کی قومی شاعری اپنی پیش رو قومی شاعری سے اس لئے بھی مختلف ہے کہ یہ جوانی کی آواز ہے۔ ایک نوجوان حال اور مجاہد قوم کی آواز ہے۔ انھوں نے سماجی مسائل پر بھی جو نظمیں لکھی ہیں ان میں بھی بلکہ مذہبی نظموں میں بھی اُن کے ی جذبۂ عمل کی آواز گونج جایا کرتی ہے۔ وطن کی عظمت، وطن کی آزادی، وطن کی خوشحالی کے جلوے اُن شاعرانہ آنکھوں میں ناچتے رہتے ہیں مثلاً پھول مالائیں کہتے ہیں۔

پوجنے کے لئے مندر جو ہے آزادی کا ؛ اس کو تفریح کا مرکز نہ بنانا ہرگز

نوجوانوں کے بارے میں "مرقعِ عبرت" میں کہتے ہیں۔

موجود ہے جن بازوؤں میں اور جوانی ؛ طوفان سے انھیں کشتیٔ قومی ہے بچانی
کیا ہے مئے غفلت سے سروں میں یہ گرانی ؛ آرام پسندی میں یہ رکھتے نہیں ثانی
پہلو میں کسی کے دلِ دیوانہ نہیں ہے ؛ ہیں مرد مگر ہمتِ مردانہ نہیں ہے

غرض چکبست ہمارے ابتدائی قومی شاعروں میں ایک بلند قامت شاعر ہیں اور وہ نہ صرف اردو کے شاعروں میں بلکہ ہندوستان کی تمام زبانوں کے قومی شعراء پر ایک بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے دوستوں نے بجا طور پر ان کے دیوان کا نام "صبحِ وطن" تجویز کیا۔ واقعتاً وہ "صبحِ وطن" کے نقیب ہیں۔

••

خوشحال زیدی

تحقیق کیلئے موضوع کا انتخاب

تحقیق میں سب سے مشکل اور پہلا کام محقق کے لئے مناسب موضوع کے انتخاب کا ہے۔ اس کے سامنے مختلف سوالا
وہ کس قسم کے موضوع کا انتخاب کرے ؟ کس قسم کے موضوعات پر تحقیق کی ضرورت ہے ؟ کس قسم کے موضوع پر وہ بآس
کرسکتا ہے ۔ نیز کس موضوع کی ادب میں کیا اہمیت ہے؟

تحقیق کے ذریعہ حقیقت کی تلاش اور کسی اہم موضوع یا مسئلہ کو سلجھانے میں بہت زیادہ وقت اعلیٰ صلا
جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے ۔ اس لئے کسی بھی موضوع کے انتخاب سے پیشتر اپنی صلاحیت دسترس اور فرد
مدنظر رکھنا چاہیئے۔ کسی موضوع کے انتخاب کے سلسلے میں کسی قسم کے ذرائع یا طریقۂ کار کے بارے میں لکھنے سے
ماہرانہ نظر تحقیق اور تحقیق کے طریقۂ کار کی خصوصیات پر ڈالنا زیادہ مناسب ہے ۔

— تحقیق بے شمار علم کے اضافہ کے ساتھ ساتھ انسانی فلاح و بہبود میں بہت بڑا رول ادا کرتی ہے۔ بقول جے اڈ با
"محقق کی خوبی ایک چیونٹی کے مانند ہونا چاہیئے جو کہ دانا دانا اپنے بل میں لے جاتی ہے"

— تحقیق محض کسی ایک انسان کی کوشش نہیں بلکہ یہ مجموعی کوششوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔

— عظیم سے عظیم تر انکشافات اور ایجادات بہت کم اتفاق پر مبنی ہیں۔ یہ سب تحقیق ہی کا نتیجہ ہیں۔

— محقق ایک عام آدمی سے ہٹ کر ہوتا ہے۔ اس کو اس موضوع یا اس میدان میں امتیاز ہوتا ہے ۔ اس
بڑے بڑے مسائل کو وہ بآسانی حل کرسکتا ہے۔ تحقیق میں وہ اصولوں کو ایک رائفل کی حیثیت سے استعمال کرتا ہے شاٹ گ

— تحقیق کا مطلب محض اعداد وشمار (DATA) جمع کرنا ہی نہیں ہے بلکہ محقق ان کا تجزیہ کرتا ہے۔ تجز
باریک بینی اور ہوشمندی سے تجزیہ کرکے ہی کسی نتیجہ پر پہونچتا ہے۔

عموماً تحقیق کے لئے پہلا پراجیکٹ، کسی بھی طالب علم کے لئے ڈگری سطح پر ابتدائی تحقیق گریجویٹ کورس یا
کورس ہوتا ہے۔ جو کہ ڈزرٹیشن (DISSERTATION) یا کسی مختصر تحقیقی مقالے کی شکل میں ہوتا
مقصد تحقیق میں لگنا ہی نہیں بلکہ عملی طور پر کسی ضرورت کے تحت کسی تحقیقی (ضمنی یا مختصر) کام میں بطور مشق یا
تحقیق لگنا ہوتا ہے۔ گزشتہ برسوں میں ادب میں زیادہ تر تاریخی موضوعات پر تحقیقی کام ہوتے آئے ہیں۔
مسائل میں کلاس روم ریسرچ یا ایکشن ریسرچ (CLASS ROOM / ACTION RESEARCH) کے ذریعہ
جس میں تحقیق کے ان طریقۂ کار کو آزمانے کی کوشش کی جاتی ہے جو کہ طالب علم کتابوں میں پڑھتے چلے آرہے ہیں۔
جہاں تک تحقیق کے لئے کسی موضوع کے انتخاب کا سوال ہے وہ طالب علم کی ضرورت اور وہ کسی معیار پر

اس پر منحصر ہے۔ مختلف طالب علموں کے مختلف مسائل (PROBLEMS) ہیں۔ کوئی طالب علم ایم۔ اے کے لئے مختصر تحقیقی مقالہ لکھنا چاہتا ہے، کوئی ایم فل (M. PHILL) کے لئے اور کوئی بڑے پیمانہ پر ریسرچ یعنی کمل تحقیق کرنا چاہتا ہے۔ کمل تحقیق کے لئے یا بڑے پیمانے پر تحقیق کے لئے موضوع یا مسئلہ کا انتخاب اور اس کا طریقۂ کار ایم۔ اے یا ایم فل کے موضوع سے قطعی مختلف ہوگا۔ بہت سے طالب علم ایم اے یا ایم فل میں جس موضوع پر چھوٹے پیمانہ پر تحقیق کرتے ہیں بعد میں پی ایچ ڈی کے لئے اس موضوع کو بہت واضح طور پر نہایت سنجیدگی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت دیتے ہوئے اس کو پوری طرح حل کرتے ہیں۔

تحقیق کے لئے کسی بھی مناسب مسئلہ یا موضوع کا انتخاب بہت نازک اور مشکل کام ہے۔ موضوع کے انتخاب کے لئے (درج ذیل ذرائع (ہر قسم کے تحقیقی موضوع کے لئے) خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

۱۔ اسکول، کالج، کلاس اور سماج یا سوسائٹی، موضوع کے انتخاب میں بہت موزوں ثابت ہوسکتے ہیں۔ ہر محقق روزمرہ ادب میں مختلف مسائل اور الجھنیں محسوس کرتا ہے جیسے جیسے انکشافات، تحقیقات اور ایجادات بڑھ رہی ہیں۔ نئے نئے موضوعات۔ اور مسائل پیدا ہوتے جارہے ہیں۔ زیادہ تر مسائل طالب علم اور استاد دونوں کے سامنے دوران تعلیم یا دوراِ مطالعہ آتے ہیں۔ جن پر تحقیق کی ضرورت وہ از خود محسوس کرتے ہیں۔

۲۔ موجودہ سائنٹیفک تحقیقات، ایجادات، تبدیلیاں اور سماجی، اخلاقی، تمدنی اور تہذیبی ارتقاء، یہ سب تحقیق کے لئے نئے نئے مسائل اور سہولتیں فراہم کررہی ہیں۔ موجودہ تعلیمی، کاروباری اور سائنسی ترقیات، تعلیم اور ادب دونوں کو نئی نئی تحقیقات کے لئے چیلنج دے رہی ہیں۔

۳۔ ڈگری سطح کی تعلیمی تجربات بھی مسئلہ کے انتخاب اور اس کے حل کرنے کے طریقۂ کار کو متعین کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ مثلاً کلاس روم، لیکچرز، تعلیمی اور ادبی مباحث، سیمینار، رپورٹس، اپنے ساتھیوں اور سمجھدار لوگوں سے تبادلۂ خیالات۔ سمپوزیم، ورک شاپ، یہ تمام چیزیں ایسی ہیں جو کہ مسئلہ یا موضوع کے انتخاب اور ان کے حل کرنے میں تحقیق کے لئے بہت مددگار ثابت ہوتی ہیں۔

۴۔ درسی کتب کے ادبی، تحقیقی اور تنقیدی مقالے، خصوصی مقالے، مختلف اداروں کی رپورٹیں، اور ٹرم پیپر بھی نئے موضوعات کے انتخاب کا بہترین ذریعہ ہیں۔ انسائیکلو پیڈیا آف سوشل سائنسز، انسائیکلو پیڈیا آف ایجوکیشن نفسیاتی اور ادبی موضوعات پر وضاحتی تلخیص (ABSTRACT GENERAL) مختلف تحقیقی موضوعات کے مقدمات، مختلف تحقیقی مقالوں پر محققین کی سفارشات تحقیقی موضوعات پر مبنی رسائل، ادبی رسائل، مختلف یونیورسٹیوں کے تحقیقی مقالا کا تفصیل مطبوعہ وغیر مطبوعہ ڈزرٹیشن اور اسی قسم کی مطبوعات یہ تمام ذرائع ہیں کسی موضوع کے انتخاب کے لئے۔

۵۔ نگران یا کسی خاص موضوع کے اسپیشلسٹ یا تجربہ کار پروفیسرز کے مشورے بھی انتخاب موضوع کا بہترین ذریعہ ہیں۔ تحقیقی موضوع کے انتخاب کے بعد اور تحقیق کا کام شروع کرنے سے پہلے محقق کے ذہن میں اس موضوع پر مختلف سوالات پیدا ہوجاتے ہیں۔ جو کہ اپنے ساتھیوں، نگران، اساتذہ اور پروفیسرز کے سامنے یا ان کے ذریعہ رکھے جاتے ہیں۔ اگر محقق اور نگراں ان سوالات کے جوابات تسلی بخش دیتے ہیں تو اس موضوع پر تحقیق کرنا زیادہ مناسب سمجھا جاتا ہے۔

تحقیق میں ندرت اور اصلیت کسی بھی موضوع کے لئے خاص توجہ کا مرکز ہے۔ اس موضوع یا اس سے متعلق موضوع پر پہلی گذشتہ تحقیق کو وسیع پیمانہ پر بڑھایا جاسکتا ہے۔ اس کے نئے گوشوں پر روشنی ڈالی جاسکتی ہے۔ گزشتہ تحقیق کے نتائج کا دیکھنا بھی ضروری ہے۔ نئے اور بہتر طریقۂ کار اور اصولوں کے تحت اس مسئلہ یا موضوع کے گزشتہ نتائج کو ضرور دیکھنا چاہیئے۔

تحقیق کا مجوزہ خاکہ ریسرچ کا پہلا اور مستحسن اقدام ہے۔ بہت سے ادارے کسی موضوع پر تحقیق شروع کرنے سے قبل موضوع کا مجوزہ خاکہ پیش کرنا ضروری سیکھتے ہیں جس کے ذریعہ مناسب اور سلسلہ وار طریقۂ کار کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ یعنی جس کے ذریعہ تحقیق میں آسانیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس پیشکش میں ایک مناسب اور بہتر آئینہ دار کہلاتا ہے جو کہ اس ریسرچ پراجیکٹ اور اس ریسرچ کے نتائج کے لئے بہت ضروری ہے۔

ریسرچ پروپوز کے ذریعہ اس تحقیق موضوع کی مختصر وضاحت اور اس موضوع کے خاکے کے ہر پہلو کی وضاحت کی جاتی ہے جو کہ تحقیق میں بہت معاون ثابت ہوتا ہے۔ اس خاکہ اور اس کی وضاحت کو عام طور پر (SYNAPSIS) کیا جاتا ہے یہ میسیز درج ذیل شکل میں ہو سکتی ہے۔

(الف) اس موضوع کا تعارت، براہ راست یا سوالیہ شکل میں۔ (ب) تحقیق کے لئے اس موضوع کی اہمیت (ج) موضوع کی تعریف (DEFINITION) اس کی وسعت اور حدود (د) موضوع سے متعلق تحقیقات یا ادب کا مختصر خاکہ (ہ) آزمائے جانے والے طریقۂ کار کی تفصیل۔

یہاں ہم ایک (SYNAPSIS) کا نمونہ پیش کر رہے ہیں۔

موضوع :- "اردو کی درسی کتب میں حب الوطنی" برائے ایم۔ ایڈ

تعارف، اہمیت اور تحقیق کی ضرورت :- تعلیم میں درسی کتب اپنا ایک منفرد مقام رکھتی ہیں۔ زبان (LANGUAGE) کی درسی کتب تعلیم میں بہت اہم رول ادا کرتی ہیں۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ اسکول، کالج میں، طالب علم کی حصول تعلیم کا انحصار پوری طرح کتب پر ہی ہوتا ہے۔

دور جدید میں یہ بات بھی واضح ہو چکی ہے کہ کسی بھی مادری زبان کی درسی کتب تعلیم کے مقاصد کے علاوہ بہت سے نظریات اور خیالات کی وسعت میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ اس لئے درسی کتب ایسی ہونی چاہیئے کہ طلباء کے جذبات میں قومی جذبہ، قومی دلچسپی اور جوش و خروش پیدا کریں۔

یہاں یہ بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ کسی بھی زبان کی درسی کتب ادبی مقاصد کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ طلباء میں قومی، سماجی مقاصد اور جذبات کو بڑھا دیتی ہیں۔ ساتھ ہی نوجوان طلباء میں جوش و خروش میں بھی بہت کارگر ثابت ہوتی ہیں یہ بات اس وقت اور بھی اہم ہو جاتی ہے جب کسی زبان کو کسی بھی اقلیتی فرقہ کی زبان کہا جاتا ہے۔

جہاں تک تحقیق کی معلومات کا دائرہ ہے اس موضوع پر ابھی تک کوئی تحقیقی کام اردو میں نہیں ہوا ہے۔ اور نہ ہی درسی کتب میں حب الوطنی کے عناصر کو تلاش کیا گیا ہے۔ محقق نے اپنے اس تحقیقی موضوع میں اترپردیش ہائی اسکول (اردو زبان) میں پڑھائی جانے والی کتب کا انتخاب کیا ہے۔ ان کتب میں موجودہ اسباق میں حب الوطنی کے عناصر کی تلاش کرنا محقق کا مقصد ہے۔

ہائی اسکول درجات کی کتب کا انتخاب اس لئے کیا گیا ہے کہ عموماً ان درجات میں بالغ طلبا ہوتے ہیں جو کہ زبان کی ٹیکنک سے واقف ہو چکے ہوتے ہیں۔ بآسانی کسی بھی زبان کو لکھ پڑھ سکتے ہیں اور سمجھ سکتے ہیں۔ ہائی اسکول میں ادب (لٹریچر) نصاب میں داخل ہوتا ہے سب سے بڑی بات یہ ہے کہ طالب علم ان درجات میں عمر کے اعتبار سے بہت ہی نازک دور سے گزرتا ہے۔ جس میں اس کی شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے۔

اس پیش کردہ تحقیق میں محقق ان درسی کتب کا اس (حب الوطنی) نظریہ سے مطالعہ کرے گا۔

تحقیق کا مقصد

اپنی تحقیق میں محقق درج ذیل سوالات کے جوابات حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔

(الف) ہائی اسکول کی اردو درسی کتب کس حد تک اپنے مقاصد پورا کرنے میں کامیاب ہیں۔ نیز کہاں تک طلباء میں حب الوطنی کے جذبہ کو پیدا کرتی ہیں اور بڑھا دیتی ہیں۔ ؟ (ب) براہ راست یا کسی بھی دوسرے طریقہ سے کس حد تک حب الوطنی کے عناصر ان اسباق میں موجود ہیں ؟ (ج) کسی کتاب کے کسی سبق میں حب الوطنی اور ملک و قوم کے مفاد کے منافی تو عناصر تو نہیں ہیں جو کہ طلباء پر غلط اثر ڈالتے ہیں ؟ (د) طالب علم ان اسباق سے کس قسم کے نتائج اخذ کرتا ہے۔ نیز یہ اسباق کس حد تک طالب علم کو متاثر کرتے ہیں ؟

حدود

یہ تحقیق صرف ہائی اسکول یوپی بورڈ میں پڑھائی جانے والی درسی کتب تک ہی محدود رہے گی۔

طریقہ کار اور وسائل

اس تحقیق میں سوالنامہ معہ وسیلے کی شکل میں استعمال کیا جائے گا جو کہ تیس تجربہ کار اور قابل اساتذہ اور نوے طلباء کو بھیجا جائے گا۔ سوالنامہ میں دیئے گئے سوالات کے جوابات دیتے ہوئے طلباء و اساتذہ دونوں اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کریں گے۔ محقق خود بھی چند اساتذہ و طلباء سے ملے گا۔ اور اس موضوع پر وضاحت کے ساتھ ان کی رائے لیتے ہوئے تبادلۂ خیال کرے گا۔

جو نتائج اخذ کئے جائیں گے ان کی روشنی میں کچھ مشورے دیئے جائیں گے۔ جو کہ کتب کی تیاری اور خصوصاً اردو کی درسی کتب کی تیاری کے لئے مشعل راہ ہوں گے۔ تاکہ ان کتب میں حب الوطنی کے عناصر زیادہ سے زیادہ پیش کئے جائیں اور یہ جذبہ طلباء میں پیدا کر کے اس کو ابھارا جا سکے۔

چند اہم موضوعات برائے تحقیق

۱۔ بہادر شاہ ظفر کا عہد اور ان کی زندگی۔ ۲۔ اردو قطعات کا فن اور تدریجی ارتقاء ۳۔ اردو اور ہندی شاعری کا تقابلی مطالعہ ۴۔ اردو افسانوں میں کردار نگاری ۵۔ اردو اور پنجابی کا لسانیاتی رشتہ ۶۔ اردو میں مذہبی ادب ۷۔ اردو میں مستعمل انگریزی الفاظ کا تحقیقی مطالعہ ۸۔ اردو اور ہندی کے عروض کا تقابلی مطالعہ ۹۔ اردو میں نعتیہ شاعری ۱۰۔ اردو میں بچوں کا ادب ۱۱۔ اردو میں اخلاقی شاعری ۱۲۔ اردو ادب پر تقسیم ہند کے اثرات ۱۳۔ اردو ادب پر سماجی اور اقتصادی حالات کا اثر۔ ۱۴۔ اردو ادب میں تمثیل نگاری۔ ۱۵۔ لکھنؤ میں مرثیہ نگاری ۱۶۔ اردو نثر میں رومانوی تحریک ۱۷۔ اردو شاعری کے مذہبی اور فلسفیانہ عناصر ۱۸۔ اردو میں ایہام گوئی کا دور۔ ۱۹۔ اردو شاعری میں عورت کا کردار ۲۰۔ اردو شاعری میں پیکر نگاری ۲۱۔ اردو ادب میں سیاسی اور میلانی رجحانات ۲۲۔ مابعد غیر شخصی مرثیہ نگاری۔ ۲۳۔ اردو کا مکاتیبی ادب ۲۴۔ اردو صحافت کا ارتقاء ۲۵۔ اردو ناول نگاری ۱۹۴۷ء کے بعد ۲۶۔ اردو افسانہ نگاری ۱۹۴۷ء کے بعد ۲۷۔ اردو تنقید ۱۹۴۷ء کے بعد ۲۸۔ اردو کے علمی اور تصنیفی ادارے ۲۹۔ اردو

ناول میں عورت کا تصور۔ ۳۰۔ اُردو میں خاکہ نگاری ۳۱۔ اردو تذکروں کی ادبی اہمیت۔ ۳۲۔ اردو شاعری میں مختلف رجحانات ۳۳۔ اُردو عروض کا تنقیدی مطالعہ ۳۴۔ اردو کا زندانی ادب ۳۵۔ اُردو ادب میں سیرت النبیؐ ۳۶۔ اردو میں سنسکرت اور ہندی کے تراجم۔ ۳۷۔ اُردو شاعری میں سانیٹ ۳۸۔ اردو شاعری میں نظم معریٰ۔ ۳۹۔ اُردو زبان و ادب پر انگریزی کا اثر ۴۰۔ اُردو لغت نویسی کا ارتقاء۔ ۴۱۔ اُردو کی درسی کتب کا تاریخی اور تنقیدی جائزہ ۴۲۔ اُردو کی اعلیٰ تعلیم ۱۹۴۷ء کے بعد۔ ۴۳۔ اُردو گیتوں کا تنقیدی جائزہ۔ ۴۴۔ اُردو میں یورپینوں اور اینگلو انڈینوں کی خدمات ۴۵۔ اُردو ہجویات ۴۶۔ اُردو میں خواتین ناول نگاری ۴۷۔ اُردو کے ہندو شاعر ۴۸۔ اقبال کا ذہنی ارتقاء ۴۹۔ امتیاز علی تاج حیات و کارنامے۔ ۵۰۔ اُردو مرثیہ نگاری ۱۸۸۰ء کے بعد دکن میں۔ ۵۱۔ مخدوم محی الدین حیات اور کارنامے ۵۲۔ سردار جعفری شخص اور شاعر ۵۳۔ راجندر سنگھ بیدی۔ فن اور شخصیت ۵۴۔ کیفی اعظمی۔ فن اور شخصیت ۵۵۔ ہندوستان میں اُردو تحقیق۔ ۵۶۔ اُردو ادب میں طنز و مزاح ۱۹۴۷ء کے بعد ۵۷۔ بیسویں صدی میں دہلی کی اُردو صحافت۔ ۵۸۔ بہار میں اُردو مرثیہ نگاری۔ ۵۹۔ ۱۸۵۷ء سے قبل اُردو کا نثری ادب ۶۰۔ دلی کالج کی ادبی خدمات۔ ۶۱۔ دلی میں اردو مرثیہ نگاری ۶۲۔ فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات ۶۳۔ مرزا ہادی رسوا۔ حیات اور کارنامے ۶۴۔ قرۃ العین حیدر۔ حیات اور کارنامے ۶۵۔ ڈاکٹر عابد حسین حیات اور کارنامے ۶۶۔ اُردو روہیلکھنڈ میں ۶۷۔ گارساں دتاسی کی ادبی خدمات ۶۸۔ عبدالرحمٰن بجنوری کی ادبی خدمات ۶۹۔ جامعہ ملیہ کی ادبی خدمات ۷۰۔ مسعود حسین رضوی ادیب حیات اور کارنامے ۷۱۔ رشید احمد صدیقی۔ حیات اور کارنامے ۷۲۔ عبدالماجد دریابادی حیات اور کارنامے ۷۳۔ کرشن چندر حیات اور کارنامے ۷۴۔ آسی غازی پوری حیات اور کارنامے ۷۵۔ اصغر گونڈوی، حیات اور کارنامے ۷۶۔ سوانح اور انتقاد ۷۷۔ شاد عارفی۔ بہ حیثیت رومانی شاعر ۷۸۔ نئی شاعری کی منفرد آوازیں ۷۹۔ ریاست ٹونک کی ادبی خدمات ۸۰۔ ریاست رامپور کی ادبی خدمات ۸۱۔ ریاست حیدرآباد کی ادبی خدمات ۸۲۔ کوٹلہ کی ادبی خدمات۔ ۸۳۔ کرناٹک میں اُردو ۸۴۔ اُردو کے چند اہم سیمینار ۸۵۔ اُردو میں تدریسی ادب ۸۶۔ اُردو میں ادبی تبصروں کی روایت ۸۷۔ اُردو لغت کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ ۸۸۔ عادات اور تہذیب ۸۹۔ قواعد نویسی۔ ۹۰۔ زبان اور قواعد۔ ۹۱۔ زبان اور عادات ۹۲۔ لغات کا لسانیاتی تجزیہ۔ ۹۳۔ دو لسانی لغات کا تجزیہ ۹۴۔ کلاسیکی ادب کی لغات ۹۵۔ شیکسپیر کے اثرات۔ اُردو ڈرامہ نگاری پر ۹۶۔ جدید اُردو ادب پر مغربی اثرات ۹۷۔ اُردو کی داستانوں کا تہذیبی مطالعہ ۹۸۔ کلیم الدین احمد۔ بہ حیثیت شاعر اور نقاد۔ ۹۹۔ قدیم اردو ادب میں ہندوستانی معاشرت۔ ۱۰۰۔ جوش ملیح آبادی۔ بہ حیثیت مرثیہ نگار وغیرہ وغیرہ — ••

بقیہ اُردو نامہ ص۲۶ سے آگے :

... اور رؤف خیر نے کلام سنایا۔ اجلاس سے قبل "اقلیم ادب" کے نئے انتخابات عمل میں آئے جس میں مسرز غنی نعیم (صدر)، یس ٹی یم عاصم (نائب صدر) اور جمیل شیدائی معتمد منتخب ہوئے۔

• ادارہ قدر ادب کی محفل دو بیتی و غزل جناب رائے جسونت رائے ضیاء منعقد ہوئی۔ کئی شاعروں نے رباعیات اور غزلیں سنائیں

ڈاکٹر مظفر حنفی

اُودی کلیاں ، بھینی پھول ، اگست چاند ، کھنکتا پانی
ہرا سمندر ، گوپی چندر ، بولو مچھلی کتنا پانی
دو بوندوں کی حسرت لے کر چپ ٹیلے پر ریت کھڑی تھی
چاروں جانب گھنگھرو باندھے رم جھم رم جھم برسا پانی
جی ہاں میں نے بھی دیکھا تھا اس کا کوئی درشن نہیں ہے
جب شعلوں کا ناچ ہوا تھا ، کافی دور کھڑا تھا پانی
پھلواری میں جھلمل جھلمل چاند کرن کب تک ٹھہرے گی
میں بس کے چکر میں بیٹھا کاٹ رہا ہوں کالا پانی
ایک لق و دق صحرا میں ہم دھوپ کے نیزے جھیل رہے ہیں
ہاتھوں میں چھوٹی سی رسی اور کنوئیں کا تازا پانی
سوکھی شاخیں سوچ رہی ہیں ، اب آنے سے کیا ہوتا ہے
پتے تالی پیٹ رہے ہیں ، آیا پانی ، آیا پانی !
گھور اندھیرا گھپ ہے لیکن مستقبل کی آس کے جگنو
میری جلتی پیشانی پر ڈال رہے ہیں ٹھنڈا پانی !
جب جب اس کی یاد آتی ہے لہو میں تیزی آ جاتی ہے
وہ پربت کی اونچی چوٹی میں جھرنے کا بہتا پانی

نظیر صفی پوری

اک کرن چمکتی ہے جس طرح نگینے میں
ایسے اس کا جلوہ ہے آئینے کے سینے میں
رنج سے نہ گھبرانا جان ہے محبت کی
میرا غم بہلتا ہے مسکرا کے جینے میں
اک حسین عالم ہے تیرے غم کا ہر آنسو
آسماں سمویا ہے ہم نے آبگینے میں
جستجو تو کرتا ہوں میں سکونِ ساحل کی
آرزو پریشاں ہے ذہن کے سفینے میں
کچھ نئے دیئے چمکے ذہن کے دریچوں سے
اب تو فرق آئے گا زیست کے قرینے میں
وقت کا تقاضہ ہے زندگی کو پہچانو
کچھ تو فاصلہ رکھو مرنے اور جینے میں
جانے وہ کب آ جائے شمعِ زندگی لیکر
آہٹیں کھنکتی ہیں حسرتوں کے زینے میں
اے نظیر اُن آنکھوں میں آج میرا چہرہ ہے
آج لطف آئے گا میکدہ کا پینے میں

غزلیں

اسلم عمادی

نئی زندگی اور نئی اُردو شاعری

نئی زندگی صنعتی روز و شب سے مالا مال ہے، دن بدن نئی صنعتیں اُونچے اور عظیم کارخانے، تعمیراتی اور مصروف کارگاہیں شہروں کی صورتیں بدلتے جا رہے ہیں۔ یہ ارتقا کی منزلیں ہیں۔ اور قوم ارتقا کی راہ میں منزل بہ منزل رواں دواں ہے۔ ملازمتوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ ہر صبح، ہر سہ پہر، ہر نیم شب کتنے ہی پڑھے لکھے، صنعتی کاریگر اور نوجوان شہروں سے جمع کرکے آبادی سے دُور، دُور دراز صنعتی مراکز کی طرف لے جائے جاتے ہیں تاکہ وہ ایک مخصوص وقت تک قوم کی اس روز افزوں عظمت کے منادر میں اپنے خون پسینے کو نذر کر سکیں۔

اقتصادی زندگی (بلکہ معاشرتی زندگی) ترقی اور مسرت کی جانب رواں دواں ہے لیکن کیا سماجی زندگی کی بھی یہ صورت ہے۔ میرا خواب افسوسناک طور پہ نفی ہے جہاں انسان اپنی دانشوری سے نت نئے کارنامے انجام دے رہا ہے، نوع بہ نوع کارخانے قائم کرتا جا رہا ہے، وہیں اس کی زندگی بہ حیثیت ایک فرد کے کم سے کم تر اور محدود سے محدود تر ہوتی جا رہی ہے بلکہ اس کا ایک فرد کے طور پہ کوئی جداگانہ کردار نہیں رہا، وہ معاشی تار و پود میں ایک ریشہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ صنعتی کلوں میں اس کی ہستی ایک پُرزہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔

عموماً (بلکہ صدیوں سے) یہ سمجھا جاتا رہا ہے کہ ایک ذہین شخص ایک بڑا کاریگر ہوتا ہے۔ لیکن موجودہ صنعتی زندگی ایک ذہین کے مقابل ایک پابند اور نظام الاوقات کے اسیر شخص کی ضرورت محسوس کرتی ہے۔ تخلیقی اور عملی اصول اتنے مختص ہیں کہ ان میں انسان کوئی واحد اور فرید قسم کی دانشوری نہیں دکھا سکتا۔ علم شعبہ جات میں بٹ گیا ہے اور شعبہ جات ان سے بھی بیشتر حصوں میں بٹ گئے ہیں یہ SPECIALIZATION کا دَور ہے یہ دَور مقصدی بلکہ اقتصادی طور پر انسانیت کے عروج کی علامت ہو سکتا ہے لیکن فرد کا دائرۂ عمل سمٹتا جا رہا ہے۔ جہاں مصروفیات ایک فرد کی تمام تر توانائیوں کا مثبت استعمال کرتی ہیں وہیں انسان کی انفرادی صلاحیتوں کے لئے سم قاتل ثابت ہو رہی ہیں۔ اس مقام پر لن یو تانگ کا یہ قول قابل غور ہے کہ "دانش بغیر حسِ مزاح ایک بنجر زمین ہے"۔ یہ ایک بیّن حقیقت ہے کہ انسان فن کارانہ اور تخلیقی صلاحیتوں کے معاملے میں بنجر ہوتا جا رہا ہے۔

فرد جس میں تھوڑی سی بھی فنّی حسّیت ہے ایک عجیب سی کشاکش میں گرفتار ہے۔ نئی شاعری بھی اس کشاکش

کو کامیاب طور پر نہیں پیش کر سکی ہے کیونکہ کشاکش کئی مسائل کا انجاد ہے۔ ہر مسئلہ کی جداگانہ صورت پیش کی گئی ہے۔ لیکن فرد کے کرب کی نامیاتی شکل صحیح طور پر سامنے نہیں آسکی ہے۔ پر کھ ماننے تو کئی جدید شعرا کے مجموعہ ہائے کلام کو ملا کر اگر ایک جگہ رکھا جائے تو وہ ایک نامکمل نظم سے بڑھ کر نہ ہوگی۔

میری نگاہ میں اہم ترین المیہ " اخلاقی اقدار کی شکست " ہے جو موجودہ زندگی میں زیادہ گہرا اور دردناک ہوگیا ہے۔ برسوں سے بنی ہوئی اور بنائی ہوئی وہ اقدار جو مختلف مذاہب، عقائد اور کچھ کو سنہرے وعدوں اور سنہری امیدوں سے آراستہ کرتی تھیں یک بہ یک توہمات اور رسوم و قیود کی شکل اختیار کر گئیں۔

بڑے دلچسپ وعدے تھے، بڑے رنگین دھوکے تھے گلوں کی آرزو میں زندگی شعلے اٹھا لائی (خورشید احمد جامی)

وہی نگاہ جو کل چشم احساں تھی، چشم کرم تھی، وہی نگاہ اب چشم نگراں اور دیدۂ غضب بن گئی۔ کل جن راستوں کو سیدھی راہ قرار دیا گیا تھا وہ آج اسباب، بورژوا اور سرمایہ داروں کا جال بن گئے ہیں۔ اقدار کے زوال کی صورت یہاں تک پہونچی کہ انسان ہر برتر کردار کے بارے میں مشکوک ہوگیا، یہاں تک کہ ؎

گلوئے یزداں میں نوک سناں بھی ٹوٹی ہے حکایت دل پیغمبراں بھی ٹوٹی ہے (مخدوم)

خدا کا جنازہ لئے جا رہے ہیں فرشتے (ن م راشد)

انسان عظیم ہے خدایا اس نے تجھے عرش سے بلایا (احمد ندیم قاسمی)

یزداں پہ جھپٹ پڑے گا ابلیس انسان ہٹا جو درمیاں سے (احمد ندیم قاسمی)

یہ انتہائی صورت کمیونسٹ اور اشتراکی نظریات کے فروغ سے پیدا ہوئی۔ ممکن ہے کہ ان نظریات نے انسانیت کے ایک بڑے حصے کے لئے معاشی اطمینان فراہم کیا ہو لیکن وہیں انہیں ہر مروج مقدس اصول سے آزاد کر دیا۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس معاشی انقلاب کو معاشرتی انقلاب کا بناوٹی سا نام کیوں دیا جاتا ہے۔ خیر یہ تو نظریاتی بحث ہے۔

اقدار کی شکست نے یہ خیال عام کیا کہ اب مجذوبانہ فقر و فاقہ اور خاکسارانہ تلاش حق کی نئے سماج کو کوئی ضرورت باقی نہیں رہی، اب کوئی استاد کوئی شاگرد، کوئی ولی، کوئی رہنما، کوئی سیاسی راہبر اگر حیثیت رکھتا ہے تو وہ اس کی معاشی اور پیشہ ورانہ حیثیت ہے۔ اس کی مستند قابلیت ہے۔ سقراط جو شاید حرف ناشناس تھا، اگر اس دور میں آتا تو اس کی عالمانہ باتوں کو غالباً کوئی نہ سنتا اور وہ اپنی دانش کی آگ میں جل کر خودکشی کر لیتا ؎

عذاب دانش حاضر سے باخبر ہوں میں کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثل خلیل (اقبال)

اپنی بات کو ذرا واضح طور پر پیش کرنے کے لئے میں ماڈرن آرٹ کی مثال دوں گا۔ پکاسو سے لے کر ایم ایف حسین کی پینٹنگس کو ذوق سے دیکھنے والے لوگ آپ کو بہت کم ملیں گے۔ اگر ان لوگوں سے جو صاحبان ذوق کہلاتے ہیں عظیم فن کاروں کے کسی مشہور آرٹ پر بھی رائے لی جائے تو حاصل مایوس کن ہوگا۔ کیا یہ صورت حال آرٹسٹ کے لئے ایک کرب انگیز سانحے سے کم ہے؟ اپنے جی کو خوش کرنے کے لئے چند ادیب یہاں تک کہتے ہوئے پائے جاتے ہیں کہ اُن کا شعر و سخن ان دو آدمیوں کے لئے ہے (کم از کم) جو اُن کی شاعری سے صحیح طور پر محظوظ ہوتے ہیں۔ گویا شاعر ترسیل سے مبرا ہے۔ حقیقت یہ نہیں

ہے۔ کیا اس دعویٰ دار شاعر کو زیادہ ارباب ذوق میسر آئیں تو مسرور نہ ہوگا۔ گویا یہ تو حفظ ماتقدم سا بیان ہے نئی اقدار میں (جو سرے سے ہیں ہی نہیں) فن کی حیثیت اسباب تعیش سے بھی کم تر ہے اور وہ آنکھیں جو بصیرت تھیں ریفریجریٹر میں پڑی ہیں اور ہمارا چہرہ ــــ

"ٹوٹی اقدار کے
بکھرے ہوئے افکار کے
پابستہ تمناؤں کے
لب بستہ وفاؤں کے
سراسیمہ گذرتی ہوئی ہر ساعت کے
اس انبوہ میں گر
اپنا چہرہ نظر آجائے تو اس سے بھی چرالو نظریں
(یہی ظالم کہیں آئینہ دکھانے نہ لگے)　ــــ (سناٹے کی آواز۔ ساجدہ زیدی)

لوگ اپنے ڈرائینگ روم میں کے کے ہیبر یا ایسے ہی مقبول فن کار کی بنائی ہوئی تصاویر یوں سجاتے ہیں جیسے انسائیکلوپیڈیا کی موٹی جلدیں۔ ان سے ان تصاویر کے انتخاب کا سبب پوچھنے کی غلطی نہ کیجئے۔

مروجہ اقدار پر انسان کا ایقان یوں کمزور ہوگیا ہے کہ اب کئی اقداری شخصیات اور اقداری محکمات علامتی نشانات سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے، وہ ان تمام اقدار سے جو خدا، قدرت، قسمت، نیکی، خیر و شر کا تصادم، امن و امان وغیرہ بار بار ذکر کرتی ہیں مشتبہ ہے۔ اس کا اعتقاد اگر اٹھ نہیں چکا تو ہٹ تو چکا ہے۔ وہ ہر دل کش چیز میں "لا ــــ" ڈھونڈ رہا ہے۔ وہ صاف ستھرا دہنے کے احکامات میں بھی تحکمانہ درشتی پاتا اور نظام العمل اور منظم زندگی کو اپنی فنی آزادی پر قفس ہے اور اس لمحے کا منتظر ہے جب تارِ عنکبوت ٹوٹ جائے گا اور کھلی کھلی تازہ ہوا اس کی زندگی کے سنسان مکان میں در آئے گی۔

خوش آئند مستقبل ایک وعدہ ہے اور وہ بھی محبوب کے وعدۂ فردا سے بڑھ کر نہیں۔ لیکن ہر فرد مستقبل کا منتظر ہے اس انتظار میں کبھی آرزو کی طلائی تحریر ہے تو کبھی حقائق کا سیہ رنگ سایہ، اس انتظار میں کچھ مایوسی ہے تو کچھ خوش فہمی۔ فنکار دونوں ہی کیفیات سے دوچار ہے۔ اس بڑھتی ہوئی تشکیک کا سبب یہ ہے کہ منزل تک پہنچنے کا کوئی راستہ، کوئی ایسا نہیں کہ کامل مسرت کی کلید ہاتھ آئے۔ مذاہب جو خوش تہذیبی اور امن و سلامتی کے دعویدار ہیں، تاریخ گواہ ہے کہ وہ خوش گوار تبدیلی لانے میں ناکام رہے جہاں بہتر عمل کی تاکید زور و شور سے ہوئی وہیں اطلاق میں زبردستی کی گئی۔ مذاہب سے ہٹ کر مسالک میں بھی یہی دشوار کا پائی گئی۔ قریبی مثال مارکسزم کی ہے جس کی عمل آوری میں سماجی ناانصافی گھناؤنی صورت درپیش ہوئی۔

نیا فنکار یہ بھی جانتا ہے کہ اب کوئی نیا فلسفہ بھی ان روز افزوں مسائل کا حل نہیں ہوسکتا بلکہ حسنِ اخلاق

اور تہذیبی نظام سے بھی بدظن ہے۔ یہ ذہنی کشمکش، یہ اخلاق کشاکش اسے کنفیوز کرتی ہے۔ وہ ایک طرف معبدوں کے بے چراغ ہونے کا مرثیہ خواں ہے تو دوسری طرف فرد پر شب و روز اترتے ہوئے کرب سے نالاں ہے۔

کہاں تو وہ لمحے تھے رقصاں
کہ جب آسماں اور زمیں پہ نظر کی حدوں تک
نئی ایک دنیا تھی منظر تھے ساتھی، رفیق اور ہم دم
مگر اب یہ دھرتی، مناظر سبھی کچھ اُجاڑ اور بنجر پڑے ہیں۔
پہاڑوں کی سب چوٹیاں اب ہیں رنگ اور تابش سے محروم
اندھیرے نے پھیلا دیں بانہیں ——— (ایک پہاڑی شام — عبدالحلیم)

نئی صنعتی زندگی میں فرد کی کم اصلیت اور اس کی وجودی اہمیت کے زوال کے خلاف نئی شاعری ایک احتجاجی آواز ہے جو مشینی شور شرابے میں اُبھرنا چاہتی ہے۔

بمبئی کی زندگی کی عکاسی "عروس البلاد" میں قاضی سلیم یوں کرتے ہیں ؎

یہ لوگ، کیسے لوگ ہیں، جیتے ہیں کس لئے		ایسا ہو ایک رات سمندر کے دیوتا
ساحل کے کف سے چیختے چنگھاڑتے چلیں		دھرتی کے زخم زخم کو دھوکر نکال دیں
یہ لوگ، کیسے لوگ ہیں، جیتے ہیں کس لئے		بے ہوش نیم مرگ سرِ راہ گذارِ عام
پھر ایسے آڑے ترچھے پڑے ہیں کہ جیسے وہ		انسان نہیں کٹے ہوئے جنگل کے پیڑ ہیں

احتجاجی قوت کو الفاظ میں قید کرنے سے جلتی ہوئی شاعری جنم لیتی ہے۔

تھکے ہوئے، واماندہ اشخاص صرف بے نام اکائیاں ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ان میں شخصیاتی کیفیات باقی ہی نہیں رہتیں وہ تو خاشاک کی طرح ہو جاتے ہیں اور نیا شخص تو ضروریات اور اسباب کا ایک ہرکارہ ہے۔

عمیق حنفی ایک انسانیت پرست شاعر ہیں۔ وہ تعلقات کے بے لوث اور بے حس ہونے کے المیہ پر حیران ہیں۔ دو شاعرانہ باتیں سنئے:

شارعِ عام پہ حادثہ ہو گیا
آدمی کٹ گیا
اس کا سر پھٹ گیا
بھیڑ بہتی رہی
بات کرنے میں جو تھے مگن بات کرتے رہے
قہقہے چیخ کے پر کترتے رہے
اور اکثر جو خاموش تھے چپ گذرتے رہے
آدمی مر گیا ——— (مشین زادوں کی بستی میں)

مستقبل سے ناامیدی اور آنے والی نسل کے لئے ہماری تہی دامنی نہ جانے کیسی کیفیت سامنے لائے۔ مصطفیٰ زیدی مرحوم اپنی نظم "میری پتھر آنکھیں" میں یوں کہتے ہیں ؎

قحط افسانہ نہیں اور یہ بے ابر فلک
آج اِس دیس کل اُس دیس کا وارث ہوگا
ہم سے ترکے میں ملیں گے اسے بیمار درخت
تیز کرنوں کی تمازت سے چٹختے ہوئے ہونٹ
دھوپ کا حرفِ جنوں، ٹوٹکا وصیت نامہ
اور مرے شہرِ ظلمات کی بے در آنکھیں
میری بے در، مری بنجر، مری پتھر آنکھیں

جدید تر شاعر رؤف خلش کہتے ہیں ؎

ریت کے ٹیلے وہی ہیں
خزاں کا ہے وہی موسم
جھلستے ہیں کڑکتی دھوپ میں پودے گلابوں کے
اُبلتے خون میں لتھڑی صلیبیں
کن نگاہوں کا ہیں کفّارہ
دہکتے سائبانوں میں
پانی کی ٹھنڈی چھاگلیں
سوکھی پڑی ہیں
میں اک بے خواب اور تنہا مسافر
گھنے سائے کی دُھن میں
صدیوں سے بھٹکتا ہوں

اوپر کی مثالیں صرف ایک جھلک ہیں۔ اِس افراط و تفریط کے دَور میں نیا شاعر تتلیاں پکڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ حاضر لمحہ میں سلیس نغمہ چھیڑتا ہے۔ وہ ایک ناظر کی طرح بغیر کوئی نتیجہ اخذ کئے منظر کو دیکھتا ہے اور انوکھے الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ اس کی شاعری کی لفظیات مبہم سی لگتی ہیں لیکن اس کے بے ترتیب الفاظ اس کی ذہنی بے ترتیبی کے آئینہ دار ہیں۔ اس کی شاعری ایک ٹوٹتا چھتا نور ہے۔ جو ادب اور زندگی کے فیوژن سے کسی جنگلی باغ میں پھول کی طرح کھلا ہوا ہو۔

شاعری کا بنیادی عنصر بھی فرد کے جذبات و علائق سے منسلک ہے۔ شاعری کو محاورے کی طرح روزمرّہ میں استعمال کی نہیں۔ وہ ایک بے ربط اور بے مخاطب تبصرہ ہے۔ نیا شاعر اس صورتِ حالات سے دوچار ہے جو کرب ناک ہے۔ اس کی ساری نظمیں ادھوری اور ساری شعری کیفیات تشنہ ہیں اور بہتر یہی ہے۔ جس دن یہ نظمیں مکمل ہوں گی وہ دن بہت صبر آزما ہوگا۔

مجید بیدار

فنِ ترجمہ کا ادبی جائزہ

زبانوں کے عروج و زوال کا دارومدار ان میں "ابلاغی کیفیات" کی کمی یا زیادتی سے ہوتا ہے جب کسی زبان میں دنیا کے نامور ادب سے اچھے تصورات کو جذب کرنے کی خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں تو اس کے ارتقا کے لیے نت نئی راہیں ہموار ہوتی ہیں اور وہ زبان عروج کی سمت چل پڑتی ہے۔ اگر کسی زبان سے ان کیفیات کو سلب کر لیا جائے تو وہ گمنامی کی اتھاہ گہرائیوں میں غرق ہو جاتی ہے۔

ہر زندہ زبان و ادب دیگر زبانوں کے علوم و فنون کے اثرات کو قبول کرنے اور ان کی آفاقیت کو اپنے دامن میں سمیٹ لینے کی خصوصیات رکھتی ہیں اور اسی "معیارِ حسن" کے سبب وہ "عالم ادب" میں "زندۂ جاوید" ہونے کا شرف حاصل کرتی ہے۔

اردو زبان کے ادب اور مواد کا تجزیاتی جائزہ لیا جائے تو اس کے ذخیرے میں اچھوتے اصنافِ سخن کے علاوہ چند ایسے نامور کارنامے بھی ملتے ہیں جن کی بدولت اردو زبان کو دنیا کی محترم زبانوں سے ہم قدم ہو کر چلنے کی توانائی حاصل ہوئی۔ یہ کارنامے "تاریخِ ادبِ اردو" کے اوراق پر سر سید تحریک، فورٹ ولیم کالج، دہلی کالج، شمس الامرا کی جدوجہد، انجمن ترقی اردو اور دارالمصنفین کے تفکرات کی صورت میں بکھرے ہوئے ہیں۔ یہی اردو کے ایسے سرچشمے رہے ہیں جن کی اساس پر اردو کی پُرشکوہ عمارت تعمیر ہوئی اور ان ہی اصولوں سے آج اردو کی بقا ہے۔

اردو کے اسلوب کو جدید طرزِ نگارش سے ہم آہنگ کرنے میں تراجم نے نمایاں حصہ لیا چنانچہ فورٹ ولیم کالج میں ترجمہ کے رواج سے ہی اردو نثر کو ایک جدید اسلوب کا پیرایہ میسر ہوا اور اسی بنا پر اردو نثری اسلوب کا آغاز فورٹ ولیم کے درودیوار سے وابستہ ہے۔ اگر فورٹ ولیم کالج میں تراجم کی کوششیں نہ کی جاتیں تو یقیناً اردو نثری اسلوب ہنوز تاریکی میں رہتا اور آج کا نثری سرمایہ اپنی کم مائیگی کا شکوہ کرتا۔

اردو کا جدید اسلوبِ نثر درحقیقت تراجم کی دین ہے۔ اگر اردو کے مترجمین بھی وہی اسلوب اختیار کرتے جو فارسی اور عربی آمیز تھا تو اردو کی موجودہ شکل عام فہمی کا سبب نہ بنتی۔ اردو زبان کے تاریخی حقائق کا مطالعہ تراجم سے قبل اور بعد کے ادوار کے اعتبار سے دلچسپی سے بھرپور ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے مترجمین نے جس اسلوب کو اختیار کیا اس کا تتبع آج بھی کیا جاتا ہے۔ سر سید نے جس اسلوب کو رواج دینے کی کوشش کی وہ خالصتہً اردو تراجم کے دوران اختیار کردہ اندازِ تحریر تھا۔ سر سید نے محسوس کر لیا تھا کہ اردو ادب کو جن قیمتی سرمایوں کی ضرورت لاحق ہے ان کی ہمراہی کے لیے قدیم اسلوبِ اردو نثر اپنی عدم گنجائش کا اعلان کرتا ہے چنانچہ انھوں نے فورٹ ولیم کالج کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اپنے رفقاء سے اسی عام انداز کو اپنی تحریر کا نمونہ بنانے پر زور دیا نتیجتاً "سر سید تحریک" سے منسلک قلمکاروں نے جن تخلیقات کو قرطاس کی زینت بخشی ان میں اردو تراجم کے اندازِ تحریر کی چھاپ نمایاں محسوس ہوتی ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے نمائندہ میر امن نے جس طرزِ نگارش کو "باغ و بہار" میں روا رکھا اسی کو تھوڑی سی ردّ و بدل کے ساتھ سر سید تحریک سے وابستہ ادیبوں نے اپنانا شروع کیا اور ہر ادب کا طالب علم اس حقیقت سے پوری طرح واقف ہے کہ "باغ و بہار" عطا محمد تحسین کی کتاب "قصۂ چہار درویش" کا آزاد ترجمہ ہے۔

میر امن نے اپنی طرزِ نگارش کے ترجمہ ہونے کا تذکرہ "باغ و بہار" کے دیباچہ میں کچھ اس انداز میں کیا ہے "اب خداوند نعمت صاحبِ مروت

بجنسہ رکھ دیا ہے قدر دانِ زبان گلکرسٹ صاحب نے (کہ ہمیشہ اقبال ان کا زیادہ رہے جب تک گنگا جمنا بہے) لطف سے فرمایا کہ قصّے کو ٹھیٹھ ہندوستانی گفتگو میں جو اردو کے لوگ، ہندو، مسلمان، عورت، مرد، بچّے، لڑکے بالے، خاص و عام آپس میں بولتے چالتے ہیں ترجمہ کرو۔ موافق حکم حضور کے میں نے بھی اسی محاورے سے لکھنا شروع کیا جیسے کوئی باتیں کرتا ہے۔"

"باغ و بہار" کے مصنف نے بذاتِ خود اپنی تحریر ترجمہ ہونے کا اعتراف کیا ہے اس لئے تراجم کے اسلوب اردو پر احسانات ہونے کو تقویت پہنچتی ہے اس کے علاوہ یہ ایک فطری حقیقت ہے کہ انسان جب کسی زبان کے کارنامہ کو دوسری زبان کا پیراہن بخشنا چاہتا ہے تو ترجمہ کے دوران ایسے الفاظ ہی اس کی رہنمائی کرتے ہیں جو عام بول چال میں رواج پائے ہوئے ہوتے ہیں چنانچہ تراجم کے دوران جو زبان استعمال کی جاتی ہے اس کے فطری نہ ہونے میں کسی قسم کا گمان ممکن نہیں۔ اردو نثری کارنامے کی ابتدا کے بیان میں جب حوالہ کی ضرورت ہوتی ہے تو ہر ادب کے طالب علم کی نگاہیں "باغ و بہار" کی نمائندگی کرتی ہیں یہی ایک کامل ثبوت ہے کہ اردو کے اسلوب پر تراجم نے اپنی گرفت مضبوط رکھی جس کے باعث "تراجم" کی طرزِ نگارش کو اردو طرزِ تحریر کا نمونہ قرار دیا گیا۔ اسی بنیاد پر تراجم کی اہمیت اردو زبان و ادب میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔

اردو کے ادبی مواد سے تراجم کے ذخیرہ کو علیحدہ کر دیا جائے تو اس کی حیثیت "بے ستون سائبان" کی مانند ہو جائے گی۔ درحقیقت اردو کی اشاعت کو ملک گیری اور دل گیری کے ذرائع اردو تراجم کی بدولت ہی میسر ہوئے۔ اگر "اردو تراجم" کی بنیاد نہ اردو ادب میں پیوست نہ ہوتیں تو اردو کسی ایک خاص فرقہ، جماعت یا قوم کی زبان ہو کر رہ جاتی۔ دنیائے ادب میں اردو کی تقدیس اسی سبب ہے کہ یہی وہ زبان ہے جس نے قوموں کی مختلف الخیال فکروں کو یکجہتی کا درس دیا اور دنیا کی تمام زبانیں جو اپنی انفرادیت کو برقرار رکھنا چاہتی تھیں، اردو تراجم نے ان کی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے "مشترکہ ادب" کی ترغیب دی۔

جس طرح "جدید تصوّرات" کی رُو سے دنیا کی تمام قوموں کو ایک قومیت اور ایک سماج کے بندھن میں پیوست کرنے کی جد و جہد آج کل عام ہو رہی ہے تقریباً اسی قبیل کی جد و جہد اردو کے تراجم سے ظاہر ہوتی ہے۔ اردو تراجم نے دنیا کی دیگر زبانوں کی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے ان کے "بہترین کارنامے" اپنے ادبی ذخائر میں شامل کئے اور زبانوں کی اکائی کا تصوّر پیش کیا۔ ہند آریائی زبانوں میں غالباً اردو ہی ایک ایسی واحد زبان ہے جس نے دنیا کی زبانوں کو ایک "مقصد" پر یکجا ہونے کی دعوت دی جس کی موزوں مثال اردو تراجم کے ذریعہ ظاہر ہوتی ہے۔ اردو نے دنیا کی کثرت سے بولی جانے والی زبانوں کے ادب کو اپنے لٹریچر سے ہم آہنگ کر کے اس بات کا ثبوت فراہم کیا کہ دنیا کی زبانوں کو "معلومات" اور ذخیرہ کے اساس پر ایک مکتبِ خیال اور طرزِ فکر کے لئے یکجا ہونا چاہیئے۔ اردو تراجم کے مطالعہ سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ ان تراجم نے اردو کو نہ صرف "افادی تصوّر" دیا بلکہ "علومِ عمرانی" اور "سائنس" کے جدید ذخائر کو اپنے سینہ میں پیوست کر لیا اسی سبب اردو تراجم کی اہمیت ادبی اور معلوماتی اعتبار سے کافی وسیع ہو جاتی ہے۔

آغا محمد باقر اپنی کتاب "تاریخ نظم و نثر" کے ذریعہ اردو کے ادب کو دو اقسام سے احاطہ کیا ہے جس کے مطابق "تقسیم اوّل" میں مستقل تصانیف اور "تقسیم ثانی" میں تراجم کی افضلیت ظاہر کی ہے۔ مستقل تصانیف میں صنفِ نظم و نثر کے تمام اصنافِ سخن کو درجہ دیا ہے اور تراجم میں دنیا کے بہترین ادب کے اقتباسات اور کتابوں کو مادری زبان میں منتقل کرنے کو بھی ادب کی نامور خدمت ظاہر کی ہے۔ آغا محمد باقر کی "تقسیم ادب" نے "تراجم" کی اہمیت میں اضافہ ہوتا ہے کیونکہ بعض اوقات تراجم مستقل تصانیف سے بھی کہیں زیادہ اولیت حاصل کر لیتے ہیں جس کی مثال نظم "گورِ غریباں" سے دی جا سکتی ہے جس نے ترجمہ میں پیدا ہونے والی تمام خامیوں کو بالائے طاق رکھ کر

اپنا منفرد مقام بنالیا۔ اسی طرح کے مزید کئی تراجم ہیں جن پر تالیف کا گمان ہی نا ممکن ہو جاتا ہے اور ترجمہ اصل تصنیف کے معیار سے بلند ہو جاتا ہے۔

کسی بھی فن پارے کی تخلیق کا مقصد بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود ہوتا ہے اور مقصد کے حصول کے لئے تخلیق کار مشاہدات و مکاشفات کے [illegible] حقائق سے گذر کر فکری گتھیوں کو سلجھاتے ہوئے جب تخلیق کے لئے قلم اٹھاتا ہے تو اس کے کردار، فکر اور تصورات کی ساری جھلکیاں سمٹ کر اس کے فن پارہ میں جمع ہو جاتی ہیں جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ؎ درد دل جمع کئے کتنے تو دیوان ہوا

تخلیق کے لیے ان اسالیب کا لزوم صرف شاعری کی حد تک محدود نہیں ہے بلکہ نثری کاوشوں میں بھی ان کارناموں کو نمایاں دخل ہوتا ہے اور جب تخلیق تصنیف کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے تو اس کا قلمکار اپنے پیش کردہ تصورات کے اثر و رسوخ کو سماج قوم و ملک کی قسمت پر مرتب ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہے یہ تصنیف کا ایک افادی پہلو ہے جس کی علمبردار صرف "بہترین تصانیف" ہو سکتی ہیں اور اگر کسی زبان و ادب میں اسی مقصدیت کے پیش نظر کوئی تصنیف منظر عام پر آئی ہو تو اس کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں کرنا ایک ایسا فعل جاریہ ہے کہ جس کی بدولت نہ صرف قوموں کے فکری رجحانات کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے بلکہ وہ تصورات جو کسی ایک قوم کا ورثہ بن گئے ہیں اور جن سے وہ قوم افادیت حاصل کر رہی ہے ان کے افادی کارناموں کو اپنی قوم میں روا رکھ کے "عظیم قوم" کے معیار کا حصول ممکن ہو سکتا ہے۔

تصانیف بین نظریاتی احساسات کی علمبردار ہوتی ہیں اور تراجم بین قومی اور بین الاقوامی احساسات کو جنم دیتے ہیں۔ اگر کوئی تصنیف عالم تخلیق میں آئے تو وہ صرف کسی ایک قوم، ملک اور سماج کی نظریاتی کشمکش اور فکری بندھنوں کا نتیجہ ہوگی لیکن جب ادب سے کسی تخلیق کو ترجمہ کیا جائے تو اس تخلیق میں پیش کردہ کشمکش، جد و جہد سے آگے بڑھ کر اضطراب کے لمحات میں داخل ہو جاتی ہے یعنی ترجمہ کے ذریعہ ان دو قوموں، دو تہذیبوں یا اس سے زائد سماج کے فکری، سماجی اور اقتصادی تصورات کا ٹکراؤ یا سنجوگ ہوتا ہے جس کے باعث سماجی و قومی لائحہ عمل میں تغیرات پیدا ہوتے ہیں اور یہی تبدیلیاں قوم و سماج کی زندگی کے ضامن سمجھے جاتے ہیں جبکہ تصنیف صرف ایک طبقہ کی فکری جد و جہد کو پیش کرتی ہے۔

تراجم ہمہ جہتی جد و جہد کے علمبردار ہوتے ہیں اور تصانیف طبقاتی جد و جہد کی نمائندگی کرتی ہیں۔ جب کوئی تخلیق ترجمہ کی جاتی ہے تو اس کے ساتھ ہی سینکڑوں کارنامے دوسری قوم کے لیے "تازیانہ" کے مصداق انھیں درس عبرت دیتی ہیں اور جوش، ولولہ، ایثار، بھائی چارگی اور یگانگت جیسے جذبے قوموں کے درمیان روا رکھ پاتے ہیں اس کے برخلاف تصنیف کے ذریعہ صرف کسی ایک قوم میں ان جذبوں کی بہتات ہو سکتی ہے۔

تصانیف فنی معلومات میں اپنی کم مائیگی کا شکوہ کرتی ہیں اور تراجم نئی زبانوں میں رائج شدہ فنون میں جدت طرازی کی بنیاد ڈالتے ہیں۔ درحقیقت ایک ابھرتی ہوئی قوم کا ذریعہ معلومات تراجم ہوتے ہیں جبکہ تصانیف کے بل بوتے پر سماج یا قوم صرف اپنی اصلاحی قدروں کو جانچ سکتی ہے لیکن اس سے "اقوام عالم" کے معلومات کی توقع رکھنا قطعی لاحاصل ہے چونکہ تصنیف صرف اپنے "دائرہ محدود" میں گردش کرتی ہے لیکن تراجم کا حلقۂ فیض اتنا وسیع ہے کہ وہ ممالک عالم کی معلومات کو کوزہ میں بند کر دیتے ہیں۔

تصانیف صرف فکری احساس کی نمائندگی کرتی ہیں جبکہ تراجم فکری احساس کے ہمراہ مادی احساس کو بھی اجاگر کرتے ہیں یعنی جب کسی تصنیف کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو انسانی فکر کی گرہیں کھلنے لگتی ہیں اور تصورات میں تحرک واقع ہوتا ہے اور ارتقاء کے زینوں کا خواہشمند ہوتا ہے جبکہ تراجم فکر کے ساتھ ساتھ ارتقاء کے مراحل سے گذار کر فن کی تخلیق کرتے ہیں۔ تصانیف کی کثرت سے مطالعہ انسان کے جذبات و احساسات

(باقی صفحہ ۳۵ پر)

بادۂ کہن (۲۱)

عزیز یار جنگ عزیز

عہدِ غفراں مکان میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس کے قادر الکلام سخنور محمد عزیز الدین خاں عزیز دکن کے استادِ سخن نواب شرف جنگ ضیا حق کے صاحبزادے تھے۔ آصف جاہ سادس نے "عزیز یار جنگ" کے خطاب سے نوازا تھا۔ عزیز ۱۲۹۰ھ میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے' ان کا گھرانہ دکنی کلچر اور علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ اس طرح ورثے میں شعر و ادب کا ذوق پایا۔ ابتداً اپنے والد ضیا حق اور حیر حکیم مظفر الدین خاں معز اور میر احمد علی عصر ایسے دکنی اساتذۂ سخن سے علمِ شعر سیکھا۔ آخر میں داغ دہلوی کے تلامذہ میں شامل ہوگئے اور داغ دہلوی کے رنگِ تغزل کو اپنا اسلوب بنایا۔
دکن کے بہترین غزل گو اور قادر الکلام شعرا میں عزیز کا شمار ہوتا ہے۔ کلام میں شگفتگی' شیرینی اور غزل کی کلاسیکی رس گھولتی نظر آتی ہے ریاست حیدرآباد کے علاقہ صرفخاص میں تعلقداری پر فائز رہے' ۸۰ سال عمر پائی اور ۱۹۴۸ء میں انتقال کیا۔ دکن کے آخری فرمانروا میر عثمان علی خاں کے عہدِ حکومت میں عزیز کی شعری شہرت ہندوستان گیر ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر زورؔ نے تذکرہ "مرقعِ سخن" مطبوعہ ۱۹۳۵ء میں عزیز کی شاعری پر سیر حاصل مقالہ سپردِ قلم کیا ہے۔ ادارۂ ادبیاتِ اردو سے عزیز کی غزلیہ شاعری کا انتخاب "متاعِ سخن" کے نام سے شائع ہوا۔ اس سے پہلے "ارمغانِ عزیز" کے نام سے دو حصوں میں ان کے دیوان چھپے' فی البدیہہ کلام کا ایک مجموعہ "نیرِ سخن" ۱۳۶۶ھ میں مطبوع ہوا۔ نمونہ کلام درج ذیل ہے ــــ (ف ـ خ)

آپ بدلیں ہزار رنگ تو کیا
میری قسمت بدل نہیں سکتے

تقلیدِ داغ باعثِ شہرت ہوئی عزیز
چرچا ہمارے کلام کا ہر انجمن میں ہے

ہم سے جو ہوئی چوک، محبت میں خطا کیا
ہوتی ہوئی آئی ہے یہ ہوتی ہے بشر سے

اپنوں کا پاس چاہیئے مہمان کا لحاظ
انسان کو ضرور ہے انسان کا لحاظ

ذرا دستِ جنوں ہشیار رہنا
نئی چادر ہے گردِ کارواں کی

منہ نہ کھلوائیے جانے دیجئے!
کچھ کہوں گا تو شکایت ہوگی

نام لیتا ہے جب دوا کا کوئی
درد کی انتہا نہیں ہوتی

نقشہ کھینچوں جو اپنے دل کا
صدقے ہو قلم، نثار کاغذ

گئی گزری ہوئی باتوں سے حاصل
اب ان کا شکوہ کیا' اُن کا گلہ کیا

رہے گی شعارِ پیر مغرور کب تک
نہ بدلے گی زمانے کی ہوا کیا

جس کی نگہہ بلند ہے جس کی نظر بلند
وہ میں ہوں تیرے دیکھنے والوں میں سربلند

کس طرح مجھ غریب کی بر آئے آرزو
دستِ سوال پست، مقامِ اثر بلند

جھ پر ہی پڑا کرتی ہیں صیاد کی نظریں
ک حرف جو بے معنی نکلا تھا کبھی منہ سے
یئے خانے کا نظام کچھ ایسا بدل گیا
نکھوں کا اعتبار بھی دل نے بھلا دیا
یں دیکھتے ہی کہدیا زاہد کا عمامہ
ون کس کا شریکِ حال ہوا
نسان کو انسان بنا دیتی ہے فطرت
یہ دل کی شرارت ہے کہ آنکھوں کی کرامت
ضرت عیسیٰ بھی آخر چل بسے
قدیر کے لکھے کو بدلتے نہیں دیکھا
نصیبے کا لکھا بہر طور ہوگا
بت کا آخر یہ انجام دیکھا
یہ حال ہمارا ہے دکھایا نہیں جاتا
یہ ناز، یہ غرور، یہ اندازِ گفتگو
ات کرنی جسے نہ آتی ہے
از ہو جس کو حسن پر اپنے
دگ کہتے ہیں وہ ہرجائی ہے
یوانہ باش، کی تو مثل ٹھیک ہے عزیز
پ اپنے کو خداوندِ جہاں کہتے ہیں
یں وہ بادہ کش ہوں کہ ہر جام پی کر
م کہاں، دل کہاں، حواس کہاں
یوں بظاہر کوئی نفاق نہیں
مدتوں گردشِ ایام مرے ساتھ رہی
دا کو فرشتے کہیں جانتے ہیں
تو نہیں کہ آپ سے دامن کشیدہ ہوں
جل سے بھی مجھ کو یہ سننا پڑا
طولِ شبِ ہجر، کہ جو صبحِ تمنا

اس چشمِ عنایت کا اثر دیکھیئے کیا ہو
وہ آج محبت کا افسانہ ہوا آخر
سب مست ہیں کسی کو کسی کی خبر نہیں
اچھے بُرے پہ آج کسی کی نظر نہیں
یہ شخص کبھی فیض رساں ہو نہیں سکتا

اس مقولے سے جی سنبھال ہوا
پیتل بھی چمک جائے تو خاور نہیں ہوتا
تنہا نہیں آتا کبھی تنہا نہیں جاتا
اب خدا حافظ ترے بیمار کا
جب صبح ہوئی چاند نکلتے نہیں دیکھا
بہت کچھ ہوا ہے ابھی اور ہوگا
نہ راحت ہی پائی نہ آرام دیکھا
آنکھیں تو گئیں دید کا چسکا نہیں جا
یہ کہہ کے تھم گئے نہیں، فرصت نہیں ہے آ
وہ کسی کا گلا کرے کیونکر
وہ کسی کو بُرا کہے کیونکر
ہائے گھر گھر تجھے دیکھوں کیونکر
غافل کو کس طرح سے ہو غفلت کی اطلا
نہیں معلوم رہے گا یہ زمانہ کب تک
سمجھتا رہا جامِ جم اوّل اوّل
بادۂ عیش کا گلاس کہاں
لیکن اگلا سا اتفاق نہیں
اب یہ ہے حال، بُرے حال میں تھا ہو
ہمیں کو خبر ہے ہمیں جانتے ہ
ہاں ابتدائے عشق ہے آفت رسیدہ ہو
بُرے وقت کوئی کسی کا نہیں
مقصد کی طرف شام و سحر بھاگ رہے ہ

نصیرالدین ہاشمی

قندِ مکرر

ایک صدی پہلے اردو میں علم سائنس کی تعلیم

حیدرآباد کے جاگیرداروں میں پائیگاہی جاگیردار کئی حیثیتوں سے دوسرے جاگیرداروں پر فوقیت رکھتے تھے۔ ان کی جاگیروں کا رقبہ ہندوستان کی بعض دیسی ریاستوں سے بڑا تھا۔ رقبہ کی طرح آبادی اور آمدنی بھی تھی۔ خاندان آصفیہ سے ان کے تعلقات دربار سے گزر کر شادی بیاہ تک پہنچ گئے تھے۔ اس کے علاوہ، علم و فن کی قدردانی اور اہل علم کی سرپرستی کے لحاظ سے بھی امرائے پائیگاہ کو امتیاز حاصل تھا۔

عصر حاضر میں مزدور اور سرمایہ داروں کی جو چپقلش ہر طرف رونما ہے۔ وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، کسان اور مزدور اس امر کے شاکی ہیں کہ انہیں محنت کا پورا معاوضہ نہیں ملتا۔ زمیندار اور سرمایہ دار ان کی محنت سے فائدہ اٹھایا کرتے ہیں۔ واقعات کے لحاظ سے یہ خیال صداقت پر مبنی نظر آتا ہے۔ مگر ہم گزشتہ زمانہ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ ہمارے جاگیردار، یا سرمایہ دار دولت سے اگر خود مستفید ہوتے تھے تو اس کے ساتھ ساتھ وہ اہل علم کی سرپرستی کرتے، شاعروں اور ادیبوں کی دستگیری سے دریغ نہ کرتے، طلبہ کے لئے تعلیمی سہولتیں فراہم کرتے اور ان کو وظائف دیا کرتے، علمائے وقت کا یومیہ جاری کر کے ان کو فکر معاش سے مستغنی کرتے تاکہ وہ طلبہ کو مفت درس دیا کریں۔ غرض کہ اگر ایک طرف وہ اپنی ذات پر خرچ کرتے تھے تو دوسری طرف علم کی ترویج پر خرچ کرنے سے بھی انہیں دریغ نہیں تھا۔

اسی قسم کی ایک ممتاز ہستی نواب شمس الامراء امیر کبیر کی تھی۔ نواب فخرالدین خاں امیر کبیر شمس الامراء کے جدِ اعلیٰ ابوالخیر خاں عالمگیر کے عہد کے ایک نامور شخص تھے۔ یہ حضرت شیخ بابا فریدالدین گنج شکر کی اولاد میں سے تھے۔ حضرت آصف جاہ اول کے ہمراہ دکن آئے۔ اور یہاں کی مشہور لڑائیوں میں نمایاں خدمت انجام دے کر آصفی دربار میں خاص رسوخ و اثر قائم کر لیا۔ ابوالخیر خاں اور ان کے فرزند ابوالفتح خاں اپنی زندگی بھر آصف جاہ اول و ثانی کے متوسل رہے اور ہر وقت سفر و حضر میں ساتھ رہا۔ متعدد جنگوں میں داد شجاعت بھی دی۔ اور اگر ایک طرف جانبازی کے جوہر کے مالک تھے دوسری طرف میدان سیاست کے بھی مرد تھے۔ سلاطین آصفی کو دکن میں اپنی سلطنت کے مستحکم کرنے، برقرار رکھنے اور دشمنوں کے دست تعدی سے محفوظ رکھنے کے لئے جو لڑائیاں کرنا پڑیں۔ ان میں ان دونوں باپ بیٹوں کا بڑا حصہ ہے۔ آصف جاہ ثانی نے ابوالفتح خاں کی اس مردانگی اور جانبازی کے باعث ان کو اپنے باڈی گارڈ کا افسر اعلیٰ مقرر کیا۔ اور جمعیت اور رسالہ پائیگاہ کے لئے جاگیر عطا فرمائی۔ پائیگاہ کی فوج کے افسروں کو پندرہ پندرہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ اس وقت کے خالصہ کی شاہی فوج کے مقابلہ میں جن کو کئی ماہ تک تنخواہ نہیں ملتی تھی۔ پائیگاہ کے سپاہی ماہوار اپنی تنخواہ حاصل کرتے تھے۔ اس زمانے میں یہ ایسا امتیاز تھا جو کسی دوسرے جاگیردار کے ملازمین کو حاصل نہیں تھا۔ بہرحال امرائے پائیگاہ نے اپنی وفاداری و جاں نثاری سے سلطنت آصفیہ کے بقاء اور اس کے استحکام میں پورا حصہ لیا ہے۔

محمد فخرالدین خاں ابوالفتح خاں کے فرزند ہیں ان کی ولادت ۱۱۹۵ھ میں ہوئی۔ ۱۲۰۵ھ میں باپ کے انتقال کے وقت ان کی عمر صرف سال کی تھی۔ والدہ کی زیر نگرانی تعلیم و تربیت ہوئی اور رفتہ رفتہ دربار شاہی اور ایوان بادشاہی میں ممتاز ہونے لگے۔ آبائی خطابات اور جاگیر

نواب کے مرتے ہی مرحمت ہو چکی تھیں بحوان ہونے پر آصف جاہ ثانی نے اپنی صاحبزادی بشیر النساء بیگم صاحبہ سے ان کا عقد کر دیا۔ اور اس طرح یہ نوجوان درباری امیر سے بڑھتا ہوا فرزندی کے درجہ تک پہنچ گیا۔

شمس الملک شمس الامراء کے علاوہ امیر کبیر کا نیا خطاب ملا اور جاگیر میں اضافہ ہوا۔ آصف جاہ ثانی کے انتقال تک وہ مورد عنایات شاہانہ بنے رہے۔ اس کے بعد آصف جاہ ثالث اور رابع کے دور حکمرانی میں بھی اسی طرح عزت و حرمت اور نام آوری سے زندگی بسر کرتے رہے۔ ۱۸۶۳ء میں آپ کا انتقال ہوا۔ شمس الامراء کے زمانہ میں جس قدر لڑائیاں دولت آصفیہ کو لڑنی پڑیں ان میں پائیگاہ کی فوج برابر شریک ہو کر حق نمک ادا کرتی رہی۔

ان کی علمی قابلیت اور لیاقت ان کی خودداری اور قدر شناسی، اہل علم و فن کی سرپرستی وغیرہ کے متعلق بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ وہ خود بھی اپنے وقت کے صاحب علم و فضل تھے۔ مشرقی علوم کے ساتھ مغربی زبانوں (انگریزی اور فرانسیسی) پر پورا عبور حاصل تھا۔ علم ریاضی، ہیئت، طبیعیات اور فلسفہ سے زیادہ دلچسپی تھی۔ علم دوستی اور علم پروری کے لحاظ سے ان کا نام "حیات جاوید" کا مستحق ہے۔ کئی مدرسے قائم کئے۔ طلبہ کو وظائف عطا کئے۔ شعراء و مصنفین کو صلے دے کر ہمت افزائی فرمائی۔ ان کی سرپرستی اور داد و دہش کے باعث بیسیوں ارباب قلم اور اصحاب فن نے اپنے افکار و خیالات کو تصانیف کی صورت میں منظر عام پر پیش کرنے کا موقع پایا۔

امیر کبیر نواب شمس الامراء کا سب سے زیادہ اہم اور قابل قدر کارنامہ یہ ہے کہ آج سے ایک سو سال پہلے انھوں نے مغربی زبانوں سے علم طبیعیات، ریاضیات، ہیئت اور طب کی کتابوں کو اردو میں منتقل کر کے شائع ہی نہیں کرایا بلکہ ان علوم کی تعلیم کا انتظام بھی فرمایا۔ حقیقت یہ ہے کہ نواب شمس الامراء کا یہ کارنامہ ایسا درخشاں اور ممتاز ہے کہ نہ زمانہ مٹا سکتا ہے اور نہ حوادث محو کر سکتے ہیں، اب ہم کسی قدر تفصیل کے ساتھ اردو سے متعلق ان کے اہم کارناموں کو بیان کرتے ہیں۔

عام طور سے ڈاکٹر گلکرائسٹ کو اردو دارالترجمہ کا بانی قرار دیا جاتا ہے کیوں کہ ۱۸۰۱ء میں انھوں نے اس کام کو شروع کیا تھا۔ گو اس میں شک نہیں کہ انھوں نے فارسی اور سنسکرت سے اردو زبان کی سلیس اور عام فہم کتابیں مرتب کرا دیں لیکن اس کے ساتھ یہ امر بھی ملحوظ ہے کہ اس کے چالیس پچاس سال کے بعد تک جو کتابیں بھی اہل علم مرتب کرتے تھے وہ عام فہم اور آسان زبان میں نہیں ہوتی تھیں۔ یعنی ڈاکٹر گلکرائسٹ کی پیروی کسی نے نہیں کی۔ چنانچہ اس کے ثبوت میں سر سید احمد کی آثار الصنادید کو پیش کیا جا سکتا ہے جو ۱۸۴۷ء میں شائع ہوئی تھی اور جو اس زمانہ کے رواج کے مطابق مقفیٰ عبارت میں لکھی گئی تھی؟ ڈاکٹر گلکرائسٹ کے ترجموں کے متعلق دوسری بات یہ ہے کہ انھوں نے جو کچھ کام کیا وہ اپنے ہم وطن اصحاب کی خاطر تھا کہ وہ جلد سے جلد اردو زبان سے واقف ہو جائیں چنانچہ زیادہ تر قصے اور کہانیوں کی کتابیں یہاں تیار ہوتی رہیں۔ اگرچہ تاریخ اور اخلاق کی بعض کتابیں بھی مرتب ہوئی ہیں مگر ان کی تعداد ایک دو سے زیادہ نہیں۔ پھر سب سے زیادہ قابل غور یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے انگریزی یا فرنچ زبان سے کسی کتاب کا ترجمہ نہیں کرایا تھا۔ علم سائنس کی کوئی کتاب ان کے دارالترجمہ سے مرتب اور شائع نہیں ہوئی۔

اس کے مقابل میں نواب شمس الامراء کا کارنامہ ہر حیثیت سے قابل ستائش اور لائق تحسین ہے۔ سب سے پہلے انھوں نے ہی سائنس کی کتابوں کے ترجمہ کا انتظام فرمایا تھا۔ سائنس کے مختلف شعبوں کی بعض درسی کتابوں کا جو اس وقت انگریزی یا فرنچ میں لکھی گئی تھیں ترجمہ کرایا۔ ان تراجم نے عام طور سے سائنس سے دلچسپی پیدا کر دی۔ اخبارات میں سائنس کے مضامین شائع ہونے لگے اور آسان عام فہم زبان میں کتابیں مرتب ہونے لگیں۔

نواب شمس الامراء کا دارالترجمہ ۱۸۵۲ء میں قائم ہوا تھا۔ دارالترجمہ میں مندرجہ ذیل صاحب ادیب مترجم کام کرتے تھے۔ مولوی غلام

محی الدین حیدرآبادی۔ (۲) میر امان علی دہلوی (۳) مسٹر جونس (۴) مسٹر تنڈرس (۵) میر شجاعت (۵) رتن لال (۷) مسٹر جوزف۔

افسوس ہے کہ اس دارالترجمہ کی تیار شدہ کتابوں کی، تفصیل ہم کو نہیں معلوم ہوسکی۔ البتہ اتنا ضرور معلوم ہے کہ مندرجہ ذیل علوم پر کام ہ

(۱) ریاضی۔ عملی و نظری (۲) طبعیات (۳) کیمیا (۴) حیوانیات (۵) ہیئت (۶) طب

جو مواد ہم کو ملا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۸۴۲ء تک یہ دارالترجمہ قائم تھا جو کتابیں یہاں تیار ہوئیں تھیں ان میں سے اکثر شائع ہوگئی ہیں۔ لیکن بعض مخطوطات نواب ظہیر یار جنگ کے کتب خانہ میں موجود ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ سب کتابیں شائع نہیں ہوسکی تھیں۔

موقع نہیں ہے کہ یہاں تفصیل کے ساتھ ان کتابوں سے متعلق جو یہاں ترجمہ ہوکر شائع ہوئی ہیں عرض کروں پھر بھی ایک دو کتابوں کی کسی تفصیلی صراحت مناسب معلوم ہوتی ہے۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے چھ کتابوں کا مجموعہ ہے یا یہ چھ حصوں پر مشتمل ہے، اس کا حجم (۲۰۸۷) صفحات پر حاوی ہے پہلی جلد ستہ شمسیہ جبر ثقل۔ ہیولا اور اس کے اقسام اور کشش۔ انجذاب۔ کشش ثقل اور مرکز جبر ثقیل کی دوسری قوتوں کا تذکرہ ہے ا دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آج سے سو سال پہلے فنی حیثیت سے یہ تصانیف اس عہد کے علمی نظریوں اور تجربوں کی ہو حامل تھیں۔

دوسری جلد میں علم ہیئت کا بیان ہے اس میں ثوابت۔ نظام شمسی حرکت زمیں۔ چاند اور دوسرے اقمار۔ موسم مدوجزر۔ ابا اعتدال حقیقی اور کینسر وغیرہ کا بیان ہے سو برس پہلے جب کہ یہ کتاب شائع ہوئی تھی ہمارے اہل علم عام طور سے سیاروں کو وہی نظر سے دیکھتے تے نے مختلف اجسام فلکی کو مختلف اثرات کا سبب مان رکھا تھا شمس الامراء کے ان ترجموں کی بدولت اردو کی علمی دنیا کو صحیح حالات کا علم ہوا ان کے مختلف مداروں کی گردش اور ان کے محوروں کا میلان ان میں تناسب، موسمی تبدیلیاں اور ان کی حرارت وغیرہ کے مسئلے ہمارے سامنے آئے اس میں چاند گہن اور سورج گرہن پر بھی کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔

تیسری جلد کو علم آب سے موسوم کیا گیا ہے۔ دراصل یہ مائیات کا نام فہم مترادف ہے۔ ارشمیدس کے اصول کو ایک سو سال پہلے اردو وضاحت کے ساتھ بیان کرنا قابل تعریف ہے۔ آب پیما (ہائیڈرومیٹر) کے بیان کے علاوہ سیلفس کے اصول کو بھی سمجھایا گیا ہے۔ پانی میں تیرنے والے اجسام پر بھی کافی مواد مہیا کیا گیا ہے۔

چوتھی جلد، علم ہوا سے متعلق ہے۔ اس میں ہوا کے وزن، بادی، لچک، ہوائی پمپ، گونج وغیرہ پر بحث ہے۔ کلیہ بائل کو آج سو سال پہلے بہت اہم خیال کیا جاتا تھا۔ اور اب تک اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ایف اے کے نصاب میں شامل ہے گیسوں پر دباؤ کی وجہ سے جو حجمی تبدیلی ہوتی ہے اس کو اسی کلیہ کے ذریعہ ظاہر کیا جاتا ہے۔ اس کتاب میں باد پیمائی اور طپش پیمائی کے متعلق بہت کچھ معلومات ہیں۔

پانچویں جلد میں انعکاس۔ نور اور نور کے اجزا محدب شیشے قوس و قزح وغیرہ کا بیان ہے۔ آج سے سو سال پہلے اس کو "علم المناظر" سے موسوم کیا گیا ہے۔ مگر اب اس کو علم مناظر کہتے ہیں۔ عصر حاضر میں علم مناظر کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک تو ہندسی مناظر اور دوسرے طبعی مناظر کہتے ہیں۔ اس پانچویں جلد میں ہندسی مناظر کا بیان ہوا ہے۔ اس میں انعکاس۔ انعطاف نور کو وضاحت سے سمجھایا گیا ہے اور کروی آئینوں کے ضابطوں کو بھی واضح کیا گیا ہے۔ دوربین اور خوردبین کی اہمیت کو اشکال کے ذریعے سے دکھانے کی کوشش کی گئی ہے

چھٹی جلد میں برق اور مقناطیس کا بیان ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ مقناطیس کس طرح بنتا ہے۔ اصلی مقناطیس کیا ہے دوسرے

س کا کیا اثر رونما ہوتا ہے۔ البتہ اس میں مقناطیسیت کے مختلف نظریوں کا تذکرہ نہیں ہے۔ کیوں کہ سو سال پہلے اس کے متعلق کافی
نہیں تھیں۔

دجودہ زمانہ میں برق کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے یعنی سکونی برقیات، رو انی برقیات اور جدید برقیات۔ زیر بحث کتاب
ز سکونی برق سے بحث کی گئی ہے۔ برق بار کے اقسام اور اس کو حاصل کرنے کے طریقے بیان کیے گئے ہیں۔ برقی باروں میں
ش کے کلیہ کو بھی وضاحت سے سمجھایا گیا ہے۔ سکونی برقیات کے متعلق بعض مشینوں کو بھی نقشوں کے ذریعہ بتایا گیا ہے۔ مثلاً لیدن
برہ۔

ں تفصیل سے واضح ہو سکتا ہے کہ ستہ شمسیہ کے ذریعہ آج سے سو سال پہلے کس طرح سائنس کے مضامین کو دنیائے اُردو کے سامنے پیش
علوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب بہت مقبول تھی کیوں کہ کئی مرتبہ اس کی طباعت ہوئی ہے چنانچہ پہلی مرتبہ تو ۱۲۵۶ھ میں اور دوسری مرتبہ
طبع ہوئی۔ ان دونوں اشاعتوں میں یہ خط نسخ میں ٹائپ ہوئی ہے تیسری بار ۱۳۰۳ھ میں مدراس کے مطبع اسلامیہ میں طبع ہوئی ہے
لتا ہے۔ چوتھی بار ۱۳۱۶ھ میں دہلی میں منشی امیر احمد صاحب کے مطبع میں طبع ہوئی ہے۔

۱۲ ہجری سے ۱۳۱۶ ہجری تک اس کتاب کا متعدد مرتبہ شائع ہونا اس کی مقبولیت کی کافی دلیل ہے۔ اگر اس موقع پر ستہ شمسیہ کے
س مضمون کی عبارت کے نمونے پیش کئے جائیں تو شاید نامناسب نہ ہوگا۔ اس سے اُس وقت کی علمی زبان کا اندازہ بھی کیا جا سکتا ہے

تاب کا یہ ہے :۔

بعد حمد و نعت کے بندہ نیاز مند درگاہ ایزدی کا، محمد فخر الدین خان المخاطب بہ شمس الامراء اس طور سے گزارش رکھتا ہے
کتابیں چھوٹی بڑی علوم فلاسفہ کی جو زبان فرنگ میں مرقوم ہے بہ سبب میلان طبیعت کے کہ بہت اس طرف شوق رکھتا تھا۔
ں آئیں۔ اس جہت سے چند مسائل ان کے از بر تھے۔ اور اگرچہ بعضے فلاسفہ زبان عرب و عجم میں بھی مشہور ہیں۔ چناں چہ علم
مناظر وغیرہ، مگر اس قدر نہیں ہیں کہ جیسا کہ اب اہل فرنگ نے ان کو دلائل اور براہین سے بدرجہ کمال اثبات کیا ہے بلکہ بعضے علوم
ایسے رواج پائے ہیں کہ ان کے نام بھی یہاں کے لوگوں نے نہیں سنا۔ چنانچہ علم آب اور ہوا اور برق اور مقناطیس اور کیمسٹری وغیرہ
نے ارادہ تھا کہ مبتدیوں کے فائدے کے لئے کوئی کتاب مختصر جامع چند علوم کی زبان فرنگ سے ایسی ترجمہ کی جاوے کہ فرصت
مشغولات سے طالب علموں کو کچھ کچھ فائدہ میسر ہوئے کس واسطے کہ اگر بڑی بڑی کتابوں کا ترجمہ ہو گا تو طالب علموں کے ذہن پر اس
رگا۔ اور مختصر رسالوں کے دیکھنے سے ان کی طبیعت آشنائے علوم ہو جائے گی، پھر طالبین از خود ارادہ مبسوط کتاب کے دیکھنے کا
پر ان دنوں میں بہ حسب مدعا، چند رسالے مختصر علوم فلاسفہ کے بہ طریق سوال و جواب کے لکھے ہوئے ریورنڈ جارس صاحب
ان میں جو ۱۸۱۸ء میں بیچ شہر لندن کے چھاپے گئے تھے ہم پہنچے۔۔۔۔ بہ فضل حق سبحانہ تعالیٰ کے یہ چھ رسالے ترجمہ ہوئے
انگریزی اصطلاح کے جو زبان عربی اور فارسی میں نہ میسر ہوئے ان کو اسی زبان اصلی پر بحال رکھنے میں آیا۔ اور یہ چھ رسالے
چھ علم پر مشتمل ہیں۔ اس واسطے ان کا نام ستہ شمسیہ رکھا گیا۔۔۔۔ اور مادہ تاریخ اس رسالہ کا گزرانا ہوا حافظ مولوی شمس
سے شمس الامرا کی ہے یہ تالیف "۔

تاب کی عبارت کا نمونہ یہ ہے۔ "تلمیذ عرض۔ تمام اجسام بہر خواہ سطح زمین سے قریب ہوں، یا بعید کشش ثقل کیا
ی ہے؟

استاد ــ "نہیں، کشش ثقل یعنی قوت جاذبہ اس قدر گھٹتی ہے جس قدر مربع جسم کی دوری کا مرکز زمین سے بڑھتا ہے۔ اس واسطے کہ قوت جذب کی علاقہ رکھتی ہے مرکز زمین سے نہ کہ سطح زمین سے"۔

تلمیذ خرد ــ "یہ امر بے مثال دریافت کرنا کمال دشوار ہے۔ اگر کوئی مثال کے وسیلے سے یہ امر مشکل میرے فہم ناقص میں آوے ارشاد فرمائیں تو کمال منت ہے۔

استاد ــ مناسب ہے۔ ایک فوٹ کے بُعد پر شمع سے ایک مقدار معین روشنی کا جو تمہاری کتاب پر پہنچتا ہے اور اس سے کتاب پڑھ سکتے ہیں۔ پس اگر دو فٹ شمع سے پیچھے ہوں گے تو اس صورت میں اگرچہ دو چند بعد شمع سے ہوا۔ پر اول سے چار چند کم روشنی پہنچے گی۔ جو مربع دو چند دوری کا یعنی مضروب فی نفسہ دو کا ہے اور اسی طرح ۳ اور ۴ اور ۵ اور ۶ فٹ کے فاصلے پر ۹ اور ۱۶ اور ۲۵ اور ۳۶ چند کم اول سے پہنچے گی۔ یہ اعداد مربع ۳، ۴، ۵ اور ۶ کے ہیں، اور یہی حال حرارت آتش کا بھی ہے یعنی جس قدر ایک گز کے فاصلہ پر گرمی پہنچے گی اور ۳ گز کے فاصلے ۹ چند کم دعلیٰ ہذا۔"

(۲) رسالہ علم و اعمال کرہ ــ یہ بھی ایک ضخیم کتاب ہے (۴۰۸) صفحے ہیں اور ۱۲۵۷ء میں طبع ہوئی ہے۔ کتاب چار مقالوں میں منقسم ہے، ہر مقالہ میں کئی ذیلی عنوان ہیں۔ پہلے مقالہ میں کرہ مصنوعہ اور دوائر کی تعریفیں ہیں، دوسرے میں کرۂ ارضی کے اعمال اور اس سے متعلق سوالات اور جوابات ہیں، تیسرے مقالہ میں کرہ سماوی کے اعمال اور ان کے متعلق سوالات اور جوابات ہیں۔ چوتھے مقالہ میں سیارے اور اجرام فلکی کا تذکرہ ہے آخری حصہ قطب نما کا بیان ہے۔

اس کتاب کے دیباچہ اور کتاب کے نمونے یہ ہیں۔ "پوشیدہ نہ رہے کہ یہ رسالہ ہے کرے کے علم اصطرلاب کروی کہتے ہیں، ۱۲۵۵ھ میں حضرت نواب شمس الامراء بہادر امیر کبیر کے حسب الحکم مسٹر جوزہ (جوزف؟) اور بینہ رتن لال نے جو دونوں ملازم سرکار فیض آثار نواب ممدوح کے ہیں، انگریزی کا زبان سے اردو میں ترجمہ کیا۔" (دیباچہ)

"جب زمین چاند اور سورج کے درمیان میں حائل ہوتی ہے تو زمین کا سایہ چاند پر گر کے اس کا مانع نور ہوتا ہے اس کو خسوف قمر کہتے ہیں اور اس سبب سے خسوف قمر حالت بدر میں ہوتا ہے۔"

"کسی مقام مفروض کے طول بلد معلوم کا تفاوت کیونکر معلوم کریں۔ قاعدہ۔ دونوں کا طول بلد تیسرے سوال کے موافق معلوم کر کے دیکھ کہ دونوں کا طول مشرقی ہے یا مغربی، مفرض کہ بر تقدیر اس وقت عدد ناقص کو عدد زائد سے وضع کرنا۔ اس وضع کے بعد جو تفاضل کہ حاصل ہوگا ان دونوں کے طول کا تفاوت ہوگا۔ اگر ایک مشرقی ہو اور ایک مغربی تو ان دونوں کے طول کو جمع کرنا پس جمع کے بعد جو مجموعہ کہ حاصل ہوگا وہی تفاوت"

نواب شمس الامراء نے جہاں دارالترجمہ قائم کیا تھا وہاں ایک پریس بھی قائم فرمایا تھا تاکہ کتابوں کی اشاعت میں سہولت ہو، یہ پریس ۱۸۳۴ء مطابق ۱۲۵۰ھ میں قائم ہوا تھا اور "سنگی چھاپہ خانہ شمس الامراء" سے موسوم تھا۔ اس پریس میں کتابیں نسخ میں ٹائپ ہوتی تھیں۔ پریس میں تصویر کشی کا بھی انتظام تھا۔ لیتھو میں سائنسی آلات، نقشے وغیرہ طبع ہوتے تھے۔ اس زمانہ میں عام طور سے ہندوستان میں مطبعوں کا رواج نہیں تھا۔ صرف کلکتہ یا مدراس میں ایک دو پریس تھے۔

نواب شمس الامراء نے صرف سائنس کی کتابوں کے ترجمہ اور ان کی اشاعت پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کی تعلیم کا بھی انتظام فرمایا تھا۔ یوں انھوں نے کئی مدرسے قائم کئے تھے مگر ان میں سب سے بڑا مدرسہ، مدرسۂ فخریہ کے نام سے موسوم تھا جو ۱۲۴۷ھ میں قائم ہوا تھا۔ اس مدرسہ میں عربی فارسی کے ساتھ ان کتابوں کی تعلیم ہوتی تھی جو نواب صاحب کے دارالترجمہ میں تیار ہوتی تھیں۔ بہ الفاظ دیگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے ایک

رآباد میں اُردو زبان میں علم سائنس کی تعلیم کا انتظام تھا اور اس کے بانی نواب شمس الامرا تھے۔

جو معلومات ہم کو دستیاب ہوتی ہیں ان سے پا یا جاتا ہے کہ نواب صاحب نے یورپ سے سائنسی تجربوں کے لئے آلات بھی طلب فرمائے تھے
ان سے تجربہ کرتے تھے اور مدرسۂ فخریہ کے طلباء کو بھی یہ تجربے بتائے جاتے تھے۔

اس مدرسہ میں جو تعلیم دی جاتی تھی وہ کس قدر مفید اور سودمند تھی اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جب حیدرآباد میں سرکار نے ۱۲۶۰ھ
کی تعلیم کے لئے مدرسہ قائم کیا تو اس میں تعلیم کے لئے مدرسۂ فخریہ کے طلبا ء ہی کو انتخاب کیا گیا تھا اور ان میں سے بعضوں نے ڈاکٹری میں اچھی ناموری حاصل
مثلاً افضل الحکما ء ڈاکٹر محمد فیض اللہ، شمس الحکما ء ڈاکٹر محمد اشرف، ڈاکٹر میر باقر علی، ڈاکٹر محمد اکبر وغیرہ۔

نواب شمس الامرا بہادر کی سرکار سے مدرسہ فخریہ اور دوسرے مدرسوں کے طلبہ کو وظائف بھی دیئے جاتے۔ کتابیں مفت مرحمت ہوتیں اور
کو معقول تنخواہیں ملتی تھیں۔

نواب شمس الامرا کا یہ بھی ایک کارنامہ ہے کہ انھوں نے اپنے مدرسہ کے لئے ایک علاحدہ نصاب مرتب کیا تھا، ادب کے ساتھ اخلاق،
ریاضی، طبعیات، علم موسیقی وغیرہ کی معلومات نصابی کتابوں میں شریک کی گئی تھیں۔

آج سے ایک سو سال پہلے مغربی زبانوں سے سائنس کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرانا اور ان کی تعلیم کا انتظام کرنا کوئی معمولی بات نہیں تھی کہ
ہم تصور کرکے نظر انداز کر دیا جائے۔ جب اس کام کے ایک سو سال بعد اس قسم کا کام شروع ہونے والا تھا تو ایک بڑی جماعت کو اس کا
آتا تھا کہ اردو جیسی تہی مایہ زبان میں مغربی علوم کا خزانہ منتقل ہو سکتا ہے اور منتقل ہو تو اس کی تعلیم اردو میں بھی دی جا سکتی ہے کیا
حیرت اور استعجاب نہیں ہے کہ نواب شمس الامرا نے آج سے ایک سو سال پہلے اس کو عملی طور پر ثابت کر دکھایا تھا دارالترجمہ کا قیام
کتابوں کا ترجمہ ان کی طباعت کا انتظام مدرسہ کا قیام اردو کو ذریعہ تعلیم بنانا۔ یہ تمام وہ قابل قدر خدمات ہیں جن کے باعث ہمارا کہ
ہیں نواب شمس الامرا حیات جاوید کے مستحق ہیں۔　　　(نوائے ادب سہ ماہی بمبئی اپریل ۱۹۵۱ء)

فن ترجمہ کا ادبی جائزہ　　　بقیہ صفحہ ۲ سے آگے

ت اور سرور کی کیفیات کو پیدا کرتا ہے لیکن جب اس تصنیف کا عکس ذہن کے گوشوں سے ہٹ جاتا ہے تو سرور کا سحر بھی ٹوٹ
اور پھر انسان دوبارہ اپنی اسی دنیا کی طرف لوٹ آتا ہے جس میں ناکامی و نامرادی کو وہ اپنا شعار سمجھتا ہے ناول یا اسی قبیل کی دیگر
طالعہ اگرچہ کہ جذباتی سکون کا باعث ہوتا ہے لیکن یہ سکون عارضی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لحاظ سے تراجم کی وجہ سے انسان اور
میں تغیر اور ذہنی ارتقاء میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ تخلیق اور تراجم میں اگرچہ کہ نمایاں فرق ہے لیکن ایک ابھرتی ہوئی قوم یا
تہذیب کے لئے تراجم کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے۔ اس ترقی یافتہ دور میں انسان کی ضروریات کی تکمیل تراجم کے ذریعہ ہی ہو سکتی
لئے تراجم آج کے دور میں تخلیق و تالیف سے زیادہ وقعت رکھتے ہیں۔ ۔۔

حیدرآباد کے شاعر

(۱۹) نظیر علی عدیل

۱۹۷۴ء میں مطبوعہ ریاستی ساہتیہ اکیڈمی کے تذکروں کا سلسلہ

سید نظیر علی عدیل (۲۹ رمئی ۱۹۲۵ء) کا شمار دبستانِ صفی کے اچھے غزل گو شعراء میں ہوتا ہے۔ عدیل نے حیدرآباد کی قدیم اور مشہور درسگاہ "دارالعلوم" سے ثانوی تعلیم مکمل کی اور ادیب منشی فاضل ہوئے۔ طالب علمی کے زمانے سے ان میں شاعرانہ صلاحیتیں پنہاں رہیں، ۱۹۴۲ء سے شعر کہنا شروع کیا۔ علمِ شعر حضرت امجد حیدرآبادی سے سیکھا اور انہیں کے مشورہ پر دکن کے نامور غزل گو استاد حضرت صفی اورنگ آبادی کو اپنا کلام دکھایا، رموزِ شعر سیکھے اور زبان و بیان کے نکات سے استفادہ کیا۔ صفی کے بعد عدیل نے حضرت امجد سے اپنے کلام پر اصلاح لی۔ حیدرآباد کے خوش فکر شعراء میں عدیل اپنے لہجہ اور اسلوب کی کلاسیکت اور ترنم کے باعث پسند کئے جاتے ہیں، غزلیہ شاعری میں کیفیاتِ حسن و دل کے ساتھ ساتھ زندگی کے مسائل اور عصری حسیت کا شعور بھی ان کی شاعری میں روشن تر نظر آتا ہے۔ عدیل کئی شعری محفلوں اور انجمنوں سے وابستہ ہیں۔ رسائل و جرائد میں ان کی تخلیقات شائع ہوتی رہتی ہیں، ریڈیو اور کل ہند مشاعروں میں بھی مدعو کئے جاتے رہے ہیں۔ حیدرآباد کی ادبی صحافت سے بھی انسلاک رہا ہے۔ نظم بھی کہتے ہیں اور مسائلِ حیات پر غائر نظر بھی رکھتے ہیں۔ کلام اشاعت کی غرض سے مرتب کر لیا گیا ہے۔ ریاستی محکمۂ امداد باہمی میں برسرِ کار ہیں اور حیدرآباد کے علمی و ادبی ماحول میں گزشتہ چند سال سے "تنہا" سے رہنے لگے ہیں۔ (و، غ)

غ

تاج داروں کے خواب کی تعبیر — سنگِ مرمر کی بن گئی تقد
ابنِ آدم ہے قطرۂ دل گیر — اس کو کہتے ہیں خون کی تا
ہے یہی حسن و عشق کی تفسیر — کوئی عالم ہے کوئی عالمگیر
بے ضمیروں کی تیرگی میں کبھی — ڈھونڈتا ہے چراغ رخ کے
ساتھ تیرے سے تو رہا گلشن — کس کو مڑ مڑ کے دیکھتے ہیں

ایک ہے میرا ظاہر و باطن
جس طرح معنیٔ عدیل و نظیر

○

وہ پہلی آنکھ کا سیلاب آج تک ہے میاں — کہ آنسوؤں کا تسلسل پلک پلک ہے
کسی کی آنکھ میں آنسو کسی کے لب پہ ہنسی — خدا رکھے ترے غم میں بڑی لچک ہے
ہوا ہوں خاک نشین صرف دل کو بہلانے — وگرنہ میری سکونت فلک فلک ہے
ہنسی اڑائی تھی شاید کسی کے زخموں کی — صدی صدی سے سمندر نمک نمک ہے
مجھے نکال کے پچھتائیں گے چمن والے — ہر ایک گل میں مرے خون کی مہک

بہت سنبھل کے گزرنا عدیل دنیا سے
قدم قدم پہ یہ ٹوٹی ہوئی سڑک ہے میاں

○

کبھی اداس وہ گلشن سے گھر نہیں آئے — گلوں کے زخم تو ان کو نظر نہیں
خلوص جن کے خد و خال سے ٹپکتا ہے — وہ کیسے لوگ ہیں اب تک نظر نہیں
یہاں تلاش ہے کس کی شمیمِ گل تجھ کو — بہت زمانہ ہوا وہ ادھر نہیں آ
خوشی کے لمحے مہ و سال سے الگ ہیں کیا — ہمارے حصے میں کیوں عمر بھر نہیں
کچھ ایسے ڈوب گئے ہم کسی کی آنکھوں میں — تمام عمر کبھی سطح پہ نہیں آ

بھٹکنے والے تو منزل پہ آچکے ہیں عدیل
نہ جانے کس لئے خود راہبر نہیں آئے

○

طلسمِ خواب

نصر قریشی

ہم کہ خوابوں کی ردا اوڑھے گذاریں ہر شب
خواب جو دل کے دریچوں کو جگا دیتے ہیں
خواب کا ڈھیر ہیں ہم ، خواب ہماری پونجی
ہم کہ اس کارگہِ زیست میں سایوں کی طرح
جب اندھیروں کا سفر ہو تو بچھڑ جاتے ہیں
نقش کی طرح ہر اک لمحہ بگڑ جاتے ہیں
زندگی روپ نئے رنگ بدلتی جائے
روشنی زرد پہاڑوں پہ ہے گم صم ، کھوئی
ہم کہ صدیوں سے غمِ دل کے صنم خانوں میں
رہگذاروں سے چلے خوابوں کے ویرانوں میں
ہر گھڑی جبرِ مسلسل سے گذرتے جائیں
نامرادوں کی طرح دستِ دعا پھیلائے
وقت کے بہتے سمندر میں بہے جاتے ہیں
سورج کے زخم سے بے حال ہیں امروز کے خواب
خوف کے تیروں سے چھلنی ہوا ہے خواب کا جسم
ضرب پڑتی ہے تو شیشوں کی طرح ٹوٹ گئے
وقت کے موڑ پہ خود اپنے سے ہم چھوٹ گئے
ہم کہ اس گردشِ ایام کے پنجوں میں اسیر
تیرہ و تار فضاؤں میں اُجالوں کے سفیر
رات آتی ہے تو چپ چاپ بکھر جاتے ہیں
خواب سنتے ہوئے ہر غم سے گذر جاتے ہیں
خاک کا خواب ہیں ہم ، خواب ہماری ہستی
آئینہ خواب کا ٹوٹے بھی تو جڑ جاتا ہے
ہم کو خوابوں کا سہارا ہے بہت
خواب کا ڈھیر ہیں ہم ، خواب ہمارا حصہ
ہم کہ خوابوں سے در و بام سجاتے جائیں
شب زدوں کو بھی حسیں خواب دکھاتے جائیں

نصیر احمد نصیر گلبرگوی

غزل

خیال و خواب میں جو آب و تاب جیسا تھا
قریب آیا تو جلتا سراب جیسا تھا

اُگا رہا ہے وہی درد کے گھنے جنگل
وجود جس کا مہکتا گلاب جیسا تھا

انا کے قول سے دیکھا تو زیست کا چہرہ
صداقتوں کے جھروکے میں خواب جیسا تھا

مرے گلاس میں مری ہی حسرتوں کا لہو
شراب تو نہیں لیکن شراب جیسا تھا

میں اس کو میلے میں دیکھا تو دیکھتا ہی رہا
کسی کا چہرہ غزل کی کتاب جیسا تھا

ہمارے زخم کے جگنو چمک اُٹھے تو نصیر
شبِ الم کا بدن آفتاب جیسا تھا

غزلیں

راہی نجیب آبادی

آخری اِلتجا

زندگی معاف رکھ
اب کوئی عذاب
کوئی بھی عذاب سہہ نہ پاؤں گا

مجھ پہ تو یقین کر
مجھ میں اب
اِتنی بھی سکت نہیں
کہ جھوٹ تو بہت ہے کوئی ٹھیس بھی سہار لوں
تجھے گنوا سکوں

ضبط کی ہر ایک حد کو
پار کر چکا ہوں میں
اب وہاں کھڑا ہوں میں
جہاں بہت قریب سے
موت کا گذر بھی ہے

مہدی پرتاپگڈھی

اس کی آنکھوں کا مرگیا پانی … حیف سر سے گزر گیا پانی
خشک دریاؤں میں ہے ریت ہی ریت … برف پگھلی، کدھر گیا پانی
جب بھی برسا ہے ابر احساسات … میری آنکھوں میں بھر گیا پانی
اُس کی آنکھیں تو جھیل جیسی تھیں … بدلا موسم، اُتر گیا پانی
میرا گھر تھا نشیب کی جانب … کس طرف سے گزر گیا پانی
گھر کے جوگی کو پوچھتا ہے کون … اپنا گھر چھوڑ کر گیا پانی
زندگی ہے وہاں، اُدھر دیکھو
ہو کے مہدی جدھر گیا پانی

○

صدائیں ڈوبتے مہتاب کی ہیں … یہ آوازیں مرے اعصاب کی
تری آواز پر اِن سرپھروں نے … ہزاروں کشتیاں غرقاب کی
سُنا ہے پھر کئی پیاسے لبوں پر … دعائیں آخری سیلاب کی
ستارہ، چاند، سبزہ، روپ، خوشبو … یہ تعبیریں تو میرے خواب کی
ترا ملنا کوئی مشکل نہیں ہے … مگر دشواریاں آداب کی
خلشؔ اس بار تازہ ہجرتوں نے … پُرانی بستیاں شاداب کی

خلشؔ مظفر پوری

خالد محمود

بانساحد کے سہیے "کبیر" کا پتھر اتار دے … یارب الٰہ اِس کو زمیں پر اُتار دے
ہر جا یہ سوچتا ہوں مری زندگی مجھے … شاید اِسی مقام پہ دکھ کر اُتار دے
پیچھے نہ رہ سکوں گا مگر میر کارواں … تھکنے لگے ہیں پیر مرا سر اُتار دے
اُس فرد سے پھر آج میں ہنس کر ملا کہ جو … موقع ملے تو پیٹھ میں خنجر اُتار دے
اپنی غزل کے جسم سے پہنا ہوا لباس
خالدؔ اگر نئے سے ہو بہتر اُتار دے

سب رنگ — اس عنوان کے تحت ہند و پاک کے معیاری ادبی رسائل و کتب سے مضامین نظم و نثر کا انتخاب شائع ہوا کرے گا (ادارہ)

سید کاظم رضا

پیاری بیٹی

شہلا گیند کی طرح اچھلتی ہوئی آئی اور آ کر میری گود میں براجمان ہو گئی۔

میں نے سر جھکا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس نے گود میں بیٹھے بیٹھے سر اوپر اٹھایا۔

"ابو جب آپ چھوٹے سے تھے تو کیا آپ بھی کہانیاں سنا کرتے تھے؟" — اس نے مجھے اپنی طرف متوجہ دیکھا تو پوچھا —

"کیوں نہیں —" میں نے مختصر سا جواب دیا۔

"آپ کو کون سی کہانی پسند تھی؟" — اس نے پھر سوال کیا۔

"اب یہ تو یاد نہیں — بہت سی کہانیاں تھیں۔"

"اچھا کوئی کہانی سنائیے!" اس نے فرمائش کر ڈالی —

"اس وقت؟" میں نے اس طرح کہا جیسے اس نے کوئی بہت ہی انوکھی بات کہہ دی ہو —

"جی!" اس نے بڑے اطمینان سے کہا۔

"نہیں بیٹے دن میں کہانی نہیں سنتے!" —

"کیوں — ؟ دن میں کیوں نہیں سنتے؟" —

"اس لیے بیٹے" میں نے اسے ٹالنے کی کوشش کی — "کہ اگر دن میں کہانی سنی جائے تو ماموں جان راستہ بھول جاتے ہیں۔"

یکلخت ہنسی کا فوارہ سا ابلا — میں نے کچھ جھینپتے ہوئے کچھ مسکراتے ہوئے شہلا کی طرف دیکھا۔ وہ ہنستے ہنستے میری گود سے پھسل کر پلنگ پر گر گئی —

"اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے —" میں نے قدرے ناراض ہوتے ہوئے کہا

اس نے اپنے ننھے منے ہاتھوں سے اپنی آنکھوں کی نمی کو پونچھتے ہوئے پوچھا — "یہ ہنسی کی بات نہیں ہے؟" —

ٹائم انٹرنیشنل کے تازہ شمارے پر نگاہیں جمائے جمائے شہلا کے انکل نے کہا — "ایک سوال یہ بھی ہے کہ راستہ ہمیشہ ماموں جان ہی کیوں بھولتے ہیں، کبھی چچا جان اس خطرے کی زد میں کیوں نہیں آتے؟" —

سروتے کی کھٹ کھٹ اچانک رک گئی۔ اماں جی نے کچھ کہنے کی نیت کی، مگر منہ میں بھری ہوئی پان کی پیک آ گئی۔ انھوں نے پیچھے گھوم کے اگالدان تلاش کیا، جب وہ نظر نہ آیا تو ان کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ انھوں نے اپنا منہ آسمان کی طرف اٹھا کر پیک کو دانتوں کی کلیوں میں سنبھالا

اونچی آواز لگاتی — "او چھمیا — کہاں مرگئی اگالدان لے کر آ"۔

بچپن میں میرا چھوٹا بھائی اماں جی کا بڑا لاڈلا تھا، مگر اب نہ جانے کیوں انھیں اس کی باتوں سے چڑ ہوگئی تھی۔ حالانکہ اب وہ دنیاوی اُ کے ناطے سب سے زیادہ کماؤ بھیا وہی تھا۔

"پڑھ لکھ کر دماغ خراب ہوگیا ہے"۔ وہ کہا کرتیں۔ "یا شاید کمائی کا گھمنڈ ہے"۔

"اسے دماغ کی خرابی کہہ لو یا گھمنڈ اماں جی"۔ وہ جواب دیتا۔ "مگر بات یہ ہے کہ میں تو وہی بات کہوں گا جو مجھے سچ نظر آتی ہے ناراض ہوتی ہیں مگر کسی کو میں دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا اور ان بچوں کو خاص طور پر نہیں"۔

اور اماں جی یہ سن کر جھنجھلا جاتیں، چراغ پا ہو جاتیں، مگر اس وقت جو اس نے گھر کا راستہ بھولنے والے فارمولے کا رُخ اپنی طرف موڑا تو ننھی شہلا پھر گود میں آکر بیٹھ گئی اور ٹھنک ٹھنک کر کہنے لگی — "ابو کہانی سنایئے نا —!"

"اچھا سنو"۔ میں نے کہانی سنانے کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنا شروع کر دیا — "ایک تھی پری — سبز پری!"

"کہاں تھی —؟" شہلا نے بات کاٹ کر پوچھا۔

"کہاں تھی!" — میں نے قدرے جز بز ہو کر کہا — "کہاں ہوتی۔ اپنے گھر میں ہوگی —"

"اور اس کا گھر کہاں تھا —"

"کوہ قاف میں! —"

"اور یہ کوہ قاف کہاں پایا جاتا ہے؟" شہلا کے انکل نے رسالے پر سے نگاہیں ہٹائے بغیر سوال کیا —

میں نے اپنے چھوٹے بھائی کی طرف دیکھا — وہ دھیرے دھیرے مسکرا رہا تھا۔

"اس نے تو میری بچی کو بگاڑنے پر کمر باندھ لی ہے —" میں نے اپنے دل میں سوچا عجیب بات ہے۔ میں نے اپنی تعلیم کا سلسلہ اس لیے ختم کیا کہ اس کی تعلیم مکمل ہو جائے اور اب وہ پڑھ لکھ کر ہمیں احمق سمجھنے لگا تھا۔ پھر ستم یہ تھا کہ میری بچی اسی کی دلدادہ تھی۔

ٹھیک ہے وہ اس سے بے پناہ محبت کرتا تھا مگر اس کی سیدھی سیدھی باتیں بھی پڑھاتا رہتا تھا اور وہ بچی اتنی سیدھی تھی کہ اس کی ہر بات دل پہ نقش کر لیتی تھی۔ وہ کہتا ہر بات دلیل سے سمجھاؤ — "ہنہ بچے دلیل کو کیا جانے —!"

میں اپنے ہی خیالات میں گم تھا۔

شہلا کے ہونٹوں پہ اس کے انکل کی بات بازگشت بن کر ابھری۔ "بتلایئے نا ابو — کوہ قاف کہاں ہے؟ —"

"بھئی اس دنیا میں کہیں نہ کہیں تو ضرور ہوگا" — میں نے دامن بچانا چاہا —

"جی کہیں بھی نہیں ہے!" شہلا نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "میں نے خود ساری دنیا کا نقشہ دیکھا ہے مجھے تمام پہاڑ نام یاد ہیں مگر ان میں کوہ قاف تو کہیں بھی نہیں ہے — نہیں ہے نا انکل؟"

"نہیں بیٹے —" وہ بولا —

"خیر نہ ہوگا —" میں نے ہتھیار ڈالنے میں ہی عافیت دیکھی۔ "میں کوہ قاف کی نہیں سبز پری کی کہانی سنا رہا ہوں"—

"مگر جب کوہ قاف ہی نہیں ہوتا تو سبز پری کہاں ہوتی ہوگی —" شہلا نے کہا —

میں نے دیکھا کہ میرا چھوٹا بھائی پھر آہستہ آہستہ مسکرا رہا ہے۔

میری جھنجھلاہٹ غصے میں تبدیل ہونے لگی۔

"یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ یہ سبز پریاں، سرخ پریاں، سنہری پریاں کہاں ہوتی ہیں —" میں نے ذرا بگڑتے ہوئے کہا۔ "لیکن اُن کی کہانیاں ہوتی ہیں۔ میں تمھیں سبز پری کی کہانی سنانا چاہتا تھا اور وہ بھی تمھاری فرمائش پر — خاموشی سے سن سکتی ہو تو اپنا منہ بند کر کے تو سن لو۔"

"بے کار ہے" شہلا نے بڑی مایوسی سے کہا —

"کیا بیکار ہے؟" میں نے پوچھا — شہلا نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ کچھ اور ہی سوچ رہی تھی۔

"جو چیزیں ہوتی ہی نہیں اُن کی کہانیاں بنانے سے کیا فائدہ —؟"

چمیا پتیل کا چمچماتا اگالدان لیے آئی اور اماں جی کی پٹی کے نیچے رکھ کر ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ اماں جی نے پیک کی ایک طویل دھار اگالدان میں انڈیلی اور گالوں ملتے ہوئے بولیں "اللہ میری توبہ — یہ سب قربِ قیامت کی نشانیاں ہیں"

اماں جی کے چھوٹے بیٹے نے کرسی میں جھولتے ہوئے کہا —

"کیا ہوا اماں جی — کونسی قربِ قیامت کی نشانیاں ہیں؟" —

"ارے بیٹے" انھوں نے لمبا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "یہ آج کل کے بچے ہیں کہ آفت کا ٹکڑا — یہ بات ایسی کیوں ہے۔ ت ویسی کیوں ہے؟ ان سے تو اچھے اچھے پناہ مانگ جائیں۔ ایک ہمارا زمانہ تھا کہ —" "آپ کا زمانہ اماں جی ساٹھ ستر سال پرانی بات ہے۔ ان برسوں میں انسان نے ایک ہی جست میں اتنا لمبا سفر طے کر لیا ہے کہ گزشتہ ساٹھ ہزار سال کی تاریخ اس کی مثال پیش نہیں کرتی۔ یہ ایٹم کا زمانہ ہے — خلائی دور ہے۔"

"تیرا تو دماغ چل گیا ہے لڑکے!" اماں جی کو غصہ آ گیا۔ "چار جماعتیں کیا پڑھ گیا ہے کہ ہر ایک کو احمق سمجھنے لگا ہے۔" میرے جسم میں رکی بھاپ بھر گئی تھی اُس کو بھی نکلنے کی راہ مل گئی —

"کوئی جاہل آدمی ایسی بات کرے تو نظر انداز کی جا سکتی ہے۔ جب ایسی باتیں پڑھے لکھے سمجھدار لوگوں کی زبان پر آ جائیں تو اسے قسمت ظریفی ہی کہا جا سکتا ہے۔ اماں جی صبر کرو" — میرے بھائی نے میری طرف دیکھا —

"خدا گواہ ہے میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا" — وہ بولا — "میں تو صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ —"

"میں تیرا مطلب خوب سمجھتی ہوں بیٹا — آخر تیری ماں ہوں" اماں جی اُس کی بات کاٹ کر کہا۔ اُن کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا "پڑھنے لکھنے کے بعد اگر میں اتنا ہی بُرا ہو گیا ہوں تو مجھے پڑھایا ہی کیوں تھا؟" میرے بھائی نے "ٹائم" ایک طرف پٹخ دیا اور بڑبڑاتا ہوا اٹھ کر چل دیا —

شہلا نے میری گود میں بیٹھے بیٹھے سر اٹھا کر میرے چہرے پر نگاہیں گاڑ دیں —

"ابو میں نے تو کہانی سنانے کے لیے کہا تھا آپ لڑنے کیوں لگے؟" —

میں نے سر جھکا کر اپنی بیٹی کی طرف دیکھا۔

"ساری بیٹے!" میں نے دھیرے سے کہا —

"مگر دیکھو تم نے پھر ایک سوال پوچھ لیا —!"

(بشکریہ "ماہنامہ افکار" کراچی۔ مارچ ۱۹۷۸ء)

نقد و نظر

(نوٹ: تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

اثر لکھنوی: حیات اور کارنامے

مقالہ از محمود خاور صفحات (۱۵۴) کراون مجلد ۔/۲۰ روپے
ناشر: شالیمار پبلی کیشنز نیا ملک پیٹ حیدرآباد ۳۶

اردو دنیا کے لئے محمود خاور کا نام نیا نہیں ۔ وہ ادبی ہفتہ وار "برگ آوارہ" کے ایڈیٹر اور ایک متوازن لب و لہجے کے شاعر کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں ۔

اثر لکھنوی (حیات اور کارنامے) اُن اچھے مقالوں میں سے ایک ہے جو شعبۂ اردو، جامعہ عثمانیہ کے زیر نگرانی کی سطح پر طالب علموں سے لکھوائے گئے ہیں ۔ محمود خاور کے اس مقالے کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے اس میکا[نکی طریقے] کو نہیں اپنایا جو تاریخ پیدائش سے شروع ہو کر تاریخ وفات پر ختم ہوتا ہے اور بیچ میں کچھ نقادوں کے حوالوں سے چند اقتباس اور باقی اللہ خیر صلا ۔ لیجئے مقالہ تیار ہو گیا ۔

ویسے محمود خاور نے بھی حوالے دیئے ہیں لیکن جہاں بھی موقع ملا انھوں نے اپنا نقطۂ نگاہ بھی پڑھنے والوں کے سامنے رکھا ہے ورنہ عام طور پر مقالوں میں ہوتا یہ ہے کہ صفحہ کے صفحے پڑھ ڈالئے اور مقالہ نگار کا نقطۂ نگاہ نہیں آتا ۔ شاعر یا ادیب کے بارے میں دوسرے دانشوروں اور نقادوں کی رائیں تو مل جاتی ہیں لیکن مقالہ نگار کیا سمجھتا ہے، کیا کہتا ہے، یہ بات سامنے نہیں آتی ۔ خاور نے اپنے اس مقالے کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے ۔ پہلے میں مرزا جعفر علی خاں کی ولادت سے لے کر انتقال تک اور ڈپٹی کلکٹری سے لے کر کشمیر کے وزیر بننے تک کے واقعات کو اس طریق میں پیش کیا ہے کہ پڑھنے والے کے سامنے وہ چھپا ہوا فن کار سامنے آجاتا ہے جو شخصیت کے روپ میں اثر لکھنوی کے نام سے غیر منقسم ہندوستان کا ایک اہم ادبی کردار بن جاتا ہے ۔ یہ دوسرا حصہ ہے ۔ مقالے کے تیسرے حصے میں خاور نے بتایا کہ اثر لکھنوی اپنے منفرد لب و لہجے میں لکھنوی اسکول کے ایک اہم شاعر تھے بلکہ بڑے نقاد بھی تھے جنھوں نے کسی قیمت پر کسی کے ساتھ ادبی سمجھوتہ نہیں کیا اور وہی کہا جس کو وہ صحیح سمجھتے تھے ۔

مود خاور نے بالکل صحیح کہا ہے "لکھنوی شاعری میں جو جوڑ توڑ، داؤ پیچ اور توڑ موڑ والی فضا ملتی ہے اس سے اس
اثر کا کلام بالکلیہ پاک ہے اور ان کے کلام کا بیشتر حصہ داخلی کیفیات کا حامل ہے۔"
شاید یہی وجہ ہے کہ اثر باوجود لکھنوی اسکول کے ایک نمائندہ شاعر ہونے کے ان کا جھکاؤ میر تقی میر کی طرف
ا۔ یہ تضاد اپنی جگہ ہے اور خاور نے اس کا بہت ہی اچھے انداز میں تجزیہ کرتے ہوئے بتایا کہ یہ ان کی بہترین
بیت اور مشرقی و مغربی تہذیب اور تعلیم کے اچھے عناصر کا اثر تھا جو ان کے ذہن اور شعور پر مرتب ہوا اور انھوں
کھلے دل کے ساتھ ہر اچھی بات اور قدر کو قبول کیا جو انھیں پسند آئی۔
محمود خاور نے اثر لکھنوی پر اس وقت لکھا جب کہ وہ بھلا دیئے گئے تھے یا بھلا دیئے جارہے تھے۔

عاتق شاہ

شہرِ تمنّا (شعری مجموعہ)

شاعر: علی احمد جلیلی قیمت: دس روپے
ملنے کا پتہ: اردو اکیڈمی سیف آباد، حیدرآباد

"شہرِ تمنّا" علی احمد جلیلی کا دوسرا مجموعۂ کلام ہے جس میں انھوں نے تسلیم کیا ہے کہ
جدید شاعر نہیں ہیں بلکہ جدید عہد کے شاعر ہیں۔ محمود سعیدی اور علی سردار جعفری نے چند سطری آراء میں اس بات پر زور
ہے کہ علی احمد جلیلی ایک بڑے باپ کے بیٹے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ خورشید احمد جامی کے بعض اشعار سے استفادہ
حد تک متاثر ہیں جیسے ؎

؎ اک عمر ساتھ رہتے ہوئے ہوگئی مگر — پہچانتی نہیں ہے ابھی تک مجھے حیات
ع ہر شخص ہے ہاتھوں میں صلیب اپنی اٹھائے — ع میں وقت ہوں تاریخ کے چہرے پہ لکھا ہوں
؎ سحر کی گود کے پالے ہوئے ہیں ہم لیکن — یہ اور بات کہ پہچانتی نہیں ہے سحر
؎ وہ عبارت جو کتابوں میں نہ تھی — ہم نے چہروں میں پڑھی ہے اکثر

مگر خورشید احمد جامی کے فکر و فن اور ڈکشن سے بہرحال دور ہیں۔ "شہرِ تمنّا" میں آخر آخر میں کہی گئی غزلیں ابتدائی
ابتدا میں اور ابتداء میں کہی گئی غزلیں آخر میں دی گئی ہیں اور ان دونوں طرح کی غزلوں کے بیچ (فصل قائم رکھنے کیلئے)
ہ نظمیں دی گئیں ہیں جو دراصل بے زمینی والی کیفیت رکھتی ہیں۔ عجز بیان کے نمونے بھی بہت ہیں جیسے ؎

جب کبھی حد سے بڑھیں تنہائیاں — آگئیں نزدیک کچھ پرچھائیاں (قافیے: دوریاں، انگلیاں وغیرہ)
آنکھوں سے دل کا درد جھلکتا دکھائی دے — خالی ہے شیشہ اور چھلکتا دکھائی دے (قافیے، تھکتا، بھٹکتا وغیرہ)

علی احمد جلیلی کی یہ بات بہت اُمید افزا ہے کہ انھیں شعر گوئی کا کوئی زعم نہیں اور نہ وہ بزعم خود غلط قسم کا کوئی دعوی کرتے
ہتے ہیں بلکہ وہ تو صاف کہتے ہیں: جیا جو بہتے ہوئے خیال عطا — پیرہن ان کو تم نیا دے دو
نیا پچھی — اسلوب نیا دیکے اٹھا لائے ہم ان کو . فرسودہ خیالات جو بیکار پڑے تھے
حمد جلیلی عام شاعروں سے اگر اپنے آپ کو ممتاز نہ کر پائیں تو اس میں ادب کا نہیں خود ان کا نقصان ہوگا۔
بت بہت خوبصورت ہے۔ من جملہ شہرِ تمنّا کا گٹ اَپ اچھا ہے۔
م۔ ن۔ م

اُردو نامہ

اُردو کی ادبی اور تہذیبی خبریں

یکم جولائی : بزم نرائن داس کا ماہانہ طرحی مشاعرہ بصدارت جناب سرفراز علی مرزا منعقد ہوا۔ قدیم رنگ سخن کے شعراء نے کلام سنایا۔

● ہندی کے مشہور شاعر راجہ دوبے کی شعری و ادبی خدمات کو اُردو، ہندی کے ادیبوں نے خراج عقیدت ادا کیا۔ آنجہانی دوبے کے شعری مجموعہ کو جلد شائع کرنے کے سلسلے میں اس جلسہ نے ایک قرارداد بھی منظور کی۔ اُردو والوں کی طرف سے ڈاکٹر عالم خوندمیری، انور رشید، کنول پرشاد کنول اور راجہ جوالا راجہ نے تقریریں کیں۔ ڈاکٹر راج کشور پانڈے صدر شعبۂ ہندی عثمانیہ یونیورسٹی نے جلسہ کی صدارت کی۔

● ریاست میں اُردو میڈیم کے معیار تعلیم کو بہتر بنانے کی ضرورت کے تحت انجمن ترقی اُردو کے زیر اہتمام ایک تعلیمی سیمینار پروفیسر حبیب الرحمٰن کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مرکزی انجمن کے نائب صدر ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، جناب عابد علی خاں معتمد ادبی ٹرسٹ، پروفیسر افضال احمد، پرنسپل فصیح الدین احمد، جناب نظام الدین مغربی اور جناب سر سنگھ اس لا ہوتی نے مخاطب کیا۔ اس موقع پر طلباء اور اساتذہ کے مسائل پر غور کرنے کے لئے ایک کمیٹی بھی تشکیل دی گئی۔

● اُردو کے نوجوان فکر معروف شاعر جناب صادق نقوی کو جامعہ عثمانیہ میں لکچرار شعبۂ تاریخ مقرر ہوئے۔ موصوف اس سے پہلے حیدرآباد پبلک اسکول سے وابستہ تھے۔

(سب رس ماہ جولائی ۷۸ء میں صادق نقوی صاحب کی ایک نظم بعنوان "کشمکش" صفحہ ۱۹ پر شائع ہو چکی ہے جس پر سہو کتابت کے سبب صادق نوید چھپا ہے۔ براہ کرم قارئین اس کی تصحیح فرمالیں (ادارہ)

۳ جولائی : انجمن تحفظ اُردو کی مجلس عاملہ کا اجلاس جناب شہوار ذکی شیشکار ایم ایل سی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں انجمن کے سابق صدر جی ایم باگا ریڈی کے وزیر پنچایت راج ہونے پر مبارکباد کی قرارداد منظور کی گئی اور انجمن سے وابستہ ان کی اُردو خدمات کو خراج تحسین ادا کیا گیا۔ جناب چندر سری واستو معتمد انجمن نے رپورٹ پیش کی اور نائب صدر تحفظ اُردو جناب سید مصطفےٰ کمال نے ریاست میں اُردو تحریک کا جائزہ لیتے ہوئے انجمن کی کامیابیوں کا ذکر کرتے ہوئے جناب باگا ریڈی کی رہنمائی کی تعریف کی۔ صدر انجمن تحفظ اُردو نے اپنے اس تیقن کا اظہار کیا کہ جناب اُردو کے تعاون سے وہ اُردو یونیورسٹی کے قیام کے مقصد کی تکمیل میں کوشاں رہیں گے۔ جناب علی تنویر نے شکریہ ادا کیا۔

۵ جولائی : جناب عابد علی خاں ایڈیٹر روزنامہ "سیاست" نے صدر جمہوریہ ہند نیلم سنجیوا ریڈی سے ملاقات کر کے ادارہ کی طرف سے مطبوعہ دو کتابیں "شہر حیدرآباد" اور "برجستہ اشعار" تحفۃً پیش کیں۔ صدر جمہوریہ ہند نے موصوف سے ریاست میں اُردو کے موقف پر تبادلۂ خیال کیا اور ان مطبوعات کی اشاعت پر دلی مبارکباد دی۔

۷ جولائی : اُردو تعلیمی ٹرسٹ زیر سرپرستی ریاستی انجمن ترقی اُردو کی باقاعدہ رجسٹریشن سرمایہ دس ہزار روپے سے عمل میں آئی ٹرسٹ کے بنیادی مقاصد میں تمام سطحوں پر اُردو درس و تدریس کو ترقی دینا اور ماڈل اسکولوں کو قائم کرنا ہے ٹرسٹ کے صدر نواب میر احمد علی خاں اور دیگر ٹرسٹیوں میں مسز زینت حبیب الرحمٰن، عابد علی خاں، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، ڈاکٹر سید عبد المنان، منوہر راج سکسینہ اور محمد فخر الدین شامل ہیں۔

● جامعہ عثمانیہ کی طرف سے اُردو کے معروف شاعر جناب غیاث متین کو پی ایچ ڈی کی تکمیل کرنے ایک سال کا ٹیچر فیلوشپ یو جی سی کی طرف سے دیا گیا۔ جناب متین جامعہ عثمانیہ میں اُردو کے لکچرار کی حیثیت سے کارگذار ہیں۔ برصغیر کے منفرد شاعر "ناصر کاظمی" پر ڈاکٹر تبسم ریڈر شعبہ اُردو جامعہ عثمانیہ کی نگرانی میں مقالہ کی تیاری میں معروف ہیں۔

۸ جولائی : جناب سید مصطفےٰ

ایڈیٹر "شگوفہ" کی صدارت میں طنز و مزاح سے عبارت ایک خوشگوار ادبی محفل منعقد ہوئی۔ جناب پرویز یداللہ مہدی نے بہ حیثیت مہمان خصوصی شرکت کی۔ مسرز ہمام ٹسے عثمان، محمد انجم ایم اے، نعیم اور سپردیز نے نگارشات سنائے۔ مسٹر مظہر الزماں خاں نے فنی کہانی پیش کی۔

اا جولائی: معروف نقاد اور شاعر ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی مرحوم کی ادبی و شعری خدمات کو حیدرآباد کے ادیبوں، شاعروں اور مصنفوں کی طرف سے زبردست خراج عقیدت ادا کیا گیا۔ ڈاکٹر وحید اختر نے اس جلسۂ تعزیت کی صدارت کی۔ ڈاکٹر حسن عسکری، ڈاکٹر انور معظم، جناب شاذ تمکنت اور جناب عوض سعید نے اعظمی مرحوم کو خراج عقیدت ادا کیا۔ جناب قدیر الزماں نے جلسہ کی کارروائی چلائی۔ ایک قرار داد تعزیت بھی منظور کی گئی۔

● حیدرآباد کے صوفی شاعر مولانا سید شیخن احمد شطاری مرحوم کی یاد میں "اپسیلا" اور "ابوالکلام آزاد میموریل سوسائٹی" کی طرف سے "جلسۂ یاد کاملؔ" بصدارت مولانا قطب الدین حسینی صابری امیر جامعہ نظامیہ منعقد ہوا۔ صدر اپسیلا جناب خواجہ معین الدین، جناب احسن علی مرزا ایڈیٹر سیاست اور مولانا قبول پاشاہ نے حضرت کامل کو خراج عقیدت ادا کیا۔ محفل شعر میں امام الدین فدا، علی سرور، عظیم حیدرآبادی اور ستار چشتی نے کلام سنایا۔

● مرکز ادب کے زیر اہتمام نوجوان شاعر جناب عزیز سجاد کے مجموعہ کلام "لمحہ لمحہ" کی رسم اجرا جناب تجلی حسین (تہذیبی سفیر) نے انجام دی۔ پروفیسر عالم خوندمیری، جناب اختر حسن مددگار معتمد اردو اکیڈیمی اور جناب احمد جلیس نے عزیز کی شعری ذہانت پر مخاطب کیا۔ آخر میں عزیز سجاد نے کلام سنایا۔ مختلف ادبی اداروں کی طرف سے شاعر کی گلپوشی کی گئی اور مبارک باد بھی دی گئی۔

● انجمن ترقی اردو شہر حیدرآباد کے زیر اہتمام صدر انجمن جناب منوہر راج سکسینہ (ایڈوکیٹ) کی صدارت میں ایک اردو تعلیمی سمینار منعقد ہوا۔ پرنسپل فصیح الدین اور کئی مقررین نے خطاب کیا۔

● اقبال اکیڈیمی کی طرف سے بصدارت ظہیر الدین احمد "محفل اقبال" کا انعقاد عمل میں آیا۔ مسرز محمد منظور احمد، کریم رضا اور راحت عزمی نے علامہ اقبال کی دانشورانہ اور فلسفیانہ خدمات پر مخاطب کیا۔

● ایک اشاعتی ادارہ "آزاد ہند پبلی کیشن بمبئی" کے سب آفس حیدرآباد کا وزیر حیوانات جناب رام دیو نے افتتاح کیا۔ ادارہ کے مرکزی صدر فہیم عابدی نے تعارفی تقریر کی۔ حیدرآباد دکن کے انچارج تجمل اظہر نے بھی تقریر کی اور حیدرآباد میں شروع کی جانے والی ادبی خدمات اور اشاعتی کاموں کا تذکرہ کیا۔

● حیدرآباد کے بزرگ شاعر جناب شمس الدین تاباں کا شعری مجموعہ "زنجیر و زنار" کے نام سے ادبستان دکن کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ یہ مجموعہ تلنگانہ اردو ٹرسٹ، اردو اکیڈیمی اور ادبی ٹرسٹ کی اعانت سے منظر عام پر آیا ہے۔ ڈاکٹر زینت ساجدہ، ڈاکٹر عالم خوندمیری اور ڈاکٹر حفیظ قتیل نے اس مجموعے پر اپنی رائیں سپرد قلم کی ہیں۔

۳ا جولائی: ہند و پاک کے فکاہیہ نویس اور صحافی ابراہیم جلیس اور نامور مشہور نقاد ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کی خدمات کو بزم اردو جامعہ عثمانیہ کی طرف سے منعقدہ جلسۂ تعزیت میں خراج عقیدت ادا کیا گیا۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ صدر شعبہ اردو نے جلسہ کی صدارت کی۔ ڈاکٹر غلام عمر خاں، ڈاکٹر سیدہ جعفر، ڈاکٹر مغنی تبسم، ڈاکٹر محمد ہاشم علی اور ڈاکٹر اشرف رفیع کے علاوہ طلباء و طالبات نے مرحومین کے فکر و فن پر روشنی ڈالی۔ ایک قرار داد تعزیت بھی منظور کی گئی۔

۵ا جولائی: حیدرآباد لٹریری فورم کی طرف سے "ترجمے کے مسائل" پر ایک سمینار جناب اختر حسن مددگار معتمد اردو اکیڈیمی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر مسعود حسین اختر، ڈاکٹر مغنی تبسم، ڈاکٹر عالم خوندمیری، احسن مرزا اور یوسف اعظمی صاحبان نے حصہ لیا۔

● نہرو یوتھ لیگ گولکنڈہ کے (۹) ویں سالانہ تقریب کے موقع پر ایک محفل شعر جناب سید شہیدی کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ کنول پرشاد کنول، خیرات ندیم، صلاح الدین نیر، ڈاکٹر احسن رضوی، امیر احمد خسرو، فیض الحمد خیال، علی افسر اور کئی شاعروں نے کلام سنایا۔ اس موقع پر مہمان خصوصی کی حیثیت سے میر احمد علی خاں صدر سابق انجمن ترقی اردو، سید رحمت علی سابق ڈپٹی اسپیکر نے شرکت اور اردو تعلیمی فنڈ کے استحکام پر اپنے خیالات

کا اظہار کیا۔ مسز منظور ظفر صدر یوتھ لیگ نے غیر مطبوعہ تقریر کی اور رپورٹ سنائی۔ موصوف نے یوتھ لیگ کی طرف سے اردو تعلیمی فنڈ میں (۲۵۰) روپیے کے عطیہ کا اعلان کیا۔

۱۶ جولائی :۔ مرکز ادب کا ماہانہ طرحی مشاعرہ جناب آوج یعقوبی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جناب تجمبر وارثی مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے رونق بزم رہے کئی شاعروں نے کلام سنایا۔

۱۸ جولائی :۔ اردو تعلیم اور روزگار کے مسائل سے متعلق "نیشنل اسٹوڈنٹس یونین آف انڈیا شاخ حیدرآباد اور انجمن اتحاد طلباء انوار العلوم کالج کے زیر اہتمام رائے جا نکی پرشاد ہال (انوار العلوم کالج) ایک سمینار بصدارت جناب شاہ عالم خاں منعقد ہوا۔ ریاستی وزیر تعلیم جناب بی، وینکٹ رام ریڈی نے افتتاحی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان کے ساتھ کسی قسم کے تغافل کی پالیسی کو پسندیدہ نہیں کہا جاسکتا۔ اردو کے ماضی پر روشنی ڈالتے ہوئے وزیر تعلیم نے کہا کہ اس زبان کو جامعاتی سطح پر سائنس، انجینئرنگ اور فنی تعلیم کے دیگر شعبوں کے ذریعۂ تعلیم بننے کا منفرد اعزاز حاصل رہا ہے۔ زندگی کے تمام شعبوں میں جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل جن کا ذریعہ تعلیم اردو تھا آج کے سماج میں بھی نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ وزیر موصوف کے اس اعلان پر ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ وزیر تعلیم نے کہا کہ اردو ذریعۂ تعلیم کے مدارس کے لئے نظامت تعلیمات میں ایک اسپیشل آفیسر (اردو میڈیم) کا تقرر عمل میں لایا جائے گا جو اس ذریعۂ تعلیم کے معیار کو اطمینان بخش بنانے کے لئے درکار تمام اقدامات کا مجاز ہوگا نیز محکمہ تعلیمات کی طرف سے بہت جلد اردو ٹیچرس ورکشاپ کے قیام کا بھی موصوف نے اعلان کیا۔ ریاستی وزیر آبکاری جناب پی گنگا ریڈی کے علاوہ مسز جہندر سریواستوا، سید مصطفیٰ کمال، بجلیں پاشا اور مس آمنہ انصار نے بھی سمینار کو مخاطب کیا۔

۱۹ جولائی :۔ جناب سرینواس لاہوٹی معتمد مجلس عمل انجمن ترقی اردو نے ریاستی وزیر تعلیم کو ایک مکتوب کے ذریعہ ریاست کے مشن اسکولوں میں تلگو اور ہندی کے ساتھ ساتھ بطور زبان دوم یا سوم اردو پڑھانے کا انتظام کرنے پر توجہ دلائی۔

۲۲ جولائی :۔ علامہ اقبال کی فارسی شعری تصنیف "ارمغان حجاز" کے اردو ترجمہ کی رسم اجراء ادیبوں اور شاعروں کے ایک نمائندہ اجتماع میں ڈاکٹر زینت ساجدہ ریڈر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ نے انجام دی۔ ڈاکٹر غلام دستگیر رشید سابق صدر شعبہ فارسی جامعہ عثمانیہ نے اس تقریب کی صدارت کی۔ حیدرآباد کے مشہور شاعر جناب مضطر مجاز نے ارمغان حجاز کا اردو نظم میں ترجمہ کیا ہے۔ مترجم سخنور کی علمی ذہانت اور ترجمے کے مشکل مراحل سے کامیاب ہونے پر مقررین نے مبارک باد دی۔ اس جلسہ کو ڈاکٹر عالم خوندمیری، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد شکیب، احسن علی مرزا اور مصلح الدین سعدی نے مخاطب کیا۔ جناب مصلح الدین سعدی صاحب نے بہ حیثیت مہمان خصوصی شرکت کی۔

● جناب شیو راؤ شیشکار رکن ریاستی اسمبلی و صدر انجمن تحفظ اردو نے ریاست کے تمام محبان و سرپرستان اردو سے انجمن ترقی اردو کی طرف سے قائم کردہ اردو تعلیم فنڈ میں فراخدلانہ عطیہ دینے کی پُر زور اپیل کی ہے۔ موصوف نے بیان میں کہا ہے کہ ریاست میں اردو کے بولنے اور چاہنے والوں کی تعداد ایک کروڑ سے کہیں زیادہ اگر وہ اس زبان کے تعلیمی مفادات کے تحفظ کا عہد کریں تو اردو تعلیمی فنڈ کے لئے مقررہ پندرہ لاکھ کا ٹارگٹ آسانی کے ساتھ مکمل کیا جاسکتا ہے۔ موصوف نے اردو میں ماڈل اسکولوں کے قیام کے منصوبے کی تائید کرتے ہوئے انجمن تحفظ اردو کی طرف سے مکمل تعاون کا اظہار کیا۔

۲۳ جولائی :۔ اقلیم ادب کا ماہانہ اجلاس ڈاکٹر مغنی تبسم کی صدارت میں منعقد ہوا۔ صدر بزم جناب رحمن جامی نے غیر مطبوعہ تقریر کی۔ جناب مصلح الدین سعدی نے ابھرتے ہوئے گلوکار اور طیب ڈاکٹر رضی الدین سے ان کی شخصیت اور فکر و فن پر انٹرویو لیا۔ آج کا شاعر کے زیر عنوان حامد مجاز نے کلام سنایا۔ یسین علی عامر نے کہانی سنائی۔ محفل شعر میں مسز مصحف اقبال توصیفی، برق یوسفی، امنیات متین، اسعد محمد نقش، مضطر مجاز، کمال الدین نوید، رحمن جامی

(باقی صفحہ ۱۸ پر)

برقی پیداوار کو بڑھاوا

آندھرا پردیش پرزور صنعتی سرگرمیوں کے دور کی دہلیز پر ہے۔ اس لیئے برقی قوت کی پیداوار نے صف اول کی اہمیت اختیار کرلی ہے۔ ریاست نے اس چیلنج سے نمٹنے کے لئے ماضی قریب میں بڑی ہمت افزا کارگذاری دکھائی ہے۔

۷۹-۱۹۷۸ء کے سالانہ منصوبے میں شعبۂ برقی کے لئے ۱۸۰۰۰ لاکھ روپیوں کی گنجائش فراہم کی ہے۔ لوئر سیلرو کی تیسری یونٹ نے نومبر ۱۹۷۷ء سے کام شروع کردیا ہے۔ کتہ گوڑم مرحلہ (۴) کے تحت ۱۱۰ میگا واٹ والی پہلی یونٹ کو اور "گیریڈ" کو مارچ ۱۹۷۷ء میں بہ یک وقت شروع کیا ہے اور مرحلہ (۴) کے تحت دوسری یونٹ جنوری ۱۹۷۸ء سے کام کررہی ہے۔ ۷۹-۱۹۷۸ء کے دوران وجئے واڑہ تھرمل اسٹیشن کی پہلی یونٹ پر بھی برقی قوت کی پیداوار آغاز کردینے کی تجویز ہے۔

بلاشبہ ہماری ریاست برقی پیداوار کے معاملے میں نئی نئی سرحدوں کی سمت پیش رفت کررہی ہے۔

ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ
حکومت آندھرا پردیش حیدرآباد

No. 5/78-79

سن اجراء : ۱۹۳۸ء   فون : ۳۸۴۶۹

بیادگار
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

ماہنامہ
سب رس
حیدرآباد

نگران : پروفیسر سید علی اکبر
ایم اے (کنٹیب)
معتمد مجلس مشاورت : غلام جیلانی
مرتب : وقار خلیل

جلد ۴۱ ستمبر ۱۹۷۸ء شمارہ ۹

مجلسِ مشاورت :
ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
ڈاکٹر غلام عمر خاں
رمن راج سکسینہ
عابد علی خاں
محمد منظور احمد

زر سالانہ : ۱۵ روپے   ششماہی : ۸ روپے
فی شمارہ : ایک روپیہ پچاس پیسے

مطبوعہ نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد ۱
مقام اشاعت : ادارہ ادبیات اردو پنجہ گٹہ روڈ حیدرآباد ۴

ترتیب

○ خریداروں سے خواہش کی جاتی ہے کہ وہ بقایا زرِ سالانہ جلد منی آرڈر سے روانہ کردیں۔

○ علم دوست اصحاب سے "سب رس" کی توسیعِ اشاعت کی درخواست کی جاتی ہے ——— (ادارہ)

اپنی بات

ڈاکٹر زورؔ کی وفات کو سولہ سال بیت گئے ـــــ ۲۳ر اور ۲۴ر ستمبر ۱۹۶۲ء کو قلب پر حملہ کے سبب وہ کشمیر میں رحلت
ہ وہیں سپرد خاک ہوئے۔ دکن کا نامور محقق ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بچھڑ گیا، ڈاکٹر زورؔ اپنے علمی، ادبی، تحقیقی، تخلیقی اور تہذیبی
کے باعث آج بھی ارباب اُردو کے دلوں کی دھڑکن ہیں۔ ان کے فکر و فن کا شہر آرزو "حیدرآباد" باکمال قلمکاروں کا آج بھی
ہے۔

یدرآباد میں جامعہ عثمانیہ کے ساتھ ساتھ "ادارۂ ادبیاتِ اردو" نے زبان و ادب، تہذیب و ثقافت کی سربلندی کے لئے
یاں انجام دے کر دکن میں ادب کی ایک روشن تاریخ بنائی ہے۔ ادارہ کے کارنامے، فرزندانِ جامعہ عثمانیہ کی علمی و ادبی
ہ "ایوانِ اُردو" کی سرگرمیاں سب کا اُفق ڈاکٹر زورؔ ہی تھے۔
لے ہوئے حالات میں بھی حیدرآباد میں زبان و ادب، تعلیم اور کلچر کے ارتقاء کی مثبت رفتارِ ترقی سے گونہ اطمینان ہوتا
زورؔ نے اُردو زبان و ادب کی ترقی اور ترویج کے لئے جو پودا لگایا تھا، آج وہ برگ و بار لا رہا ہے۔ نئی کونپلیں اپنا
ر رہی ہیں، اُردو کے حق کو تسلیم کرایا جا رہا ہے اور اس کی تعلیمی ترقی کے بارے میں ٹھوس بنیادوں پر اسکیمیں تیار
نئے خاکے بن رہے ہیں۔ ریاستی اُردو اکیڈیمی کے قیام کے بعد ریاست میں اُردو کی ترقی کے نئے امکانات روشن ہوئے
وں اور قلمکاروں کی حوصلہ افزائی ہو رہی ہے۔

اکٹر زورؔ کی یاد کو تازہ رکھنے کے لئے ہر سال ادارۂ ادبیاتِ اُردو کی طرف سے "یوم زورؔ" منایا جاتا ہے۔ اس بار
دارہ کی طرف سے "دکنی ادب اور ثقافت" کے موضوع پر ایک سمینار کا خاکہ بنا ہے
ں اشاعت میں ڈاکٹر زور کی شخصیت اور فکر و فن پر دو مضامین شامل ہیں، مصطفےٰ شروانی اور داؤد اشرف کی
یریں قارئین کو یقیناً متاثر کریں گی۔
لنگ کے ایک کلاسیکی اور نامور سخنور "ویمنا" پر رشید قریشی صاحب کی صاحبِ طرز تحریر اور محمد عبدالغنی کا مقالہ
ے غالب: ابوالکلام آزاد" بھی اس شمارے کی خصوصیات ہیں

'ادارہ'

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

حیدرآباد میں اُردو

(قیامِ آندھرا پردیش سے قبل کا سرسری جائزہ)

حیدرآباد کی بنا ایک ایسے بادشاہ نے ڈالی تھی جو خود بھی اُردو کا ایک بہت بڑا شاعر اور تین زبانوں تلنگی، اُردو اور فا ماہر تھا۔ اس بادشاہ کے والد ابراہیم قلی قطب شاہ کے عہد میں گولکنڈہ تلنگانہ کا مرکز بن چکا تھا اور اس کی سرپرستی اور قدر ا کی شہرت سن کر دُور دُور سے تلنگی اور اُردو کے شاعر حیدرآباد آئے تھے۔ چنانچہ ان ہی میں بہمنی بادشاہوں کے پایہ تخت ب ایک مشہور شاعر فیروز بھی تھا جس نے سب سے پہلے گولکنڈے میں اُردو زبان میں نظمیں اور کتابیں لکھیں۔ اس طرح کے لوگ اُردو کے نغموں سے واقف ہوئے اور ان سے لطف اندوز ہونے لگے۔ حیدرآباد میں سب سے پہلے چارمینار بنا اور اس کی تعمیر کے کام میں گولکنڈہ اور اس کے اطراف کے رہنے والے جو مزدور لگائے گئے تھے وہ سب تلنگی کے ساتھ سا میں بھی بات چیت کرتے تھے۔ اس طرح گویا حیدرآباد کے خمیر میں ہی چونے اور مٹی کے ساتھ اُردو بھی شامل تھی۔ اور اس چونکہ پہلے پہلے مٹی کی بھی بعض عمارتیں جلدی میں بنا کر اوپر چونے کی استرکاری کی گئی تھی تاکہ شہر تھوڑی ہی مدت ہی میں بارونق آباد ہو جائے۔ اس لئے یہ کہاوت مشہور ہو گئی تھی کہ

"حیدرآباد نگینہ اندر مٹی اوپر چونا"

حیدرآباد کو آباد ہوئے ابھی پندرہ بیس سال بھی نہیں گذرنے پائے تھے کہ یہاں کے ایک مشہور شاعر مُلّا وجہی نے لمبی مثنوی لکھی جس میں محمد قلی قطب شاہ اور اس کی محبوبہ بھاگ متی کی داستانِ محبت بیان کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شہر اُ کے گاؤں چچلم کی جگہ آباد کیا گیا۔ اور اس کا نام بھی بھاگ نگر رکھا گیا۔ جس جگہ چارمینار کی عمارت بنائی گئی وہاں خود بھ کا گھر تھا یہ تلنگانہ کی ایک حسین ترین رقاصہ اور باکمال عورت تھی۔ وجہی نے اپنی اس مثنوی میں جس کا نام قطب مشت تلنگانہ کی نسبت لکھا تھا ؎

دکن سا نہیں ٹھار سنسار میں | پنج فاضلاں کا ہے اس ٹھار میں
دکن ہے نگینہ انگوٹھی ہے جگ | انگوٹھی کو حرمت نگینہ ہی لگ
دکن مُلک بھو تیج خاصہ اہے | تلنگانہ اس کا خلاصہ اہے

محمد قلی قطب شاہ جب شہر حیدرآباد بسا رہا تھا تو اس کی بڑی خواہش تھی کہ اس میں لوگ جلد آ کر آباد ہوں اسکا اظہار ایک نظم لکھی تھی جس میں خدا سے دُعا کرتا ہے کہ ؎

مرا شہر لوگاں سے معمور کر　　رکھیا جوں تو دریا میں من یا سمیع

یعنی اے خدا جس طرح تو نے دریا میں مچھلیاں بھر دی ہیں اسی طرح میرے شہر کو لوگوں سے بھر دے ۔
حیدرآباد میں لکھے گئے ان شعروں سے اندازہ ہوا ہوگا کہ اس شہر میں اردو کا ارتقاء اس کی آبادی کے ساتھ ہی شروع
۔ بادشاہ خود اردو کا شاعر تھا ۔ چنانچہ اس کا ایک بہت ضخیم اردو دیوان موجود ہے ۔ جو چھپ بھی گیا ہے ۔ بادشاہ
میں اردو کے بڑے بڑے شاعروں کی قدر کی جاتی تھی ۔ اس کے ملک الشعراء وجہی کا تو ذکر ابھی کیا گیا ہے اس کے علاوہ
۔ اور ملا غواصی بھی اس عہد کے بڑے بڑے شاعر تھے ۔ جن کے نام اور کام سے اردو دنیا واقف ہو چکی ہے ۔
محمد قلی قطب شاہ کا جانشین اس کا داماد سلطان محمد قطب شاہ ہوا ۔ وہ اور اس کی ملکہ حیات بخشی بیگم دونوں علم دوست
کے دلدادہ تھے ۔ سلطان محمد نے اپنے خسر کا جو دیوان مرتب کیا اور اس پر اردو ہی میں ایک دیباچہ لکھا ۔ اس کا بیٹا
عبداللہ قطب شاہ تو بالکل اپنے نانا محمد قلی کے قدم بہ قدم چلتا تھا چنانچہ ایک شاعر نے اس کے بارے میں لکھا تھا کہ ؎

"پھر جنگ میں آیا محمد قلی"

سلطان عبداللہ کے دور میں اردو زبان بہت کچھ صاف اور سلیس ہو گئی تھی ۔ خود اس کے اور اس کے دربار کے شاعروں کے
معلوم ہوتا ہے کہ محمد قلی کے دور میں جو مشکل ہندی اور سنسکرت کے لفظ رائج تھے ان کی جگہ اب آسان لفظ رائج ہو گئے
۔ زبان کی قواعد کی پابندی سختی سے ہونے لگی تھی ۔ غواصی اس کا ملک الشعراء تھا اور اس نے کئی اردو کتابیں اس کے زمانہ
۔ اس کے علاوہ ابن نشاطی بھی ایک بڑا شاعر تھا جس نے اپنی مثنوی "پھول بن" میں اردو زبان کے جملہ صنایع و بدایع استعمال
۔ اس دور کے دوسرے شعراء میں جنیدی، ملک خوشنود، سید بلاقی اور شاہ راجو مشہور ہیں ۔ ان سب کی اردو کتابیں

ہیں ۔

حیدرآباد کے آخری قطب شاہی بادشاہ ابوالحسن تاناشاہ بھی اچھے شاعر تھے وہ نہ صرف بادشاہ تھے بلکہ صوفی
اور شاعر بھی تھے ۔ ان کے عہد میں اردو زبان محمد قلی اور عبداللہ اور ان کے دور کے شاعروں کے مقابلے میں زیادہ فارسی
۔ بن گئی تھی اور سنسکرت کے الفاظ ان کے دور تک کم ہو گئے تھے ۔ ان کی ایک غزل کا آخری شعر ہے ۔

اے جانِ ابوالحسن تو اچھے خوش لگ سکتے　　بندِ قبا کو کھول کے صحن چمن میں آ

ابوالحسن تاناشاہ کے بعد حیدرآباد کی مرکزیت ختم ہو گئی اور چونکہ اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ کے قیام کی وجہ
۔ اورنگ آباد پورا کا سلطنت مغلیہ کا پایہ تخت بن گیا تھا ۔ اس لئے وہاں شمال اور دکن کے سب شاعر اور ادیب حیدرآباد اور بیجاپور
۔ دلی سے ملے اور ان کی نظموں اور کتابوں سے واقف ہوئے ۔ ان کو معلوم ہوا کہ جس زبان کو وہ اب تک بازاری اور
۔ زبان سمجھتے تھے اس میں دکن والوں نے بڑی بڑی کتابیں لکھی ہیں ۔ یہ دیکھ کر انھوں نے بھی اسی زبان میں لکھنا شروع کیا اور
۔ ادبی زبان اس وقت تک فارسی تھی ۔ اس لئے پہلے پہلے ان کے اشعار میں فارسی لفظ اور ترکیبیں نمایاں رہیں ۔ چونکہ اس وقت
۔ شہر حیدرآباد پر شمالی ہند کے امیروں اور حاکموں کا قبضہ تھا اس لئے دکن والوں نے بھی شمالی ہند کی اردو اور اس کے لب و لہجہ
۔ بار کرنا شروع کیا ۔ چنانچہ اورنگ آباد میں سینکڑوں شاعر جمع ہو گئے تھے جو شمالی ہند کی زبان میں لکھتے تھے ۔ بعد کو نظام علی خان
آصف جاہ ثانی کے عہد میں اورنگ آباد سے پایہ تخت منتقل ہو کر پھر حیدرآباد آ گیا اور اس وجہ سے اورنگ آباد کی جمی جمائی محفل اجڑ گئی

اور زیادہ تر لوگ حیدرآباد آگئے۔ حیدرآباد میں اس وقت تک قدیم دکنی اُردو ہی رائج تھی اور شمالی ہند کی اردو کا اثر پوری طرح پڑنے نہیں پایا تھا۔ اورنگ آباد کا شاعروں، ادیبوں اور عالموں کی آمد حیدرآباد کے بعد یہاں کے شاعروں نے بھی اُن کی تقلید شروع اور اس طرح حیدرآباد والے معیاری اُردو سے واقف ہوئے۔ اس عہد میں اعظم الامراء ارسطو جاہ اور ان کے بعد مہاراجہ چندو لال شعر و سخن کے بڑے قدردان تھے۔ ان کے درباروں میں دور دور سے شاعر جمع ہو گئے تھے اور دلی سے شاہ نصیر، شیخ حفیظ، تاج الدین مشتاق جیسے باکمال استاد بھی آگئے تھے اور دکن کے اکثر شعراء نے ان کی شاگردی اختیار کی اور ان کے لب و لہجہ اور محاوروں کے مطابق شعر لکھنے شروع کیے۔

یہ صورتِ حال عرصہ تک جاری رہی اس کے بعد تو حیدرآباد میں اُردو کا ایسا چرچا ہوا کہ نواب شمس الامراء نے متعدد اور سائنسی کتابوں کا اُردو میں ترجمہ کرایا اور اُردو کے لئے فضا ہموار ہوئی۔ رفتہ رفتہ یہاں کی سرکاری اور درباری زبان بھی اُردو بن نواب وقار الامراء اور میر محبوب علی خان آصف جاہ سادس کے دور میں شمالی ہند کے بڑے بڑے ادیب اور شاعر مثلاً نذیر احمد، محسن الملک، داغ، امیر مینائی، شبلی، عبدالحلیم شرر، ظفر علی خاں، عبدالحق، سید علی بلگرامی وغیرہ ملازمت کے لئے حیدرآباد آ اور ایک ایسی فضاء پیدا کر دی کہ ہر طرف سے ایک اُردو یونیورسٹی کے قائم کرنے کی تحریک اٹھی جو عماد الملک، حبیب الرحمن خاں شروانی، سر راس مسعود اور سر اکبر حیدری نواز جنگ کی مسلسل کوششوں کے باعث سنہ ۱۹۲۰ء میں قائم ہو گئی اور اس کے دارالترجمہ کی طرف جملہ علوم و فنون کے ترجمے اُردو میں ہونے لگے۔ ان ترجموں کی زبان سہل رکھنے کی کوشش کی گئی تھی مگر پھر بھی بعض ترجمے بہت ثابت ہوئے اور ان کی وجہ سے حیدرآباد کی اُردو بہت فصیح اور بلیغ اور ایک حد تک مشکل اور مغلق مشہور ہو گئی لیکن ان اصطلاحوں کو چھوڑ کر دیکھا جائے تو جامعہ عثمانیہ نے اُردو کی بہت بڑی خدمت کی اور اُردو کے ارتقاء میں نمایاں حصہ لیا۔ ادب جملہ میدانوں میں اُردو کو بہت عروج حاصل ہوا اور افسانے، ناول، شاعری، تنقید، تحقیق اور تاریخ سے متعلق سینکڑوں کتا حیدرآباد میں لکھی گئیں اور ہزاروں لوگ اس زبان کے دلدادہ پیدا ہو گئے۔ جن میں سے بعض نے پورے ہندوستان میں کمال کی وجہ سے شہرت حاصل کی اور ان کی اور دلی اور لکھنو والوں کی تحریر کی زبان میں کوئی فرق باقی نہ رہا۔

جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد شمالی ہند سے وحید الدین سلیم، جوش ملیح آبادی، فانی بدایونی، عظمت اللہ خان، صفی جائسی، علامہ عبداللہ عمادی، مرزا ہادی رسوا، اور مرزا فرحت اللہ بیگ جیسے اعلیٰ پایہ کے شاعروں اور ادیبوں نے حیدرآباد میں شہرت حاصل کی۔ اور یہاں رہ کر اُردو کی ترقی میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ اس اثناء میں خود اہلِ حیدرآباد میں حکیم الامجد، صفی اورنگ آبادی، علی منظور، مینکش، وجد اور مخدوم محی الدین جیسے عمدہ شاعر نمودار ہوئے جن کے کارنامے دنیائے اُردو کے لئے باعثِ فخر سمجھے جاتے ہیں۔ ▲▼

(بہ شکریہ ریڈیائی تقریر)

پونچھ بھی ڈالو اب چشمِ نم ساتھیو　　کیوں کریں آج بھی کل کا غم ساتھیو
ہمدمو ابھی نہ چھوڑو یہ وقت ہے　　یوں ہی بڑھتا ہے ہر قدم ساتھیو
ہمتیں پست ہونے نہ پائیں کہ اب　　ختم ہوتا ہے دورِ ستم ساتھیو

(ڈاکٹر زور)

مصطفیٰ شروانی

زور صاحب

۱۹۴۷ء کی جنوری کا مہینہ تھا ہم سٹی کالج کے طالب علم یوم ولی کے سلسلہ میں جلسہ گاہ اور نمائش کے انتظام مکمل کرنے میں اساتذہ پرنسپل اعظم صاحب کی ممکنہ مدد کے بعد تھکے ہارے جلسے کے وقت سے کچھ پہلے ہی وسیع پنڈال میں بیٹھ گئے جیسے جیسے امرا، عدالت العالیہ جامعہ عثمانیہ کے پروفیسر صاحبان آتے گئے ہم ایک دوسرے کو بتلاتے گئے کہ کون آ رہے ہیں مہمان خصوصی اور سرپرست جلسہ نواب سالار جنگ بہادر کی آمد سے کچھ پہلے ایک وجیہ دراز قامت تو نمنڈی اچکن پہنے ڈھیلا پائجامہ گہرے رنگ کی ترکی ٹوپی اور وضع یہ کہ ایک ہاتھ میں زری کے کام کا پانوں کا بٹوہ لیے۔ جو خوش گلو خوش شکل خوش خرام بزرگ آئے ان پر ہم طلبا میں سے اکثر کی نظر جم گئی۔ وہ تھے ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ایم اے، پی ایچ ڈی (لندن) پروفیسر ادبیات اردو جامعہ عثمانیہ۔ زور صاحب سے کئی بار اس سے پہلے بھی نیاز حاصل ہو چکا تھا والد صاحب جناب پروفیسر ہارون خاں شروانی سے زور صاحب کے قریبی روابط تھے لیکن اس روز سٹی کالج میں یوم ولی میں زور صاحب جیسے خود برات کے دولہا تھے ولی کو فرش سے عرش پہ پہنچانے میں زور صاحب میر کارواں کا حکم رکھتے تھے۔ جلسہ کی کارروائی اعظم صاحب کے خطبۂ استقبالیہ سے شروع ہوئی۔ حضرت [illegible] نے اپنی معرکہ کی رباعی پڑھی:۔

اُڑ جائے گا جب زاغ تو عنقا ہوگا　؛　پتھر کھو جائے گا تو ہیرا ہوگا
مرکر شیطان بھی ولی ہوتا ہے　؛　پہلے ہی جو ولی ہو وہ کیا ہوگا

جناب مخدوم محی الدین نے اپنی خوب صورت نظم سنائی۔

ولی وہ ہمدم فطرت، وہ پیکرِ نور وجدانی　　وہ جبریل سخن، وہ اولین تلمیذ رحمانی
وہ میراث جہاں، وہ خلد کا پیغام آتا ہے　　دکن کی سرزمیں پر زندگی کا جام آتا ہے

مخدوم کی لوچدار آواز اور "پھر ولی کی شاعری" کے موضوع پر جناب ابوظفر عبدالواحد صاحب کی محققانہ تقریر جسے موصوف نے [illegible] انداز میں پڑھا۔ پھر سکندر علی وجد نے اپنی سریلی آواز میں ولی کو خراج پیش کیا۔

الٹ دی گردشِ ایام نے بزمِ قطب شاہی　؛　بجھا دی قصرِ عادل شاہ کی شمعِ سحر گاہی
تیرے نغموں سے ولی باغِ سخن میں پھر بہار آئی　؛　خزاں منظر چمن میں گل کھلے بانگِ ہزار آئی

جب اگلی تقریر کے لیے ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کا نام لیا گیا اور ان کی تقریر کا موضوع "ولی کا وطن" بتایا گیا تو جیسے ہم طلبا کی توجہ کا مرکز ولی یا ان کے وطن سے زیادہ مقرر کی باغ و بہار شخصیت بن گئی۔ خیال ہوا کہ ایسے اچھے مقرر ایسے قدر خشک موضوع پر کیا بولیں گے اور ہم کیا سنیں گے اور ولی کے وطن پر یوں بھی کتنا کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک دقیق تقریر کا موضوع بن جائے۔ ولی کا وطن

کونسا تھا، اورنگ آباد میں پیدا ہوئے، احمد آباد (گجرات) میں وفات پائی۔ بس اتنی سی بات ہونی چاہیئے۔ بہرحال زور صاحب اپنی بچی تلی آواز میں تقریر شروع کی اور ولی کا یہ شعر پڑھا ۔

ہرگز ولی کے پاس تم باتاں وطن کی مت کہو ؛ جو نینے کے کوچہ میں ہے اس کوں وطن سوں کیا غرض

شعر پڑھنے کا انداز ایسا تھا کہ پرانی اردو کا یہ شعر دو سو سال بعد بول اٹھا پھر صرف "ولی کے وطن" کے موضوع پر تقریباً ۔ کا ایسا عالمانہ مقالہ پڑھا جس میں تین سو سال پہلے کے شمالی ہند کے شعراء میر خان کمترین کے اسی شعر سے لیکر کہ ۔ "ولی پر ... لاوے اسے شیں اب کہتے ہیں" "مخزن الشعراء" میں ولی کو گجراتی قرار دئیے جانے کے تذکرہ (محققان ایں فن را در حال او اختلاف است کہ آیا ولی از گجرات است و یا از دکن) ولی کے فطری رجحانات کا ذکر کرکے حالات کے پیش نظر دہ اورنگ آباد سے گجرات ولی کے بے شمار اشعار کو ہی سند بنا کر زور صاحب نے جس انداز سے یہ ثابت کیا کہ ولی دکنی ہی تھے یہاں تک اپنی اس تلاش و تحقیق میں اسی انڈیا آفس لندن کے کتب خانہ میں سید ابو المعالی کے فرزند سید محمد تقی کے منقولہ دیوانِ ولی کے تاریخی نادر قلمی نسخہ کی تلاش کو بیا میں سید محمد تقی نے پہلے صفحہ پر کلام کی نقل شروع کرنے سے قبل لکھا ہے :-

" تصنیف مغفرت پناہ میاں ولی محمد متوطن دکھن" زور صاحب کی تقریباً ایک گھنٹہ کی تقریر سب مبہوت ہو کر سنتے رہے تلاش و جستجو کے دریا امنڈ رہے تھے ۔

ادبیاتِ اردو کے دلدادہ زور صاحب نے ادارۂ ادبیاتِ اردو قائم کیا سوماجی گوڑہ میں اپنے ہی مکان میں ماہانہ جلسے منعقد کر۔ والد صاحب کے ہمراہ میں بھی کبھی کبھی جلسوں میں شرکت کرتا اور تقاریر میں دلچسپی ہوتی نہ ہوتی زور صاحب کی تقریر جب جہاں جس موضوع ہمیشہ بڑی توجہ سے سنی جاتی۔ ۱۹۲۹ء میں سلسلہ "مطبوعاتِ ادارۂ ادبیاتِ اردو کی (۲۳) ویں کتاب "سرگزشت غالب" خود ز کی تصنیف تھی جس میں زور صاحب کی تحقیق کا یہ اعلیٰ کرشمہ تھا کہ اس کتاب میں غالب سے متعلق نہ صرف مطبوعہ سوانح عمریوں کا تذکرہ ہے" مہر، شیخ محمد اکرام اور مالک رام کی مشہور سوانح عمریوں پر تبصرہ ہے بلکہ بنارس ہندو یونیورسٹی کے اردو اور فارسی کے استاد مولوی ہیش پرشاد ترتیب سوانح غالب کا بھی ذکر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے زور صاحب کی نظر اردو ادبیات کے کھوئے ہوئے خزانوں سے گزر کر جمع ہونے والے جواہر پاروں پر بھی پہنچتی تھی ۔

فروری ۱۹۵۵ء میں زور صاحب نے ادارۂ ادبیاتِ اردو کی جانب سے حضرت امجد کا جشنِ الماسی (گولڈن جوبلی) کی تقریب کی اس تقریب میں سپاسنامہ خود زور صاحب نے لکھا اور پڑھا۔ عام طور پر سپاسنامے خشک اور سادہ ہوا کرتے ہیں لیکن امجد کے کا سپاسنامہ اردو کے ایک نامور محقق حضرت زور کا کارنامہ تھا اس پر خشک ہونے کا سوال ہی نہ تھا :۔

"حضرت خواجہ بندہ نواز ؒ سے لیکر آج تک ساڑھے پانچ سو سال کے طویل عرصے میں اردو کے ان بلند نظر شاعروں کا سلسلہ برابر قائم ہے جو صحیح معنوں میں تلامذہ الرحمٰن ثابت ہوتے اور جنھوں نے اپنی شاعری میں تصوف و عرفان کے مضامین کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کی عوامی زندگی کی نہایت کامیاب ترجمانی کی۔ میراں جی شمس العشاق، برہان الدین جانم، امین الدین علی اعلیٰ، میراں جی خدا نما، قاضی محمود بحری، وجیہ الدین وجدی، محمد باقر آگاہ، سراج، فیض، وطن، شاہ تراب، حمزہ اور توفیق اسی سلسلہ کے دانشور اساتذہ سخن ہیں اور ان کے بعد حضرت امجد کے کلام کی خوبیاں بیان ہوئی۔ حضرت امجد آپ اس چمنستان بے خزاں کے گل سرسبز ہیں۔ آپ کے کلام میں انسانی فطرت کی بوقلمونیاں، جبر و اقتدار کی چیرہ دستیاں

اور حقائق و معارف کی موشگافیاں اس لطافت سے جھلکتی رہتی ہیں کہ پڑھنے والا زندگی سے گریز کرنے کی بجائے ایک ایسی اونچی سطح پر پہنچ کر اس سے نبرد آزما ہونے کے لئے تیار ہو جاتا ہے کہ اس کے بعد زندگی کے نشیب و فراز اس کے لئے نشیب و فراز ہی باقی نہیں رہتے۔"

دو سو سال پہلے کے ولی دکھنی کے سو سال بعد کے غالب اور ان کے سو سال بعد کے حضرت امجد حیدرآبادی۔ سب زور صاحب کے احاطۂ تحقیق میں شامل تھے۔ محمد قلی قطب شاہ کی شاعری کے ہر پہلو پر تحقیق کرتے رہے قطب شاہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر جو صرف پندرہ سال کی عمر میں قطب شاہی سلطنت کا بادشاہ بنا اور صرف ۴۷ سال کی عمر میں فوت ہوا۔ زور صاحب نے محمد قلی قطب شاہ معانی کے اردو دیوان کو ادارۂ ادبیات اردو کے مطبوعاتی سلسلہ میں نہایت آب و تاب سے شائع ہی نہیں بلکہ دکنی شعراء کے کلام کا ایک پورا سیٹ بہت تھوڑی مدت میں ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے اردو داں عوام کے ہاتھوں میں پہنچ گیا۔ زور صاحب کا حیدرآباد میں آخری کارنامہ اور اپنی زندگی میں اردو پر آخری عظیم احسان ادارۂ ادبیات اردو کی جاذب نظر عمارت ہے جس کا بلند مینار قصر بلاد وسطہ کے اگلے موڑ سے اردو کے ایک دلدادہ کا زبان و ادب اردو کا رتبہ بلند سے بلند تر کرنے کے عزم کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ حیدرآباد سے زور صاحب سری نگر گئے تو کچھ اس طرح گئے جیسے ولی اورنگ آباد سے گجرات گئے تھے:۔

افسوس ہے تمام کہ آخر کو دوستاں
اس میکدے سوں اٹھ کے چلا سدہ لبساز دل (ولی دکھنی)

ڈاکٹر زور ان شخصیتوں میں تھے جو ایک بیدار دل اور متلاطم ذہن لے کر پیدا ہوئے تھے اور اس غرض سے پیدا ہوئے تھے کہ اپنے گرد و پیش کو اپنے موجزن خیالات اور شعلہ پرور جذبات سے مضطرب کریں۔ اور سماج میں زندگی اور موسیت کی روح پھونکیں۔ زور ایسے صاحب عمل تھے کہ ان کا ہر لمحہ کیف پرور اور ان کی ہر ساعت محرک عمل ہوتی تھی۔ ان کے دل و دماغ میں ہر آن نت نئے خیالات کی موجیں اٹھتی تھیں اور یہ موجیں وہیں ختم نہیں ہو جاتی تھیں۔ بلکہ وہ اپنی پوری قوت کے ساتھ حیز عمل میں آتی تھیں۔ وہ خود کام کرتے تھے اور دوسروں کو کارآمد بناتے تھے۔ ان کی زندگی کا بڑا کرشمہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے اردگرد ایک نئی دنیا بسائی۔ جس میں علم و عمل کے دریا بہنے لگے۔ اور اس میں تصنیف و تالیف کے چراغ روشن ہوئے۔ وہ دنیا ابھی قائم ہے اور قائم رہے گی۔ زور نے دنیا کو خیرباد کہہ دیا لیکن انھوں نے اپنے علم و عمل کا ایسا نقش بٹھا دیا ہے کہ وہ محو نہیں ہوگا۔ ان کی شخصیت میں ایسی جاذبیت تھی کہ صاحب ذوق خود بخود ان کی طرف کھنچے آتے تھے اور ان کے فیض صحبت سے دامن امید بھرے جاتے تھے۔ یہ حلقۂ علم ہر روز وسیع ہوتا گیا۔ نئی نئی شخصیتیں اس میں جذب ہوتی گئیں اور اس حلقۂ علم سے بڑے بڑے انشاء پرداز اور صاحب تصنیف باہر نکلے جو اب حیدرآباد اور بیرون حیدرآباد کی علمی دنیا میں اپنا مقام رکھتے ہیں۔

(پروفیسر مجید صدیقی سب رس "یادگار زور نمبر" ۱۹۶۳ء)

داؤد اشرف

ڈاکٹر زور کے تحقیقی کارنامے

اُردو کے معمار اور اُردو تحریک کے رہنما کی حیثیت سے ساری اُردو دنیا ڈاکٹر زورؔ سے اچھی طرح واقف ہے۔ ساتھ ہی، یہ بات بھی اہمیت رکھتی ہے کہ جدید حیدرآباد کی تعمیر و تشکیل اور ملک کے اس خطہ میں علوم و فنون کی ترقی، ادبی، علمی اور اشاعتی سرگرمیوں کے فروغ غرض یہ کہ ایک منفرد اور مثالی ملی جلی تہذیب کو پروان چڑھانے میں جن لوگوں نے حصہ لیا ان میں ڈاکٹر زورؔ کی شخصیت بڑی نمایاں ہے۔ یوں تو ڈاکٹر زورؔ کی خدمات علمی، ادبی اور تہذیبی شعبوں میں بکھری نظر آتی ہیں لیکن اس کے اثرات اور نتائج بڑے دُور رس اور ہمہ گیر ثابت ہوئے اور مستقبل میں بھی اُن کی قدر اور واضح اہمیت حاصل ہوگی اور اسی ہی کو بنیاد بنا کر ادب کے قافلے آگے بڑھیں گے۔

ڈاکٹر زورؔ کی شخصیت کی اہم اور بنیادی خصوصیات محنت اور عزم و حوصلہ ہیں ان ہی بنیادی خصوصیات نے محی الدین زورؔ کو ڈاکٹر زورؔ بنایا۔ کامیابیوں سے ہمکنار کیا اور ایسے کارناموں کا حوصلہ دیا جن پر حیرانی ہوتی ہے۔ کوئی فرد جو کہ کوئی کی ترقی اور روشن مستقبل کا دار و مدار سخت محنت پر ہوا کرتا ہے وہی شخص اور وہی قوم خوش حال ہو سکتی ہے اور ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکتی ہے جو خود کو سخت محنت کا عادی بنالے یا سخت محنت پر ایمان رکھے اس کی ایک اچھی مثال ڈاکٹر زورؔ ہے یوں تو یہ بات بہت معمولی اور غیر اہم معلوم ہوتی ہے لیکن یہی وہ حقیقت اور راز ہے جس کے ذریعہ افراد اور اقوام عروج پر پہنچنے کا اعزاز حاصل ہوتا ہے۔ اقبال نے کہا تھا ؎

بے محنتِ پیہم نہیں کھلتا کوئی جوہر روشن شررِ تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد

ڈاکٹر زورؔ کی متعدد تصانیف، ادارۂ ادبیاتِ اردو اور ایوانِ اردو کی عمارت کو دیکھ کر ان کی اہمیت اور ڈاکٹر زورؔ کی محنت کا اندازہ نہ کرنا اور بات ہے ورنہ واقعہ یہ ہے کہ انھیں اپنے کاموں کی انجام دہی میں بڑے ناسازگار اور ناساز حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ بسا اوقات سخت جد و جہد کے باوجود انھیں خاطر خواہ امداد اور تعاون حاصل نہ ہو سکا لیکن اس کے باوجود وہ کبھی ناامید نہیں ہوئے۔ حوصلہ شکن ماحول اور حالات میں بھی انھوں نے اپنی جد و جہد جاری رکھی اور یہ اُن کا حوصلہ اور عزم تھا جس نے انھیں کامیابیوں کی منزل تک پہنچایا۔ اُن کے تمام کام اور کارنامے محنت، عزم اور حوصلہ کا درس دیتے ہیں۔

ڈاکٹر زورؔ کی شخصیت بلاشبہ غیر معمولی صلاحیتوں کی حامل تھی وہ اپنے دوست احباب، ساتھیوں، شاگردوں حتیٰ طور پر ملنے جلنے والوں کو بھی ہمیشہ دعوتِ عمل دیتے اور بے عمل اور کاہل لوگوں سے ناراض رہتے اور انھیں سخت سُست سناتے۔

ڈاکٹر زورؔ کا یہ احسان ہے کہ انھوں نے حیدرآباد میں نئے لکھنے والوں کا ایک بڑا گروہ یعنی کارواں تیار کیا اور اس کے سربراہ اور میرِ کارواں کی حیثیت سے آگے رہے وہ اپنے شاگردوں کو لکھنے کی ہمیشہ ترغیب دیتے اور اُن کی

افزائی کرتے۔ اُن کے جن شاگردوں اور تربیت یافتہ ادیبوں نے اُن کی شخصیت اور کارناموں کو خراجِ تحسین ادا کیا ہے اُن مضامین میں ہر ایک نے ڈاکٹر زورؔ کے مشفقانہ رویہ اور حوصلہ افزائی کا ضرور ذکر کیا ہے یہ ایک حقیقت ہے کہ ڈاکٹر زورؔ کی انتھک اور مخلصانہ کوششوں کی وجہ سے حیدرآباد سے ابھرنے والے ادیبوں میں ذوق، محنت اور خود اعتمادی کا جذبہ پیدا ہوا اور وہ ادیب اور شاعر جو اچھی اور اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک تھے بہت جلد اپنے علمی اور ادبی کاموں کے باعث سارے ملک میں جانے پہچانے جانے لگے۔ انھیں ناموری اور شہرت حاصل کرنے میں دیر نہیں لگی۔

ڈاکٹر زورؔ نے بیسیوں کتابیں تصنیف کیں اور سینکڑوں مضامین لکھے اور کثیر تعداد میں ادیبوں، شاعروں اور علمی اور تحقیقی کام کرنے والوں کی تربیت کی اور اُن سے لکھوایا۔ ڈاکٹر صاحب کا اہم اور پسندیدہ موضوع جس پر خود انھوں نے کام کیا اور کروایا دکنی زبان اور ادب اور دکنی تہذیب تھا۔ دکنی زبان و ادب اور دکنی تہذیب پر کام کرنے کے لئے ڈاکٹر زورؔ نے بڑی اور باضابطہ تحریک چلائی اس کی وجہ دکنی زبان و ادب اور دکنی تہذیب سے ڈاکٹر زورؔ کو محبت تھی سرزمین دکن کے ذرہ ذرہ سے انھیں عشق تھا لیکن اس کے علاوہ یہ تحریک ڈاکٹر زورؔ کی ایک شعوری کوشش بھی معلوم ہوتی ہے۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ تحریک اُن مخصوص حالات کے خلاف ایک ردِعمل کی حیثیت رکھتی تھی جن میں ڈاکٹر زورؔ کی نسل پروان چڑھ رہی تھی یوں تو اُس زمانے میں اُن حالات کے خلاف ہر دکنی کے یہاں ذہنی ردِعمل موجود تھا لیکن ڈاکٹر زورؔ نے اس ردِعمل کو ایک باضابطہ تحریک کی شکل دی۔

۱۶۸۷ء میں اورنگ زیب نے گولکنڈہ فتح کیا اور قطب شاہی سلطنت کو مغلیہ سلطنت میں ضم کر لیا گیا اُسے دکنی زبان و ادب اور دکنی تہذیب کے زوال کا نقطۂ آغاز سمجھنا چاہیئے۔ قطب شاہی سلطنت کے خاتمہ کے بعد اورنگ آباد مغلوں کے صوبہ دکن کا دارالخلافہ رہا اور جب تقریباً سوا سو برس بعد ۱۷۶۳ء کے لگ بھگ یہ دارالخلافہ اورنگ آباد سے حیدرآباد منتقل ہوا آصف جاہی سلطنت کی سائز گھٹ گئی تھی اور جنوب کے تمام مغل امراء یہاں سمٹ کر آگئے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد اہلِ لکھنؤ اور دلی والوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ خاص کر سالار جنگ اول کی ایماء پر شمالی ہند کے پڑھے لکھے اور باصلاحیت افراد کی ایک بڑی تعداد حیدرآباد آئی۔ حیدرآباد کا یہ دور مغل برطانوی دور کے نام سے موسوم کیا جاسکتا ہے۔ مغلوں نے دکن میں فارسی زبان رائج کی جسے آصف جاہی دور میں بھی جاری رکھا گیا۔ دکنی زبان کی سرپرستی ختم ہوچکی تھی اور اس کا ارتقاء رک گیا تھا لیکن یہی زبان شمالی ہند میں ارتقاء پذیر ہوکر اُردو کہلائی۔

۱۹۰۰ء کے لگ بھگ جب اردو کو فارسی کی بجائے دفتری زبان قرار دیا گیا تو دفتری نظم و نسق بڑی حد تک نو واردان دلی و لکھنؤ کے ہاتھوں میں منتقل ہوگیا۔ ان سیاسی حالات اور تبدیلیوں نے مقامی لوگوں میں جنھیں اب تک بھی ملکی یا مقامی کہا جاتا ہے احساسِ کمتری کا جذبہ پیدا کیا اور اُن پہ نا اہلی کا لیبل لگایا گیا لیکن جامعہ عثمانیہ کے قیام نے اس صورتحال کو بدل دیا۔ جامعہ کے قابل اور ہونہار سپوتوں نے احساسِ کمتری کو ختم کرنے اور خود اعتمادی کے جذبہ کو بیدار کرنے میں کامیابی حاصل کی اس تحریک اور مہم کے امام ڈاکٹر زورؔ تھے۔ دکنی زبان اور ادب کی بازیافت کے ذریعہ وہ نہ صرف یہ کہ اردو زبان اور ادب کے آغاز و ارتقاء کے سلسلہ میں گم شدہ کڑیوں کو جوڑنا چاہتے تھے بلکہ یہ بھی دکھانا چاہتے تھے کہ اُردو کے آغاز و ارتقاء میں دکنیوں کا کتنا بڑا اور اہم رول ہے ساتھ ہی ساتھ اہلِ دکن پہ لگائے گئے نا اہل کے لیبل کو نکالنے اور انھیں اہل اور باکمال ثابت کرنے کے لئے خود انھوں نے کتنی ہی کتابیں تصنیف کر ڈالیں اور نئی پود کو تربیت دے کر اس سے بھی کثیر تعداد میں

کتابیں تصنیف کروائیں اور بہ کثرت مضامین لکھوائے۔

ڈاکٹر زور انشا پرداز، تنقید نگار، شاعر، افسانہ نگار اور ماہر لسانیات ہونے کے علاوہ مورخ اور محقق بھی تھے۔ ایک مختصر مضمون میں اُن کے تمام ادبی کارناموں کا جائزہ لینا اور علیحدہ علیحدہ میدانوں میں اُن کے مقام کا تعین کرنا ممکن نہیں ہے اسی لئے اس مضمون کو اُن کے تحقیقی کارناموں کے جائزہ تک محدود رکھا گیا ہے۔ "کلیات محمد قلی قطب شاہ" "میر محمد مومن" "اردو شہ پارے" "داستان ادب حیدرآباد" "دکنی ادب کی تاریخ" اور "تذکرہ مخطوطات ادارۂ ادبیات اردو" ڈاکٹر زور کے اہم تحقیقی کارنامے ہیں ان میں سے چند تصانیف کی اہمیت واضح کرتے ہوئے ڈاکٹر زور کی تحقیق کے بارے میں باتیں عرض کروں گا۔

"کلیات محمد قلی قطب شاہ" تحقیق کے میدان میں ڈاکٹر زور کا سب سے بڑا کارنامہ ہے اس ضخیم دیوان کی ترتیب برسوں محنت اور عرق ریزی کے بعد ممکن ہو سکی۔ کلیات محمد قلی قطب شاہ میں ڈاکٹر زور نے جو مفصل اور مبسوط مقدمہ سپرد قلم کیا ہے وہ قلی قطب شاہ کی سوانح اور اس کی شاعری کی خصوصیات کا احاطہ کرتا ہے۔ محمد قلی کی سوانح اور شاعری کو زیادہ سے زیادہ واضح کرنے کی غرض سے دکنی تہذیب کے پس منظر کو بھی انھوں نے ابھارنے کی پوری پوری کوشش کی ہے۔ یہ مقدمہ ڈاکٹر زور کے بلند سوانح نگار اور مورخ ہونے کا بین ثبوت ہے۔

اس تحقیقی کارنامہ کے منظر عام پر آنے کی وجہ سے اردو زبان اور ادب کے بارے میں جو بعض مسلمہ مفروضات اور عام تھے یکسر رد ہو گئے۔ اور محمد قلی کی شاعری نے اردو شاعری پر عائد کئے جانے والے اکثر اعتراضات اور الزامات کا جواب بھی دے دیا۔ محمد قلی کی شاعری کو اردو دنیا سے روشناس کرا کے ڈاکٹر زور نے تاریخ اردو ادب کو ماضی میں نئی وسعتوں سے آشنا کیا اور نئی عظمت اور ہمہ گیری بخشی۔

ڈاکٹر زور نے اپنے مقدمہ میں گولکنڈہ کے تہذیب و تمدن کی جو تصویر پیش کی ہے وہ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب، رواداری، قومی یکجہتی اور باہمی یگانگت کی ایک روشن مثال ہے۔ گولکنڈہ کی یہ تہذیب ملک کے دیگر حصوں کی تہذیب کے مقابلے زیادہ "ہندوستانی" زیادہ حقیقی اور تصنع اور تکلف سے مبرا تھی۔ ڈاکٹر زور اگر کلیات محمد قلی قطب شاہ کو مرتب کرنے کوئی اور کام نہ بھی کرتے تب بھی اس تحقیقی کارنامہ کی بنا پر اُن کا نام اردو دنیا میں ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہتا۔

"میر محمد مومن" تحقیق ہی کے باب میں ڈاکٹر زور کی ایک اہم تالیف ہے جو قطب شاہی دور کی ایک نہایت اہم سیاسی سماجی شخصیت کی حیات اور کارناموں پر مشتمل ہے اس کتاب میں ڈاکٹر زور نے تمام اہم اور ضروری ماخذوں سے استفادہ کیا ہے جن میں نایاب و کم یاب مخطوطات، مطبوعات، دستاویزی شہادتیں اور آثار قدیم کے ماخذ شامل ہیں۔ میر محمد مومن کے پسماندگان کے یہاں محفوظ کاغذات اور مواد کا بھی ڈاکٹر زور نے مطالعہ کیا۔ شہر کے اطراف و اکناف جہاں جہاں بھی مواد فراہم ہو سکتا تھا کر بڑی تگ و دو، دوڑ دھوپ اور چھان بین کے ذریعہ مواد حاصل کیا۔ میر محمد مومن کی تعمیر کروائی ہوئی عمارتیں، مسجدیں، تالاب اور دیہات دیکھے۔ اس کے علاوہ روایات اور قصوں کے بیان سے کتاب میں وہ فضا پیدا کرنے کی کوشش کی جو تہذیبی ترتیب دینے کے لئے ضروری ہوا کرتی ہے معاصر اور قدیم ماخذوں سے ضروری معلومات اور مواد فراہم نہ ہونے کی صورت میں ڈاکٹر زور نے بعد کے ماخذوں LATER SOURCES سے استفادہ کیا۔

اس کتاب میں میر محمد مومن کے پسماندگان کے بارے میں تفصیلی معلومات دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ میر محمد مومن کے آبا و اجداد، ان کے خاندانی حالات اور ان کے وطن ایران میں ان کے ابتدائی حالاتِ زندگی پر نسبتاً تفصیل سے لکھا جانا چاہیے تھا۔ ممکن یوں لگتا ہے کہ ڈاکٹر زورؔ گولکنڈے کی سیاسی اور سماجی زندگی میں میر محمد مومن کے رول اور CONTRIBUTION کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کرنا چاہتے تھے۔

سوانح نگاری کے فن اور جدید اصولوں کی روشنی میں اگر ہم اس کتاب کو جانچنا چاہیں تو قدرے مایوسی ہوگی کیونکہ میر محمد مومن کی زندگی اور شخصیت کے بعض گوشے تاریکی میں ہی رہے اس کے علاوہ ان کے کارناموں کے بارے میں بھی تفصیلی معلومات فراہم نہیں ہو سکیں لیکن یہ کتاب کی کوئی خامی اور نقص نہیں ہے۔ فصلِ زمانی کے باعث وہ تمام مواد فراہم نہیں تھا جو سوانح اور کارناموں پر مفصل کتاب لکھنے کے لئے ضروری تھا یہ کتاب بلاشبہ گولکنڈہ اور اس کی تہذیب کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے اور یہی مولف کا مقصد تھا۔

تذکرۂ اردو مخطوطات ادارۂ ادبیاتِ اردو جو پانچ جلدوں پر مشتمل ہے ڈاکٹر زورؔ کا ایک تحقیقی کارنامہ ہے اتنی بڑی تعداد میں اردو مخطوطات کا تذکرہ یا توضیحی فہرست کسی ادارے اور لائبریری میں مطبوعہ یا غیر مطبوعہ شکل میں موجود نہیں ہے۔ ادارۂ ادبیاتِ اردو اور ادارہ میں لائبریری کے قیام کے بعد ڈاکٹر زورؔ نے نادر اور اہم مخطوطات اکٹھا کرنے کا اہتمام شروع کیا اور جب ادارہ لائبریری میں قلمی نسخوں کی تعداد ۵۰۰ سے تجاوز کر گئی تو ڈاکٹر زورؔ کو ان نسخوں کا تذکرہ مرتب کرانے کا خیال پیدا ہوا۔ ڈاکٹر زورؔ اپنی سرکاری و دیگر علمی و ادبی مصروفیتوں کے باعث یہ کام اپنے احباب جناب غلام رسول اور پروفیسر سروری سے کروانا چاہتے تھے جنھیں وہ اس کام کے لئے موزوں تصور کرتے تھے لیکن جب یہ حضرات بعض ناگزیر وجوہ کی بناء پر اس پروجکٹ کے لئے وقت نہ دے سکے تو ڈاکٹر زورؔ نے خود اس کام کا بیڑہ اٹھایا اور سچ تو یہ ہے کہ اس کام کے لئے ڈاکٹر زورؔ ہی نہایت موزوں شخص تھے طالب علمی کے دور سے وہ اپنا بیشتر وقت لائبریریوں میں قدیم مخطوطات کے مطالعہ میں گزارا کرتے تھے اسی وجہ سے انھیں قدیم دکنی مخطوطات کو پڑھنے میں بڑی مہارت حاصل ہو گئی تھی جامعہ عثمانیہ سے فارغ التحصیل ہو کر جب ڈاکٹر زورؔ پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے یورپ گئے اور یورپ کے دورانِ قیام میں انھیں جتنے بھی قدیم مخطوطات دستیاب ہو سکتے تھے ان سب کا غائر مطالعہ کیا۔ قدیم مخطوطات کو پڑھنے کی مہارت، مخطوطات کا وسیع مطالعہ اور وسیع معلومات ہی کی وجہ سے ڈاکٹر زورؔ اتنا مشکل اور دقت طلب کام بہتر طور پر انجام دینے کے قابل ہو سکے۔

اگر کوئی مخطوطہ زشت خط میں ہو یا ناقص الاول یا ناقص الآخر ہو یا پھر اس کا سنِ کتابت یا سنِ تصنیف دستیاب نہ ہو تو تذکرہ نویس کو گم شدہ کڑیوں کو ملانے کے لئے انتہائی صبر آزما اور انتہائی دشوار گزار مراحل سے گزرنا پڑتا ہے پہلے تو یہ کوشش کی جاتی ہے کہ اندرونی شہادتوں سے کام نکالا جائے اگر اندرونی شہادتیں ناپید یا ناکافی ہوں تو دیگر ماخذوں اور معلومات کی مدد سے اس مخطوطہ کے بارے میں چھان بین ضروری ہو جاتی ہے اس کے لئے دیگر اداروں اور لائبریریوں کے تذکروں کی مدد سے یا خود مرتب کی اپنی معلومات کی روشنی میں ہی آگے بڑھنا پڑتا ہے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ تذکرۂ مخطوطات کی ترتیب کس قدر دشوار ہے اور اس کے لئے کتنی ریاضت اور جانفشانی درکار ہے۔ اس اعتبار سے تذکرۂ مخطوطات ادارۂ ادبیاتِ اردو بجائے خود ایک ایسا تحقیقی کارنامہ ہے جس کی بناء پر ڈاکٹر زورؔ کا نام تحقیق کے میدان میں

ہمیشہ اہمیت کا حامل رہے گا۔

ڈاکٹر زورؔ نے دکن کی ادبی تاریخ یا تہذیبی تاریخ کے بارے میں جو کچھ بھی قلم بند کیا ہے وہ اصول تحقیق کے اعتبار سے ایک مخصوص انفرادیت کا حامل ہے۔ بعض نزاعی مسائل کے قطع نظر اُن کی تحقیق کی بنیاد عام طور پر مضبوط کہی جاسکتی ہے اُن کی کے ماخذ معتبر اور استدلال قوی ہیں۔ یہ بات ذہن نشین ہونی چاہیئے کہ ادبی اور تہذیبی تاریخ نویسی میں تحریری شہادتوں کو جتنی اہمیت حاصل نہیں ہے۔ مسز لشن اور موہنی راجن کی کتاب THE DAYS OF THE BELOVED حال ہی میں کیلیفورنیا سے چھپ گئی ہے جو نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس کے دور کی تاریخ ہے اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ماخذ تحریری سے زیادہ تقریری ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کتاب میں لوگوں کی زبانی و تقریری شہادتوں، اُن کی بیان کی ہوئی باتوں حتیٰ کہ قصے کہانی اور افواہوں کو تک اہمیت دی گئی ہے۔ اسی خصوصیت کی بنا پر اس کتاب کے کافی چرچے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ مسز لشن اور موہنی راجن نے جو روایات قلمبند کی ہیں اُن میں کچھ زیادہ تاثر نہیں ہوتی تاہم یہ روایات بھی کوئی معاصر روایات نہیں۔ قطب شاہی دور کی روایات محفوظ کرنے کا کام بڑی محنت سے ڈاکٹر زورؔ نے انجام دیا۔ انھوں نے معتبر اور مستند ماخذوں سے اخذ کردہ مواد کو اکٹھا کی ہوئی روایات سے جوڑنے اور ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی اور اس طرح انھوں نے تحقیق اور روایت کی آمیزش سے ایک ایسا تحقیقی ادب پیش کیا جس سے ایک محقق سے لیکر تمام آدمی تک اپنی استطاعت کے مطابق بہرہ اندوز ہوسکتا ہے۔

ڈاکٹر زورؔ نے اپنی تحقیق میں داستان کو داستان اور افسانہ کو افسانہ کہا ہے اور داستان اور افسانہ کو کبھی تحریری شہادت کا نام نہیں دیا۔ داستان ادب حیدرآباد کے دیباچہ میں وہ لکھتے ہیں

"...... اس کتاب کے مطالعہ کے وقت یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہیئے کہ یہ کوئی مبسوط تاریخ یا تذکرہ نہیں ہے، ایک ایسا جائزہ ہے جو زیادہ تر مؤلف کے تاثرات پر مشتمل ہے اور جس میں پہلی بار اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں کے نہ صرف نثر بلکہ ہر موضوع کے نثر نگاروں کی نسبت بھی ضروری معلومات یکجا کر دی گئی ہیں یہ جن دس ابواب پر مشتمل ہے ان میں سے ہر ایک اتنی اور اہمیت رکھتا ہے کہ اس پر علحدہ اور مبسوط کتاب لکھی جاسکتی ہے اگر مستقبل کے ادیب اس کی تکمیل کی طرف متوجہ ہوں تو سمجھنا چاہیئے یہ داستان اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئی"۔

دکنی تہذیب کی بازیافت کے لئے ڈاکٹر زورؔ نے جو کوششیں کی ہیں اُن پر اگر اعتراض کیا جائے کہ وہ مستند اور معتبر تحقیق پر مبنی ہیں تو اس اعتراض کو زیادہ وزنی نہیں سمجھا جا سکتا کیونکہ ڈاکٹر زورؔ نے جن روایتوں اور حکایتوں کو محفوظ کیا وہ تاریخی طور پر کتنی غیر تحقیقی کیوں نہ سمجھی جائیں کیا یہ خود ایک تاریخی حقیقت نہیں کہ یہ داستانیں ایک خاص دکنی تہذیب کے خمیر ہی سے ابھری ہیں اور صدیاں اُن میں گشت کرتی رہی ہیں۔ ان دیرینہ داستانوں نے دکنی تہذیب کے ماحول سے کتنے عناصر اور انہیں رنگ و روغن حاصل کیا کہ دکنی تہذیب کے ماخذ میں انھیں بڑی اہمیت حاصل ہوگئی۔ روایت کے مزاج اور امتزاج کو سمجھے بغیر سیاسی تاریخ نویسی کے انداز میں ہر بات کا دستاویزی ثبوت طلب کر کے تہذیبی تاریخ مرتب نہیں کی جاسکتی۔ فن تحقیق کے اس رمز کو ڈاکٹر زورؔ نے سمجھا تھا اور ڈاکٹر زورؔ پر بعض تنقیدیں اُن کے اسی انداز اور معیارِ تحقیق کی وجہ سے ہوئی ہیں لیکن ادبی اور تہذیبی بصیرت کی بالیدگی کے ساتھ ساتھ محسوس کیا جائے کہ جن امور کو موجب تنقید سمجھا گیا دراصل وہ لائق تحسین تھے۔

ڈاکٹر زورؔ نے دکنی ادب کے ساتھ اُس کا ماحول بھی پیش کیا۔ قطب شاہی دور کی تہذیب اپنے محور اور جگہ سے ہٹ،

٭ رسوم و رواج، زبان اور عقیدوں اور طور طریقوں کی بھی کم اہمیت نہیں۔

ی جگہ مغل، برطانوی تہذیب کا اثر نمایاں تھا ڈاکٹر زور نے داستان سرائی، روایت، حکایت وغیرہ سے وہ ماحول اُبھارا جس کی وجہ
دکنی ادب کو سمجھنا آسان ہو گیا اور اس کی حقیقی قدر و منزلت کا تعین بھی ممکن ہو سکا۔

ڈاکٹر زور کے تحقیقی کاموں میں بعض غلطیوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی کی جاتی ہے اور اعتراض کیا جاتا ہے کہ اُن کا یہ کام اعلیٰ معیار
نہیں ہے یا ادھورا ہے۔ یہ اعتراض درحقیقت درست اور بجا نہیں ہے۔ تحقیق میں کوئی کام اور کوشش حرف آخر نہیں ہوتی۔
پہلا کام شروع کرنے والوں کا کام لاکھ کوششوں کے باوجود ادھورا رہ جاتا ہے کیونکہ تمام ماخذ اُن کی نظروں کے سامنے نہیں ہوتے۔
ے ہی گوشے اُن کی نظروں سے پوشیدہ رہتے ہیں جو ماخذ چھوٹ جاتے ہیں اُن سے استفادہ کرتے ہوئے مستقبل کے محققین تحقیق کو
ے بڑھاتے ہیں۔ کلیات محمد قلی قطب شاہ کو ڈاکٹر زور نے آج سے ۳۰ سال قبل ترتیب دیا تھا اگر کوئی محقق آج دوبارہ اُس پر نظر
لتے ہوئے ڈاکٹر زور کے کام میں کچھ عیب پاتا ہے تو اُس میں کوئی حیرت اور تعجب کی بات نہیں ہے دکنی ادب پر تحقیقی کام کافی آگے
بڑھ چکا ہے اب ڈاکٹر زور کے کام کو آگے بڑھانا ممکن ہے۔ نئے ماخذوں اور نئی تحریری شہادتوں کی روشنی میں محمد قلی کے سوانحی حالات
یں کچھ رد و بدل بھی ممکن ہے۔ ڈاکٹر زور جن گرہوں کو کھول نہیں سکے تھے اور جن غیر مانوس الفاظ کے معنی و مفہوم کا صحیح اندازہ نہیں کر سکے
اُن میں سے اکثر و بیشتر گرہیں کھل چکی ہیں اور غیر مانوس الفاظ کے معنی و مفہوم بھی واضح ہوتے جا رہے ہیں۔

ڈاکٹر زور بسیار نویس تھے وہ کسی ایک تصنیفی و تالیفی کام پر زیادہ وقت دینے کے قائل نہیں تھے وہ طویل مدت تک
۔ تصنیف کی چھان بین اور اُس پر نظر ثانی کرنے کی بجائے کسی دوسرے علمی و ادبی کام کے آغاز کو بہتر اور مناسب سمجھتے تھے یہ ڈاکٹر
زور کا علمی رویّہ تھا۔ اُن کے خیال میں کوئی بھی علمی اور ادبی کام حرفِ آخر کی حیثیت نہیں رکھتا۔ تحقیق طلب امور پر مواد کی فراہمی اور
کوتاہیوں کی نشاندہی اور اُن کی اصلاح مستقبل کے ادیب و محقق کا کام ہے۔ اس علمی رویّہ اور اُن کی بسیار نویسی نے اُن کے تحقیقی کام
معیار کو کچھ نقصان ضرور پہنچایا ہے تاہم اردو ادب میں تحقیقی کام کا ایک بہت اہم اور قابلِ قدر ذخیرہ اکٹھا ہو گیا۔

بعض ناقدین نے مذکورہ بالا اعتراضات کی روشنی میں ڈاکٹر زور کے تحقیقی کارناموں کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کی ہے
ڈاکٹر زور کے تحقیقی کارناموں کی اہمیت مسلّمہ ہے اور اُن کی قدر و قیمت کم نہیں کی جا سکتی۔ اصل میں یہ اعتراضات کم بصیری پر مبنی ہیں
اس بات کو سمجھنے کے لئے سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے تاریخ اردو ادب اور اردو ادب کے ماحول سے
ڈاکٹر زور کی شخصیت اور اُن کے کارناموں کو یکسر بھلا دیا جائے اور اس کے بعد دیکھا جائے کہ کیا ڈاکٹر زور کے بغیر بھی اردو زبان اور ادب
جس مقام پر ہیں کیا وہیں ہو سکتے تھے۔

اس اعتبار سے اگر ڈاکٹر زور کو اردو زبان و ادب کی دنیا میں تاریخ ساز اور عہد ساز شخصیت کہا جائے تو کوئی مبالغہ نہیں
انھوں نے اس زبان اور ادب کے ایک عہد کی بازیافت کی جس کی وجہ سے زبان و ادب کی تاریخ کو از سرِ نو لکھنا ضروری ہو گیا۔
انھوں نے یہ عظیم کارنامہ ایک انشاء پرداز، ایک مصنف، محقق، نقاد، دکنی ادبیات کے ماہر اور ماہر لسانیات کے روپ میں کے ذریعہ ہی نہیں
اپنی ذات کو ایک ادارہ میں تبدیل کر کے سر انجام دیا وہ مجسم تحریک، مجسم ادارہ اور عزم و ارادہ اور عمل کا بے پناہ قوتوں کا سرچشمہ
دکن کی سنگلاخ سرزمین سے اُبھرنے والے اس کوہ کن نے اپنی تحقیق کے تیشہ سے جوئے شیر نہیں بلکہ ادب و تہذیب کی دنیا کا
و تہذیب کے ایک عہد کو دنیا سے روشناس کروایا ۵۵

— عبدالغنی فاروقی

دوسرے غالب: — ابوالکلام آزاد

تاریخ ادب و فن کی ایک لاتغیر و اعلیٰ روش یہ ہے کہ اس کی تہذیب کا قافلہ پچھلے تمدن کی بصیرت سے آگے بڑھ ہے۔ بہ قول ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نیا ادبی یا فنی کارنامہ ماضی کے گراں قدر سرمایہ سے کسی نہ کسی طرح وابستہ ہوئے بغیر میں نہیں آسکتا، بلکہ خود اس کا وجود پذیر ہونا پرانے کارناموں کے نظام میں ایک ناقابلِ محسوس لیکن یقینی تبدیلی بنتا ہے۔ ایسے ادبی شہ پارے میں بہارِ نو کی نیرنگیاں اور نامیاتی حسن کا نکھار مضمر ہوتا ہے جس سے حیاتِ انسانی ارادے جگمگا اٹھتے ہیں اور اس کے اداروں میں شائستگی و توسیع رونما ہوتی رہتی ہے۔ اس طرح دانشوار صحیفۂ حیات اور ان کا تصوراتِ فن کے مطالعہ سے شخصی میلانات میں اور اس کے باطنی ہیجانات میں اعتبار تغیر ہونے لگتا ہے جس کے نتیجہ میں جادہ اور کوچے کی اکثر جہتیں روشن ہو جاتی ہیں۔ ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ اپنی گئی ہے۔ اور نیم تاریک دھندلکوں سے اچانک اجالے میں آگئی ہے۔ مگر فنکار کی شخصیت سے متاثر ہونے بطور ایک تجربہ عمر کی ایک خاص منزل تک محدود ہو تو مناسب ہے اور معاً اس کی بنیادی غایت یہ ہو کہ تخلیق کے وسیلوں کو ترقی یافتہ بنایا جائے اور فنکار کے عصری رجحانات اور فنی شغلوں کی مدد سے خود آگہی اور شناسی پیدا کی جائے۔ اگر استفادہ کا یہ سماجی عمل کسی ایک مخصوص ذات یا کسی ایک نظریۂ فن و حیات تک ہو کر رہ گیا ہو تو رسم و روایت پرستی کے مہیب سفر کا آغاز ہونے لگتا ہے اور اس کا جمود میکانیت کا شکار و تخلیق کی جاں فزا مسرتوں سے بیگانہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ جس کا نفسیاتی انجام یہ ہوتا ہے کہ اس کے خیالات میں اور و شعری کارناموں میں عفونت سی پیدا ہو کر سرایت کر جاتی ہے اور اس کے عزائم و مقاصد باطنی الجھنوں کے نذر ہو جا

ہم نے یہ تمہید اس لیے اٹھائی ہے اور یہ ثبوت ہم پہنچانا چاہتے ہیں کہ ہندوستان میں عربی علم و ثقافت کے ر نے تطہیر پسندی (Purification) کا جو رویہ اختیار کیا ہے اور تمدنی مسائل کے بارے میں ان ہے اس کا تاریخ و تہذیب کی فطری رفتار کی روشنی میں تجزیہ کیا جائے تو وہ انتہائی از کار رفتہ اور غیر بصیرت ا حق تو یہ ہے کہ یہ لوگ اکتسابِ فیض کے اجتماعی ذکاوت سے جو باہمی امداد و اختلاط کے نتیجہ میں حاصل ہو بڑے اور عظیم کام لینا جانتے ہیں اور نہ ہی اپنے ذہن و شعور کی مدد سے آگے بڑھتے ہیں۔ اسی لیے ان کے ہا

ں اور زندگی کے نا قابلِ گریز اقتصادی مسائل میں جھانکنے اور ان کو سلجھانے کی پہلی اور ابتدائی کوشش بھی نظر
۔ اس کے برخلاف یہ حضرات ایک خاص الخاص دبستان فکر کے علمبردار بن جاتے ہیں۔ جو ایک مخصوص عہد کے مکانی،
در سماجی تقاضوں کے تناظر میں ظہور پذیر ہوا تھا اور جو آمرانہ حکومت کی کھوکھلی مگر بہ ظاہر پرشکوہ اخلاقی قدروں کو تمدنی
لیے ایجاد کیا گیا تھا۔ اس فرقہ کی فکری رفتار اس جوہری توانائی کے دور میں بھی خطرناک حد تک سست پڑ گئی ہے۔

ہن چارہ جوئی اور وسیلہ سازی سے قاصر۔ ان کا احساس و شعور صدیوں کی روایت پرستی کے بوجھ سے معطل اور ایجاد
کے فرحت بخش لمحوں سے نا آشنا ہو گیا ہے۔ کائنات اپنی لامحدود وسعتوں کے باوصف ان کی نظر میں ایک سرائے
تِ انسانی اپنی ساری پیچیدگیوں کے ساتھ حبابِ آب سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ قرۃ العین حیدر صاحبہ نے
ی کی اجتماعی تعاملات جامد نفسیات اور ذہنی افلاس کے بارے میں ایک نہایت بلیغ جملہ لکھا ہے۔ اس جماعت
کو دورِ جدید کے نظام تعلیم و اقتصاد کے محض پیچ و خم سمجھنے کے لیے نصف صدی لگ جائے گی لہ آج کل
سلسلہ ہے)

مگر ہر کلیہ و مسئلہ کے لیے استثناء بھی ہوتا ہے۔ سر سید، مولانا حالی، مولانا ابوالکلام آزاد اور چند ایسے ہی گنے
م فن ہیں جنھوں نے عربی علوم و فنون اور ان کی تہذیبی تاریخ کا مطالعہ سائنٹفک انداز میں کیا اور اپنے ناقدِ
سمات زندگی کے مہین گرہوں کو کھولنے کے لیے مثبت اقدامات کئے ہیں۔ چونکہ یہ حضرات مذہب و اخلاق اور
ر کے ان انقلابی طاقتوں اور حرکی قوتوں میں ایمان رکھتے تھے جو گروہ انسانیت اور اس کے سماج کو ترقی یافتہ
کے لیے راہیں کھول دیتے ہیں اور بشری امکانات کی نشاندہی میں دست تعاون بڑھاتی ہیں۔ لہٰذا اپنی شخصیت
اور اپنے تخلیقی سرچشموں کو شاداب کرنے کے لیے وہ لوگ اس نظریہ علم کے حامی تھے "حکمت مومن کا گم شدہ
۔ جہاں اور جس کسی کے پاس بھی مل جائے اس کو حاصل کرنے کی بھرپور کوشش کیجئے" (الحکمۃ ضالۃ
، فاینما تجدوھا فاخذوھا) چنانچہ ماہرین فن کے علمی تجربوں اور عقلی ریاضتوں کو نہ صرف قدر کی
۔ دیکھتے تھے بلکہ ان سے مستفید ہو کر اپنے وجود کے معنوی گوشوں کو منور کر لیتے تھے بالخصوص جبکہ دونوں کی
ناد و نفسی ساخت یکساں واقع ہوئی ہو۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ متذکرہ بالا ہستیوں نے اپنے ذہنی و فنی ارتقاء کے سفر میں بہ واسطہ یا بے واسطہ
کے نتائج فکر اور ادبی ملاحظات سے یعنی ان کی بلند و بالا شخصیت سے متاثر ہوتے ہیں۔ غالباً میرا یہ کہنا نادرست
، ہندوستان میں جو بڑی تیزی سے پرانی روایتیں مٹ رہی تھیں اور اس تناسب سے نئی تہذیبی قدریں ابھر رہی
رہی تھیں ان کو سامنے رکھتے ہوئے ان لوگوں نے غالب کی ہمہ گیر فنی بصیرت و ادراک کی روشنی میں شعر و نثر کے
ترات و اسالیب کے خاص الخاص سانچے کو اپنے لیے متعین کر لیا تھا۔ مثلاً مولانا حالی ہی کو لیجئے۔ حالی کی اشتیاق
، تحصیل و تلاش کی تیز و تند آگ ان کے سینہ میں سلگ رہی تھی۔ کسی مضمون شعر کی وضاحت یا شعر میں لفظ کے
استعمال کی تشریح کے لیے حالی کبھی کبھی دوسروں کے ساتھ نواب دبیر الملک، فخر الدولہ کے دربار سخن و شعر میں

شریک ہوا کرتے تھے۔ غالب نے ان کے شعری ذوق کی شگفتگی و شائستگی کو دیکھ کر اظہار خیال کیا تھا کہ میں ہر کسی کو مشورہ نہیں دیتا لیکن تمہارے متعلق میری یہ رائے ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنے آپ پر ظلم کروگے۔" حالی نے لکھ کر فکری تسلسل کی نظم نگاری کے لیے جدید نسل کو فقید المثال نمونہ چھوڑا ہے اور دوسری اصناف سخن میں جو شعری کئے ہیں، بلا شک ان سے یہ ثبوت مہیا ہو جاتا ہے کہ غالب ایک عظیم شاعر ہونے کے ناتے علم النفس میں بھی جینئیس تھے اور حالی کے بارے میں ان کا اندازہ غلط نہیں تھا لیکن نظریہ و نظر، دم و خم، گفتار و کردار اور قول و حالی غالب سے بہت دور اور نواب مصطفٰی خاں شیفتہ سے یکسر قریب تھے۔ چنانچہ وہ قدرتاً و طبعاً نواب شیفتہ واقعیت پسندی اور حقیقت نگاری کی طرف جھکے۔ چونکہ حالی نے اپنی مختصر خود نوشتہ سرگذشت میں کھلے بندوں کیا ہے کہ مجھے غالب کی صحبت سے اس قدر فائدہ نہیں پہنچا جتنا کہ شیفتہ کی آٹھ سالہ معیت سے۔ لہٰذا میرے خیال اگر وہ کے دوسرے شیفتہ ہوتے۔

سرسید کے فکری تعینات اور نظری حیثیات کے موڑنے میں غالب نے جو غیر معمولی رول ادا کیا ہے وہ کچھ تمہید سرسید نے بڑی جگر کاوی سے آئین اکبری کی اصلاح و ترتیب کی اور اس بنیاد پر کہ تعلقات استوار ہیں غالب کے لیے داد تحسین طلب کی۔ غالب نے مردہ پرور مبارک کار نیست کے تازہ دریافت کردہ نقطۂ تنقید کے پیش نظر آئین اکبری جارحانہ تقریظ لکھی کہ کس لیے رمیدہ ہڈیوں میں جان ڈالنے کی کوشش کر رہے ہو۔ حیات انسانی اس پیش رفت نت نئے مسائل خلق کر رہی ہے اور اکبری سلطنت کے تیار کردہ آئین اپنی آبرو کھو چکے ہیں۔ ہند کے پہ نظر ڈالو کہ سائنسی اکتشافات نے کس قدر دلفریب اجالا پھیلا رکھا ہے جو ساری کائنات کو اپنے گھیرے میں ہے۔ ادبی ہوشمندی کا تقاضا ہے کہ نئی روشنی در آنے کے لیے اپنے دل و دماغ کے دروازے وا رکھیں ہے کہ یہ بات سرسید کی توقع اور نیز رواج زمانہ کے سراسر خلاف تھی۔ انھوں نے غالب کے اس جاندار تقریظ نورد کر دیا اور اپنی کتاب بغیر تقریظ کے شائع کر دی۔ مگر سرسید اصیل اور طباع آدمی تھے۔ فوراً بعد انہ اشتعالی ذہن سے غالب کے بلیغ اور اشارات کو تاڑ لیا اور اپنی عاقبت عزیز بنانے کی فکر میں لگ گئے۔ یہاں ایک رکھنے کے قابل ہے کہ چونکہ سرسید نے اپنی شخصیت کے آئینہ میں عظمت و شہرت کا پرتو دیکھ لیا تھا اس لیے وہ کی جانب نہ جھکے بلکہ اپنی فکری توانائیوں کو قوم و ملت کے تعمیری کاموں اور سماجی فلاح و بہبود کے لیے وقف کر دیا علمی و تاریخی کارنامے انجام دیئے اور سرسید اول بن گئے۔ (جنوب میں دوسرے سرسید جنم لے چکے ہیں مگر شمال دوسرے سرسید کے ظہور کا انتظار کیا جا رہا ہے)

البتہ زندگی کے تنگ دور میں غالب کی طرح ڈرامائی واقعات سے اگر کسی امام فن کو دوچار ہونا پڑا ان ہمہ گیر حادثات نے اس کی شخصی دبا[illegible] میں اضافہ کر کے دوسرے غالب ہونے کا مستحق ٹھہرایا ہے تو وہ مولانا آزاد ہیں۔ دونوں کے سوانحی واقعات اور فنی کارگزاریوں کا تقابلی مطالعہ کیجئے شاید رشتۂ خیال ہو جائے گی۔

کارگاہ عالم میں قدرت کا سب سے بڑا راز سربستہ اور اس کا بے بدل شاہکار انسان اور اس کا ناقابل تسخیر تحت الشعور ہے جو زمانی ومکانی فاصلہ و تفاوت کے باوجود اپنے نشو و نمود کے سلسلے میں بار بار سر اٹھاتا رہتا ہے اور جو مادہ کے مختلف سانچوں میں قدرے تغیر کے ساتھ ڈھلتے رہتا ہے۔ متحیر نگاہیں اس کی توجہ میں اعجاز و ایجاد کے دریا بہا دیتے ہیں مگر تکرار و تسلسل اور ترفع و توسیع کا یہ عمل درحقیقت حسن تمام یا خیر کل کی جانب ایک ذہنی جست ہوتا ہے۔ اصل اور اجل کی اعلیٰ منزل تک پہنچنے کے لیے بشری طاقت کا ایک جرات مندانہ اقدام ہے۔ اقبال کی زبان میں یزداں کو کمند میں لانے کے لیے مردانہ ہمت ہے۔ ع یزداں بہ کمند آور اے ہمت مردانہ۔

غالب اور مولانا آزاد کے خانوادوں اور دونوں کے خانوادوں کے صوری اور معنوی امتیازات کا جائزہ لیجئے معاً ان کے سماجی وعلمی وجاہت پر غور فرمائیے تو محسوس طور پہ دکھائی دے گا کہ دراصل یہ دونوں خالق کی دو عظیم صفات جلال وجمال کے کلیتاً دو خارجی مظہر ہیں۔

غالب انتہائی ناز سے کہا کرتے تھے کہ وہ ترک ایبک کی تاریخ ساز ہستیوں کا آخری چشم و چراغ اور مایہ ناز یادگار ہیں اور ان کے اسلاف نے مصاف جنگ میں ناقابل فراموش جنگی کارنامے انجام دے کر تاریخ کے صفحات میں دائماً اپنے ناموں کو محفوظ کر لیا ہے مگر میں نے علم کو قلم بنا لیا اور اپنی کشتیٔ فن کے بحر بے کراں میں روانہ کر دی۔ مولانا آزاد نے بھی ہند کے ایک ایسے علمی و روحانی خاندان میں جنم لیا ہے۔ جس پر بقول ان کے صدیوں کی قدامت و تسلسل کی مہریں لگی تھیں جو ملک شخصیت اور اس کی شائستہ تعلیمات کے ساتھ سارے ملک میں متعارف تھا۔ اس خانوادہ کی ایک معنوی خصوصیت یہ تھی کہ اس کے اراکین دانش و بینش میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے مگر ان کے کان نئے ابھرتے جھتے سماج اور اس کی صداؤں کو سننا گوارا نہیں کرتے تھے آپ ہی اندازہ لگائیے کہ خام ناپختہ شعور ایسی عرفان و حقیقت کی رومان انگیز اور ادب آموز فضا میں کیا برگ و بار لائے گا اور اس کے اثرات کس قدر دور رس ہوں گے؟ علاوہ بریں فکر انسانی کی تعمیر و تشکیل میں منجملہ اور عناصر کے ایک بنیادی عنصر نظام تعلیم کا ہوتا ہے۔ مولانا کو جس طرح کے بے میل اور سرتاسر غیر بصیرت افروز نصاب علم و ادب سے سابقہ پڑا تھا اس کا ذکر مولانا نے بڑی جامعیت کے ساتھ کیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

"ایسا نظام تعلیم جسے فن تعلیم کے جس زاویہ نگاہ سے دیکھا جائے، سرتاسر عقیم ہو چکا ہے طریق تعلیم کے اعتبار سے ناقص درس و املا کے اسلوب کے اعتبار سے ناقص ۔ ۔ ۔ ۔ اس سے ان کتابوں کے مطالب و عبارت کا علم حاصل ہو جاتا ہے لیکن خود ان علوم میں کوئی مجتہدانہ بصیرت حاصل نہیں ہو سکتی (غبار خاطر صفحہ ۱۳۰)۔

لیکن مولانا غالب کی طرح تعلیم و مذہب کے انقلابی آہنگ میں ایمان رکھتے تھے اور وہ دو سال کی بہار آفریں عمر تک میں مذہبی علوم و سماجی فنون کی لامحدود وسعتوں کے حسن سے آگاہ ہو چکے تھے۔ ان کی تشنگی اس قدر شدید تھی کہ روایاتی علوم کے چشمۂ تنگ آبی سے اپنی پیاس بجھا نہیں سکتے تھے۔ اس لیے ان کے تیز رفتار قدم اسی منزل میں رکے نہیں اور جو کچھ انہیں توارث یا تربیت کے حوالے سے ملا تھا اس کی لطافت یا عظمت میں بے خود ہو کر نہیں رہ گئے۔ چنانچہ ابھی وہ پندرہ رنگین بہاریں تھے کہ ان کی طبیعت کا سکون ہلنا شروع ہو گیا اور شک و شبہ کے کانٹے دل میں چبھنے لگے۔ وجہ اس

کا فرشتہ سرگوشی کرنے لگا کہ گرد و پیش میں جو آوازیں سنائی دے رہی ہیں ان کے علاوہ کچھ اور بھی ہونا چاہیئے اور علم و حقیقت کی دنیا اتنی ہی نہیں جتنی سامنے آ کھڑی ہے ۔ حتی کہ چند ہی برسوں میں وہ تصورات جو انہیں خاندان، تعلیم وغیرہ وغیرہ کے توسط سے ملے تھے یکسر بے سروپا اور غیر مفید معلوم ہونے لگے اور وہ نئی سمتوں اور راہوں کی تلاش میں چل کھڑے ہوئے ۔ پھر ان کی زندگی میں ایک ایسی گھڑی بھی آئی کہ عقائد و رسوم کی بوسیدہ دیوار کو خود اپنے ہاتھوں سے ڈھا اس کے ملبے پر افکار و نظریوں کی نئی عمارت تعمیر کرنی پڑی لیکن اس کے لیے مولانا کو ادارتی اقدار اور روایا اخلاق کی پائدار اور مضبوط عمارت کو مسمار کرنا پڑتا ہے ۔ بار بار ان کے تحت الشعور سے یہ صدا آنے لگی کہ اعتقا کی بنیاد علم و نظر پر ہونی چاہیئے ۔ تقلید و توارث پر کیوں؟ تشکیک و جستجو کی طاقتور آرزو مولانا کو گرد و پیش پر نظر ڈالنے اور نئے کاروان حیات کے تلاش کی لگن لگا دیتی ہے ۔ نفسیاتی طور پر مشرقی روایات کی بازگشت سے ان کے جذبات میں خاص ہلچل ہونے لگتی ہے ۔ ایسے گومگو کے عالم میں مولانا کو موروثی اثاثہ اور نفسیاتی کشمکش سے رستگاری دلانے کے لیے غالب کی روح ان کے قالب میں حلول کر جاتی ہے ۔ لیکن مولانا آزاد کی کثیر الابعاد اور منفرد شخصیت میں روح غالب کا سراغ پانے کے لیے چند اہم نکتوں کی جانب توجہ دلانا نہایت ضروری ہے ۔

مولانا آزاد تہذیب اسلام اور اس کی قدیم و جدید فکریات کے اعلیٰ نقیب ۔ تمدنی اعمرانی ارتقاء اور حالا کے زبردست مورخ ۔ عالمی سیاست و معاشیات کے ممتاز امام ۔ عربی و فارسی شاعری کے مایہ ناز نکتہ سنج اردو کے برگزیدہ ادیب و ناقد اور ان کے علاوہ اور بہت کچھ ہیں ۔ ان کی باوقار شخصیت نے وقت کی تما تحریکات اور سماجی تنظیموں پر ان کی فکری انفرادیت کا انمٹ نقش چھوڑا ہے ۔ مولانا نے غبار خاطر میں ان عا محرکات و داخلی موثرات کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے جن سے ان کی یہ عظیم شخصیت بنی ۔ اس لیے کہ اس عا اسباب میں ہر حالت کا دامن کسی نہ کسی علت سے بندھا ہوا ہے ۔ آخر ان رشتوں کا بھی سراغ ملنا چاہیئے جن کے ان کے ذہن و شعور کی تعمیر و تشکیل ہوئی (غبار خاطر ص ۱۳۴) ۔ مولانا نے بڑی فراخ دلی سے تسلیم کیا ہے کہ وہ ان محرکات کو بروئے کار لانے میں کامیاب نہ ہو سکے ۔ حق یہ ہے کہ مولانا کا یہ تنقیدی انداز انتہائی دلچسپ اور فکر ہے ۔ اس لیے کہ اس کے مطالعہ سے ان کی سربستہ راز زندگی کے بعض پہلو سامنے آ جاتے ہیں اور اکثر بے نقاب ہو اس سلسلہ میں یہ بات بھی ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ مولانا کی ذات گرامی کا ایک ایسا عبقری وجود تھا جو ترقی یافتہ (Developed) کہلاتا ہو جو وقت سے آگے بڑی تیز قدمی سے دوڑتا تھا ۔ جو مستقبل کے واقعات کا عکس اپنی ہستی کے ریڈار میں دیکھ لیتا تھا اور جو ایک قدم آگے بڑھایا تو مڑ کر دیکھنا اس کے لیے موت کے مترادف تھا ۔ وہ ہٹ سکتا تھا مڑ نہیں سکتا تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا کے ادبی حد تک دینی تحریریں اور سیاسی قرار داد بے لیک اور بے لوث ہوتی ہیں ۔ بہر حال اوائل عمر میں مولانا کی داخلی دنیا میں ناآسودگی کا اور طلب کی تمنا کا جو ٹھاٹھیں مار رہا تھا وہی ایک عظیم محرک بن کر ان کی ساری شخصیت پر چھا جاتا ہے اور وہ اعتقاد اور جمود کی تنگ و تا گلیوں سے نکل کر اطراف کی پھیلی ہوئی دنیا کا مطالعہ کرنے لگتے ہیں ۔ انہیں ایسے انتخابات کی تلاش ہوتی ہے جو ذ

...ں کا خاتمہ اور ایجاد و تخلیق کے فرحت بخش لمحوں سے ہمکنار کر سکے۔ خوش بختی سمجھئے یا حسن اتفاق کہ اس وقت مولانا کی
...س لگاؤ اس ادبی مجادلہ پر پڑی جو غالب اور ان کے معاندین کے درمیان فارسی کے معروف لغت برہان قاطع کے
...ملہ میں موثر آرا اور کافی گرما گرم بحثیں چل چکی تھیں۔ ایک جانب غالب اپنے محاذ پر ڈٹے ہوئے تھے اور دوسری
...ب رجعت پسندوں کا طبقہ نے اپنے مورچے سے غالب پر ادبیت ہتھیاروں سے حملہ کیا تھا۔ برہان قاطع کے ادبی و لغوی
...لہ نے مولانا کی باطنی کشمکش پر جو تازیانہ کا سا کام کیا ہے اس کا جز بہ جز ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"میری تیسری برس کی عمر تھی کہ مدراس کے اخبار جریدہ روزگار" میں یادگار غالب کا اشتہار دیکھا میں نے بڑے
...ق سے کتاب منگائی۔ یہ میرے اردو مطالعہ کا پہلا آغاز تھا۔ کتاب میں برہان قاطع کا حال پڑھا تو خیال ہوا کہ یہ تمام
...بیں دیکھنی چاہیں . . . . چونکہ اس زمانہ میں فارسی لغات کے مطالعہ و تحقیق کا بھی شوق تھا اور تصحیح الفاظ کی
...ی کاوش رہتی تھی۔ اس لیے پوری دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کا موقع ملا۔ واقعہ یہ ہے کہ مرزا غالب نے یہ چند اجزاء
...کر علم و تحقیق کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ ابوالکلام۔ نقش آزاد ص ۳۳ "

علم نفسیات کی ایک روایت بتاتی ہے کہ عمر کے نوخیز اور اثر پذیر حصہ میں انسانی دل و دماغ پہ جو بھی آثار و نقش
...تسم ہو جاتے ہیں وہ لافانی ہوتے ہیں اور مرور وقت کے ساتھ ان کا رنگ اور پرکیف ہونے لگتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس
...مانہ سے غالب مستقل طور پہ آزاد کے ذہنی و فکری رفیق اور زندگی کی اکثر پیچیدہ راہوں میں ان کے دائمی مشیر بن جاتے ہیں۔
...نکہ غالب کی شاعرانہ تعبیروں کو وہ مقام حاصل ہوتا ہے جو دستور حیات اور آداب عمل سکھانے والے وجدانی رہنما کا
...ہوتا ہے۔ اس لیے آپ دیکھیں گے کہ مولانا آزاد پہ سرور کی مستی چھائی ہوئی ہو یا وہ سیاسی ہنگاموں کی سرگرمیوں میں ہمہ تن
...شغول۔ مکتوب کے ذریعہ ایسی گمنام ہستی سے نقاب اٹھا رہے ہوں یا رات کی سہ پہر کی چائے اور سگریٹ نوشی کے مرکب
...ل سے لطف اندوز ہو رہے ہوں۔ زہد و علم کی مجلس آرائی ہو یا رند و تر دامنی کا سلسلہ چھڑا ہوا ہو غرض غالب ان کے
...حساس و شعور پہ چھائے ہوتے ہیں اور ذکر حبیب سے ان کے داخلی ہیجانات کی تطہیر اور جذبات کو تسکین ہو رہی ہے۔ یہ
...یں نہیں کہہ رہا ہوں خود مولانا آزاد کا اصرار ہے کہ زندگی کے اکثر شعبوں میں ان کے ساتھ اس نوع کے معاملات پیش آئے
...لیا جن سے غالب کو ان کے جیب حیات در پیش ہوتے تھے (غالب اور ابوالکلام ص ۲۲)۔

آپ دیکھیں گے کہ عربی و فارسی زبانوں میں عالمی شہرت رکھنے والے فنکار و شاعر مثلاً ابوتمام، معریؔ۔ فرزدق
...ردوسی و سعدی۔ حافظ و جامی، عرفی و طالب آملی، انوری و نظیری، فیضی، و ابوالفضل، علی حزیں و ناصر علی۔
...غنی کاشمیری مولانا کے نہاں خانوں میں تاک جھانک کر لیتے ہیں اور کبھی کبھی زندگی کی دشوار گذار وادیوں میں مولانا کے
...غمگسار و چارہ ساز بن جاتے ہیں لیکن آزاد کے سیل فکر و معانی اور طوفانی جذبات کے لیے اگر کوئی شخصیت مرجع ارشاد
...بن سکتی ہے تو غالب کی پہلودار شخصیت ہی ہو سکتی ہے جو زندگی کے تھکا دینے والے سفر میں ہمدردی اور آشنائی کی خوشبو
...بانٹ کر آزاد کے پرکیف احساسات کو تسکین دے سکتی ہے۔ شاید غالب کی جانب آزاد اس لیے بھی کھنچے چلے آتے ہیں کہ
...فکر و عمل کی بھرپور تصویر غالب میں دکھائی دیتی ہے۔ گویا خود کی تصویر ہے غیر کے آئینہ میں۔ دونوں میں نفسیاتی افتاد کی

یکرنگی اور میدانِ عمل میں جو محسوس مماثلت پائی جاتی ہے اس سے اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ شعور انسانی عقل کا
کے لیے صرف اپنی کینچلیاں بدلتے رہتا ہے چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے ؎

ما نہ بودیم بدین مرتبہ راضی غالب شعر خود خواہشِ آن کرد کہ گردد فنِ ما

"میں نے سیاسی زندگی کے ہنگاموں کو نہیں ڈھونڈا تھا - سیاسی زندگی کے ہنگاموں نے مجھے ڈھونڈ نکالا (غبا
زمانہ اور ابنائے زمانہ کی کم قدری اور قدر ناشناسی کا شکوہ کرتے ہوئے غلام رسول مہر کو ایک خط میں لکھتے ہیں ۔ اف
زمانہ میرے دماغ سے کام لینے کا کوئی سامان نہ کرسکا ۔ غالب کو تو اپنی ایک شاعری ہی کا رونا تھا نہیں معلوم میرے
چیزیں قبر میں جائیں گی ؎

نارواں بود بہ بازارِ جہاں جنسِ وفا رونقے گشتم واز طالع دکان رفتم (غالب) نقشِ آ

آپ اپنا تماشائی بن گیا ہوں ۔ یعنی اپنے آپ کو غیر سمجھ لیا ہے ۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے ۔ کہتا ہوں کہ غالب کے ایک
جوتی لگی ۔ (غالب)

ہم نے عرصے سے مسلمانوں کو اپنے سے غیر سمجھ لیا ہے اور جب کبھی گورنمنٹ کی طرف سے کوئی مشکل پیش آتی ہے
ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایک اور جوتی لگی ۔ الہلال ۔ آگسٹ ۱۹۱۲ء ۔

حیات انسانی کی معنی یابی اور معنویت شناسی کے لیے دو طریقوں سے کام لیا گیا ہے (۱) سماجی اور سائنسی
مدد سے (۲) وجدانی طریقوں کی راہوں سے ۔ مگر ہر دور کے مفکر اس کے برگزیدہ اور نیک منصب کو تصور میں
قدم آگے بڑھایا ہے اور عصری تجربات اور اجتماعی رجحانات کی روشنی میں اس کی تقدیسیت کو تسلیم کیا ہے ۔ مولا
نے وجود انسانی کی پیچیدہ نفسیات اور اس کے طلسماتی آہنگوں کی جانب جو فکر انگیز اشارے کیئے ہیں ان پر مو
مخصوص مزاج اور منفردانہ مقام کی چھاپ لگی ہوتی ہے ۔ انھوں نے اپنے فکری عمل سے زندگی کی اداؤں اور اس
کو ایک نیا روپ دیا ہے ۔ ان کے خیال میں حیات انسانی ایک گراں قدر تحفہ ہے ۔ فنی عمل کا ایک ایسا نمونہ ہے
تک پہلے ہی بن چکا ہے ۔ اس کو انھوں نے مقدس فریضہ سے تعبیر کیا ہے ۔ ان کے ادراک میں زندگی نہ استحقاق ہے نہ نغمہ
یا رازِ قدرت کا ناقابلِ تسخیر شاہکار بلکہ ایک وبالِ دوش ہے جسے بہر حال اٹھائے پھرنا ہے ۔ ایک ذمہ داری ہے
چار و ناچار پوری کرنی ہے ۔ غالباً یہ تصورِ حیات کسی بالغ النظر فلسفی کے فکری عمل کا مرہونِ منت نہیں ہے بلکہ بالراست مولانا کے
استوار کے گہرے شعور کا خلق کردہ ہے جس میں ان تلخ تجربوں کا بھی عمل دخل ہے جن سے ان کو آئے دن کے سیاسی ہنگا
نتیجہ میں دوچار ہونا پڑتا تھا ۔

لیکن مولانا اس نظریہ کے بھی علمبردار ہیں کہ انسانی افکار و اعمال کا ارتقاء و تسلسل جاری رہتا ہے اور بار با
شکلوں میں ان کا مظاہرہ ہوتا رہتا ہے ۔ چنانچہ وہ غبارِ خاطر میں ایک جگہ عرفانی اعمال و افکار کے تسلسل و تکرار کے ر
سابعہ شامی کا رابعہ بصریہ سے تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں ۔

"افکار و اعمال کے امثال و اشباہ ہمیشہ مختلف وقتوں اور مختلف شخصیتوں میں سر اٹھاتے رہتے ہیں اور فکر و نظر

سے کہیں زیادہ احوال و واردات کا میدان اپنی یکرنگیاں اور ہم آہنگیاں رکھتا ہے (غبارِ خاطر صفحہ ۸۱)

اس مسئلہ کی افادیت و معروضیت یا اس کے ماورائی پہلوؤں سے بحث ہمارا مقصود نہیں ہے مگر یہ ایک حیرت انگیز اتفاق ہے کہ غالب اور مولانا آزاد کے احوال و واقعات میں غیر مشتبہ شباہت پائی جاتی ہے اور یہ مماثلت اس قدر روشن ہے کہ آ مولانا کے ایک عقیدت مند نقاد کو لکھنا پڑا کہ اگر آواگون کا کوئی قائل ہو تو اسے گمان ہو سکتا ہے کہ غالب ہی کی بے قرار روح نے مولانا آزاد کے قالب میں دوبارہ جنم لیا ہے (غالب اور ابوالکلام صفحہ ۹) ۔ حقیقت بھی یہ ہے کہ ان دو عظیم فنکاروں کے ہاں جو فکری و تہذیبی نقطۂ اتصال ہے وہ اس قدر واضح ہے کہ بغیر کسی گہرے تقابلی مطالعہ کے سمجھ میں آجاتا ہے یعنی دونوں کے ہاں سماجی مدوجزر سے نبرد آزمائی کی جرأت ۔ قدرت کی استبدادی قوتوں سے رہائی پانے کی جد و جہد ۔ دونوں کے ہاں اعتقادات سے نفسیاتی لگاؤ اور سوز دروں اور آتشِ پنہاں کی گرمی صاف محسوس ہوتی ہے ۔ فن کی قدروں اور فکر کا اداروں پر تنقیدی نگاہ ۔ اختراع پسندی ۔ ناخوش گوار حالات کو خوش گوار بنانے کا فن ۔ فکر و نظر کی آزادی ۔ بذلہ سنجی اور سخن شناسی اور اس طرح کی کئی باتوں میں وافر مماثلت دونوں میں موجود ہے حتیٰ کہ دونوں کی عائلی زندگی ۔ خانگی معاملات اور ازدواجی امور میں جو اتفاقی و طور تباط موجود ہے اس کا احتساب بھی دلچسپی سے خالی نہیں ۔ مولانا کی شادی غالب کی طرح بارہ سال میں ہوئی مگر کے لحاظ سے مولانا کی اہلیہ جان (زلیخا) ان کی آدھی کے برابر تھیں ۔ دونوں نے عورت کا مطالعہ سماجی پس منظر میں نہیں کیا یعنی غالب کی طرح مولانا نے اپنی نصف بہتر کو جنسی خواہشات کی تسکین کا ذریعہ اور عیش و عشرت کا سامان ہی نہیں کیا بلکہ دونوں کی عائلی زندگی مزاج و آہنگ کے اعتبار سے المیہ ثابت ہوئی ۔ غالب، ذہنی ہم آہنگی نہ ہونے کے باوصف اپنی اہلیہ سے بے پایاں محبت رکھتے تھے ۔ آزاد کا اپنی رفیقۂ حیات سے جو جذباتی لگاؤ تھا اس کا انکشاف اس خط سے ہوتا ہے جو انہوں نے احمد نگر کے جیل میں لکھا تھا ان کی تحریر ہی نہیں بلکہ تاریخ اس بات کا بین ثبوت پیش کرتی ہے کہ زلیخا کی جدائی سے اس صاحبِ نظر کا دماغی و جسمانی سکون چل گیا اور ان کی صحت تیزی سے جواب دینے لگی ۔ ہند کی دو بڑی شخصیتوں کی گھریلو زندگی پر جو پردہ اسرار پڑے ہیں ان کے اٹھانے سے دونوں کے شعور و کردار کے سمجھنے میں مدد ملتی مگر خاندان کی نام نہاد وضعداری اس امر کی مجاز نہ تھی ۔ کیا ضرور کہ نجی اور خانگی واقعات کو جلوت کا رنگ دیا جائے ۔ دونوں میں ایک اور قدر مشترک یہ ہے کہ غالب کی طرح آزاد بچپن کی اس زنجیر پائی سے خوش نہ تھے ۔ تاہم آزاد نے زلیخا کو جو محبت عطا اور خراجِ عقیدت کیا ہے اس کا مطالعہ قاری کو ایک اور دنیا میں لے جاتا ہے وہ لکھتے ہیں ۔

"گزشتہ پچیس برس کے اندر کتنے ہی سفر در پیش ہوئے ۔ کتنی ہی مرتبہ گرفتاریاں ہوئیں ۔ میں اس درجہ افسردہ اسے کبھی نہیں دیکھا ۔ کیا جذبات کی وقتی کمزوری تھی جو اس پر غالب آگئی تھی ۔ میں نے تو اس وقت ایسا ہی خیال کیا تھا ۔ اب سوچتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ شاید اسے صورت کا ایک مجہول احساس ہونے لگا تھا ۔ شاید وہ محسوس کر رہی تھی کہ زندگی آخری ملاقات ہے ۔ وہ خدا حافظ اس لیے کہہ رہی تھی کہ میں سفر کر رہا ہوں وہ اس لیے کہہ رہی تھی کہ خود سفر کرنے والی ہے"

ادبی دنیا کی دو بڑی ہستیوں میں اس طرح کی ہم رنگیوں کا پایا جانا خارج از امکان نہیں ہے اور ایک بڑے کی بصیرتوں کے آئینہ اور اس کے جذبات کے شیشی محل نہیں دوسرے فنکار کا اپنے گیسوؤں کو سنوارنا از رہے تو

غیر ممکن بھی نہیں ہے مگر غالب کے پیکر خیال اور نقش تصور کو مولانا نے اپنی سرگذشت کے احوال و واردات کے مرقع میں جس والہانہ انداز سے پیش کیا ہے۔ اس سے اس بات کی توثیق ہو جاتی ہے کہ مولانا دوسرے غالب کہلانا اپنے لیے موجب افتخار سمجھتے تھے۔ الحاصل مولانا نے غالب کی نازک عرفانی روح کو نثر کے متین جسم میں کھپانے کی جو شعوری کوشش کی ہے اس سے اردو نثر کو ایک باوقار انداز اور اس کے آہنگ و تخیل کو ایک نیا وژن مل گیا ہے۔

چلتے چلتے ایک اور نقطہ مماثلت کو ملاحظہ فرمائیے جو آخری ہوتے ہوئے بھی نہایت معنی خیز ہے۔ غالب نے اپنے عدیم المثال شاعرانہ تخیل سے مکتوب نویسی کا جو سہل اور ناقابل اتباع اسلوب بیان اختراع کیا تھا اس کی امتیازی صفات کا مجملاً جائزہ حسن عسکری نے لیا ہے اور آخر میں غالب کے خطوط کو معبودیت کا مقام دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں وہ ہر شخص ان کو ایک مقدس پتھر سمجھ کر چومتا ہے اور ان کی پرستش کرنے لگتا ہے"۔ اس طرح مولانا نے اپنی تحریروں کے لیے جو جداگانہ انداز اور حکیمانہ طرز تکلم ایجاد کیا تھا وہ بہ قبول نیاز فتح پوری بالراست مولانا کی ہستی کی قلزم سے ظہور پذیر ہوا ہے انھوں نے انتہائی کامیابی کے ساتھ برتا اور انہیں کے ساتھ ختم ہوا ؎

"ایک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے"

●●

بقیہ: اردو نامہ

(۴۶ سے آگے)

میں منعقد ہوا۔ مولانا صابر نے مخدوم کی شخصیت قیادت اور فکر و فن پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ محبت اور محنت کے اس نامور سخنور کو جناب خواجہ معین الدین صدر اسپیلا اور دیگر معززین نے صبر لوپر خراج عقیدت ادا کیا۔ مخدوم کی قبر پر چادر گل چڑھائی گئی اور فاتحہ و ختم قرآن کا انتظام بھی کیا گیا۔

۲۵ر اگست:۔ مولانا حافظ ابو یوسف ڈپٹی لیڈر کانگریس آئی لیجسلیچر پارٹی نے ریاستی قانون ساز کو ... موازنہ پر تقریر کرتے ہوئے حکومت پر زور دیا کہ وہ اردو ہیڈ ٹیچر کی گرانٹ میں اضافہ کرے اور ریاست میں اردو مدارس کے قیام کے سلسلے میں طلباء کی شرط کے لزوم کو برخواست کرے۔

● اردو فورم کے زیر اہتمام محفل شعر جناب احمد شریف ریاستی وزیر اوقاف کی صدارت میں آراستہ ہوئی۔ جناب نسیم عارف الدین ایڈوکیٹ مہمان خصوصی تھے۔ اس مشاعرہ میں ڈاکٹر غیاث صدیقی افتخار احمد اقبال، عزیز بھارتی، اشرف خوندمیری، فکری بدایونی، بشیر وارثی، علی سرور، احمد علی ادیب، بیکس الہ آبادی، امام الدین فدا اور کلیم مہدی نے کلام سنایا۔

۲۹ر اگست:۔ بزم انقلاب ادب کا سالانہ مشاعرہ جناب بشیر وارثی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ کئی قدیم و جدید مکتب فکر کے شاعروں نے کلام سنایا۔ علی سرور نے شکریہ ادا کیا۔ ●●

نتیجۂ امتحان مرکز خوشنویسی / ادارۂ ادبیات اردو
منعقدہ ۱۳ر و ۱۴ر اگست ۱۹۸۱ء

سال اوّل

کامیاب درجۂ اول | امین الدین، ابراہیم خلیل، مشتاق احمد، پروین سلطانہ، دردانہ بیگم

کامیاب درجۂ دوم | عقیلہ سلطانہ، سید احمد حسین، سلیمہ آصف، محمد الیاس، محمد عبدالستار

سال دوّم

کامیاب درجۂ اول | حمید الحق، ممتاز جہاں، محمد غوث، سیدہ خورشید فاطمہ

کامیاب درجۂ دوم:۔ قمر النساء، سیدہ سرفراز، سید ممتاز محمد، نجمہ سلطانہ و اعظم سشمرلیا۔

●

باقر

نذرِ مخدوم

گنگ، گلوگیر صدا آخرِ شب | کون یہ مسندِ معنیٰ سے اُٹھا آخرِ شب
سے پُراسرار سی مدھم مدھم | کس کے قدموں کی یہ آتی ہے صدا آخرِ شب
لے پھر اُٹھ کے سلیمانِ سخن | ڈھل گئی خاک میں بلقیسِ نوا آخرِ شب
ہری ہوئی اس کو مکانوں میں ملیں | پہونچا ہر در پہ لئے آبِ بقا آخرِ شب
ن کی غضب تھی، وہ ستارہ تھا عجب | ٹوٹ کر دامنِ شب میں جو گرا آخرِ شب
سے اٹھی لاش کسی سورج کی | یا کسی چاند نے منہ پھیر لیا آخرِ شب
ذ پہ سر رکھ کے سحر سے پہلے | بجھ گئی شمعِ شبستانِ نوا آخرِ شب
جس کی صدا انوارِ سحر تھے وہ دیا | کر گیا بخششِ تنویر و ضیا آخرِ شب
مچلی تو کیا، بادِ صبا آئی تو کیا | نشۂ رنگ ہی جب ٹوٹ گیا آخرِ شب

صرصرِ درد چلی پچھلے پہر یوں مضطر
پھول کی طرح ہر اک زخم کھلا آخرِ شب

★

حسن رضوی

کشتی پہ بادبان نہیں | رُخ ہوا کا بھی مہربان نہیں
تنگ تھی زمیں ہم پر | اور اب سر پہ آسمان نہیں
رہ فسردگی چھلکے | زندگی کا کوئی نشان نہیں
ش ہے کس جگہ ٹھہریں | ہاں کسی گھر میں سائبان نہیں

راستوں کو وہاں بھی لے جائیں
جس جگہ پہ کوئی مکان نہیں

مومن خاں شوق

یادِ زور

(ڈاکٹر زور کی ۱۵ویں برسی کے موقع پر)

اُجالے کی اسی بستی، اسی اردو کے ایواں میں
رسالوں میں کتابوں میں، نوادر شاہکاروں میں
اُسے ہم نے کچھ اس اندازِ دلداری سے دیکھا ہے
کبھی لکھتے ہوئے افسانۂ عہدِ تمنّا کو
کبھی تاریخِ مہر و ماہ رقم کرتے
کبھی نقد و نظر میں منہمک:
تحقیقِ دکنی میں کبھی غلطاں

دکن کے ذرّہ ذرّہ سے محبت بے نہایت تھی
لکھوں تو کیا لکھوں عاجز قلم، زورِ بیاں کم کم
جو اپنی ذات میں علم و ادب کا ضَو فشاں پرچم
اُسے اک عہدِ کُل لکھوں، اُسے اک مدرسہ لکھوں
اُسے گنجینۂ گوہر لکھوں، حسنِ عطا لکھوں
اُسے ہم نے کچھ اس اندازِ دلداری سے دیکھا ہے:
دبستانِ دکن کا وہ معلّم،
علم و دانش کا خزینہ تھا
وفا کی سرزمیں پر کوہِ نور ایسا نگینہ تھا

■■

غزلیں

محمود عشقی

پائلوں میں کھنک رہی ہے رات
میکدوں میں چھڑک رہی ہے رات

لوریوں سے لہک رہی ہے رات
بالکوں کو تھپک رہی ہے رات

نفرتوں سے جھلس گئی تھی زمیں
پیار اس پر چھڑک رہی ہے رات

گشت کرتی ہوئی فصیلوں پر
گیسوؤں کو جھٹک رہی ہے رات

جنگلوں سے گزر گئی بے خوف
بستیوں میں جھجک رہی ہے رات

میکشوں کو، غبار بازوں کو
کتنی حسرت سے تک رہی ہے رات

خواب گاہوں کے دیکھ کر منظر
اپنی پلکیں جھپک رہی ہے رات

کیف و مستی میں ڈوب کر عشقی
ساغروں سے چھلک رہی ہے رات

نجیب رامش

لگتا ہے کہ کچھ تو کھو دیا ہے
صحرا میں گلاب بو دیا ہے
پھر خون سا کیوں مہک رہا ہے
ہاتھ اپنا تو میں نے دھو دیا ہے
عکس اس کا، مہک، خطوط، سب ماند
لمحوں نے دھواں پرو دیا ہے
کیا پایا کسی نے بستیوں سے
صحرا نے سراب تو دیا ہے
عاجز ہوں میں اپنی اس لچک سے
دے مجھ کو جو سنگ کو دیا ہے
ہمدرد جہاں بھی۔ تو بھی محسن
کاغذ کا لباس جو دیا ہے
کڑیاں جو بکھر گئیں تو وحشی
زنجیر کے دکھ پہ رو دیا ہے

رشید عبدالسمیع جلیل

زینۂ درد

(نذرِ قلی قطب شاہ)

اب تو یہ ہے کہ سرافراز خموشی کے سوا
روضۂ جاں میں گزر اور کسی کا بھی نہیں
چارمینار بھی اک قصۂ پارینہ ہوا

کھو گئی بھاگ متی اور قلی ہے کہ خموش
کوئی سندیسہ کوئی پیار کا نغمہ بھی نہیں
داستاں گیر وہ اک نقش جو گنجینہ ہوا

کوئی بنیاد جو فرخندۂ بنیاد بھی تھی
سیل آمادہ ہوئی، موجِ فراموش رہی
جو بھی سمجھوتہ ہوا وقت سے دیرینہ ہوا

میں جو سائے میں کھڑا ہوں تو شکستہ ہے انا
سر سراتے ہوئے ماضی کے سوا کیا ہے یہاں
عکس دھندلا گیا جس کا یہ وہ آئینہ ہوا

اب تو یہ ہے کہ فقط سوگ کے مینار ہیں ہم
تشنہ کاموں کو کوئی فن کی پرکھ کیا معنی
چارمینار تو بس درد کا اک زینہ ہے

رشید قریشی ایم اے

ویمنا اور اس کی شاعری

ویمنا، تلگو شاعری میں شتک کا عظیم شاعر گزرا ہے۔ شتک اس صنفِ شعر کو کہتے ہیں جس میں سو بند ہوتے ہیں لیکن شعراء اس تعداد کے پابند نہ رہ سکے اور سو سے بھی زائد بند نظم کرنے لگے۔ خود ویمنا نے ہزاروں بند کہہ ڈالے ہیں۔ ان ہزاروں میں سے اس وقت جو بند اس کے نام سے منسوب ملتے ہیں ان کی تعداد بھی کم و بیش پانچ ہزار ہے۔ تاہم سو کی حد سے متجاوز ہونے کے باوجود اس صنف کا نام نہیں بدلا اور وہ بدستور شتک ہی کہلاتی رہی۔ اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کا ہر بند، نظم کا جزو ہوتے ہوئے بھی بجائے خود مکمل ہوتا ہے۔ آخری شعر یا شعر کا کچھ حصہ ہر بند میں دہرایا جاتا ہے۔ جسے مکٹ کہا جاتا ہے۔ ویمنا کے بند جس مکٹ سے آراستہ ہیں وہ ہے۔ اے خدا کے پیارے ویمنا سُن!

دراصل یہ صنف باشکل اور غنائیت کے اعتبار سے اتنی سبک، بیکر اور خوش آہنگ ہے کہ ویمنا کا وجدان اسی کا دلدادہ رہا۔ اور جو کچھ بھی اس نے کہا جاوداں ہو گیا۔ یہ صنف بنیادی طور پر بھگتی کے مضامین کے لئے استعمال ہوتی تھی۔ لیکن بتدریج اس میں دوسرے موضوعات بھی داخل ہونے لگے اور جب ویمنا کی شعر گوئی سیلاب کی طرح امڈی اس کے بہاؤ میں سارے ہی موضوع اس صنف میں گھس آئے۔

ویمنا کا رنگ کہیں مصلحانہ، کہیں عاشقانہ، کہیں رندانہ اور کہیں عارفانہ ہے لیکن خود اس کا اپنا جو رنگ ہے وہ ہے فقیرانہ اور یہ رنگ ہر رنگ کے پردہ میں رہ رہ کر کوندتا رہتا ہے... اس رنگ کے شاعر وہ ہوتے ہیں جو ماحول یا جبلت کے زیرِ اثر سیدھے راستے سے پگڈنڈی پر پڑ جاتے ہیں منزل ان کی آنکھوں کے سامنے ہوتی ہے۔ لیکن ان کا ہر قدم انہیں اس سے دور کرتا جاتا ہے مشیت کا منشا بھی شاید یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنی گمراہی میں سرگرداں رہیں اور شاعر سے بڑھ کر کچھ اور نہ بننے پائیں۔ ویمنا اپنے مقام پر مطمئن نہیں تھا۔ وہ آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ اسے ایک گرو کی تلاش تھی لیکن لوگوں نے بیچ رستہ ہی میں اُسے گھیر لیا۔ اور وقت سے بہت پہلے خود اسی کو گرو بنا ڈالا۔ وہ اُن سے پیچھا چھڑا کر بھاگ نکلا تو وہ بھی اس کے پیچھے آئے۔ اُسے پکڑ دھکڑ کر جگ کے استھان پر بٹھایا اور دھوم دھام سے اپنی عقیدتیں گزرانتے لگے۔ اس افتاد سے اس کی نامکمل روحانی شخصیت بھٹک کر بازار میں آ گئی۔ ویمنا اب نہ گرو تھا نہ جوگی... وہ ایک نا تمام سفر کا نا آسودہ مسافر تھا اور بازار میں کھڑا تھا۔ یہاں اُسے چند عورتیں ملیں جن کے قہقہوں کے ساتھ ان کی چوڑیاں کھنکتی تھیں۔ ممکن اس نے دیکھا ان قہقہوں اور باتوں کا مول تول ہوتا ہے اور جو بھی کوئی دام دیتا ہے ان کا مالک ہو جاتا ہے.. وہ دل برداشتہ وہاں سے نکلا تو میکدہ میں پناہ گیر ہوا۔ یہاں بیخودی نشاط انگیز تھی... لیکن دیوانگی بھی ہنگامہ آرا تھی۔ وہ وہاں بھی ٹھہر نہ سکا۔ اپنے بے چین دل کو سکون آشنا کرنے کے لیے اس نے شادی کر لی۔ گھر بنا لیا۔ لیکن گرہستی زندگی کی ذمہ داریوں نے اسے پریشان کر دیا اور وہ گھر بار چھوڑ کر پھر اپنی آزاد دنیا میں پہنچ گیا۔

یہ ویمنا کی زندگی کے ایک دور کا سرسری خاکہ تھا۔

اس کی پیدائش، زندگی اور وفات کے بارے میں تحقیق کرنے والوں کی الگ الگ دریافتیں ہیں۔ اُسے کوئی پندرھویں، کوئی

سترھویں اور کوئی اٹھارویں صدی کا شاعر قرار دیتا ہے۔ کسی کے خیال میں اس کا وطن "کنڈا اویلو" ہے تو کوئی "ترکو" بتاتا ہے۔ اس بارے میں ڈاکٹر پوپ اور میجر میکڈ انلڈ کی تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ اس کی زندگی کا زمانہ سترھویں صدی کا آخر اور اٹھارویں صدی کا اوائل ہے۔ اس کا زیادہ تر حصہ کڑپہ اور کرنول میں گزرا۔ تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات کہیں نہیں ملی۔ صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ وہ سن ۱۶۵۲ عیسوی میں پیدا ہوا۔ کس قدر عجیب اتفاق ہے کہ جس شاعر کو حیاتِ دوام ملی اس کی نہ تاریخ پیدائش ہے نہ تاریخ وفات۔

ویمنا کی شاعرانہ عظمت سے کسی کو انکار نہیں۔ وہ تلگو کا پہلا عوامی شاعر تسلیم کیا جاتا ہے وہ فطری شاعر تھا۔ اس نے کسی پاٹ شالہ میں تعلیم پائی نہ کسی پنڈت کی شاگردی کی۔ فطرت نے اس سے جو شعر کہا اور وہ شعر کہنے لگا۔ زندگی اس کی درس گاہ ... اور تجربہ اس کا استاد۔ اس کا شعر کہنے کا انداز یہ ہوتا کہ وہ گھنٹوں گم سم چلتا رہتا۔ ایک گاؤں سے دوسرا گاؤں، دوسرے گاؤں سے تیسرا گاؤں... اس پدیاترا کے دوران کوئی منظر، کوئی شخص یا کوئی چیز اُسے متوجہ کر لیتی تو اس پر اس کی ٹکٹکی جم جاتی۔ اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے، وہ جھومنے لگتا اور مدھم لہجہ میں شعر اس کی زبان سے ادا ہونے لگتے۔ اس کے معتقدین اور شاگرد جو اس کے اطراف جمع رہتے فوراً اس کے اشعار لکھ لیتے۔ یہ وجدانی کیفیت گزر جاتی تو وہ پھر چل پڑتا۔ چلتے رہنا اس کا کام تھا کیونکہ اسی طرح اس کا سندیس زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ سکتا تھا۔ ویمنا کے کلام کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ بہت آسان زبان میں ہے۔ بعض شعر تو ایسے ملتے ہیں جیسے شاعر شعر نہیں کہہ رہا کسی سے باتیں کر رہا ہے اس میں یہ ندرت بھی ہے کہ جو تشبیہ اور استعارے استعمال کئے گئے ہیں وہ عام زندگی سے متعلق ہوتے ہیں اور ان کا برجستہ اطلاق کلام کو اس قدر موثر اور دل نشین بنا دیتا ہے کہ سننے، سمجھنے اور ماننے کا ردِ عمل ایک ہی وقت میں وقوع پذیر ہو جاتا ہے چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

ہر گھر کے پچھواڑے کوئی نہ کوئی بیل دیوار پر پھیلی رہتی ہے اور اُسے باندھ نہ رکھا گیا تو وہ باہر نکل جاتی ہے۔ اس منظر میں کوئی خاص دلکشی نہیں رہتی۔ لیکن ویمنا کو اس میں ایک کردار رجحان نظر آیا وہ کہتا ہے: "گھر کے پچھواڑے کی بیل دیکھ ریکھ نہ ہو تو پھیل کر باہر نکل جاتی ہے۔ یہی حال گھر کی عورت کا ہے"

اس بند کی حکمت پر کھلے ذہن اور ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہئیے کیونکہ ایک حقیقت کی تفہیم کے لئے دوسری ناقابلِ انکار حقیقت کو سامنے لایا گیا ہے۔ گھر میں محراب ہوتا ہے۔ اس میں چراغ رکھا جاتا ہے۔ چراغ میں بتی ہوتی ہے اور تیل اُسے جلتا رکھتا ہے۔ ویمنا نے اس محراب، اس چراغ کو دیکھا اور تلقین کی "عرفان کے محراب میں ایک ایسا چراغ جلا جس میں اچھی سیرت کی بتی ہو۔ نیک اعمال کا تیل ہو اور پھر اس چراغ" مضمون انتہائی دقیق ہے لیکن بیان کی سلاست نے اُسے اس قدر آسان بنا دیا ہے کہ ہر سننے والا یہ محسوس کرتا ہے اس چراغ کو جلانا مشکل کام ہے اور جس کام کو مشکل نہ سمجھا جائے وہ کام آسان ہو ہی جاتا ہے۔ اور یہ بھی روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ بکریوں کے ریوڑ میں 'ماں سے بچھڑا ہوا بچہ ماں چاہے کہیں ہو پکارتا پکارتا اسی کے پاس چلا جاتا ہے۔

ویمنا کہتا ہے ..." بکریوں کے ریوڑ میں بچہ اپنی ماں کو پہچان کر اس کے پاس چلا جاتا ہے۔ اسی طرح سچا بھگت اپنے گرو کو ہزاروں میں ڈھونڈتا، آخر کار اس کے چرنوں میں پہنچ جاتا ہے۔" بھگت اور گرو کے بندھن کو واضح کرنے کے لئے جو مثال دی گئی ہے وہ جذب اور جستجو کا روح تک اثر رکھتی ہے اور سننے والا اسے آمادگی کے ساتھ قبول کر لیتا ہے جیسے وہ بات پہلے ہی سے اس کے ذہن میں تھی۔ ویمنا نے اس کی توجہ اس طرف مبذول کروادی۔ گرو کے بعد ویمنا خدا کا بھی پتہ دیتا ہے۔

انسان خدا کو ڈھونڈنے کے لئے تیرتھ یاترا کرتا ہے۔ لیکن ویمنا ایک اور ہی راستہ بتاتا ہے۔ خدا انسان کے نفس میں چھپا ہو

لیکن نادان انسان اس کا ٹھکانہ نہیں جانتا۔ اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا ہے۔ انسان کی اس گمراہی پر دیمنا کچھ برافروختہ سا ہو جاتا ہے کہتا ہے۔ یہ نادان انسان اس گدھے کے جیسا ہے جس پر چندن کی لکڑی لدی ہو لیکن گدھے کو خبر ہی نہ ہو کتنی قیمتی چیز اس کے پاس ہے۔ ظاہر ہے ظاہر و باطن کو سنوارنے کی نصیحت کے لئے بھی اس نے گدھے کو سامنے لا کھڑا کیا ہے۔

جسم پر بھبوت مل لینے سے کوئی شخص جوگی بن جاتا ہے کیا؟ اس گدھے کو دیکھو یہ بھی تو کوڑے کرکٹ میں لوٹ لگا کر آیا ہے اسی طرح وہ دکھاوے کی عبادت کرنے والوں کی بھی خبر لیتا ہے۔

دل میں کھوٹ رکھ کر تسبیح گھمانے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اندھا اگر اندھیرے میں باہر نکلنے کا راستہ ڈھونڈے تو کیا وہ اُسے مل سکتا ہے؟

لوہار کا کام سب ہی دیکھتے ہیں۔ لیکن ویمنا کی نظر میں تو صرف دیمنا ہی دیکھتا ہے۔ دیکھئے اس نے کیا دیکھا؟

لوہے کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو لوہار تپا کر جوڑ سکتا ہے لیکن کیا کوئی کاریگر ایسا ہے جو ٹوٹے ہوئے دل کے ٹکڑوں کو جوڑ دے؟

ویمنا نے گھاس کو خوشبودار پایا۔ سونے کو بے بو۔۔ اس نے سوچا۔ یہ خوشبو اس حقیر گھاس کو کیوں دے گئی۔ اس کا حقدار تو چمکیلا، گراں بہا سونا تھا اس نے سوچا۔ اگر خوشبو بھی نہ ہوتی تو گھاس کا سر آخر کس طرح اونچا رہ سکتا؟ اور وہ خدا کی قدرت کا قائل ہو جاتا ہے کہ ہر ایک کو کچھ نہ کچھ دیا جاتا ہے اور کسی کو سب کچھ نہیں دے دیا جاتا۔

اب میں ویمنا کے اشعار کا صرف ترجمہ پیش کرتا ہوں کیونکہ اُن میں حکمت اور عرفان کی ایسی تجلیاں ہیں جو کسی دوسری روشنی کی محتاج نہیں۔

"نیک نیتی اور پاک دلی سے کیا ہوا کام کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو۔۔ اس کا درجہ بلند ہی ہوتا ہے۔ بڑ کا بیج کتنا چھوٹا لیکن درخت کو دیکھو کتنا اونچا ہوتا ہے"۔

"انسان کی چھوٹی موٹی غلطیاں سدھاری جا سکتی ہیں اسی طرح جس طرح سوراخ اور گھڑے کو کپڑے کی ڈاٹ لگا کر استعمال کے قابل بنایا جا سکتا ہے۔ لیکن اس شخص کو کس طرح سدھارا جائے جو انسانیت کے قیام سے گر گیا ہے"۔

"کتنی معمولی چیزوں سے ہمیں کتنی بڑی تکلیف پہنچتی ہے۔ جوتے میں پھنسے کنکر سے آنکھ میں پڑے کچرے سے پاؤں میں چبھے کانٹے سے اور گھریلو جھگڑے سے۔ لیکن یہ کمزور انسان۔۔ خدا کو اپنے دل میں کس خوشی سے اُٹھائے پھرتا ہے"

ویمنا کی شاعری میں وہ حقیقتیں ہیں جو درحقیقت ہمارے آس پاس بکھری ہوتی ہیں لیکن انہیں بے حقیقت سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے وہ چراغ ہیں جو رہنما قدموں کے نشانوں کو اجالتے اور عرفان کی منزل تک پہنچاتے ہیں لیکن یہ چراغ گھر کے محرابوں میں جلنے بجھنے والے چراغ نہیں ہیں یہ وہ چراغ ہیں جن میں نورِ ازلی شام و سحر سے بے نیاز فروزاں رہتا ہے۔ وہ لوگوں کو اسی روشنی کے راستہ پر بلاتا ہے اور لوگ جب اس کے پاس نہیں آتے تو وہ اُن کے پاس جاتا ہے۔

کیونکہ وہ لوگوں کا شاعر ہے۔ اس کے لوگوں میں، ریاکار، بدکار، مذہبی ٹھیکیدار اور دولت پر اکڑنے والے سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ عورت بھی کہیں کہیں اس کی ملامتوں کا نشانہ بنتی ہے لیکن اس سے کسی کو شکایت نہیں۔ کیونکہ وہ بے لاگ ہے اور اس کی نیت مخلصانہ ہے وہ ان کی برائیوں کو مٹانا چاہتا ہے۔ ان کو انسان بنانا چاہتا ہے۔۔ وہ چاہتا ہے۔۔ مرد۔۔ عورت دونوں صاحبِ دل، صاحبِ نظر، صاحبِ کردار بنیں۔ نیکی کا دور دورہ ہو اور ہر گھر میں سکون آباد رہے اس کا یہ بھی کمال ہے کہ اپنے مقدس مقصد کو حاصل کرنے کیلئے گھما پھرا کر آسمانی زبان استعمال نہیں کرتا۔ بول چال کے لفظوں اور جانی پہچانی مثالوں کے ذریعہ زندگی کی بنیادی حقیقتوں کو اُبھارتا ہے اور روح کی الوہی رفعتوں کو اُجاگر کرتا ہے اس کا روپ فقیرانہ ہے اس کا کلام عارفانہ ہے اور لگن اس اشتیاق سے اس کی طرف بڑھتے ہیں جیسے وہ اپنی جھولیوں سے اپنے وجود کے کھوئے ہوئے اجزا نکال نکال کر انہیں واپس دینے والا ہے ●●

حیدرآباد کے شاعر (۲۰)

برقی یوسفی

۱۹۰ شاعروں پر ریاستی ساہتیہ اکیڈمی کے مطبوعہ دو تذکروں کا توسیعی سلسلہ

محمد یوسف الدین ولد محمد شرف الدین (برقی یوسفی) ... مئی ۱۹۳۳ء کو پیدا ہوئے۔ عثمانیہ میٹرک، اردو ... اور ادیب کامل (جامعہ اردو علیگڑھ) کامیاب ہیں ... بعد ٹرانسپورٹ کارپوریشن میں کنڈکٹر کی حیثیت ... کارگزار ہیں۔ برقی یوسفی طالب علمی کے زمانے سے ... لکھتے رہے۔ آزادی کے بعد کی نسل سے ہیں، ترقی ... تحریک اور کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے رکن اور ... پسند تحریک کے سرگرم اور فعال نوجوانوں میں ان کا ... ر ہوتا ہے۔ "انجمن ارتقائے ادب" کے ۱۹۵۴ء سے ۱۹۶۰ء تک معتمد عمومی رہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین ... ۱۹۶۰ء سے اب تک رکن عاملہ ہیں۔ مزدور تحریک ... آر ٹی سی میں آگے بڑھانے میں نامور سیاسی قائد ... شاعر مخدوم محی الدین کے ساتھ برقی یوسفی ... بھی نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔

برقی شاعری میں مخدوم اور کیفی سے متاثر ... نظمیں مسائل اور موضوعات پر لکھتے اور ... پڑھتے بھی خوب ہیں۔ بیحد سادہ مزاج، مخلص ... انسان دوست نوجوان ہیں۔ ان کی شاعری کا ... انسانی اقدار کا احترام، محبت اور محنت کی ... تقدیس اور آدرشوں اور خوابوں کی تلاش ملا ... شاعری میں بھی زندگی کے مسائل اور محبت کے ... باہمی رشتے کو برتنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ شاعری کا ... ایک انتخاب بغرض اشاعت ترتیب دے لیا ہے اور ریاستی اردو اکیڈمی کے اشتراک و تعاون کے منتظر ہیں (د-ع)

○

اک شب ترا خیال تھا تحریک درد تھی — گذری جو شب تو صبح کی تصویر زرد تھی
یہ زندگی بھی برف کی صورت پگھل گئی — ہر سانس زندگی کی مری سرد سرد تھی
اک شہرِ بے پناہ سے ہر شخص بے نیاز — تنہائی حسبِ حال تھی اور فرد فرد تھی
دیکھا جو میں نے اپنی صدی کی نگاہ سے — میری صدی پہ سینکڑوں صدیوں کی گرد تھی
مجنوں کی زندگی کی طرح برقی یوسفی
تیری حیات عشق بھی صحرا نورد تھی

اک حسنِ بے پناہ کی اکائی کو مان لیں — بے حجت و دلیل خدائی کو مان لیں
ہم جانتے ہیں منکرِ حسنِ ازل کی بات — ہم کیسے اہرمن کی دہائی کو مان لیں
ہم کو ہوا ہے کیسی قیامت کا سامنا! — کس دل سے ہم تمہاری جدائی کو مان لیں
جب اپنی ذات، اپنی انا میں بکھر گئی
اپنے ضمیر ہی کی سچائی کو مان لیں

درد تزئینِ عاشقی نہ ہوا — حسن بھی حسنِ دلبری نہ ہوا
تشنہ لب، گام گام ٹوٹا ہوں — دل شکستہ مگر کبھی نہ ہوا
ظرفِ مے آزما کے دیکھ لیا — جام مے جام بے خودی نہ ہوا
تلخیاں بوند بوند پی لیتا ہوں! — اس کا لہجہ بھی شبنمی نہ ہوا
برقی وہ روٹھ کے گیا ایسے
اس نے پھر ربط باہمی نہ ہوا

جو شہزادے ہیں کیا جانیں کہ سوچ کی کرن کیا ہے — وطن کے دشمنوں سے کیا کہیں حبِ وطن کیا ہے
مرے آئینۂ دل میں ہزاروں رخ ابھرتے ہیں — نزاکت پوچھتی ہے صورتِ گل پیرہن کیا ہے
ہمیں نے حسنِ عالم کو حیاتِ جاوداں بخشی — ہمیں سے پوچھتے ہو، زندگی کا بانکپن کیا ہے
جو دل کے راز ہیں وہ شعر کے سانچوں میں ڈھلتے ہیں — بتائیں کس طرح ہم منزلِ تخلیقِ فن کیا ہے
دلوں میں ہے ہمارے برقی نقشِ عظمتِ آدم
ہمارے سامنے اب رفعتِ دار و رسن کیا ہے

○

عبدالوحید صدیقی

نیرنگ

جمنا کے اس کنارے کو بھی شہر نے اپنے دامن میں سمیٹ لیا تھا اس کے باوجود یہاں کوئی دلکشی پیدا نہ ہو سکی تھی۔ یہ کنارہ اب بھی صبح ہوتے ہوئے اور رات کے آتے آتے بہت سوں کی حاجت براری کے فرائض انجام دیتا اور کنارے پر خود رو خار دار جھاڑیاں پردہ پوشی کو اپنا نصب العین گردانتیں۔ جس کی ٹہنیوں کو چھیڑنے پر بچوں کو ڈانٹا پھٹکارا جاتا غالباً افادیت نے وجود کو تقویت بخشی تھی بچے صبح شام ریت کے ایک صاف ٹیلے پر کھیلنے کے لئے جمع ہوتے جس کو ہر کوئی اُن کا پلے گراونڈ تصور کرتا۔

اللہ رکھا اور دین محمد یہاں کے سب سے پُرانے باسی تھے، زمین کی حفاظت، تھوڑی بہت کاشتکاری اور آس پاس مزدوری پر گزارا کرتے، کاغذی اجارہ داری کے سوا ساری زمین ان کی ملکیت تھی مگر جنگل کی آگ اور شہر کی آبادی کو بڑھتے دیر نہیں لگتی۔

اللہ رکھا اور دین محمد دونوں بھائیوں کو اپنے باپ دادا کی باتیں اچھی طرح یاد تھیں۔ اللہ رکھا کہا کرتا تھا یہاں پر ایسا جنگل تھا لوگ ادھر کو گزرتے ہوئے خوف کھاتے مگر وہ خوف جانوروں کا تھا اب شہر بن جانے کے بعد بات دوسری ہو گئی یہاں پر انسان سازی کے نام پر بھی ایک فیکٹری قائم ہوئی تھی۔ اس کے باپ دادا نے اس کی صفائی، عمارت سازی، مشین اور پودوں کے نصب کرنے میں مہینوں مزدوری کر کے پیٹ بھرا تھا، ان دنوں کا ذکر وہ بہت للچائے ہوئے انداز میں کرتا گویا وہ دن ان کی خوشحالی کے تھے۔

مدت ہوئی دونوں بال بچوں کی بیڑیوں میں گرفتار ہو چکے تھے۔ اللہ رکھے کی گھروالی قریبی گاؤں کے مزدور کی لڑکی تھی ہاتھ پاؤں گٹھیلے اور قد بھی ماشاءاللہ اچھا خاصا اونچا تھا رنگ تو اتنا صاف نہ تھا لیکن شادی کے بعد اس کے چہرے پر کافی رونق آ گئی تھی۔ چند سالوں میں اس نے تین بچے دے ڈالے لیکن کوئی نرینہ نہ تھا شاید عجلت آرزو کی شکستہ تصویر تھی۔

باپ دادا کے زمانہ میں تو لوگ انھیں پوری زمین کا مالک سمجھتے تھے مگر اب ان کے پاس ایک پختہ مکان کے پیچھے تھوڑی سی جگہ پر گارے سے لپی ہوئی اینٹوں کی چار دیواری پر تختوں کی کچی چھت کے سامنے تھوڑی سی انگنائی کے سوا کچھ نہ تھا، ماں ابھی زندہ تھی اس نے بھی گوالوں کی بھینسیں باندھنے کی جگہ کے قریب ایک جھونپڑی ڈال لی تھی جس کی اب وہ مالک بن گئی تھی۔

اللہ رکھا جمنا پار کسی گاؤں میں مزدوری پر گیا، رات کو نہیں لوٹا، کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا، وہ مزدوری کر کے زیادہ تھک جاتا تو رات وہیں قیام کر لیتا دوسرے دن کی مزدوری پوری کر کے واپس لوٹتا، کلو نے رات گئے تک انتظار کیا اور روٹی ہانڈی پر بڑا سا پتھر رکھ کر سو گئی، صبح کے وقت اس کے گھر کے سامنے ایک بھیڑ جمع تھی یہ لوگ ظاہری حال حلیہ سے مزدور پیشہ لگ رہے تھے، شاید یہ لوگ جمع ہو کر ایک ساتھ کسی ٹھیکہ دار کے یہاں مزدوری پر جانے والے تھے۔

گلی کے نکڑ پر لوگوں کی بھیڑ ہر آنے جانے والے کو استفسار کی دعوت دیتی مگر انھیں اپنی ملتبع حیثیت کا احساس وہاں کھڑے نہ ہونے دیتا، کچھ آگے بڑھنے کے بعد کوئی ہم جنس ملتا تو اس سے مسکرا مسکرا کر پوچھتا "کہئے صاحب، آپ کی گلی میں یہ کیا آرائی ہے" "میری گلی کیوں ہوتی، میں تو بہت آگے رہتا ہوں"۔ حالانکہ ان کا گھر اتنا قریب تھا کہ کلن کے بچے پانی کی بھیک مانگنے کے دستک دیتے اور بار بار جھڑکائے جاتے۔

بس اسٹاپ پر بھیڑ تھی، کالج اور اسکول پرنسپلوں کے علاوہ دفتروں کے بڑے بڑے بابو وہاں موجود تھے، آج بات موضوع کلن کا گھر تھا "اس ایک گھر نے سارے محلے کی عزت آبرو پر پانی پھیر دیا ہے"، "سوچئے کس طرح گلی کی نالیوں پر صبح سے شام تک بچوں کو کتوں بٹھائے رکھتی ہے" "ہاں صاحب! بڑی شرمندگی ہوتی ہے جب کوئی کالونی کا رہنے والا ملنے آجاتا ہے"، "کم بخت کا منہ گاکا بنا ہے، جب بولتی ہے پہلے گالی نکلتی ہے" دوسرے صاحب نے اضافہ کیا، تیسرے بابو جی بے تکلفی کے انداز میں بولے "اس کی باتیں اسی وقت سنو جب اللہ رکھا، کالج کا چپراسی عیدو، مسجد کا پہلا فراش، جبو، جس کو کلن کے گھر آنے جانے پر مسجد کی ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا تھا، ہیرالال ٹھیلے والے، مندر کا چوکیدار اور دو ایک یار اور جمع ہوتے ہیں۔" آخر میں ایک صاحب بولے "کیا ہی اچھا ہو، ہم لوگ آپس میں رقم جمع کر کے اس کا کہیں اور بندوبست کر دیں اور یہ جگہ کسی اور مصرف میں لے آئیں۔" اس تجویز پر ایک ساتھ کئی آوازیں اٹھیں۔ "لیکن یہ کیونکر ممکن ہوگا محلہ سدھار کمیٹی کا ایک روپیہ وصول کرنے کے لئے ایک ایک گھر کے دس دس چکر لگانے پڑتے ہیں" بات پوری نہ ہونے پائی تھی کہ بھگدڑ مچی۔ لوگ بس کی طرف دوڑ پڑے۔ بابو جی کے بیگ کی کیل سے کسی برقعہ پوش کا برقعہ الجھ گیا وہ گرتے گرتے سنبھلنے کو تھیں کہ پیچھے سے کسی صاحب نے دھکا دیا وہ لڑکھڑا کر گر پڑیں۔ بس جا چکی تھی وہ برقعہ جھاڑ کر ایک ہلکی رنگ کی ساڑی میں ملبوس عورت کے پاس جا ہوئیں اور تیز تیز نہ معلوم کیا کیا کہے جا رہی تھیں۔

دس گیارہ کا عمل ہوگا، اسکول کالج کے بچے اور دفتروں کے بابو حضرات تمام جا چکے تھے۔ کچھ لوگ ایک چارپائی پر کچھ اٹھائے ہوئے دور سے آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ قریب پہنچنے پر معلوم ہوا کہ رات گھر لوٹتے ہوئے جمنا کی ٹھنڈ پر اگی جھاڑیوں کے قریب اللہ رکھا مردہ پایا گیا، ناخن آنکھوں کے نیلے پن کو دیکھ کر لوگوں نے اندازہ لگایا کہ کسی زہریلے جانور نے کاٹ کھایا ہے۔

لاش پہنچتے ہی ایک کہرام مچ گیا کلن دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی اس کی آواز میں بہت سی آوازیں شامل تھیں، بہت سے لوگ دور دور سے ایک نظر غلط انداز ڈالتے نکلے جا رہے تھے۔ گرمی کے دن تھے لوگوں نے اللہ رکھا کو دوپہر سے پہلے پہلے نہلا دھلا دوپہر کی نماز میں شریک کر دیا۔ امام صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی اور دو چار دعائیہ کلمات کہہ کر حجرے میں چلے گئے، کبھی کبھی وہ جنازے پر بہت لمبی دعا کرتے اور قبرستان تک ساتھ بھی جاتے۔

اللہ رکھا بغلی قبر میں رکھا جا چکا تھا، جنازہ میں شریک ہونے والوں میں کچھ مزدور پیشہ، دو چار چپراسیوں اور چوکیداروں علاوہ کوئی نہ تھا۔ قبرستان سے لوٹنے کے بعد سب نے کلن کو تسلی دی، ہر کسی کی بات سن کر وہ ایک بار اپنی تینوں بچیوں پر پُرمتاہ نظر ڈالتی جن کے آنسوؤں کے سوتے روتے روتے خشک ہو چکے تھے اور معصوم آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔

کلن کی چوڑیاں ٹوٹ چکی تھیں، اس کے جسم پر اب چھوٹے چھوٹے پھولوں کی چھینٹ کا سوٹ نہ تھا اس کو بھرکٹ میلے کپڑے دیئے گئے تھے، چار ماہ دس دن اس نے بغیر کسی سنگھار کے گزارے ان دنوں اللہ رکھا کے دوستوں اور کلن کے جان پہچان والوں کی آمد و رفت کچھ زیادہ ہو گئی تھی مگر وہ اس سے مل نہ سکتے تھے، عیدو، جبو، ہیرالال، جو کوئی آتا چاول، آٹا، دال کچھ نہ کچھ ساتھ ا

عدت پوری ہو چکی تھی، کلن کے ہاتھوں پر ہری چوڑیاں اچھی لگ رہی تھیں، اس نے ہرا سوٹ بھی پہنا تھا، اڑوس پڑوس کے لوگوں سے کپڑے پہننے کا اس کا مذاق اچھا ہو گیا تھا، گو وہ اپنی خواہش کو اصلی روپ نہیں دے سکتی تھی مگر منت کا ہرا جسم چینٹ کے سوٹ کو سلک سوٹ سے زیادہ جاذب نظر بنا کر پیش کرتا۔

آج دعوت تھی، بھائی برادری کے لوگوں کے علاوہ جان پہچان کے اکثر لوگ شامل تھے۔ اس دعوت کے لئے کلن یا اس کے دیور کو کچھ نہ کرنا پڑا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ ساری تیاریاں آج کی خوشی کے لئے بہت پہلے سے مکمل ہو چکی تھیں۔

چارپائی پر بیٹھ کر ہیرالال، جبو اور عیدو ایک بڑے پیالے سے بڑی بڑی بوٹیاں نکال کر اپنے بائیں ہاتھ پر رکھی روٹی پر رکھ کر توڑ توڑ کھا رہے تھے، ہیرالال گوشت کا زیادہ شوقین تھا۔ کلن کے ہاتھ کا بنا گوشت وہ بڑے مزے سے کھاتا۔ گاؤں میں آبادی مسلمانوں کی زیادہ تھی وہ بچپن سے دوستوں کے ساتھ گوشت کا عادی ہو گیا تھا، کبھی کبھی وہ اپنے گاؤں کو شہر کے غاصبانہ طور پر ہڑپ کر لینے پر غصہ کا اظہار کرتا اس لئے کہ اس کی نوعمری اور دیہاتیت آج کی شہریت اور ادھیڑ عمری سے بہت مختلف تھی۔

رات گئے تک یہ لوگ گپیں ہانکتے رہے۔ گلی کے دونوں کناروں پر چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں، آج کلن کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی وہ اپنی بہنوں اور دیورانی کے ساتھ ایک چارپائی پر بیٹھی تھی، ہر کوئی کلن سے باتیں کرنا چاہتا، چار ماہ کے بعد آج سب کو اس سے ہنس بولنے کا موقع ملا تھا وہ ہر ایک کو مسکرا مسکرا کر جواب دیتی، بچیاں بار بار نظریں اٹھا کر ماں کو دیکھتیں اور پھر نگاہیں نیچی کئے چارپائی کی بان کریدنے لگتیں، سب سے چھوٹی بچی ننھی ماں کی گود میں سر دے کر سو گئی تھی۔

ایک بجنے کو تھا، ہیرالال نے عیدو سے کہا، ابے چل، رات ہو رہی، بچوں کو سونے دے۔ سب ایک ایک کر کے کھڑے ہوتے گئے اور دھوتی کی گانٹھیں کھول کھول کر بچیوں کے ہاتھوں میں اپنی بند مٹھیاں دیتے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے، کلن نے سب کو مسکراہٹ آمیز سلام کے ساتھ رخصت کیا۔

بس اسٹاپ پر لوگ جمع تھے اکثریت سفید پوشوں کی تھی، کوئی کہہ رہا تھا۔ اللہ رکھا مر گیا مگر کم بخت کلن کی چارپائیاں اب بھی ہمیشہ کی طرح رات رات تک آباد رہتی ہیں" ذلیل ہے، کتیا ہے منہ کالا کیا کرتی ہے" دوسرے نے کہا۔ ہیرالال کو پتہ نہیں کیا بات لگی ہے سالا روزانہ رات کو موجود، عیدو نے عشاء کی نماز پڑھی اور بیڑی کا بنڈل ہاتھ میں تھامے پہنچ گیا اور نہ معلوم کتنے سالے اوباش اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ ایک صاحب اور بولے "ان ذلیلوں سے کوئی کچھ کہہ کر کیوں اپنی عزت کا خطرہ مول لے، بس آتی دکھائی دی۔ بھگدڑ مچی۔ ہر طاقتور کمزور کو دھکا دے کر بس میں پھلانگ جاتا تھا۔ عورتیں بھی جو بھیڑ دیکھ کر دو بسیں چھوڑ چکی تھیں اب طاقت آزمائی پر آمادہ نظر آتی تھیں اور مردوں کے ہاتھ جابے جا بڑھ جانے پر بھی اب وہ پہلے جیسا احتجاج نہ کرتی تھیں، پرانے رکھ رکھاؤ کے ایک بزرگ عورتوں کے لحاظ میں پیچھے رہ گئے تھے، چلتی بس میں چڑھتے ہوئے توازن کھو بیٹھے، کپڑے جھاڑتے ہوئے کہنے لگے، اہلیہ دواخانہ میں شریک ہے نہ معلوم دوسری بس کب آئے، مریضوں کو دیکھنے کا وقت ختم ہو جائے گا تو گیٹ بند ہو جائے گا وہاں ان کو انتظار ہوگا وہ اس دوران بار بار جیب پر ہاتھ پھیرتے رہے۔

دن کو ہر کوئی روزی روٹی کی تلاش میں سرگرداں رہتا اور شام کو یہ لوگ کلن کے گھر جمع ہوتے، یہ معمول مدتوں سے جاری تھا، آج رات میں بات کا موضوع نیا تھا۔ "چھٹو شادی ہو گئی ہے" ہیرالال نے کہا، ابے عیدو اپنے لونڈے رمضانی سے کیوں نہیں بیاہ دیتا۔ "بھو کر کا سوال ہے" میرا لونڈا اچھا نہیں" عیدو نے کہا۔ "پھر ہاتھ پاؤں کا مضبوط ہے اور کیا چاہئے، اگلے سوموار کو بات پکی ہو جاوے شادی ہو گئی ہے پورے سال بھر کا بھی تو فرق نہیں، یہ بھی ساتھ ساتھ نمٹ جائے، میرے جی پر بڑا بوجھ ہے۔" کلن نے

آہستہ آہستہ دھیمی آواز میں کہا۔ کلن کے لئے یہ لوگ سب کچھ تھے۔ عیدو نے یہ سن کر کہا "عبو! تیرے چھوٹے کی کیا عمر ہے کا ہوگا، تو کیا بڈھا کر کے بیاہ کرے گا۔ بنو بھی چودہ کی ہے چھوٹے کو کپڑے کا نیا جوڑا سلوا دے، اگلے سوموار کو بھائی لوگوں کو بلوا لے، اس نیک کام سے بھی نمٹ جائیں گے"۔

ابھی سورج نے پوری طرح اپنا منہ نہیں چھپایا تھا، وقت سے پہلے چارپائیاں گلی کے دونوں کناروں پہ بہتی گندی نالیوں جن نالیوں پر کبھی چھمو اور بنو بھی اکثروں بیٹھی نظر آتی تھیں دونوں جانب چارپائیوں پر گودڑ نما گدے جن پہ بیٹھے داستے کپڑے گئے تھے، پائینتی پر چھینٹ کی رضائیاں تھیں اور بیچ میں ایک ایک صندوق سوار تھا جس میں دو ایک جوڑے کپڑوں کے علاوہ کھانا نقاب پوش پیتل کے چند زیور بھی دکھائی پڑتے تھے، چارپائیوں کے سرہانے ایک بے ہنگم موچھوں والا اس بے دردی سے ڈھول تھا جیسے کوئی میواتی ملا مکتب کے کسی بچے کو دھن رہا ہو۔

ماں کے چہرے پر خوشی و غم کی ملی جلی کیفیت دکھائی پڑتی تھی، رات ٹھنڈی ہو چلی تھی، ڈھول کا بے ہنگم بول بالا آخر دم سادھ چکا تھا، دولہے والے ادھ رنگے کپڑوں کے ساتھ دلہنوں کو لئے پیدل روانہ ہو گئے۔

رات ڈھلے مسکراتی فضا میں گوٹے اور گلکاری زدہ دوپٹوں کے پیچھے تک نظریں اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود پہنچ نہ پائیں البتہ کھو کھلے گھنگھروں کی صدا کانوں کے پردوں سے دیر تک ٹکراتی رہی، کل پھر سورج نکلے گا اور رات کی پچھلی پہر کی مسکراہٹ کردے گا، گوٹ اور ٹکلیوں کی چمک ماند پڑ جائے گی اور گلابی دوپٹوں کی رنگت بہہ کر نہ جانے کیا روپ دھارے گی۔

تقریباً پورے ایک ماہ بعد دونوں بہنیں اپنی ماں سے ملنے کے لئے آئی تھیں، شام کی اگلی گھڑیوں میں سب لوگ پہ اپنا دربار لگا چکے تھے، کلن سے باتوں کے دوران ایک داماد نے گلی میں سے گزرتے ہوئے ایک سفید ریش بزرگ کے بارے کلن نے بزرگ کی طرف حقارت آمیز نگاہیں اٹھائیں "یہ بڑے میاں اور ان کے بچے بستی کے مہاجن کہلاتے ہیں۔ ماں بھائی! مٹھوں نوٹ کماتے ہیں ہشتی نے ایک دن دو پیسے مانگے تھے۔ بڈھے نے سیری کچی کہ ایک موٹی سی گالی دی اور کمر پر اپنی لٹھیا خدا غارت کرے۔ آدمی تو بھلے مانس لگتے ہیں۔" داماد نے مزید جرح کی۔ اس پر کلن نے کہا "یہاں سب بھلے مانس رہتے ہیں" نے بتانا شروع کیا۔ وہ اگلی والی کوٹھی پروفیسر صاحب کی ہے اس سے پرے کوئی اور سیر اپنا بنگلہ بنا رہا ہے۔ کل تک جو میگوئیاں ہوتی تھیں کہ فلاں صاحب ان کی فیس دیا کرتے تھے اور فلاں نے کپڑے بنوا دئے تھے۔ اللہ اللہ کر کے پڑھائی ختم کرنے کے بعد نوکری ملی۔ نوکری کیا ہے۔ اللہ سب کو دے، علاؤ الدین کا چراغ ہاتھ آگیا ہے۔ سال بھر بھی پورا نہیں ہوا کی کوٹھی تیار، لوگ کہتے ہیں کرسی بڑی نہیں ہے۔ خدا کی دین بڑی ہے۔ دن میں صرف دو دو کام کرتے دکھائی دیتے ہیں اور اینٹ روڑا۔ خدا معلوم رات کو کس گھڑی نازل ہو جاتا ہے۔" یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ جاکٹ پہنے ہوئے ایک ہاتھی پیکر شخص آداب عرض "حضور کہاں رہے" بڑے دنوں میں درشن ہوئے، دونوں دو قدم آگے بڑھے تھے کہ کسی نے السلام علیکم کہہ کر مخاطب کیا، اس نے اپنی موٹی گردن کو زور دے کر موڑا، مسکرایا اور بس۔ کلن سے دوسرے داماد نے پوچھا "یہ موٹا آدمی" کلن نے کہا "خدا ہر کسی کو ایسا ہی دے۔ ہائی اسکول پاس ہے گاؤں کے نکڑ پر چنگی وصول کیا کرتا تھا۔ بنو کے دلوا کہا کرتے تھے انسان سازی کے نام پر جب فیکٹری قائم ہوئی اس کو منشی رکھ لیا گیا تھا، دیکھتے دیکھتے ہڈیوں پہ تہہ جمنے لگی اور کھال آگیا پہلا شخص جس نے حضور، حضور کہہ کر آداب عرض کیا تھا وہ کالج کے پروفیسر ہیں اور اس کے کرایہ دار ہیں دوسرے

ہیں بڑے افسر ہیں ابھی حیدرآباد سے تبادلہ ہوا ہے مسلمانوں کے ماحول میں رہنے کے عادی تھے وہ بھی منشی جی کے کرایہ دار ہیں۔
رات کافی گزر چکی تھی۔ تارے ٹوٹنے لگے تھے صبح دونوں بہنیں اپنی اپنی گاؤں چلی جائیں گی۔ ماں نے کہا۔ دو چار گھنٹے سو لو۔ یہ سن کر سب اٹھ کھڑے ہوئے، چھمو اور بتو اپنی ماں کے ساتھ جمنا کے کنارے جھاڑیوں کی طرف گئے اور تھوڑی دیر بعد آکر سو رہے۔

پو پھٹتے چھمو اور بتو اپنے اپنے شوہروں کے ساتھ چلی گئیں، جبو اور عیدو چند مہینوں کے فاصلے سے خاک کا پیوند بن چکے تھے گھروں میں کھٹ پٹ ہوتی رہتی ہے اب کی بار بات کچھ زیادہ بڑھ گئی۔ اس بار کلن اپنی دیورانی کی حمایت بھی کھو چکی تھی، دیور نے اس کو گھر بدر کر دیا۔ وہ شمی کو لے کر ہیرالال کے گھر رہنے لگی۔ ہیرالال کی بھی کمر دوہری ہو گئی تھی، بڑھیا بہت پہلے جمنا کی نذر چڑھ چکی تھی اس کا اکلوتا لڑکا جوہری کسی مل میں ملازم ہو گیا تھا، جب سے کلن اور شمی ان کے گھر رہنے لگیں۔ یہ رات کو دیر سے گھر آنے لگا تھا۔ باپ نے دو ایک بار پوچھا تو کہہ دیا کہ مل میں کام بڑھ گیا ہے۔ مالک چھٹی دیر میں دیتا ہے اس پر بوڑھے ہیرالال نے کہا تھا ہاں بیٹا۔ نوکری نوکری ہی ہے۔

رات دن آنکھ مچولی کھیلتے رہے، کلن دال روٹی پکا لیتی اور حقہ بھر کر ہیرالال کے آگے سرکا دیتی۔ ایک رات سو کر اٹھے تو جوہری اور شمی غائب تھے۔ بوڑھا ہانپ ہانپ کر جوہری کو گالیاں دے رہا تھا۔ "سالے کو گولی مار دوں گا"۔ کلن جھونپڑی کے ایک کونے میں گھٹنوں پر ہاتھ اور ہاتھوں پر ٹھوڑی ٹیکے ہوئے غمگین بیٹھی تھی۔ آج گھر میں روٹی نہیں پکی۔ دوسرے دن ہیرالال نے اپنے ہاتھ سے سبزی روٹی پکائی اور منت سماجت کر کے نڈھال بھوکی کلن کو کھلائی۔ تیسرے دن سے کلن خود روٹی پکانے لگی تھی۔ ابھی چند دن گزرے تھے کہ رات کو جھونپڑی سے صدائیں اٹھتی سنائی دینے لگیں، اے بھگوان! اے خدا! ہماری کوکھ بھر دے، ہمارے بچھڑوں کو لوٹا دے، ہم سب بے قصور ہیں، ان کا بھی کوئی دوش نہیں۔

آندھی اور طوفان ختم ہو چکا تھا، رات تاریک تھی، بجلی چمک رہی تھی، ہلکی ہلکی بوندا باندی جاری تھی، کلن اور ہیرالال اپنی اپنی کھاٹوں پر سمٹے بیٹھے تھے اچانک ٹارچ کی تیز روشنی جھونپڑی میں داخل ہوئی دوسرے لمحے کلن چلا اٹھی۔ "شمی، میری شمی" اور اس سے چمٹ گئی۔ بوڑھا ہیرالال لرزتے کانپتے ہانپتے چارپائی کی پائینتی پکڑ کر اٹھنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ جوہری نے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ باباجی بیٹھے رہیے۔ نہیں بیٹا، نہیں بیٹا کہہ کر ہیرالال اٹھا اور لرزتے ہاتھوں سے اس نے اپنے جوان بیٹے کو سینے سے لگا لیا۔ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کہہ نہ سکا۔ ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑی۔ آخری ہچکی لی اور دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔ جوہری نے ایک چیخ ماری اور زار و قطار رونے لگا۔ یہ دیکھ کر کلن اور شمی دوڑ پڑے۔ کلن نے ہیرالال کے ہاتھ پاؤں سیدھے کئے۔ شمی نے اپنے دوپٹے سے جوہری کے آنسو پونچھے، راتوں رات تینوں نے مل کر ہیرالال کا کریا کرم کیا۔ اب یہ لوگ جھونپڑی میں نہیں رہتے۔ کسی مشن کی پختہ عمارت میں منتقل ہو گئے ہیں ——

نئے افسانے کو جس طرح سہل نگاری کا کھیل سمجھ لیا گیا۔ یہ سلوک شاید نئی شاعری کے ساتھ بھی نہیں ہوا۔ میرے خیال میں تو نئی کہانی کے لئے جس ذہنی تربیت، وسیع مطالعہ، گہرے مشاہدے اور روایت کے بھرپور شعور کے ساتھ زبردست تخلیقی صلاحیت کی ضرورت ہے، وہ روایتی افسانے کے لئے اتنی ضروری نہیں —— ہمارے نئے افسانہ نگار اپنے مطالعہ اور تخلیق دونوں کا آغاز نئی کہانی سے کرتے ہیں۔ "ابوالکلام قاسمی"

سب رنگ

اس عنوان کے تحت ہند و پاک کے معیاری اد
سے مضامین نظم و نثر کا انتخاب شائع ہوا کر
ا

فیض احمد فیض

عہدِ طفلی سے عنفوانِ شباب تک

مظفر الحسن سے گفتگو

ہمارے شعراء کو مستقلاً یہ شکایت رہی ہے کہ زمانے نے ان کی قدر نہیں کی۔ ناقدری ابنائے وطن ہماری شا
مستقل موضوع ہے۔ ہمیں اس سے اُلٹ شکایت یہ ہے کہ ہم پہ لطف و عنایات کی اس قدر بارش رہی ہے
کی طرف سے، اپنے ملنے والوں کی طرف سے اور ان کی جانب سے بھی جن کو ہم جانتے بھی نہیں کہ اکثر ندامت ہوتی ہے
دہش کا مستحق ہونے کیلئے جو تھوڑا بہت کام ہم نے کیا ہے۔ اس سے بہت زیادہ ہمیں کرنا چاہیئے تھا۔

یہ کوئی آج کی بات نہیں ہے۔ بچپن ہی سے اس قسم کا تاثر رہا ہے۔ جب ہم بہت چھوٹے تھے۔ اس
پڑھتے تھے۔ تو اسکول کے لڑکوں کے ساتھ بھی کچھ اسی قسم کے تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ خواہ مخواہ انھ
اپنا لیڈر تسلیم کر لیا تھا۔ حالانکہ لیڈری کی صفات ہم میں نہیں تھیں۔ یا تو آدمی بہت لٹھ باز ہو کر دوسرے
مانیں یا وہ سب سے بڑا فاضل ہو۔ ہم پڑھنے لکھنے میں ٹھیک تھے۔ کھیل بھی لیتے تھے لیکن پڑھائی میں ہم نے کو
پیدا نہیں کیا تھا۔ کہ لوگ ہماری طرف متوجہ ہوں۔

بچپن کا میں سوچتا ہوں تو ایک یہ بات خاص طور سے یاد آتی ہے کہ ہمارے گھر میں خواتین کا ایک ہجوم
تین بھائی تھے۔ ان میں ہمارے چھوٹے بھائی (عنایت) اور بڑے بھائی (طفیل) خواتین سے باغی ہو کر کھیل
رہتے تھے۔ ہم اکیلے ان خواتین کے ہاتھ آ گئے۔ اس کا کچھ نقصان بھی ہوا اور کچھ فائدہ بھی۔ فائدہ تو یہ ہوا کہ ا
ہم کو انتہائی شریفانہ زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا۔ جس کی وجہ سے کوئی غیر مہذب یا اُجڈ قسم کی بات اس
ہمارے منہ سے نہیں نکلتی تھی۔ اب بھی نہیں نکلتی۔ نقصان یہ ہوا، جس کا مجھے اکثر افسوس ہوتا ہے کہ بچپن میں کھ
بھی ایک طرح کے لہو و لعب کی زندگی گزارنے سے ہم محروم رہے۔ مثلاً یہ کہ گلی میں کوئی پتنگ اڑا رہا ہے۔
کھیل رہا ہے، کوئی لٹو چلا رہا ہے۔ ہم بس کھیل کو دیکھتے رہتے تھے۔ اکیلے بیٹھ کر ہوتا ہے۔ شب و روز تم
آگے، کے مصداق ہم ان تماشوں کے صرف تماشائی بنے رہتے اور ان میں شریک ہونے کی ہمت اس لیے نہیں
ایسے مشاغل یا شریفانہ کام نہیں سمجھتے تھے۔

اساتذہ بھی ہم پر مہربان رہے۔ آج کل کا میں نہیں جانتا، ہمارے زمانے میں تو اسکول میں سخت پٹ

ہمارے عہد کے استاد تو نہایت ہی جلاد قسم کے لوگ تھے۔ صرف یہی نہیں کہ ان میں سے کسی نے ہم کو ہاتھ نہیں لگایا۔ بلکہ ہر کلاس میں ہم کو مانیٹر بناتے تھے بلکہ ساتھی لڑکوں کو سزا دینے کا منصب بھی ہمارے حوالے کرتے تھے۔ یعنی فلاں کو چانٹا لگاؤ، فلاں کو تھپڑ مارو۔ اس کام سے ہمیں بہت کوفت ہوتی تھی اور ہم کوشش کرتے تھے کہ جس قدر بھی ممکن ہو یوں سزا دیں کہ ہمارے شکار کو وہ محسوس نہ ہو۔ طمانچے کی بجائے گال تھپتھپا دیا۔ یا کان آہستہ سے کھینچ وغیرہ کبھی ہم پکڑے جاتے تو استاد کہتے یہ کیا کر رہے ہو زور سے چانٹا مارو۔

دو تاثر بہت گہرے ہیں۔ ایک تو یہ کہ بڑوں کی جو دلچسپیاں ہوتی ہیں۔ ان سے محروم نہ رہے۔ دوسرے یہ کہ اپنے دوستوں، ہم جماعتوں اور اپنے اساتذہ سے ہمیں بے پایاں شفقت اور خلوص ملا جو بعد کے زمانے کے دوستوں اور معاصرین سے ملا اور آج بھی مل رہا ہے۔ صبح ہم اپنے ابا کے ساتھ فجر کی نماز پڑھنے مسجد جایا کرتے تھے۔ معمول یہ تھا کہ اذان کے ساتھ ہم اٹھ بیٹھے، ابا کے ساتھ مسجد گئے۔ نماز ادا کی اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ مولوی ابراہیم میر سیالکوٹی سے جو اپنے وقت کے بڑے فاضل تھے۔ درس قرآن سنا، ابا کے ساتھ ڈیڑھ دو گھنٹے کی سیر کیلئے گئے۔ پھر اسکول رات کو ابا بلا لیا کرتے خط لکھنے کیلئے اس زمانے میں انھیں خط لکھنے میں کچھ دقت ہوتی تھی۔ ہم ان کے سکریٹری کا کام انجام دیتے تھے۔ انھیں اخبار بھی پڑھ کر سناتے تھے۔ ان مصروفیات کی وجہ سے ہمیں بچپن میں بہت فائدہ ہوا۔ اردو انگریزی اخبارات پڑھنے اور خطوط لکھنے کی وجہ سے ہماری استعداد میں کافی اضافہ ہوا۔

ایک اور یاد تازہ ہوئی۔ ہمارے گھر سے ملی ہوئی ایک دکان تھی۔ جہاں کتابیں کرائے پر ملتی تھیں۔ ایک کتاب کا کرایہ دو پیسے ہوتا۔ وہاں ایک صاحب ہوا کرتے تھے۔ جنھیں سب "بھائی صاحب" کہتے تھے۔ بھائی صاحب کی دکان میں اردو ادب کا بہت بڑا ذخیرہ جمع تھا۔ ہماری چھٹی ساتویں جماعت کی طالب علمی میں جن کتابوں کا رواج تھا۔ وہ آج کل قریب قریب مفقود ہو چکی ہیں۔ جیسے طلسم ہوشربا، فسانۂ آزاد، عبدالحلیم شرر کے ناول وغیرہ۔ یہ سب کتابیں پڑھ ڈالیں۔ اس کے بعد شاعروں کا کلام پڑھنا شروع کیا۔ داغ کا کلام پڑھا، میر کا کلام، غالب تو اس وقت بہت زیادہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ دوسروں کا کلام بھی آدھا سمجھ میں آتا تھا۔ اور آدھا نہیں آتا تھا۔ لیکن ان کا دل پر اثر کچھ عجب قسم کا ہوتا تھا۔ یوں شعر سے لگاؤ پیدا ہوا اور ادب میں دلچسپی ہونے لگی۔

ہمارے ابا کے منشی گھر کے ایک طرح منیجر بھی تھے۔ ہمارا ان سے کسی بات پر اختلاف ہو گیا تو انھوں نے کہا کہ اچھا آج ہم تمہاری شکایت کریں گے کہ تم ناول پڑھتے ہو۔ اسکول کی کتابیں پڑھنے کی بجائے چھپ کر انٹ شنٹ کتابیں پڑھتے ہو۔ ہمیں اس سے بہت ہی ڈر لگا اور ہم نے ان کی بہت منت کی کہ شکایت نہ کریں۔ مگر وہ نہ مانے اور ابا سے شکایت کر ہی دی۔ ابا نے ہمیں بلایا اور کہا میں نے سنا ہے۔ تم ناول پڑھتے ہو۔ میں نے کہا جی ہاں! کہنے لگے ناول ہی پڑھنا ہے تو انگریزی ناول پڑھو اردو کے ناول اچھے نہیں ہوتے۔ شہر کے قلعہ میں جو لائبریری ہے وہاں سے ناول لاکر پڑھا کرو۔

ہم نے انگریزی ناول پڑھنے شروع کیے۔ ڈکنس، ہارڈی آخر نہ جانے کیا کیا پڑھ ڈالا۔ وہ بھی آدھا سمجھ میں آتا تھا،

اور آدھا پلّے نہ پڑتا تھا۔ اس مطالعہ کی وجہ سے ہماری انگریزی بہتر ہوگئی۔ دسویں جماعت میں پہنچنے تک محسوس اُستاد پڑھانے میں کچھ غلطیاں کر جاتے ہیں۔ ہم ان کی انگریزی کا درست کرنے لگے۔ اس پر ہماری پٹائی تو نہ اُستاد کبھی خفا ہو جاتے اور کہتے اگر تمھیں ہم سے اچھی انگریزی آتی ہے۔ تو پھر تم ہی پڑھایا کرو ہم سے کیوں پڑ

اس زمانے میں کبھی کبھی مجھ پر ایک خاص قسم کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ جیسے ایک آسمان کا گیا ہے۔ بعض چیزیں کہیں دور چلی گئی ہیں۔ دھوپ کا رنگ اچانک صاف ہو گیا ہے۔ پہلے جو دیکھنے میں آیا تھ بالکل مختلف ہو گئی ہے۔ دنیا ایک طرح کی پردۂ تصویر کے قسم کی چیز محسوس ہونے لگی تھی۔ اس کیفیت کا اب احساس ہوا ہے۔ مگر اب نہیں ہوتا۔

مشاعرے بھی ہوا کرتے تھے۔ ہمارے گھر سے ملحق ایک حویلی تھی۔ جہاں سردیوں کے زمانے میں مشا تھے۔ سیالکوٹ میں نہایت راج نرائن ارمان ہوا کرتے تھے۔ جو ان مشاعروں کے انتظامات کرتے تھے۔ ایک بزر دین مرحوم تھے۔ علامہ اقبال کے دوست، سری نگر میں مہاراجا کشمیر کے میر منشی۔ وہ صدارت کیا کرتے تھے۔ جب د میں پہنچے تو ہم نے بھی تک بندی شروع کر دی اور ایک دو مشاعروں میں شعر پڑھ دیے۔ منشی سراج دین نے ہ ٹھیک ہے تم بہت تلاش سے شعر کہتے ہو، مگر یہ کام چھوڑ دو۔ ابھی تو تم پڑھو لکھو اور جب تمھارے دل او آ جائے تب یہ کام کرنا۔ اس وقت یہ تضییع اوقات ہے۔ ہم نے شعر کہنا ترک کر دیا۔

جب ہم مرے کالج سیالکوٹ میں داخل ہوئے اور وہاں پروفیسر یوسف سلیم چشتی اردو پڑھانے آئے مفسر بھی ہیں۔ تو انھوں نے مشاعرے کی طرح ڈالی اور کہا طرح پر شعر کہو۔ ہم نے کچھ شعر کہے اور ہمیں بہت داد م نے منشی سراج دین کے بالکل خلاف مشورہ دیا اور کہا فوراً اس طرف توجہ کرو شاید تم کسی دن شاعر ہو جاؤ۔ گ لاہور چلے گئے جہاں بہت ہی فاضل اور شفیق اساتذہ سے نیاز مندی ہوئی۔ پطرس بخاری تھے۔ اسلامیہ کا تھے۔ بعد میں صوفی تبسم صاحب آگئے۔ ان کے علاوہ شہر کے جو بڑے ادیب تھے۔ امتیاز علی تاج تھے۔ چراغ حفیظ جالندھری صاحب تھے۔ اختر شیرانی تھے، ان سب سے ذاتی مراسم ہو گئے۔ ان دنوں اساتذہ اور طلبہ کا رشت ساتھ ساتھ کچھ دوستی کا سا بھی ہوتا تھا۔ کالج کی کلاسوں میں تو شاید ہم نے کچھ زیادہ نہیں پڑھا۔ لیکن ان بزرگ اور صحبت سے بہت کچھ سیکھا۔ اُن کی محفلوں میں ہم پر شفقت ہوتی تھی۔ اور ہم وہاں سے بہت کچھ حاصل کر کے ا

ہم نے اپنے دوستوں سے بھی بہت کچھ سیکھا۔ جب شعر کہتے تو سب سے پہلے خاص دوستوں ہی کو سناتے داد ملتی تو مشاعروں میں پڑھتے۔ اگر کوئی شعر خود کو پسند نہ آیا۔ یا دوستوں نے کہا نکال دو تو اُسے کاٹ دیا۔ ایم۔ اے باقاعدہ لکھنا شروع کر دیا تھا۔

ہمارے ایک دوست ہیں خواجہ خورشید انور۔ ان کی وجہ سے ہمیں موسیقی میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ خورشید دہشت پسند تھے۔ بھگت سنگھ گروپ میں شامل ــــ انھیں سزا بھی ہوئی جو بعد میں معاف کر دی گئی۔ دہشت پسند کے موسیقی کی طرف مائل ہوئے ہم دن میں کالج جاتے اور شام کو خورشید انور کے والد خواجہ فیروز الدین مرحوم کی بیٹھ

بڑے اُستادوں کا گانا سنتے۔ یہاں اس زمانے کے سب ہی استاد آیا کرتے تھے۔ اُستاد توکل حسین خاں، اُستاد عبدالوحید خاں، اُستاد عاشق علی خاں، اور چھوٹے غلام علی خاں وغیرہ۔ ان اُستادوں کے ہم عصر اور ہمارے دوست رفیق غزنوی مرحوم سے بھی صحبت ہوتی تھی۔ رفیق لا کالج میں پڑھتے تھے۔ پڑھتے تو خاک تھے۔ بس رسمی طور پر کالج میں داخلہ لے رکھا تھا۔ کبھی خورشید انور کے کمرے میں اور کبھی رفیق کے کمرے میں بیٹھک ہو جاتی تھی۔ غرض اس طرح ہمیں اس فنِ لطیف سے حظ اندوز ہونے کا کافی موقع ملا۔

جب ہمارے والد فوت ہوئے تو پتہ چلا کہ گھر میں کچھ کھانے کو نہیں ہے۔ کئی سال تک در بدر پھرے اور فاقہ مستی کی۔ اس میں بھی لطف آیا۔ اس لئے کہ اس کی وجہ سے تماشائے اہلِ کرم دیکھنے کا بہت موقع ملا۔ خاص طور سے اپنے دوستوں سے کالج میں ایک چھوٹا سا حلقہ بن گیا تھا۔ کوئٹہ کے ہمارے دو دوست تھے۔ احتشام الدین اور شیخ احمد حسین۔ ڈاکٹر حمید اللہ بھی اس حلقے میں شامل تھے۔ ان کے ساتھ شام کو محفل رہا کرتی۔ جوانی کے دنوں میں جو دوسرے واقعات ہوتے ہیں۔ وہ بھی ہوئے۔ اور ہر کسی کے ساتھ ہوتے ہیں۔ گرمیوں میں تعطیلات ہوتیں تو ہم کبھی خورشید انور اور بھائی طفیل کے ساتھ سری نگر چلے جایا کرتے اور کبھی اپنی ہمشیرہ کے پاس لائل پور پہنچ جاتے۔ لائل پور میں باری علیگ اور ان کے گروہ کے دوسرے لوگوں سے ملاقات رہتی۔ کبھی اپنی سب سے بڑی ہمشیرہ کے ہاں دھرم سالہ چلے جاتے۔ جہاں منظرِ قدرت دیکھنے کا موقع ملتا اور دل پر ایک خاص قسم کا نقش ہوتا۔ ہمیں انسانوں سے جتنا لگاؤ رہا اتنا قدرت کے مناظر اور مطالعۂ حُسنِ فطرت سے نہیں رہا۔ پھر بھی ان دنوں میں نے محسوس کیا کہ شہر کے جو گلی محلے ہیں۔ ان میں بھی اپنا ایک حسن ہے۔ جو دریا و صحرا، کوہسار یا سرو و سمن سے کم نہیں۔ البتہ اس کو دیکھنے کیلئے بالکل دوسری طرح کی نظر چاہئے۔

مجھے یاد ہے ہم مستی دروازے کے اندر رہتے تھے۔ ہمارا گھر بالائی سطح پر تھا۔ نیچے بدرو بہتی تھی۔ چھوٹا سا ایک چمن بھی تھا۔ چار طرف باغات تھے۔ ایک رات چاند نکلا ہوا تھا۔ چاندنی بدرو اور اردگرد کے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر پڑ رہی تھی۔ چاندنی اور سائے یہ سب مل کر کچھ عجیب پُر اسرار منظر بن گئے تھے۔ چاند کی عنایت سے منظر کا یہ حصہ عجب تھا اور کچھ عجیب سی قسم کا حسن پیدا ہو گیا تھا۔ میں نے لکھنے کی کوشش بھی کی ہے۔ ایک آدھ نظم میں منظر کشی کی ہے۔ جب شہر کی گلیوں، محلوں اور کٹڑیوں میں کبھی دوپہر کے وقت کبھی شام کے وقت کچھ اس قسم کا روپ آ جاتا ہے۔ جیسے معلوم ہو کوئی پرستان ہے۔ نیم شب چاند، خود فراموشی، بام و در خامشی کے بوجھ سے چور وغیرہ اسی زمانے سے متعلق ہیں۔

ایم اے میں پہنچے تو کبھی کلاس میں جانے کی ضرورت ہوئی۔ کبھی بالکل جی نہ چاہا۔ دوسری کتابیں جو نصاب میں نہیں تھیں پڑھتے رہے۔ اس لئے امتحان میں کوئی خاص اعزاز حاصل نہیں کیا۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ جو لوگ اوّل دوم آتے ہیں۔ ہم ان سے زیادہ جانتے ہیں۔ خواہ ہمارے نمبران سے کم ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ بات ہمارے اساتذہ بھی جانتے ہیں۔ جب کسی اُستاد کا، جیسے پروفیسر ڈکنسن یا پروفیسر ہرنشا چندر کٹّا پا ایسا تھے۔ لیکچر دینے کو جی نہ چاہتا تو ہم سے کہتے کہ ہمارے بجائے تم لیکچر دو ایک ہی بات ہے۔ البتہ پروفیسر بخاری بڑے قاعدے کے پروفیسر تھے۔ وہ ایسا نہیں کرتے تھے۔ پروفیسر ڈکنسن کے ذمے اُنیسویں صدی کا نثری ادب تھا۔ مگر انہیں اس موضوع سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

اس لیے ہم سے کہا دو تین لیکچر تیار کرو۔ دوسرے جو دو تین لائق لڑکے ہمارے ساتھ تھے۔ ان سے بھی کہا دو دو تین تین
بھی تیار کر دو۔ کتابوں وغیرہ کے بارے میں کچھ پوچھنا ہو تو آ کے ہم سے پوچھ لینا۔ چنانچہ ہم استاد ہم امتحان ما۔
ابتدائی شاعری کے دوران میں یا کالج کے زمانے میں ہمیں کوئی خیال بھی نہ گزرا کہ ہم شاعر بنیں گے۔ سیاست وغی
ذہن میں بالکل ہی نہ تھی۔ اگرچہ اس وقت کی تحریکوں، مثلاً کانگریس تحریک، خلافت تحریک یا بھگت سنگھ کی
تحریک کے اثرات تو ذہن میں تھے۔ مگر ہم خود ان میں سے کسی قضیے میں شریک نہیں تھے۔

شروع میں خیال ہوا کہ ہم کوئی بڑے کرکٹر بن جائیں کیونکہ بچپن سے کرکٹ کا شوق تھا۔ اور بہت کھیل چکے
اُستاد بننا چاہیے۔ ریسرچ کرنے کا شوق تھا۔ ان میں سے کوئی بات بھی نہ بنی۔ ہم کرکٹر بنے نہ نقاد اور نہ ریسرچ کیا۔ ا
امرتسر چلے گئے۔ ہماری زندگی کا شاید سب سے خوش گوار زمانہ امرتسر ہی کا تھا۔ اور کئی اعتبار سے ایک تو اس
ہمیں پہلی دفعہ پڑھانے کا موقع ملا بہت لطف آیا۔ ان سے ملنے اور روزمرہ کی رسم و راہ کا لطف، اُن سے کچھ
پڑھانے کا لطف۔ ان لوگوں سے دوستی اب تک قائم ہے۔ دوسرے یہ کہ اسی زمانے میں کچھ سنجیدگی سے شعر لکھنا شروع
امرتسر ہی میں پہلی بار سیاست میں تھوڑی بہت بصیرت اپنے کچھ رفقا کی وجہ سے پیدا ہوئی جن میں محمود الظفر تھے۔ ڈاکٹر
بعد میں ڈاکٹر تاثیر آ گئے تھے۔ یہ ایک نئی دنیا ثابت ہوئی۔ مزدوروں میں کام شروع کیا۔ سول برٹیز کی ایک انجمن بنی تو اس
پسند تحریک شروع ہوئی تو اس کی تنظیم میں کام کیا۔ ان سب سے ذہنی تسکین کا ایک بالکل نیا میدان ہاتھ آیا۔

ترقی پسند ادب کے بارے میں بحثیں شروع ہوئیں اور ان میں حصہ لیا۔ ادب لطیف کی ادارت کی پیشکش
برس اس کا کام کیا۔ اس زمانے میں لکھنے والوں کے دو بڑے گروہ تھے۔ ایک "ادب برائے ادب" والے، دوسرے
برس تک ان دونوں کے درمیان بحثیں چلتی رہیں۔ جن کی وجہ سے کافی مصروفیت رہی جو بجائے خود ایک بہت ہی دلچسپ
تجربہ تھا۔ برصغیر میں ریڈیو شروع ہوا۔ ریڈیو میں ہمارے دوست تھے۔ ایک سید رشید احمد تھے۔ جو ریڈیو پاکستان کے ڈی
دوسرے سومناتھ چب تھے۔ جو آج کل ہندوستان میں شعبۂ سیاحت کے سربراہ ہیں۔ دونوں باری باری سے لاہور کے
مقرر ہوئے۔ ہم اور ہمارے ساتھ شہر کے دو چار ادیب ڈاکٹر تاثیر، حسرت، صوفی صاحب اور ہری چند اختر وغیرہ ریڈیو
اس زمانے میں ریڈیو کا پروگرام ڈائرکٹر آف پروگرامز نہیں بنایا کرتا تھا۔ ہم لوگ مل کر بنایا کرتے تھے۔ نئی نئی باتیں سو
سے پروگرام مرتب کرتے تھے۔ ان دنوں ہم نے ڈرامے لکھے، فیچر لکھے دو چار کہانیاں لکھیں، یہ سب ایک مستقل مشغلہ تھ
چلے گئے تو ہم دہلی جانے لگے۔ وہاں نئے نئے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ دہلی اور لکھنؤ کے لکھنے والے گروہوں سے شناسا
سردار جعفری، جاں نثار اختر، مجاز اور مخدوم مرحوم سے ریڈیو کے توسط سے رابطہ پیدا ہوا جس سے دوستی کے
اور سوچ بوجھ میں طرح طرح کے اضافے ہوئے۔ وہ سارا زمانہ مصروفیت کا بھی تھا۔ اور ایک طرح سے بے

(مجموعۂ کلام "شہرِ نگاراں" سے)

نقد و نظر

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

زنجیرِ زنّار

• مصنف: محمد شمس الدین تاباںؔ • ضخامت: ۲۷۴ صفحات • قیمت: ۱۲ روپیے
• ناشر: ادبستانِ دکن (بہ یادگار حضرت صفی اورنگ آبادی) ۲۰ - ۵ - ۵۲۵ شکر گنج، حیدرآباد۔ ۲۶۵ .. ۵

جناب تاباںؔ ان شعراء میں سے ہیں، جو دورِ نو میں بھی روایتی شاعری کی شمعیں فروزاں کئے ہوئے ہیں۔ ان کے ذوقِ سخن میں وہی رنگ و آہنگ ہے جو صفیؔ اورنگ آبادی اسکول کی خصوصیت ہے۔ ان غزلوں میں نہ تو وہ رومانی تغزل ہے جو ہجر و وصل سے متعلق ہوتا ہے۔ نہ وہ عارفانہ لب و لہجہ جو مابعد الطبیعاتی آہنگ اور گم گشتگی سے وجود پذیر ہوتا ہے۔ جناب تاباںؔ کا یہ مجموعہ غزلوں سے مالامال ہے۔ جو کہ ان کا مخصوص فارم ہے۔ ان کے علاوہ کچھ مواقع پر لکھی ہوئی نظمیں، چند مرثیے اور متفرقات بھی اس کتاب میں جمع کر دیے گئے ہیں۔

تاباںؔ کی شعری کیفیات میں عشقِ حقیقی سے انسلاک ایک نیا رخ ہے۔ ان غزلوں میں اصغرؔ و جگرؔ کا رنگ تو نہیں، ہاں ایک جداگانہ رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ اصغرؔ و جگرؔ کا عشقِ حقیقی صوفیانہ تھا۔ جس میں جزو کے کل میں گم ہونے اور اسی کیفیت و نشاط میں وارداتِ قلبی کا شعری اظہار، رنگِ کلام تھا۔ جب کہ تاباںؔ کا کلام ایک بندۂ محض کا کلام ہے۔ جو معشوقِ حقیقی سے تابِ سخن نہیں رکھتا، بلکہ اس سے نذرِ کرم کا ملتجی ہے

میں نے حضرت تاباںؔ کی غزلیں پہلے اس CONTEXT میں نہیں پڑھی تھیں اور ان سے اس طور پر لطف اندوز نہ ہو سکا تھا۔ اس مجموعہ میں یہ کامل کیفیت سامنے آئی۔ کاش وہ اپنے اس رنگ کو قائم رکھیں اور اس راہ میں مشق و ریاضت سے کمال حاصل کریں۔ یہاں پر اس بات کا اظہار بھی لازم ہے کہ مجموعہ کلام کی تاخیر سے اشاعت کے باعث ان کی کئی غزلیں عمرِ گذشتہ کے لب و لہجہ سے پُر لگتی ہیں۔ یہ اردو کے شاعروں کا مشترکہ المیہ ہے کہ کتابوں کی بروقت اشاعت نہیں ہو پاتی۔ جناب تاباںؔ کے چند اشعار اربابِ ذوق کی نذر ہیں:

• ہمارے قہقہوں میں ہچکیوں کا درد پا جاتے
اگر تم نے سنی ہوتی کبھی خاموشی گویائی

• وہ مہر و ماہ، لالہ و گل سے لے کے کیا کرتے
سجدہ دل کا جس کے ربط ہو اس نقشِ پا کے ساتھ

• سو بار جس کی بزم میں دل ٹوٹتا رہا
پھر ہم وہیں چلے ہیں، اسی حسنِ ظن کے ساتھ

• بچھڑ کے ان سے بڑھا اور رنجِ تنہائی
شریکِ بزمِ جہاں تو رہا مگر تنہا

• حیف اس عمر پہ، اے محتسبِ شہر جو عمر
رنجِ ناکردہ گناہی میں بسر ہو جاتے

اس مجموعہ میں چند پُراثر نعتیں اور اساتذہ کی غزلوں پر تضمینیں بھی شریک ہیں۔ مختلف مواقع پر لکھی ہوئی منظومات، غزل کے جزیرہ جلا وطنی کی کیفیت میں ہیں اگر وہ نہ شریک ہوتیں تو مجموعہ کا تاثر بہتر ہوتا۔ اس کتاب کو بہتر ادارت کی ضرورت تھی۔ یہ بات ہے کہ تاباںؔ کے کلام کی اشاعت مناسب ہوئی اور ایسے ہی اساتذہ کا جو ہمارے شہر میں رونق افروز ہیں، کلام بھی اسی خوش اسلوبی سے چھپے تو یہ اہم بات ہوگی۔ ضخامت کے پیش نظر کتاب کی قیمت کم ہے۔ (اسلم عما

• مصنف: حنیف کیفی • ضخامت: ۲۴۴ صفحات • قیمت: ۱

• ناشر: مصنف، لکچرر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔

اردو شاعری میں سانیٹ

حنیف کیفی کی یہ کتاب ان کے وسیع مطالعہ اور تحقیق کی آئینہ دار ہے۔ اردو سانیٹ کے پس منظر، بناوٹ اور ارتقاء سے بحث کرتی ہے۔ ار ایک مخصوص فارم پر مبنی ہے۔ یہ فارم رومانی شاعری کے دور میں کافی مقبول رہا ہے۔ خصوصاً انگریزی اور فرانسیسی زبان ایک قابلِ ذکر سرمایہ موجود ہے۔ اس علمی کتاب میں حنیف کیفی نے انتہائی احتیاط اور تدقیق کے ساتھ سانیٹ کی ابتدا صورتوں اور اردو میں پہلا سانیٹ اور اردو کے سانیٹوں کا مواد اور ہیئت پر مبنی مطالعہ کیا ہے۔

حنیف کیفی کا طرزِ نگارش بھا ملا اور ادبی ہے۔ کتاب کے لب و لہجہ میں کہیں بلا وجہ وکالت اور بناوٹی یا تمد کا رنگ نہیں ملتا۔ اردو سانیٹ پر شاید ہی اس سے بہتر کام ہو سکے۔ کتاب کی نثر کی ایک مثال ملاحظہ کیجیے:

"اختر شیرانی نے جو سانیٹ بعد میں لکھے ان میں لوان کے ابتدائی سانیٹوں میں ایک نمایاں فرق یہ نظر آتا ہے سانیٹ کی مخصوص ہیئت کو ترک کر کے "اردو سانیٹ" کی نئی ہیئت اختیار کرتے ہیں۔ جس کی ترتیب قوافی "ا ج د د ج، ہ و و ہ، ز ز" ہے۔ کبھی کبھار اپنی پہلی طرز کی طرف بھی مائل ہو جاتے ہیں۔ "شہر د" (باقیات اخ جو ان کے انتقال کے بعد شائع ہوا) کے ایک سانیٹ کو چھوڑ کر، باقی تمام سانیٹ اسی نئی ہیئت کے مطابق ہیں"

یہ کتاب اردو ادب کے ہر طالب علم کے لئے ایک اہم دستاویز ہے اور عمدہ کتابت و طباعت سے آراستہ
(اسلم عم

• ناشر: پرویز ید اللہ مہدی

چوڑی کے غلام

پرویز ید اللہ مہدی دو سال پہلے "چہیتر پہاڑ" کے تحفے کے مزاح میں داخل ہوئے تھے۔ ان کی نئی تخلیق کا نام "چوڑی کے غلام" کا ایک سیلاب بلا ہے۔ جس میں وہ قاری کو بہا لے جاتے ہیں۔ ہارس پلے (HORSE PLAY) اور سلاپ اس (SLAP STICK) کو اردو میں رواج دینے کا سہرا ان ہی کے سر بندھتا ہے۔ "چوڑی کے غلام" موضوعاتی چیز کے مضامین اتنے دلچسپ ہیں کہ انہیں پڑھنے کی طرف طبیعت رجوع کرتی ہے۔ اس مزاح کے سطحی ہونے نہیں مگر آپ قہقہہ لگانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ ان کے نوشہ کو آپ یہ گنگناتے ہوئے پائیں گے ؎

کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے　　جہیز کے نام پہ سسرے کا مال آتا ہے

اور بیاہ والے مشہور زمانہ دھن چھیڑ رہے ہیں "چاند ستارو، پھول برساؤ میرا لنگور آیا ہے۔"

انسداد جہیز تک ہم کے اس مجاہد نے سب کو بہت ہنسایا ہے مگر خود اس کا فنِ مزاح نگاری ترقی کی منزلیں طے کرنے کی بجائے مائل بہ زوال ہوتا جارہا ہے۔ شاید یہ زود نویسی کا شاخسانہ ہو کہ ان کی تیسری کتاب "تو تو میں میں" چھپ کر تیار ہے اور بازار میں آیا ہی چاہتی ہے۔ جوڑی کے غلاموں سے ان کی بے تکلفی حد سے زیادہ ہی ہوگئی ہے کبھی تو انھیں جوتیوں کا ہار پہنایا جارہا ہے اور کبھی تو ان کو جیل بھجوایا جارہا ہے۔ ان غلاموں کو سزا کے طور پر دنگل میں بھی اتارا جارہا ہے "ایک ملاقات"، "عمر بھر کا ساتھ"، "آٹھواں عجوبہ"، "چھیڑ چھاڑ" سے ڈائجسٹ کیے گئے ہیں "کمپارٹمنٹل"، "شادی کا سوٹ"، "جہیز اور اکھاڑہ" بہت اچھے مضامین ہیں۔ (۱۲۸) صفحات کی یہ کتاب خوبصورت طریقہ پر چھپی ہے۔ سید منصور آرٹسٹ کا سرورق پسند کیا جائے گا۔ کتاب نہ پڑھنے کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ کو ہنسنے اور قہقہے لگانے سے نفرت ہے۔ قیمت بھی کوئی زیادہ نہیں صرف (۷) روپیہ۔ ملنے کا پتہ: شالیمار پبلی کیشنز، ترپ بازار، حیدرآباد۔ (۱۲)

(ایس بے صادق)

عشق اور بھگتی

مصنف: عماد الحسن آزاد فاروقی۔ ڈیمائی سائز ۹۶ صفحات۔
قیمت: چھ روپے۔ اشاعت ستمبر ۱۹۷۸ء
ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۲۵

آزاد فاروقی نے زیر نظر کتاب میں مولانا روم اور سری راما کرشنا کے نظریات و اقوال کی روشنی میں خدا سے عشق اور بھگتی کے مظہر جذبات کو سلیس پیرایۂ بیان بخشا ہے۔ مصنف نے "افتتاحیہ" میں لکھا ہے کہ "ہمارا بنیادی مقصد جذبۂ محبت کی تحقیق، اس کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ اور خاص طور سے جذبۂ محبت کی سب سے ارفع شکل "عشق اور بھگتی" سے بحث کرنی ہے۔" عشق اور بھگتی پر چلنے والے، عرفانِ حقیقت کی منزل پر پہنچے ہیں۔ اسلام اور ہندو دھرم میں یہ جذبات روشن تر نظر آتے ہیں۔ قابل مصنف نے چار ابواب میں، انسان کی وجودی کیفیت مولانا روم اور راما کرشنا کی نظر میں دلیلوں اور مثالوں کے ذریعہ واضح کرنے کی سعیٔ مشکور کی ہے۔ ان دو عظیم شخصیتوں نے ایک دوسرے سے مختلف زمانے، مذہب اور ماحول میں مختلف انداز کی زندگیاں گذارتے ہوئے بھی ایک ہی جذبۂ محبت کی معراج کو پہنچ کر، حقیقتِ اعلیٰ کا عرفان حاصل کیا تھا۔ فاضل مصنف نے مولانا روم کی مثنوی اور راما کرشنا کے مشن، عہد اور ان کی زندگی کے مختلف گوشوں پر نظر ڈالتے ہوئے جذبۂ عشق اور بھگتی کے وسیلہ سے معرفتِ الٰہی کے نکات کو روشن کیا ہے۔ مذاہب کے درمیان عشق اور یگانگت اور میل ملاپ کے لئے، ایسی مفید کتابوں کا مطالعہ، سیکولرازم کی روایات کو استحکام بخشنے میں معاون ہوگا۔ امید ہے یہ کتاب اپنی افادیت کے باعث وسیع حلقوں میں پڑھی جائے گی۔

(وقار خلیل)

دوماہی "اندازے"

اردو کی نئی مطبوعات پر تبصروں کے لئے ڈاکٹر عقیل کی نگرانی میں شائع ہو رہا ہے۔ پہلے شمارہ جولائی میں پانچ کتابوں پر تبصرے شامل ہیں، جن کے نام "پرندہ پکڑنے والی گاڑی" (غیاث احمد گدی)، "پتیل کا گھنٹہ" (قاضی عبدالستار)، "دوپہر کا سپاہی" (سلام بن رزاق)، "آمین" (عبداللہ کمال) اور "جدیدیت کی فلسفیانہ اساس" (شمیم حنفی) ہیں۔ علی الترتیب ڈاکٹر عقیل، نجم الکریم، علی احمد فاطمی، شکیل رضا اور علی جاوید کے سیر حاصل تبصرے شامل ہیں۔ دوماہی "اندازے" ڈاکٹر سید محمد عقیل کی نگرانی میں ۳۲ صفحات پر شائع ہوتا ہے، یہ رسالہ انجمن تہذیب نو ۲۷/۲ ہیلٹ، الہ آباد سے طلب کیا جاسکتا ہے۔ (د۔ غ)

اُردو نامہ

اُردو کی علمی ادبی اور تہذیبی خبریں

۲۳ جولائی :۔ ساؤتھ انڈیا اُردو اکیڈیمی کی مجلس عاملہ نے اُردو تعلیم کے مسائل پر غور کیا اور اُردو کو ریاست کی دوسری زبان بنانے کا مطالبہ کیا۔ اکیڈیمی کا جلسہ جناب سید وقارالدین چیف ایڈیٹر "رہنمائے دکن" کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں اکیڈیمی کے نئے انتخابات بھی عمل میں آئے مسز ریم، باگا ریڈی وزیر پنچایت راج سرپرست، کے پربھاکر ریڈی ڈپٹی اسپیکر صدر، سید سکندر شاہ، ڈاکٹر سجن طالب شاہ آبادی نائب صدر، حسن فرخ معتمد تشہیر، مرزا اظہر اللہ بیگ معتمد اور اراکین عاملہ میں ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید، ولی تنویر، میر اعظم علی، اکرام جاوید اور دیگر اصحاب شامل ہیں۔

۳۰ جولائی :۔ اُردو مجلس کا ماہانہ ادبی اجلاس ڈاکٹر مغنی تبسم ریڈر شعبۂ اُردو عثمانیہ یونیورسٹی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ شری ہنپال سنگھ ورما لکچرار ہندی انوارالعلوم کالج نے "ہندی شاعری میں جدیدیت" اور ڈاکٹر یوسف کمال لکچرار زوالوجی عثمانیہ یونیورسٹی نے ملک راج آنند کے انگریزی مضمون "میں ادیب کیسے بنا" کا اُردو ترجمہ سنایا۔ آخر میں محفل شعر ہوئی۔ جناب صلاح الدین نیّر معتمد اُردو مجلس نے شکریہ ادا کیا۔

● ادارۂ ادبیات اُردو کے زیر اہتمام "ایوانِ اُردو" میں "یادِ اقبال" کا علمی اجلاس ڈاکٹر حسن عسکری پروفیسر مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر وحید اختر، ڈاکٹر مغنی تبسم، ڈاکٹر عالم خوندمیری، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد شکیب اور یوسف اعظمی صاحب نے اقبال کے فکر و فلسفہ پر فکر انگیز خیالات کا اظہار کیا۔ جناب منظر مجاز نے اقبال کے فارسی کلام کا منظوم اُردو ترجمہ سنایا۔ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے اس اجلاس کی رپورٹ نشر کی گئی۔ جناب محمد منظور احمد (رکن مجلس مشاورت سب رس) نے معتمدی کے فرائض انجام دیئے۔ جناب سید ہاشم علی اختر معتمد عمومی ادارہ نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔

● ادارۂ قدرِ ادب کی طرف سے ماہانہ "محفلِ دو بیتی" جناب جسونت رائے حنیا کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ کئی شاعروں نے رباعیاں اور غزلیں سنائیں۔

۳۱ جولائی :۔ شریمتی راجیم سنہا ناظم محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ آندھرا پردیش نے اپنے عہدہ کا جائزہ ڈاکٹر ایس، آر باجی کو دیا۔ ڈاکٹر باجی سابق میں مرکزی حکومت کے محکمۂ اطلاعات کے ڈائرکٹر رہ چکے ہیں۔ ریاستی اُردو میقاتی جرائد کی اسوسی ایشن کی طرف سے شریمتی سنہا کی خدمات کے اعتراف میں ایک جلسہ منعقد ہوا اور اُن کی گلپوشی کی گئی۔

● اُردو کے جواں عمر صحافی مسٹر محمود الدین حامد کو سٹی کانگریس آئی کا سکریٹری مقرر کیا گیا۔ مسٹر حامد کی ادارت میں ہفتہ وار اُردو اخبار بھی شائع ہوتا ہے۔

۱۲ اگست : ریاستی وزیر تعلیم مسٹر بی وینکٹ رام ریڈی نے اپنے چیمبر واقع سکریٹریٹ میں اُردو تنظیموں کے نمائندوں سے ملاقات کی اور بتایا کہ اُردو تعلیم کی ضروریات اور دیرینہ مسائل کی عاجلانہ یکسوئی کی جائے گی اور نظم و نسق میں اُردو کے استعمال کا جائزہ بھی لیا جائے گا۔ ریاستی وزیر پنچایت راج مسز ریم باگا ریڈی (نائب صدر اُردو اکیڈیمی) مسٹر عابد علی خاں، مسٹر چندر سری واستو، مسز مصطفےٰ کمال، محترمہ رفیع رؤف، ڈاکٹر وی، رامچندرن ڈائرکٹر اعلیٰ تعلیم، مسٹر شیخ مولا ڈپٹی سکریٹری محکمۂ تعلیمات اور اسٹوڈنٹس لیڈر جمیل پاشاہ اور دیگر افراد نے وزیر تعلیم سے ملاقات کی۔

۲۳ اگست :۔ ریاست کے اہل قلم حضرات سے آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی نے غیر مطبوعہ تخلیقات کی اشاعت کے سلسلے میں طباعت کے لئے گرانٹ کی

نظموں کے باب میں ۱۴؍اگست تک درخواست مع منظومات داخل کرنے کا پریس نوٹ جاری کیا۔

● محفلِ خواتین کا ادبی اجلاس اور مشاعرہ محترمہ ریٹا سیٹھ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ معتمد محفل محترمہ بانو طاہرہ سعید نے خیر مقدم کیا۔ محترمہ یاسمین خسرو نے کہانی سنائی محترمہ فاطمہ عالم علی نے طیبہ خسرو کی کتاب "ابرِ نیساں" پر تاثراتی مضمون پڑھا۔ اس جلسہ میں محترمہ بلقیس علاؤالدین کی بچوں کے لئے انگریزی مطبوعہ کتاب "شنکر اور بہار" کی رسم اجراء شریمتی روڈا مستری کار یاستی وزیر سیاحت و بہبودیٔ اطفال نے انجام دی۔

محترمہ عفت عبدالقیوم کی صدارت میں محفلِ شعر ہوئی جس میں بانو "تاباب" سلطانہ، مظفر النساء ناز، نسیم نیازی اور امجدی بانو شیریں نے کلام سنایا۔

۳؍اگست :۔ قلعہ گولکنڈہ میں "اسماء اردو اسکول" کے افتتاح کی تقریب کو مخاطب کرتے ہوئے جناب عابد علی خان بانی معتمد ادبی ٹرسٹ نے کہا کہ "آزادی کے بعد اردو سے مسلسل ناانصافی کے باعث شمال میں اردو والوں کی نئی نسل اردو سے بے بہرہ ہو گئی ہے مگر حیدرآباد نے دکن میں اردو کے چراغ کو روشن رکھا ہے" مسز سرجناس ریڈی نے جلسہ کی صدارت کی۔ مسز کے پربھاکر ریڈی ڈپٹی اسپیکر بحیثیت مہمانِ خصوصی شریک تھے۔ جناب عابد علی خان نے کہا کہ ریاستی انجمن ترقی اردو نے اردو تعلیم کے فروغ کے لئے ایک قلیل المدتی اور طویل المدتی پروگرام تشکیل دیئے ہیں جن کے تحت ریاست کے اضلاع میں کوچنگ سنٹر کا قیام عمل میں لایا جا رہا ہے۔ موصوف نے اس بات پر زور دیا کہ اگر ہر اردو والا کم سے کم ایک روپیہ اردو تعلیمی فنڈ میں عطیہ دے تو ۵ لاکھ روپیہ کا نشانہ مکمل ہو سکتا ہے۔ مسٹر شیو لال رکن اسمبلی، مسٹر میر احمد علی خاں صدر ریاستی انجمن ترقی اردو، جاوید قادری اور منظور ظفر صاحبان نے بھی مخاطب کیا۔

● زندہ دلانِ حیدرآباد کے زیر اہتمام پہلا طرحی مزاحیہ و طنزیہ مشاعرہ صدر زندہ دلان جناب سجاوت چند کھنہ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جناب عابد علی خان ایڈیٹر روزنامہ "سیاست" مہمانِ خصوصی تھے۔ مسرز گلی نلگنڈوی، مسٹر ہیٹ حیدرآبادی، اسمعیل ظریف، گرگر حیدرآبادی، طالب خوندمیری، مصطفیٰ علی بیگ، اشرف خوندمیری، صبغتہ اللہ بختیارؔ، محمود نشتر، کن پرشاد بھجو لنگیری اور بوگس حیدرآبادی نے کلام پیش کیا۔ سنجیدہ شعراء میں مسرز اختر حسن ناچیز، غیاث متین اور علاء الدین نوید نے بھی طنز و مزاح سے عبارت شعر سنائے۔

۵؍اگست :۔ ریاست میں اردو کو مستحقہ مقام دلانے کے لئے سخت جدوجہد کو ناگزیر بتاتے ہوئے اردو تعلیمی فنڈ میں فراخ دلانہ عطیہ کے لئے اپیل میں مسرز میر احمد علی خان پروفیسر حبیب الرحمٰن، عابد علی خان (انجمن ترقی اردو) نے کہا ہے کہ جامعہ عثمانیہ کی نشاۃ الثانیہ کے لئے اردو کا پہلا ماڈل اولین مرحلہ ہوگا۔ اپیل میں اضلاع کو توجہ دلائی گئی ہے کہ وہ اردو تعلیمی ٹرسٹ سے بھرپور تعاون عمل کریں اور اپنے عطیات اردو تعلیمی فنڈ۔ اردو ہال، حمایت نگر حیدرآباد کے پتے پر روانہ فرمائیں۔

۷؍اگست : انجمن ترقی اردو کی طرف سے "اردو ہال" میں پہلے اردو ماڈل اسکول کا قیام عمل میں آیا۔ بچوں کے تعلیم کی ماہر محترمہ نجمہ عبدالخالق اس مدرسۂ اطفال کی نگران مقرر کی گئی ہیں۔ رسم افتتاح کی خوشگوار تقریب میں ننھے اردو طالب علموں کے علاوہ انجمن ترقی اردو کے احباب معتدد شریک تھے۔

۱۰؍اگست :۔ ڈاکٹر حبیب ضیاء لکچرار اردو کالج کا مقالہ "مہاراجہ سرکشن پرشاد حیات اور ادبی خدمات" کی رسم اجراء اردو ہال میں ڈاکٹر حسینی شاہد پرنسپل اردو اورینٹل کالج نے انجام دی۔

۱۱؍اگست : آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی کی طرف سے ہندوپاک کے نامور شاعر جناب فیض احمد فیض کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ جناب آصف پاشاہ صدر اردو اکیڈیمی نے جلسہ کی صدارت کی۔ جناب بیم باگا ریڈی ریاستی وزیر پنچایت راج و نائب صدر اکیڈیمی نے خیر مقدمی تقریر کرتے ہوئے جناب فیض کو زبردست خراج تحسین ادا کیا۔ اس تقریب میں حیدرآباد کے ادیبوں، شاعروں، اساتذۂ اردو اور محبانِ اردو نے شرکت کی۔ حضرت فیض نے حیدرآباد کے علمی و ادبی ماحول کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ بعض مجبوریوں کی وجہ سے وہ آرزو کے باوجود حیدرآباد نہ

لیے سرزمینِ دکن سے اپنے گہرے تعلق کا ذکر
تے ہوئے بتایا کہ حیدرآباد کی شفقتیں ان
حصر رہی ہیں۔ فیض صاحب نے مخدوم، ڈاکٹر
ر، مولوی عبدالحق اور خلیفہ عبدالحکیم سے اپنی
اقات کی یاد تازہ کی اور دکنی کلچر اور یہاں کے
جی ماحول پر مسرت کا اظہار کیا۔ اس موقع
حضرت فیض نے اپنا کلام بھی سنایا۔ اردو
یڈمی کی طرف سے ان کی خدمت میں اکیڈمی کی
طبوعات جناب عابد علی خاں نے پیش کیں۔
ب سعادت چند کھنہ، جناب اختر حسن اور
ب رشید قریشی نے مہمان شاعر کا خیر مقدم کیا۔ ا
یڈمی کے کتب خانہ اور سرگرمیوں سے واقف
ایا۔

● نظام کالج کے شعبۂ اردو کی طرف سے حضرت فیض احمد فیض کا خیر مقدم کیا گیا۔ پروفیسر بخاری پرنسپل نظام کالج نے صدارت کی۔ ڈاکٹر زینت ساجدہ نے فیض کی شخصیت اور شاعری پر خطاب کیا۔ فیض نے کلام سنایا۔

۱۲ر اگست:۔ انجمن ترقی اردو اور انجمن ترقی پسند مصنفین کی طرف سے اردو ہال میں حضرت فیض احمد فیض کا خیر مقدم کیا گیا۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نائب صدر مرکزی انجمن ترقی اردو نے اس تقریب کی صدارت کی۔ جناب عابد علی خاں شریک معتمد انجمن نے خیر مقدم کیا۔ ڈاکٹر زینت ساجدہ اور تلنگو والوں کی طرف سے مسز ملا ریڈی نے خطاب کیا۔ مختلف علمی و ادبی اداروں کی طرف سے حضرت فیض کی گلپوشی کی گئی۔ اس موقع پر محترمہ ناز صدیقی (بیگم ڈاکٹر مغنی تبسم) کی کتاب ساحر

لدھیانوی شخص اور شاعر کی حضرت فیض کے ہاتھوں رسم اجرا انجام پائی۔ فیض کا خیر مقدم کرتے ہوئے ڈاکٹر گوڑ نے کہا کہ سجاد ظہیر کے بعد شاعروں اور دانشوروں کے بین الاقوامی اجتماعات میں فیض نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ فیض نے حیدرآباد کے ادبی ماحول کو خراجِ تحسین ادا کرتے ہوئے کہا کہ زبان کو سیاسی مذہبی مسئلہ بنا کر اس کی خدمت کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ اردو کے مستقبل سے مایوس نہیں ہیں انگریزی کے چلن کے باوجود اس زبان کا برصغیر میں دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ پاکستان میں اردو کے علمی و ادبی مسائل کے بارے میں بھی فیض نے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور آخر میں حاضرین کے اصرار پر کئی غزلیں اور نظمیں سنائیں۔

● ادارۂ ادبیاتِ اردو کی طرف سے "ایوانِ اردو" میں حضرت فیض کا خیر مقدم کیا گیا۔ جناب ہاشم علی اختر معتمد ادارہ نے گلپوشی کی۔ حضرت فیض نے ادارہ کے کتب خانہ اردو میوزیم اور مرکز خوشنویسی کا معائنہ کیا اور ڈاکٹر زورؔ کی گرانقدر خدمات کو خراجِ عقیدت ادا کیا۔

۱۴ر اگست:۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی طرف سے حضرت فیض کا خیر مقدم کیا گیا۔ ڈاکٹر سیں کے کما صدر شعبۂ انگریزی نے صدارت کی۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ پروفیسر و صدر شعبۂ اردو نے فیض کی شخصیت اور شاعری کو بھرپور خراجِ تحسین ادا کیا۔ محترمہ ناز صدیقی نے گلپوشی کی۔ فیض نے بانیٔ جامعہ عثمانیہ کی اردو خدمات کو خراجِ عقیدت ادا کیا اور اپنا کلام سنایا۔ ڈاکٹر مغنی تبسم نے شکریہ ادا کیا۔

● اردو تعلیمی فنڈ میں جناب ملک رام اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ (پروفیسر جامعہ ملیہ اسلامیہ دلی) نے قیام حیدرآباد کے موقع پر ایک ایک سو روپیے عطیہ جناب عابد علی خاں شریک معتمد انجمن ترقی اردو کے حوالے کیا اور تعلیمی فنڈ کو وقت کی اہم ضرورت قرار دیتے ہوئے اردو دوستوں سے بھرپور معاونت کی اپیل کی۔

۱۷ر اگست:۔ ساؤتھ انڈیا اردو اکیڈمی حیدرآباد یونٹ کی مجلسِ عاملہ کا اجلاس جناب عزیز الدین بخاری کی صدارت میں منعقد ہوا اس موقع پر شہر حیدرآباد کے اردو مدارس کی ناگفتہ بہ حالت کا جائزہ لیا گیا اور ایک قرار داد منظور کی گئی کہ اردو کے تحفظ اور بقا کی ذمہ داری خود اردو بولنے والوں پر عائد ہوتی ہے اس قرار داد میں اردو تعلیمی فنڈ سے اشتراک اور اردو کوچنگ سنٹر نیز ماڈل اسکولوں کے قیام میں انجمن ترقی اردو سے بھرپور تائید کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

۲۵ر اگست:۔ نامور شاعر مخدوم محی الدین کی نویں برسی کے موقع پر آندھرا پردیش سوشل، ایجوکیشنل اینڈ لٹریری اسوسی ایشن (اسپیل) کے زیر اہتمام ایک جلسہ مولانا سید قطب الدین صابری امیر جامعہ نظامیہ کی صدارت

(باقی صفحہ ۲۳ پر)

ہماری جانب سے ہمالیائی مساعی کی ضرورت

بیروزگاری جیسے ہمالیائی مسئلے کے حل کے لیے ہماری جانب سے بھی ہمالیائی مساعی کی ضرورت ہے۔ چنانچہ درپیش چیلنج سے نمٹنے اور روزگار کے مواقعات کے لیے نئے میدان ہموار کرنے میں قوم ہمہ تن مصروف ہے۔ اس ضمن میں ریاستی حکومت نے خاص طور پر کمزور طبقات کی مدد پر زبردست زور دیا ہے۔

چنانچہ پڑھے لکھے بیروزگاروں کو سودمند پیشوں کی عملی تربیت دی جائے گی۔ پہلے مرحلے میں یہ تربیت کمزور طبقات تک محدود رہے گی۔ ۱۵ر اگست ۱۹۷۸ء سے آغاز کردہ ۵ کروڑ روپے مالیت کی خصوصی روزگار اسکیم سے درج فہرست اقوام و قبائل کے بیروزگار میٹریکولیٹس اور گریجوایٹس کو نیز پسماندہ اقوام اور معاشی طور پر پسماندہ افراد کے ایک معقول فیصد کو فائدہ پہنچے گا۔ زیر تربیت افراد کو پرکشش نقد وظائف مارجینل رقم اور کاروبار کی ترقی کے لیے امداد فراہم کی جائے گی۔

اس طرح آج آندھرا پردیش میں بیروزگاروں کے لیے نئے نئے مواقعات کے دروازے کھولے جا رہے ہیں

محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ حکومت آندھرا پردیش حیدرآباد

No:- 18/2149/ADVT/84/78

سن اجراء: ۱۹۳۸ء   فون: ۳۸۴۶۹

بانی نگار
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد

مرتب: وقار خلیل ★ جلد: ۴۱ شمارہ: ۱۰
اکتوبر ۱۹۷۸ء

زرِ سالانہ: ۱۵ روپے
ششماہی: ۸ روپے
فی شمارہ: ایک روپیہ پچاس پیسے

مطبوعہ: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چارکمان حیدرآباد ـ ۲
مقام اشاعت: ادارۂ ادبیات اردو، ایوان اردو، پنجہ گٹہ روڈ
حیدرآباد ۵۰۰۰۰۴

ترتیب

★

تحتانوی تعلیم کے معیار میں بہتری

آندھرا پردیش میں تحتانوی تعلیم کے معیار کو بہتر بنانے کے لئے " ابھودیا پرادھامیکا ودیا سمستھا" کے نام سے ایک خود مختار تنظیم قائم کی جائے گی ۔ یہ تنظیم عوام کی فیاضی اور سخاوت سے اور مذہبی و خیراتی اداروں کے فنڈس سے استفادہ کرتے ہوئے مدرسوں کیلئے درکار اشیاء کی ضروریات پوری کرے گی ۔

ابتدائی مرحلہ میں تقریباً چھ سو مدارس اس تنظیم کے حوالے کرنے کی تجویز ہے تاکہ موزوں عمارتوں اور کھیل کے میدانوں کی فراہمی کے علاوہ ایسے خصوصی تربیت یافتہ اساتذہ کا انتظام کیا جاسکے جو رسمی تعلیم کے ساتھ ساتھ اخلاقی تعلیم بھی دے سکیں جس کی کہ ہماری پروان چڑھتی ہوئی نسل کی کردار سازی کے لئے شدید ضرورت ہے ۔

بلاشبہ " ابھودیا پرادھامیکا ودیا سمستھا" کی تنظیم آندھرا پردیش میں تحتانوی تعلیم کو بہتر سے بہتر معیار عطا کرے گی ۔

محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ
آندھرا پردیش ۔ حیدرآباد

No 21/78-79/2380

اپنی بات

رسالہ 'سب رس' کی مجلسِ مشاورت کی نئی تشکیل عمل میں آئی ہے۔ گزشتہ مجلسِ مشاورت اور اس کے معتمد جناب غلام جیلانی صاحب نے رسالے کے معیار کو بلند کرنے اور اُسے متنوّع بنانے کی طرف خاص توجہ دی تھی۔ اس کی وجہ سے ادبی حلقوں میں 'سب رس' کی مقبولیت میں نمایاں اضافہ ہوا۔ ہم کوشش کریں گے کہ اس روایت کو برقرار رکھیں اور رسالے کو خوب سے خوب تر بنائیں۔

ادارۂ ادبیاتِ اُردو کو یہ فخر اور امتیاز حاصل ہے کہ اس نے بانیٔ ادارہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ مرحوم کی سرپرستی اور نگرانی میں دکنی ادب کے شہ پاروں کو منظرِ عام پر لانے اور دکنی کلچر کی بازیافت کے سلسلے میں نمایاں حصّہ لیا۔ ادارے کا ترجمان رسالہ "سب رس" دکنیات کی اشاعت میں ہمیشہ پیش پیش رہا ہے' آئندہ بھی 'سب رس' کا ایک حصّہ دکنی ادب اور تمدن پر تحقیقی اور تنقیدی مقالوں کے لئے مختص رہے گا۔

زبان کے بغیر کسی کلچر کا تصوّر ممکن نہیں ہے۔ کلچر کی روح کو توانا اور دل کو زندہ رکھنے کے لئے جہاں یہ ضروری ہے کہ اُس کی زبان میں تخلیقی سرگرمیوں کا سلسلہ جاری رہے وہیں اُس کی ذہنی ترقی کے لئے لازمی ہے کہ اُس میں علوم و فنون کا سرمایہ بھی بڑھتا رہے۔ اس مقصد کے پیشِ نظر ہم چاہتے ہیں کہ شعر و ادب کے علاوہ جدید معاشرتی اور طبعی علوم پر عام فہم زبان میں مضامین شائع کریں۔

ہم اُمید کرتے ہیں کہ اہلِ علم اور اہلِ قلم اصحاب ان عزائم کی تکمیل میں ادارۂ 'سب رس' سے بھرپور تعاون کریں گے۔

مغنی تبسّم

سید غوث

مراثیِ انیس میں اخلاقی قدریں

مرزا انیس ان چند گنے چنے شاعروں میں سے ہیں جن کی وجہ سے اُردو شاعری کی آبرو قائم ہے۔ ان کے مرثیوں میں منظر نگاری، جذبات نگاری، کردار نگاری، رفعتِ تخیل، نفسیاتی عناصر کے علاوہ آفاقی اخلاقی قدریں پائی جاتی ہیں۔ "ادب میں کوئی صنف اس وقت عظیم نہیں بن سکتی جب تک کہ اس کا موضوع عظیم نہ ہو"۔ اگر گوئٹے کا یہ مقولہ ٹھیک ہے تو پھر اردو شاعری کے اصناف میں مرثیہ ہی ایک صنف ہے جس کے تعلق سے ہم دعویٰ کر سکتے ہیں کہ اس کا موضوع عظیم ہی نہیں بلکہ عظیم تر ہے کیونکہ شہادتِ امام حسینؑ کا واقعہ وہ ہے جسے دنیا کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ یہ تاریخِ انسانیت کا وہ باب ہے جس کو سنہری حروف میں لکھا جانا چاہیئے۔ حضرت امام حسینؑ کی بنی نوعِ انسان کے لئے ایک نمونہ ہے۔ اور واقعاتِ کربلا خیر و شر کے درمیان ایک تصادم اور یہ حادثہ ہمارے لئے درسِ عبرت ہے۔ ا
موضوع کے لئے انیس نے جو اسلوب اختیار کیا ہے وہ نہایت شاندار پُرشکوہ ہے۔ الفاظ کی موزونیت، محاوروں اور روزمرہ کی خوش بیانی میں جوش یہ اور اسی قسم کی دیگر باتیں ہیں جو انیس کی انفرادیت میں داخل ہیں۔ "انیس کی انفرادیت یہ ہے کہ انہوں نے دبستانِ کا ہی بدل دی، جن باتوں کی وجہ سے دبستانِ لکھنؤ بدنام ہوا، انیس نے انہیں خصوصیات کو اختیار کر کے اس دبستان کو عز و شرف عطا کیا۔ د کی ساری خامیاں انیس کے ہاں خوبیوں کے روپ میں ملتی ہیں"۔ (تنقیدی افکار" ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید۔ صفحہ ۸۹) ——— یوں تو سے شعراء نے لکھے لیکن انہیں کی سی شہرت کا تخت اور ہر دلعزیزی کا تاج کسی کو حاصل نہ ہو سکا۔ اگر میر زمینِ غزل کے چاند ہیں تو پھر یہ ہے کہ انیس بھی آسمانِ مرثیہ کے سورج ہیں۔ انیس کے کلام میں جہاں میر کی غزلوں کا سوز و گداز ملتا ہے وہیں سودا کے قصیدوں کی شا بھی موجود ہے۔ اور میر حسن کی مثنویوں کا رنگ و روپ بھی۔

کسی عزیز یا مذہبی پیشوا یا سیاسی رہنما کی موت پر شاعر اپنے شدید جذباتِ غم کا اظہار کرتا ہے اور مرنے والے کی خوبیاں نظم اس نظم کو مرثیہ کہتے ہیں۔ کچھ خاص اسباب ایسے ہیں جن کی وجہ سے اُردو کے اکثر و بیشتر شعراء نے واقعاتِ کربلا کو اپنے مراثی کا موض اور اپنے لئے وسیلۂ نجات جانا۔

ابتدائی مرثیہ نگاروں کے ہاں فلسفیانہ خیالات اور اخلاقی مضامین کی کمی پائی جاتی ہے۔ اس لئے نہیں کہ ان کے نزدیک مرثیہ صرف رونا اور رُلانا ہی تھا بلکہ اس وجہ کہ ان کا زور زیادہ تر شہادتِ حسینؑ اور ماتمِ حسین پر صرف ہوا۔ اس بارے میں صالحہ عابد حسین "لوگوں کے ذہنوں میں عام طور پر یہ خیال بیٹھا ہوا ہے کہ مرثیے صرف رونے اور رُلانے کے لئے ہوتے ہیں۔ یوں تو ابتدائی زمانے کے

میں بھی شہیدانِ کربلا کی زندگی کے واقعات بیان کئے جاتے تھے۔ اور مثالی کرداروں اور اعلیٰ اخلاقی قدروں کی حامل ہستیوں سے دنیا کو متعارف کرایا جاتا تھا، وہ بجائے خود اخلاقی تربیت کا ایک ذریعہ کہا جاسکتا ہے"۔ (انیس کے مرثیے۔ مقدمہ از صالحہ عابد حسین صفحہ ۵۱)۔ ضمیرؔ اور ان کے بعد کے شعراء نے مرثیہ کو ہر حیثیت سے وسعت دی۔ اس میں منظر نگاری، جذبات نگاری، واقعہ نگاری، نفسیات نگاری، کردار نگاری کے ساتھ ساتھ رحم و کرم، جود و سخا، عفو و بخشش، عشق و محبت، صبر و قناعت، بے ثباتیٔ دنیا، وفا و ایمان، تسلیم و رضا، خاندانی روایات، بزرگوں کا ادب، رشتوں کا خیال، اپنوں کا پاس، قضا و قدر، موت و حیات اور ایسے بے شمار اخلاقی مضامین کو جگہ دے کر جن شعراء نے صنفِ مرثیہ کو اردو شاعری میں اہم مقام دلایا، ان میں انیسؔ اہم ہیں۔

اعلیٰ شاعری کی بنیاد اخلاقی چٹان پر رکھی جاتی ہے۔ جو شاعری بدلتے ہوئے سیاسی و معاشی ریت کے تودے پر رکھی جاتی ہے وہ لمحاتی ہوتی ہے۔ اعلیٰ شاعری سے ہر مذہب و ملت اور ہر عمر کے لوگ نہ صرف مسرت حاصل کرتے ہیں بلکہ وہ اپنی بصیرت میں بھی اضافہ کرتے ہیں۔ اعلیٰ شاعر زمان و مکاں میں رہ کر بھی ان سے پرے رہتا ہے۔ اس کا مقصد انسانیت کی فلاح و بہبود ہوتا ہے۔ وہ اپنی شاعری سے قاری کے دل میں متضاد جذبات ابھارتا ہے اور کبھی دردناک واقعہ یا بھیانک منظر کو اس سلیقہ سے پیش کرتا ہے کہ اس سے قاری کے دل میں دکھ درد کی ٹیسیں اٹھتی ہے۔ اور کبھی حیرت و ہمدردی کا جذبہ ابھرتا ہے۔ شاعری جذبات و احساسات کا کھیل ہے۔ یہ داخلی بھی ہے اور خارجی بھی جس میں وزن و آہنگ، مواد و موضوع اور ان کے تحت اور بہت ساری باتیں اس خوبی اور توازن سے جمع ہو جاتی ہیں کہ شعر میں شعریت آجاتی ہے۔ یہی اچھے شعر کی پہچان ہے۔ معمولی شاعر اخلاقی مضامین شاعری کے احاطے میں لاکر انہیں خشک اور غیر دلچسپ بنا دیتا ہے۔ لیکن ایک اعلیٰ پایہ کا شاعر انہیں مضامین کو اس سلیقہ سے پیش کرتا ہے کہ لطفِ مضمون باقی رہنے کے علاوہ قاری پر بھی ان کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ مرزا انیسؔ کے مرثیوں میں اخلاقی مضامین اس طرح جگہ پاگئے ہیں جس طرح انسان میں روح۔ یہ اسی طرح فطری ہیں جس طرح بہار میں پیڑ سے پتے نکل آتے ہیں۔ ان کے اس قسم کے اشعار بے جوڑ غیر فطری اور خشک نہیں ہیں بلکہ اپنی جگہ جادو جگاتے ہیں۔

"تعلیمِ اخلاق اور انسانی قدروں کی متعدد مثالیں مرثیہ میں ملتی ہیں جن کے نتیجے میں ذہنِ انسانی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ معنیٰ کے اعتبار سے ایک ایک مصرعہ سے گویا اصولِ اخلاق کا ایک ایک سمندر چھلکتا ہے"۔ (میر انیس بحیثیت رزمیہ شاعر، از ڈاکٹر اکبر حیدری صفحہ ۱۰۲)۔ اس قول کی روشنی میں ہم مراثیٔ انیسؔ کا مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ انہوں نے آفاقی اور انسانیت دوست قدروں کو اپنے اشعار میں اجاگر کیا ہے۔ اس ضمن میں دو چار مثالیں دلچسپی سے خالی نہیں۔

حضرت امام حسینؑ اور ان کے ساتھی حق گو اور امر بالمعروف کے پابند تھے۔ ان کا جنگ کرنا اور صلح کرنا، زندہ رہنا اور مرنا سب خدا کے لئے تھا۔ لڑائی میں اپنی طرف سے پہل کرنا ان کے نزدیک شیوۂ مردانگی نہیں تھا اور انہوں نے شر و فساد کو ہر طرح دبانے کی کوشش کی۔ اس کی کئی مثالیں مرثیوں میں موجود ہیں۔ حضرت امام حسینؑ اور ساتھ کے ساتھی میدانِ کربلا میں پہلے پہنچتے ہیں اور ترائی پر اپنا پڑاؤ ڈالتے ہیں۔ یزید کا ایک رئیس اسی وقت وہاں اپنی فوج کے ساتھ پہنچتا ہے اور حضرت علیؑ کے دلبند کو وہاں سے ہٹ جانے کا مطالبہ کرتا ہے۔ اور اپنی فوج کی بڑائی اور طاقت کو بڑے گھمنڈ سے بیان کرتے ہوئے عدم تعمیلِ حکم لڑائی کی بھی دھمکی دیتا ہے۔ اس کی ان بے ادب باتوں کو سن کر حضرت عباس جوش میں آجاتے ہیں مگر حضرت انہیں سمجھاتے ہیں۔

اس کو یوں مخاطب فرماتے ہیں ؎

تم کون ہو حسین سے ہے افتخار خشک و تر — ان کے سوا ہے کون شہنشاہ بحر و بر
دیکھو فساد ہوگا بڑھو گے اگر ادھر — شیروں کا یاں عمل ہے تمہیں کیا نہیں خبر
سبقت کسی پہ ہم نہیں کرتے لڑائی میں
بس کہہ دیا کہ پاؤں نہ رکھنا ترائی میں

ان اشعار سے یہ صاف پتہ چلتا ہے کہ حضرت عباس کو اپنے بھائی سے بڑی محبت و عقیدت تھی ۔ انھیں جہاں اس بات کا پاس و لحاظ تھا کہ حضرت کے سامنے بے ادبی نہ کریں وہاں اس بات کا بھی خیال تھا کہ غیر ضروری طور پر لڑائی جھگڑا نہ ہو ۔ اسی وجہ سے وہ کہتے ہیں "سبقت نہیں کرتے لڑائی میں" موقع و محل وہی ہے ۔ حضرت زینب نے دیکھا کہ حضرت عباس، شمر لعین کی باتیں سن کر جوش میں شیر کی طرح ہیں اور چاہتے ہیں کہ افسر فوج کو اپنی بڑھائی اور گھمنڈ کا سبق دیں ۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ابھی ابھی تلواریں چلنے والی ہیں ۔ اتنے میں کا بروقت ٹوکنا صلح پسند عناصر کا پتہ دیتا ہے ۔

زینب پکاریں پیٹ کے زانو بہ صد ملال — ہے ہے غضب ہوا، اگر آیا انھیں جلال
کہہ دے کوئی کہ اے اسد کبریا کے لال — غربت پہ ابن فاطمہ کی تم کرو خیال
قربان ہوگی نہ لڑائی کا نام لو
میں ہاتھ جوڑتی ہوں کہ غصہ کو تھام لو

اس بند سے حضرت زینب کے کیرکٹر کے علاوہ ان خواتین کربلا کا جنگ کے تعلق سے رویہ کا اظہار ہوتا ہے ۔ لڑائی سے باز آنے کے لئے کس سے سمجھایا جا رہا ہے ۔ خصوصاً آخر کے دو مصرعے تو لاجواب ہیں ۔ اس کے علاوہ اور بھی متعدد بند ہیں جن میں اس بات کی صراحت کی گئی، بند جس میں حضرت امام حسین کے کیرکٹر کی ایک جھلک کے ساتھ ان کی امن پسندی کا اظہار ملتا ہے یہاں درج کیا جا رہا ہے ۔ موقع وہی ہے لیکن اور سننے والے گرمی پیش کرنے کا انداز اچھوتا ہو گیا ہے ۔

بولے یہ بھائی سے لپٹ کر شہ ابرار — تم دھیان کدھر ہو کرتے ہو کن لوگوں سے گفتار
کیا منہ جو ہٹا دیں تمہیں دریا سے ستمگار — لو تھام غصہ کو نہیں کرتے ہو گر پیار
اللہ سزا دے گا انھیں بے ادبی کی
لڑنا ہمیں لازم نہیں امت سے نبی کی

چوتھے مصرع میں "پیار" کے لفظ میں بلاغت، حسن ادا، مناسبت موقع و محل کے ساتھ محبت و گلہ، شکوہ و پیار، دوستی و وفاداری کے کتنے کے بند کو اشارہ میں جو قاری کے ذہن سے کھل جاتے ہیں ۔ بے ادب لشکر یزید کو سزا دینے کا کوئی قصد ہی حضرت امام زماں کے ذہن میں نہ تھا ہر معاملہ کو اللہ پر چھوڑتے تھے ۔ یہی سبب ہے کہ اس موقع پر بھی وہ ان کی نامعقول حرکات، لڑائی کی دھمکی، ترائی سے بے دخل جتلانے کے ساتھ نرمی اور صلح و رحم کا سلوک کرتے ہیں ۔ اس لئے کہ وہ رسول خدا کے نواسے تھے ۔ اس سے بڑھ کر دنیا کے سامنے اور کیا مثال پیش کی جا سکتی جو پیش کیا جا رہا ہے لیکن لڑائی سے انھوں نے ہمیشہ اپنے آپ کو باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی ۔ آخر انھوں نے تلوار اٹھائی تو وہ اپنے دفاع کے ان کے پاس اس کے سوا کوئی دوسرا چارہ کار نہیں تھا ۔ ان کا تو یہ ایمان تھا کہ "ضبط و غضب کو دخل نہ دو حق کی راہ میں" "عدم تشدد کی ایک

برچھیاں تول کے ہر غول سے خونخوار بڑھے　　نیزے ہاتھوں میں سنبھالے ہوئے اسوار بڑھے

تیر جوڑے ہوئے چلوں میں کماں دار بڑھے　　بولے شہ یاں سے ابھی کوئی نہ زنہار بڑھے

اسد حق کے گھرانے کا یہ دستور نہیں

میں نبی زادہ ہوں سبقت مجھے منظور نہیں

کے بعد شاعر نے جو نفسیاتی گل بوٹے کھلائے ہیں وہ انہیں کا حصہ ہے۔ علمدار مبادا ناراض نہ ہو جائیں دلبر مصطفیٰ ان سے کہتے ہیں کہ فوج دشمن شور ہے۔ اس وجہ سے وہ ناحق تم سے فتنہ و فساد کرتے ہیں۔ جاہلوں سے تکرار اور ادنیٰ سے بحث ننگ ہے۔ پس خاموشی ہی ان سب کا جواب ور پھر تم پسر رحیم ہو، خدا تو ہر جگہ ہے، اس میں ترائی یا جنگل کی تخصیص نہیں۔ پھر فلسفۂ بے ثباتی دنیا اس حسن و خوبی سے بیان کرتے ہیں جو درس ق کا اہم جزو ہے۔ اس قسم کے اشعار انیس کے کلام کا بہت بڑا سرمایہ ہیں۔

تھوڑے سے بستروں کی ہے درکار ہم کو جا　　جنگل ہوا تو کیا جو ترائی ہوئی تو کیا

بے عمر بے ثبات زمانہ ہے بے وفا　　آرام کا محل نہیں یہ عاریت سرا

اب وہ کہاں ہیں شہر جنہوں نے بسائے ہیں

سب اس زمیں پہ خاک میں ملنے کو آئے ہیں

پھر اس کا نتیجہ بھی دیکھ لیجئے۔ حضرت عباس میں کیا نظم و ضبط تھا؟ ایک سچے اور بہادر مسلمان سپاہی میں اس کا ہونا ضروری ہے۔ ایک اور ہمدرد بھائی کی کیفیت اور ایک دلیر سپاہی کی عظمت اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتی ہے۔ ایک بہترین سپاہی اپنے بہترین کمانڈر کی بات سن کر نظم و ضبط سے کام لیتا ہے اس کا نقشہ دیکھئے اور انیس کی کردار نگاری پر داد دیجئے جس میں اس باریکی کو دکھایا گیا ہے کہ حضرت عباس علمدار لئے امام جہاں کا کہا پتھر کی لکیر تھا۔ جب حکم ہوتا ہے کہ لڑائی جھگڑے کا نام نہ ہو تو پس ان پر ایک سکتہ سا چھا جاتا ہے۔ البتہ غیض و غضب کے جذبات سرد نہیں ہوئے تھے اس وجہ سے ان میں رعشہ سا آ جاتا ہے۔ اور اپنی جبیں کے شکن اور ابرو کے بل کو اپنے آقا سے چھپانے کے لئے گردن دیتے ہیں۔ گردن کا خم کرنا تسلیم و رضا کا دوسرا پہلو ہے۔ اسی طرح دو متضاد جذبات و کیفیات کے تصادم کے نتیجہ پر ان کی آنکھ سے آنسو ٹپتے ہیں۔ انسانی جذبات کی جس خوبصورتی اور باریک بینی سے شاعر نے تصویر کشی کی ہے وہ بے مثال ہے۔

آقا نے دی جو اپنے سر پاک کی قسم　　بس تھرتھرا کے رہ گیا وہ صاحب کرم

پر تھی شکن جبیں پہ نہ ہوتا تھا غیظ کم　　چپ ہو گئے قریب جب آئے شہ امم

گردن جھکا دی تا نہ ادب میں خلل پڑے

قطرے لہو کے آنکھوں سے لیکن نکل پڑے

جنگ کو ٹالنے کی حضرت امام عالی مقام اور ان کے ساتھیوں نے ہر ممکن کوشش کی۔ لیکن وہی ہونا تھا جو ہوا۔ حق و صداقت کے لئے یں نیام سے نکل پڑیں۔ اس دستور کے مطابق ایک ایک سپاہی ان میں سے نکل آتا ہے اور اپنا حسب نسب بیان کرنے کے بعد دشمن کی فوج مبارز طلب کرتا ہے۔ شہید اعظم کے ساتھیوں میں سے ہر ایک حملے سے پہلے دشمن کے سپاہیوں کو ہر طرح سمجھاتا ہے کہ وہ غیر ضروری لڑائی لڑ کر غیر کو چھوڑ کر شر کا ساتھ دے رہے ہیں۔ یہاں اس کی صرف ایک مثال پیش کی جا رہی ہے۔ حضرت قاسم جب میدان کارزار میں آتے ہیں۔

تو رجز پڑھنے کے بعد دشمن کی فوج پر بڑی نرمی سے اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ یزید اور اس کے ساتھی بہکے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دل زہرا کے در پے جاں ہو گئے ہیں۔ سب کو پانی میسر ہے لیکن دلبند علی پیاسا ہے۔ ایک جان کی خاطر سیکڑوں تیغیں بلند ہیں۔ کیا دنیا میں جہان کی یہی خاطر و مدارت ہوتی ہے۔ حضرت قاسم کی زبانی یہ بند لکھ کر انیس نے خیر و شر کا جو مقابلہ و موازنہ کیا ہے وہ اپنی جگہ بہت اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اس بند میں حضرت رسول کے نواسے حضرت حسینؑ کی سیرت کی ایک اہم جھلک دکھائی گئی ہے۔

بیدؔ نے جو کی ہو کوئی تقصیر تو کہہ دو — جوڑا ہو کماں میں جو کوئی تیر تو کہہ دو

چھینی ہو کسی شخص کی جاگیر تو کہہ دو — امت پہ کبھی کھینچی ہو شمشیر تو کہہ دو

تم لوگوں نے کس روز نہیں جبر کیا ہے

اس صابر و شاکر نے صدا صبر کیا ہے

حضرت امام حسینؑ بچپن ہی سے بلند اخلاق کے حامل تھے۔ انیس نے اپنے مراثی میں حضرت امام عالی مقام کی عالی شان سیرت کا جو لافانی نقشہ پیش کیا ہے وہ آنے والی نسلوں کے لئے ایک بہترین نمونہ ہے۔ "اخلاق اور روحانی اعتبار سے نہایت بلند مرتبہ انسان بدکردار افراد اور موجودات کے ہاتھوں مصائب و آلام سہتے ہیں۔ اس قسم کی تکالیف کی توجیہ خدا پرستانہ نقطۂ خیال سے یہ ہے کہ یہ تکالیف روح کے تزکیہ کا باعث ہوتی ہیں، روح کو بلندی و رفعت دنگاہ مصائب و آفات ہی میں حاصل ہو سکتی ہیں۔ یہ اس اعلیٰ صفات کو ابھارتی اور اس کے کردار کا امتحان لیتی ہیں"۔ (اسلام کا نظریۂ حیات از ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صـ ۱۳۱)

بدکردار کے ہاتھوں حضرت امام حسینؑ نے جن آلام کے مقابلے میں جس صبر و شکر کا مظاہرہ کیا اس کی کوئی مثال دنیا کی تاریخ اب تک پیش نہ کر سکی۔ کربلا کے میدان میں اپنے دلبند اور لخت جگروں کو جنگ پر جانے سے روکے رکھنا، اپنے بھائی حضرت عباس کو ان کے غیض و غضب سے باز آنے کے لئے نرمی سے سمجھانا، خوف و ہراس کی حالت میں بھی نماز ادا کرنا، تین دن تک بھوک اور پیاس کی شدت برداشت کرنا، اپنے سینے پر پتھر رکھ کر آخر کار اپنے عزیزوں کو دوستوں کو ان میں جانے کی اجازت دینا، اپنے جگر بندوں کو میدان میں لڑتے اور شہادت حاصل کرتے ہوئے دیکھنا اور پھر ان شہیدوں کو ایک کے بعد دیگرے اپنے ہاتھوں سے اٹھا لانا، عورتوں کو صبر و رضا کی تعلیم دینا، دنیا کی بے ثباتی کا فلسفہ، خیر و شر میں فرق بیان فرمانا، یہ اور اسی قسم کی بے شمار سیرت کی بہترین مثالیں ہمیں انیس کے مرثیوں میں مل جاتی ہیں۔ انیس نے اپنے ایک مرثیہ میں اس روایت کو نظم کیا ہے جس میں وقت آخر امام حسینؑ کی شہادت سے کچھ پہلے ایک مسافر کربلا کے میدان میں نکل آیا جو روضۂ حضرت علی کی زیارت کی غرض سے اپنے گھر سے نکلا تھا۔ وہ کربلا کا خونیں منظر دیکھ کر متعجب ہوا۔ اپنا حال حضرت امام عالی کو سناتا ہے۔ اس وقت امام مظلوم اس مسافر کے لئے دعائے خیر کرتے ہیں۔ ان کے حسن سلوک سے وہ مسافر بہت متاثر ہو کر ان کا نام دریافت کرتا ہے۔ حضرت امام حسینؑ کا جواب لاجواب ہے، آپ بھی سنئے:-

قدموں پہ لوٹ کر یہ پکارا وہ دردناک — اظہارِ اسمِ اقدس اعلیٰ میں کیا ہے باک

بتلائیے کہ غم سے مرا دل ہے چاک چاک — چپ ہو گئے تڑپنے پہ اس کے امام پاک

یہ تو نہ کہہ سکے کہ شہِ مشرقین ہوں

مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسین ہوں"

مصرع میں حضرت امام حسینؑ کی سادگی، عجز و انکساری کا مرقع پیش کیا گیا۔ اس کے علاوہ اس میں جو ڈرامائی انداز ہے اس پر بحث کی جا چکی ہے۔ اس حالت زار میں بھی حضرت امام اس مسافر کی ہر طرح مدد کرنے کے لئے تیار رہیں۔ جس سے متاثر ہو کر آخرکار وہ مسافر یوں کہہ

دیکھی جو یہ عنایت سلطانِ بحر و بر — رونے لگا وہ مردِ مسافر جھکائے سر
دل سے کہا خدا کا ولی ہے یہ خوش سیر — اس حال میں غریب نوازی ہے اس قدر
دیکھی نہ باپ میں یہ محبت نہ بھائی میں،
اب تک ہیں اس طرح کے بھی بندے خدائی میں

حسینؑ کی شخصیت کی مثال ایک خاموش اور ٹھہرے ہوئے سمندر سے دی جا سکتی ہے جس میں مد و جزر نام کو نہیں۔ حضرت امام حسینؑ آخری وقت اس بات کی حجت کرتے ہیں کہ وہ قہرِ خدا سے بچ جائیں۔ خود اپنی تلوار میان سے نکالنے سے پہلے وہ فوج دشمن کو یوں مخاطب فرماتے ہیں۔

محسن سے بدی ہے یہی احسان کا عوض واہ — دشمن کے ہوا خواہ ہوئے دوست کے بدخواہ
گمراہ کے بہکانے سے روکو نہ مری راہ — تو اب بھی مسافر کو نکل جانے دو للہ،
ٹل جائے گی اک دم میں اماں رنج و بلا سے
میں ذبح سے بچ جاؤں گا، تم قہرِ خدا سے

انیس نے حضرت امام حسینؑ کے جود و سخا سے متعلق ایک واقعہ نظم کرتے ہیں۔ حضرت امام عالی مقام اپنے ساتھیوں کے ساتھ کوفہ ہیں، راستے میں حُر اور اس کے ساتھ، بہت سارے ساتھی جنگل میں جہاں پانی کا دور دور تک نام و نشان نہیں تھا، پیاسے ملتے ہیں، ب طلب کرتے ہیں۔ حُر اور اس کا دستہ سیراب ہوتا ہے۔ اس بات کا ذکر شاعر نے امام حسینؑ کی زبان سے ادا کیا ہے جس میں احسان یا ہے بلکہ ہدایت کی تعلیم مقصود ہے۔

اگرچہ یہ شعار نہیں اہلِ سخی کے شایاں — کہ کسی شخص کو کچھ دے کے کرے سب پہ عیاں
پوچھ لو حُر تو ہے موجود، عیاں ہوا پنہاں — اسی جنگل میں یہ فوج تھا یہ تشنہ دہاں
شور تھا آج چلیں جسم سے جانیں سب کی
منہ سے باہر نکل آئی تھیں زبانیں سب کی
زینت ہر قصے کی ہے پانی سے شجر ہو کہ بشر — مجھ سے دیکھا نہ گیا میں تو سخی کا ہوں پسر
میں نے عباسِ دلاور سے کہا گھبرا کر — مشکوں والے ہیں کہاں اونٹ ہیں پانی کے کدھر
کرم ساقیِ کوثر کو دکھا دو بھائی،
جتنا پانی ہے وہ پیاسوں کو پلا دو بھائی،

اور ساقیِ کوثر کو اور اس کے ننھے منھے بچوں کو پانی کا ایک قطرہ بھی نہ ملا۔

ت، جلالت، روحانیت، حقانیت، شجاعت، عدم تشدد، نفسِ مطمئنہ کے عناصر نے حسینی سیرت کو جنم دیا ہے — یہی باتیں

اخلاقی دائرے میں داخل ہیں ۔ اس کے برعکس طاغوتی طاقت ہمیشہ شر و فساد پر ایمان و ایقان رکھتی ہے ۔ اس کو خدا سے بڑھ کر اپنی قوت و طاقت زر و زیور، دولت و حکومت پر ناز و تکبر اور بھروسہ ہوتا ہے ۔ ایسے ہی بد اخلاق لوگوں کا حضرت امام کو جو اُن کے محسن تھے، نیک خواہ تھے، اس طرح جواب دیتے ہیں ۔

اعدا نے کہا قہرِ خدا سے نہیں ڈرتے ۔ ناری تو ہیں دوزخ کی ہوا سے نہیں ڈرتے
فریادِ رسولِ دوسرا سے نہیں ڈرتے ۔ خاتونِ قیامت کی بکا سے نہیں ڈرتے
ہم لوگ جدھر دولتِ دنیا ہے ادھر ہیں
اللہ سے کچھ کام نہیں، بندۂ زر ہیں

ایسا کہنے والے کوئی غیر نہیں تھے، ان کا رشتۂ حیات اسلام سے بندھا ہوا تھا ۔ لیکن یہ بندھن کمزور اور بودہ تھا ۔ ان کے لب پر اللہ اور رسول کے نام تھے لیکن ان کے دل طاغوتی قوتوں سے مغلوب ہو چکے تھے ۔ ان کی روح میں نہ حرارتِ دین تھی اور نہ حرارتِ ایمان ۔ انہوں نے اسلامی تعلیمات کو بالائے طاق رکھا ۔ مملکت کو حکومت الٰہیہ کے دائرہ سے نکال کر شخصی حکومت کی بنیاد رکھی، اسلام کے جمہوری عناصر کو پامال کیا، افراد کی آزادی پر پابندیاں عائد کر دیں، حدود اللہ کے قوانین و ضوابط کو مسخ کر دیا ۔ حضرت امام حسین پر ان کی ظلم و زیادتی کا ایک اور نقشہ ان اشعار سے ابھر کر ہمارے سامنے آتا ہے ۔

نے ملک سے غرض نہ اسے حبِّ جاہ ہے ، قبضے میں نہ خزانہ ہے اور نہ سپاہ ہے
لوگوں سے رابطہ ہے نہ غیروں سے راہ ہے ۔ جائے نشست قبرِ رسالت پناہ ہے
ناحق یہ ظلم، حق سے نہیں لوگ ڈرتے ہیں
جنگ اس سے جس غریب پہ فاقے گذرتے ہیں

اسی طرح خیر و شر کی ایک اور مثال جس میں بتایا گیا ہے کہ اس معیت میں بھی اللہ کے چند ایسے بندے ہیں جو اس سے غافل نہیں ہیں اور ان کی بہ نسبت ایک بڑی تعداد ایسی ہے جو نہ صرف اس سے غافل ہیں بلکہ ناحق بندگانِ خدا کا خون بہانے پہ کمر بستہ ہیں ۔

یاں تھیں صفیں نمازِ جماعت کی اور ادھر ، باندھی تھی فوج کس نے صف آرائی پر کمر
شکلِ ہلال، چڑھتی تھیں تلواریں چرخ پر ۔ نیزے بھی تیز ہوتے تھے اور خنجر و تبر
غل تھا کہ آج خون کا دریا بہائیں گے
پیاسے نمازیوں کے گلے کاٹے جائیں گے

اردو ادب میں ایسے شعراء کی کمی ہے جن کی شاعری شخصیت کا آئینہ ہو ۔ لیکن مولانا حالی اور میر انیس کے تعلق سے ہم یہ دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی شخصیت اور شاعری ایک دوسرے میں مدغم ہے ۔ ہر شاعر کا مطالعہ اس دور کے سماجی پس منظر میں کرنا چاہیئے ۔ اس سے صحت مند نتائج مرتب ہو سکتے ہیں ۔ اس حیثیت سے انیس کا بھی مطالعہ ضروری اور اہم ہے ۔

وہ شریف گھرانے کے چشم و چراغ تھے ۔ ان کی تعلیم و تربیت مذہبی ماحول میں ہوئی ۔ ان کے اسلاف درویش صفت، مشہور شاعر اور صوفی تھے ۔ شعر و شاعری ان کو وراثت میں ملی تھی ۔ مذہب سے گہری عقیدت، آفاقی قدروں پر ایمان، انسان دوستی، خلوص، تہذیب، شائستگی

عمدہ اخلاق، خودداری اور شرافتِ نفس کے عناصر سے ان کی شخصیت کے خدوخال ابھرتے ہیں۔ اس دور کا جاگیردارانہ معاشرہ زوال پذیر ہوچکا تھا۔ تہذیب کی دیواریں کھوکھلی ہوچکی تھیں۔ بادشاہ، اور امرا، خود پسند اور عشرت پرست تھے۔ رعایا معاشی حیثیت سے مفلوج ہوچکی تھی۔ سلطنتِ اودھ کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ ہر شخص گذرے ہوئے کل کو بھول چکا تھا اور آنے والے کل کی کسی کو فکر نہیں تھی۔ سبھی "آج" کے جامِ شراب میں مست و بیخود تھے۔ ایسے نفسا نفسی کے دور میں ہر شخص خود غرض، خود پسند اور نفسانی خواہشات کا غلام تھا۔ عیش کوشی آرام طلبی ہی ان کے لیے شیوۂ مردانگی تھا۔ سستی و کاہلی ان کے رگ و پے میں سرایت کرچکی تھی۔ اخلاقی قدریں تقریباً پامال ہوچکی تھیں۔ زندگی کے ہر شعبہ میں تکلف و تصنع کا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ ایسے میں بہت سارے اردو شعراء "چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی" مصداق بنے ہوئے تھے۔ کچھ شعراء نے مذہب کا لبادہ اوڑھ لیا اور تصوف کو اپنی شاعری میں جگہ دی۔ ان ہی شعراء میں خواجہ میر درد اور میر انیس کے نام اہم ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان دونوں شعراء کے ہاں تصوف کی بہت ساری اصطلاحات ملتی ہیں۔ اپنے اسلاف کا اثر انیس کی سیرت پر بھی پڑا اور ان کے دل و دماغ پر صوفیانہ خیالات چھائے رہے جو ان کے کلام میں جابجا موجود ہیں۔ یوں بھی انیس مذہبی شاعر تھے اور مذہبی شاعری میں تصوف و عرفان کا ہمیشہ سے غلبہ رہا ہے۔ ان کے مرثیوں کے علاوہ سلاموں اور رباعیات میں بھی مسائلِ تصوف کے انمول موتی اس تراش خراش سے پیش کئے ہیں کہ اس کا جواب نہ ہوسکا۔ سلوک و عرفان، سالک، راہِ رضا، تقویٰ، عصمت و عفت، حق شناسی، تسلیم و رضا، معرفتِ الٰہی، فقر و فقیر، نانِ خشک، صبر و شکر، توکل، قناعت، ہوسِ دنیا، ترکِ دنیا، خوفِ الٰہی، خاکساری، عشقِ الٰہی وغیرہ اصطلاحات کو انیس نے اپنے بیشتر مرثیوں میں جگہ دے کر عرفانی اخلاقیات کا پرچار کیا ہے۔ بعض جگہ آیاتِ قرآنی اور احادیث کا ترجمہ بھی پیش کر دیتے ہیں۔

میر انیس سالک کے تعلق سے حضرت امام حسین کے ارشاد کو اس طرح نظم فرماتے ہیں۔

سالک جو ہیں وہ راہِ رضا بھولتے نہیں　　جو دوست ہیں ولی کے دوا بھولتے نہیں

ایک اور جگہ حضرت اکبر وقتِ رخصت جو ارشاد فرماتے ہیں اس کو شاعر یوں بیان کرتا ہے۔

دوری نہیں کچھ عمر سفر ہوتی ہے کوتاہ　　ہمت ہو تو کٹ جاتی ہے نرمی سے کڑی راہ
سالک ہے وہی راہِ رضا سے ہے جو آگاہ　　آسیل کی صورت، تجھے کوثر کی ہے گر چاہ

عرفانی اخلاقیات میں عشقِ الٰہی کو بڑی اہمیت ہے۔ راہِ خدا میں وطن دولت، زن و اولاد قربان کرنا اور ان کی محبت کو بھلا دینا اور خود بھی قربان ہو جانا ہی سب سے بڑا درجہ رکھتا ہے۔ حضرت امام حسین کے سامنے اپنے قریبی رشتہ دار حتیٰ کہ اپنے عزیز دلبند جگر بند بھی شہادت کا جام نوش کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں ان کا دل درد سے بھر آتا ہے۔ یہ فطری امر بھی ہے۔ لیکن ایسے موقعے پر حکمِ الٰہی کے سامنے صبر و سکون کی جو تلقین فرماتے ہیں، وہ صوفیانہ انداز ہے

جو اہلِ محبت ہیں بلا ان کے لئے ہے　　صابر ہیں جو یہ درد، دوا ان کے لئے ہے
مظلوم جو ہیں لطفِ خدا ان کے لئے ہے　　ہر رنج میں اک تازہ مزا ان کے لئے ہے

سو دکھ ہوں تو ہوں، محو ہیں الفت میں اسی کی
روتے ہیں تو روتے ہیں، محبت میں اسی کی

روئے جو مصیبت میں تو کیا ہوتا ہے اے دل ہوتا ہے جو قسمت کا لکھا ہوتا ہے اے دل
ہر درد کا الفت میں مزا ہوتا ہے اے دل صابر سے رضامند خدا ہوتا ہے اے دل
مطلب تب ہے یہ مرحلہ طے کر کے ملیں گے
بچتے ہیں تو فرزند سے اب مر کے ملیں گے

انیس کے کلام میں علم عرفان کے رموز و نکات جہاں موجود ہیں وہیں عصری آگاہی کی پرچھائیاں بھی اپنا آب و تاب دکھاتی ہیں۔ انیس کا دور سیاسی ہی نہیں بلکہ اخلاقی زوال کا بھی دور تھا۔ اس پس منظر میں انیس کی مرثیہ گوئی کو ایک ردِعمل کہا جا سکتا ہے ۔۔۔ اس دورِ انحطاط میں بھی انیس نے ان اعلیٰ و آفاقی قدروں کو اپنے سینے سے لگائے رکھا اور ایک معلمِ اخلاق کی حیثیت سے ان کا ذکر خوبصورتی سے اپنے مرثیوں میں کیا تاکہ اپنے معاشرے کی اصلاح ممکن ہو سکے۔ اور یہ اصلاحی پہلو انیس کے دور تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ ہر دور، ہر ملک اور ہر قوم کے لئے مفید اور کارآمد ہے۔ یہی سبب ہے کہ آج بھی انیس کو پڑھنے والوں کی کمی نہیں ہے اور آئندہ بھی نہیں ہوگی۔ انیس کے ہاں اخلاق کا کیا معیار تھا اور وہ کونسی قدریں ان مٹ ہوتی ہیں ۔۔۔ بقول صالحہ عابد حسین "یہ قدریں ہیں خداشناسی اور خود شناسی، عقیدہ اور ایمان، دیانت اور شرافت نفس، حق گوئی اور حق پرستی، عفو و کرم، ایثار و قربانی، شجاعت جاں بازی، وفا اور جاں نثاری، صبر و استقلال، راضی برضا رہنے کا حوصلہ، رشتوں کی پاس داری اور انسانیت کا درد، خلوص و محبت اور پھر حق کی راہ میں جان قربان کرنے کا وہ جذبہ جو شہادت کی منزل تک پہنچ سکتا ہے۔ بشہادت۔ یعنی سر دار بھی صرف حق کا نام لینا اور حق کے لئے گواہی دینا، یہ وہ قدریں ہیں جن کو فنا نہیں۔ جو دب دب کر ابھرتی ہیں اور اپنی سچائی منوا کر رہتی ہیں اور یہی وہ قدریں ہیں جن کو انیس نے زیادہ بالواسطہ یعنی اپنے کرداروں کی سیرت اور اخلاق میں سمو کر اور اجاگر کر کے اور کہیں کہیں بلاواسطہ بھی پیش کیا ہے"۔ ("میر انیس سے تعارف" از صالحہ عابد حسین، ص ۹۱)

انھیں اعلیٰ اخلاقی اقدار سے متعلق چند مثالیں اوپر دی جا چکی ہیں۔ مرثیہ میں ان کے لئے مذہبی، تاریخی، اور مثالی کردار لئے گئے ۔۔۔ انھیں مثالی کرداروں کو سامنے رکھ کر وہ اپنے معاشرہ کی اصلاح چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ لوگ کاہلی اور سستی کو چھوڑ کر راہِ عمل اختیار کریں۔ مبالغہ اور جھوٹ کو بالائے طاق رکھ کر صداقت اور حق گوئی کو اپنا شعار بنائیں۔ راہِ حق میں مر مٹنے کی تڑپ پیدا ہو۔ طاغوتی طاقتوں کے سامنے اپنا سر نہ خم کریں۔ صرف زر و زیور کو اپنا دین و ایمان نہ بنائیں۔ حق کا ساتھ اور باطل کے خلاف آواز بلند کی جائے۔ کیا یہ باتیں صرف انیس کے دور کے لئے ہی بہتر و مناسب تھیں؟ کیا آج کے معاشرے کو ان سے کوئی واسطہ نہیں ہے؟ کیا زمانۂ مستقبل میں ان اقدار کی کوئی اہمیت نہیں ہوگی؟ حیاتِ انسانی کے لئے ان اقدار کا ہونا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ انسان کے زندہ رہنے کے لئے ہوا کا ہونا۔

زوال پذیر معاشرے پر انیس نے اپنے مرثیوں میں جو طنز کئے ہیں وہ اپنی جگہ اصلاحی پہلو رکھتے ہیں۔ اس ضمن میں صرف دو مثالیں دلچسپی سے خالی نہیں۔ شاعر اپنے ماحول کا گلہ خدا سے یوں کرتا ہے۔

ناقدریٔ عالم کی شکایت نہیں مولا کچھ دفترِ باطل کی حقیقت نہیں مولا،
باہم گل و بلبل میں محبت نہیں مولا میں کیا ہوں کسی روح کو راحت نہیں مولا
عالم ہے مکدر کوئی دل صاف نہیں ہے،
اس عہد میں سب کچھ ہے پر انصاف نہیں ہے

قدری عالم کی شکایت جس حسین انداز سے شاعر نے کی ہے وہ اپنی جگہ لاجواب ہے۔ گل و بلبل میں محبت نہ ہو، کسی ذی روح کو راحت نہ ہو، زمانہ مکدر دل صاف نہ ہو اور اس عہد میں انصاف نہ ہو تو پھر بتائیے کہ وہ دور کتنا الم ناک ہوگا۔ کیا یہ اشعار انیس کے عہد کی سچی ترجمانی نہیں کرتا؟ لوگوں میں برائی اور بھلائی کی تمیز اٹھ جاتی ہے تو ہیرا بھی ان کے نزدیک پتھر سا لگتا ہے۔ سچے قدر دانوں کی کمی کا جو احساس انیس کے ں تھا، اسے ملاحظہ فرمائیے۔

الماس سے بہتر یہ سمجھتے ہیں خزف کو ۔۔۔ دُر کو تو گھٹاتے ہیں بڑھاتے ہیں صدف کو

اندھیر ہے یہ چاند بتاتے ہیں کلف کو ۔۔۔ کھو دیتے ہیں نیشے کے لئے دُر نجف کو

ضائع دُر و لعل بدخشاں و عدن کے

مٹی میں ملاتے ہیں جواہر کو سخن کے

انیس کی رباعیات، قطعات اور سلاموں میں بھی اخلاقی اقدار کا بہت بڑا سرمایہ موجود ہے۔ لیکن ان اصناف کا جائزہ ہمارے موضوع بحث سے خارج ہے۔ مراثی انیس کے ایک سرسری مطالعہ سے بھی ان کے صرف وہ اشعار جن میں اخلاقی مضامین کا اظہار ہوتا ہے اگر یکجا یں تو ایک ضخیم کتاب ہو سکتی ہے۔ اس مختصر مقالہ میں زیادہ مثالوں کی گنجائش نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ ان کے کلام میں گلدستہ مضامین، سیاتی مطالعہ، مناظر کی دلکشی، رزم و بزم کا پر شکوہ بیان، عقیدہ و ایمان میں حرارت لانے والی باتیں، مسئلہ قضا و قدر کے علاوہ آفاقی لاقی قدریں پائی جاتی ہیں جس سے قاری کا دل مسرت حاصل کرتا ہے اور دماغ بصیرت۔

مولانا الطاف حسین حالی نے اپنے مقدمے میں تمام اصناف سخن سے بحث کی ہے۔ مرثیہ کی خوبی کا جہاں انہوں نے تذکرہ کیا ہے ہاں اس کی خامیوں کا ذکر بھی کیا ہے لیکن انیس کی بے حد تعریف کی ہے۔

دِلّی کی زبان کا سہارا تھا انیس ۔۔۔ اور لکھنؤ کی آنکھ کا تارا تھا انیس

دِلّی جڑ تھی تو لکھنؤ اس کی بہار ۔۔۔ دونوں کو یہ دعوٰی ہے ہمارا تھا انیس

یکن آج انیس صرف دِلی یا لکھنؤ کے نہیں ہیں بلکہ سارے ہندوستان و پاکستان کے ہیں۔ یہی ان کی عظمت ہے اور یہی ہماری عقیدت۔

—— ادارۂ ادبیاتِ اُردو کو اس کی پرانی عمارت میں دیکھ چکا تھا۔ اب خوش قسمتی سے اس کی نئی اور بی عمارت "ایوانِ اُردو" میں دیکھنے کا موقع ملا۔ آنکھیں کھل گئیں۔ اس کی عمارت میں حُسنِ نظر اور ذوقِ سلیم کی رفرمائی ہے۔ اس کی آرائش میں سلیقہ اور نفاست ہے۔ اس کے کتبوں، خطوط، فرامین، مخطوطات، مطبوعات، اور زبان و ادب سے متعلق نوادر میں ڈاکٹر زورؔ اور اُن کے رفیقوں کے خونِ جگر کی آب و تاب جھلکتی ہے۔ یہ ادارہ اُردو زبان و ادب کی صدیوں کی چمن بندی کا بڑا اچھا عکس پیش کرتا ہے۔ یہاں تحقیقی اور علمی م کرنے والوں کے لئے بڑا خزانہ موجود ہے۔ اس ادارہ کی ترقی و توسیع کے لئے کوشش اُردو زبان و دب سے محبت رکھنے والوں اور ہماری مشترکہ تہذیب کے علم برداروں کا فرض ہے۔

(پروفیسر آل احمد سرور ۴ جولائی ۱۹۶۱ء)

سید اشفاق حسین (مرحوم)

مخدوم

۱۹۲۶ یا ۱۹۲۷ کی بات ہے۔ ایک عالی شان حویلی میں مشاعرہ تھا۔ حویلی کے بلند کاخ و ایوان روشنی سے جگمگا رہے تھے۔ م سے فرش پر قیمتی ایرانی قالینیں بچھی تھیں۔ شہ نشین پر زرد اطلس کے شامیانے کے نیچے صدر مشاعرہ بیٹھے تھے۔ اور سامنے نوا جاگیردار، وزرا اور عہدہ دار تھے۔ ایک طرف یونیورسٹی کے کچھ پروفیسر اور طالب علم بھی تھے۔ مشاعرہ شروع ہوا۔ غزلیں پڑھی گئیں۔ مشاعرہ بہار پر پہنچا ہی تھا کہ ایک دبلا پتلا شاعر شہ نشین پر آیا۔ اس نے بہت ہی دلکش انداز میں اپنی نظم شروع کی۔ نظم تھا "حویلی"۔۔۔ جب وہ اس شعر پر پہنچا،

رہزنوں کا قصرِ شوریٰ قاتلوں کی خوابگاہ کلبلاتے ہیں جرائم جگمگاتے ہیں گناہ

تو نوابوں اور جاگیرداروں کی صفوں میں کھلبلی سی مچ گئی۔ شاعر حویلی میں کھڑے ہو کر اس کے در و دیوار کو لرزہ براندام کر رہا تھا۔ جاگیر کے گڑھ میں وہ جاگیری نظام زندگی پر ضربیں لگا رہا تھا۔

ایک بوسیدہ حویلی یعنی فرسودہ سماج لے رہی ہے نزع کے عالم میں مردوں سے خراج
اک مسلسل کرب میں ڈوبے ہوئے سب بام و در جس طرف دیکھو اندھیرا جس طرف دیکھو کھنڈر
مار و کژدم کا ٹھکانہ جس کے دیواروں کے چاک اُف یہ سنّاٹے کس قدر تاریک کتنے ہولناک

یہ پہلی باغیانہ آواز تھی جو حیدرآباد کے ایوانوں میں گونجی۔ یہ پہلی بار تھا حویلی کو ایک فرسودہ سماج کا مظہر کہا گیا تھا۔

تلنگانہ کے ہرے بھرے اور لہلہاتے کھیتوں اور حسین تالابوں کے بیچ مخدوم نے اپنا بچپن گزارا تھا۔ اس کی شاعری تلنگانہ ہی کھیتوں سے ابھری۔ ان ہی کھیتوں میں اس نے زندگی کو گنگناتے اور گاتے دیکھا۔ یہیں اسے زندگی میں مٹھاس اور طرب آمیز ہوا۔ یہی تالاب اور یہی کھیت اور ان کے آس پاس کی زندگی اس کی ابتدائی دور کی شاعری کا موضوع بنی۔ "طور"، "تلنگن" اور سا ایسے ہی محبت بھرے گیت ہیں جو اس نے اپنے وطن کی حسین فضاؤں میں گائے تھے۔ جب شاعر کو اپنا ماحول تمام تر حسن و محبت سے ر مسرت و شادمانی سے پُر نظر آتا تھا۔ اس کی نگاہیں ابھی اس کرب و درد کو نہیں دیکھ پائی تھیں جو اس رنگین کے پردے کے پیچھے چھ اور آگے چل کر اس رنگین پردے کو اسے ہی نوچ پھینکنا تھا۔

مخدوم جب عثمانیہ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہو کر نکلا تو زندگی کا نیا تصور اس کے ذہن و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ تار تصور کے مطالعہ نے اسے سماج کے عمل تبدیلی کا شعور بخشا۔ اس کا ماحول اس کے ذہنی شعور کا ساتھ نہ دے سکتا تھا۔ اس کے

ذہنی کشمکش کا دور تھا ۔ مگر جلد ہی وہ اس کشمکش سے باہر نکل آیا ۔ اور اپنے لئے ایک راہ متعین کرلی ۔ اس کے سامنے ایک طرف وہ صدیوں پرانی معاشرت تھی جو زندگی سے پیٹی ہوئی تھی اور جس نے اسے بے حرکت اور اپاہج کر رکھا تھا ۔ دوسری طرف نئی زندگی کی نئی قوتیں آہستہ آہستہ ابھر رہی تھیں ۔ یہ پرانا طرزِ زندگی اندر سے گو کھوکھلا ہو چکا تھا مگر اس کی سطح بڑی چمکیلی تھی ۔ اور اس چمک دمک نے بہت سوں کی نظروں کو خیرہ کر رکھا تھا ۔ مخدوم اس فریبِ نظر کا شکار نہیں ہوا ۔ اس نے سرِ میدان اس کھوکھلے پن کو للکارا ۔ اس کی نگاہیں حال کے عالیشان ایوانوں کو مستقبل کے کھنڈر بنتے دیکھ رہی تھیں ۔ کیونکہ ان ایوانوں میں جو زندگی پل رہی تھی وہ حیاتِ انسانی کے ارتقائی تصور سے نابلد تھی ۔

ایک طرف عیش و عشرت کی فراوانی تھی تو دوسری طرف افلاس و غربت کی ہولناکی ۔ اور اس تضاد کے بیچ متوسط طبقہ تھا جو اپنی عافیت اسی میں سمجھتا تھا کہ دونوں طرف سے آنکھیں بند کئے اپنی راہ پر چلتا رہے ۔ مگر مخدوم اس عافیت کے حصار سے باہر نکل آیا اور زندگی کی اس انصافی اور ناہمواری کے خلاف آواز اٹھائی ۔

سر پہ در ہائے زماں توڑوں گا ، شورِ نالہ سے درِ ارض و سما توڑوں گا
ظلم پروردہ قوانینِ جہاں توڑوں گا عشرت آباد امارت کا مکاں توڑوں گا

توڑ ڈالوں گا میں زنجیرِ اسیرانِ قفس دہر کو پنجۂ عسرت سے چھڑانے دے مجھے

مخدوم جو کبھی تمام تر حریر و پرنیاں تھا اب فولاد بن چکا تھا ۔ جس نے کبھی محبت کی راہوں میں اپنے دل کے ٹکڑے بکھیرے تھے کہا تھا کہ "خدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے" ۔ اور یہ بھی کہا تھا ؎

میرے محبوب میری نیند اڑانے والے میرے مسجود میری روح پہ چھانے والے
آ بھی جا تاکہ میرے سجدوں کا ارماں نکلے آ بھی جا تاکہ تیرے قدموں پہ مری جاں نکلے

وہی مخدوم اب کہہ رہا تھا ؎

برق بن کر بتِ ماضی کو گرانے دے مجھے رسمِ کہنہ کو تہِ خاک ملانے دے مجھے
تفرقۂ مذہب و ملت کو مٹانے دے مجھے خوابِ فردا کو بس اب حال بنانے دے مجھے
آگ ہوں ہاں آگ اک دہکتی ہوئی آگ آگ ہوں آگ بس آگ لگانے دے مجھے

محبت سے بغاوت کی یہ راہ اس کے شعور کی تربیت کی راہ ہے ۔ اس راہ میں وہ ٹھہرا نہیں چلتا ہی رہا ۔ اور ادبی دہشت پسندی کا یہ دور ہی ختم ہو گیا ۔ جیسے جیسے اس کا شعور پختہ ہوتا گیا اس کی منزل بھی متعین ہونے لگی ۔ اور اس کے سماجی شعور سے اس کا فنی شعور ہم آہنگ ہوتا گیا ۔ اسے اپنے ماحول کی بے حرکتی اور بے حسی میں رات کی تاریکی کا سا احساس ہوتا تھا ۔ رات بڑھتی ہی جاتی تھی اور خورشید درخشاں کے آثار کہیں نظر نہیں آتے تھے ۔ ایسی تاریکی میں مخدوم کی آواز روشنی کی ایک لکیر بن کر ابھری اور شعاعِ امید بن کر اس نے بہت سے دلوں میں گھر کر دیا ۔ دکن کے اکثر نوجوانوں کے فکر و عمل پر مخدوم کے خیالات کی صداقت اور بے پناہ خلوص اثر انداز ہونے لگا ۔ گو روایتی بے حسی اور تاریخِ عالم کی تخلیقی رفتار کی بے شعوری نے اس اثر کو بڑھنے نہیں دیا ۔ اسے ایک لاابالی شاعر ہی سمجھا جانے لگا ۔ مخدوم نے جب یہ محسوس کیا کہ شاعری اس کے خوابوں کی حقیقت میں نہیں بدل سکتی تو وہ عملاً انقلابی بن گیا ۔ تلنگانہ کے وہ کھیت جہاں اس نے محبت کے سبق کی پاسداری کی تھی" اس کے انقلابی عمل کی رزم گاہ بن گئے ۔ وہ کھیت جہاں پہلے اسے حسن ہی حسن نظر آتا تھا" اب وہاں اسے درد و کرب کی چیخیں

سُنائی دیتی تھیں وہ طوفانوں کو دامن میں سمیٹے زندگی کی ناانصافیوں کو للکارتا رہا۔ ظالموں اور جابروں کو اس کے نام سے لگا۔ اور مظلوم و مجبور سینہ تان کر اس کے دوش بدوش کھڑے ہو گئے۔ اس کا یہ شعر اب حقیقت بن چکا تھا ؎

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو   چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

اس کی شاعری محبت کے گیتوں سے شروع ہو کر بغاوت کے نعروں سے گذری۔ اور پھر شعور کی پختگی کے ساتھ اعتدال بھی پیدا ہوتا گیا۔ اس کی نگاہیں پھولوں کی سیج سے دھواں اٹھتے دیکھتی ہیں۔ مگر لہجہ میں وہ درشتگی باقی نہیں ؎

عیش و عشرت کی جس جا کہ فراوانی تھی   جس جگہ جلوہ فگن روحِ جہاں بانی تھی
ہاں وہیں میرے دلِ زار نے یہ بھی دیکھا   ہاں مری چشم گنہگار نے یہ بھی دیکھا
خونِ دہقاں میں امارت کے سفینے تھے رواں   ہر طرف عدل کی جلتی ہوئی میت کا دھواں

ہر طرف عدل کی جلتی ہوئی میت کا دھواں اٹھ رہا تھا۔ اس دھویں کے پیچھے فرنگی سیاست کی بازی گری کارفرما تھی اور اس کی گرفت دیسی ریاستوں میں اور بھی مضبوط اور مستحکم تھی۔ غلامی کا احساس اور آزادی کا جذبہ ہر محبِ وطن کے دل میں پیدا ہو رہا تھا اور یہ احساس بھی اجاگر ہو چکا تھا کہ جب تک ملک آزاد نہ ہو زندگی اسی طرح تاریکی کی راہوں میں بھٹکتی رہے گی۔ اس آزادی پر مخدوم کی آواز اس عزم و خود اعتمادی کے ساتھ اٹھی ؎

وہ ہندی نوجواں یعنی علمبردارِ آزادی   وطن کا پاسباں وہ تیغِ جوہردارِ آزادی
وہ ٹھوکر جس سے گیتی لرزہ براندام رہتی ہے   وہ دھارا جس کے سینے پر عمل کی ناؤ بہتی ہے
چھپی خاموش آہیں شورِ محشر بن کے نکلی ہیں   دبی چنگاریاں خورشیدِ خاور بن کے نکلی ہیں
بدل دی نوجوانِ ہند نے تقدیر زنداں کی   مجاہد کی نظر سے کٹ گئی زنجیر زنداں کی

کہو ہندوستان کی جے، کہو ہندوستاں کی جے

مشرق عرصہ سے سامراجی قوتوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ وہ سرزمین جس نے ساری دنیا کی ثقافتی اور تمدنی رہنمائی کی، مفلوج اور بے جان ہو کر رہ گئی تھی۔ سامراجی ظلم و استبداد کے پنجہ میں پھنس کر وہ زندگی کے تخلیقی عمل سے محروم ہو چکی تھی۔ مشرق کی اس بے بسی پر مخدوم نے کہا ہے ؎

اک مسلسل رات جس کی صبح ہوتی ہی نہیں   خوابِ اصحابِ کہف کو پالنے والی زمیں
اس زمینِ موت پروردہ کو ڈھایا جائیگا   اک نئی دنیا نیا آدم بنایا جائے گا،

مخدوم کی شاعری میں شروع سے آخر تک اس نئی دنیا کی بشارت ہے جس میں زندگی کی نعمتیں کسی ایک طبقہ کا حق نہیں بلکہ سب کا حق ہیں۔ وہ زندگی سے بھرپور محبت کرتا ہے اور نہیں چاہتا کہ زندگی چند کے لئے رحمت اور باقی سب کے لئے عذاب بنی رہے۔ وہ اس گمراہی کو دور کرنا چاہتا ہے۔ وہ نوجوانوں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے

ایسا جہاں جس کا اچھا انجام ہو   ایسا جہاں جس کا خوب نیا نام ہو
ایسا جہاں جس کی نئی صبح و شام ہو   ایسے جہانِ نو کا تو پیدا نگار بن

حبشہ پر مسولینی کے قبضے اور اسپین میں جمہوریت پسندوں کی شکست سے انسان دوستوں کو ایک جھٹکا سا لگا ۔ پھر سرمایہ داری نظام ایک دوسرے سے دست و گریباں ہوگئے اور آخر میں ساری دنیا جنگ کی لپیٹ میں آگئی ۔ مخدوم نے اس دور میں جنگ، موت کا گیت، روحِ مخلوط، زلف چلیپا اور سپاہی جیسی نظمیں لکھیں جس میں اس نے سرمایہ داری کی لعنتوں اور جنگ کی تباہ کاریوں کے خلاف پر زور احتجاج کیا اور انسانیت کے لئے انقلاب کی تمنا کی ۔

اے جانِ نغمہ جہاں سوگوار کب سے ہے　　　ترے لئے یہ زمیں بے قرار کب سے ہے
ہجومِ شوق سرِ رہ گزار کب سے ہے　　　گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

وہ سوچتا ہے کہ کب یہ رات کی تاریکی دور ہوگی اور کب صبح طلوع ہوگی اسے اس کا یقین ہے صبح ہوگی ضرور ؎

رات کے ماتھے پہ افسردہ ستاروں کا ہجوم　　　صرف خورشیدِ درخشاں کے نکلنے تک ہے ۔

مخدوم نے اپنی زندگی میں بڑی مصیبتیں جھیلیں مگر اس کی پیشانی کبھی شکن آلود نہیں ہوئی ۔ حادثات اس کے عزم و عمل سے ٹکرائے مگر اس نے مسکرا کر انھیں اپنی راہ سے ہٹا دیا ۔ اس کے کردار میں دریاؤں کی سی روانی اور کہساروں کی سی رعنائی ہے ۔ اس کا سب سے بڑا جوہر اس کا بے پناہ خلوص ہے ۔ کچھ یہی بات ہے کہ اس کے دوستوں میں ہر مکتبِ خیال کے لوگ ملتے ہیں ۔ اور اس کی شخصیت کا یہی تنوع اسے ابھی تک جوان رکھے ہوئے ہے ۔ وہ اپنی مجلسی زندگی میں بڑا ہی زندہ دل جلیس تھا اس کا ظریف مزاج اور اس کی شگفتگی ہر بزم کی رونق رہی ہے ــــ بزمِ یاراں میں تو وہ اور بھی کھل اٹھتا ہے ۔ وہ زندگی کو ہمیشہ اس طرح برتنے کا عادی رہا ہے ۔ مخدوم اپنے طالب علمی کے دور میں بظاہر ایک لاابالی سا نوجوان تھا ۔ مست و بے خود، فکرِ فردا سے بے نیاز، لاپرواہ، سہل انگار ــــ اس کے گرد دوستوں کا ہجوم سا رہتا ۔ اس ہجوم میں اس کی زندگی جھومتی اور قہقہے لگاتی رہتی ۔ وہ اس ہجوم میں رات رات بھر جاگ کر صبح کرنے کا عادی تھا ۔ اس کی شخصیت میں ایسی کشش تھی کہ بہت کم اسے تنہائی نصیب ہوتی مگر جب ہوتی تھی تو زندگی کی حقیقتیں اس پر اثر انداز ہوتیں اور غور و فکر کی ایک لکیر اس کے چہرے پر پھیل جاتی اور اس کی آنکھوں میں مستقبل کا عزم جھلکنے لگتا جیسے وہ حال کے روزن سے مستقبل دیکھ رہا ہو ۔ یہی بات تھی کہ جب وقت آیا اور اس نے اپنی زندگی کے مقصد کو متعین کر لیا تو لاابالی پن کا یہ لبادہ اس آسانی سے اتار پھینکا کہ کسی کو یقین نہ آتا تھا ۔ اور لوگ حیران تھے کہ اس لبادہ کے پیچھے کس طرح اب تک ایک چٹان چھپی بیٹھی تھی ۔

مخدوم عثمانیہ یونیورسٹی کا ایک ممتاز طالب علم رہا ہے ۔ شاعر کی حیثیت سے تو وہ مشہور تھا ہی ۔ اس کی نثر بھی بڑے شوق سے پڑھی جاتی وہ جب بی ۔ اے میں تھا تو اس نے ٹیگور پر ایک کتاب لکھی ۔ غالباً ٹیگور پر اردو میں یہ پہلی کتاب تھی جس میں شاعر کی زندگی اور شعری کارناموں پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی تھی ۔ اس نے ایم ۔ اے کے لئے اردو ڈرامہ کے ارتقاء پر جو مقالہ لکھا تھا ۔ اس کے ممتحن نے اس کامیاب کوشش پر اسے مبارک باد دی تھی ۔ مخدوم برسوں حیدرآباد کے اسٹیج پر اپنی اداکاری کے جوہر دکھا چکا ہے ۔ ڈراموں کا شوق اسے شروع ہی سے تھا ــــ کالج میں اس نے ایک دوست کی شرکت میں برنارڈ شاہ کے ایک ڈرامہ "ہوشش کے ناخن" کے نام سے اخذ کیا اور خود ہی اسے اسٹیج کیا ۔ یہ ڈرامہ اتنا پسند کیا گیا کہ پھر شہر کے سب سے بڑے تھیٹر میں اسے دوبارہ اسٹیج کیا گیا ۔ کالج سے نکلنے کے بعد بھی اس کا یہ شوق جاری رہا ۔ اور اس نے چیخوف کے "چری آرچرڈ" کو "پھول بن" کے نام سے اخذ کیا اور پھر خود ہی اسے اسٹیج کیا ۔ مگر یہی زمانہ تھا کہ وہ تھیٹر کے اسٹیج سے زندگی کے اسٹیج پر آگیا ۔ اور اس طرح تھیٹر نے مستقبل کے ایک بہت بڑے فن کار کو کھو دیا ۔ اپنے مقصد اور نصب العین کی خاطر اس نے اپنی شاعری کو بھی قربان کر دیا ۔ (باقی صـ۲۳ــ پر دیکھئے)

ڈاکٹر مظفر حنفی

مشینی عہدِ رواں کی غذا، فریب فریب — یہ ارتقا ہے کہ تحت الثریٰ فریب فریب
کھلی جو آنکھ تو اک حجرۂ بلا میں ہوں — نہ وہ فضا ہے نہ وہ مہ لقا فریب فریب
جسے تلاش کیا عمر بھر خلاؤں میں — وہی تو میرے تعاقب میں تھا فریب فریب
پکارتا تھا کوئی مجھ کو یا اخی کہہ کر — کوئی دریچہ نہ مجھ پر کھلا فریب فریب
مجھے بھی مارا، مرا نام تھا انا جادو — طلسمِ ذات شکستہ ہوا، فریب فریب
محاصرہ جو کیا آستیں کے سانپوں نے — مرا عصا نہ بنا اژدہا، فریب فریب
نہ پوچھئے کہ مظفر کو کیا ملا فن سے
لہو تھکانے لگا اور کیا فریب فریب

غزلیں

امان ارشد

جان کر اپنا غموں کی زندگانی سے مجھے — کوئی دیتا ہے صدائیں ہر کہانی سے مجھے
عرصۂ تہذیب میں خود ساختہ زنداں ملا — زندگی کی پُر تکلف میزبانی سے مجھے
ہوں کلیمِ وقت لیکن بارگاہِ حسن سے بھی — سحرِ باطل کے اُجالے لن ترانی سے مجھے
مصلحت کوشوں کے پیغ بستہ تجاہل کے سوا — کیا ملا ہے سوزِ دل کی نغمہ خوانی سے مجھے
اس چمن کے ذرّے ذرّے میں ہے میرا بھی لہو — باغباں نے غیر جانا بدگمانی سے مجھے
نازنینانِ جہاں کا ہر ستم سہنا پڑا
ایک شوخ و خود نما کی مہربانی سے مجھے

حنیف

کس جرمِ ناسزا کی سزا پارہا
پیہم صلیبِ وقت پہ لٹکا ہوا

بڑھتے ہوئے ہجوم میں گم ہو گ
ٹرنک رنگ کے سب سے اپنا پتا پوچھ

پھیلا ہوا تھا وسعتِ کونین
کیوں آج اپنی ذات میں سمٹا ہ

خود آگہی کی سمت ہوا تھا میں
اب کیجئے تلاش مجھے، کھو گیا

مدت کے بعد صورتِ آئینہ
یوں لگ رہا ہے جیسے کوئی دوسر

ساتھی کوئی بنے نہ بنے بات تو
کب سے گلی کے موڑ پہ تنہا کھڑا

ہوں دشتِ آرزو میں اک آواز
کیفی جسے سنے نہ کوئی وہ صدا

غزلیں

(نذرِ مخدوم)

تُو نے کی زخم شماری بھی تو کیا آخرِ شب
دم دلاسہ رہا دستور ترا آخرِ شب

وقتِ پرواز ہر اک پنکھ نُچا ہے تو نہ ڈر
آسماں والوں میں ہلچل ہی مچا آخرِ شب

رات بھر خوابوں کے شیشوں کو بچائے رکھا
سنگ اندازوں کی بستی میں لُٹا آخرِ شب

ہوشمندی کا ہے ترے شہر میں' قحطِ غم ہے
ڈھونڈ کر اب کسی دیوانے کو لا آخرِ شب

رت جگے ہم نے کئے، ہم پہ ہی الزام آئے
یہ ملی جاگتے رہنے کی سزا آخرِ شب

یا اندھیروں کو عطا کر دے اُجالوں کا مزاج
یا میری آنکھوں میں سورج نہ اُگا آخرِ شب

ہم نشینی تو حریفوں نے ہی بخشی تھی خلش
سر پھرا میں ہی تھا، پہلو سے اُٹھا آخرِ شب

رؤف خلش

شاخ جھکی نہ کوئی گُل ہی کِھلا آخرِ شب
میں جو سورج تھا اکیلا ہی چلا آخرِ شب

لَب کشائی سے ترے علم کی کثرت جاتی!
لکھ لیا' دل پہ فقط' حرفِ دُعا آخرِ شب

آنکھ وہ شہر جو سیلاب میں ڈوبے نہ کبھی
ذہن وہ دشت کہ جلتا ہی رہا آخرِ شب

میری خواہش کہ پرندوں کی زباں بھی سمجھوں
اس لئے جاگتا رہتا ہوں سدا آخرِ شب

دھوپ زینے سے بناتی ہے سمندر پہ متین
خواب دیکھا تھا کہ بس ٹوٹ گیا آخرِ شب

غیاث متین

میرا میں مجھ سے خفا ہو کے چلا آخرِ شب
اور اونچی ہوئی دیوارِ اَنا آخرِ شب

آنکھ لگتے ہی چھنا کا سا ہوا آخرِ شب
آبگینوں کا بدن ٹوٹ گیا آخرِ شب

ہاتھ تو ہاتھ تھے، ہونٹوں کو بھی جنبش نہ ہوئی
صرف آنکھیں رہیں مصروفِ دُعا آخرِ شب

زندگی! تجھ سے میں شب بھر تھا مخاطب لیکن
کون روتے ہوئے محفل سے اُٹھا آخرِ شب

تیرا چہرہ مرے چہرے سے اُبھر آیا تھا
خود کو دیکھا تو اچنبھا سا ہوا آخرِ شب

اک سجیلا سا دمکتا ہوا بانکا چہرہ
مطلعِ دل سے نمودار ہوا آخرِ شب

وہ جو محنت کا محبت کا فرشتہ تھا نوید
نئے ذہنوں کو جگائے گا سدا آخرِ شب

علی الدین نوید

مجید بیدار

مہدی افادی کا تنقیدی شعور

تخلیق کے مرتبہ کا تعین اور فن پارہ کی ادبی حیثیت کو منوانے کے لئے جو عمل اختیار کیا جاتا ہے اسے تنقید کہتے ہیں۔ اردو زبان وا تنقیدی شعور کی پرچھائیاں بیسویں صدی میں ظہور پذیر ہوئیں۔ اس سے قبل اردو میں تنقیدی شعور بے ربطی کا شکار رہا۔ حالی اردو کے ناقد ہیں جنھوں نے ادب اردو میں اصولِ تنقید کو رواج دینے کی کوشش کی۔ لیکن تنقیدی شعور کا چلن اس دور میں معیار نہ بنا کے ادیب یا ناقد نے اردو اصنافِ سخن اور سرمایۂ اردو کو سائنسی بنیادوں پر مدون کرنے کا نظریہ پیش کرتے ہوئے اردو ادب میں کی فراہمی پر زور نہیں دیا۔

مہدی افادی اردو کے پہلے ناقد ہیں جنھوں نے ادبِ اردو کو ہدفِ تنقید بناتے ہوئے اور ارتقائے زبان کے لئے معلوماتی، اور علمی مواد کو زبانِ اردو کے لئے از حد ضروری قرار دیا۔ اسی باعث وہ اپنی کتاب "افاداتِ مہدی" میں مشوروں کی بنیاد پر اردو کی بقا کے لئے انسائیکلوپیڈیا، جدید ترین اردو لغت اور جدید سائنسی علوم پر کتابوں کی ضرورت کا اظہار کرتے ہیں جس مہدی افادی کے تنقیدی شعور کا پتہ چلتا ہے۔ اور اس بات کی جانکاری ہوتی ہے کہ مہدی نے اپنے خیالات کو اردو زبان کی ترقی وقف کر دیا تھا۔

مہدی افادی اردو کے ان انشا پردازوں میں ہیں جنھوں نے اپنے دور کی عام ڈگر سے علحدہ راستہ کیا اور اردو کے سرمایہ پر تعمیری ا ہوئے تنقید کو روا رکھا جو ان کے اعلیٰ تنقیدی شعور کی علامت ہے۔ مہدی افادی عالی ظرف کے حامل تھے۔ انہوں نے صرف تنقید کو برو ئے لایا بلکہ تعمیری اصول کو بھی پیش نظر رکھا جس کی وجہ سے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مہدی افادی کا تنقیدی شعور اردو ادب کے لئے مینارۂ نور کا رکھتا ہے۔

مہدی افادی کے تنقیدی شعور کو اجاگر کرنے والا ان کا عمل اردو لٹریچر پر "تنقید برائے تعمیر" کی بنیاد رکھتا ہے۔ مہدی نے تعمیری ا اردو ادب کے لٹریچر کا جائزہ لیا اور ادب کو افادی اغراض کے لئے استعمال کرنے کی خاطر تنقید کی بنیاد رکھی۔ اسی وجہ سے مہدی کی کو "تعمیری تنقید" کا نام دیا جا سکتا ہے۔ ان کی تحریروں میں مشوروں کا شامل رہنا خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنے تنقیدی شعور کو اغراض کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ اردو کو مہدی افادی جیسے بہت کم نقاد میسر آئے ہیں، جنھوں نے تنقید کے دوران مشوروں

حیثیت میں تنقید کے تعمیری پہلوؤں کا انکشاف کرنے کی وجہ سے مہدی کے طریقہ تنقید کو "تعمیری تنقید" کا نام دیا جا سکتا ہے ۔

ادب کو تعمیری اغراض سے منسلک کرنے کے لئے مہدی افادی نے تعمیری تنقید کی بنیاد رکھی ۔ "افادات مہدی" میں درج شدہ تمام مضامین میں تحقیق کے علاوہ تنقید برائے تعمیر کا عنصر پوری طرح سے غالب ہے جس کے ذریعہ مہدی اردو ادب کو مغربی ادب کے ہم پلہ بنانا چاہتے ہیں اور جدید ایجادات و اختراعات کے لبادہ میں اردو کو حسین اور دلفریب بنانے کے خواہاں ہیں ۔ مہدی افادی نے تعمیری تنقید کے ذریعہ اردو کو ایسا گلشن بنانا چاہا جس میں ہمہ رنگ و اقسام کے پھول کھلتے ہیں ۔ تعمیری تنقید اصل افادی کے ذہن کی ایسی جدید ترین پیداوار ہے جس میں نقاد کسی صاحب شخصیت یا فن پارہ پر تنقید کرتے ہوئے اس سے نیک توقعات وابستہ کرتا ہے اور شخصیت و فن میں نکھار کے لئے گذارشات کی بنیاد رکھتا ہے تاکہ تعمیری انداز میں ادب کی نمو ہو سکے اور شخصیت و فن میں افادی پہلو کی جھلکیاں نمودار ہوں ۔

مہدی افادی اپنی تحریروں کے ذریعہ صاحب شخصیت سے توقعات وابستہ کرتے ہیں اور قاری سے گذارش کرتے ہیں کہ وہ مطالعہ کے ذریعہ قوت شعور کو بلند کرے اور افادی اغراض کے لئے ادب کو استعمال کرے ۔ "افادات مہدی" میں متعدد جملوں میں متعدد جگہوں پر تعمیری تنقید کی نمائندگی ملتی ہے ۔ مہدی تعمیری نظریہ کے تحت ہلکا سا طنزیہ لہجہ بھی اپناتے ہیں جس کی وجہ سے تعمیری تنقید میں نکھار پیدا ہو جاتا ہے اور تنقیدی نظریات میں طنز کو بھی مقام مل جاتا ہے ۔ "نذیر احمد اور انسائیکلوپیڈیا آف اسلام" کے زیر عنوان تحریر کردہ مضمون میں مہدی افادی نے تعمیری پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے :

> "اگر سویلیزیشن اور سائنٹیفک ترقیات کے ساتھ بھی بقائے مذہب کی ضرورت ہے تو میں بلا خوف و تردید کہہ سکتا ہوں کہ سب سے پہلے جدید نسلوں کے ہاتھ میں ایک ایسی تالیف دینی ہوگی جو جامع معقول و منقول ہو اور جس میں اسلام کے فروغ و اصول پر حصول اطلاعات کا اتنا بڑا ذخیرہ موجود ہو جو انھیں آئندہ صدیوں میں واقفیت عامہ کے لحاظ سے ہمارا بہترین رہنمائے مذہب ہو سکے ۔" (افادات مہدی ص ۵۸)

تعمیری انتقادی نظر کا اظہار مہدی افادی کی فطرت میں داخل ہے ۔ چنانچہ وہ مستقبل کی قوم کو مذہب پر کاربند رکھنے کے لئے ایسا تعمیری زاویہ پیش کرتے ہیں کہ جس پر عمل کے بعد مذہب سے بغاوت مشکل نہیں تو ناممکن ضرور ہے ۔ وقت کے تقاضوں کے مطابق جامع مذہبی لٹریچر ترتیب دینا اور اسے ایک مبسوط کتاب کی شکل میں شائع کرنے کا نظریہ مہدی افادی کی ایسی بہترین رائے ہے جو صدیوں تک قوم کے لئے رہنمائے مذہب کی حیثیت رکھتی ہے ۔ اس مشورہ کے ذریعہ مہدی نے مستقبل میں قوم کے لئے تعمیری پہلو کو اجاگر کیا ہے جس سے ان کے تنقیدی شعور میں بالغ نظری اور مستقبل بینی کا اظہار ہوتا ہے ۔ اس کے علاوہ اس امر سے بھی واقفیت ہوتی ہے کہ مہدی کا تنقیدی شعور تعمیر پسندی کا مظہر ہے ۔ اسی طرح مہدی افادی ماحول و معاشرت میں رچے بسے سطحی اصول پر بھی تنقید کرتے ہیں تو اس میں بھی تعمیر کا عنصر نمایاں ہوتا ہے ۔ چنانچہ لکھتے ہیں :

> "ہمارے دیسی رئیسوں کو دیکھئے بہت کھینچ تان کر اگر ان کو علمی رنگ میں لائیں تو فنون لطیفہ کی ایک شاخ سے آگے نہیں بڑھتے یعنی ان کے حصے میں لے دے کے ایک طرح کی موسیقی رہ گئی ہے جو ہندوستان کی جاہلانہ ایجاد ہے — بلا شبہ اسپرٹ ان میں بھی ہے مگر اس کا مصرف ان کے ہاں کچھ بھی تفصیل کے لائق نہیں ۔"

(افادات مہدی صــ)

ہندوستان کے رئیسوں میں ذوق و شوق کا عمل بتلاتے ہوئے مہدی افادی یہ تنقید کرتے ہیں کہ وہ صرف فنونِ لطیفہ کی ایک یعنی موسیقی پر اپنے اوقات صرف کر رہے ہیں حالانکہ وہ اگر چاہیں تو دیگر معاملات میں بھی اپنی ترقی کا جال بچھا سکتے ہیں ۔ ان رئیسوں کی ہمتیں بلند کرنے کے لئے اپنے تعمیری نظریے کو دوبارہ تحریر کرتے ہیں اور ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان میں مادہ موجود ہے لیکن اسے بروئے کار لانے میں وہ پیچھے ہیں جس کی وجہ سے ان کی ترقی معکوس ہے اگر وہ اس پر توجہ دیں تو ترقی خود ان کے چومے گی ۔

موسیقی کو جاہلانہ ایجاد کہہ کر تنقید کرنا اور نیشنل اسپرٹ کی دیسی رئیسوں میں موجودگی کا اظہار مہدی افادی کے تنقیدی شعور کا ثبوت ہے اور وہ تنقید کے ساتھ ہی تعمیری نظریے کو بھی پیش کر رہے ہیں ۔ اس عمل سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مہدی افادی کا تنقید برائے تعمیر کا حامی تھا ۔

ڈپٹی نذیر احمد کے کارناموں سے اردو ناقدین بے اعتنائی نہیں برت سکتے ۔ بلکہ انھیں اردو ناول کا موجد تصور کرتے ہوئے م لیکن مہدی افادی نذیر احمد کے اس کارنامے کو سراہتے ہوئے بھی تنقید کرتے ہیں جس میں تعمیر کا عنصر پوری طرح نمایاں ہے ۔ وہ " افادات " کے صفحات پر لکھتے ہیں " مولانا نذیر احمد کو اپنی اعلیٰ درجہ کی عربیت کے ساتھ قاموس الاسلام (انسائیکلوپیڈیا) لکھنے کا خیال نہیں آیا ۔ پیمانے کو گھٹا کر کم سے کم " لغات اسلام " لکھ سکتے تھے ۔ اور یہ پھر بھی ایسی چیز ہوتی کہ یورپ اپنی فلسفیانہ تحقیق و تدقیق کے ساتھ نہیں جا سکتا تھا آئندہ نسلوں کے لئے یہ قیمتی وراثت موصوف کی باقی رہنے والی یادگاروں میں سب سے زیادہ پیش بہا ہوتی " (افادات

ڈپٹی نذیر احمد کے کارناموں پر چوٹ کرتے ہوئے مہدی یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ ہماری قوم کے سربراہوں کو ضرورت کی چیز خاص کی چیز کا لحاظ رہتا ہے جس کی وجہ سے ضرورتیں پس پشت رہ جاتی ہیں اور لوازمات آگے بڑھ جاتے ہیں ۔ مہدی کے گھٹی گھٹی سی کربیہ کیفیت پوشیدہ ہے جس کو وہ ظاہر بھی کرنا چاہتے ہیں اور چھپانے پر بھی غور کرتے ہیں ۔ نذیر احمد کی شخصیت اور مہدی معترض نہیں لیکن ان کے ذریعہ " قاموس الاسلام " کی ترتیب کو سونے پر سہاگہ کا درجہ دیتے ہیں اور تخئیل کی پابجائی سے وہ آئندہ نسلوں کے لئے فکرمند نظر آتے ہیں ۔ قوم کے مستقبل کے لئے فکرمندی مہدی کا ایسا ابھرتا طرز و انداز ہے جو تعمیری ذہن کرتا ہے ۔ ماضی پر تنقید کرتے ہوئے مستقبل کے لئے فکرمند رہنا تعمیری تنقید کی دلیل ہے ۔ اور مہدی کے تخیلات اس امر پر پوری ط آتے ہیں ۔

ادب میں فن پاروں کے درجہ کا تعین ناقدین کی تنقیدوں سے ہوتا ہے ۔ یعنی تنقید تخلیق کے مقام کی معاون ہوتی ہے ۔ تنقید میں نقاد تخلیق کا درجہ متعین کرنے کے لئے فکرمند نظر نہیں آتا ۔ بلکہ مستقبل میں قوم کا درجہ بلند کرنے کی سعی میں منہمک نظر آتا ہے ۔ اور تنقید برائے تعمیر میں یہی فرق ہے کہ تنقید کے ذریعہ صرف فن پاروں کے درجات کا تعین ممکن ہے ۔ لیکن ادبی تنقید پر تعمیر افضلیت حاصل ہے ۔ مہدی افادی تعمیری ذہن کو پیش کرنے کے لئے ارشاد فرماتے ہیں ۔

" آج کل سب پر فوقیت اس قدر بڑھ رہا ہے کہ جب تک کوئی کام اعلیٰ درجہ کے پیمانے پر نہ جاری کیا جائے پ نہیں سکتا " (افاداتِ مہدی ص ۲۱۵)

تعمیری ذہنیت اور نقد و نظر کی صلاحیت اس جملہ میں پوری طرح ابھر گئی ہے ۔ وہ تنقید کو تعمیری انداز میں فروغ دینا چاہتے

اردو زبان طبقہ سے معیارِ ذوق و فوقیت کے بدل جانے کا اظہار کرتے ہوئے جانچنے اور سوچنے کا ڈھنگ بدل جانے کا ادعا کیا ہے۔ انہوں نے ترقی کی راہیں حائل ہو جانے کا اظہار کر کے قدامت پسندوں اور قدیم ڈگر پہ چلنے والوں کو نئے طرز ادا اور انداز کے بدلتے طریقے سے مقابلہ کرنے اور عادات کے قدم سے قدم ملا کر چلنے پر زور دیا ہے۔ اس طرح مہدی معیارِ فوقیت پیش کر کے ہندوستانی افراد کو سوچ بچار کی دعوت دیتے ہیں اور ان سے توقع وابستہ کرتے ہیں کہ جانچنے کا انداز بدل جانے کی وجہ سے بھی وہ اعلیٰ اور معیاری خیالات پر توجہ دیں گے۔

مہدی افادی اگرچہ کہ کڑی تنقید کے حامی ہیں لیکن ان کے مکتوبات میں بکثرت تنقید برائے تعمیر کا نظریہ واضح ہے۔ وہ اردو زبان کو ترقی یافتہ زبانوں کے ہم قدم کرنا چاہتے ہیں اسی لئے انہوں نے اپنے مراسلوں میں انسائیکلو پیڈیا، وضع اصطلاحات کی ضرورت، جامع ترین لغت کی ترتیب کے باب میں اپنی رائے کو مقدم رکھا ہے۔ مراسلوں میں بار بار اس جانب نشاندہی سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہوتی ہے کہ مہدی افادی اردو کے محسن و مشیر ہونے کے علاوہ منفرد نقاد بھی تھے۔ جن کی تحریروں سے تعمیری تنقید کا رجحان فروغ پائے گا۔ ان کے نزدیک تنقید صرف معیار قائم کرنے اور تخلیق کا درجہ متعین کرنے کے عمل کا نام نہ تھا بلکہ وہ تنقید کا ایک وسیع مفہوم اپنے تفکرات میں رکھتے تھے۔ وہ تنقید کو تعمیری اغراض کے لئے استعمال کرنے کا ایک ذریعہ تصور کرتے تھے۔ اسی لئے "افاداتِ مہدی" میں تنقید کے ساتھ ہی انھوں نے تعمیری پہلو بھی ظاہر کر دیئے ہیں۔ جہاں وہ تنقید کرتے ہیں وہیں اس تنقید کے تعمیری گوشے کو بھی روشن کر دیتے ہیں۔ ان دلائل کی روشنی میں مہدی افادی کو اردو کا ایک تعمیر پسند نقاد کہنا بے جا نہ ہوگا۔ مہدی کے تنقید برائے تعمیر کی بنیاد پر جدید اردو کی پرشکوہ عمارت زمانۂ حال کی داستان بیان کر رہی ہے۔

بادۂ کہن

— فصاحت جنگ جلیل —

حافظ جلیل حسن جلیل ۱۸۶۶ء میں بمقام مانک پور (یو پی) پیدا ہوئے۔ لکھنؤ میں علوم متداولہ کی تکمیل کی۔ عربی اور فارسی میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ بچپن ہی سے شعر گوئی کا شوق تھا۔ ۲۰ سال کی عمر میں امیر مینائی کے سلسلۂ تلمذ سے وابستہ ہو۔ وقت والی رام پور کے استاد تھے۔ جلیل نے رام پور میں سکریٹری دفتر امیر اللغات کے فرائض انجام دیئے۔ ۱۹۰۰ء میں امیر کے ساتھ حیدرآباد آئے۔ امیر مینائی کے انتقال پر جلیل ان کے جانشین ہوئے۔ حیدرآباد میں مہاراجہ سرکشن پرشاد نے جلیل کی فرمائی اور اپنی نگرانی میں شائع ہونے والے دو رسالوں "دبدبۂ آصفی" اور "محبوب الکلام" کی ادارت ان کے تفویض کی۔

۱۹۰۹ء میں داغ دہلوی کے انتقال کے بعد والی دکن نواب میر محبوب علی خاں نے جلیل کو داغ کی جگہ دی۔ اور اپنا جب نواب میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع سریر آرائے سلطنت ہوئے تو انہوں نے بھی جلیل کو اپنی استادی کا شرف بخشا۔ جلیل القدر، امام الفن، فصاحت جنگ کے خطابات سے سرفراز فرمایا۔ ۱۳۶۵ھ (۵ جنوری ۱۹۴۶ء) میں حضرت جلیل کا انتقال ہوا اور یہیں تدفین عمل میں آئی۔

جلیل دبستانِ لکھنؤ کے آخری مسلّم الثبوت استادِ سخن تھے۔ ان کا حلقۂ تلمذ وسیع تھا۔ انہوں نے بحیثیت استادِ فن اردو زبان کی بے لوث خدمت انجام دی۔ جلیل کے کلام میں سلاست اور روانی کے علاوہ مضمون آفرینی، نازک خیالی اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔ ان کی شاعری میں جہاں قدیم رنگِ تغزل نمایاں ہے وہاں تصوف، فلسفہ اور درسِ اخلاق کی کمی نہیں ہے۔ جلیل کی تصانیف میں "تاجِ سخن، جانِ سخن، روحِ سخن، معراجِ سخن، سرتاجِ سخن، عطرِ سخن، گلِ صد برگ، معیارِ اردو، تذکیر و تانیث، اردو اور سوانحِ حضرت امیر مینائی قابلِ ذکر ہیں۔ استاد جلیل کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔ (میر سراج الدین علی)

یہ رنگ گلاب کی کلی کا — نقشہ ہے کسی کی کمسنی کا
منہ پھیر کے یوں چلی جوانی — یاد آگیا روٹھنا کسی کا

خوب انصاف تری انجمنِ ناز میں ہے — شمع کا رنگ جمے خون ہو پروانے کا

ہے چاروں طرف خدا کا جلوہ — پردہ تو کہیں اٹھے خودی کا
چاہتا ہوں اسے دیکھے نہ کوئی میرے سوا — محو شوقِ نقابِ رخ جاناں ہو جا

پردہ نہ تھا یہ صرف نظر کا قصور تھا
دیکھا تو ذرّے ذرّے میں اس کا ظہور تھا

فنا کے دوش پہ ہے بارِ ہستی
بھروسہ زندگانی کا بھلا کیا

کسی کا حسن اگر بے نقاب ہو جاتا
نظامِ عالمِ ہستی خراب ہو جاتا

ایک بجلی نظر میں کوند گئی
خاک نظارۂ جمال ہوا

دو دن کی ہے بہارِ چمن اس پہ ناز کیا
پھولوں کو آ رہی ہے ہنسی باغباں پہ

جلیل آساں نہیں آباد کرنا گھر محبت کا
یہ اُن کا کام ہے جو زندگی برباد کرتے ہیں

نگاہ برق نہیں چہرہ آفتاب نہیں
وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

عدم کے دشت میں پایا گیا ہوں
کہاں سے میں کہاں لایا گیا ہوں

ساتھ چلنے دو مجھے بھی رہروانِ کوئے دوست
کارواں میں کیا غبارِ کارواں ہوتا نہیں

جلیل انسان کرتا ہے ہزاروں خواہشیں لیکن
نکلنے کے جو ہوتے ہیں وہی ارماں نکلتے ہیں

پردے یہ سامنے ہیں تو دیکھے گا کیا اسے
دونوں جہاں کو اپنی نظر سے گرا کے دیکھ

ہم تم ملے نہ تھے تو جدائی کا تھا ملال
اب یہ ملال ہے کہ تمنا نکل گئی

پینے سے کر چکا تھا میں توبہ مگر جلیل
بادل کا رنگ دیکھ کے نیت بدل گئی

بات ساقی کی نہ ٹالی جائے گی
کر کے توبہ توڑ ڈالی جائے گی

آتے آتے آئے گا ان کو خیال
جاتے جاتے بے خیالی جائے گی

نقاب کہتی ہے میں پردۂ قیامت ہوں
اگر یقین نہ ہو دیکھ لو اٹھا کے مجھے

اس شان سے وہ آج پئے امتحاں چلے
فتنوں نے پاؤں چوم کے پوچھا کہاں چلے

جب میں چلوں تو سایہ بھی اپنا نہ ساتھ دے
جب تم چلو زمین چلے آسماں چلے

آنکھوں میں آ کے کون الٰہی نکل گیا
کس کی تلاش میں مرے اشک رواں چلے

جب تک خلشِ درد تھی یک گونہ مزہ تھا
جب سے مجھے آرام ہے آرام نہیں ہے

جب مو صد ہم نے غنچہ کا دیکھا
تبسم پہ ساری جوانی لٹا دی

اب کون پھر کے جائے تری جلوہ گاہ سے
اے شوخ چشم پھونک دے برقِ نگاہ سے

رواں ہے عمر اور انسان غافل
مسافر ہے کہ سوتا جا رہا ہے

عکس ہے آئینۂ دہر میں صورت میری
کچھ حقیقت نہیں اتنی ہے حقیقت میری

سارے جہاں میں جلوہ نما ہے وہ خود نما
سارے جہاں سے آپ کو پنہاں کئے ہوئے

تم یہاں سے کیا گئے مری دنیا ہی بدل دی
وہ لطف نہیں وہ سحر و شام نہیں ہے

اے چمن کے رہنے والو یوں گذارا چاہیئے
باغباں بھی خوش رہے راضی رہے صیاد بھی

حیدرآباد کے شاعر

(۲۱)

رازؔ عابدی

۱۹۶۲ء میں ریاستی ساہتیہ اکیڈمی کے مطبوعہ دو جلدوں کا توسیعی سلسلہ

میر محمد علی، رازؔ عابدی، حیدرآباد کے بزرگ شعراء میں اپنی فکر اور سخن کے اعتبار سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ ... پیشہ آباء سپہ گری رہا مگر انہیں شعری و ادبی ماحول نے عزت بخشی، شرفائے دکن سے ہیں، جو ۱۹۲۰ء میں پیدا ہوئے، گھر کا ماحول ادبی اور تہذیبی رہا۔ جدِ اعلیٰ حضرت باقرؔ، فصیح الملک داغؔ دہلوی کے گرامی تلامذہ میں شمار کیے جاتے ہیں۔ والد میر ثابت علی ثابتؔ تخلص کرتے تھے اور اپنے وقت کے قادر الکلام سخنور تھے۔ بھائی جوہرؔ عابدی بھی شعر و ادب کا روشن ذوق رکھتے تھے۔ رازؔ عابدی کا ماحول سے اثر لینا ضروری تھا۔ تقریباً چالیس سال سے شعر کہتے ہیں، غزل، سلام، نوحے، منقبت خوب کہتے ہیں، ابتداءً حضرت ہادیؔ کنتوری سے رجوع رہے، ازاں بعد علامہ میر محمد علی اسرؔ کے آگے زانوئے شاگردی طے کیا۔ حیدرآباد میونسپل کارپوریشن میں انسپکٹر کے عہدہ سے ۳۰ نومبر ۱۹۷۴ء کو سبکدوش ہوئے۔ شعری محفلوں میں کلام سناتے اور داد پاتے ہیں۔ شعری مجموعہ "شعلۂ غم" مرتب ہوا ہے اور اشاعتی مراحل میں ہے۔ کلاسیکی طریقِ سخن کے شعراء میں رازؔ عابدی اپنی شخصیت اور فن کے لحاظ سے سرمۂ چشم سمجھے جاتے ہیں، وضعداری اور انسان دوستی کے اوصاف سے عبارت فرد ہیں۔ (د، خ)

آخری کام محبت میں یہ کر لینا ہے — دامنِ دل کو ترے درد سے
منزلِ ترکِ تمنا میں وفا آ پہنچی — کس کو اب آپ کی باتوں
ہمکو اب فرصتِ آزار شماری تو نہیں — جائزہ اپنی وفاؤں کا
کچھ مراسم تھے ترے ذوقِ ستم سے دل کے — شکوہ کرنا ہے نہ اب غم
اپنے ہی نام سے ہم اُن کو صدا دیتے ہیں — ہو کے مجبور کوئی نام اگ
دل نے تو ساتھ دیا منزلِ ناکامی میں — امتحاں تیرا ابھی اے دیدۂ

زخمِ دل، داغِ جگر، نالۂ غم، اشکِ الم
رازؔ ہمراہ یہی زادِ سفر لیتا ہے

بیچ رستے میں اگر چھوڑ کے جاؤ گے مجھے — اور اُلجھے ہوئے حالات
چپ رہوں گا تو شرافت مجھے طعنہ دیگی — سچ بتاؤں گا تو سُولی
میں سمجھ لوں گا اسے اپنی محبت کا صلہ — تم اگر اپنے ہی ہاتھوں سے
خوشنما وعدے غنیمت ہیں تسلی کے لئے — جاگتی آنکھوں سے کیا خوا
فکر زخمی ہے، نظر زخمی ہے، دل زخمی ہے — کیا محبت میں فقط زخم

رازؔ کندن کی طرح ضبط نکھر جائے گا
شعلۂ غم میں اگر اور جلاؤ گے مجھے

ہر لفظ میں اب تک وہی خوشبوئے وفا ہے — کس ہاتھ نے یہ پیار کا
ہر عہد کا جادہ مرے قدموں سے بنا ہے — ہر دور کے ماتھے پہ مرا
مانوس ہوں اس طرح میں کلیوں کی چٹک سے — جیسے یہ مرے دل کے د
رہ رہ کے تمہیں دل نے کئی بار پکارا — تنہائی میں ایسا بھی کو
ہر شخص کے لہجے میں ہے بیزار اُداسی — جیسے کوئی مقتل کا

کرتے ہیں ادا رازؔ ہر ایک سانس کی قیمت
اس دور میں جینا بھی تو جینے کی سزا ہے

نہ خارِ غم نہ گلِ تر مری تلاش میں ہے — مرے وجود کا پیکر
کسی بھی غم سے پتہ میرا پوچھ لینا تھا — سُنا ہے کوئی ستمگر
جراحتوں کا تسلسل ہے زندگی میری — نگاہِ وقت کا خنجر ہر
میں زندگی میں اُسی آدمی سے ڈرتا ہوں — جو میری راہ سے ہٹ
تمام عمر جو دل کے صنم کدے میں رہا — خوشا نصیب وہ پتھر

پلٹ کے رازؔ میں بالشتیوں کو کیا دیکھوں
بلندیوں کا مقدر مری تلاش میں ہے

غزلیں

سحر سعیدی

میری آواز پہنچ پائی نہ باہر کی طرف
میں اُسی گرتے ہوئے گھر میں تھا اندر کی طرف

پھیلنے لگی نظروں میں سیاہی شب کی
آنکھ اُٹھی جو کسی ڈوبتے منظر کی طرف

وہ ندی ہے کسی صحرا سے ملے گی کیسے
وہ تو ہر حال میں جائے گی سمندر کی طرف

میری پرواز پہ تھیں سب کی نگاہیں لیکن
کس نے دیکھا مرے جلتے ہوئے شہپر کی طرف

تھک کے لوٹ آیا ہوں خوابوں کی گذرگاہوں سے
کون دیکھے اسی دیکھے ہوئے منظر کی طرف

میں نے منصوبے تواضع کے بنائے کیا کیا
اس کو آتے ہوئے دیکھا جو کبھی گھر کی طرف

لوگ منظر کے طلسمات میں کھوتے ہی گئے
آنکھ اُٹھی نہ کسی کی پس منظر کی طرف

تم کو ٹھہرائیں گے سب مورد الزام سحر
کوئی اُنگلی نہ اُٹھائے گا ستمگر کی طرف

نظیر صفی پوری

دل میں ترا خیال نہ ہو اور تو نہ ہو
ممکن نہیں ہے پھول تو ہو رنگ و بو نہ ہو

کیوں دل کا نام دیں اُسے پتھر نہ کیوں کہیں
جس دل میں تیرا درد تری جستجو نہ ہو

دل پر نقوش چھوڑ سکے گا کیسے کوئی کلام
جذبات کی زباں میں اگر گفتگو نہ ہو

اے شیخ منع کیجئے ہم کو شراب سے
لیکن کچھ اس طرح سے کہ اس میں غلو نہ ہو

رنگِ قلم سے ہم نے مہذب کیا اُسے
گر ہم نہ ہوں تو تذکرۂ لکھنؤ نہ ہو

کیوں اپنے عکس سے ہی بہلنے لگا ہوں میں
اس آئینے میں سوچ رہا ہوں کہ تو نہ ہو

چاہوں تو بس اُسی کو میں چاہا کروں نظیر
اس آرزو کے بعد کوئی آرزو نہ ہو

مرغوب علیخاں

زرد موسم کے کرشمے دیکھنا
شاخ کو تنہا ترستے دیکھنا

جان و دل کی راہ میں اک موڑ پر
کتنے بے رس ہوں گے جھولے دیکھنا

درد کی رُت میں بکھر جائیں گے سب
ریت کی مانند رشتے دیکھنا

تیز بارش میں نہ ہو جائیں فنا
کچی مٹی کے گھروندے دیکھنا

رابطوں کے پُل بکھر جائیں تو پھر
زنگ آلودہ دریچے دیکھنا

سب رنگ

اس عنوان کے تحت ہندوستان و پاکستان کے معیاری ادبی کتب و رسائل سے مضامین، نظم و نثر کا انتخاب شائع ہوتا ہے۔

محمد عبداللہ قریشی

مولانا محمد علی: رزم سے بزم تک

رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر اردو کے قادر الکلام شاعر، انگریزی کے زبردست ادیب، نڈر صحافی، آتش بیان مقرر، ماہر سیاست دان، پاک و ہند کی کامل آزادی کے مخلص علم بردار اور مسلمانوں کے محبوب ترین رہنما تھے۔ ۱۸۷۸ء میں رام پور میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ سے بی اے کیا۔ انڈین سول سروس کی تعلیم کے لئے انگلستان گئے، واپس آکر کچھ عرصہ رام پور اور بڑودہ میں ملازمت کی۔ پھر ملازمت سے استعفیٰ دے کر ۱۲ جنوری ۱۹۱۱ء کو کلکتے سے کامریڈ جاری کیا مگر جلد ہی اسے دہلی لے آئے۔ اس میں انگریزی انشاء پردازی کے وہ جوہر دکھائے کہ ایچ۔ جی۔ ویلز جیسا انگریزی ادیب یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ "محمد علی نے برک کی زبان، میکالے کا قلم اور نپولین کا دل پایا ہے۔"

دراصل ان کا دماغ مغربی لیکن دل مشرقی تھا۔ وہ طرابلس اور بلقان کی جنگوں میں مسلمانوں کی مظلومی پر تڑپ اٹھے۔ ترکوں سے ہمدردی کی پاداش میں چند واڑہ میں نظر بند کر دیئے گئے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں کانگرس کا ساتھ دیا۔ پھر چند وجوہات کی بنا پر کانگرس سے الگ ہو کر کامل آزادی کا مطالبہ کیا اور گول میز کانفرنس میں شریک ہو کر مشرق کی حمایت میں مغرب میں مغرب ہی کے ہتھیاروں سے لڑے۔ آخر ۱۲ شعبان ۱۳۴۹ھ مطابق ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو ترپن برس کی عمر پا کر لندن میں انتقال کیا اور بیت المقدس میں دفن ہوئے۔ یوں کہنا چاہیئے کہ وہ ایک آفتاب تھے جو مشرق سے طلوع ہوا، مغرب میں غروب ہوا اور اب مشرق و مغرب کے مرکز بیت المقدس میں آرام فرما ہے۔ مولانا نے اپنی مسافرانہ موت کی پیشن گوئی خود ہی کر دی تھی، "مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دور"

بقول سلیمان ندوی — "ان کی رحلت کے ساتھ ہی وہ پُر درد آواز جو ۱۹۱۱ء سے ۱۹۳۰ء تک ہندوستان اور دنیائے اسلام کے ہر قیامت آفریں سانحہ میں صدائے صور بن کر بلند ہوئی تھی ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی۔ وہ بے قرار دل جو اسلام اور مسلمانوں کی ہر مصیبت کے

بے تاب ہو ہو جاتا تھا۔ اور دوسروں کو بھی بے تاب کرتا تھا، قیامت تک کے لئے ساکن ہوگیا۔ وہ اشک آلود آنکھیں جو دین و ملت کے غم میں آنسوؤں کا دریا بہاتی تھیں، ہمیشہ کے لئے بند ہوگئیں۔ وہ پر جوش سینہ جو ہمارے مصائب کے پہاڑوں کو سیلاب بن کر بہا دیتا تھا اس کا تلاطم ہمیشہ کے لئے ختم گیا۔ وہ پُرزور دست و بازو جو شب و روز خدمت گذاری اور نبرد آزمائی میں مصروف رہتے ایسے بے حس ہو گئے۔

مولانا محمد علی ملت کے عزادار تھے۔ اب ساری ملت ان کی عزادار ہے۔ وہ پاک و ہند کے ماتم دار، طرابلس کے سوگوار، سمرنا کے لئے غم زدہ، بلقان کے اشک بار، شام پر گریاں، انگورہ پر مرثیہ خواں، حجاز کے لئے سوختہ غم اور بیت المقدس کے لئے وقف الم تھے۔ ان کا حق سرزمین اسلام کے چپہ چپہ پر تھا۔ ان کے لئے اولین قبلۂ اسلام کا سینہ پھٹ گیا اور وہ اس میں سما گئے۔"

اقبال نے کیا خوب کہا تھا ؎

خاکِ قدس اورا با آغوشِ تمنا در گرفت　　سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گذشت
جلوۂ او تا ابد باقی بچشمِ آسیاست　　گرچہ آں نورِ نگاہِ خاوراں از خاور گذشت

مولانا محمد علی جوہر کے کارناموں میں ان کی غزل سرائی کوئی بڑا درجہ نہیں رکھتی لیکن جس طرح ان کی آخری پیش گوئی کی صداقت کو دنیا نے دیکھا اور تسلیم کیا کہ وہ غلام ہندوستان میں واپس نہیں آئے۔ ان کے مرنے پر معلوم ہوا کہ انہوں نے زندان خانہ میں بیٹھ کر جو ابیات کو نظم کیا تھا وہ سرتاسر صداقت تھے اور پیشن گوئیوں کی عجیب و غریب مثالیں، انہوں نے کہا تھا ؎

اللہ ہی کے رستے میں جو موت آئے تو اچھا　　اکسیر ہی ایک دعا میرے لئے ہے

ان کی یہ پُرتاثیر دعا اکسیر بنی اور ان کے حق میں قبول ہوئی۔ ان کا ماتم جس طرح دنیا میں ہوا، مشرق و مغرب ہوا، پاک و ہند میں ہوا، عالم اسلام میں ہوا، فلسطین اور اس کے بیت المقدس میں ہوا، وہ شاید ہی کسی کے لئے ہوا ہو۔ صاحب دل شاعر کی صداقت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے

ہے ماتم یہ زمانے میں بپا میرے لئے ہے۔

مولانا کی زندگی کا ایک رخ یہ بھی تھا کہ وہ نہایت زندہ دل، یار باش اور بے تکلف انسان تھے۔ ان کی طالب علمی کے زمانے کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ آکسفورڈ یونیورسٹی میں ایک اجتماع ہوا جس میں طے پایا کہ سب ملکوں کے طالب علم اپنے اپنے قومی ترانے سنائیں۔ ان کی نمائندگی مولانا محمد علی کے حصے میں آئی۔ اقبال کا قومی ترانہ اس وقت تک رائج نہ ہوا تھا۔ انگریزی ترانہ God save the King (خدا بادشاہ کو سلامت رکھے) سنایا جاتا تو بڑی بے عزتی ہوتی۔ آخر ان کو اس مصیبت سے چھٹکارا پانے کی ایک دلچسپ ترکیب سوجھ گئی۔ جب ان کی باری آئی تو انہوں نے اسٹیج پر پہنچ کر ترنم سے مصرع اٹھایا،

بی بی مینڈک کی رِی، تو تو پانی کی ہے رانی ... بی بی مینڈک کی رِی۔

تالی تھاپ اور پاؤں کی تھاپ سے یہ قومی ترانہ اس انداز سے گایا کہ دوسرے طالب علموں پر وجد طاری ہو گیا اور بھی جھوم جھوم کر گانے لگے۔ لطف یہ ہے کہ اس مقابلے میں ہندوستان کا ہی ترانہ اوّل نمبر پر آیا۔

آکسفورڈ ہی کی تعلیم کے دوران تعطیلات کا زمانہ آیا۔ اکثر طلبہ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ بعض نے سیر و تفریح کی غرض سے یورپ کی سیرگاہوں کا رخ کیا۔ مولانا کو ان دنوں مچھلیاں پکڑنے کا بہت شوق تھا۔ انہوں نے بھی رخت سفر باندھا اور آکسفورڈ کے

کے نزدیک تالاب کے کنارے کانٹا ڈالے۔ ایک روز ندی کے کنارے سارا دن بیٹھے رہے لیکن کوئی مچھلی ہاتھ نہ آئی۔ دن ڈھلنے لگا تو لیٹے۔ ندی کے پاس ہی ایک پرانی وضع کی عمارت تھی جس کے در و دیوار پر وحشت اور اداسی برس رہی تھی۔ سلاخوں والے دریچوں سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ یا پاگل خانہ ہے۔ اتنے میں دریچہ کھلا اور ایک شخص کا چہرہ دکھائی دیا اس نے مولانا کو اشارے سے بلایا اور پوچھا

"تم کون ہو؟" — "میں طالب علم ہوں اور آکسفورڈ میں پڑھتا ہوں" — "یہاں کیا کرنے آئے ہو؟" — "مچھلیاں پکڑنے" "کوئی مچھلی ہاتھ آئی؟" — "ایک بھی نہیں" "تو پھر یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو، اندر آؤ"۔

مولانا کہا کرتے تھے کہ اس پاگل کا یہ فقرہ مجھے ساری عمر یاد رہا۔

دلّی کے ایک شہزادے کو مصوری کا بہت شوق تھا۔ روغنی تصویر بناتے تھے۔ غالباً یہی بے چارے کی معاش کا ذریعہ تھا۔ انہوں نے مولانا کو دلّی کی جامع مسجد کی تصویر پیش کی۔ تصویر بہت اچھی تھی۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر چونکہ گداگروں کی موجودگی ایک لازمی بات ہے اس لئے مصور نے بھی نقل کو اصل دکھانے کی غرض سے ایک سیڑھی پر ایک عورت دکھائی تھی جو پھٹا پرانا برقع اوڑھے اور ننگے بچوں کو ساتھ لئے کھڑی تھی۔ عورت کا ہاتھ بھیک کے لئے برقع سے باہر نکلا ہوا تھا۔ اور تصویر کے نیچے لکھا تھا "بھکارن"۔ —

مولانا نے تصویر دیکھ کر کہا "بھائی مجھے آرٹ کے سلسلے میں زیادہ شُد بد تو نہیں ہے مگر میں یہ تصویر لینے اور ہدیہ دینے کو تیار ہوں بشرطیکہ میری بات مانو اور اس کا نام بھکارن مٹا کر جو فقرہ میں عرض کروں وہ درج فرما دو — مصور کو نام پر ہی تو ناز تھا۔ اس نے حیران ہو کر پوچھا بھلا کیا درج کر دوں؟ مولانا نے پنسل سے ایک کاغذ پر لکھ دیا: "HER FATHER BUILT IT" (اس عمارت کو اس کے اجداد نے بنایا تھا) شہزادہ صاحب نے یہ مشورہ قبول کر لیا۔ اب وہ جامع مسجد کی معمولی تصویر نہ تھی بلکہ آلِ تیمور کا مرقعِ عبرت تھی مولانا محمد علی کے ڈرائنگ روم میں جو صاحب نظر اسے دیکھتا وہ گرم آنسو یا ایک ٹھنڈی سانس اسے بطورِ خراج ادا کئے بغیر نہ رہتا تھا۔

"ہمدرد" کے آخری دور میں مولانا کو ایک آرٹسٹ کی ضرورت تھی۔ ہوشنگ آباد کے عبدالسمیع خاں اس سلسلے میں ان سے ملنے آئے مولانا نے پوچھا "آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟" — سمیع صاحب نے کہا "میں سی۔ پی (صوبجات متوسط) کا رہنے والا ہوں" — مولانا نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا "کیا سی پی میں آرٹسٹ بھی ہوتے ہیں؟" — سمیع صاحب نے جواب دیا "آرٹسٹوں کو چھوڑیئے سیپی میں موتی ہوتے ہیں" — مولانا اس حاضر جوابی پر پھڑک اٹھے اور اس قدر خوش ہوئے کہ انھیں فوری ملازم لیا۔ اس کے بعد جب کبھی "بڑوں" سے ان کا تعارف کراتے تو کہتے "یہ سی پی کے موتی ہیں" —

ایک دفعہ مولانا سیتاپور میں گاندھی جی کے ساتھ بیٹھے شریفے کھا رہے تھے۔ گاندھی جی نے کہا "مولانا آپ کو ذیابیطس کی شکایت ہے۔ شکر آتی ہے۔ آپ شریفے نہ کھائیے" مولانا نے کہا "واہ کیوں نہ کھاؤں — ؟ سسرال کا مال بھی نہ کھاؤں؟" سسرال کا لفظ سن کر گاندھی جی چونکے تو مولانا نے وضاحت کی کہ حیران نہ ہوجیئے۔ میں رام پور کا رہنے والا ہوں اور شریفے سیتاپور کے ہیں رام اور سیتا کے رشتے پر غور کیجئے تو یہ شریفے سسرال کے ہوئے یا نہیں"

کانگرس نے جب نمک بنانے کی تحریک شروع کی تھی تو گاندھی جی نے مولانا محمد علی کو بھی نمک بنانے اور سول نافرمانی کی دعوت دی مولانا نے اپنی بیماری (ذیابیطس) کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

"میں بھلا نمک کیا بناؤں گا۔ قوم کے غم میں دس سال سے شکر جو بنا رہا ہوں"

نان کواپریشن یعنی عدم تعاون کی تحریک کی باگ ڈھیلی ہوتے ہی ہندوستان کی سیاست میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ایک طبقہ اسمبلیوں میں جانے اور اپنی تحریری مہم جاری رکھنے کا حامی ہوگیا۔ یہ لوگ ماڈریٹ کہلاتے تھے۔ مولانا محمد علی نہیں چاہتے ہندوستانی نمائندے اسمبلیوں میں جائیں اور تضیع اوقات کریں۔ اس لئے انہیں نوچینجر NO CHANGER کہتے تھے۔ ان ہی اتفاق ہے کہ مولانا محمد علی اسمبلی کا تماشہ دیکھنے کے لئے پریس گیلری میں جاکر بیٹھ گئے۔ پنڈت شیام لال نہرو نے انہیں دیکھا "مسٹر محمد علی! جب آپ یہاں تک تشریف لے آئے ہیں تو پھر نیچے بھی آجایئے"۔

مولانا نے برجستہ جواب دیا I STILL LOOK DOWN UPON YOU (میں تو اب بھی اس بلندی سے آپ کی پستی دیکھ رہا ہوں)

دہلی میں اسمبلی کا اجلاس ہورہا تھا۔ مولانا عربی لباس یعنی جبہ پہنے تشریف لائے۔ پنڈت مدن موہن مالویہ نے مذاقاً کہا "اوہو! آپ! میں سمجھا تھا شاید بیگم بھوپال تشریف لا رہی ہیں"۔ مولانا نے فوراً جواب دیا — "ہاں۔ واقعی۔ اس زنانہ اسمبلی میں مردوں کا کیا کام"؟

روزنامہ زمیندار اور ہمدرد کی قلمی جنگ جاری تھی۔ مولانا ظفر علی خاں زمیندار میں مولانا محمد علی جوہر کے خلاف اور مولانا محمد علی ان کے ہمدرد میں لکھ رہے تھے۔ انہی دنوں خلافت کمیٹی کا کوئی اجلاس ہوا جس میں دونوں شریک تھے۔ مولانا ظفر علی خاں کسی تجویز سے ناراض ہو کر واک آؤٹ کر گئے۔ مولانا کے صاحبزادے اختر علی خاں اور زمیندار کے معاون ایڈیٹر مولانا غلام رسول مہر نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ مولانا دونوں بیمار تھے اور سیٹ پر لیٹے لیٹے اجلاس کی کارروائی میں حصہ لے رہے تھے، وہ جھٹ اٹھ بیٹھے اور بے ساختہ بولے،

"غضب ہوگیا، باپ بیٹا اور روح القدس تینوں خفا ہوگئے"۔

۱۹۲۱ء یا ۱۹۲۲ء میں مولانا مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر (اعظم گڑھ) کے اجلاس میں تشریف لے گئے۔ جلسہ مدرسے کے وسیع میدان میں ہوا۔ مولانا نے دھواں دھار تقریر کی۔ تقریر کے خاتمے پر مجمع کے ایک گوشے سے ایک بڑھا دیہاتی اٹھا اور مجمع کو چیرتا ہوا سیدھا طرف بڑھا۔ اگرچہ اسٹیج تک پہنچنے میں اسے سخت مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن وہ اپنی دھن کا پکا تھا۔ اس نے مولانا کے پاس دم لیا۔ اور مولانا کی داڑھی چوم کر کہا، "واللہ محمد علی! جو تو نے کہا وہ کسی سے نہ ہوسکا" یہ کہہ کر وہ مڑا تو مولانا نے فرمایا، "اس طرح کی داد بھی آپ کے سوا مجھے کسی اور سے نہیں ملی"۔

۱۹۲۱ء ہی کی بات ہے۔ رفاہ عام لکھنؤ کے جلسہ میں مولانا کی تقریر تھی۔ ڈائس پر مولانا شوکت علی اور دیگر بہت سے رہنما بیٹھے نعروں اور تالیوں کی گونج میں مولانا تقریر کے لئے کھڑے ہوئے۔ اور ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا۔ جب وہ برطانوی سیاست کے بخیے ادھیڑنے پر آتے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ "جنگل کا شیر گونج رہا ہے کچھار میں"

جب تقریر نقطۂ عروج پر پہنچی تو ایک گوشے سے کسی نے کہا "آواز نہیں آرہی ہے"۔ مولانا نے گرج کر کہا "جن لوگوں تک آواز نہیں پہنچ رہی، ان کے کانوں پر برطانوی سامراج کی مہریں لگی ہوئی ہیں۔ وہ میری تقریر کبھی نہیں سن سکیں گے۔ لہٰذا رہنے دیں"۔ اس پر پورا پنڈال قہقہوں سے گونج اٹھا۔

شملہ کی ایک دعوت میں مولانا خلافتی لباس میں رونق افروز تھے۔ اردو میں باتیں کرتے کرتے کسی بات پر الجھ کر انگریزی ۔۔ اب بھلا کون ان کے سامنے دم مارنے کی جرأت کرسکتا تھا۔ ایک ہندوستانی نے مولانا کو اس قدر روانی سے انگریزی تو حیرت سے پوچھا، "اتنی اچھی انگریزی آپ نے کہاں سیکھی؟"

مولانا نے جواب دیا " ایک جم کے سے قصبے میں "۔ یہ سن کر انی نے بڑے اشتیاق سے پوچھا " کونسے قصبے میں ؟ "
" آکسفورڈ " مولانا نے جواب اور ساری محفل زعفران زار بن گئی ۔

۱۹۲۸ء کا زمانہ تھا ۔ سائمن کمیشن ہندوستان آیا ہوا تھا ۔ ملک بھر میں اس کی مخالفت ہو رہی تھی ۔ لیکن مسلمانوں کا ایک گروہ اس سے تعاون کو تیار تھا جس کے خلاف ایک جلسہ لکھنو میں ہوا ۔ مولانا محمد علی کو اس میں تقریر کرنا تھا ۔ خبر گرم تھی کہ کچھ لوگ اس جلسے میں گڑبڑ مچائیں گے ۔ اور مولانا حسرت موہانی ان کی پشت پناہی کریں گے ۔ مولانا محمد علی تقریر کے لئے کھڑے ہوئے چند ہی جملے بولنے کے بعد وہ حسرت صاحب کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا

" حسرت صاحب ! آپ کمیشن کے ساتھ موافقت کے حق میں ہیں یا مخالفت کے ؟ " ۔۔۔ " جی میں ! نہ میں موافق ہوں نہ مخالف "
مولانا محمد علی نے کہا " اچھا تو یہ کہیئے کہ آپ نہ کوآپریشن چاہتے ہیں نہ نان کوآپریشن بلکہ صرف آپریشن چاہتے ہیں "
جلسہ اس پر خوب ہنسا اور ہڑبونگ کا سارا منصوبہ خاک میں مل گیا ۔ پھر کسی کو گڑبڑ مچانے کی جرأت نہ ہوئی ۔

مولوی ظفر الملک علوی مدیر " الناظر " لکھنو ' ایک جلسے میں سبز عمامہ اور سبز لبادہ اوڑھے ہوئے پہنچے ۔ مولانا محمد علی بھی شریک تھے ۔ انہوں نے دیکھتے ہی فرمایا " یہ ہریل کہاں سے آگیا ؟ "

یہ تھے مولانا محمد علی جوہر مرحوم ' جن کی ولادت کو اب سو سال پورے ہوتے ہیں ۔ آج سے نصف صدی پیشتر تک وہ ہر بزم میں بلبل خوش نوا بن کر چہکتے تھے ۔ اب ہمارے کان ان کے ترانے سننے کو ترس رہے ہیں ۔ مگر وہ کبھی نہیں گونجیں گے ۔ ان کی آتشیں زبان ہر رزم میں تیغ براں بن کر چمکتی تھی ۔ مگر اب اس کی تابش کسی معرکے میں نظر نہیں آئے گی ۔

(ماہنامہ " المعارف " لاہور)

پروین شاکرہ

غزل

ٹوٹی ہے میری نیند مگر تم کو اس سے کیا
بجھتے رہیں ہواؤں سے در تم کو اس سے کیا

تم موج موج مثل صبا گھومتے رہو
کٹ جائیں میری سوچ کے پر تم کو اس سے کیا

اوروں کا ہاتھ تھامو انہیں راستہ دکھاؤ
میں بھول جاؤں اپنا ہی گھر تم کو اس سے کیا

ابر گریز پا کو برسنے سے کیا غرض !
سیپی میں بن نہ پائے گہر تم کو اس سے کیا

لے جائیں مجھ کو مال غنیمت کے ساتھ عدو
تم نے تو ڈال دی ہے سپر تم کو اس سے کیا

تم نے تو تھک کے دشت میں خیمے لگا لیے
تنہا کٹے کسی کا سفر تم کو اس سے کیا

(مجموعۂ کلام " خوشبو " سے)

نقد و نظر

(تبصرے کیلئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

شامِ شہرِ یاراں : (متفرق کلام) شاعر : فیض احمد فیض ، صفحات ۱۳۶ ۔ قیمت مجلد دس روپے / غیر مجلد چھ روپے
ناشر : مکتبۂ جامعہ لیمیٹیڈ ۔ جامعہ نگر دہلی 110025 اردو بازار دہلی ۔

ترقی پسند تحریک نے اردو زبان کو عظیم شاعروں سے نوازا اور اس حقیقت سے انکار سخن فہمی کی تردید ہے ۔ اس تحریک نے شعر و ادب کو انسانی سماج پر مرکوز کر دیا ۔ یہ موضوع ایسا ہے کہ متنوع شعری پرتو سامنے آئے ۔ ایک طرف شاعری بانگِ دہل بن گئی ، حفیظ جالندھری ، جوش ملیح آبادی ، ساغر نظامی ، احسان دانش ، دوسری طرف شاعری تند نوا بن گئی ۔ ساحر لدھیانوی ، مخدوم ، میراجی ، احمد ندیم قاسمی ، تیسری طرف ایک ذاتی شاعری نفیس انقلابی لب و لہجہ سے آراستہ سامنے آئی ۔ اس کارواں کے نمائندہ شاعر ہیں فراق ، فیض ، ناصر کاظمی ، خلیل الرحمٰن اعظمی ، سردار جعفری ۔

ترقی پسند تحریک کا کلائمکس آزادی سے قبل کچھ پندرہ بیس برسوں سے آزادی تک تھا ۔ اور پھر نئے اور آزاد ماحول میں شعری لب و لہجہ درجہ بدرجہ بہر حال ضرور تبدیل ہوتا رہا ۔ اس عصری تبدیلی سے پہلا گروپ زیادہ متاثر نہ ہوا ۔ ان کی آواز کی جاگیردارانہ قوت تقدس اور پیمبری کا لستا لبھیانی رخ اختیار کرنے لگی ۔ تلخ نوا ساحر کا لب و لہجہ بھی زیادہ نرم نہ ہوا ۔ مخدوم نے اسرار وجود کے نئے زاویہ کو تسلیم کر لیا اور انتہائی خوب صورت نظمیں اپنے آخری دور کے سرمایہ کی شکل میں چھوڑیں جن میں ان کی انفرادیت بھی ہے اور تند نوائی بھی ۔ لیکن انداز نیا ہے ۔ میراجی تجربات شعر ، قاسمی تا حال بالذات شاعری کی طرف مائل ہوئے ۔

تیسرا قافلہ اپنے پہلے ہی دور میں عالمی ادب عالیہ کی طرف مائل تھا ۔ اور " عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ " کا صحیح وجودی ترجمہ تھا ۔ اس لئے بہت ہی کم وقت سے فراق سے نئے دور سے ہم آہنگ ہو گیا ۔ اور ان کا RELEVANCE مستند ہو گیا ۔

فیض ایک عظیم شاعر بھی اور ان کی شاعری ہمارے لئے کاشفِ ذوقِ سخن ہے ۔ فیض کی شاعری میں تشبیہ اور استعارے کی درمیانی شکل نظر آتی ہے ۔ جہاں پہ نہ تو تشبیہ سے بین طور پر موصوف سامنے آتا ہے ، نہ ہی استعارے کی طرح پس پردہ ہوتا ہے — فیض کی اشارات میں تجاہلِ عارفانہ کی سی کیفیت ہے ۔ جب وہ موصوف ستم کیش یا اپنی وفاؤں کا ذکر کرتے ہیں تو وہ ستم کیش بہت حد تک ہماری آنکھوں میں پھر جاتا ہے ۔ لیکن تشنگی ہم سے کہتی ہے کہ کاش شاعر نے کھل کر اشارہ کیا ہوتا لیکن سخن فہم جانتا ہے کہ اس

اسرائیت میں بھی اس حسنِ بیان ہے۔ فیض کی لفظیات صفت کی شکل میں تشخص ہیں اور وہ اچھی یا بری صفات کا مجموعہ جو شعر میں موجود ہے بہت حد تک زندگی سے مستعار ہے۔ فیض کی شاعری کا اصل لطف اس مفروضے کے ساتھ پڑھنے میں زیادہ آتا ہے کہ سخن اسبابِ حل و عقد اور ارباب کار رجحان کی جانب ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح حافظ کا کلام پڑھتے ہوئے یہ خیال ذہن میں محفوظ ہو تو لطف دوبالا ہوتا ہے۔ فیض کی ادبی زندگی ان کی عملی زندگی سے ہم آہنگ رہی ہے۔ اس لئے بیشتر پر ذاتی تجربہ کی آنچ محسوس ہوتی ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں فیض کی چند نظمیں اور غزلیں ہیں جو گذشتہ ۵، ۶ برس میں وارد ہوئیں۔ ان غزلوں کے مطالعہ سے پہلے ایک عجیب سا پُر اعتماد نشاط محسوس ہوتا ہے کہ آج بھی فیض کے کلام میں وہی بانکپن ہے اور وہی تخلیق ہوتا جاری ہے جو کلام کی تازگی کی دلیل تھا۔ اشعار میں کچھ شناسا پن ہے لیکن وہی پُر تحمل زبان ہے جس نے کہیں پر بھی COMPROMISE فیض کی زبان سچائی ادب پر نادر مثال ہے۔ میری اس نثر سے فیض کا کلام بیش گنا بہتر ہے۔ اس لئے کچھ غزلوں کے اشعار

ہم نے سب شعر میں سنوارے تھے — ہم سے جتنے سخن تمہارے تھے۔
پہنچ کے در پہ ترے کتنے معتبر ٹھہرے — اگرچہ رہ میں ہوئیں جگ ہنسائیاں کیا کیا
اک گردنِ مخلوق جو ہر حال میں خم ہے — اک بازوئے قاتل ہے کہ خوں ریز بہت ہے
خوش دعوتِ یاراں بھی ہے یلغارِ عدو بھی — کیا کیجیے دل کا جو کم آمیز بہت ہے
کوئی مسیحا نہ ایفائے عہد کو پہنچا — بہت تلاش پسِ قتلِ عام ہوتی رہی
دیر سے آنکھ سے اترا نہیں اشکوں کا عذاب — اپنے ذمے ہے ترا قرض نہ جانے کب سے
احسان لئے کتنے مسیحا نفسوں کے — کیا کیجیے دل کا نہ جلا ہے نہ بجھا ہے

فیض کی نظمیں انقلابیت اور اس کے نئے دور اور نئی اقدار میں گل پوشی ہو جانے سے متعلق ہیں۔ ان کی باتوں میں ایک حکمت آگئی ہے سو جماع نہیں۔ وہ اپنے مخاطب کو ہلکی ہلکی زبان میں مشورہ بلکہ رائے دیتے ہیں۔ لہجہ میں کوئی تحکم نہیں ہے۔ ان مانی میں دعویٰ اور دلیل نہیں۔ ایک ہم سفرانہ یادداشت ہے۔ فیض کی شاعری ایک ذہین راہی کی شاعری ہے جس میں [illegible] بھی ہے استعارات آزادہ روی بھی۔

فیض کے اس مجموعہ میں شریک نظموں میں آہنگ کی یکسانیت اور غنائیت کی طرف مکمل ذہنی رجحان کا بھی اندازہ ملتا ہے۔ اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں فیض نظموں کی حد تک سہل گو تو نہیں ہوتے جا رہے ہیں۔ جو کہ فیض کے طرزِ شعر سے جدا گانہ ہے۔ بعض قافیہ ردیف کو پیش کرنے کے لئے مصرعے ملتے ہیں جو کہ معنوی طور پر کوئی اہمیت نہیں رکھتے اور نہ لاتے ہیں۔ ان کی نظمیں [illegible] گیت "اب کیا دیکھیں راہ تمہاری" "تم اپنی کرنی کر گزرو" اور دو خوبصورت قطعات اس مجموعہ میں عطر بیزی کر رہے ہیں۔ خوبصورت استانزہ بھی پڑھ لیں:

اب کیوں اس کی فکر کرو — جب دل ٹکڑے ہو جائے گا
اور سارے غم مٹ جائیں گے — تم خوف و خطر سے در گزرو

جو ہونا ہے سو ہونا ہے ۔ گر ہنسنا ہے تو ہنسنا ہے
تم اپنی کرنی کر گذرو ۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا ۔ تم اپنی کرنی کر گذرو

ابتدائی صفحات پر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم اور رشید محمد حمید کے مضامین کی موجودگی کا کوئی خاص سبب سمجھ میں نہیں آیا۔ کیونکہ یہ مضامین تشنہ یادداشتوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔

کتاب کی قدر و قیمت اس میں پوشیدہ کلام میں ہے جو گراں مایہ ہے ۔ ویسے اس خوبصورت طباعت اور قیمت فروخت کے لئے مکتبہ جامعہ قابلِ مبارک باد ہے ۔

(اسلم عمادی)

سرودِ رفتہ

مصنف: اشفاق حسین ، قیمت دس روپے، صفحات ۲۵۶
ملنے کا پتہ: ۱/۱۷/۸۳۷ - آصف نگر - حیدرآباد ۲۸

محترمہ سیمیں اصغر نے اپنے والد اشفاق حسین کے مضامین کا مجموعہ "سرودِ رفتہ" کے نام سے چھپوا کر روحانی سکون اور قلبی آسودگی محسوس کرتی ہوں گی ۔ یقیناً ایک بیٹی کی طرف سے اپنے باپ کی خدمت میں یہ اچھا خراجِ عقیدت ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ ادبی نقطۂ نظر سے ان کا یہ کارنامہ ہر آئینہ قابلِ ستائش بھی ہے کہ اس طرح اشفاق حسین صاحب کی باغ و بہار تحریریں محفوظ ہو گئیں ۔ "سرودِ رفتہ" سے ایک زمانہ کیف و سرود کی دولت سے مالا مال ہوتا رہے گا ۔ اشفاق حسین صاحب کثیر التصانیف ادیب نہیں ہیں ۔ دورِ طالب علمی میں انہوں نے "اختر کی ڈائری" لکھی اور مشہور ہو گئے ۔ شہرت مشکل سے نصیب ہوتی ہے مگر شہرت کو اشفاق حسین کی جیسے تلاش تھی ۔ جب ایم اے کا مقالہ "مقامِ اقبال" کے نام سے شائع ہوا تو وہ اردو کے نامور اور صاحبِ طرز ادیب تھے ۔ "اقبال اور انسان" کے ذریعہ ۲۲ سال کے وقفہ کے بعد انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ہی کیا تھا کہ وہ اللہ کو پیارے ہو گئے ۔

اشفاق حسین نے "اختر کی ڈائری" اور "اقبال اور انسان" کے درمیان جو مضامین لکھے مختلف اغراض و مقاصد کے تحت اور مختلف اوقات میں ، سیمیں اصغر نے ان سب کو یکجا کیا اور "سرودِ رفتہ" کے نام سے شائع کیا ۔ "ماضی کے جھروکے سے" کے زیرِ عنوان انہوں نے "اختر کی ڈائری"، "اقامت خانے کی راتیں"، "بھاگ متی کی آپ بیتی" اور "یادش بخیر" جیسے جیتے جاگتے مضامین شامل کئے ہیں ۔ "یادِ رفتگاں" میں ذکرِ یار سے لے کر علامہ حیرت بدایونی تک سارے ہی خاکے قلب و ذہن کو بصیرت عطا کرتے ہیں ۔ خصوصاً مخدوم سے اشفاق کا جو یارانہ تھا وہ ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے ۔ ہر ہر لفظ سے پیار و محبت کے چشمے ابلتے نظر آتے ہیں ۔ حق تو یہ ہے کہ اشفاق حسین نے اس خاکہ کے ذریعہ حقِ دوستی ادا کیا ہے ۔ ویسے ذکرِ یار، بنے بھائی، شنکر جی، ڈاکٹر زندہ، اور سلیمان اریب، اردو خاکوں کی فہرست میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں ۔

اشفاق حسین یونیورسٹی سے نکلے تو ریڈیو کی دنیا میں پہنچے ۔ یہاں بھی ان کا قلم پھول کھلاتا رہا ۔ اس دور کے چند منتخب مضامین کو "آواز کی دنیا" کے عنوان سے کتاب میں شامل کیا گیا ہے ۔ متفرقات میں وہ مضامین یا پھر ان کتابوں پر تبصرے شامل ہیں جن کی رسمِ اجرا میں یہ شریک رہے ہیں ۔ یا پھر جن کتابوں کو انھوں نے پڑھا اور ان کے بارے میں رائے دی ہے ۔ اس فہرست کے مضامین میں سعادت کے انتقال پر" اور "حضور کا ہے دل ڈائریری یاد سے پہلے" اشفاق حسین کی طرزِ نگارش کے اچھے نمونے پیش کرتے ہیں آخر میں چند خطوط ہیں ۔ ایسا لگتا ہے اس باب میں سیمیں اصغر نے تحقیق و جستجو سے کام نہیں لیا ہے ۔ ورنہ اشفاق حسین کے بے شمار بولتے خطوط ایسے ہیں جو اس کتاب میں شامل کئے جا سکتے تھے ۔

گو اس مجلد فتہ میں چیدہ چیدہ مضامین شامل ہیں جس کی وجہ سے اشفاق حسین کی شخصیت اُبھر نہیں سکی۔ تاہم ان مضا
سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ وارفتۂ حیدرآباد تھے۔ جامعہ عثمانیہ سے بے شمار ادیب و شاعر ابھرے اور ابھر رہے ہیں
جامعہ کے ابتدائی دور میں اشفاق حسین، حاتم علی خاں، میر حسن، مخدوم، ظفر الحسن اور سعادت علی خاں کی صحبت جو دیوانے تھے
تھے انہوں نے اپنی علمی، ادبی، سماجی، اور سیاسی خدمات سے مادر علمیہ کا نام روشن کیا۔
اشفاق حسین اور ان کے احباب کی تحریروں میں جو چاشنی، رنگینی اور مٹھاس ہے وہ ان شخصیات کی فطری صلاحیتوں
اشفاق حسین زندہ ہوتے تو شاید اور بھی ان کی فکر انگیز تحریریں منصۂ شہود پر آتیں مگر ایسا نہیں ہوا۔

(طیب انصاری)

تلاش (شعری مجموعہ)

شاعر: حسرت شوری صفحات: ۱۲۸ ڈیمائی سائز مجلد، قیمت: ۱۰/-
ناشر: پنڈت گوکل چند شوری، راجوری گارڈن، نئی دہلی۔

پیش نظر کتاب گوکل چند حسرت شوری دہلوی کا شعری مجموعہ ہے۔ اس کتاب کا
اردو کے نامور شاعر فراق گورکھپوری نے تحریر کیا ہے۔ "مقدمہ" قمر مرادآبادی نے لکھا ہے اور تقریظ و تعارف کے عنوان
جھنجھانوی نے اظہار خیال کیا ہے۔ حسرت دہلوی اردو کے کہنہ مشق شاعر ہیں۔ ان کا یہ مجموعۂ کلام غزلوں، قطعات اور متفرق
مشتمل ہے۔ لیکن وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ بقول فراق گورکھپوری "حسرت صاحب کے کلام کی نمایاں
بیان کی صفائی، زبان کی سلاست، حاضر دماغی اور اسلوب کی چستی ہیں۔ انھوں نے اپنے تجربات زندگی، احساسات
کو سادگی، صفائی اور پرکاری کے ساتھ، شعر کے قالب میں ڈھال دیا ہے ؎

پھر بھی آئینہ دیکھتا ہوں میں — زندگی گو نظر نہیں آتی!
گزری جاتی ہیں منزلیں حسرت — پھر بھی منزل نظر نہیں آتی!
گو واقفِ رازِ در و دیوار ہوں حسرت — پر آگ لگانے کے لئے گھر تو بنا لوں

گوکل چند حسرت شوری برہمن خاندان کے ایک شریف نفس اور وضعدار چشم و چراغ ہیں۔ ان کی شخصیت
شاعری میں بھی طہارت نفس، پاکیزگی، جذبات، خلوص نیت اور گنگا جمنی تہذیب کا عکس نظر آتا ہے۔ چونکہ انھوں نے د
خاص روایتی ماحول میں نشو و نما پائی ہے۔ اس لئے ان کی غزلوں میں بھی روایتی انداز کی چھاپ نظر آتی ہے۔ تاہم ان کے
میں زندگی کے گوناگوں مسائل اس کا شعور اور اپنے ماحول اور گرد و پیش کے حالات سے اثر پذیری کا احساس بھی ہوتا۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

میں گرتا رہا ہوں سنبھلتا رہا ہوں — زمانہ کے ہمراہ چلتا رہا ہوں
عرصۂ ہستی ازل سے تا ابد!! — ہے مگر میعادِ ہستی چند روز!
آئے تھے کاٹنے حیات کے دن — کاٹنی پڑ گئی پہاڑ سی رات!

ٹائٹل دیدہ زیب ہے۔ کتابت، طباعت اور گٹ اپ بھی بہت عمدہ۔ مجھے امید ہے کہ "تلاش"
اہلِ ذوق اور عوام دونوں حلقوں میں مقبول ہوگا۔

(محمد علی اثر)

ادبی سرگرمیاں

اردو نامہ: علمی، ادبی، اور تہذیبی خبرنامہ

یکم ستمبر: گولکنڈہ میں قائم شدہ اردو ذریعہ تعلیم کے "اسما اسکول" کا جناب میر احمد علی خاں صدر ریاستی انجمن ترقی اردو اور جناب محبوب حسین جگر جوائنٹ ایڈیٹر "سیاست" نے معائنہ کیا۔ جناب سرینواس ریڈی نائب صدر انجمن شاخ حیدرآباد اور معتمد جناب صادق الدین نے مہمانوں کو اسما اسکول کی کارکردگی سے واقف کرایا۔ محترمہ فوزیہ صادق الدین ہیڈ مسٹرس نے خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ گولکنڈہ کے نواح میں قائم کردہ اردو میڈیم کے اس ابتدائی اسکول سے مقامی اصحاب نے عملی دلچسپی لی ہے۔ معائنہ کرنے والوں نے بہتر کارکردگی کا اظہار کیا۔

• لیبر گارڈ کے نام سے ایک نیا اردو ہفتہ وار، میر شجاعت علی خاں کی ادارت اور ڈاکٹر غیاث صدیقی کی نگرانی میں شائع ہونا شروع ہوا۔ ہفتہ وار کے پہلے شمارہ کی رسم اجراء جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست نے انجام دی۔

۶ ستمبر: عبد الصمد صفی کے مصنف اور شاعر راجیشور راؤ اصغر کی حیات اور کارنامے پر ڈی۔ فل۔ رسرچ ایم اے کا مقالہ شائع ہوا۔ اردو سبھا کی طرف سے منعقدہ ادبی محفل میں ریاستی وزیر مسٹر بی رام دیو نے اس کتاب کو جاری کرنے کی رسم انجام دی۔ جناب عابد علی خاں معتمد ادبی ٹرسٹ، محترمہ رودا مستری، ریاستی وزیر سماجی بہبود ڈاکٹر راجے محبوب نارائن اور مسٹر بوج ریڈی نے مخاطب کیا اور مصنف کو مبارکباد دی۔ راجہ لال راجہ، صدر اردو سبھا نے شکریہ ادا کیا۔

۷ ستمبر: خطیب اہل بیت جناب اختر زیدی کے شعری مجموعہ، "فیضان" کی رسم اجرا جناب سہیل آفندی (فرزند نجم آفندی مرحوم) کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ مولانا حافظ ابو یوسف (ایم ایل سی)، ڈاکٹر صفدر علی بیگ اور جناب باقر امانت خانی نے زیدی صاحب کی شخصیت اور ان کے فکر و فن پر روشنی ڈالی۔

۸ ستمبر: محفل خواتین کا ماہانہ ادبی اجلاس حکیم گنج بہاری لال کی صدارت میں منعقد ہوا۔ محترمہ نیرہ کادس جی نے "انگریزی نظموں کے اردو تراجم" پر مضمون سنایا۔ قمر جمالی نے کہانی پیش کی اور خواتین شعراء نے کلام سنایا۔ محترمہ بانو طاہرہ سعید معتمد محفل خواتین نے جلسہ کی کارروائی انجام دی اور شکریہ ادا کیا۔

۱۶ ستمبر: آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی کے پریس نوٹ کے مطابق اردو کے تعلیمی وظائف اسکیم کے تحت ریاست کے اردو میڈیم طلبا و طالبات کو بصراحت ذیل وظائف ایک سال کے لئے منظور کئے گئے۔ انٹرمیڈیٹ کے ۸ طلبا و طالبات کو ہر ماہ ۲۵ روپیے بی اے سال اول کے ۶ طلبا و طالبات کو ہر ماہ ۳۰ روپیے، ایم اے سال اول کے ۵ طلبا و طالبات کو ہر ماہ ۳۵ روپیے۔

۱۷ ستمبر: اقلیم ادب کا ماہانہ ادبی اجلاس پروفیسر سید سراج الدین صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جناب ظہیر الدین احمد نائب صدر اقبال اکیڈیمی نے "اقبال کی فکر و خیال کے چند گوشوں" پر مقالہ سنایا۔ جناب عوض سعید نے نئی کہانی سنائی۔ "آج کے شاعر" کے موضوع پر رحمان جامی نے اپنا کلام سنایا۔ اس موقع پر جناب شمس الدین تاباں، اور پرویز ید اللہ مہدی صاحبان کا معتمد اقلیم ادب جمیل شیدائی صاحب نے خیر مقدم کیا اور ان اصحاب کو ان کی کتابوں کی اشاعت پر مبارکباد دی۔ محفل شعر میں مسرز تاباں، ڈاکٹر احسن رضوی، وقار خلیل، صادق نقوی، برق یوسفی، رؤف خیر، حمید حاصل، رؤف رحیم نے کلام سنایا

۱۹ ستمبر: معروف افسانہ نگار محترمہ نجمہ نکہت کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ "نیب

"کاوش" کے نام سے شائع ہوا پبلی کیشنز کے زیر اہتمام شائع ہوا۔

۲ستمبر: اقبال اکیڈیمی کی اطلاع کے بموجب سہ ماہی "اقبال ریویو" کے نائب مدیر کی حیثیت سے جناب مصلح الدین سعدی کا انتخاب عمل میں آیا۔

۲۴ستمبر: اردو مجلس کا ماہانہ ادبی اجلاس ڈاکٹر زینت ساجدہ ریڈر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی کی صدارت میں بمقام "اردو ہال" منعقد ہوا۔ محترمہ بانو طاہرہ سعید نے عہد آصفی کی شاعرہ "ماہ لقابائی چندا کی شاعری" پر مضمون سنایا۔ محترمہ نجمہ نکہت نے نئی کہانی پیش کی۔ محفل شعر میں ڈاکٹر غلام دستگیر رشید، ڈاکٹر حسن رضوی، ماہر حیدرآبادی، شمس الدین تاباں، وقار خلیل، صادق نقوی، رحمٰن جامی، رؤف خیر، دانش گوہر، بانو طاہرہ سعید، زہرہ تحسین، عزیز بھارتی اور منیر الزماں منیر نے کلام سنایا۔ جناب صلاح الدین نیر معتمد اردو مجلس نے شکریہ ادا کیا۔

• ساؤتھ انڈیا اردو اکیڈیمی کی مجلس عاملہ کا اجلاس جناب کے پربھاکر ریڈی ڈپٹی اسپیکر کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اردو کے تعلیمی اور سماجی مسائل پر غور کیا گیا۔ رکنیت سازی کی مہم میں شدت پیدا کرنے کی غرض سے اراکین نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

۲۵ستمبر: ادارۂ ادبیات اردو کے زیر اہتمام معروف شاعرہ محترمہ بانو طاہرہ سعید کا دوسرا شعری مجموعہ "مہکتے ویرانے" اشاعتی مراحل سے گذر رہا ہے۔ بانو کی شعری صلاحیتوں پر ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، پروفیسر جگن ناتھ آزاد اور جناب سید علی اختر معتمد اعزازی ادارۂ ادبیات اردو نے مضامین لکھے ہیں۔

• اردو کے پہلے نثر نگار اور صوفی بزرگ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی تعلیمات پر ایک سمپوزیم مولانا سید شاہ محمد محمد الحسینی سجادہ درگاہ بندہ نواز کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ریاستی گورنر مسٹر کے سی ابراہام، ڈاکٹر غلام دستگیر رشید، جناب اکبر علی خاں، سابق گورنر یوپی اور جناب کے یل مہندرا ایم یل سی نے مخاطب کیا۔

ادارۂ ادبیات اردو

کے اردو امتحانات

اردو عالم اور اردو فاضل میں شرکت کیجئے اور گرایجویٹ بنئے:

مزید تفصیلات کے لئے لکھئے یا ملئے:
پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی
(معتمد شعبۂ امتحانات)
چار قندیل، آغا پورہ، حیدرآباد ۱

ہماری اہم مطبوعات

تاریخ گولکنڈہ	پروفیسر حمید صدیقی	۲/=
میر محمد مومن	ڈاکٹر زور	۱/=
سروجنی نائیڈو	وزیر حسین دہلوی	۲/=
تاریخ ادب اردو	ادارہ	۱/۵۰
حیدرآباد	ڈاکٹر رقیہ سلطانہ	۱/۵۰
سوانح سلاطین آصفی	(۶ کا سیٹ)	۷/=
مغربی تصانیف کے اردو تراجم	میر حسن	۱/=
یادگار زور	ادارہ سب رس	۱/=
آبگینۂ شعر	بشیر النساء بیگم بشیر	۲/=
مہکتے ویرانے	بانو طاہرہ سعید	۱۲/=
ٹھنڈی جالیاں	بھارت چند کھنہ	۲/=
کیف و کم	یوسف ناظم	۴/=
برق و آشیاں	سعید شہیدی	۵/=
ہیلینا (ڈرامہ)	فضل الرحمٰن	۲/=
معانی سخن (محمد قلی)	ڈاکٹر زور	۱/=
عروض	ڈاکٹر کلیم اللہ حسینی	۳/=

(ادب اطفال)

محمد قلی کی جیون کہانی	وقار خلیل	۱/=
مولانا ابوالکلام آزاد	"	۱/=
ہیروں کی کہانیاں	حبیب ابراہیم	۱/۵۰
گاندھی جی	خورشید احمد جامی	۱/۵۰
عرب اور عربستان	جہاں بانو نقوی	۱/۵۰

ملنے کا پتہ: سب رس کتاب گھر، ایوان اردو، پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد ۴

چھوٹے کسانوں کا بڑا ہاتھ

آج ہماری معیشت کو خوش حالی کی سمت لے جانے میں چھوٹے کسانوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ چھوٹے کسانوں کی ترقیاتی ایجنسی (ایس ایف ڈی اے)۔ مارجنل کسانوں اور زرعی مزدوروں کی اسکیم (یم ایف اے ایل)۔ خشک سالی سے متاثر ہونے والے علاقوں کا پروگرام (ڈی پی اے پی) اور افزائش نسل کا پروگرام (ایل پی پی) جو فی الوقت آندھرا پردیش میں زیر عمل آوری ہیں۔ درحقیقت ان کا بنیادی مقصد چھوٹے کسانوں کی فلاح و بہبود ہے جو زیادہ تر سماج کے کمزور طبقات سے تعلق رکھتے ہیں۔

جنوری ۱۹۷۸ء کے ختم تک چھوٹے کسانوں کی ایجنسیوں کی جانب سے بھرپور امداد کے لئے تقریباً ۶،۵۸ لاکھ کسانوں کی شناخت عمل میں لائی گئی ہے۔

جن اضلاع میں خشک سالی سے متاثر ہونے والے علاقوں کا پروگرام روبہ عمل ہے ان اضلاع میں ۱۹۷۴-۷۵ اور ۱۹۷۷-۷۸ کے درمیان ۲۲،۵۴ کروڑ روپیوں کی متاثر کن امداد مہیا ہوئی ہے۔ نتیجتاً توسیع کی جانب مائل ہماری معیشت میں چھوٹے کسان کو اہم کردار ادا کرنے کے لائق بنانے کے لئے تالابوں کی تعمیر، باولیوں کی کھدائی، درخت اگاؤ مہم اور دودھیارے مویشیوں کی تقسیم وغیرہ کے کاموں میں حوصلہ افزا پیش رفت ہوئی ہے۔

محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ
آندھرا پردیش۔ حیدرآباد

No 13/78-79/2380

اجراء: ۱۹۳۸ء   فون: ۳۸۴۶۹

از ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

ماہنامہ

سب رس

حیدر آباد

وقار خلیل
جلد: ۴۱ شمارہ: ۱۱
نومبر ۱۹۷۸ء

سالانہ: ۱۵ روپیہ ششماہی: ۸ روپیہ
ایک روپیہ پچاس پیسے

ناشر: ادارہ ادبیات اردو
حیدرآباد ۵۰۰۰۰۴

ترتیب

اپنی بات

ہر سال "ادارۂ ادبیاتِ اُردو" کے بانی، اُردو کے نامور محقق، نقاد اور ادیب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ کی برسی کے موقع پر ان کی یاد کو تازہ رکھنے کے لئے "یوم زورؔ" کی تقریب منعقد کی جاتی ہے۔ اس سال یہ طے کیا گیا کہ یہ تقریب محض رسمی نوعیت کی نہ ہو۔ ڈاکٹر زورؔ کی خدمات کے اعتراف اور اُن سے اظہارِ عقیدت کی بہتر صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ایسے عنوانات پر مقالے لکھوائے جائیں جو ان کی تحقیق کا موضوع رہے ہیں اور ان کا انتساب مرحوم کے نام کیا جائے چنانچہ اس بار یوم زورؔ کے موقع پر دکنی ادب اور کلچر پر ایک سمپوزیم کا انعقاد عمل میں لایا گیا۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ پروفیسر و صدر شعبہ اُردو جامعہ عثمانیہ نے سمپوزیم کی صدارت کی۔ ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب، ڈاکٹر ہاشم علی، ڈاکٹر شریف النساء اور پروفیسر اکبر الدین صدیقی نے مقالے پڑھے۔ زیرِ نظر شمارے میں وہ مقالے پیش کئے جا رہے ہیں جو اس اجلاس میں پڑھے گئے۔ 'قندِ مکرر' کے تحت ڈاکٹر زورؔ کی کہانی "سرو صحرا" شامل کی گئی ہے۔

عظیم شخصیتوں کی یاد کو تازہ اور زندہ رکھنے کا طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ ہم ان کے دکھائے ہوئے راستے پر گامزن ہو کر ان کے مقاصد اور کاموں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی سعی کریں۔ ڈاکٹر زورؔ نے اُردو زبان کے تحفظ اشاعت اور ترقی کے لئے ساری توانیاں وقف کر دی تھیں اس سلسلے میں انھوں نے بعض اہم اور بنیادی کاموں پر خاص توجہ کی۔ ڈاکٹر زورؔ کا خیال ہے کہ کسی لزوم اور جبر کے بغیر لوگوں کو اردو زبان سیکھنے اور پڑھنے کی ترغیب دی جائے تو یہ طریقہ زیادہ مفید اور کارکرد ہو سکتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اُردو زبان و ادب کا ایک نصاب مرتب کروا کے اُردو کے امتحانات کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا جو آج تک جاری ہے۔ یہ امتحانات سال میں دو بار منعقد ہوتے ہیں۔ ریاست آندھرا پردیش کے علاوہ دوسری ریاستوں میں بھی ان امتحانات کے مراکز قائم ہیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی نے ادارہ کے امتحانات اُردو عالم کو انٹرنس اور اُردو فاضل کو ڈی۔ او۔ ایل کے مماثل تسلیم کر لیا ہے جس کی وجہ سے ان امتحانات کی افادیت بڑھ گئی ہے۔ موجودہ دور میں جبکہ سرکاری اور خانگی مدارس میں اُردو تعلیم کی سہولتیں کم ہوتی جا رہی ہیں اُردو والے بچوں کو گھر میں اُردو پڑھا کر ان امتحانوں میں شریک کروائیں تو اس نقصان کی کسی حد تک تلافی ہو گی جو مادری زبان میں تعلیم حاصل نہ کرنے کی وجہ سے ہو سکتا ہے۔ اس طرح آنے والی نسلوں کا ربط اپنی زبان ادب اور کلچر سے ٹوٹنے نہیں پائے گا۔ دوسری زبان بولنے والوں کو بھی جو اُردو سے دلچسپی رکھتے ہیں ان امتحانوں میں شرکت کے لئے راغب کیا جا سکتا ہے۔ ہم اُردو زبان کی ترویج اور اشاعت سے دلچسپی رکھنے والے تمام احباب اور اداروں سے گذارش کرتے ہیں کہ وہ اپنے اپنے علاقے میں ادارے کے امتحانات کے مراکز قائم کریں اور طالب علموں اور ناخواندہ بالغوں کو ان امتحانوں میں شرکت کی ترغیب دیں۔

مغنی تبسم

محمد اکبرالدین صدیقی

ڈاکٹر زور اور دکنی ادب

بہمنی بادشاہوں کی جہاں بہت سی یادگاریں آج بھی باقی ہیں، ان میں سب سے اہم دکنی زبان اور اس کا ادب ہے۔ علاءالدین خلجی کے دکن پر حملے کے بعد اس زبان کو دکن میں پھولنے پھلنے کا موقع ملا۔ لیکن اس صدی کے پہلے ربع تک عوام دکنی ادب سے واقف نہ تھے۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق بابائے اُردو نے ۱۹۲۲ء میں محمد قلی قطب شاہ کے کلیات کو رسالہ اردو میں متعارف کرایا۔ اس کے بعد چار پانچ سال میں اردو میں ایسے مضامین شائع کیے جن کا تعلق دکنی کے شعراء اور ادیبوں سے تھا۔

زور صاحب اگست ۲۷ء میں یورپ گئے، اور اس وقت تک انہوں نے دکنی ادب کے تعلق سے کچھ نہیں لکھا۔ جب انگلستان کے کتب خانوں میں کام کرنے کا موقع ملا، انہوں نے دکنی ادب کے بے شمار مخطوطات دیکھے۔ اپریل ۱۹۲۸ء میں ان کا مضمون رسالہ تجلی میں شائع ہوا جس کا عنوان تھا "کتب خانہ جات شاہانِ اودھ اور دکنیات"۔ ان کتب خانوں میں انہیں اکثر و بیشتر دکنی کے مخطوطات ملے۔ دوسرا مضمون اسی رسالہ میں مئی میں شائع ہوا۔ عنوان تھا "کرنل میکنزی کا مجموعہ ادبیات شرقی"۔ اس میں ان مخطوطات کا ذکر ہے جو اس مجموعہ میں شامل ہیں۔ تیسرا مضمون بہرام و بانو حسن اور بہرام و گل اندام پر ہے۔ دکنی میں بہرام کے تعلق سے جو مثنویاں ملتی ہیں ان کا ذکر ہے۔ مثلاً امین اور طبعی نے یہ مثنویاں لکھی ہیں۔ ان کا ایک مضمون "گولکنڈہ کا ایک قدیم ترین شاہکار" ہے۔ یہ وجہی کی قطب مشتری کا تنقیدی جائزہ ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب نے سب رس پر اردو میں ۱۹۲۴ء میں لکھا تھا۔ اس میں مثنوی قطب مشتری کا سرسری ذکر آگیا تھا۔ لیکن زور صاحب نے وجہی اور قطب مشتری پر نہایت تفصیل سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس مضمون کے تعلق سے مجلہ مکتبہ کے مدیر پروفیسر عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:

" مولوی زور صاحب یورپ میں لسانیات کی تحقیقاتی تعلیم کے ساتھ اردو ادب اور بالخصوص دکھنی یا اردوئے قدیم میں جو عظیم الشان ریسرچ فرما رہے ہیں اس سے ناظرین مکتبہ بخوبی واقف ہیں اور کسی مزید صراحت کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ آپ نے برٹش میوزیم اور انڈیا آفس کی نایاب مخطوطات اردوئے قدیم و جدید کے مطالعے کے بعد ان کتب خانوں کے کیٹلاگ کی تیاری ہو کی جس کو مستشرقین نے بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ نیز آپ نے پیرس و ایڈنبرا کے کتب خانوں میں دکھنی ادب کے نایاب مخطوطات کا جو حصہ دنیا بالکل ناواقف ہے مطالعہ کر کے اردوئے قدیم میں حیرت انگیز انکشافات فرمائے۔ ذیل کا مضمون مولانا وجہی کی قطب مشتری پر آپ

بھی ان فاضلانہ تحقیقات کا نتیجہ ہے۔ آج تک اس مثنوی کا اردو دنیا کو کوئی علم نہیں تھا۔ کیٹلاگوں کے مطالعے سے بھی اس کتاب کا حال کسی کو معلوم نہ ہو سکا تھا۔"

ممکن ہے کہ محترم مدیر کی نظر سے اردو کا وہ شمارہ نہ گذرا ہو جس میں مولوی عبدالحق صاحب کا مضمون سب رس پر شائع ہوا اور مشتری اور تاج الحقائق کا بھی انہوں نے ذکر کیا ہے۔ ویسے بھی اس وقت یہ دونوں دوست بی اے کے پہلے سال میں تھے اور ممکن ہے اس وقت قدیم اردو سے کوئی دلچسپی نہ رہی ہو۔

ڈاکٹر زور نے ۱۹۲۸ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری لندن یونیورسٹی سے لی اور اردو کے آغاز و ارتقا پر ایک مقالہ لکھا۔ پھر لسانیات اور صوتیات کی تعلیم کے لئے پیرس میں رہے۔ اور ۱۹۳۰ء میں ہندوستانی فونٹیک شائع کی۔ ڈاکٹر صاحب نے مندرجہ بالا مضامین اشاعت کے لئے بھیجے لیکن جو نیا مواد ملا اسے علحدہ درج کرتے چلے گئے۔ اور ۱۹۲۹ء میں تعطیلات میں حیدرآباد آئے اور اپنی مشغول کا ثمرہ "اردو شہ پارے" کی شکل میں پیش کیا۔ میں دیکھتا تھا کہ وہ اور ان کے دوست احباب یعنی عبدالقادر سروری، سید محمد، عمر یافعی، فیض محمد اور عبدالرحمن شریف صاحبان ان کے کام میں ہاتھ بٹاتے تھے۔ عجلت اس لئے تھی کہ وہ ختم تعطیلات سے پہلے پیرس پہنچنا چاہتے تھے۔ اس طرح اردو شہ پارے کی کتابت، طباعت اور اشاعت سب کچھ دس ہفتے میں ہو گئی — ڈاکٹر صاحب کی کوئی اور کتاب اس قدر کم مدت میں تیار ہو کر شائع ہو گئی ہو۔ مواد تو ساتھ تھا لیکن اس کی ترتیب و تدوین میں سب کا مشورہ شریک تھا۔

نصیرالدین ہاشمی نے لکھا ہے کہ "اردو شہ پارے" تاریخ ادب میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس میں قطب شاہی عہد سے لے کر بعد تک اردو نظم و نثر کے شہ پاروں کو پیش کیا گیا ہے۔ زور صاحب نے حتی الامکان کوشش کر کے زیادہ سے زیادہ حالات سعی کی ہے۔ قدیم دکنی ادب کی تاریخ اس کی ابتداء اور ارتقاء کا حال اس سے معلوم ہو جاتا ہے۔"

ڈاکٹر زور صاحب خود اردو شہ پارے کے بارے میں رقم طراز ہیں:

"جب میں نے ۱۹۲۸ء میں اردو شہ پارے کے نام سے ایک کتاب مرتب کی تھی تو نہ دکنی ادب کا چرچا تھا نہ عام اردو والوں کو معلوم تھا کہ اردو زبان میں تین چار سو سال قبل اتنی اعلیٰ درجہ کی نظم و نثر لکھی گئی ہوگی۔ اردو شہ پارے نے اردو زبان کی ادبی تاریخ کو بدلنے اور اردو کی قدامت اور بلندگی قائم کرنے میں بڑا حصہ لیا تھا۔ مگر اپنے موضوع پر ابتدائی کوشش ہونے کی بنا پر اس میں خامیاں بھی تھیں۔ معلومات مکمل نہ تھیں۔ بعض شاعروں کے حالات میں قطعیت نہ تھی۔ اور بعض بیانات ظن اور قیاس پر تھے۔"

ڈاکٹر زور کے یہ خیالات اردو شہ پارے کی اشاعت کے تیس سال بعد کے ہیں جب کہ دکنی کا بیشتر سرمایہ منظر عام پر آیا یا بھی آتا جا رہا ہے۔ دکنی ادب کی تاریخ میں ۱۹۳۵ء کی اہمیت ہے۔ سٹی کالج میں یوم ولی منایا گیا۔ اس شان کا یوم ہندوستان میں کسی کا منایا گیا ہو۔ قدیم دکنی مخطوطات کی ایک نمائش بھی منعقد کی گئی تھی جس کو نواب سالار جنگ کی سرپرستی حاصل تھی۔ نواب نے خطبۂ صدارت میں فرمایا'

اس اہم اور دلچسپ کام کو اس تقریب کے ساتھ ختم نہ ہونا چاہیئے بلکہ مناسب یہ ہے کہ اس دو صد سالہ جشن ولی کی یادگار میں

کوئی مستقل کام کا آغاز کیا جائے۔ میرے خیال میں اس سے بہتر کوئی اچھا کام نہیں ہو سکتا کہ ولی کے معاصرین اور ان سے پہلے کے شاعروں اور صاحبانِ تصانیف کی اردو کتابیں مرتب اور شائع کی جائیں۔ اس اہم کام کی تکمیل کے لئے ایک جماعت منتخب کر لینی چاہیئے — میں بھی اس مبارک اور اہم کام میں اس جماعت کا ہاتھ بٹانے تیار ہوں"۔

اس تجویز پر فوراً عمل کیا گیا، جناب سید محمد اعظم صاحب پرنسپل سٹی کالج کمیٹی کے صدر اور ڈاکٹر زور صاحب نائب صدر مقرر ہوئے۔ اور پانچ اراکین پروفیسر سید محمد معتمد اور میر سعادت علی رضوی شریک معتمد مقرر ہوئے۔ کتابوں کا انتخاب کیا گیا اور مختلف اشخاص کو ان کی ترتیب و تدوین کا کام دیدیا گیا۔ تقریباً تمام حضرات نے کام خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ اور یہ سب کتابیں شائع ہو گئیں — ڈاکٹر زور صاحب نے کلیاتِ قطب شاہ کی تدوین کی۔ اس کا مقدمہ دکنی ادب کا شاہکار ہے۔ اب تک شاید ہی کسی کتاب کا مقدمہ اس قدر تفصیلی اور بسیط ہو۔ محمد قلی قطب شاہ کی زندگی کے حالات کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب نے حیدرآباد کی سماجی اور معاشرتی تاریخ کا ایک دل نشیں خاکہ پیش کر دیا ہے۔ حیدرآباد اور ایران کے تعلقات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اور یہاں کے ان رسم و رواج کا بھی بیان کیا ہے جو قطب شاہی دور میں رائج تھے۔ سلسلۂ یوسفیہ کی اور دوسری جتنی بھی کتابیں شائع ہوئیں ان سب میں ڈاکٹر صاحب کے مشورے شامل رہے۔ ترتیب و تدوین اور اشعار کی تفہیم میں مرتبین کی مدد کرتے رہے۔ اس سلسلہ میں حسبِ ذیل کتابیں شائع ہوئیں۔

کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ، کلیاتِ سراج، قصۂ بے نظیر، پھول بن، مثنوی سیف الملوک بدیع الجمال، طوطی نامہ، کلام الملوک کلیاتِ عبداللہ قطب شاہ، گلشنِ عشق، مثنوی رضوان شاہ و روح افزا، مثنوی چندربدن و مہیار، تصویرِ جاناں، پنچھی باچھا اور علی نامہ۔

ڈاکٹر زور صاحب کی یہ خواہش تھی کہ یہ کام جاری رہے۔ سلسلۂ یوسفیہ کی ان تمام کتابوں کا ذخیرہ اور ایک معتدبہ رقم ابوالکلام آزاد انسٹی ٹیوٹ کے حصے میں آئی اور توقع تھی کہ یہ سلسلہ برابر جاری رہے گا اس لئے کہ سرمایہ کی کمی کا سوال نہ تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ سلسلہ ہو گیا۔ کتابوں کا ذخیرہ بھی تقریباً سب فروخت ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب کی توجہ اس کی طرف سے قدرے کم ہو گئی اس لئے کہ اب وہ اس سے زیادہ اہم کام میں مصروف ہو گئے یعنی کلیاتِ محمد قلی کی اشاعت ۱۹۴۰ء کے بعد سے وہ مخطوطات کا تذکرہ لکھنے لگے اور مسلسل پانچ جلدیں تیار کر کے شائع کر دیں۔ یہ بڑا اہم کارنامہ ہے۔ ان پانچ جلدوں میں ۱۱۵۰ قلمی کتابوں کا تذکرہ نہایت تفصیل سے آیا ہے۔ اس قدر تفصیل کم اور کتب خانہ کی فہرستوں میں نہیں ملتی۔ ڈاکٹر زور نے اپنی امکانی کوشش کر کے قلمی کتابوں کے مصنفوں کے حالات لکھے۔ ان کتابوں کے موضوع کے بارے میں تفصیلات دیں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے دکن کے مشہور شعراء کے دواوین کا انتخاب شائع کرنے کا پروگرام بنایا اور مشہور شاعروں اور ادیبوں کا تذکرہ بھی اسی پروگرام کا ایک حصہ تھا۔ انہوں نے اس کام کو اپنے دوستوں اور شاگردوں میں تقسیم کر دیا تاکہ کام جلد ہو اور کتابیں بھی جلد شائع ہو جائیں۔ چنانچہ تذکرہ مرقع سخن کی دو جلدیں شعراء کی تصویروں کی ساتھ شائع ہوئیں جن میں ۵۰ شعراء کا ذکر ہے اور خود ڈاکٹر صاحب نے شعراء کے دواوین سے حسبِ ذیل انتخابات مرتب کر کے شائع کئے۔

متاعِ سخن (عزیز یار جنگ) کیفِ سخن (رضی الدین حسن کیفی) بادۂ سخن (ڈاکٹر احمد حسین مائل) فیضِ سخن (حافظ میر شمس فیض) معانیِ سخن (محمد قلی قطب شاہ) اور رمزِ سخن (بہاری لال رمز)۔

قطب شاہی سلاطین کے کارناموں کو اجاگر کرنے کے لئے انہوں نے سیرِ گولکنڈہ، گولکنڈے کے ہیرے، اور حیدرآباد فرخندہ بنیاد، نیم افسانوں کے مجموعے شائع کئے۔ ان کتابوں سے قطب شاہی سلطنت اور سلاطین کے کارناموں کا صحیح طور پر اندازہ ہوتا ہے ورنہ مغل مورخین نے ان

نا پر دبیز پردے ڈال رہے تھے ۔ اور عوام اس غلط فہمی کا شکار تھے کہ اورنگ زیب کو گولکنڈہ پر حملہ کرنے میں حق بجانب تھا پچھلی صدیوں حیدرآباد میں جو ادب تخلیق ہوا ، اس پر ایک کتاب " داستانِ ادب حیدرآباد " لکھی ۔ بظاہر یہ مختصر معلوم ہوتی ہے لیکن آئندہ کام کرنے والوں کے لئے رہنما ثابت ہو رہی ہے ۔

سید محمد والہ موسوی نواب مہدی نواز جنگ کے اجداد میں ہیں ، وہ ادیب بھی تھے اور شاعر بھی ۔ انہوں نے ایک مثنوی " طالب و موہنی " تھی ڈاکٹر صاحب نے اس کو مرتب کر کے شائع کیا ۔

ڈاکٹر صاحب کی آخری کتاب دکنی ادب کی تاریخ ہے جس کو سندھ اردو اکیڈیمی کراچی نے شائع کیا ۔ یہ تاریخ مختصر ہے — صاحب کو اعتراف ہے ۔ لکھتے ہیں " میں اپنی اس کتاب کو دکنی ادب کی تاریخ پر حرفِ آخر نہیں سمجھتا ، مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ اس کے ذریعہ خطۂ ملک کی علمی و ادبی تحریکوں اور کاوشوں کو عام اردو داں حلقوں میں متعارف کرانے کی کوشش کی گئی ہے " ۔ ڈاکٹر صاحب پر بعض لوگ پسندی کا اعتراض کرتے ہیں ۔ یہ اعتراض بعض دوستوں نے ڈاکٹر کے سامنے بھی کیا ہے ۔ وہ غالب کا مصرع پڑھتے " کون جیتا ہے تری کے سر ہونے تک " — اور حالی کے ہم خیال تھے کہ " جو کرنا ہے کر لو کہ تھوڑی ہے مہلت " ۔

انہوں نے اسی لئے کبھی کسی کام کو التوا میں نہ رکھا اور آج کا کام کل پر نہ ڈالا بلکہ کل کا کام آج کرنے کے عادی تھے اور اپنے دوستوں اگردوں سے بھی یہی توقع رکھتے تھے ۔

ڈاکٹر صاحب اولو العزم انسان تھے ۔ انہوں نے بہت سے موضوع اردو ادب کو دیئے ۔ روحِ تنقید سے پہلے تنقید پر اردو ادب ئی کتاب شائع نہیں ہوئی ۔ ہندوستانی لسانیات سے پہلے اردو ادب میں لسانیات پر کوئی کتاب نہیں چھپی ۔ ہندوستانی صوتیات ہندوستانی صوتیات میں پہلی اور آخری کتاب ہے ۔ اسی لئے وہ آج ابو الآباء لسانیات کہلاتے ہیں ۔

مغل مورخین کے غلط سلط واقعات کی صحت کا کسی کو خیال نہ آیا یہ کام بھی ڈاکٹر صاحب کے ہاتھوں ہوا ۔

میں نے بعض حضرات سے سنا ہے کہ ڈاکٹر صاحب سے دکنی ادب میں لغزشیں ہوئی ہیں ۔ بعض الفاظ کی قرات غلط ہوئی ہے نقلوں کے معنی غلط ہوئے ہیں ۔ میرا مفروضہ ہے کہ چالیس سال قبل جب کہ دکنی کی کوئی کتاب سامنے نہ تھی ، ترتیب و تدوین کے طریقے بھی وجود میں نہیں آئے تھے ، کتابوں کا حصول بھی ممکن نہ تھا کہ متعدد نسخے سامنے رہتے اور مرتب صحیح نتیجہ پر پہنچتا ۔ ان حالات میں نے جو کچھ کیا وہ ایک ایسی مشعل ہے جس کی روشنی میں ہم اور ہمارے نکتہ چیں آگے بڑھ رہے ہیں ۔

مرزا سرفراز علی

ایوانِ اردو

گلستانِ ادب ، دانش کا گلشن ، علم کا ایوان
یہ فردوسِ نظر ، تسکینِ دل ، جانِ دل و جاں ہے
اسے سینچا ہے حضرت زورؔ نے خونِ جگر دے کر
خوشا ایوانِ اردو ، حاصلِ تہذیبِ انساں ہے

(۱۵ راگست ۱۹۶۲ء)

ڈاکٹر محمد ہاشم علی

سلسلۂ بندہ نوازؒ کے ایک صوفی خاندان کی اردو خدمات

اردو کی ابتدائی نشو و نما میں جہاں عادل شاہی و قطب شاہی سلاطین نے غیر معمولی حصہ لیا وہیں سرزمینِ دکن کے اکثر و بیشتر صوفیائے کرام نے بھی اس زبان کو اپنی تصنیف و تالیف کا ذریعہ بنا کر فروغ دیا ہے۔ ان نفوسِ قدسیہ میں سلسلۂ بندہ نوازؒ کے مشہور اولیا میراں جی شمس العشاق، برہان الدین جانمؒ اور امین الدین اعلیٰؒ کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔ اور پھر ان کے بعد ان کے سلسلہ سے تعلق رکھنے والے بے شمار صوفیوں نے اس زبان میں تصنیف و تالیف کے سلسلہ کو جاری رکھتے ہوئے اس کو آگے بڑھانے میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ ان ہی بزرگوں میں سے شاہ حسینی خداوند بادی اور ان کے پوتے سید عبدالقادر میراں شاہ ولی اللہ اور پھر ان کے پڑپوتے شاہ محمد اور شاہ صدرالدین کا بھی شمار ہوتا ہے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے شاہ میراں جی شمس العشاق کے بارے میں لکھا ہے کہ میراں جی دکن کی ان چند گنی چنی ہستیوں میں سے ہیں جن کے فیضِ نظر کے طفیل نہ صرف اس دیس میں نور کی ندیاں رواں ہوئیں بلکہ جنھوں نے ابلاغ و ترسیل کے ایک نئے وسیلہ یعنی قدیم اردو کی داغ بیل ڈالی۔ اور بابائے اردو مولوی عبدالحق کا خیال ہے کہ دکن میں اردو کا نشو و نما میراں جی شمس العشاق کی بدولت ہوا تھا۔ مولوی صاحب لکھتے ہیں کہ

"میراں جی بڑے بابرکت بزرگ تھے۔ انہوں نے بیجاپور میں ایک ایسے خاندان کی بنیاد ڈالی جس میں ان کے جانشین یکے بعد دیگر بڑے صاحبِ علم اور صاحبِ ذوق ہوئے۔ اور انہوں نے اس کو اپنی زبان سمجھا اور اس زبان میں سلوک و معرفت پر متعدد رسالے اور نظمیں لکھیں۔ اسی خاندان کے مریدوں اور معتقدوں نے بھی اپنے مرشدوں کی پیروی میں اسی زبان کو اپنی تصنیف و تالیف کا ذریعہ بنایا۔ یہ اسی خاندان کا اثر تھا کہ بیجاپور میں زبان کو اس قدر فروغ حاصل ہوا اور وہاں ایسے خوش بیان اور ایسے بلند خیال شاعر پیدا ہوئے جن کی نظیر اردو کے شاعروں میں بہت کم ملتی ہے۔"[1]

مولوی عبدالحق نے جو بات میراں جی شمس العشاق کے خاندان کے تعلق سے کہی ہے یہ بات بڑی حد تک دکن کے ایک دوسرے صوفی شاہ حسینی خداوند بادی کے خاندان پر بھی منطبق ہوتی ہے۔ خداوند بادی کے دکنی نثری رسالہ اور ایک غزل کا جہاں پتہ چلتا ہے وہیں ان کے پوتے

بدیع القادر میراں حسینی ولی اللہ منزوی الجبلین (المعروف بہ میراں شاہ ولی اللہ جبلی) کے خلاصۃ الرویت جیسی معرکۃ الآراء کتاب کے مصنف ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ اور خود میراں حسینی ولی اللہ کے فرزند شاہ محمد کے "خزانۂ عبادت" و "خزانۂ معرفت" جیسی منظوم تصانیف ملتی ہیں۔ خدانما کے دوسرے فرزند شاہ صدرالدین کے بہت سی منظوم و منثور رسالوں کی تفصیلات کا علم ہوتا ہے۔ ان مضمون میں ان کا اختصار کے ساتھ جائزہ لیا جائے گا۔

ہاشم حسینی خداوندہادی کا نام سید ہاشم ہے لیکن خداوند، خدانما، خداوند ہادی اور خداوند ہادی خدانما کے لقب سے مشہور ہیں۔ مشکوٰۃ النبوۃ، تذکرۂ اولیائے دکن اور حدیقۂ رحمانی مصنفہ ابن سقف ان تینوں تذکروں میں آپ کے حالات ملتے ہیں۔ لیکن نسب نامہ صرف صاحب مشکوٰۃ نے دیا ہے۔ نسب نامہ کی صحیح تفصیل جہاں کے سلسلۂ خاندان کے ایک شجرہ سے دستیاب ہوئی ہے اس سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ سید جلال الدین بخاری مخدوم جہانیاں جہاں گشت کی اولاد سے ہیں۔ مخزن السلاسل عربی مصنفہ سید شاہ ابوالحسن ثانی قادری بیجاپوری میں قادریہ سلاسل دیئے گئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ ہاشم حسینی خداوندہادی کو سلسلۂ قادریہ میں حضرت محمود خوشدہان سے بیعت و خلافت حاصل تھی۔ اسی طرح چشتیہ سلسلہ کے شجروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہاشم حسینی خداوندہادی کو سلسلۂ چشتیہ میں حضرت امین الدین علی اعلیٰ شوقی ربانی سے بیعت و خلافت حاصل تھی۔ چشتیہ و قادریہ ان دو سلاسل کے علاوہ مجھے مزید دو سلاسل یعنی بخاریہ و طبقاتیہ کے شجرے بھی ملے ہیں۔ اس طرح ان چاروں سلاسل میں خصوصیت کے ساتھ آپ کی اولاد میں سید شاہ ابوالبرہان میراں حسینی، سید شاہ عبدالقادر المعروف میراں حسینی ولی اللہ منزوی الجبلین اور سید شاہ محمد صدرالدین سے سلسلہ بہ سلسلہ چلا ہے۔ ہاشم حسینی خداوندہادی کو سلسلۂ طبقاتیہ میں شاہ طیب علی بیجاپوری اور سلسلۂ بخاریہ میں حضرت شاہ غلام علی بیجاپوری سے خلافت و اجازت تھی۔ ؎

حضرت خداوندہادی صاحب تصرف و خوارق عادات تھے۔ آپ سے سلسلۂ چشتیہ کافی پھیلا۔ چنانچہ حیدرآباد میں آپ کے سلسلہ کے کافی بزرگ مدفون ہیں۔ حضرت عالمگیر جب دکن میں آئے تھے اس وقت آپ چنچولی ضلع گلبرگہ میں بقید حیات تھے۔ آپ کا مزار مبارک بھی یہیں ہے۔ سن وفات کا ذکر ان تذکروں میں نہیں ملتا، صرف عبدالجبار خاں ملکاپوری نے ۵ شوال ۱۱۱۶ھ لکھا ہے۔ حضرت خداوندہادی کا عرس شریف بڑے اہتمام کے ساتھ چنچولی میں ہر سال منایا جاتا ہے۔ مراسم عرس حضرت سید شاہ فصیح اللہ حسینی صاحب موجودہ سجادہ نشین انجام دیتے ہیں۔

حضرت سید شاہ ہاشم خداوندہادی صاحب تصنیف بھی رہے ہیں۔ آپ کا ایک نثری رسالہ جناب علیم الدین صاحب تاجر کتب حیدرآباد پاس ہے۔ ڈاکٹر زینت ساجدہ صاحبہ نے مجلۂ عثمانیہ کے دکنی ادب نمبر میں آپ کے ایک چکی نامہ کا ذکر کیا ہے اور اس کے کچھ بند بھی دیئے ہیں۔ خداوندہادی کے نہیں بلکہ ان کے مرید فاروقی کے ہیں اور اس کا اندازہ خود اس چکی نامے کے ان اشعار سے ہوتا ہے۔

عرفان کا چکی نامہ　　　بولے سید خداوند خدانما

پیرلے مرید کو سمجھانا

حضرت سید ہاشم خداوندہادی کی ایک غزل کو میں نے جنوری ۱۹۷۳ء کے ماہنامہ سب رس میں پہلی بار شائع کیا ہے۔ یہ غزل کتب خانہ سالار جنگ (۱۰۶) تصوف (۴۰) کلیات و دواوین میں ملتی ہے۔ لیکن اس میں اشعار بے وزن ہیں اور اس کا کاتب کم سواد ہے۔ مجھے حکیم سید باقر حسینی مرحوم کی ملکیت بیاض میں یہی غزل ملی ہے اور یہ کافی صحت پر مبنی ہے۔ اس غزل میں خداوند ہادی کا ملے ہر شعر

میں حق تعالیٰ کا مشہود بہ اعتبار تشبیہ کے کیا جانا ظاہر کیا ہے ۔ اور ذات حق کو ہر قسم کی تقید سے پاک و منزہ بتلایا ہے اور یہ بھی بتلایا ہے کہ نور کا اللہ ظہور ہے اس لئے عارف نور سے ہی نور کا مشاہدہ کرسکتا ہے ۔ اور مقطع میں اپنے شیخ امین الدین علی اعلیٰ کی توصیف کی ہے ۔

اچھے یو سو میں یو نور علی ہے امین اعلیٰ　　خداوند کی نظر نور خیالاں پر لگائے ہیں

حضرت سید ہاشم حسینی خداوند ہادی کے دیگر فرزندان کے منجملہ بلحاظ تعلق یہاں صرف دو کے ذکر پہ اکتفا کیا جاتا ہے ۔ ایک سید شاہ وجیہ اللہ حسینی اور دوسرے ابوالبرہان میراں شاہ حسینی ۔ سید شاہ وجیہ اللہ کے ایک فرزند سید شاہ عبدالقادر المعروف بہ میراں شاہ ولی اللہ منزوی الجبلین ہیں جن کو اپنے عم بزرگوار حضرت ابوالبرہان میراں شاہ حسینی سے بیعت و خلافت حاصل ہے ۔ اور حضرت ابوالبرہان میراں شاہ حسینی اپنے والد حضرت سید ہاشم حسینی خداوند ہادی کے خلیفہ ہیں ۔ سید شاہ عبدالقادر المعروف میراں شاہ ولی اللہ نے اپنے دادا سید ہاشم حسینی خداوند ہادی کی طرح دکنی ادب میں تصنیف و تالیف کے سلسلہ کو جاری رکھا ۔ اور میراں شاہ ولی اللہ کے دو فرزند ایک شاہ محمد اور دوسرے شاہ صدر الدین بھی صاحب تصنیف رہے ہیں ۔

شاہ محمد حق نما نے اپنی تصانیف خزانۂ عبادت اور خزانۂ معرفت میں جو اپنے والد کے حالات لکھے ہیں اس میں اپنے والد کو اپنا شیخ بھی بتلایا ہے ۔ اور اپنے والد سید عبدالقادر میراں شاہ ولی اللہ کو بارہویں صدی کے ممتاز ولیوں میں سے ایک بتایا ہے ۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

میں آیرچ ہوں قبلہ گاہ کا مرید　　ہی نام میراں صاحب سو روشن مزید
ولیاں سوں ہے قایم زمانہ تمام　　جگ جب تلک ہے ولی ہے مدام
صدی بارہویں کے ولیاں میں سکل　　ولی ہینگی یو شاہ میراں نول

(خزانہ عبادت" نسخہ قلمی نمبر (۸۴۶) کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد)

حضرت میراں شاہ ولی اللہ نہ صرف صاحب تصرف و خوارق عادات تھے بلکہ صاحب تصنیف بھی تھے ۔ میراں تخلص تھا ۔ فارسی میں شعر کہتے تھے ۔ اگرچہ حضرت میراں کی اب تک کسی فارسی تصنیف کا پتہ نہیں چلا ہے لیکن ان کی فارسی شعر گوئی کا اندازہ اس قطعہ سے ہوتا ہے جو انہوں نے اپنے فرزند شاہ صدر الدین کی ولادت کے موقع پہ کہا تھا ۔ یہ قطعہ حکیم سید باقر حسینی مرحوم کی ایک بیاض سے دستیاب ہوا ہے ۔

حضرت شاہ عبدالقادر میراں شاہ ولی اللہ کی تصانیف میں ایک دکنی نثری رسالہ خلاصۃ الرویت بھی ہے لیکن ڈاکٹر حسینی شاہد نے اپنے مقالہ " شاہ امین الدین علی اعلیٰ اور ان کے سلسلہ کے خلفا کی اردو خدمات " میں اس رسالہ کو سید شاہ عبدالقادر میراں حسینی نائب خلیفہ ہاشم حسینی خداوند ہادی کا قرار دیا ہے ۔ اور لکھا ہے '

" سید میراں کا سنہ وفات کسی تذکرے میں نہیں ملتا ۔ البتہ خاندانی شجرے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا انتقال ۱۱۱۵ھ میں ہوا عاشق محمد معشوق الیہ سے تاریخ نکلتی ہے "۔ ڈاکٹر حسینی شاہد نے سنہ ۱۱۱۵ھ تاریخ وفات لکھی ہے ۔ لفظ " اللہ " میں دو " الف " ہیں ڈاکٹر حسینی شاہد نے الف ثانی کو شمار نہیں کیا جس کی وجہ سے سنہ ۱۱۱۵ھ قرار دیا ہے اگر الف ثانی کو شمار کیا جائے تو سنہ ۱۱۱۶ھ

بیان بہادر ہی صحیح و درست ہے ۔ کیونکہ جناب سید سلیمان قادری سجادہ نشین حضرت میراں حسینی صاحب کے پاس تاریخ وفات ۱۲ صفر ۱۱۱۹ھ روز دوشنبہ درج ہے ۔ حضرت میراں حسینی کاسب علی آباد (حیدرآباد) میں دفن ہیں ۔ عاشق نے حضرت کے مزار کے محل وقوع کی ان الفاظ میں نشاندہی کی ہے ۔

شاہ علی بنڈہ کے آگے جو علی آباد ہے　　جل پلی کی نہر ہے پائوس ان کے در کے سات

(کلیات عاشق مخطوطہ نمبر ۱۲۲ ۱۴۱۴ قسم کتب خانہ آصفیہ)

ڈاکٹر حسینی شاہد نے خلاصۃ الرویت کے دو نسخوں کا ذکر ہے ۔ ایک کتب خانہ آصفیہ اور دوسرا کتب خانہ سالار جنگ کا ۔ لیکن مجھے مزید دو نسخوں کا پتہ چلا ہے ، ایک اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میسور میں ہے ۔ اور دوسرا حکیم باقر حسینی مرحوم فلکنوڈ حیدرآباد کی ملکیت ہے ۔ "خلاصۃ الرویت" "قرارت الانسان" اور "سبع صفات" کے نام سے بھی معروف رہا ہے ۔ خلاصۃ الرویت کے چاروں مذکورہ نسخوں کی تفصیل جانچنے سے یہ بات صاف طور پر واضح ہوتی ہے کہ مصنف کا نام

۱ ۔ پہلے نسخہ میں "حاجی الحرمین شاہ عبدالقادر عرف شاہ میراں جیلی الاودی"

۲ ۔ دوسرے نسخہ میں "حاجی الحرمین شریفین شاہ میراں حسینی ولی اللہ منزوی الجبلین"

۳ ۔ تیسرے نسخہ میں "حاجی الحرمین شاہ عبدالقادر عرف شاہ میراں جی الاودی"

۴ ۔ چوتھے نسخہ میں "حاجی الحرمین شریفین شاہ عبدالقادر عرف شاہ میراں حسینی ولی اللہ منزوی الجبلین" لکھا ہوا ہے ۔

دوسرے اور چوتھے نسخے میں شاہ میراں حسینی ولی اللہ منزوی الجبلین صاف لکھا ہے ۔ چوتھے نسخے کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ یہ خاندانی نسخہ ہے ان معنی میں کہ یہ نسخہ حکیم سید باقر حسینی کی ملکیت ہے ۔ اور حکیم صاحب کا تعلق شاہ صدر الدین کے خاندان سے ہے ۔ اور شاہ صدر الدین کے والد کا نام شاہ عبدالقادر عرف شاہ میراں حسینی ولی اللہ منزوی الجبلین ہے ۔ یہ بزرگ پہاڑوں پر رہا کرتے تھے ۔ چنانچہ ان کے فرزند شاہ محمد اپنی تصنیف "خزانہ عبادت" میں لکھتے ہیں ؎

ہمیشہ رہتے تھے او پہاڑوں میں جان　　جنگل ہور بیابان جھاڑوں میں جان

اس لئے ان کو "منزوی الجبلین" کہا جاتا ہے ۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ شاہ صدر الدین اپنے والد سید عبدالقادر عرف شاہ میراں حسینی ولی اللہ منزوی الجبلین کے نہ صرف فرزند بلکہ خلیفہ بھی ہیں ۔ اور شاہ صدر الدین کو قادریہ، چشتیہ، طبقاتیہ اور بخاریہ ان چاروں سلاسل میں اپنے والد بزرگوار حضرت سید عبدالقادر عرف شاہ میراں حسینی ولی اللہ منزوی الجبلین سے بھی خلافت ہے جس کی توثیق ان چاروں سلاسل کے ان شجروں سے ہوتی ہے جو سید شاہ ذوالفقار علی ساکن جنتل کانی ضلع کھم کی ملکیت ہے ۔ ان شواہد کی روشنی میں ڈاکٹر حسینی شاہد کے اس خیال سے قطعی اتفاق نہیں کیا جاسکتا کہ اس رسالہ خلاصۃ الرویت کے مصنف سید عبدالقادر عرف شاہ میراں حسینی صاحب ہیں ۔ اور اس میں شک و شبہ کی رمق برابر بھی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ خلاصۃ الرویت کے مصنف شاہ صدر الدین کے والد بزرگوار حضرت سید شاہ عبدالقادر عرف شاہ میراں حسینی ولی اللہ منزوی الجبلین ہیں جن کا انتقال ۴ جمادی الآخر ۱۱۴۲ھ کو ہوا اور "بود چارم جمادی الآخر" سے یہ نکالا گیا جس کی تفصیل اس بیاض میں ملتی ہے جو حکیم باقر حسینی کی ملکیت ہے ۔

حضرت سید عبدالقادر میراں حسینی ولی اللہ ارکاٹ سے چند میل کے فاصلہ پر آدم کی پہاڑی پر آسودہ ہیں۔ غلام عبدالقادر المتخلص بہ ناظر نے اپنے تذکرہ "بہار اعظم جاہی" میں لکھا ہے کہ انہوں نے اپنے سفر ارکاٹ کے دوران حضرت میراں حسینی ولی اللہ کے مزار پر حاضری دی تھی۔ حضرت سید عبدالقادر میراں حسینی ولی اللہ نہ صرف صاحب کرامات بلکہ صاحب تصنیف بھی تھے۔ یہ ان کی تربیت ہی کا فیضان تھا کہ جہاں ان کے ایک فرزند شاہ محمد نے "خزانۂ عبادت" اور "خزانۂ معرفت" جیسی مثنویاں لکھ کر شریعت و طریقت کی اہمیت سے اُردو دنیا کو واقف کرایا وہیں ان کے دوسرے فرزند شاہ صدرالدین نے معرفت کے رموز سے عوام کو واقف کرانے کے لئے یا دوسرے الفاظ میں اپنی "مطلب برآری" کے لئے قدیم اردو یا دکنی زبان و ادب کو استعمال کیا۔ جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں ؎

مطلب سوں اپنے کام ہے دکنی اچھو یا فارسی　　مگہ دیکھنے سے ہے غرض جس جنس کی ہو آرسی

شاہ صدرالدین کے والد بزرگوار میراں شاہ ولی اللہ اور ان کے بھائی شاہ محمد کے فیضِ نظر کے طفیل جہاں ارکاٹ (ٹامل ناڈو) اور رام گیر (آندھرا پردیش) میں نور کی ندیاں رواں ہوئیں وہیں شاہ صدرالدین کی توسط سے حضرت سید محمد حسینی گیسو دراز شہباز بلند پرواز کا فیضان کرناٹک کے گوشہ گوشہ میں ایسا عام ہوا کہ اسرار و معارف کا طوطی بولنے لگا۔ حتیٰ کہ سلطنت خداداد کے تاجدار ٹیپو سلطان کو بھی یہ شرف حاصل ہوا کہ حضرت شاہ صدرالدین کے دستِ حق پرست پر بیعت کرے۔ حضرت شاہ صدرالدین کا وصال ۱۱۹۳ھ میں ہوا۔ ان کے خلیفہ عارف شاہ قادری نے "صدر نشین اہلِ جنت" سے مادۂ تاریخ نکالا تھا۔ شاہ صدرالدین کا مزار بنگلور اور ٹمکور کی شاہراہ پر بنگلور سے کوئی سولہ میل فاصلہ پر نلمنگل کے بس اسٹانڈ کے قریب واقع ہے۔

شاہ صدرالدین کی جملہ ۱۷ مثنویاں اور ۳ غزلوں کے علاوہ ۶ نثری رسالوں کا پتہ چلتا ہے۔ جن میں ان کا ایک معرکۃ الآرا نثری رسالہ "مرآۃ الاسرار" ہے جس کو پروفیسر عبدالقادر سروری مرحوم نے اپنے قیام میسور کے دوران مرتب کر کے ۱۹۴۶ء میں شائع کیا تھا۔ شاہ صدرالدین نثر نگار ہی نہیں بلکہ ممتاز شاعر بھی تھے۔ اب تک ان کے کم و بیش ڈھائی ہزار اشعار کا پتہ چلا ہے۔ انہوں نے غزلیں بھی لکھیں اور مثنویاں بھی۔ لیکن مثنویوں میں انہوں نے تصوف کے خشک مسائل کو تمثیلوں، تشبیہوں اور اپنے نکھرے ہوئے اسلوب سے دلچسپ بنا دیا ہے۔ مثلاً ایک شعر میں جسم کو سیپی، دریا کو جسم مثالی اور موتی کو روح سے اس طرح تشبیہ دیتے ہیں ؎

مایہ دریا ہے مروارید جان　　اور صدف ہے جسم تیرا بے گمان

مثنوی مولوی معنوی میں مولانا جلال الدین رومیؔ کا ایک شعر ہے ؎

درگذر ایں جملہ تن در بصر　　در نظر رو در نظر رو در نظر

مذکورہ شعر میں مولانا رومیؔ نے "در نظر" کی تکرار سے شعر میں جو حسن پیدا کیا ہے دکنی میں شاہ صدرالدین نے اس کا آزاد ترجمہ کرتے ہوئے اس کے حسن کو برقرار رکھنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ فرماتے ہیں ؎

ناظر و منظور سوں بالکل گذر　　خود نظر ہو خود نظر ہو خود نظر

اسی طرح ذیل کے شعر میں "نور ہو رہ نور ہو" کی تکرار سے جو حسن پیدا ہوا ہے ملاحظہ ہو ؎

نور ہو رہ نور ہو رہ نور ہو　　والا پیدا ہو ارکی منظور ہو

شاہ صدرالدین کی جو بھی غزلیں ملتی
ان کے مطالعہ سے ان کی زبان میں ارتقار
بڑی مدد ملتی ہے ۔ خصوصاً شاہ صاحب
زلوں کا جب ہم بیجا پور کے مشہور و معروف
نصرتی (متوفی ۱۰۸۵ھ) کی غزلوں سے
نا کریں تو شاہ صاحب کی زبان کے ارتقار
سانی اندازہ ہوسکتا ہے ۔ نصرتی کا
شعر ملاحظہ ہو ۔

یں پیو کی جن دل کا ترنج بات اپس کا ٹے
کیا کام یوسف ہور زلیخا کی دو مجلس سوں

اس کے مقابلہ میں شاہ صاحب کے اس
سلاست و روانی ملاحظہ ہو ۔

نیان بنا اور کچھ دھیان وہروں میں
غیر کو جا ہوں تو دو عالم میں ہنسی ہے

شاہ صاحب کے خلیفہ عارف شاہ
بھی صاحب تصنیف صوفی تھے ۔ ان کی دو
مشہور ہیں (۱) حقوق المسلمین
مطلوب المریدین ۔ اس طرح شاہ صدرالدین
ان کے خلیفہ عارف شاہ قادری کا شمار ان
سلسلے دکن میں ہوتا ہے جو حضرت گیسو دراز
واز کے اس سلسلہ کی آخری کڑی سمجھے
ہیں جس نے اردو زبان و ادب کو تصنیف
کیلئے ذریعہ بنایا تھا ۔ شاہ صدرالدین کی طرح
شاہ قادری بھی تلنگل میں مدفون ہیں ۔ الغ
یہ کہا جاسکتا ہے کہ دکنی ادب کی وہ سلسلے
روایت سے چلی تھی وہ بیجاپور، گولکنڈہ، رام گیر
سے بہتے ہوئے میسور اور بنگلور تک پہنچ کر ختم ہوگئی

■■

مظہر کامل

یادِ زورؔ

اے عاشقِ شیدائے اردو جب تو نے اچانک پردہ کیا
کتنوں کے دلوں میں گھر رہتا تیرا اس وقت کہیں معلوم ہوا

ہاں نام تو محی الدین تھا مگر اردو کی مسیحائی بھی کی
دم توڑنے والی اردو کا کیا کچھ نہ مداوا تو نے کیا

کی عمر بسر تو نے ساری تاریخ و ادب کی خدمت میں
یہ ایک حقیقت ہے جس پر شاہد ہے دکن کی ساری فضا

کس زور کا ماتم ہے برپا ہر سمت جہانِ اردو میں
کس کس نے کلیجہ چھوڑ دیا اک تیر فقط دل کیا بیٹھا

اردو کے پرستاروں کے لئے ایوان وادارہ اب بھی ہے
رونق تھی مگر ان کی جس سے افسوس وہی باقی نہ رہا

تھوڑے سے تعرف سے تجھ پر یہ مصرعِ فانیؔ کھپتا ہے
غربت بھی نہ تجھ کو راس آئی اور ہائے وطن بھی چھوٹ گیا

اے پیکرِ عزم و جہد و عمل اخلاص کی برکت سے تیرے
جب تو نے اٹھایا کوئی قدم منزل نے تجھے خود بڑھ کے لیا

کردار کا تیرے یہ پہلو اربابِ نظر پر روشن ہے
تو زیست کی ہر اک منزل میں محسود رہا حاسد نہ بنا

مظہر نے حقیقت پر مبنی رحلت کی تیرے تاریخ کہی
"اردو کے فدائی مونس کو کشمیر نے ہم سے چھین لیا"

۱۳ ھ ۸۲

سداشیو ڈیار
ترجمہ : رابعہ قریشی

مہاتما بسویشور اور اُن کی تعلیمات

ھندوستان کی مذہبی تاریخ میں مہاتما بسویشور کی شخصیت سب سے زیادہ اہم اور قد آور ہے ۔ جنوبی ہند میں ان کی تعلیمات لاکھوں لوگوں کے لئے گذشتہ آٹھ صدیوں سے مشعلِ ہدایت بنی ہوئی ہیں اور ان کا فلسفۂ حیات آج کے دورِ ابتلا میں بھی اس فرد کے لئے باعثِ فلاح و نجات ہے جو غریبی کے بارِ مصائب تلے بدحال اور اخلاقی اقدار کی پامالی کے باعث مضطرب اور برافروختہ ہے ۔ ان حالات میں ضروری ہے کہ مہاتما بسویشور جیسے روحانی پیشوا کی تعلیمات پر عمل پیرائی کرکے پراگندہ ذہنوں کے سکون کے لئے کوئی حل تلاش کیا جائے ۔

مہاتما بسویشور ایک آفاق گیر شخصیت کے مالک تھے ۔ جو ایک خدا' ایک دنیا اور " ایک انسانی برادری " پر یقین رکھتے تھے ۔ ان کا یہ مستحکم عقیدہ تھا کہ بنی نوعِ انسان کی ہمدردی ہی مذہب کی بنیاد ہوتی ہے ۔ اس لحاظ سے گوتم بدھ کی طرح مہاتما بسویشور کا پیام بھی جذباتِ اخوت پر مبنی ہے ۔ انہی جذبات کی تبلیغ انہوں نے اپنے وچنوں کے ذریعے کی ہے ۔ ان کی محبت و شفقت کی کہانیاں صرف انسانوں ہی کے بارے میں مشہور نہیں' بلکہ ان کی کرم گسترانہ نگاہ کی رسائی بے زبان جانوروں تک بھی تھی ۔ یہ کہانی بہت مشہور ہے کہ ایک دفعہ ان کی ساری گائیں چرا لی گئیں ۔ ملازمین سے انہیں جب یہ اطلاع ملی تو انہوں نے حکم دیا کہ گھر کے تمام بچھڑے بھی چوروں تک پہنچا دیئے جائیں تاکہ بچھڑے اپنی ماؤں کی جدائی میں مبتلائے تکلیف نہ رہیں ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ زندگی اُن کے نزدیک قابلِ قدر' بلند اور مقدس تھی ۔ اپنے ایک وچن میں انہوں نے فرمایا ہے کہ وہی شخص سچا عابد' متقی اور پارسا ہے جس کے پیشِ نظر ساری مخلوقات کی بھلائی اور خوش حالی رہے ۔ جرمنی کے ڈاکٹر البرٹ شوائٹزر نے اس جذبے کو " تقدسِ حیات " سے تعبیر کیا ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ مقدس وہ ہے جو زندگی کو مقدس سمجھے ۔ مہاتما بسویشور نے ۸۰۰ برس پہلے یہ تعلیمات کو عام کیا ہے ۔ انہوں نے کسی مرحلے پر بھی زندگی سے فرار کی تعلیم نہیں دی ۔ وہ فرماتے تھے کہ نیک زندگی ہی نجاتِ دنیا و آخرت کا ضامن ہے ۔ ان کا یہ بھی قول ہے کہ کائنات " خدائی دار الضرب " ہے اور جو سکہ دنیا میں کھرا ہے وہ آخرت میں بھی ہر حال کھرا ثابت ہوگا ۔ جو انسان یہاں نیک ہے وہ عاقبت میں بھی نیک اور کامران متصور ہوگا ۔

مہاتما بسویشور کے عہد میں "ورناشرم دھرم" زوال یافتہ ہو رہا تھا ۔ اور اس کے دور کے سماج نے لوگوں میں اونچ نیچ اور ذات پات کی تفریق پیدا کر دی تھی ۔ کسی معزز خاندان میں فرد کی پیدائش اس کا مرتبہ متعین کرتی تھی ۔ اس کے نتیجہ میں اس شخص کو نہایت حقیر سمجھا جاتا تھا جو کسی پست خاندان میں جنم لیتا تھا ۔ پھر ایسے فرد کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ اعلیٰ ذات کے لوگوں کی خدمت کے لئے اپنی زندگی وقف کر دے ۔ مہاتما بسویشور نے مذکورہ "ورناشرم دھرم" پر نظرِ ثانی کی اور اسے انصاف، مساوات اور تقدیسِ انسانیت کا درس دیا — پروفیسر گوکاک کا یہ قول بالکل صحیح ہے کہ مہاتما بسویشور نے ذات پات کی تفریق سے پارہ پارہ معاشرے کو اتحاد اور مساوات کا درس دے کر اچھوت کو برہمن کا ہمدوش و ہمسر کر دیا ۔

مہاتما بسویشور فرماتے تھے کہ خدا کی نگاہوں میں سب مساوی ہیں اور عظمت دراصل تقرّبِ خداوندی کے باعث ہے ۔ اس طرح ان کا فرمان تھا کہ بزرگی، رنگ، نسل اور ذات پر منحصر نہیں ۔ انہوں نے معاشرۂ انسانی کو ارواح کی ایک ایسی جمہوریت سے تعبیر کیا جس میں سب کے لئے مساوی جذبۂ عزت و توقیر موجود ہو ۔ سماجی مساوات ان کے فلسفہ کی روح ہے ۔ انہوں نے ہر اس شخص کو پیامِ نجاتِ آخرت سنایا جس نے نیک زندگی بسر کی ہو ۔ "ویرشیو دھرم" کی تبلیغ کے سلسلے میں انہوں نے اسی مساوات کی بنیاد کو پیش نظر رکھا ۔ جس پر بعد میں بلا لحاظِ تفریقِ ذات، تعمیرِ انسانیت کی بنیاد رکھی گئی ۔ انہوں نے اس انقلاب کی راہ ہموار کی جس کا پیام پست اور زبوں حال عوام کے لئے تھا ۔

مہاتما بسویشور نے ایک روحانی اکیڈیمی "انوبھو منٹپ" کے نام سے قائم کی تھی جس کا سب سے بڑا وصف یہ تھا کہ اس میں بلا لحاظِ تفریقِ رنگ و نسل و مذہب ہر شخص کو خوش آمدید کہا جاتا تھا ۔ اس انوبھو منٹپ کے ارکان میں حجّام، خیّاط، دھوبی، سُنار، کمہار، اسلحہ ساز، سپاہی، دبّاغ، ماہی گیر اور ملّاح وغیرہ سبھی شامل تھے ۔ یہ مقامِ حیرت ہے کہ پست ذات کے ان ہی لوگوں نے مہاتما بسویشور کی رہنمائی میں فلاحِ انسانیت کے لئے بے شمار وچن لکھے اور مہاتما بسویشور نے انہی کو ایک عظیم سماجی انقلاب کا وسیلہ بنایا ۔ اسی نو بیدار طبقہ نے ان کی رہنمائی میں اس سماج کی تشکیلِ جدید کی اور بہت قلیل مدت میں ہندوستان میں وہ تمدن پیدا کر دیا جو کسی بھی ملک کے لئے سرمایۂ افتخار ہو سکتا ہے ۔ اس نئی انقلابی تحریک کا سماج پر یہ اثر ہوا کہ قرب و دور سے اہلِ دانش "بسو کلیان" میں جمع ہونے لگے ۔ جہاں مہاتما بسویشور نے "شاہ بجّل" کے عہدِ حکومت میں انوبھو منٹپ قائم کیا تھا ۔ اسی کی شہرت کا نتیجہ تھا کہ کشمیر جیسے دور دراز مقام کا شہزادہ مایا بھی بسو کلیان منتقل ہو گیا تھا ۔ اس دور میں انوبھو منٹپ کے اربابِ مجاز نے مہاتما بسویشور کے آشیرواد کے تحت ایک برہمن لڑکی کی شادی ایک ہریجن سے کروا دی تھی جس کے نتیجے میں سارا قدامت پسند سماج برانگیختہ ہو گیا تھا ۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ملک میں سب سے پہلے مہاتما بسویشور نے ہی ذات پات کی تفریق کو ختم کرنے کے لئے آٹھ سو سال قبل عملی اقدام کئے جنہیں ہمارے اپنے دور میں مہاتما گاندھی نے ہریجن سدھار اور سرودیہ کے نام سے مقصدِ حیات بنا لیا تھا ۔

آر ستر مالکر نے اپنی تصنیف "لنگ کی سرزمین" میں بسویشور کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے بجا طور پر یہ کہا ہے کہ "یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ مہاتما بسویشور ہی ہندوستان کے سب سے پہلے آزاد خیال مفکر تھے" انہوں نے ہی ذات پات کی تفریق کی قدیم رسم کا خاتمہ کیا اور یہ اعلان کیا کہ نسب کے اعتبار سے کسی کو فوقیت نہیں کیونکہ پیدائش کے لحاظ سے سب لوگ مساوی ہیں ۔

مہاتما بسویشور کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے صدیوں کی مظلوم اور کمزور عورت کو معاشرے کی محکومی اور غلامی سے

نجات دلائی ۔ ہندوستان میں صدیوں سے ان کے عہد تک یہی تصور تھا کہ عورت ایک حقیر مخلوق ہے جو کسی قسم کی آزادی کی مستحق نہیں ۔ یہ صرف اور صرف مہاتما بسویشور تھے جنہوں نے یہ اعلان کیا کہ عورت کا مرتبہ مذہباً مرد سے فروتر نہیں ۔ اسی کے پیش نظر انہوں نے عورتوں کو ترغیب دی کہ وہ سماجی اور مذہبی امور میں مردوں کے شانہ بہ شانہ حصہ لیں ۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک دن میں تنگ نظر پنڈتوں سے یہ سوال کیا ہے کہ "آخر عورت کی جنس کیا ہے ؟" یہ مہاتما بسویشور کی تحریک اصلاح نسواں کا اعجاز تھا کہ بارہویں صدی کے بعد ہمیں وہ صوفی اور فلسفی خواتین نظر آتی ہیں جنہوں نے فلسفہ، مذہب، تہذیب اور ادب کی سرخروئی کے لئے کارہائے نمایاں انجام دیئے ۔ ان بلند پایہ مقدس خواتین میں اکا مہادیوی، گنگامبیکا، اکا ناگما، نیلما، اور ستیکا وغیرہ کے اسمائے گرامی افق ہند پر ستاروں کی طرح تابندہ ہیں ۔ اکا مہادیوی اور گنگامبیکا تو وہ معزز خواتین تھیں جنہیں اپنے عہد کے عظیم بزرگ اور رہنما اللم پربھو سے بھی شرف نیاز حاصل تھا ۔ خود بسویشور، اکا مہادیوی کی عظمت کے اس حد تک قائل تھے کہ انہوں نے ان کو اپنے سے برتر تسلیم کیا ہے ۔ گو کہ وہ سن و سال کے لحاظ سے ان سے بہت چھوٹی تھیں ۔ تاریخ عالم میں یہ امر نہایت حیرت انگیز ہے کہ بہت قلیل عرصہ میں چھوٹی سی ریاست کرناٹک نے اتنی جلیل و عظیم صوفی خواتین کو جنم دیا ۔۔۔ ان خواتین کی فہم و فراست کا اس بات سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے انوبھو منٹپ کے عظیم ادبی و مذہبی مذاکرات میں نہایت انہماک کے ساتھ حصہ لیا ۔ کہا جاتا ہے کہ اس منٹپ کے (۳۰۰) باقاعدہ شرکار میں (۶۰) ارکان کی تعداد خواتین پر مشتمل تھی ۔ مسز جیمس کیمبل نے ایک جگہ لکھا ہے کہ بسویشور نے سماجی اصلاح کا ایک جامع اور وسیع نظام العمل ترتیب دیا تھا جس میں خواتین کی سربلندی اور آزادی پر بطور خاص توجہ مبذول کی گئی تھی ۔ ہندوستان کے موجودہ مصلحین معاشرہ دراصل مہاتما بسویشور ہی کی تعلیمات سے استفادہ اور اس کی تبلیغ و اشاعت میں مصروف ہیں ۔

مہاتما بسویشور نے "کایکا" کے فلسفے کے تحت ایک سماجی انقلاب کی بنیاد رکھی ۔ انہوں نے اس بات کی تبلیغ کی کہ آدمی کی توقیر اس کے پیشے کے پیش نظر نہ کی جائے، کیونکہ ان کی نظر میں کوئی پیشہ معزز یا مبتذل نہیں تھا ۔ "کایکا" کے لغوی معنی جسمانی محنت کے ہیں ۔ مہاتما بسویشور کے نزدیک اس کا مفہوم خود شناسی اور معرفت نفس کے علاوہ یہ ہے کہ انسان بے عمل زندگی بسر نہ کرے ۔ انہوں نے سستی اور کاہلی کی ہر جگہ مذمت کی ہے ۔ اور اس بات پر زور دیا ہے کہ ہر شخص اپنے اور اپنے سماج کے لئے کچھ نہ کچھ کمائے ۔ ان کے نزدیک ہر اچھا کام ایک عبادت تھا ۔ انہوں نے ان لوگوں کی سخت مذمت کی جو پست اقوام کو بہ نظر حقارت دیکھتے ہیں ۔ چنانچہ انہوں نے اس بات کا عہد کر رکھا تھا کہ وہ کسی ملاقاتی سے اس کی ذات یا پیشے کے بارے میں ہرگز استفسار نہیں کریں گے اور اگر ان سے کبھی ایسی غلطی سرزد ہو جائے تو انہوں نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اس کی پاداش میں ان کا سر قلم کر دیا جائے ۔

کایکا کے تحت ویرشیو فلسفے نے دنیا کو "مایا" کی بجائے ایک حقیقت سے تعبیر کیا ہے ۔ اور اسی نظریے کے تحت انہوں نے ترک دنیا کر کے جنگل میں جا کر تپسیا کرنے اور سنیاس لینے کی سخت مخالفت کی تھی ۔ ان کا ارشاد تھا کہ بہترین زندگی بہترین عمل میں پوشیدہ ہے ۔ انہوں نے نتائج سے بے پروا عمل پر زور دیا ہے اور فرمایا ہے کہ اگر کسی ہوس یا لالچ کے پیش نظر کوئی کام کیا جائے تو ایسا کام برباد اور غارت ہو جاتا ہے ۔ مہاتما بسویشور نے بھیک مانگنے کی سخت مخالفت کی اور اعلیٰ ذات کے لوگوں میں بھی دست نگری کے رجحان کو معتوب قرار دیا ۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ جو اپنے پیٹ کے لئے سوال کرے وہ جنگم نہیں ہے ۔

"کایکا" کے فلسفے کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ماتحت بارہویں صدی عیسوی ہی میں "سماج واد" کے نظریات کا آغاز ہو گیا تھا ۔ ویرشیومت پر اعتقاد رکھنے والے کے لئے یہ لازم ہے کہ وہ کل کے لئے کچھ بچا نہ رکھے ۔ اگر وہ اپنی ضروریات سے زیادہ کماتا اور جمع رکھتا ہے تو گویا

دوسرے کو ضروریاتِ زندگی سے محروم رکھتا ہے ۔ اس سلسلے میں ان کا یہ قصہ بہت مشہور ہے کہ ایک چور نے ان کے گھر میں داخل ہو کر ان کی طلائی زیور چرالیا ۔ بیوی چیخ پکار کرنے لگیں تو بسویشور نے فرمایا کہ چور دراصل چور نہیں بھگوان ہے جو انہیں یہ بتانے کے لئے گھر آیا ہے کہ چور ہیں ۔ کیونکہ ہم نے ضرورت سے زیادہ جمع کر رکھا ہے ۔ لہٰذا اگر ایک چور دوسرے چور کے گھر آئے تو شورِ فریاد و فغاں کیوں بلند کیا جائے ؟ —— اس حکایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ بسویشور غیر ضروری دولت کے اجتماع کے کس قدر مخالف تھے ۔ انہی خیالات کا انہوں نے اپنے وچنوں میں بھی کیا ہے ۔

ان کے کایکا فلسفے نے انسانیت کو یہ درس بھی دیا ہے کہ آدمی جب تک محنت کرنے کے لئے تیار ہے اس وقت تک معاشرے میں غربت باقی رہ سکتی اور محنتی آدمی مفلس نہیں ہو سکتا ۔ اس لئے وہ عمل کو جنّت سے تعبیر کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ بھگوان کے نزدیک برگزیدہ وہ ہے جو نیک عمل ہے ۔ ایک وچن میں فرمایا ہے کہ اگر کوئی مصروفِ جہدِ حیات ہے تو اس کے تساہلِ عبادت کو نظر انداز کر دینا گناہ نہیں ہے کیونکہ عمل مت ہے ۔

مہاتما بسویشور کے پیشِ نظر ہمیشہ عام آدمی کی فلاح و بہبود رہی اور وہ اسی کے دل و دماغ تک اپنا مقدس پیغام پہنچانا چاہتے تھے —— دور میں دانشوروں کی زبان سنسکرت تھی لیکن انہوں نے اپنے فلسفے کو خانقاہوں اور مٹھوں کی تنگیوں سے نکال کر عام آدمی کے لئے مشعلِ راہ بنایا ۔ اسی لئے انہوں نے سنسکرت کی بجائے سلیس کنڑا زبان کو اپنا ذریعۂ ابلاغ بنایا اور اسی زبان میں وہ اپنے بیش قیمت وچن پیش فرمائے جن میں قیمتیں پنہاں ہیں ۔ ان کے وچنوں کے اس سلیس اسلوب کو بعد کے شرن مہاتماؤں نے بھی تبلیغِ مذہب کے لئے اختیار کیا ۔ یہ چونکہ ان کے قلب ۔ گہرائیوں سے نکلے ہیں اس لئے لوگوں کے قلوب و اذہان پر اثر انداز ہوتے ہیں ۔ یہ وچن کہیں ہمارے گھریلو ماحول کی عکاسی کرتے ہیں، کہیں ان دیہی گھاٹ کے مناظر نظر آتے ہیں ۔ کہیں سپیرے کی بین سنائی دیتی ہے ۔ کہیں پرندوں کے نغمے گونجتے ہیں، کہیں گرہست عورت کا تقدس ہے ۔ کہیں فراق زدہ محبوبہ سراپا انتظار نظر آتی ہے ۔ اور حق تو یہ ہے کہ ان سب سے کسی نہ کسی طرح بھگوان کی عقیدت ہی کا اظہار ہوتا ان کے وچن اخلاقیات کے بیش بہا اور لازوال خزانے ہیں جن میں سے بعض وچن بائبل کے مقدس احکام کی یاد دلاتے ہیں ۔

مہاتما بسویشور کی تعلیمات رائگاں نہیں گئیں ۔ یہ گراں قدر تعلیمات آج بھی ہمارے معاشرے میں زندہ ہیں ۔ جو عوام کے لئے نور بنی ہوئی ہیں ۔

یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ کیا مہاتما بسویشور اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے ؟

اس کا جواب اثبات میں بھی ہے اور نفی میں بھی ۔ وہ عظیم پیغمبر جو انسانیت کی رشد و ہدایت کے لئے مبعوث ہوئے ، وہ بھی شاید مقصد میں پورے طور پر کامیاب نہیں ہوئے ۔ لیکن ان نفوسِ برگزیدہ نے ہمیشہ انسانیت کو راہِ نجات دکھلائی ہے ۔ اور انہی کی روشنی میں عوام رفتہ رفتہ راہِ منزل پر گامزن ہوئے ہیں ۔ گاندھی جی کے بارے میں ٹیگور نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ " وہ شاید مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے بلکہ مہاتما گوتم بدھ اور حضرت مسیح کی طرح ، بدبختوں کو نیکی کی طرف بلانے میں شاید وہ بھی ناکام ۔ لیکن وہ اس حیثیت سے ہمیشہ یاد رہیں گے کہ انہوں نے اپنی ساری زندگی کو دوسروں کے لئے نمونۂ عمل بنا دیا تھا "۔ مہاتما بسویشور کی کیفیت ہے جن کی تعلیمات نے بنی نوعِ انسان کو دائمی امن ، ہدایت ، روشنی اور مسرت عطا کی ہے ۔

غزلیں

شاذ تمکنت

شب وعدہ کہہ گئی ہے شب غم دراز رکھنا ۔۔۔ اسے میں بھی راز رکھوں تم بھی راز رکھنا
یہ ہے خار خار وادی یونہی زخم زخم چلنا ۔۔۔ یہ ہے پتھروں کی بستی، یونہی دل گداز رکھنا
ہمہ تن جنوں ہوں پھر بھی ہے کچھ تو پاسداری ۔۔۔ کہ بُرا نہیں خرد سے کوئی ساز باز رکھنا
مرے ناخنِ وفا پہ کوئی قرض رہ نہ جائے ۔۔۔ ترے دل میں جو گرہ ہے اُسے نیم باز رکھنا
وہی لے جو اَن سُنی بھی وہی شاذ نغمگی بھی
یہ حسابِ خامشی بھی مرے نَے نواز رکھنا

ڈاکٹر احسن رضوی

جہاں جہاں سے بھی گزرا نقوش چھوڑ گیا ۔۔۔ وجود اس کا فقط راہ کا غبار نہ تھا
ہر ایک شخص سے ملتا رہا جو ہنس ہنس کر ۔۔۔ بہت اُداس ہوا ہے کبھی جو خود سے ملا
درخت اپنی جگہ ہیں سڑک بھی اپنی جگہ ۔۔۔ مگر وہ راستہ اب وہ نہیں جو پہلے تھا
تمام عمر رہی جستجوئے علم و ہنر ۔۔۔ میں ایک گہرا سمندر تھا اور پیاسا رہا
بدن کی آگ بجھی ہے تو روح تشنہ ہے ۔۔۔ کہ زندگی کا مقدر ہے اک نہ ایک خلا
تمام رات مجھے چیونٹیوں نے کاٹا ہے ۔۔۔ بدن کے نیچے پڑا نرم نرم بستر تھا
ہزار محفلیں آباد کر گیا احسن
یہ اور بات وہ تنہائیوں کی زد میں رہا

وقار واثقی

یہ یقینی امر ہے، وہ خود نما بن جائے گا
آئینہ لیکن مزاجِ وقت کا بن جائے گا

ماسوا اپنے کسی پہ بھی نہیں اس کی نظر
وہ کسی دن ساری دنیا سے بُرا بن جائیگا

ہو سکے تو کوئی سمجھائے کہ چھوڑے غور و فکر
انتہا کی فکر میں وہ ابتدا بن جائے گا

بندگی کرتا رہے گا صرف اپنی دیکھنا
وہ بزعمِ خویش خود اپنا خدا بن جائیگا

کون سمجھے گا ترے الفاظ کی گہرائیاں
کل زبانِ خلق پہ اک مسئلہ بن جائیگا

یوں ذلیل اتنا کیا ہوتا نہ اس کو دوستو
کیا خبر تھی کل وہ اپنا رہنما بن جائے گا

قولِ غالب باعثِ تسکینِ خاطر ہے وقار
درد جب حد سے سوا ہوگا دوا بن جائیگا

مظفر حنفی

چتی ہیں اب کدھر جاتاہے سایہ
اور چپکے سے مرے اندر اتر جاتاہے سایہ

لنے کے لئے سورج اتنے کھیلتے ہے
آدمی سانسیں لیا کرتا ہے، مرجاتاہے سایہ

راستے میں چاندنی لیٹی ہوئی تھی
میرے بستر سے نکل کر کس کے گھر جاتاہے سایہ

دھوپ میں اس ابر یک لمحہ کی رحمت
اس طرح تو اور کچھ بے چین کر جاتاہے سایہ

بنت پہ ہے، آرزو شوریدہ سر ہے
میں جدھر جاؤں تری دیوار پر جاتاہے سایہ

ں جب قربت کے لمحے دوپہر میں
جسم میں ٹھنڈی ہوا، آنکھوں میں بھر جاتاہے سایہ

اے مظفر آس کا ایک آدھ جگنو ہی بہت ہے
روشنی کے دائرے میں تو بکھر جاتاہے سایہ

غزلیں

ب

سحر سے گذر گئے چپ چاپ
وفا پرست ترا نام کر گئے چپ چاپ

کہ خود روشنی کو ترسے ہم
قلم کا نور کتابوں میں بھر گئے چپ چاپ

ٹتے لمحوں کی داستاں لکھ کر
ہم اپنے درد کو تقسیم کر گئے چپ چاپ

ہر کہ ہر راہ میں صلیبیں ہیں
حیات بانٹنے والے ہی مرگئے چپ چاپ

ں میں جلتے ہیں شمع صورت ہم
شب سیاہ کی رگ میں اتر گئے چپ چاپ

ہا تو بس ہمسفر تھی تنہائی
ہجوم چھوڑ کے ہم اپنے گھر گئے چپ چاپ

دل بہاروں پہ مرثیہ خواں ہیں
زمیں پہ شاخوں سے پتے بکھر گئے چپ چاپ

ہمارے قصے زمانے کے ہونٹوں پر ہیں نصر
لہو سے اپنے زمیں سرخ کر گئے چپ چاپ

اسلم عمادی

انسان مرگیا اب کے...

کہیں نہیں یہ مرے شہر میں ہوا اب کے
جو آدمی تھا وہی سانپ بن گیا اب کے

جل اٹھے کتنے گھروندے اسی کے فتنہ سے
یہ آدمی ہے! مگر اس کا کھل گیا اب کے

مناظر ایسے بھیانک تھے بلکہ آتش ناک
چیخ کے ٹوٹ گیا دل کا آئینہ اب کے

بہت سکون تھا ہمزاد تیرے ہونے سے
مگر تو مجھ پہ مری جاں! جھپٹ پڑا اب کے

کدھر سے جاؤں؟ کہاں جاؤں؟ میرے پیارے شہر
مرے لہو سے ہے تر میرا راستہ اب کے

جہاں سے سانسیں ابھرتی تھیں اک فضا بن کر
یہ کیا ہوا کہ وہیں سے دھواں اٹھا اب کے

بہت مہیب سی لگتی ہے یہ خبر اسلم
ہمارے شہر میں انسان مرگیا اب کے

قدیرہ اختیار

منشی پریم چند اور انسانیت

منشی پریم چند جدید افسانہ اور ناول کے امام سمجھے جاتے ہیں ۔ انھوں نے اُردو افسانہ اور ناول کو نئے اُفق اور نئی سمتیں دی ہیں ۔ پریم چند نے افسانہ اور ناول کے روایتی دھاروں کا رخ زندگی اور حقیقت کی طرف موڑ کر ان میں زندگی اور تابندگی پیدا کی ہے ۔ اور افسانہ اور ناول کو زندگی سے اتنا قریب کر دیا ہے کہ ہم کو ان اصناف میں اپنے دل کی دھڑکن صاف سنائی دیتی ہے ۔ خاص کر پریم چند نے اُردو افسانہ کو اس قابل بنایا کہ وہ مغربی افسانہ سے آنکھ ملا سکے ۔ اُردو ناول کو پریم چند نے تصوّرات اور تخیلات کی دنیا سے ، جمالیات کی دلدل سے خطیبانہ گھن گرج اور واعظانہ انداز سے پند و نصیحت کی کڑواہٹ سے اور رجعت پسند عناصر کے چنگل سے نکالا ہے ۔ نذیر احمد کو ان کے واعظانہ انداز نے ڈبو دیا تھا ۔ سرشار کو ان کی بے راہ روی نے اور شرر کو ان کی تبلیغ نے نقصان پہنچایا تھا ۔ پریم چند ان سارے خطرات سے بے خوف و خطر گذر گئے اور کردار نگاری سے اس خوبی سے واقف ہوئے جو نذیر احمد اور سرشار کے یہاں مفقود تھی ۔ یوں تو پریم چند کے بعد اُردو ناول کی ہیئت میں تجربے بھی ہوئے ۔ وسعتیں بھی پیدا ہوئیں لیکن کسی ناول نگار نے بہ یک وقت اتنے بھرپور اور جامع کردار نہیں دئے جتنے پریم چند نے دیئے تھے ۔ پریم چند کے کردار آج بھی ذہنوں سے چمٹے ہوئے ہیں اور ان کرداروں نے کچھ ایسے گہرے اور اَن مٹ نقوش چھوڑے ہیں جو ایک زمانہ ہونے پر بھی مٹ نہیں پائے ۔ یہ پریم چند کی کامیابی کا بیّن ثبوت ہے ۔

پریم چند کے ناول ہوں یا افسانے ان میں واقعات نگاری ، جذبات نگاری اور منظر نگاری انتہا کو پہنچی ہوئی ہے ۔ وہ ایک عظیم فن کار کے اس وصف سے خوب واقف ہیں کہ کس طرح قاری کو متاثر اور مطمئن کیا جائے ۔ ان کے ناول اور افسانوں نے قاری پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں ۔ جذبات نگاری کی فطری صلاحیت پریم چند میں ، انسان کے احساسات اور اس کے جذبات کو سمجھنے سے آئی ہے ۔ ہر طبقہ اور ہر کردار کے جذبات کو کچھ اس خوبی سے پیش کیا ہے کہ ان کی وسعتِ نگاہ اور مشاہدہ کا قائل ہونا پڑتا ہے ۔

پریم چند منظر نگاری سے ماحول اور فضا پیدا کرنے میں کامیاب ہیں ۔ منظر نگاری سے کرداروں کی جہاں مالی اور معاشی حیثیت کا پتہ چلتا ہے وہیں ان کی فطرت بھی ظاہر ہوتی ہے ۔ پریم چند مناظرِ قدرت اور کرداروں

بط قائم کرنے میں کامیاب ہیں۔ ان کے یہاں واقعات نگاری میں سحرکاری ملتی ہے۔ واقعات کے تانے تے بڑی خوبی سے ملتے ہیں اور ایک ایسا وحدتِ تاثر پیدا ہوتا ہے جو دریا کے بہاؤ میں دکھائی دیتا ہے۔ یہ تِ تاثر اکثر ناول نگاروں کے ناول میں مفقود ہے۔

پریم چند کا جذبۂ انسانیت ان حالات کی دین ہے جن سے وہ گزرے ہیں۔ جس شخص نے زندگی کے دکھ ہوں اور جو حالات کی لپیٹ میں آیا ہو وہی بہت جان سکتا ہے کہ درد و تکلیف کیا چیز ہوتی ہے۔ ظلم و زیادتی ہتے ہیں، ناکامی اور محرومی کس چیز کا نام ہے۔ چودہ سال کی عمر میں پریم چند کے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ سوتیلی اور سوتیلے بھائیوں کے پرورش اور نگہداشت کی ذمہ داری ان کے سر آ گئی تھی۔ زندگی کے سخت ترین امتحان بے انتہا تکلیف و آزمائش سے انہیں گزرنا پڑا تھا۔ حالات یہاں تک خراب ہو گئے تھے کہ انہیں اپنی تعلیمی یات کو پورا کرنے اور تعلیم جاری رکھنے کے لیے تین میل دور ٹیوشن پڑھانے کے لیے پیدل جانا پڑتا تھا۔ رح پیٹ کاٹ کر انھوں نے ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا۔ شادی کے بعد بیوی سے مزاج نہ مل سکے اور پنے میکے جا رہیں۔ ایک کے بعد دیگرے تلخیاں ان کی زندگی میں گھلتی رہیں اور وہ مردانہ وار مقابلہ کرتے اور اس طرح حالات کی بھٹی میں تپ کر وہ کندن بن گئے۔ چنانچہ پریم چند کا احساس انسان دوست اور نیت پرور ہونا فطری اور لازمی تھا۔

پریم چند انسان کی عظمت کے معترف ہیں اس لیے ان کی انسان دوستی اور انسانیت، انسانی عظمت کو دھکا دیکھتی ہے تو جاگ اٹھتی ہے۔ وہ بدی پر نیکی، نفرت پر محبت، تشدد پر عدم تشدد، بغض پر اخوت، شکست، ناامیدی پر امید، ظلم پر رحم، انتشار پر بھائی چارگی، نفاق پر اتحاد، دشمنی پر دوستی کو ترجیح دیتے ہیں۔ ایک ضابطۂ اخلاق رکھتے ہیں اور ایک واضح تصورِ حیات بھی ______ وہ انسان کو درماندگی سے نا چاہتے ہیں۔ وہ ایک ایسا ماحول چاہتے ہیں جہاں انسان کو آسودگی مل سکے۔

پریم چند پر گاندھی جی کی تعلیمات اور ٹالسٹائی کے فلسفہ کا اثر ملتا ہے۔ پریم چند ان دونوں کی طرح انسانی ندگی کو سنوارنا چاہتے تھے۔ وہ معاشرے میں اصلاح لانا چاہتے تھے اور انسانی مسائل کو حل کرنا چاہتے تھے۔ نسان کو ظلم و تشدد سے آزاد کرانا چاہتے ہیں۔ دکھوں سے آزاد کرانا چاہتے ہیں۔ غریبوں، مزدوروں، ں اور بے کسوں کو ان کا حق دلانا چاہتے ہیں جس کے وہ مستحق ہیں اور جن کی بنیادی ضرورتوں کی تکمیل یت کا فرض ہے۔

ڈاکٹر عابد حسین نے انسانیت کی تعریف اور وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"ہیومانزم جسے ہم اُردو میں انسانیت کہہ سکتے ہیں۔ انگریزی زبان میں دو معنوں میں استعمال ہے۔ ایک عام معنی میں ایک خاص معنی میں۔ عام معنی میں یہ ہمہ گیر انسانی ہمدردی اور نوعِ انسان کی محبت بارت ہے اور خاص معنوں میں یہ ایک فلسفیانہ تصور ہے جس کی رُو سے انسان عام فطرت کے قوتوا

کے ہاتھوں میں ایک کھلونا ہے نہ فوق فطرت قوتوں کے ہاتھ میں۔ بلکہ اپنا ایک مستقل وجود، مستقل عقل و ارادہ اور پیمانۂ اقدار رکھتا ہے اور کچھ حدود کے اندر اپنی زندگی اور اپنی سیرت کی طرح تعمیر کر سکتا ہے۔"

پریم چند کے یہاں انسانیت کی اصطلاح ہمہ گیر انسانی ہمدردی، بنی نوع آدم سے انس اور ایک رد عمل کی تشکیل کے دونوں معنوں میں آتی ہے۔ اس تصور سے ان کے افسانوی مجموعے اور ناول بھرے پڑے ہیں۔ پریم چند ایک ادیب ہی نہیں تھے بلکہ انسانیت کے پیامبر بھی تھے۔ ان کا فن، ان کی انسان دوستی سے جلا پاتا رہا۔ فن کار کے مسلک کو خوب پہچانتے تھے کہ فن کار کو مخلص اور انسان دوست ہونا چاہیے۔ ورنہ فن کار اتھ سے مفقود ہو جاتا ہے۔

پریم چند نے افسانہ "بوڑھی کاکی" اور "پنچایت" میں بوڑھی بے کس عورتوں کی زبوں حالی کا ذکر بڑے موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ ساری انسانی ہمدردیاں ان بوڑھیوں سے وابستہ ہو جاتی ہیں۔ ان افسانوں میں ان لوگوں کی مکاری کو بتلایا گیا ہے جو بوڑھی، بے سہارا عورتوں کو سبز باغ دکھا کر ان کی جائیداد اپنے نام منتقل کروا لیتے ہیں اور پھر انھیں روٹی روٹی کا محتاج بنا دیتے ہیں۔ ایسے بے رحم انسانوں میں سوئی ہوئی انسانیت کیسے جاگتی ہے۔ اس کو بہت ہی خوبی سے بتلایا گیا ہے۔

" بوڑھی کاکی پتلوں پر سے پوریوں کے ٹکڑے اُٹھا اُٹھا کر کھا رہی تھیں۔ روپا کا کلیجہ سن سے ہو گیا۔ کسی گئو کی گردن پر چھری چلتے دیکھ کر اس کے دل کی جو حالت ہوتی ہے وہی اس وقت اس کی ہوئی ایک براہمن دوسرے کا جھوٹا پتل ٹٹولے۔ ہائے میں کتنی بے رحم ہوں جس کی جائیداد سے مجھے دو سو روپے کی آمدنی ہو رہی ہے اس کی یہ دُرگت اور میرے کارن۔ اے ایشور مجھ سے بڑا بھاری گناہ ہوا ہے مجھے معاف کر دو۔"

"پنچایت" میں بھی شیخ جمن کا دوست الگو، دوستی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے حق و انسانیت کی بات کرتے ہوئے کہتا ہے۔

" شیخ جمن پنچوں نے اس معاملہ پر اچھی طرح غور کیا۔ زیادتی سراسر تمہاری ہے۔ بھگتوں سے معقول نفع ہوتا ہے۔ تمہیں چاہیے کہ خالہ جان کو ماہوار گزارے کا بندوبست کر دو۔ اس کے سوائے اور کوئی صورت نہیں۔ اگر تمہیں یہ منظور نہیں تو ہبہ نامہ منسوخ ہو جائے گا۔"

پریم چند کے افسانے "قاتل کی ماں" اور "قاتل" عدم تشدد کا پرچار کرتے ہیں۔ تشدد، ظلم اور خون خرابہ کو پریم چند پسند نہیں کرتے۔ وہ ان لوگوں کے بھی مخالف تھے جو قتل و خون، تشدد اور ظلم کے ذریعہ ملک کو آزادی دلانا چاہتے تھے۔ اپنے ان خیالات کو پریم چند نے قاتل کی ماں کی زبان سے یوں ادا کیا ہے۔

" سوراجیہ قتل و خون سے نہیں ملتا، تیاگ اور تپ سے ملتا ہے۔ لالچ چھوڑتے نہیں، بڑی خواہشات چھوڑتے نہیں، اپنی برائیاں دیکھتے نہیں۔ اس پر دعویٰ ہے سوراجیہ لینے کا۔ یہ کچھ بوجھ کہ سوراجیہ قتل و خون سے ملے گا وہ قتل و خون ہی پر قائم رہے گا۔ عوام کی کوشش سے جو سوراجیہ ملے گا وہ ملک کی

ہوگی ۔

"افراد کی چیز ہوگی اور تھوڑے سے آدمیوں کا ایک گروہ تلوار کے زور سے انتظام نہ کر سکے گا ۔ ہم عوام کا سوراجیہ چاہتے ہیں ۔ قتل و خون کی طاقت رکھنے والے گروہ کا نہیں ۔"

افسانہ "قاتل" میں قاتل کی ماں کی انسانیت کو بتلایا گیا جو انسان کے خون کو انسان کا خون اور انسان کے نقصان کو بنی نوع انسان کا نقصان سمجھتی ہے ۔ اپنے بیٹے کو ایک انگریز افسر کی بیوی پر گولی چلاتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی اور اس عورت کے سامنے آجاتی ہے اور خود ختم ہو جاتی ہے ۔ مرنے سے پہلے وہ بیٹے سے کہتی ہے ۔

"تو تمہارا مذہب درندوں اور وحشیوں کا ہے جو جنگ کے بنیادی اصولوں کی بھی پروا نہیں کرتے ۔ عورت ہر ایک مذہب میں معصوم سمجھی گئی ہے یہاں تک کہ وحشی بھی اس کا احترام کرتے ہیں ۔"

پریم چند نے سودیشی تحریک پر مبنی اپنے ایک افسانہ "آخری تحفہ" میں اس لعنت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ملک کی معیشت زرِ مبادلہ کی وجہ سے متاثر ہو رہی تھی ۔ لاکھوں ٹن سونا باہر جا رہا تھا اس پر بھی بہت سے لوگ قومی مفاد پر ذاتی مفاد کو ترجیح دیتے ہوئے انسانیت سوز حرکت کر رہے تھے ۔ "آخری تحفہ" میں بیوی ان ذہنیت رکھنے والوں پر طنز کرتے ہوئے کہتی ہے ۔

"آپ جب پڑھے لکھے ہوئے آدمی ہوتے ہوئے اپنا فرض نہیں پہچانتے تو افسوس ہوتا ہے کہ ملک کی یہ حالت ہے ۔ لوگوں کو کھدر نہیں ملتا ۔ آپ ریشمی ساڑیاں خرید رہے ہیں ۔"

ایک اور سیاسی افسانہ "آشیاں برباد" میں پریم چند نے ان عورتوں کی انسان دوستی کو بتلایا ہے جو آزادی کی خاطر قید و بند کی زندگیاں بسر کر رہی تھیں جو انگریزوں کے خلاف مظاہرہ کرتے ہوئے پکڑی گئی تھیں ۔ ان کے ماں باپ، بھائی بہن، شوہر اور بچے ان سے بچھڑ گئے تھے لیکن انسانیت کے تقاضے کو انہوں نے پورا کر دکھایا تھا ۔ وہ ظلم کے خلاف لڑ رہی تھیں ۔

مردلا نے قید خانہ میں چھما سے مخاطب ہو کر کہا تھا ۔ "اب تم سے آج کہتی ہوں بہن یہاں مجھے کسی کی یاد آتی تھی تو بچے کی ۔ بیچارہ "اماں اماں" کہہ کر مجھے تلاش کرتا ہوگا ۔ مجھے دیکھ کر روٹھ جائے گا تم کہاں چلی گئی تھیں ۔ جاؤ میں تم سے نہیں بولتا ۔ تم میرے گھر سے نکل جاؤ ۔ بڑا شیطان ہے بہن ۔"

جب کہ چھما ایک بیوہ تھی جلیان والا باغ میں اس کا آشیاں برباد ہو گیا تھا ۔ شوہر مارا گیا ۔ لڑکے مارے گئے ۔ اب ایسا کوئی نہیں تھا جسے وہ اپنا کہہ سکتی ۔ اور ان دس برسوں سے اس کا محروم نصیب دل قوم کی خدمت میں آشتی اور سکون تلاش کر رہا تھا ۔

پریم چند نے اپنے افسانہ "منتر" میں جذبۂ انتقام کو دبا کر بڑی خوبی سے جذبۂ انسانیت کو ابھارا ہے ۔ بھگت کا لڑکا ڈاکٹر چڈا کی بے اعتنائی کی وجہ سے مر جاتا ہے اور جب ان کے اپنے بیٹے کیلاش کو سانپ کاٹ کھاتا ہے تو بھگت نہ چاہتے ہوئے بھی انتقام کی آگ میں جلتے ہوئے چڈا کے گھر پہنچ جاتا ہے تاکہ یہ تماشا دیکھ آئے ۔

مگر جب کیلاش کو بُری حالت میں دیکھتا ہے تو اس میں چھپا ہوا انسان جاگ جاتا ہے وہ چاہتے ہوئے بھی انتقام لے نہیں پاتا۔ انتقام کے بدلے ڈاکٹر چڈّا پر احسان کرتا ہے اور منتر سے کیلاش کو ٹھیک کر دیتا ہے۔

افسانہ "نجات" میں پریم چند نے برہمنوں کی انسان سوز حرکتوں، ذات پات کے فرق اور بھید بھاؤ کو بتلایا ہے۔ دکھی چمار اپنی بیٹی کی شادی کے لیے پنڈت گھاسی رام کے پاس آتا ہے اور پنڈت گھاسی رام اس بہانے اس کو لکڑیاں چیرنے کہتا ہے۔ وہ بھوکا ہوتا ہے۔ پھر بھی اس کام میں لگ جاتا ہے اور اپنے پران تیاگ دیتا ہے۔ یہ دیکھکر پنڈت کھسیانہ ہو جاتا ہے چمار برادری کے لوگ دکھی رام کی لاش کو پنڈت کے گھر میں پڑے رہنے دیتے ہیں تاکہ پنڈت اچھوت کی لاش اٹھا کر اپنے گناہوں کا پراشچت کرے۔ آدھی رات کو جب سب لوگ سو جاتے ہیں تو پنڈت گھاسی رام دکھی کی لاش کے گلے میں پھندا ڈال کر اسے کھینچتے ہوئے لے جاتا ہے اور ایک کھیت میں چھوڑ آتا ہے۔

ناول "غبن" میں پریم چند نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ انسانیت کسی طبقہ کی میراث نہیں۔ انسانیت کا جذبہ غریبوں کی بہ نسبت امیروں میں کم پایا جاتا ہے۔ دیوی دین غریب ہونے کے باوجود بے غرضی سے رما اور جالپا کی مدد کرنا چاہتا ہے اور انہیں اپنے گھر میں پناہ دیتا ہے یہاں تک کہ اپنی زندگی کا اثاثہ بھی ان پر نچھاور کرنے سے دریغ نہیں کرتا۔

ناول "گئودان" میں پریم چند نے ایسے کردار پیش کئے ہیں جو انسانیت کے علمبردار ہیں۔ اس ناول کا ہیرو ہوری جو کہنے کو جاہل اور اَن پڑھ ہوتا ہے لیکن انسانیت کا جذبہ اس میں ہمیشہ موجزن رہتا ہے۔ محبت و مروّت، ایثار و اکرام، خلوص اور ہمدردی اس کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ اپنے دشمن سے بھی اس کا خلوص انسانوں جیسا ہے۔ جب ہیرا نے اس کے گائے کو زہر دیا تھا وہ اس کو جیل سے بچانے کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے اور ڈنڈ بھرتا ہے۔ ہیرا کے بھاگ جانے کے بعد اس کے خاندان کی کفالت کرتا ہے۔

ناول "نرملا" میں پریم چند نے اِن لڑکیوں سے ہمدردی کی ہے جو غریب ہونے کے ناطے بوڑھوں کے سر منڈھ دی جاتی ہیں۔ اور جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کم عمری میں بیوہ ہو جاتی ہیں۔ ان کے خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو پاتے اور ارمانوں کا خون ہو جاتا ہے۔ نرملا اور طوطا رام کی عمر میں باپ بیٹی کی عمر کا فرق ہوتا ہے اور اس کے باوجود وہ میاں بیوی ہیں اس بے جوڑ شادی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بیوہ ہوتے ہی اس کی زندگی میں تلخیاں ہی تلخیاں آجاتی ہیں۔

غرض پریم چند نے ہر اس انسانیت دشمن عنصر کے خلاف لکھا جس سے انسانیت کا جذبہ مجروح ہوتا ہے۔ یا انسانیت پر حرف آتا ہے۔ "انسانیت" کے جذبے کو فروغ دینے اور اس کے لیے سازگار فضا پیدا کرنے کے لیے انھوں نے تادمِ زیست کوشش کی۔ وہ صحیح معنی میں "مبلغِ انسانیت" ہیں۔

لئیق صلاح

عصمت النساء بیگم باقرہ

اب سے کوئی ۴۰، ۵۰ سال پہلے سرزمین حیدرآباد کی ادبی اور مذہبی سرگرمیوں میں بہت کم خواتین حصہ لیا کرتی تھیں۔ اس دور میں اگرچہ کہ تعلیم کا رواج عام ہوچکا تھا لیکن دیگر پابندیاں ایسی حائل تھیں جس کے سبب ان کا منظر عام پر آنا مشکل تھا۔ اس لئے اس عہد کی تصانیف میں چند ہی خواتین کے نام ملیں گے جن کے کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مثلاً بیگم صغرا ہمایوں مرزا، بشیر النساء بیگم بشیر اور مسز پاشاہ بیگم صوفی وغیرہ۔ ان ہی میں سے ایک عصمت النساء بیگم باقرہ تھیں۔

محرم ۱۳۰۴ھ میں عصمت النساء بیگم محلہ عیدگاہ قدیم میں تولد ہوئیں۔ والد کا نام مولوی حاجی امام علی شاہ تھا۔ حاجی صاحب، نواب افضل الدولہ کے استاد محترم تھے۔ کہتے ہیں کہ افضل الدولہ کو بڑی عمر میں قرآن سیکھنے کا شوق ہوا۔ بادشاہ وقت کی اس ایماء پر بڑے بڑے علماء اور مولوی طلب کئے گئے جن میں حاجی صاحب بھی شامل تھے۔ حاجی صاحب کی عمر اس وقت بمشکل ۱۸، یا ۱۹ سال تھی۔ وہ چند سال مکہ معظمہ میں سکونت اختیار کرنے کے بعد لوٹے تھے۔ جب تمام مولوی اور علماء اکٹھے ہوگئے تو فرمان شاہی نازل ہوا کہ سب کو علیحدہ کمروں میں بٹھا دیا جائے۔ اس کے بعد نواب افضل الدولہ خود بہ نفس نفیس ایک ایک مولوی سے ملتے گئے۔ اور انہوں نے ہر ایک سے بس یہی سوال کیا کہ آپ مجھے کتنے عرصہ میں قرآن ختم کروائیں گے۔ کسی نے کہا چھ ماہ، اور کسی نے ایک سال تو کسی نے اس بھی کم عرصہ بتلایا۔ بہرحال سب سے دریافت کرنے کے بعد حاجی صاحب کے پاس تشریف لائے۔ ان سے بھی نواب افضل الدولہ نے وہی سوال کیا، آپ نے جواباً عرض کیا "نواب صاحب آپ کا شوق آپ کو پڑھائے گا"! حاجی صاحب کے یہ الفاظ نواب صاحب کے دل میں جاگزیں ہوئے۔ اور انہوں نے حاجی صاحب کا تقرر بحیثیت استاد کے کرلیا۔

روزانہ محل مبارک سے سواری روانہ کی جاتی اور حاجی صاحب اس میں تشریف لاتے۔ کئی دن بغیر مشاہرے کے پڑھاتے رہے۔ ایک روز نواب صاحب ہی نے مشاہرہ کے تعلق سے دریافت فرمایا تو معلوم ہوا کہ مشاہرہ مقرر ہی نہیں ہوا۔ پھر فوری حکم جاری ہوا، بقایا کے ساتھ تمام مشاہرہ مل گیا۔ حاجی صاحب ایک سیر طبع اور قناعت پسند انسان تھے۔ ان کی یہی خوبیاں تھیں جس کے سبب نواب صاحب انہیں بےحد عزیز رکھتے تھے۔ اس خلوص و محبت سے غلط فائدہ اٹھاکر انہوں نے کبھی نواب صاحب سے کوئی چیز طلب نہیں کی۔

ایک مرتبہ حاجی صاحب ایک طویل عرصہ تک غیر حاضر رہے۔ پھر اچانک آگئے۔ جب نواب صاحب سے ملاقات ہوئی تو نواب صاحب

نے [illegible] تک غیر حاضر رہنے کی وجہ دریافت کی۔ حاجی صاحب نے کہا کہ وہ مدینہ منورہ گئے تھے۔ اس جواب کو سن کر افضل الدولہ نے فرمایا "حاجی صاحب! آپ مجھ سے اجازت طلب کئے بغیر کیسے گئے؟" کہنے لگے "سرکار، بڑے سرکار نے یاد فرمایا تھا"۔ اس جواب سے نواب صاحب بے حد متاثر ہوئے۔

نواب صاحب استاد محترم کو خطاب عنایت کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے فوراً اپنے خیال کا اظہار حاجی صاحب سے کیا۔ حاجی صاحب نے فرمایا، نواب صاحب! اس نام سے قیامت کے دن اگر پکارا جاؤں تو دیجئے، ورنہ نہیں۔

عصمت النساء بیگم کی والدہ ماجدہ بھی سادات خاندان سے تھیں۔ ان کا نام رحمت النساء بیگم تھا۔ وہ اس دور کے مشہور بزرگ مولوی حسن الزماں صاحب کی ہمشیرہ نسبتی تھیں۔ مولوی صاحب حضرت سجاد بیگؒ اور مولوی حبیب علی شاہ کے معاصر تھے۔ ان تینوں نے محمد علی خیرآبادی سے بیعت کا شرف حاصل کیا تھا۔ مولوی حسن الزماںؒ رین بازار میں رہتے تھے۔ ان کا مکان آج بھی "روضۃ الحدیث" کے نام سے مشہور ہے۔ وہ ایک عظیم کتب خانہ کے مالک تھے۔ احادیث کی صحت ان کے پاس ہوا کرتی تھی۔ عصمت النساء بیگم کے مرشد مولوی حسن الزماں تھے۔

عصمت النساء بیگم نے ایک ایسے ماحول میں آنکھیں کھولیں جو علم و ادب کا گہوارہ تھا۔ اس لئے وہ کم سنی ہی سے تعلیم کی طرف متوجہ ہوئیں۔ اس دور میں بچوں کو دینی تعلیم سب سے پہلے دی جاتی تھی۔ چنانچہ انہوں نے ڈھائی سال کی عمر میں اس وقت کی مروجہ تعلیم کے مطابق "بغدادی قاعدہ" ختم کیا۔ چھ سال کی عمر میں قرآن شریف ختم کیا۔ اس کے ساتھ ہی فقہ، حدیث، اور تفسیر کا درس شروع کیا گیا۔ موصوفہ کے خالہ زاد بھائی مولوی لطیف الزماںؒ (صاحبزادے حسن الزماںؒ) اگرچہ کہ عمر میں بڑے تھے لیکن وہ ان ہی کی ہم سبق تھیں۔ مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی سے یہ دونوں فقہ و حدیث کا درس لیا کرتے تھے۔ مولوی صاحب نابینا تھے۔ جب یہ پڑھنا شروع کرتیں تو مولوی صاحب بڑے انہماک سے سبق سنتے، ان کا طریقہ یہ تھا کہ جب تک وہ "بس" نہ کہیں پڑھنے والا پڑھتا رہے۔ بعض اوقات تو بے شمار صفحے الٹ جاتے لیکن مولوی صاحب "بس" نہ کہتے۔ اور انہیں "حجاب پاس وضع" مولوی صاحب سے دریافت کرنے میں مانع رکھتا۔ (وہ یہ خیال کرتیں کہ یہ نہ صرف گستاخی کے مترادف ہے بلکہ اپنی کم حوصلگی کو بھی ظاہر کرے گا) دوسرے دن انہیں یہ تمام سبق سنانا پڑتا۔ کثرت مطالعہ کے سبب آنکھیں پک جاتی تھیں۔ ایک دفعہ کسی طبیب نے مشورہ دیا کہ پتنگ اڑایا کریں تاکہ اوپر دیکھنے سے آنکھوں کی سرخی دور ہو سکے۔ لیکن ان کے ذوق کو وہاں بھی کوئی مانع نہ رکھ سکا۔ بقول غالب ؎ زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا! کی طرح وہ پتنگ کو کرسی کے ڈنڈے سے باندھتیں اور پھر مطالعہ میں مصروف ہو جاتیں۔ ان کے اس علمی ذوق سے متاثر ہو کر مولوی نذیر احمد صاحب نے انہیں "باقرہ" کا لقب عطا فرمایا تھا جس کو بعد میں انہوں نے بطور تخلص کے استعمال کیا۔

۹ سال کی عمر میں وہ فقہ، حدیث اور تفسیر کی تعلیم سے فارغ ہو گئیں۔ استاد کی طرح مرشد کامل مولوی حسن الزماں صاحب بھی انہیں بے حد چاہتے تھے۔ وہ لاڈ اور پیار سے "پیارے" کہا کرتے تھے۔ عصمت النساء بیگم کو ان کے مرشد نے ایک قلم عطا کیا تھا جسے وہ بحفاظت رکھا کرتی تھیں۔ اور ان کا کہنا تھا کہ اس قلم کے طفیل وہ خوش نویس ہوئیں۔ اور جو کچھ انہوں نے سپرد قلم کیا وہ سب اسی کی کارفرمائی ہے۔ انہوں نے فن خوش نویسی کی باضابطہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی لیکن ان کی تحریریں اس بات کی غماز ہیں کہ وہ اپنے عہد کی ایک ممتاز خوشنویس تھیں۔

نو برس کی عمر میں عصمت النساء بیگم کی شادی میر محمد عباس کے صاحبزادے محمد مصطفیٰ صدیقی سے کی گئی۔ شوہر بھی علم دوست واقع ہوئے تھے۔ چونکہ وہ اکلوتی لڑکی تھیں اس لئے ان کی والدہ نے اپنے داماد کو "گھر داماد" بنا لیا۔ عموماً شادی کے بعد عورتوں کو جو نئی

ذمہ داریاں سنبھالنی پڑتی ہیں وہ اس سے بے نیاز ہوگئیں ۔

جب حصولِ تعلیم سے فراغت پائیں تو اصلاحِ اناث کی طرف متوجہ ہوئیں ۔ اس دور میں ہندوستانی عورتیں توہمات کا شکار رہتیں ۔ مذہب کی حقیقت کچھ اور تھی، اور جو مذہب انہوں نے اختیار کیا تھا وہ غیر اسلامی رسومات اور بدعات کا ایک گھپلا بن گیا تھا ۔ چنانچہ عصمت النساء بیگم نے اپنے مکان میں ایسے اجتماعات مقرر کئے جس میں مذہب کے اصل اصولوں پر روشنی ڈالی جاتی تھی ۔ غلط عقائد اور فرسودہ رسومات کی تردید کچھ ایسے انداز میں کرتیں کہ سننے والوں کو وہ باتیں ناگوار بھی نہ گزرتیں، اور وہ اپنی پچھلی روایتوں کو خیرباد کہہ دیتے ۔ ان کا اپنا یہ نظریہ تھا کہ بچے ہوں یا بڑے سب سے پہلے ان کے دل میں خدا اور اس کے رسول کی محبت پیدا کیجئے اس کے بعد وہ خود اُن سے احتراز کریں گے جن سے بچنے کی انہیں ہدایت دی گئی ہے ۔ سزاؤں سے ڈرا اور خوف پیدا کرنے کی بجائے محبت پیدا کرنا بہتر ہوتا ہے ۔ ریذ بازار سے جب چیلہ پورہ منتقل ہوئیں تو یہاں بھی وہ سلسلہ جاری رہا ۔

عصمت النساء بیگم نے ایک انجمن "معین الشرفاء" کے نام سے قائم کی تھی جس کے سرپرست بیگم نواب ناصر الدولہ مرحوم اور بیگم قائد ملت مرحوم تھیں ۔ اور خود انجمن کے معتمد کی حیثیت سے ماہ بماہ تین سو روپے کلدار چندہ جمع کرکے مدینہ منورہ روانہ کیا کرتی تھیں ۔ سید شاہ قطب عالم صاحب مرحوم حرمین شریفین کی کمیٹی کے ممبر تھے جن کے ذریعے یہ چندہ وہاں ارسال کیا جاتا اور باقاعدہ رسائد حاصل کی جاتی تھیں ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ سعودی عرب مالی اعتبار سے سب سے پسماندہ ملک سمجھا جاتا تھا ۔ وہاں کی بیوائیں اور یتیم بچے اس امداد سے بے حد خوش ہوا کرتے تھے ۔

عصمت النساء بیگم کا دوسرا کارنامہ انجمن سراج الخواتین کا انعقاد تھا ۔ بیگم سید خواجہ فیاض الدین کی ایماء پر اس کی ایک باضابطہ کمیٹی قائم ہوئی ۔ اور ۱۳۵۵ھ میں شہزادی درِ شہوار کو اس کا سرپرست مقرر کرکے ایک عالی شان جلسہ" باغ سیف آباد میں منعقد کیا ۔ انجمن کی طرف سے ایک مدرسہ بھی قائم کیا گیا جس میں عربی زبان کے علاوہ فقہ، حدیث اور تفسیر کا بھی درس دیا جاتا تھا ۔ اس مدرسہ کے اہم کارکنوں میں قیصری بیگم صاحبہ بھی تھیں جو ڈپٹی نذیر احمد کی نواسی تھیں ۔

لڑکیوں کی دینی و مذہبی تعلیم کے ساتھ عصمت النساء بیگم کو ان کی عصری تعلیم کی بھی فکر تھی ۔ اس لئے پرانے شہر میں کئی پرائمری اسکول انہوں نے اپنی سعی و کوشش سے قائم کئے تھے ۔ نامپلی گرلز ہائی اسکول کی سابق پرنسپل مس آمنہ پوپ ان کی کوششوں کو سراہتی تھیں ۔ عصمت النساء بیگم کو کوئی اچھی سی ملازمت تعلیمات میں مل جاتی، لیکن انہوں نے ایسی پیشکشوں کو قبول نہیں کیا ۔ وہ بے لوث خدمت کی خواہاں تھیں ۔

عربی، فارسی اور اردو کے علاوہ انگریزی سے بھی کما حقہ واقف تھیں ۔ ۱۳۱۹ھ میں انہوں نے ایک مختصر رسالہ "تحفۂ عثمانی" جس میں تعلیم نسواں کے موضوع پر روشنی ڈالی گئی ہے لکھ کر اعلیٰ حضرت نواب میر عثمان علی خاں کی خدمت میں پیش کیا تھا ۔ اس رسالہ کی ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ انہوں نے بقلم خود لکھا تھا ۔ اعلیٰ حضرت بندگانِ عالی نے اس قدر صاف اور شستہ و پاکیزہ خط سے بہت خوش ہوئے، اس کی تعریف و توصیف کی اور از راہِ کرم فرمائی تا حیات منصب مقرر فرمائی ۔ ان کی یہ تصنیف بغرض معائنہ دلی اور آگرہ بھی گئی ۔ عصمت النساء بیگم کی اس تصنیف کا ذکر، پاکستان کی شائع کردہ بہادر یار جنگ اکاڈمی کی کتابوں کی فہرست میں درج ہے ۔ حیدرآباد کا علمی و ادبی ورثہ، مرتبہ احمد عبداللہ المسدوسی ۱۹۳۸/۸۷ کراچی) .

عصمت النساء کو اپنی مادری زبان" اردو" سے غیر معمولی لگاؤ تھا ۔ وہ اس کی ترقی کے لئے کوشاں تھیں ۔ " تحفۂ شافی" میں مادری زبان کی تعلیم کی تائید میں اپنے خیال کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے :

" تعلیم نسواں کے لئے مادری زبان کا مسئلہ سب سے زیادہ ضروری اور اہم ہے ۔ کوئی قوم اس وقت تک ترقی نہیں کرسکتی جب تک وہ اپنے افراد کو مادری زبان میں تعلیم نہ دلائے اور اپنی مادری زبان کو ترقی نہ دے ۔ اور یہ تمام قوموں کا مسلّمہ مسئلہ ہے کہ کسی زبان کی شیرینی اور اس کی نزاکت صرف اس قوم کے خواتین کی بدولت قائم رہ سکتی ہے "۔

آگے وہ لکھتی ہیں کہ دوسری زبانوں کا جاننا بھی ضروری ہے تاکہ اپنی زبان میں ان علوم کا اضافہ ہو جو دیگر زبانوں میں موجود ہے ۔ لیکن ہم اپنی زبان اور اس کی روایات و اقدار کو فراموش نہ کریں ۔ وہ لکھتی ہیں :

" ہمیں اس سے انکار نہیں کہ خیالات میں وسعت پیدا کرنے کی غرض سے اور مادری زبان میں علمی سرمایہ داخل کرنے کے لئے دوسری زبانوں کی تحصیل کو ضروری قرار دے لیا جائے ۔ لیکن بطور جزو لاینفک کے نہیں ۔ نہ اس غرض سے کہ خود اپنی زبان سے بے رخی کی جائے .... ہمارا مدعا ہرگز یہ نہیں کہ زبان انگریزی کو بُرا جان کر اس کا مقاطعہ کیا جائے بلکہ غرض یہ ہے کہ اس کو صرف اس قدر عزت دی جائے جس کی وہ مستحق ہے ۔ نیز یہ کہ ہماری قومیت کا نمایاں جز فنا نہ ہونے پائے ۔ دنیا کی تمام قومیں السنہ عام کو صرف اس غرض سے حاصل کرتی ہیں کہ اقوام متمدنہ و غیر متمدنہ سے یا تو تبادلۂ خیالات کرسکیں یا اپنی زبان میں علمی اضافہ کرلیں ۔ لیکن یہ کسی کا مقصود نہیں ہوتا کہ اپنی قومیت کو فنا کر کے دوسروں میں جذب ہو جائیں "۔

مندرجۂ بالا اقتباس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس دور کی تحریکوں سے متاثر تھیں ۔ اسلوب بیان وہی ہے جس کا سلسلہ دورِ سرسید سے شروع ہوتا ہے ۔

عصمت النساء بیگم نے ایک ناول " جہاں آراء" بھی لکھا تھا ۔ جس کی دو جلدیں ہیں ۔ جو زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوئیں اس ناول میں انہوں نے لڑکیوں کی تعلیم و تربیت اور پردہ کی افادیت پر روشنی ڈالی ہے ۔ نثر کے علاوہ انہیں شاعری سے بھی لگاؤ ۔ "سخنورانِ دکن" میں تسکین عابدی نے ان کے بارے میں لکھا ہے " عصمت النساء بیگم عصمت' حیدر آباد کی رہنے والی اور تعلیم یافتہ خاتون ہیں ۔ شعر بڑے اچھے کہتی ہیں "۔

تسکین عابدی صاحب نے ان کا تخلص عصمت بتایا ہے لیکن وہ باشرو لکھا کرتی تھیں ۔ ان کے کلام میں زیادہ تر نعتیہ قصائد اور سلام پائے جاتے ہیں ۔ اس کے علاوہ چند غزلیں ، نظمیں اور تاریخی قطعات بھی موجود ہیں ۔ ان کے کلام میں سماجی شعور کی جھلک نظر آتی ہے ۔ بعض اشعار ناصحانہ انداز میں لکھے گئے ہیں ۔ نمونۂ کلام ملاحظہ کیجئے :

عیب سے خالی نہیں کوئی بشر دوسروں کے عیب پر مت کر نظر
مان لو میرا کہا اے صاحبو یاد رکھو یہ نصیحت دوستو
تم کبھی ضائع نہ ان اوقات کو کام میں لاؤ انہیں دن رات کو
آج کا جو کام ہے ہو جائے آج کامیابی کا رہے تا سر پہ تاج

مشہور صاحب کوشاعر حضرت امجد کی اس رباعی " بندے ہو اگر سب کے تو سب سے مانگو" کی تضمین باشرو نے ایک نئے انداز

ما پیش کی ہے ۔ ملاحظہ فرمائیے ۔

سارے اسباب ہٹا لو تو سبب مل جائے — پھر سبب سے جو مانگو تو تمہیں سب مل جائے
سب نہیں ہوتے نبی اور نہ ولی اور نہ شہید — رب کسی کو نہ بناؤ تو تمہیں رب مل جائے

دوسری جنگِ عظیم سے متاثر ہو کر بچوں کی ایک نظم میں انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے ۔

برطانیہ ہے ظالم — ہوتا نہیں ہے نادم
مکار سے بچالے — اے رحم و کرم والے

ہے سخت جان جرمن — سب کا ہوا ہے دشمن
اغیار سے بچالے — اے رحم و کرم والے

باقرہ کے چند شعر ایسے ہیں جن میں انسانی زندگی کی جھلکیاں ہیں ۔ اور بعض ان کے دلی جذبات و خیالات کے آئینہ دار ہیں

آئینہ سامنے ہے شغلِ خود آرائی ہے — منتظر دید کا ہر ایک تماشائی ہے
اب تو آجاؤ میرے پاس کوئی غیر نہیں — آپ کی یاد ہے اور بس شبِ تنہائی ہے
باقرہ قبر میں گھبرائی تو رحمت نے کہا — لو یہ تصویر بنی مونسِ تنہائی ہے
کوئی ہے مصروفِ دنیا کوئی ہے مشغولِ دیں — آدمی آیا جہاں میں بس کمانے کے لئے
قلبِ مومن کو خدا نے اس لئے وسعت دیا — دو جہاں کے راز ہیں اس میں سمانے کے لئے
نامۂ اعمال میں باقی نہ رکھا ایک جرم — چشمِ تر بھی خوب ہے آنسو بہانے کے لئے

فارسی میں بھی وہ شعر موزوں کرتی تھیں ۔ ان کے اپنے سمدھی نواب شمشیر یاور جنگ نے جب حج کی سعادت حاصل کی تو انہوں نے ایک فارسی قطعہ بطورِ تہنیت ان کی خدمت میں پیش کیا تھا ۔

مبارک باشدائے شمشیر یاور — چہ فضلیش بر سرت اللہ اکبر
دعا ر باقرہ از قلبِ صادق — شود مقبول یارب حج اکبر

بالآخر علم و ادب کی یہ شمع ۲۲ محرم ۱۳۶۴ھ کو رات کے دس بجے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گل ہو گئی ۔

جب مجھے یہ احساس ہوگا کہ ہندوستان سے اردو ختم ہو رہی ہے تو میں "دیوانِ اردو" کو یاد کر کے اپنے دل کو ڈھارس بندھا لوں گی ۔ ہر زبان ایک ملک کی دولت ہے اور دولت کا ہر ذرہ ہمارا دی توجہ کا حقدار ہے ۔ اردو کو چاہنے اور زندہ رکھنے والوں کو میرا سلام ۔

———— عصمت چغتائی

۲۶ جون ۱۹۷۲ء

وہاب عندلیب

ہنستا ہوا وہ پھول

(سلیمان خطیب کی یاد میں)

۱۶ ر اکتوبر ۱۹۷۸ء کی سہ پہر جبکہ میں بلدیہ کے دفتر میں تھا۔ شیخ احمد صاحب اسسٹنٹ انجینئر نے یہ خبر دی کہ سلیمان خطیب کو
ر ہسپتال گلبرگہ میں داخل کر دیا گیا ہے جہاں ان کی حالت تشویشناک ہو گئی ہے۔ اس خبر پہ یقین نہیں آیا کیونکہ دو تین روز قبل ان سے مل
تھا بھلے چنگے تھے۔ حیدرآباد سے ہندی مشاعرہ لوٹ کر آئے تھے تاہم میں کسی تاخیر کے بغیر شیخ احمد صاحب کے ہمراہ دواخانہ کے
وارڈ میں پہنچا جہاں خطیب صاحب زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھے۔ کئی امراض نے ان پر اجتماعی یورش کر دی تھی
بطیس، یرقان، گردوں کی معطلی، خون کا دباؤ، عارضۂ قلب نہ جانے کس کس موذی مرض کی زد میں تھے۔ اُن پر نیم بے ہوشی
عالم طاری تھا۔ زبان گنگ تھی۔ مشاعروں کی روح رواں اور محفلوں کی جان بہار پر بڑا کڑا وقت تھا۔ قہقہے بکھیرنے والا نہایت
پ چاپ تھا۔ محفل کو زعفران زار بنانے والا اور مشاعرہ گاہ کی چھت اُڑانے والا گم سم تھا۔ اپنے رفیق دیرینہ کو اس عالم میں دیکھ
دل دہل گیا۔ شام کے ۶ بج رہے تھے۔ ڈاکٹروں نے حیدرآباد منتقل کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ امبولنس دواخانے کے باہر تیار
ی تھی۔ چند قریبی اعزہ خطیب صاحب کے ساتھ تھے۔ میں نے اپنے عزیز ترین دوست پر الوداعی نظر ڈالی۔ ان کی روانگی کا یہ
ر بڑا کرب ناک تھا۔ مجھے ایسا لگا کہ زندگی پسپا ہو رہی ہے اور موت کا آہنی پنجہ آگے بڑھ رہا ہے۔ نگاہیں دور تک امبولنس
ا قب کرتی رہیں۔ یہاں تک کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ میں نے اپنے بوجھل قدموں کو حرکت دی اور مغموم دل کے
تھ اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ رات بڑی بے کلی میں گزری۔

دوسرے دن اطلاع ملی کہ خصوصی معالجین کی ایک ٹیم دواخانہ عثمانیہ میں خطیب صاحب کی زندگی کو طول دینے کے لئے
ت سے نبرد آزما ہے۔ تیسرے دن میں خود حیدرآباد پہونچ گیا۔ ۱۹ ر اکتوبر ۷۸ء کی صبح دواخانہ عثمانیہ جانا چاہا تو پتہ چلا کہ
ب صاحب ACUTE MEDICAL CARE UNIT میں ہیں جہاں وقت مقررہ ۴ ساعت شام سے قبل کسی ملاقاتی
خلہ ممکن نہیں۔ پھر ہمیں اخبار سیاست کی جستجو ہوئی جس کے ایک کالم نے خبر دی کہ خطیب صاحب کی صحت قدرے بہتر ہے
نے اطمینان کا سانس لیا اور شام کا انتظار کرنے لگا۔ ٹھیک ۵ بجے اپنے افسانہ نگار دوست قدیر زماں کے ہمراہ متعلقہ وارڈ
اور خطیب صاحب کو چاق و چوبند دیکھ کر بے پایاں مسرت ہوئی اور اب یہ امید بندھ گئی کہ وہ پوری طرح صحت یاب ہو کر
ہ لوٹیں گے۔ مختصر سی ملاقات میں صحت، علاج، امریکہ سے بھابی صاحبہ کی واپسی، صاحبزادگان خطیب اور احباب

گلبرگہ کے بارے میں گفتگو ہوئی۔ ملاقات کے لئے جو وقت مقرر تھا وہ ختم ہوا چاہتا تھا اس لئے میں نے خطیب صاحب سے اجازت چاہی۔ دم رخصت انھوں نے میری ڈھارس بندھائی اور کہا کہ "پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ جاؤ گلبرگہ میں سب دوستوں سے کہدو کہ میری طبیعت سنبھل رہی ہے۔" دوسرے دن بھی ان کی حالت اطمینان بخش تھی لہذا میں گلبرگہ واپس ہوا۔ کیونکہ مجھے ۲۲ر اکٹوبر ۷۸ء کی صبح حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کے عرس کے سلسلہ میں منعقد شدنی مجلس مذاکرہ میں اپنا مضمون پڑھنا تھا صبح صبح مضمون کے مسودہ پر نظر ثانی کر رہا تھا کہ ڈاکٹر ناصر اور راہی قریشی نے یہ روح فرسا خبر سنائی کہ حضرت خطیب کا ۲۱ر اور ۲۲ر اکٹوبر کی درمیانی شب تقریباً ۱½ بجے دواخانہ عثمانیہ میں انتقال ہوگیا۔ ہم سماع خانہ درگاہ شریف جانے کی بجائے خطیب کارنیج پہنچے۔ ذریعہ کار نعش دوپہر گلبرگہ پہنچی۔ بعد عصر جلوس جنازہ خطیب کارنیج سے برآمد ہوا۔ جس میں ہزاروں سوگواروں نے شرکت کی۔ بعد نماز مغرب پائیگاہ میں نماز جنازہ ادا کی گئی جس میں خطیب خاندان کی کثیر تعداد شریک تھی۔ تقریباً ۸½ بجے شب ہم نے اپنے عزیز ترین دوست، دکنی زبان کے ساحر، صاحب طرز شاعر و منفرد نثر نگار کے جسد خاکی کو جو عاشق بندہ نواز بھی تھا پائین بندہ نوازؒ میں پیوند خاک کردیا۔ اس طرح سرزمین گل و برگ اپنے مایۂ ناز فرزند سے ہمیشہ کے لئے محروم ہوگئی۔

شور عابدی اور ابراہیم جلیس کے بعد اور ایک ہم عصر بھی ہم سے بچھڑ گیا۔ گلشن دکن کا خوش نوا بلبل خموش ہوگیا۔ بزم طرب لٹ گئی، رستے کی پنتی بجھ گئی۔ شہباز کے شہر میں، قلی کے نگر میں، نصرتی کے وطن میں، سراج اور ولی کے دربار میں ماتم بپا ہے کہ ان کا اپنا شاعر ملک کے گوشے گوشے میں قہقہے بکھیر کر، آنسو لٹا کر خوشبو اڑا کر ملک عدم کو چل بسا۔ عزیزو ہم سب کے لئے یہ عظیم سانحہ ہے۔

سلیمان خطیب کی وفات کا غم مدتوں ہمارے لئے تازہ رہے گا۔ مرحوم صرف دکن کے نہیں بلکہ سارے ملک کے مقبول ترین عوامی شاعر تھے۔ انھوں نے دیہات کی فطری زبان میں شاعری کی وہ معیاری اُردو میں بھی شعر کہنے پہ قدرت رکھتے تھے لیکن انھوں نے اپنے لئے جس زبان کا انتخاب کیا ہے وہ عوام کی بولی تھی جس میں طبع آزمائی کرنا آسان نہیں تھا لیکن انھیں دقت نہیں ہوئی کیونکہ وہ اس مخصوص زبان اور اس کے ماحول سے بخوبی آشنا تھے۔ انھوں نے ایک چھوٹے سے دیہات میں آنکھ کھولی اور دیہی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا نہایت قریب سے مطالعہ کیا۔ قدیم دکنی ادب کے وہ بڑے دلدادہ تھے۔ ڈھولک کے لوک گیتوں سے انھیں عشق تھا۔ انھوں نے برسوں گاؤں گاؤں گھوم کر ایسے ہزاروں گیت جمع کئے ان کی شاعری میں یہی لوک گیت رچ بس گئے ہیں۔ خطیب نے ایک عوامی زبان کو اپنی شاعری کا میڈیا بنا کر طنز و مزاح کے اسلوب کو اپنایا تاکہ عام آدمی بھی شعر و سخن سے محظوظ و مستفید ہوسکے اور اس سلسلے میں ان کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔ دکنی جیسے شاں کے ایک شاعر قائم چاندپوری نے لچر زبان قرار دیا تھا۔ خطیب نے اُسے سنوار کر درجۂ کمال کو پہنچایا اور ثابت کردیا کہ اس زبان میں وقت اور ماحول کی موثر نمائندگی اور عصری تقاضوں کے کامیاب اظہار کی صلاحیت موجود ہے خطیب نے دکنی روایات کی پاسداری کی' انھیں مقبول بنایا بلکہ ان میں خوشگوار اضافے کئے۔ قدیم روش سے ہٹ کر اپنے لئے ایک نیا راستہ نکالا اسی اجتہاد کے باعث انھیں شہرت عام اور بقائے دوام نصیب ہوئی۔ اس زبان کے وقار و اعتبار کو بلند کرنے کے لئے خطیب نے جو حصہ ادا کیا ہے وہ ناقابل فراموش ہے۔ یقیناً انھوں نے دکنی ادب کی تاریخ میں

اپنی مستقل جگہ بنالی ہے۔ ان کے تذکرہ کے بغیر دکنی شاعری کی تاریخ تشنہ متصوّر ہوگی۔ قدیم شعرائے دکن وجہی، غواصی، قلی، نصرتی، شاہی اور ہاشمی وغیرہ کی زبان سے مختلف نظر آتی ہے ہم اس زبان کو جدید دکنی کہہ سکتے ہیں۔ جدید دکنی آج بھی سارے جنوبی ہند میں ٹریونڈرم اور مدراس سے لے کر بمبئی اور احمد آباد تک بولی اور سمجھی جاتی ہے اور یہ زبان شمالی ہند میں بھی اجنبیت محسوس نہیں کرتی۔ یہی وجہ ہے کہ خطیب کی شاعری کو راس کماری سے کشمیر تک یکساں طور پہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ "کیوڑے کا بن" کے مطالعہ سے جہاں شاعر کی بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے وہیں یہ حقیقت بھی بے نقاب ہوتی ہے کہ خطیب جدید دکنی کے صاحب طرز و دیدہ ور شاعر تھے ان کے کلام میں جذبات کی شدت کے ساتھ ساتھ ندرتِ خیال اور غلوئے فکر جیسے محاسن بھی پائے جاتے ہیں انھوں نے شاعری نہیں ساحری کی ہے۔

ہم عصر دکنی شعراء میں بھی خطیب کا پایہ نہایت بلند ہے۔ انداز بیان، جدّت، فکر، نازک خیالی اور معنیٰ آفرینی نے انھیں قدآور شاعر بنادیا ہے۔ "پگڈنڈی" "یاد" "ندی" اور "دکنی عورت کا انتظار" خطیب کی شاہکار نظمیں ہیں جن کا شمار ادب عالیہ میں ہوسکتا ہے۔ ان نظموں میں شاعر نے منظر کشی اور فطرت نگاری کا کمال دکھایا ہے اور جذبات کی کامیاب ترجمانی کی ہے ان نظموں کو پڑھتے ہوئے قاری ایک ایسی فضا میں پہنچ جاتا ہے جو اس کے ذہن میں روشنی اور روح میں بالیدگی پیدا کرتی ہے انھیں دکنی کا ورڈز ورتھ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ مصوّر فطرت ہونے کے علاوہ شاعر حیات بھی تھے۔ ان کی شاعری دراصل تنقید معاشرہ و تنقید حیات ہے۔ خطیب نے زندگی کی تلخ حقائق کو اپنا موضوع بنایا اور بعض اہم سماجی مسائل کی جانب عوام کی توجہ مبذول کی ان کی نظمیں "پہلی تاریخ"، "ساس بہو" "سانپ" "چھورا چھوری" "نراج کا پلنگ" "اٹھائیس تاریخ"، "دو طرفہ" وغیرہ سماجی حقیقت نگاری کی عمدہ مثالیں ہیں مخدوم کی نظم "چارہ گر" تو آپ نے پڑھی ہوگی۔ خطیب نے اس پر جو پیروڈی (بیچارگی) لکھی وہ مخدوم کی نظم سے زیادہ مشہور ہوگئی تھی۔ وطنیت کے موضوع پہ بھی انھوں نے بڑی پیاری نظمیں کہی ہیں جن میں "ہمالہ کی چاندی" کو بیناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ نادر تشبیہوں، لطیف استعاروں اور عام محاوروں کے فنکارانہ استعمال نے ان کی شاعری میں رس گھول دیا ہے۔

خطیب کی شاعری لطیف طنز و مزاح کا حسین مرقع ہے۔ ان کی نظم کی ابتداء ہلکے پھلکے مزاح اور چٹخاروں سے ہوتی ہے مگر اختتامی حصّہ دردناک ہو جاتا ہے۔ ان کی شاعری زعفران زار بھی ہے اور لالہ زار بھی۔ گاہ ہنستی ہے گاہ روتی ہے۔ شاعر کو اس بات کا عرفان تھا کہ "ہر دل آویز مسکراہٹ آنسوؤں سے دھلی ہوئی ہوتی ہے۔

خطیب اپنے عہد کے اہم اور بڑے شاعر تھے یا نہیں؟ اس پہ نقادوں کو خامہ فرسائی کر دینے دیجئے۔ میری دانست میں انھوں نے جس زبان کو اپنی شاعری کا میڈیا بنایا، اس زبان کے بڑے رسیلے و سجیلے شاعر تھے۔ انھوں نے کبھی میر و غالب یا اقبال و جوش کی ہمسری کا دعوٰی نہیں کیا بلکہ وہ اپنے کمال فن سے بھی بے بہرہ بھی نہیں تھے چنانچہ خودشناسی ملاحظہ فرمایئے:

؎ دم غنیمت ہے میرا دکھن میں　　اپنے فن کا امام ہوں باشا

یقیناً وہ اپنے فن کے امام تھے۔ دکنی آج اپنے اس امام سے محروم ہوگئی۔

سلیمان خطیب سے میرے دیرینہ تعلقات تھے۔ سنہ ۱۹۵۰ء سے ہمارا ساتھ تھا گلبرگہ اسٹوڈنٹس کا ٹیج انجمن ترقی اردو، غالب صدسالہ تقریبات کمیٹی، اُردو اکیڈمی، سلامتی ادبی و تہذیبی فورم کی سرگرمیوں اور "خم کا کل" و "زاویئے" کے اشاعتی مراحل میں اُن کی بے لوث رفاقت نصیب تھی۔ اُن تعلقات کے پیش نظر ان کی دائمی فرقت کا سانحہ میرے لئے شخصی نوعیت کا بھی ہے۔ خطیب کے بغیر آج محفل احباب سونی ہے۔ وہ ہماری بزم کی رونق تھے ان ہی کے دم سے گرمئ محفل قائم تھی۔ ان کی محبت، شفقت اور عنایت برسوں یاد رکھی جائیگی۔

حیف! دوستوں کو ٹوٹ کر چاہنے والا، ان کی مصیبت میں ڈھال بن جانے والا ساتھی، باغ و بہار شخص، عوام کے دکھ درد کا شاعر، فطرت کا مصوّر، وطن کا شیدائی اور دکن کے کھن کا انمول ہیرا ہمیشہ کے لئے کھوگیا۔ لگتا ہے کہ وہ آج بھی ہم میں ہے۔ محفل کو قہقہہ زار بنا رہا ہے۔ مشاعرہ لوٹ رہا ہے۔ خراماں خراماں اسکوٹر چلا رہا ہے، ڈرامہ ڈائرکٹ کر رہا ہے۔ ساتھیوں کو مشورے دے رہا ہے۔ کہیں گپ ہانک رہا ہے۔ تو کہیں فقرے کس رہا ہے۔ اور کہیں لن ترانی کر رہا ہے۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ وہ ہنستا ہنساتا اپنی ہی نظم کا اختتامی حصہ بن گیا مگر جب تک "ہمارہ کی چاندی" پگھلتی رہے گی دیس میں گنگا اُبلتی رہے گی، پگڈنڈی دھان کی کھیتوں میں مانگ بنی رہے گی، موٹ کا پانی مڑی مڑی امرت بانٹتا رہے گا۔ ساس بہو کی آویزش اور پڑوسن کی گمت باقی رہے گی۔ پاؤ حکیم بندوں کو رب سے ملاتے رہیں گے۔ ہر ماہ پہلی تاریخ کھنکھناتی رہے گی۔ برکھا کے بادل ستاتے رہیں گے۔ اور انکھیاں برہا کے موتی لٹاتے رہیں گے۔

بلاشبہ خطیب کی یاد سے ہمارے دل جگمگاتے رہیں گے۔ ان کی موت سے "کیوڑے کا بن" اجڑا نہیں ہے اور مہک گیا ہے اور سدا مہکتا رہے گا۔ خطیب ہی کا شعر آج ہمارے جذبات کی ترجمانی کر رہا ہے۔

؎ ہم ہی بُرے تھے رہ گئے رونے کے واسطے
ہنستا ہوا وہ پھول تھا ہنستا چلا گیا

وقار خلیل

سانحہ

دکھن منے عزیزو! یو سانحہ ہوا ہے
یہ شاعری میں کیا کیا رنگ روپ تھے سجیلے
تجبیت میں نمایاں گوؤں کے غریب لوگاں
تجے شعر کا بغیچہ، دل، دَمن مڑی سر بکا
یہ بیت کی طراوٹ، جی کو لبھانے ہاری
تجہ شعر کا آوازہ، چوندھیر چپار سو تھا
انجھواں کے سارموتی پلکاں منے ڈھلے ہیں

"کیوڑے کے بن" کا شاعر ماٹی منے ملا ہے
گلیاں کی چاندنی تھی "خوباں" کے رنگ میلے
اُن کے تھے تولیے، ارماناں اور شوقاں
تج لب میں تھی حلاوت، ہر کن میں تو نہایا
تج طنز کی لگاوٹ، جی چھید کرنے ہاری
تج روپ میں غواصی، جادو جگا رہا تھا
تج نام پر خطیب! کتے کی دل دکھے ہیں

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

قند مکرر

سروِ صحرا

پیامتی پیٹھ آج ایک چھوٹا سا قصبہ رہ گیا ہے۔ جس کی عالیشان قطب شاہی مسجد کے خوب صورت مینار حیدرآباد سے حمایت ساگر جانے والی سڑک کی بائیں جانب اب بھی راستہ سے گذرنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ یہ مقام گولکنڈہ کے زندہ دل بادشاہوں کی بہترین تفریح گاہ سمجھا جاتا تھا۔ اس سلطنت کے بادشاہوں اور امیروں نے قلعہ کے باہر دور دور تک اس قسم کے شبستان آباد کر رکھے تھے، اور جب کبھی درباری زندگی اور سیاسی انجھنوں سے فرصت ملتی تو قلعہ سے نکل کر ہر ایک اپنے اپنے گوشۂ عشرت میں دل بہلاتا تھا۔

ان شبستاں کے آباد کرتے وقت دو باتوں کا ضرور خیال رکھا جاتا تھا۔ ایک تو یہ کہ وہاں سے ان کی اُمید دل کا آماہ جگاہ قلعہ گولکنڈہ نظر آتا رہے، اور دوسری یہ کہ وہاں سب سے پہلے ایک شاندار مسجد بنوائی جائے۔ چنانچہ گولکنڈہ کے اطراف دور دور میلوں تک جنگلوں میں جو خوشنما مسجدیں نظر آتی ہیں۔ وہ قطب شاہیوں کے ان ہی عشرت کدوں کے باقی ماندہ آثار ہیں۔ ان کے قریب وجوار کے پرتکلف محلات اور بارونق بازار تو صدیوں کی ویرانی اور سیاسی افراتفریوں کی وجہ سے نیست ونابود ہو گئے۔ لیکن مسجدیں باقی رہ گئیں۔ رہے نام اللہ کا۔

پیامتی پیٹھ میں اب تک مشہور ہے کہ تانا شاہ بادشاہ ہر جمعرات کو قلعہ سے یہاں آجاتا تھا اور ایک رات گذار کر دوسرے دن جمعہ کی نماز اس مسجد میں پڑھنے کے بعد شکار کھیلتے ہوئے قلعہ کو واپس جاتا۔ بادشاہ کو ملکہ کا بڑا خیال تھا۔ وہ حد درجہ نازک مزاج تھی۔ جب کبھی جلال میں آجاتی تو پھر کسی سے نہ سنبھلتی اور قطب شاہی محل اس کی گرج دار آواز سے لرزنے لگتے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ شکی مزاج اور خبطی ہوگئی تھی۔ مغلوں کے مخالفانہ پروپگنڈے نے تانا شاہ بادشاہ کو فاسق وفاجر مشہور کر دیا تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ دوسرے بادشاہوں کی طرح اس کے محل میں حرم کا وجود ہی نہ تھا۔ البتہ ایک ایسا واقعہ پیش آگیا تھا کہ بادشاہ ایک غریب کسان کی بیکس لڑکی کو اپنے محل میں پناہ دینے پر مجبور ہوگیا تھا۔ جس کا ایک قصہ اب تک پیامتی پیٹھ اور اس کے نواح میں زبان زد خاص وعام ہے اور وہ یہ ہے۔

تخت نشینی کے چند ماہ بعد ہی بادشاہ شکار کے لئے نکلا تھا۔ ہرن کے تعاقب میں وہ اپنے ساتھیوں سے دور نکل چکا تھا کہ پیامتی پیٹھ کے قریب اس کو ایک کسان کی جھونپڑی میں سے کسی کے آہستہ آہستہ رونے کی آواز سنائی دی۔ قریب پہنچ کر اس نے دیکھا کہ ایک خوب صورت لڑکی ایک بوڑھے کا سر اپنے زانو پر لئے بیٹھی ہے اور زار وقطار رو رہی ہے۔

بادشاہ پر بھی ایک زمانہ ایسا گذر چکا تھا۔ جب وہ خود جنگل میں جھونپڑی میں رہا کرتا تھا۔ اس پر اس حالت کا بڑا اثر ہوا۔ وہ فوراً گھوڑے پر سے اتر پڑا اور قریب ہو کر دریافت کیا۔ غریب دہقان زادی بادشاہ کو اپنی جھونپڑی میں دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ اس نے

آنسو تھم گئے۔ اس کے ہونٹ کانپنے لگے۔ اس نے پہلے بھی بادشاہ کی سواری اپنے باپ کے کھیت کے قریب سے گذرتی ہوئی دیکھی تھی۔ اور اس کے باپ نے کہا تھا کہ "بادشاہ کی صورت کا نظر آنا ہی برکت اور خوشحالی کا باعث ہے۔" اس خیال سے وہ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنتے ہی ان کی طرف دوڑی تھی تاکہ بادشاہ کا چہرہ نظر آجائے۔ لیکن اس کو کبھی ایسا موقع نہ ملا تھا کہ اچھی طرح دیکھ سکتی۔

آج جو اس نے اس قدر قریب سے بادشاہ کو دیکھا تو اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ اور نہ معلوم کب تک یہ حالت جاری رہتی اگر بادشاہ بکمال شفقت اس کے رونے کا سبب دریافت نہ کرتا۔ جب لڑکی کے ہوش و حواس درست ہوئے تو اس نے سنبھل کر اپنے نیم برہنہ جسم کو اپنے پھٹے ہوئے کپڑوں سے ڈھانپتے ہوئے عرض کیا۔

"میرا باپ ہمیشہ کہتا تھا کہ بادشاہ کی صورت نظر آجائے، تو خوشی ہی خوشی ہے۔ حالانکہ آج تو میرے سر پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے یا تو آپ بادشاہ نہیں ہیں اور اگر میں واقعی بادشاہ سلامت کو دیکھ رہی ہوں تو پھر میرے بوڑھے باپ کو سانپ نے کیوں ڈسا اور اس نے اس قدر جلد کیوں آنکھیں بند کرلیں؟"

بادشاہ بھی اس سے ہمکلام ہی تھا کہ خدام شاہی پہنچ گئے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ فوراً کسی طبیب یا سانپ کا عمل جاننے والے کو بلایا جائے۔ اس نے دہقان دوشیزہ کو تسلی دی اور اپنے چند ملازم وہاں چھوڑے۔ چلتے ہوئے اس نے لڑکی سے کہا۔

"بادشاہ کی صورت نظر آجانے کے بارے میں تمہارا باپ جو کچھ کہتا تھا، اس کے آزمانے کا دراصل یہی وقت ہے۔"

دوسرے روز صبح بادشاہ کو اطلاع ملی کہ کسان جانبر نہ ہوسکا۔ سانپ ڈسے ہوئے اسے عرصہ گذر چکا تھا۔ طبیبوں اور عاملوں نے رات تمام اس کی لاش کے ساتھ بیکار محنت کی۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ بدقسمت دہقان کی حرماں نصیب لڑکی کو سایۂ عاطفت میں لے لیا جائے۔ شام ہونے سے قبل دہقان زادی قلعہ گولکنڈہ میں پہنچا دی گئی۔ جہاں اس کو اصیلوں اور خادماؤں نے حمام کرا کے خلعت فاخرہ سے ملبوس کیا اور دولت خانۂ عالی کے اس قطعہ میں فروکش کیا۔ جو کسی زمانے میں پیاسی اور تاراسی کی قیام گاہ رہ چکا تھا۔ تاناشاہ نے تاکید کردی تھی کہ اس کے ساتھ نہایت اچھا برتاؤ کیا جائے تاکہ وہ بہت جلد اپنے باپ کا غم بھول جائے۔

چند روز گذر جانے کے بعد بادشاہ کو معلوم ہوا کہ غریب دہقان زادی اب بھی غم زدہ ہے اور اس کا اکثر وقت رونے میں گذرتا ہے۔ تاناشاہ اس کی آزادانہ گفتگو اور بے باک حسن ملیح سے متاثر ہوچکا تھا۔ اور وہ سمجھ رہا تھا کہ محل کی آسائش اور شاہانہ لباس اور زیور پہن کر وہ اپنی قدیم زندگی کو بالکل بھول جائے گی۔ لیکن شاید اس کو یاد نہ رہا کہ خود گولکنڈہ جیسی سلطنت کا بادشاہ ہو جانے اور خداداد محل اور رنگین محل جیسے فلک بوس محلات میں اقامت گزیں ہونے کے باوجود بعض اوقات تنہائی میں اپنے بچپن کے جھونپڑے اور دیہات کی آزادانہ زندگی کو یاد کرکے بے چین ہو جاتا تھا۔ اس نے حکم دیا کہ اس سرو صحرا کو اس کے حضور میں لایا جائے۔

دہقان زادی نے جب کئی روز کے بعد بادشاہ کی صورت دیکھی تو اس کو پھر سے اس گھڑی کا خیال آگیا جب کہ وہ اپنی جھونپڑی میں اپنے باپ کی لاش لئے بیٹھی تھی۔ وہ بے اختیار رونے لگی۔ خادموں نے سمجھایا کہ تم اس وقت ظل اللہ کے حضور میں ہو اور یہ طریقہ آداب کے خلاف ہے۔ بادشاہ نے خود بھی دلاسا دیا اور کہا۔

"تم اس قدر رنجیدہ کیوں ہو؟ تمہیں تو خوش ہونا چاہئیے!"

دوشیزہ نے جواب دیا۔

"حضور مجھے اپنے پیارے باپ کا غم ہی کیا کم تھا جو اس قید خانے کی مصیبت نازل ہو گئی ہے؟"

بادشاہ نے متعجب ہو کر پوچھا۔

"تم قید خانے میں نہیں محل میں ہو۔ تمہیں ہر طرح کا آرام ہے۔ کھانے کو لذیذ غذائیں، پہننے کو رنگ برنگ کے بہترین لباس اور آرائش کے لئے جواہرات کے گہنے! اس سے بڑھ کر تم کیا چاہتی ہو؟"

دہقان زادی نے عرض کیا۔

"یہ سب میرے لئے بیکار ہیں۔ میں اس تنگ و تاریک قید خانے کی تنہائی سے بیزار ہوں۔ مجھے جنگل کے کھلے میدان لہلہاتا ہوا سبزہ، بہتا ہوا صاف و شفاف پانی، طراوت بھرتی ہوئی ہوا اور سب سے بڑھ کر آزادی چاہیئے۔ خدا کے لئے مجھے آزاد کر دیجئے۔ میں اس قید کو ...."

بادشاہ خود بھی اپنے آپ کو مقید محسوس کرتا تھا۔ اس کا دل بھی آزادی چاہتا تھا مگر وہ بادشاہت کی امانت کو سنبھالے ہوئے تھا۔ وہ مجبور تھا ورنہ کبھی کا آزاد ہو جاتا۔ لڑکی کہے جا رہی تھی مگر اب اس کا دماغ کسی اور خیال، کسی اور فضا میں محو ہو گیا تھا۔ وہ اب گولکنڈہ میں نہ تھا۔ اس کو اپنے بچپن کی زندگی یاد آ گئی تھی۔ اس کی ابتدائی زندگی کے چودہ سال اس کی آنکھوں میں پھرنے لگے۔ اُس گولکنڈہ میں قدم رکھنے کے بعد آج سب سے پہلی دفعہ محسوس کیا کہ اس عظیم الشان سلطنت، ان پر تکلف محلات اور اس شاہی ٹھاٹ کے باوجود اس کو وہ آزادی نصیب نہیں ہے۔ جس کے لئے یہ غریب دوشیزہ تڑپ رہی ہے۔ اطاعت گذار خادموں اور جاں نثار امیروں کے جھگمٹے میں وہ خود کو تنہا محسوس کر رہا تھا۔ خیالات کی دنیا میں وہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا۔

بادشاہ کے اس سکوت اور اس کی طبیعت کے اس تکدر کو دیکھ کر شاہی خدام سامنے سے ہٹ گئے اور دہقان زادی اپنی قیام گاہ میں پہنچا دی گئی۔

ایک روز سر شام خود تانا شاہ پیماتی کے محل میں داخل ہوا۔ اس پر تکلف ماحول میں غریب کسان کی لڑکی اُس کو ایک شہزادی نظر آ رہی تھی۔ اُس نے اِس سرد صحرا سے کہا۔

"تم نے میری زندگی میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ شاید تم نہیں جانتی کہ میں بھی تمہاری طرح جنگل کی ہواؤں کا پروردہ ہوں۔ مجھے بھی یہ عالیشان محل تنگ و تاریک قید خانے نظر آتے ہیں۔ میں نے تم کو محض اس لئے یہاں لانے کا حکم دیا تھا کہ باپ کی وفات سے تم دنیا میں تنہا ہو گئی ہو۔ ممکن ہے یہاں تمہارا دل بہل جائے۔ لیکن اگر تم چاہتی ہو تو اب بھی آزاد ہو۔ مگر میں پہلے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ یہاں سے نکلو گی تو کہاں جاؤ گی اور کس طرح دنیا میں زندگی بسر کرو گی۔"

لڑکی پر بادشاہ کی اس تلطف آمیز گفتگو کا بڑا اثر ہوا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ اُس نے سر نیچے کو جھکاتے ہوئے آہستہ آہستہ کہا۔

"اب میرا دنیا میں کوئی نہیں ہے .... میری ماں بچپن میں مر چکی تھی۔ میرے دونوں بھائی دکھا میں چل بسے ... میں خود بھی اب یہ سوچتی ہوں کہ تنہا اپنے کھیت کا کام کس طرح کروں گی؟ نہ معلوم میرے پیارے بیلوں کا کیا حشر ہوا ہے؟"

بادشاہ نے کہا۔

"تم آزاد ہو۔ سوچ سمجھ کر کوئی تصفیہ کر لو اور جس وقت چاہو مجھے مطلع کر دینا کہ میں تمہیں تمہارے کھیت کی دنیا میں پہونچا دوں گا۔"

پیامتی کا محل کئی سال سے ویران پڑا تھا۔ اب جو بادشاہ نے اس میں قدم رکھا۔ پھر سے چہل پہل اور رونق پیدا ہو گئی۔ ملکہ بھی کئی روز سے اس سنسان محل میں بات چیت اور حرکت کی آوازیں سن رہی تھی۔ مگر اس کو حقیقت حال کا علم نہ ہوا تھا۔ بادشاہ کا گذر ہوا تو سارے محل میں یہ خبر مشہور ہو گئی۔ اور ملکہ کو بھی آخرکار چند ہی روز میں اصل واقعہ معلوم ہو گیا۔ وہ غصہ میں بے تاب ہو گئی اور عالمِ غیض و غضب میں اپنی خادماؤں کو حکم دیا کہ پیامتی کے محل میں بادشاہ نے جس عورت کو لا رکھا ہے اس کو پکڑ لائیں۔ خادمائیں خوف زدہ تھیں۔ ان کے لئے یہ بڑا نازک وقت تھا۔ ایک طرف ملکہ کا بے پناہ غیض و غضب، دوسری طرف بادشاہ کی خفگی۔ ملکہ آپے سے باہر ہوئی جا رہی تھی۔ آخر ایک قدیم ملازمہ نے ہمت کر کے عرض کیا کہ :-

"میں واری جاؤں، حضور غصہ میں بے حال ہوئی جا رہی ہیں۔ دشمنوں کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔ آخر یہ لونڈی کس دن کے لئے ہے۔ حکم ہو تو ایسی تدبیر کروں کہ وہ بدبخت باقی رہے اور نہ بادشاہ کا دل اس کی طرف مائل ہو۔ اگر حضور ذرا صبر و تحمل سے کام لیں تو کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی اور ہر بات ملکہ کی طبیعت کے موافق ہو جائے گی۔"

دوسری خادماؤں کی بھی ہمت بندھی، انھوں نے بھی طرح طرح کی باتیں بنانی شروع کیں۔ خدا خدا کر کے ملکہ کا غصہ تھما۔ اس کے بعد چند ہی روز میں وہ بڑھیا دہقان زادی کو زہر کھلانے کی ترکیبوں میں کامیاب ہو گئی۔

جب بادشاہ کو اس غریب لڑکی کی نازک حالت کا علم ہوا تو اس نے فوری اطبائے شاہی کو معالجہ کا حکم دیا اور بڑے بڑے انعام واکرام کے وعدے کئے۔ وقت زیادہ نہیں گذرا تھا۔ غریب دوشیزہ کی جان بچ گئی، مگر وہ کئی دن تک فریش رہی۔ بادشاہ روز اس کی عیادت کو جاتا تھا۔ اور اب اس نے اس کی حفاظت کے لئے اپنے خاص ملازم متعین کر دیئے تھے۔

کچھ عرصے کے بعد تاناشاہ قلعہ سلطان نگر کے آثار دیکھنے کے لئے نکلا۔ یہ وہی قلعہ تھا، جس کو سلطان محمد قطب شاہ نے موجودہ مسجد کے قریب حیدرآباد کی حفاظت کے لئے بنانا شروع کیا تھا۔ مگر اس کی بے وقت کی وفات نے اس کو نامکمل حالت میں چھوڑ دیا۔ سلطان ابوالحسن تاناشاہ کا خیال تھا کہ اس قلعہ کو مکمل کر دیا جائے تاکہ حیدرآباد کے دونوں طرف دو مضبوط قلعے ہوں۔ اور اس طرح کوئی دشمن اس شہر میں قدم رکھنے کی جرأت نہ کر سکے۔

بادشاہ نے ایک رات اور ایک دن سلطان نگر کا محل و قوع اور اس کی نامکمل فصیلوں اور برجوں کے معائنے میں گذارا۔ وہ چاہتا تھا اور دو روز قیام کر کے اس کی تعمیر کے جملہ مرحلوں کا تصفیہ کر دے۔ لیکن دوسری رات اس کو نیند نہ آئی۔ وہ بے چینی سی محسوس کر رہا تھا۔ رات تمام وہ ٹہلتا رہا اور صبح ہونے سے قبل نہ معلوم کیا خیال آیا کہ اپنے خدم و حشم کو وہیں چھوڑ، چند خاص ملازمین کو ساتھ لے کر گولکنڈہ کا رُخ کیا۔

نصف النہار سے قبل وہ اپنے محل میں پہنچ گیا اور سیدھا پیامتی کے محل کا رُخ کیا۔ وہاں اس کے ملازم ایک کمرے میں مقید ملے۔ جن سے معلوم ہوا کہ دہقان زادی کو ملکہ پکڑ لے گئی ہے۔ تاناشاہ نے یہ سنتے ہی بالاخانے پر چڑھ کر ملکہ کے محل کی طرف نگاہ ڈالی۔ وہاں صحن میں ایک درخت کی پیڑ سے دہقان دوشیزہ کو باندھ دیا گیا تھا اور اس کے اطراف لکڑیوں کا انبار تھا۔ جس کو ابھی ابھی آگ لگائی گئی تھی۔ غریب لڑکی چیخ رہی تھی۔ مگر وہاں کوئی اس کی مدد کرنے والا نہیں تھا۔ بلکہ الٹا اس کو گالیاں دی جا رہی تھیں اور بڑھیا کہہ رہی تھی کہ تیری سزا تو اس سے زیادہ سخت ہونی چاہیئے۔

بادشاہ نے بالاخانے ہی سے آواز دی۔ کہ خبردار جو لڑکی کو ضرر پہنچنے پائے۔ بادشاہ کی آواز سنتے ہی سب گھبرا گئے اور بے تحاشہ

بھاگ نکلا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ بادشاہ کئی روز کے لیے قلعہ سے باہر گیا ہوا ہے اور وہ اس وقت واپس آئے گا جب لڑکی کا نام باقی نہ رہے گا۔

اس اثنا میں بادشاہ کے ملازمین خاص جو اس لڑکی کی حفاظت کے لیے مقرر کیے گئے تھے اور جنھیں بروقت تمام مقید کے ملازمین لڑکی کو کشاں کشاں لے گئے تھے پہنچ گئے انھیں خود تاناشاہ نے آزاد کیا تھا۔ ملکہ کے محل میں پہنچتے ہی انھوں نے دونوں کی رسیاں کھول دیں۔ لڑکی کے کپڑے جل رہے تھے۔ بدقت تمام آگ بجھائی گئی۔ تاناشاہ نے قریب آ کر لڑکی کو دیکھا۔ وہ آگ کی سے جھلس باختہ ہوچکی تھی، بادشاہ کو دیکھتے ہی اس نے ایک چیخ ماری اور بے ہوش ہوگئی۔

جب لڑکی کو ہوش آیا تو اس نے معلوم کیا وہ گولکنڈہ کے عالیشان محل کی جگہ ایک کھلی بارہ دری کے میدان میں لیٹی وہ حیران تھی۔ جنگل کی آزاد ہوائیں چل رہی تھیں اور دور دور تک سبزہ ہی سبزہ نظر آ رہا تھا۔ اس کو پریشان دیکھ کر ایک خادمہ آہستہ سے کہا:-

"بادشاہ نے تم کو پیامتی پیٹھ کی شاہی بارہ دری میں منتقل کردیا ہے اور وہ ابھی تمہاری عیادت کے لیے آنے والے ہیں۔

جب کئی ہفتوں کی نگہداشت کے بعد لڑکی پوری طرح صحت مند ہوگئی تو اس کو غسل صحت کرایا گیا اسی روز بادشاہ غریب لڑکی کو صحت یابی کی مبارکباد دینے کے لیے پیامتی پیٹھ پہنچا۔ اثنائے گفتگو میں اس نے اس سرو صحرا سے کہا:-

"اب تم آزاد کردی گئی ہو تمہارا کھیت یہاں سے بالکل قریب ہے اور تمہارے بیل بھی محفوظ ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے تم کو ناحق دو مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا، اور یہ دونوں ایسی سخت اور مہلک تھیں کہ تمہاری جگہ اگر کوئی محلات کی پروردہ ہوتی تو ختم ہی ہوجاتی۔ تمہاری ہمت اور قوت برداشت قابل تعریف ہے۔"

دہقان دوشیزہ نے دست بستہ عرض کیا کہ:-

"حضور نے دو دفعہ میری جان بچائی ہے، اور میری تیمارداری میں جو زحمت اٹھائی ہے اس کا تقاضہ ہے کہ میں عمر بھر کے لیے ظل اللہ کی لونڈی بنی رہوں۔ میری تمنا ہے کہ حضور ہی کی خدمت گذاری میں میری بقیہ زندگی صرف ہوجائے بشرطیکہ حضور بھی اس غریب کو اس قابل سمجھیں۔"

لڑکی کی شریفانہ گفتگو، اس کا میٹھا چہرہ، اس کی بیمار آنکھیں، اس کا سرو جیسا بلند و بالا قد، اور اس کی سادگی و پرکاری، کے رومان آفریں ماحول میں حسن و لطافت کا اضافہ کر رہی تھیں۔ بادشاہ کے دل میں عشق و محبت کی دبی ہوئی چنگاریاں بھڑک اٹھیں شاید منتظر تھا کہ کوئی اس کے تشنہ مضراب ساز کو چھیڑ دے۔ اس سرو صحرا نے اس کی سوئی ہوئی قوتوں کو بیدار کردیا۔ اس کے جذ بجلی گری۔ اس نے کہا:-

"تمہاری ان پریشانیوں کی وجہ سے مجھے تمہارے ساتھ ایک خاص دلچسپی پیدا ہوگئی ہے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ تم نے اپنی ہمت اور کردار سے ثابت کردیا کہ میرے لیے تم سے بہتر رفیق اور کوئی نہیں مل سکتا۔ اب تک دنیا میں اپنے آپ کو علیحدہ سمجھتا رہا تھا۔ ممکن ہے کہ تمہاری وجہ سے میرا یہ احساس تنہائی دور ہوجائے کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ میری اور تمہاری زندگی میں کئی باتیں مشترک ہیں۔ تم نے بھی جنگل میں پرورش پائی اور میں نے بھی اپنی عمر کا ابتدائی زمانہ اسی آزادانہ ماحول

میں گذرا ہے۔ تم بھی یکایک محل کی زندگی گذارنے پر مجبور کر دی گئیں اور مجھے بھی اسی طرح یکایک یہ بھیس اختیار کرنا پڑا۔
میں سمجھتا ہوں کہ خُدا تعالیٰ نے غیب سے تم کو بھیج کر ایسے اسباب پیدا کر دیئے تاکہ میری یہ مصنوعی زندگی حقیقت
اور اصلیت کی جھلکوں سے محروم نہ رہے۔"

پیاماتی پیٹھ کی شاہی بارہ دری کئی سال سے ویران رہنے کے بعد اس غریب دہقان زادی کی وجہ سے پھر آباد ہو گئی۔ حُسن و عشق کی سرگرمیاں ہر خرابہ میں رونق پیدا کر دیتی ہیں۔ بادشاہ ہر جمعرات کو قلعہ سے آیا کرتا اور ایک رات اور ایک دن اس آزاد دنیا میں بے تعلق زندگی گزار کر بعد نمازِ جمعہ قلعہ کو واپس ہو جاتا۔ جہاں پانچ چھ روز تک اس کو ایک مدبّر بادشاہ کا بھیس اختیار کر کے قطب شاہوں کی اس عظیم الشان سلطنت کے کاروبار انجام دینے پڑتے تھے۔

کئی سال تک غریب دہقان زادی اپنے محسن بادشاہ کے دل کو گرماتی رہی۔ اس کا فکرمند دل اس سروِ صحرا کی سادگی و پرکاری سے غنچہ کی طرح کھِل جاتا۔ وہ جب تک اس کے ساتھ رہتا، شاہی وقار و تمکنت کو بھولا ہوا رہتا۔ اُس کے پیشرو تاجدارِ گولکنڈہ نے ملک کی سیاست میں جو پیچیدگیاں پیدا کر دی تھیں، ان کو سلجھاتے رہنے میں چھ روز تک اس کے دل و دماغ میں جو گرانی سی رہتی، وہ سب پیاماتی پیٹھ میں داخل ہوتے ہی حرفِ غلط کی طرح محو ہو جاتی۔ لیکن تانا شاہ کی قسمت میں عیش و آرام سے زیادہ رنج و غم کا حصہ تھا۔ قدرت کو منظور نہ تھا کہ اس سروِ صحرائی سے وہ زیادہ دنوں تک لطف اندوز ہو سکتا۔ زہر اور آگ کے حادثوں کی وجہ سے دہقان زادی کی صحت میں گھن لگ گیا تھا۔ اس کو اندرونی طور پر حرارت آتی رہتی تھی۔ وہ روز بروز نحیف ہوتی گئی۔ آخرکار ایک وقت آیا کہ بادشاہ نے اس کی صحت کو خطرہ میں محسوس کیا۔ شاہی طبیبوں نے اس کا بہت علاج کیا۔ لیکن اس کی حالت خراب ہوتی گئی۔ وہ بسترِ مرگ پر لیٹی ہوئی تھی۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ اب اپنے محسن بادشاہ سے جُدائی کا وقت قریب آگیا ہے۔ اُس نے اپنی خادمہ کو اشارہ کیا۔ جس نے بادشاہ کے قدموں کے پاس پانچ کشتیاں لاکر رکھدیں۔

غریب دہقان زادی نے بھرّائی ہوئی آواز میں بادشاہ سے عرض کیا:-

"میں اپنی ہر چیز بادشاہ پر نثار کر چکی ہوں۔ یہ آخری امانت ہے۔ جس کو پیش کر کے میں حضور سے اپنے اس قصور کی معافی چاہتی ہوں کہ اس کو اب تک چھپائے رکھا۔ یہ وہ جواہرات ہیں جو مجھے اس بارہ دری کے ایک مقفل کمرے میں محفوظ ملے تھے۔ یہ شاید پیاماتی کی دولت ہے۔ جس نے اپنے آقا سلطان عبداللہ قطب شاہ سے حاصل کر کے اس کو یہاں محفوظ کر دیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں وہ مشہور ہیرے بھی ہیں، جن کی وجہ سے مرحوم بادشاہ اور دغاباز میر جملہ کے آپس میں ناچاقی ہو گئی تھی۔"

غریب دہقان زادی کی وفات کا تاناشاہ کو بے حد صدمہ ہوا۔ وہ پھر سے خود کو دنیا میں اکیلا محسوس کرنے لگا تھا لیکن ہر جمعرات کی شام کو وہ حسبِ عادت پیاماتی پیٹھ آتا اور اپنی اس رفیقِ زندگی کی یاد میں ایک رات اور ایک دن بسر کیا کرتا۔ گولکنڈہ کی سلطنت کی طرح اس سروِ صحرا کے دیئے ہوئے ہیروں اور جواہرات کو بھی وہ ہمیشہ امانت سمجھتا رہا اور ان دونوں کو آخر وقت تک سنبھالے رکھا۔ اس کی دیانت کا تقاضا تھا کہ اُن کی حفاظت کیلئے مردانہ مقابلہ کرتا مگر وہ پہلے ہی اورنگ زیب سے صلح کر کے قطب شاہی سلطنت اور گولکنڈے کے ہیرے اس کے حوالے کر دیتا۔ تاناشاہ کی نظر میں ان دونوں کی کوئی وقعت نہ تھی وہ

نقد و نظر

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

اردو افسانے میں لس بین ازم

مصنف: ش اختر

ش اختر رانچی کے ایک کالج میں اردو کے استاد ہیں۔ افسانہ نگار کی حیثیت سے وہ کافی معروف ہیں۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "زندان کی ایک رات" نام سے شائع ہوا تھا۔ حال ہی میں ان کا ناولٹ "خون بہا" چھپا ہے۔ "اردو افسانے میں لس بین ازم" (LESBIANISM) اختر کے دو طویل تنقیدی مقالوں کا مجموعہ ہے۔ پہلے مقالے کا عنوان "ادب میں اسٹائل کا مسئلہ" ہے۔ دوسرا مقالہ وہی ہے ن کے عنوان کو کتاب کا نام قرار دیا گیا ہے۔ ادبی تنقید میں اسلوب ... یا اسٹائل کی اصطلاح بہت ہی مبہم اور غیر متعین وم میں استعمال ہوتی رہی ہے۔ مختلف نقادوں نے اپنے اپنے نقطۂ نظر سے اسلوب کے تصور کی تشریح کرتے ہوئے ا کے عناصر ترکیبی کی نشان دہی کی ہے۔ اس سلسلہ میں دو نقاطِ نظر زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ ایک نفسیاتی اور دوسرے لسانی۔

ش اختر نے اپنے مضمون میں اسلوب کے بارے میں نفسیاتی اور رومانی نقطۂ نظر کو اپنایا ہے۔ جو اسلوب کو شخصیت کا ، دف قرار دیتا ہے۔ اسلوب اور شخصیت کے باہمی تعلق پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے اسلوب کے عناصر ترکیبی کی جو فہرست ائی ہے۔ اس میں شخصیت، زبان، خیالات کی غیر پیچیدگی، کردار، اختصار، فصاحت، قوتِ اظہار، تاثرات کی پیش کش ، ، کی بلند پروازی، معنی، اطلاعات کی نوعیت، شامل ہیں۔ پھر اردو شعر و ادب کے حوالے سے ان عناصر ترکیبی کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے اور مضمون کے آخر میں اردو کے افسانوی ادب سے اسلوب کے مختلف نمونے پیش کرتے ہوئے رومانوی اسلوب ص طور پر جائزہ لیا ہے۔ اسلوب اور شخصیت کے باہمی تعلق کا مسئلہ خالص نفسیاتی مطالعے کا موضوع ہے اور اس لعے کے ذریعے صرف اس بات کی وضاحت کی جاسکتی ہے کہ کسی مصنف کے اسلوب کی منفرد خصوصیات کی تشکیل میں کی شخصیت کس طرح کارفرما رہی ہے۔ خود اسلوب کے حسن و قبح کو پرکھنے میں نفسیات سے کوئی مدد نہیں مل سکتی۔ یت کے علاوہ، جن عناصر ترکیبی کی نشان دہی کی گئی ہے، ان کا تعلق زبان اور اس کے تخلیقی استعمال سے ہے۔ اس لئے وب کے سائنٹفک تجزیے کے لئے لسانیات کے علم بالخصوص اسلوبیات سے مدد لینا ناگزیر ہے۔

دوسرا مضمون "اردو افسانے میں لس بین ازم" ہے۔ ش اختر ... مقالہ ... سے

پہلے بطور تمہید معاشرے میں عورتوں کا مقام اور ان کے مسائل، فکری اور سماجی انقلابات اور ان کے اثرات اور ادب میں جنس کی اہمیت کے موضوعات پر مختلف مفکرین اور ماہرینِ نفسیات کے حوالوں کے ساتھ معلومات افروز خیالات پیش کیے گئے ہیں۔ ود آخر میں بتایا گیا ہے کہ اُردو میں اگرچہ جنس کے موضوع پر بہت سی کہانیاں اور ناول لکھے گئے ہیں۔ لیکن کم ہی ادیبوں نے ورتوں میں ہم جنسیت یا لس بین ازم کے مسئلے پر توجہ کی ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ رہی ہو کہ ہمارے مخصوص طرزِ معاشرت ور بعض دوسری وجوہات سے، عورتوں کی ہم جنسیت عام نظروں سے پوشیدہ رہی ہے۔ اختر کا یہ خیال درست نہیں ہے کہ قدیم شعراء کے ہاں، اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ نظیر اکبرآبادی نے اس موضوع پر نظم لکھی ہے۔ اس کے علاوہ ریختی گو شاعروں کا کلام بھی ہم جنسیت سے بھرا پڑا ہے۔

ش۔ اختر نے اس مقالے کے آخر میں، چند ایسی کہانیوں کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے، جو میلانِ ہم جنسی کے وضوع پر لکھی گئی ہے۔ ان میں عصمت چغتائی، ممتاز شیریں، ہاجرہ مسرور اور صدیقہ بیگم کی کہانیوں 'لحاف'، 'انگڑائی'، تل، اونٹ اور پہاڑ' اور 'تارے لرز رہے ہیں' سے بطور خاص بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب کے دونوں مقالے دلچسپ اور کر انگیز ہیں۔ (ڈاکٹر مغنی تبسم)

دیوانِ اثر (خواجہ میر اثر دہلوی)

مرتب، ڈاکٹر کامل قریشی۔

ناشر: انجمن ترقی اُردو ہند 'اردو گھر' راوز ایوینو، نئی دہلی۔۱

خواجہ محمد میر اثرؔ دہلوی اپنے دور کے ان باکمال اور صاحبِ طرز شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔ جنھوں نے اردو شاعری بالخصوص زل اور مثنوی جیسی اصناف کو آبرومند بنانے میں بہت زیادہ حصّہ لیا۔ میر اثرؔ خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی، جانشین اور ن کی خانقاہ کے سجادہ نشین تھے۔ انھوں نے دردؔ سے نہ صرف مذہب اور تصوف میں، بلکہ شاعری میں بھی بہت زیادہ نتساب کیا۔ اثرؔ کو اگرچہ وہ شہرت حاصل نہ ہو سکی، جو دردؔ اور ان کے دیگر ہمعصر شاعروں کو حاصل تھی۔ لیکن دھیرے ھیرے ہی سہی، ان کی شعری حیثیت اور اہمیت کا اعتراف کیا جانے لگا۔ مولانا حالیؔ نے سب سے پہلے 'مقدمۂ شعر و شاعری' میں اثرؔ کی مثنوی 'خواب و خیال' کی ستائش کی، بلکہ مرزا شوق لکھنوی کو ان کی مثنوی 'بہارِ عشق' کی حد تک ے کا خوشہ چیں قرار دیا۔ مولوی عبدالحق نے ۱۹۲۶ء میں 'خواب و خیال' کو شائع کیا اور ان کے بعد ۱۹۳۰ء میں 'دیوانِ اثرؔ' بھی تیب دے کر اس کی اشاعت عمل میں لائی۔ اس سے ایک سال قبل تقی الدین احمد نے 'دیوانِ اثرؔ' شائع کیا تھا۔

اس دوران اثرؔ کی شخصیت اور شاعری اور مثنوی 'خواب و خیال' پر چند ایک مضامین مختلف رسائل میں شائع ہوتے رہے، تاہم اثرؔ اور ان کے کلام پر جیسی کہ توجہ دی جانی چاہیے تھی، نہیں دی گئی۔ تاخیر سے سہی، ڈاکٹر کامل قریشی نے ن تمام قلمی نسخوں، تذکروں، بیاضوں اور ملفوظات تک رسائی حاصل کی، جو ملک بھر میں ان کو مہیا ہو سکتے تھے۔

موصوف نے ان سب سے غیر معمولی سلیقے اور اہتمام کے ساتھ کام بھی لیا ہے۔ آثر کے حالاتِ زندگی کی تدوین بھی ان کی گہری اور مربوط تحقیق کا حاصل ہے۔ ونیز تمام قلمی و مطبوعہ نسخوں کی روشنی میں دیوانِ آثر کی ترتیب کی گئی ہے اور جہاں جہاں اختلافات دکھائی دیئے ہیں ان کی وضاحت بھی موجود ہے۔ میر آثر کی شاعری کے پس منظر کو واضح کرتے ہوئے ان کے کلام کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ یوں میر آثر کے شاعرانہ مرتبہ کو بہ تمام و کمال متعین کیا گیا ہے۔

مجموعی طور پر دیوانِ اثر کی ترتیب اور میر آثر دہلوی کی حیات اور شاعری کا جائزہ، ڈاکٹر کامل قریشی کا لائق ستائش کارنامہ ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ انجمن ترقی اُردو نے اس کو اہتمام سے شائع کیا ہے۔ کتابت، طباعت اور کاغذ اوسط سے اچھے ہیں البتہ قیمت (۲۸) روپیے کچھ کم ہوتی تو اچھا تھا۔ (ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید)

پتے کی بات (مزاح)

مصنف: برق آشیانوی قیمت: (۱۴) روپیے
ناشر: نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ۔ لکھنو۔ (یو۔ پی)

برق آشیانوی مزاح پیدا کرنے کے کئی حربوں سے واقف ہیں۔ وہ اپنے مزاح کا استعمال بڑی چابک دستی سے کرتے ہیں۔ چونکہ وہ سنجیدہ نگاری کے دروازے سے مزاح نگاری میں داخل ہوئے ہیں اس لئے ابتذال اور پھکڑ پن کے خارزار سے اپنا دامن بچا کر چلتے ہیں۔ ان کے اسلوب سے متانت، سنجیدگی، آہستہ خرامی کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے مزاح کی حد تک بڑھی ہوئی شرافت انھیں ایک منفرد مقام عطا کرتی ہے۔ ان کا انداز دھیرے دھیرے بہنے والے دریا کا سا ہے۔ اس لئے اندازِ بیان میں انقلاب یا ارتقا کی گنجائش بہت کم ہے۔ یہ ایک قابلِ تعریف بات ہے کہ الفاظ کی شعبدہ بازی دکھانے کی بجائے وہ حالات کے تجزیئے سے نتائج اخذ کرتے ہیں اور محل وقوع کے ذریعہ مزاح پیدا کرتے ہیں۔ مزاح نگاری میں یہ تکنیک مستحسن خیال کی جاتی ہے۔ قہقہہ کی بجائے زیرِ لب تبسم پیدا کرنے کا رجحان بھی، انھیں دوسرے مزاح نگاروں سے ممتاز کرتا ہے۔ تلخ طنزیہ اشاروں کو یہ قابلِ اعتنا نہیں سمجھتے، لطیف طنز پر اکتفا کرتے ہیں وہ ایک خالص مزاح نگار ہیں۔ حالات ملازمت، مصروفیت، ماحول، علم و تربیت، خاندانی روایات کے باعث اُن کا لہجہ بہت ہی شائستہ ہو گیا ہے اور خوش ذوق حضرات ہی ان کے مزاح سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ "پتے کی بات" میں چھتریوں کا قصہ بڑا دل آویز ہے۔ "قیامت آئی جو شادی کی"، "بڑی بیوں کی پردہ نشین خاتون سے شادی کر کے"، "بھوک ہڑتال"، "خواتین کا سال"، "خالہ خیرن"، "عورتیں پڑھیں گی اور عبرت حاصل کریں گی"، "ہمارا غیر معقدی جلسہ"، "حجامت"، "تفریح"، "فلاح غالب"، "کرکٹ میاں جی کے باب میں"، "من کے گئو بیسٹ آفیسرم"، "کرکٹ کا مٹری مرد پٹیں گے اور چلّو بھر پانی کی تلاش میں نکل کھڑے ہوں گے۔" مستقبل میں شاعر بننے کا پروگرام رکھنے والے کسی اُستاد سے غزل ریپیر (REPAIR) کروانے کا ارادہ رکھنے والے اصحاب "کیا کیا نہ شاعر بننے کے لئے" پڑھ کر شاید توبہ کر کے شاعری سے تائب ہو جائیں۔

کتاب کا سہ رنگی سرورق بہت اچھا چھپا ہے۔ (۱۵۲) صفحات کی اس کتاب کی قیمت چودہ پیسہ کچھ زیادہ نہیں۔

(ایس۔ جے صادق)

ادبی سرگرمیاں

اردو نامہ: علمی، ادبی اور تہذیبی خبر نامہ

یکم اکتوبر: ادارۂ شعر و حکمت کی طرف سے ڈاکٹر احسن رضوی کے اعزاز میں "ایک ادبی شام" ڈاکٹر مغنی تبسم ریڈر شعبہ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی کی صدارت میں منعقد ہوی۔ ڈاکٹر تبسم کے علاوہ جناب سعید شہیدی، جناب خیرات ندیم اور جناب صادق نقوی نے ڈاکٹر احسن کی شعری صلاحیتوں اور ان کی ... شخصیت کے مختلف گوشوں پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ جناب صلاح الدین نیر نے ڈاکٹر احسن کی گلپوشی کی۔ محفل شعر میں سرور ڈاکٹر مغنی تبسم، سعید شہیدی، خیرات ندیم، وقار خلیل، صلاح الدین نیر، صادق نقوی، فیض الحسن خیال، نے کلام سنایا۔

• ادبستانِ دکن کی مجلسِ عاملہ کا اجلاس ڈاکٹر حفیظ قتیل کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جس میں طے پایا کہ دکن کے بزرگ شاعر حضرت صفی اورنگ آبادی کا کلیات شائع کیا جائے۔ جناب شمس الدین تاباں اور ڈاکٹر غیاث صدیقی نے بھی اس سلسلہ میں اپنے مشورے دیئے۔

• بزمِ اردو جامعہ عثمانیہ کے انتخابات میں مسٹر زعیم عبید اللہ صدیقی صدر، مس ساجدہ سلطانہ نائب صدر، عبدالرحمٰن قریشی معتمد عمومی اور مس قمر سلطانہ شریک معتمد ہوئے۔ پروفیسر رفیعہ سلطانہ صدر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ نے منتخب اراکین کو مبارکباد دی۔

۱۳ اکتوبر: انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کی طرف سے صدر انجمن نواب میر احمد علی خاں، معتمد جناب حبیب الرحمٰن، شریک معتمد جناب عابد علی خاں نے مشترکہ بیان جاری کرتے ہوئے محبانِ اردو سے اردو تعلیمی فنڈ کو استحکام بخشنے کی اپیل کی۔ اور بتایا کہ انجمن نے اپنی مالی سے تعلیمی فنڈ میں بشمول ۸۵ ہزار روپیے جمع کرلئے ہیں۔ ختم سال تک دو لاکھ روپیے جمع کئے جانے کے عزم کا اعادہ کرتے ہوئے بتایا کہ ریاست اور شہر کے اہم مقامات میں اردو تعلیم کے کوچنگ سنٹروں کا وسیع پیمانے پر قیام عمل میں آئے گا۔ تاکہ ابتدائی درجوں سے اعلیٰ درجوں تک اردو میں حصول علم کا سلسلہ مستحکم ہو۔

۴ اکتوبر: شعبۂ فارسی عثمانیہ یونیورسٹی کے زیر اہتمام فارسی ڈپلوما کورس کا افتتاح کرتے ہوئے قونصل جنرل ایران ڈاکٹر علی خانی نے کہا کہ ہندوستانی تہذیب و تمدن کو پروان چڑھانے میں فارسی زبان نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ڈاکٹر رضیہ اکبر صدر شعبہ فارسی عثمانیہ یونیورسٹی نے بھی جلسہ سے خطاب کیا۔

• محفل خواتین کا ماہانہ ادبی اجلاس محترمہ باجی جمال انصاری کی صدارت میں منعقد ہوا۔ محترمہ فاطمہ عالم علی نے اکبر الہ آبادی کے نام کھلا خط کے زیر عنوان فکاہیہ اور محترمہ بانو طاہرہ سعید نے "حاجی صاحب" نام سے مزاحیہ سنایا۔ خواتین شعراء نے کلام پیش کیا۔

۸ اکتوبر: ساؤتھ انڈیا اردو اکیڈمی کی سٹی یونٹ کے ایک اجلاس میں محلہ واری کمیٹیوں کی تشکیل کا فیصلہ کیا گیا اور حیدرآباد ٹیلی ویژن سے اردو پروگرام کی پیشکشی کے لئے رائے عامہ کو متحرک کرنے اور ارباب مجاز کو توجہ دلانے کی غرض سے "ٹی وی کنونشن" کے انعقاد کے بارے میں غور کیا گیا۔ جناب عزیز الدین احمد صدر سٹی یونٹ نے جلسہ کی صدارت کی۔

۹ اکتوبر: ریاستی الکٹریسٹی بورڈ کی بزم اردو کی جانب سے اردو تعلیم کا افتتاح عمل میں آیا۔ بورڈ کے سکریٹری مسٹر شرما نے جلسہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اردو ہماری گنگا جمنی تہذیب کی آئینہ دار ہے۔ جناب یم اے عظیم صدر بزم اردو اور جناب میر کمال الدین علی خان معتمد بزم نے بھی مخاطب کیا اور بتایا کہ ۷۴ غیر اردو داں

ملازمین بورڈ نے اردو کلاسیس میں داخلہ لیا ہے۔

۱۳ اکتوبر: جناب ابوالفیض سحر، اسسٹنٹ ڈائرکٹر ترقی اردو بیورو (مرکزی وزارت تعلیم) نے پریس کانفرنس کو مخاطب کرتے ہوئے بورڈ کی سرگرمیوں سے واقف کرایا اور کہا کہ تعلیم بالغان اسکیم کے تحت ملک گیر سطح پر کوچنگ سنٹروں کا قیام عمل میں آرہا ہے۔ بورڈ کی طرف سے اردو کی نصابی کتابوں کی ترتیب و اشاعت کا کام بھی اطمینان بخش طریقے پر جاری ہے آندھرا پردیش ٹکسٹ بک اسکیم کے تحت بورڈ نے ریاستی انجمن ترقی اردو کے تعاون سے (۴۵) کتابوں کے مسودے تیار کرائے ہیں۔ جن میں سے (۸) کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ جناب سحر نے بتایا کہ بچوں کے عالمی سال کی مناسبت سے ترقی بورڈ، بچوں کے لئے ایک باتصویر انسائیکلوپیڈیا بھی شائع کر رہا ہے۔ اب تک بورڈ کی طرف سے ادب اطفال سلسلے میں (۳۰) کتابیں... شائع ہو چکی ہیں۔

۱۴ اکتوبر: اقبال اکیڈیمی کے زیر اہتمام ماہانہ "محفل اقبال" میں ڈاکٹر غیاث صدیقی، جناب مصلح الدین سعدی ایڈیٹر "اقبال ریویو" اور جناب ظہیر الدین احمد نے "اقبالیات" پر مقالے سنائے۔ جناب مضطر مجاز نے فارسی کلام اقبال کا اردو ترجمہ پیش کیا۔ جناب پرنسپل سید خلیل اللہ حسینی نے جلسہ کی صدارت کی۔

● ادبستان دکن کے زیر اہتمام بزرگ شاعر جناب شمس الدین تاباں کے پہلے شعری مجموعہ "زنجیر و زنار" کی رسم اجراء جناب حامد علی عباسی نائب صدر ادارۂ ادبیات اردو نے انجام دی۔ جسٹس گوپال راؤ ایکبوٹے نے جلسہ کی صدارت کی۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، جناب آصف پاشاہ سد۔ ریاستی اردو اکیڈیمی، ڈاکٹر حسینی شاہد، جناب محبوب حسین جگر جوائنٹ ایڈیٹر سیاست، ڈاکٹر حفیظ قتیل، ڈاکٹر عالم خوندمیری نے تاباں کی شاعری اور شخصیت پر مخاطب کیا۔ تاباں صاحب نے کلام پیش کیا۔ موسیقار وٹھل راؤ نے سازوں پر تاباں کی غزلیں سنا کر داد حاصل کی۔ وقار خلیل نے جلسہ کی کاروائی انجام دی۔

۱۵ اکتوبر: اقلیم ادب کا ماہانہ ادبی اجلاس ڈاکٹر انور معظم پروفیسر شعبہ اسلامیات عثمانیہ یونیورسٹی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ برطانوی شاعر وہائٹ ہیگ کی حیات اور فن پر جناب حمید حاصل نے مقالہ سنایا۔ "آج کا شاعر" کے زیر عنوان، احمد قادری صاحب نے اپنا کلام سنایا۔ محفل شعر میں ڈاکٹر معظم، غیاث متین، رحمن جامی، رؤف خیر، صادق نقوی، مصلح الدین سعدی، مضطر مجاز، علی الدین نوید، رضا وصفی، صب کوثر، رحمت یوسف زئی، ڈاکٹر راہی، حسام الدین سلیم نے کلام سنایا۔ جناب جمیل شیدائی معتمد اقلیم ادب نے شکریہ ادا کیا۔

۱۷ اکتوبر: بزم اردو الکٹریسٹی بورڈ کی طرف سے ڈاکٹر زینت ساجدہ ریڈر شعبہ اردو کی صدارت میں "شام افسانہ" منعقد ہوی۔ مسز اقبال متین، اکرام جاوید، آمنہ انصاری اور عوض سعید کے علاوہ، بزم اردو کے اراکین افسانہ نگاروں نے افسانے سنائے۔ میر کمال الدین علی خان معتمد بزم نے شکریہ ادا کیا۔

● تہذیبی ادارہ "سماج درپن" کے زیر اہتمام جناب مرزا اظہر افسر کے ڈراموں کے مجموعہ "نارنگی کی خوشبو" کی رسم اجراء آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد کے ڈائرکٹر جناب جے ڈی پادیجہ نے انجام دی۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، جناب احمد جلیس اور محترمہ بانو طاہرہ سعید نے اظہر افسر کی تخلیقی صلاحیتوں اور ریڈیائی فیچر و ڈراموں میں ان کی ذہانت کو خراج تحسین ادا کیا۔

● ہمہ لسانی قومی خبر رساں ادارہ "سماچار بھارتی" کی شاخ حیدرآباد کے قیام کی مسرت میں ایک جلسہ ہوا۔ جس میں اس امر کا انکشاف کیا گیا کہ یکم نومبر سے پہلی مرتبہ صحافت کو تلگو اور اردو میں عالمی خبریں فراہم ہو سکیں گی۔

۱۸ر اکتوبر: انوار العلوم کالج لائبریری میں پروفیسر ہارون خان شروانی کی عطیہ کتابوں کے "شروانی کارنر" کا افتتاح جناب میر احمد علی خاں صدر ریاستی انجمن ترقی اردو نے کیا اور پروفیسر شروانی کی علمی اور دانشورانہ صلاحیتوں کو خراج تحسین ادا کیا۔ پرنسپل جناب خلیل اللہ حسینی نے بھی شروانی صاحب کی خدمات کو سراہا اور کہا کہ چار سو کتابیں انوار العلوم کالج کی لائبریری کو تحفۃً مرحمت فرما کر موصوف نے گرانقدر علمی خدمت انجام دی ہے۔

● علی گڈھ اولڈ بوائز اسوسی ایشن کی جانب سے علی گڈھ میں سالانہ یوم سرسید انعقاد عمل میں آیا۔ صدر اسوسی ایشن جناب احمد جنگ نے صدارت کی۔ پروفیسر حبیب الرحمٰن، پروفیسر منظور عالم، جسٹس شرف الدین احمد اور جناب میر اکبر علی خان سابق گورنر اڑیسہ نے سرسید کی قومی، ملی اور تعلیمی خدمات کو زبردست خراج عقیدت ادا کیا۔ محفل شعر و سخن جناب سعید شہیدی کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ مسرز بانو طاہرہ سعید، مظفر النساء ناز، صلاح الدین نیر، خیرات ندیم، وقار خلیل، صادق نقوی، فیض الحسن خیال اور فخر الدین نیاز نے کلام سنایا۔ جناب عبدالمنان قادری معتمد علی گڈھ اولڈ بوائز اسوسی ایشن نے شکریہ ادا کیا۔

۲۱ر اکتوبر: بہزادِ دکن خواجہ فیاض الدین نظامی کی پہلی برسی کے موقع پر ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹیٹیوٹ میں "یادِ نظامی" کا جلسہ جناب اکبر علی خاں سابق گورنر یو۔پی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ محترمہ روداستری ریاستی وزیر سیاحت نے سادہ نمبر کی رسم اجراء انجام دی۔ مولانا حسن نظامی ثانی دہلوی، ایڈیٹر ماہنامہ "منادی" دہلی، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد شکیب، جسٹس شرف الدین احمد، ڈاکٹر سید عبدالمنان اور جناب حسن الدین احمد صدر "ولا اکیڈیمی" نے بہزادِ دکن کو زبردست خراج عقیدت ادا کیا۔ محترمہ بانو طاہرہ سعید نے نظم سنائی۔ جناب عبدالصمد نے شکریہ ادا کیا۔

● دکنی زبان کے مقبول شاعر جناب سلیمان خطیب کا مختصر علالت کے بعد دواخانہ عثمانیہ میں انتقال ہوگیا۔ دوسرے دن گلبرگہ شریف (کرناٹک) میں درگاہ حضرت خواجہ بندہ نوازؒ میں تدفین عمل میں آئی۔ خطیب کا پہلا شعری مجموعہ "کیوڑے کا بن" ۱۹۷۵ء میں شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔

(خطیب کی وفات پر ادارۂ ادبیات اردو اور ادارۂ "سب رس" کی طرف سے گہرے رنج و الم کا اظہار کیا جاتا ہے۔ خدا مغفرت فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے۔)

۲۲ر اکتوبر: زندہ دلانِ حیدرآباد کے ہنگامی اجلاس میں سلیمان خطیب کی وفات پر گہرے رنج و الم کا اظہار کرتے ہوئے قرار دادِ تعزیت منظور کی گئی۔

● ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نائب صدر انجمن ترقی اردو ہند نے تعزیتی بیان میں سلیمان خطیب کی وفات کو اردو شاعری کا بالعموم اور دکنی شاعری کا بالخصوص بڑا نقصان قرار دیا۔

● جناب شہباز حسین ایڈیٹر ماہنامہ "آجکل" دہلی نے ریاستی اردو اکیڈیمی میں "آجکل" کے آندھرا پردیش نمبر کی اشاعت کے سلسلے میں حیدرآبادی ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں سے ملاقات کی۔ مسرز عابد علی خان، ایڈیٹر "سیاست"، بھارت چند کھنہ، ڈائرکٹر اردو اکیڈیمی، اختر حسن مددگار معتمد اکیڈیمی، رشید قریشی مددگار معتمد اکیڈیمی، رشید الدین، وقار خلیل، صابر کمال اور ناصر کرنولی اس بات چیت میں شامل تھے۔

۲۳ر اکتوبر: سلیمان خطیب کی وفات پر علمی و ادبی تنظیموں اور معروف اصحاب کے تعزیتی بیانات جاری ہوئے۔ جن میں پروفیسر ہارون خان شروانی، حافظ مولانا ابو یوسف،

ای سی، جناب بھارت چند کھنہ، ڈائرکٹر اردو اکیڈمی شامل ہیں۔

۲۴ر اکتوبر: ریاستی وزیر آبپاشی جناب پی۔ گنگا ریڈی نے سلیمان خطیب کی وفات پر تعزیتی بیان میں بھرپور خراج عقیدت ادا کیا۔ آندھرا پردیش ملٹری اردو اسوسی ایشن نے قرار داد تعزیت منظور کی۔ مسٹر صلاح الدین نیر، سپیشل آفیسر ریاستی پنچایت راج، قادر جاوید اور بشیر انور نے خطیب کی شعری خدمات کو خراج عقیدت ادا کیا۔

● جناب آصف پاشاہ صدر اردو اکیڈمی نے تعزیتی بیان میں کہا ہے کہ خطیب کے اٹھ جانے سے دکنی زبان کا سہاگ ماند پڑ گیا ہے لیکن سلیمان خطیب دلوں میں رہ جانے والا شاعر ہے۔

۲۶ر اکتوبر: جناب یم باگا ریڈی ریاستی وزیر پنچایت راج نے کہا ہے کہ: مشہور شاعر سلیمان خطیب کے انتقال کو محض شعر و ادب کا ہی نہیں، بلکہ اردو زبان کے لئے ایک ناقابل فراموش سانحہ ہے۔ خطیب سے اپنے دیرینہ شخصی ملاقات کو تعزیتی بیان میں دہراتے ہوئے وزیر موصوف نے بھرپور خراج عقیدت ادا کیا۔

● ساؤتھ انڈیا اردو اکیڈمی نے قرار داد تعزیت منظور کی۔ جناب اکرام جاوید نے خطیب کی شخصیت اور ان کے فن پر اظہار خیال کیا۔

۲۷ر اکتوبر: شعبہ فارسی، عثمانیہ یونیورسٹی کی طرف سے "حافظ شیرازی" پر دو روزہ سمینار کا نائب صدر قونصل ایران جناب الہٰی نے افتتاح کیا اور کہا کہ حافظ عالمی شاعر تھے۔ ان کی شاعری خلوص و محبت کے نقوش سے روشن نظر آتی ہے۔ سمینار کے پہلے سیشن کی صدارت جسٹس شرف الدین احمد نے کی۔ ڈاکٹر رضیہ اکبر، ڈاکٹر شریف النساء، ڈاکٹر نعیم الدین (مرہٹواڑہ یونیورسٹی)، محمود سروش (بمبئی) اور یعقوب عمر (حیدرآباد) نے مقالے پڑھے۔

۲۸ر اکتوبر: حافظ پر سمینار کی دوسری نشست ڈاکٹر رضیہ اکبر صدر شعبہ فارسی شعبہ عثمانیہ یونیورسٹی کی، صدارت میں ہوئی۔ پروفیسر عالم خوندمیری، جناب اختر حسن، پروفیسر پرویز صلاح الدین اور ڈاکٹر محمد علی زیدی نے حافظ اور ہند ایران ادبی و ثقافتی تعلقات پر مقالے سنائے۔

۲۹ر اکتوبر: سلیمان خطیب کو اردو ہال میں منعقدہ تعزیتی جلسہ میں زبردست خراج عقیدت ادا کیا گیا۔ یہ جلسہ انجمن ترقی اردو، ادارہ ادبیات اردو، زندہ دلان حیدرآباد، اردو مجلس، انجمن ترقی پسند مصنفین، ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور ادارہ شگوفہ کی جانب سے جناب بھارت چند کھنہ، ڈائرکٹر اردو اکیڈمی، کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔ مسرز حبیب الرحمٰن، عابد علی خاں، ہاشم علی اختر، ڈاکٹر سری رام شرما، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، ڈاکٹر زینت ساجدہ اور عاتق شاہ نے مخاطب کیا۔ محترمہ بانو طاہرہ سعید، وقار خلیل، طالب خوندمیری، مصطفےٰ علی بیگ اور عزم نصاری نے منظوم خراج عقیدت ادا کیا۔ جناب صلاح الدین نیر معتمد اردو مجلس نے قرار داد تعزیت پیش کی۔

۳۰ر اکتوبر: حیدرآباد میونسپل کارپوریشن کے ایک ترجمان نے صحافت کو بتایا کہ بلدی انتخابات کے سلسلے میں پہلی بار اردو میں بھی فہرست رائے دہندگان شائع کی جا رہی ہے۔ ••

بانو طاہرہ سعید

کا دوسرا شعری مجموعہ

مہکتے ویرانے

قیمت: بارہ روپیے

ناشر: ادارہ ادبیات اردو
پنجہ گٹہ، حیدرآباد ۴۔
اے۔ پی۔

موضع کی مرکزی حیثیت و اہمیت

آج کے ہندوستان میں موضع اب بھی اپنی مرکزی حیثیت و اہمیت کو برقرار رکھے ہوئے ہے اور اس کی معیشت پوری قومی معیشت کی تشکیل میں کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔ اس لئے آندھرا پردیش میں زیادہ تاخیر کے بغیر بہتر مواصلاتی ذرائع کی مدد سے مواضعات کو مربوط کر دیا جانا چاہیئے۔

ریاست میں مواضعات کو سڑکوں کے ایک جال کے ذریعہ ملا دینے کی غرض کو پیش نظر رکھتے ہوئے ۷۹-۱۹۷۸ء کے موازنے میں ۱۱ کروڑ روپیوں کی معقول گنجائش فراہم کی گئی ہے۔

آندھرا پردیش روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن کی اپنی مساعی کے علاوہ نجی آپریٹروں کو بھی زائد راستوں کے ذریعہ آندھرا پردیش کے دور افتادہ مواضعات تک حمل و نقل کے انتظامات کے لئے ترغیبات پیش کی جارہی ہیں تاکہ ایسے مواضعات کے باشندے زیادہ سے زیادہ طور پر تہذیب و تمدن کی نعمتوں سے فیض یاب ہوسکیں۔

محکمۂ اطلاعات و تعلقاتِ عامہ
آندھرا پردیش۔ حیدرآباد

No 23/78-79/2380

اجراء ۱۹۳۸ء فون ۳۸۴۶۹

بیادگار
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد

مجلس مشاورت سب رس

صدر : پروفیسر سید علی اکبر
نائب صدر : محامد علی عباسی
اراکین : گوپی چند نارنگ
" : رمن راج سکسینہ
" : عابد علی خاں
" : محمد منظور احمد
" : محمد اکبر الدین صدیقی
" : سید ہاشم علی اختر
" : پروفیسر سراج الدین
معتمد : ڈاکٹر مغنی تبسم

مرتب : وقار خلیل

جلد : ۴۱
شمارہ : ۱۲
دسمبر ۱۹۷۸ء

زر سالانہ : ۱۵ روپے ششماہی : ۸ روپے
فی شمارہ : ایک روپیہ پچاس پیسے

بوعہ نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان حیدرآباد
مقام اشاعت : ادارہ ادبیات اردو پنجہ گٹہ حیدرآباد

ترتیب

اپنی بات

گزشتہ برسوں میں بعض دشواریوں کے باعث "سب رس" پابندی کے ساتھ شائع نہیں ہوسکا تھا۔ چند مہینوں کا مشترکہ شمارہ شائع کرکے اس کی پابندی اشاعت کو بحال کیا جاسکتا تھا لیکن محض اس خیال سے کہ 'سب رس' کے خریداروں کو سال میں بارہ شمارے ملنے چاہئیں۔ مشترکہ شمارے کی اشاعت سے گریز کیا گیا۔ اب صورتحال یہ ہے کہ 'سب رس' پابندی کے ساتھ شائع ہوتا ہے لیکن اس طرح کہ ہر شمارے پر چار ماہ قبل کی تاریخ دی جاتی ہے تاکہ فائل مکمل رہے۔ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ ہر ماہ ایک زائد شمارہ چھاپ کر آئندہ دو چار ماہ میں اس فصل کو دور کردیں۔ اس کے بعد ہر شمارہ مقررہ مہینے کے اوائل میں شائع ہوسکے گا۔

اشاعت کی پابندی کے ساتھ ہم "سب رس" کے معیار کو بہتر بنانے اور اس کی دلچسپی میں اضافہ کرنے کی طرف بھی توجہ کر رہے ہیں۔ شعر و ادب کے علاوہ علمی موضوعات پر مضامین کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا ہے۔ اردو جاننے والے دانشوروں اور اساتذہ سے ہم بطور خاص گزارش کرتے ہیں کہ وہ اس سلسلہ کو جاری رکھنے میں "ادارہ سب رس" کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اپنے قلمی معاونین اور قارئین سے ہماری درخواست ہے کہ وہ اپنے تاثرات اور مشوروں سے ہمیں آگاہ فرمائیں تاکہ ہم اپنی کوتاہیوں کو دور کرتے ہوئے رسالہ زیادہ مفید اور دلچسپ بنا سکیں۔

مغنی تبسم

شیریں شاہین

متنی تنقید اور تصحیحِ متن

اردو میں متنی تنقید اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک خاص اور منفرد اہمیت کی حامل ہے۔ جستجوئے حقیقت و صداقت اس تنقید کا منشائے خاص ہے۔ متنی تنقید تحقیق و تدوین سے قریب تر ایک عملی فن ہے۔ جہاں کوئی تصنیف بغیر چھان بین اور تحقیق کے معتبر اور مستند قرار نہیں دی جاسکتی، جس طرح کسی ادیب کے فکر و فن اور ذہنی صلاحیتوں کا جائزہ، اس کے کلام کی وسعت و گہرائی اور اس میں مختلف النوع رنگوں کی تلاش کے بغیر مکمل نہیں ہوتا اسی طرح اس کے حالات، اس کے سوانح، اس کے کلام سے دوسرے تاریخی اور سماجی رشتوں کا علاقہ اور دورِ ماقبل و مابعد کے صحیح ادراک کے بغیر اس کی شخصیت اور کلام کی تصویر مکمل نہیں ہوگی۔ اس تصویر کو مکمل کر کے صحیح صورت میں پیش کرنا متنی نقاد کا کام ہے۔ اگرچہ کلاسیکی اور ادبی تنقید سے اس کا براہِ راست کوئی تعلق نہیں، لیکن پھر بھی اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ کوئی بھی تنقید تحقیق کی روشنی میں راہ طے کیے بغیر کسی بھی ادب کے صحیح اور واقعی مقام تک رسائی حاصل نہیں کی جاسکتی۔ بقول ڈاکٹر گیان چند "تحقیق کی دستگیری کے بغیر تنقید منزل تک نہیں پہونچ سکتی۔ تنقید میں نہ صرف ادب پارے سے بحث ہوتی ہے بلکہ اس کے خالق کے سماجی و معاشی ماحول، اس پر اثر انداز ہونے والے گوناگوں عوامل، اس کے ذہنی ارتقاء کی بھی کھوج لگائی جاتی ہے، ان پہلوؤں کو تحقیق ہی ادا کرسکتی ہے"

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ ادبی تاریخ انسانی ذہن کے ارتقا و تنزل کی تاریخ ہے۔ مغربی مبصرین نے ادب کو قوموں کی روح کی خود نوشت سوانح حیات سے تعبیر کیا ہے۔ کوئی بھی ادب نہ صرف اپنے خالق کے ذہن و فکر کی عکاسی کرتا ہے بلکہ زمانۂ خالق کے انسانی ذہن و جذبات کا سمت اور دلچسپی، سیاسی و معاشرتی حالات، اور سماج کے عروج و زوال سے ذہنِ انسانی پر ہونے والے اثرات کی بھی بھرپور ترجمانی کرتا ہے۔ گویا ادب انسانوں کی ایسی بولتی ہوئی تاریخ ہے جس کے زمرے میں وقت، حالات، تہذیب و کلچر کی تمام روحیں سمٹ آتی ہیں جو آپس میں مل کر ایک مخصوص آواز کی شکل اختیار کرلیتی ہے۔ جسے ہم عصری آواز کہتے ہیں۔ یہ عصری آواز دنیا کے ہر ادب میں پوشیدہ ہوتی ہے، یہی وہ آواز ہے جو کسی ادبی محقق کے لئے بہت اہمیت رکھتی ہے۔ کیونکہ اپنی اسی آواز کی بنا پر ادب نہ صرف اپنے ماقبل کی آوازوں میں بلکہ مابعد کی آوازوں میں بھی پہچانا جاتا ہے۔ ادب کی اسی آواز کے ذریعہ ادبی محقق حقائق کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے امتدادِ زمانہ، حالات کی ستم ظریفی، عصری چشمک، رشک، رقابت، مروت و رواداری اور مفروضات و مغالطے کے سبب اصل حقیقت پر دبیز پردے پڑ جاتے ہیں۔ لہٰذا ان پردوں کو ہٹا کر اصل حقیقت کی بازیافت کرنا متنی نقاد کا کام ہے جو اپنی جگہ نہایت اہم ہے۔ حقائق اور اصلیت

ـتہ ہو جانے کے بعد ہی تنقیح ہو جانے کے بعد ہی تنقید کی منزل آتی ہے۔ محقق کے متعین کردہ واقعات و حالات کی روشنی میں تنقید م اٹھاتی ہے۔ تنقید اور خاص کر تاریخی تنقید نے تحقیق کی اہمیت اور بڑھا دی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی اہمیت کو ابھی صحیح طور سے سمجھا ہے جس کا سبب غالباً یہ ہے کہ ابھی تک نقادوں کے ذہن میں اس کے اصول و قواعد کا کوئی واضح تصور موجود نہیں اور جس کے لئے بقول مار اللہ "ترتیب" کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے جو متنی تنقید کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ "ترتیب" کی اصطلاح کے مطابق عام طور پر ہوتا یہ ہے جی قدیم متن کو اس طرح مرتب کرتے ہیں کہ اس میں اپنے نظریات و مفروضات شامل کر دیتے ہیں اور جب متن ان کے نظریات و ت کی معیار پر پوری اترتی ہے تو اسے مکمل ترتیب کی شکل دے دی جاتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم اصل متن سے دور ہو جاتے س کے علاوہ صحتِ متن کے زوال کے ساتھ ساتھ اس کی صحیح ادبی و تاریخی خصوصیت بھی مجروح ہو جاتی ہے۔ املا و تلفظ کی تحریف و زمانۂ تصنیف کا صحیح تعین کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی مصنف کی انفرادیت اور متن کی لسانی حیثیت بھی متاثر ہو جاتی ہے۔ م ہوتا ہے کہ کسی TEXT کی ایڈیٹنگ سے قبل ہم متنی تنقید کے اصل مفہوم کو سمجھ لیں اور ان تمام اصولوں و قواعد سے واقفیت کر لیں جو متنی کے ذیل میں آتے ہیں۔

"کسی متن کو اس کی حقیقی صورت میں دوبارہ پیش کرنے کے فن کو متنی تنقید کہتے ہیں"، حقیقی صورت سے مراد وہ صورت ہے جسے ان حالات میں پیش کرنا متن کے مصنف کا منشائے خاص تھا۔ چنانچہ اس فن کے لئے تدوین کی اصطلاح مناسب تر معلوم ہوتی ہے۔ ق انجم نے اس کے لئے انگریزی اصطلاح TEXTUAL CRITICISM کا اردو ترجمہ متنی تنقید کی صورت میں پیش کیا ہے۔

'متن' کی تعریف میں اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ وہ ہر مطبوعہ یا غیر مطبوعہ تحریر جسے کوئی متنی نقاد مرتب کرنا چاہتا ہے متن کہلائے گی خواہ ید ہو یا قدیم۔ نظم ہو یا نثر، طویل ہو یا مختصر سب متن ہوگی۔

ادبی تنقید کی طرح متنی تنقید کے بھی چند ضابطے اور سائنٹفک اصول ہیں جن کے پیش نظر کسی متن کو جانچا اور پرکھا جاتا ہے۔ فرق کہ ادبی نقاد کسی ادب پارے کو اس کے بندھے ٹکے اصولوں کے ساتھ ساتھ اپنے ذوقِ سلیم کے پیمانے میں بھی ناپتے ہیں اور پھر اس کے بڑے یا معمولی ہونے کا فیصلہ صادر کرتے ہیں۔ لیکن متنی نقاد کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ اپنی تحقیق و تنقید اور شعور و فہم کی روشنی میں کھرے کی پرکھ کے ساتھ اصل متن کی بازیافت کرے، وہ قطعی اس بات کا مجاز نہیں کہ اپنے ذوقِ طبع کے معیار پر بھی متن کو جانچے اور اس کے معیاری یا ہونے کا فیصلہ کرے۔ خواہ متن اچھا ہو یا برا، تحقیق کا کام صرف اصل کی بازیافت ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ فنِ تحقیق کا دائرہ محدود ہے بلکہ تدوین کی اصطلاح کے مطابق بقول شخصے یہ اپنے اندر "بقدرِ شوق" وسعتوں کا اضافہ کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ اس میں ـنی کی روشنی صداقت کی جستجو اور ایک علم دوست کی لگن موجود ہوتی ہے۔ ادب کا وہ محقق جسے خوب سے خوب تر کی تلاش ہوتی ہے، وہ منہ ور طریقوں کو کام میں لاکر اور بہتر صورتیں پیدا کرنے کی بھی کوشش کرتا ہے۔ زمانہ کی چیرہ دستیوں، کاتب کی غلطیوں یا جان بوجھ کر ملت کے تحت اصل سے چشم پوشی کے سبب متن جو غلطیاں پیدا ہو جاتی ہیں انھیں صحیح حالت میں دوبارہ پیش کرنا متنی نقاد کا فرض ہے، مثلاً محمد حسین آزاد نے جو دیوانِ ذوق ایڈٹ کیا ہے اس میں ان اشعار کی صورت یہ ہے:

۱۔ خط دیکھ کر وہ آئے بہت پیچ و تاب میں　　کیا جانے کیا لکھ گیا انھیں اضطراب میں

۲۔ ابر کیا آنسو بہانا کوئی ہم سے سیکھ جائے　　برق کیا ہے تلملانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

۳ . گل بسا کچھ تو بہار میں اے صبا دکھلا گئے — حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

یہی اشعار دیوانِ ذوق کے قدیم ایڈیشنوں میں اس طرح ملتے ہیں :

۱ . خط پڑھ کر اور بھی وہ ہوا پیچ و تاب میں — کیا جانے کیا لکھ گیا اسے اضطراب میں

۲ . ابرِ تر آنسو بہانا کوئی ہم سے سیکھ جائے — برقِ مضطر تلملانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

۳ . کھل کے گل کچھ تو بہار اپنی صبا دکھلا گئے — حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

اس طرح کی معمولی تبدیلیاں شعر کے مفہوم کو بھی بدل دیتی ہیں . یہاں متنی نقاد کا کام یہ ہے کہ ان اشعار میں شاعر کا اصل کلام کونسا ہے . یہ سب یں انتہائی تحقیق و چھان بین اور دلیل و شہادت کے ساتھ مدون کو پیش کرنا ہوتی ہیں .

ظاہر ہے ایسی صورت میں متنی نقاد کی ذمہ داریاں بہت بڑھ جاتی ہیں لہذا اسے ہر قدم سوچ کر، پھونک پھونک کر اٹھانا ہوگا . مدون کو یہ بھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ انسان میں سچ بولنے کی عادت کم ہوتی ہے . اور ہر انسان بہرحال انسان ہے، اس سے غلطیاں بھی ہو سکتی ہیں . لہذا یہ ضروری نہیں کہ جو متن اس کے پیش نظر ہے وہ عین منشائے مصنف کے مطابق ہی ہو . لہذا اسے ہر چیز کو شک و شبہ کی نظروں سے دیکھنا ہوتا ہے . بقول گیان چند :

" وہ ایسا سنار ہے کہ چمک دار کندن کو بھی کسوٹی پر رگڑے بغیر کبھی ایمان نہیں لاتا "

بعض اوقات محقق ایکسرے (x-ray) کی نظریں ڈال کر ان واقعات کی تہوں سے حقائق کو ڈھونڈ نکالتا ہے . جس پر دوستی و مروت و کذب، اور تاریخ کی گرد جم جاتی ہے . بہرکیف یہ ایک نہایت ہی صبر آزما، محنت طلب کام ہے جس کے لئے علم کی بصیرت، ذہن کی شائستگی مزاج کا اعتدال اور طبیعت کا استقلال لازم ہے . مدون کو بیک وقت ناقد، محقق، مفسر کے فرائض بھی انجام دینے ہوتے ہیں . اس کے بغیر کوئی نقاد صحیح طور پر تدوین کے فرائض سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا . شعر کے مفہوم کو سمجھ لینا اس کے لئے ضروری ہوتا ہے . اسے اپنا تنقیدی شعور بھی بیدار رکھنا چاہیئے . تاکہ اس کا علم تو ہو سکے کہ کسی درجۂ سوم کے شاعر کو کسی بلند پایہ شاعر کا ہم پلہ تو قرار نہیں دیا جا رہا . اس کے علاوہ اسے ادبی مورخ کی طرح تلفظ و املا سے متعلق عہد بہ عہد جانکاری لازم نہ سہی لیکن یہ جاننا بے حد ضروری ہے کہ وہ جس مصنف کی تحریر مدون کر رہا اس وقت اس کا تلفظ و املا کیا تھا؟ . مصنف کی تحریر سے اگر دستیاب ہے تو واقف ہونا ضروری ہے . تاکہ اسے یہ بخوبی معلوم ہو سکے کہ متن میں کی گئی ہے اور الحاقی تحریر کتنی ہے . ان امور کے مدنظر محقق کے لئے ایک خاص مزاج کا ہونا بہت ضروری ہے جس میں ایمانداری و دیانت داری کے ساتھ صبر و ہمت کا جذبہ بدرجہ اتم موجود ہو . قاضی عبدالودود صاحب کا قول ہے "تحقیق وہی کر سکتا ہے جسے سوائے کھانے اور تحقیق کرنے کے دوسرا کام نہ ہو" . عرشی صاحب کا کہنا ہے کہ "تحقیق بڈھوں کا کام ہے" . مختصر یہ کہ یہ نہایت ہی دماغ سوزی اور دیدہ ریزی کا کام ہے جہاں کان کنی کے بعد ہی گوہرِ مقصود ہاتھ آتا ہے اور اس کے حاصل ہونے کی بھی صرف امید کی جا سکتی ہے یقین نہیں .

تدوین کے سلسلے میں سب سے پہلے مواد کی فراہمی کا مسئلہ آتا ہے یہ مسئلہ نہایت ہی کٹھن ہوتا ہے . تدوین کے کاموں کا آدھا انحصار مواد کی فراہمی پر ہے . کسی نے مواد کی تلاش جوئے شیر لانے کے مترادف ہے . سب سے پہلے یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ اس موضوع سے متعلق کیا کیا دستیاب ہے اور کہاں ہے؟ اسے کس طرح فراہم کیا جا سکتا ہے؟ اس کے لئے لائبریریوں سے مدد لی جا سکتی ہے، دوسرے شہر اور ملک کی عمومی لائبریریوں اور پھر لوگوں کے ذاتی کتب خانوں سے بھی مدد مل سکتی ہے . ہندوستان میں پریس کی مدت حیات اتنی کم ہے کہ بہت سارے

ماہم قلمی مخطوطے نوابوں اور امرا کے ذاتی کتب خانوں کے اندر ہی پوشیدہ رہ گئے ہیں ۔ بہت سی نئی چیزیں ان مخطوطوں
تا ہیں ۔ لہٰذا لائبریریوں کے علاوہ محقق کو رئیسوں کے کتب خانوں تک بھی رسائی حاصل کرنا چاہیئے ۔

جس مصنف یا شاعر پر وہ کام کر رہا ہے نہ صرف اس کے حالاتِ زندگی بلکہ اس عہد کی سیاسی و معاشرتی تاریخ اور ادب کے
ں پوری پوری جانکاری حاصل ہونی چاہیئے ۔ اس عہد کی زبان پر پورا عبور ...صل ہونا چاہیئے ۔ اور جہاں تک ہو سکے مصنف کے
و ذکر کرنے کی کوشش کرنا چاہیئے ۔ معاصرین کی تصانیف کا مطالعہ بھی ضروری ہے خواہ وہ مطبوعہ ہو یا غیر مطبوعہ ۔ اور اگر مصنف
ستاویز ہو یا خود مصنف کے ہاتھ کی دستاویز ہے اس کا مطالعہ بھی لازم ہے ۔ مصنف کے خود نوشت نسخے ، روزنامچے ،
طوط اور خود نوشت سوانح حیات ، اس کے خاندان یا دوستوں اور شاگردوں سے متعلق یادداشتیں وغیرہ ملیں تو سبھی کو نگاہ
ت مناسب ..تا ہے ۔ اگر مصنف صوفی تھا تو اس عہد کا صوفی ادب اور اگر سیاسی آدمی تھا تو اس عہد کے سیاسی حالات وغیرہ
ت حاصل کرنا چاہیئے ۔ اس سے مصنف کے ذہن کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے ۔ اس کے علاوہ وہ کتابیں بھی دیکھ لینا چاہئیں جو کبھی
مطالعہ رہی ہوں ۔ کیونکہ بعض اوقات مصنف اس کے حاشیہ پر بھی تحریر کر دیتا ہے جس سے ذہنِ مصنف کو سمجھنے میں قدرے
۔ اس طرح تمام مواد و حقائق اکٹھے کر لینے کے بعد تصدیق و تصحیح متن کی منزل آتی ہے ۔

مصنف کے حاصل شدہ مختلف مخطوطوں میں سے کسی ایک کا تعین کرنا ، پھر قرات کی غلطیاں اور تصرف و تحریف کو مدلل
ت کرنا اور کسی مصنف کے کلام میں الحاقی و محذوف کلام کے سلسلے میں مزید چھان بین کر کے اصل حقائق کو منظرِ عام پر
حیح متن ہے ۔

ب و تصحیح کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اگر متن کے دو نسخے ملتے ہیں تو ایسی صورت میں ایک کو بنیادی نسخہ بنا کر اسے ہو بہو نقل کر لیں گے
نسخے سے مقابلہ کر کے اختلافات کی حاشیہ پر نشاندہی کر دیں گے اس طرح بھی متن تیار ہو جاتا ہے ۔ لیکن یہ طریقۂ کار کچھ زیادہ
بلکہ اس میں بہت ساری غلطیوں کے امکانات رہ جاتے ہیں جو ظاہر ہے تحقیق و تدوین کے تقاضے کو پورا نہیں کرتے ۔

طریقۂ کار یہ ہے کہ ہم جس متن کو مدون کرنا چاہتے ہیں اس کے جتنے نسخے ہیں سب کا مقابلہ و موازنہ کر کے ہم ان میں سے اس
کریں جو متن کی بہتر صورت ہو سکتی ہو ۔ بہتر صورت سے مراد وہ متن جو اس کے عہدِ تصنیف میں مصنف ان مخصوص علمی ادبی
حالات میں پیش کرنا چاہتا تھا یا پیش کر سکتا تھا ۔ ایسی صورت میں زمانۂ تصنیف کے بعد اصلاح بھی (جو خود مصنف نے کی ہو)
ئے گی اور نہ بہترین متن میں شامل کی جائیگی ۔ یہ اور بات ہے کہ بعد کی اصلاح حاشیہ میں درج کر دی جائے —
ت میں ہمیشہ تبدیلی آتی رہتی ہے ۔ ممکن ہے جو خیالات ابتدائی زمانہ میں رہے ہوں کچھ عرصہ بعد ان میں تبدیلی آ جائے ، یا جو
ل کئے ہوں ان میں سے بعض متروک ہو گئے ہوں ۔

نسخہ کے تعین میں خاصی سوجھ بوجھ سے کام لینا ہوتا ہے ۔ اگر ہمیں دو مخطوطے دستیاب ہوتے تو ہم ان میں سے اس
جو اصل متن کے قریب تر ہوگا ۔ عام طور سے لوگ اس نسخہ کو صحیح قرار دیتے ہیں جو قدیم ہوتا ہے لیکن یہ نظریہ کچھ زیادہ
لئے کہ متنی نقاد کو شائد ہی صحیح طور سے یہ معلوم ہو کہ اصل مخطوطے اور اس دستیاب شدہ نسخے کے درمیان کتنے نقل در نقل
تانچہ یہ جاننے کے لئے کہ کون سا نسخہ اصل متن سے قریب تر ہے اس تیاری کے پس منظر میں پرکھنا ہوگا جو فراہمی مواد کے

سلسلے میں بیان کی جا چکی ہیں ۔ اس میں سہی مصنف کے ہم عصر، اس کی دوسری تصانیف اور اس کے عہد کی یا خود اس کی دستاویز کی معلومات حاصل کرنا لازم ہے ۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ ہم ان دستاویزات میں پیش کردہ واقعات کو بلا چوں و چرا تسلیم کرلیں ۔ ممکن ہے کہ اس میں بھی غلط بیانی سے کام لیا گیا ہو ۔

اور اگر کہیں متن کا صرف ایک ہی نسخہ ملتا ہے تو ایسی حالت میں مقابلے کی کوئی صورت نہیں رہ جاتی ۔ صرف ان تیاریوں کی روشنی میں غلط قراتوں کی تصحیح کرنی ہوگی ۔ اگر کہیں ایک ایسا نسخہ ملے جو مصنف کے ہی ہاتھ کا لکھا ہوا ہے تو یقیناً یہ پہلے نسخہ سے بہتر ہوگا مگر تصحیح کی گنجائش اس میں بھی ہوگی ، کیونکہ ممکن ہی نہیں کہ مصنف سے کوئی لغزش نہ ہوئی ہو ۔ لہذا اس تصحیح کے لئے بھی ماخذ کی تحقیق کرنی ہوگی ۔

اگر کہیں مختلف عہد کے بہت سے مخطوطے دستیاب ہوتے ہیں تو ان کے خاندان مرتب کرکے کسی ایک کو بنیاد بنانا ہوگا ۔ مثلاً نسخہ "الف" نسخہ "ب" سے نقل ہوا ہے اور "ب" "ن" کی نقل ہے ، تو یہ سب ایک خاندان کے کہلائیں گے ۔ اب یہ جاننے کے لئے کہ یہ واقعی ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں ، یہ بات ذہن نشین کرلینی چاہیئے کہ اگر "ن" کے کاتب نے قرات میں کہیں غلطی کی ہے یا کچھ حذف کیا ہے تو یقیناً 'الف' اور 'ب' میں بھی یہی غلطیاں ہوں گی ۔ لہذا اس طرح خاندان کی شناخت ہو جاتی ہے ۔ اس کے علاوہ مقامی الفاظ و املائی خصوصیات بھی کاتب نقل میں شامل کردیتا ہے چنانچہ جن جن نسخوں میں یکساں مقامی اثرات نظر آئیں گے وہ ایک خاندان کے کہلائیں گے ، اسی طرح اگر دو تین خاندان مرتب ہو جاتے ہیں اور ہر خاندان میں چار چار نسخے ہیں تو ان چاروں کے موازنے کے ذریعہ ہر خاندان کا ایک بنیادی نسخہ بنے گا آخر میں ان بنیادی نسخوں کا موازنہ کرکے کسی ایک کو جو مصنف کے متن سے قریب معلوم ہو بنیادی نسخہ بنا لینا چاہیئے ۔ بنیادی نسخہ بنانے اور موازنے سے اختلافات نسخ کے اظہار میں آسانی ہو جاتی ہے ۔

تصحیح متن کے ضمن میں جہاں تک اختلاف نسخ کا تعلق ہے وہاں اخذ و ترک کا عمل متنی نقاد کے تنقیدی شعور اور اس کی فہم و فراست پر منحصر ہے ۔ امتداد زمانہ ، حالات کی ستم ظریفی اور کتب خانوں کی طرف سے لاپرواہی قیمتی اور نایاب نسخوں کو بہت نقصان پہنچا دیتی ہے ۔ کیڑے کے چاٹ جانے کے سبب یا نم و مرطوب جگہ میں نسخہ رکھے جانے کے باعث بہت سے حرف آپس میں خلط ملط ہو جاتے ہیں ۔ بعض حصے گل کر ختم ہو جاتے ہیں اور کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ نسخہ کے ابتدائی صفحے ضائع ہو جاتے ہیں اور کبھی آخر کے صفحے برباد ہو جاتے ہیں ۔ اول الذکر کو ناقص اول اور آخر والے کو ناقص الآخر کہتے ہیں ؛ لہذا اس کی اصلاح و درستگی کے واسطے یہ ضروری ہے کہ نقاد مصنف کے فکر و شعور کو اس حد تک سمجھ لے کہ صرف اس بصیرت کے سہارے وہ یہ فیصلہ کرسکے کہ مصنف نے کونسی صورت کو وجود بخشا تھا ۔ اس کے لئے وسعت علم و نظر نہایت ضروری ہے ۔

دو متنوں کا موازنہ کرتے وقت متنی نقاد کو اکثر مختلف قراتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔ جو کئی اسباب سے شعوری یا غیر شعوری طور پر وجود میں آئی ہیں ۔ یہ غلطیاں زیادہ تر کاتب کی بدخطی ، غلط نویسی ، کم سوادی اور نافہمی کی بناء پر سرزد ہوتی ہیں ۔ ان میں سے بعض تو سرے سے پڑھے نہیں جاتے اور اگر پڑھنا ممکن ہو تو مطلب موقع محل کے اعتبار سے واضح نہیں ہوتا ۔ اور عبارت کو صحیح طور سے سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے ۔ یہ تمام غلطیاں نادانستہ طور پر ہوتی ہیں جن کی مثالیں ذیل میں دی جاتی ہے ۔

اردو میں ایسے الفاظ بکثرت ملتے ہیں جو اپنے ابتدائی خد و خال میں ایک دوسرے سے کافی ملتے جلتے ہیں ۔ ایسے الفاظ نقل کرتے وقت کاتب غلطیاں کر جاتے ہیں ۔ مثلاً تعطیل ۔ تعلیل ۔

بعض الفاظ اپنے آخری حرف یا جز کے اعتبار سے ایک دوسرے سے کافی ملتے جلتے ہیں ۔ ایسے الفاظ بھی پڑھتے اور نقل کرتے وقت
لطیاں کر جاتے ہیں مثلاً سمت، لعنت، قائل، قابل وغیرہ ایسی غلطیاں اگر کسی کلام میں سرزد ہو جائیں تو اس کا معنی و مفہوم بگڑ جاتا ہے،
ا ہوتا ہے کہ کتابت کرتے وقت غلطی سے دو لفظوں کا درمیانی بُعد اس طرح کم ہو جاتا ہے کہ وہ ایک ہی لفظ معلوم ہونے لگتا ہے ۔
لے زیب' جو واصل پائے ۔ زیب ہے ۔ ص

پڑی موتیوں کی فقط پائے زیب   کہ دیکھے سے جس کو گہر پائے زیب

دو لفظ ہیں لیکن اس کا درمیانی فاصلہ کم کر دیا جائے تو یہ "جوان" پڑھا جا سکتا ہے ۔ "شور کا بیان" کو "شورکابیاں" بھی پڑھ
یا ۔ "پرِ" "وا" "نہ کر" الگ الگ لفظ ہیں لیکن اس کو "پروانہ کر" بھی پڑھا جا سکتا ہے ۔
اسی طرح ایک لفظ کے دو جز کا فاصلہ اگر کتابت میں زیادہ ہو جائے تو غلطی ہو سکتی ہے ۔ مثلاً "جو بن گیا" کی جگہ "جو" "بن گیا" یا
کی جگہ "جو" "اب" وغیرہ ۔
کبھی نقطے اور شوشوں کے ادھر ادھر ہو جانے سے بھی لفظ بدل جاتا ہے مثلاً "خط اور حظ" نعت اور لغت" مخطوطہ اور محظوظہ یا
ور تقریر' وار اور دار وغیرہ بے شمار اس طرح کے الفاظ مل جائیں گے جن کے نقطوں یا شوشوں کے ذرا سے آگے پیچھے ہونے کے سبب
یہ کا کچھ ہو جائے گا ۔

اردو میں زیر زبر کے سبب بھی بڑی بڑی غلطیاں ہو جاتی ہیں ۔ مثلاً دِل ٹوٹ گیا' اگر 'د' پر بجائے زیر کے زبر لگا دیا جائے تو لفظ
ی گروہ بن جاتا ہے ۔ یہ سب کتابت کی ایسی غلطیاں ہیں جسے درست کرنے کا مدون مجاز ہوتا ہے ۔ اس کے بعد کچھ ایسی غلطیاں
بحث آتی ہیں جس کی تصحیح کے لئے چند علامتوں کا استعمال ناگزیر ہے ۔ مثلاً اکثر شہروں اور جگہوں کے نام اتنے غیر مانوس اور اجنبی
تے ہیں کہ کاتب اسے پڑھنے اور لکھنے میں غلطی کر جاتے ہیں ۔

کسی متن میں سن یا اعداد و شمار کے نقل کرنے میں بھی غلطیاں ہو جاتی ہیں ۔ اس کے علاوہ کسی شخص کے نام کے نقل کرنے میں بھی غلطی ہو سکتی
۔ نام کے اوپر خط نہ ہو اور عام عبارت کی طرح لکھا ہو تو خاص غلطی ہونے کا امکان ہو سکتا ہے یا پھر اس صفت پر جو بظاہر نام بھی معلوم
کم پڑھا لکھا کاتب اسے نام سمجھ کر اس پر خط ڈال دیتا ہے ۔ مثلاً

بنو گے خسروِ اقلیم دل شیریں زباں ہو کر   جہانگیری کرے گی یہ ادا نور جہاں ہو کر

ہے کہ یہاں ایہام کے طور پر یہ صفت جو بظاہر نام بھی ہیں' استعمال ہوئی ہیں ۔ لیکن اگر کاتب ایہام اور شاعری کے اصول و قواعد سے
ہے تو وہ اسے تاریخی نام سمجھ کر اس پر بھی خط ڈال سکتا ہے ۔ متنی نقاد کے لئے کاتب کی ایسی ہی غلطیاں اکثر پریشان کن ثابت ہوتی
لہذا اسے اپنے عقل و شعور اور سیاق و سباق کے حوالے سے صحیح کرنے کا حق حاصل ہے ۔ لیکن یاد رہے کہ اس کے پاس اس کے دلائل بھی ہونے
۔ ایسی اصلاحات کے لئے چند علامتیں مقرر کر دی گئی ہیں ۔ مثلاً اگر کوئی لفظ یا فقرہ کتابت میں چھوٹ گیا ہے اور مدون غلطی کو محسوس
ہے تو یہاں پر قوسین بنا دینا مناسب ہے ۔ اور اگر مدون قیاس کرے کہ یہاں پر کون سا لفظ یا فقرہ ہونا چاہیئے تو اسے قوسین کے اندر
ے ۔ گویا یہ اس بات کی علامت ہے کہ یہاں کوئی لفظ یا فقرہ چھوٹ گیا تھا ۔ اگر کوئی لفظ پڑھا جا سکتا ہے مگر مفہوم دور از فہم ہے تو وہاں پر
بنا کر اس میں سوالیہ نشان ڈال دینا چاہیئے ۔ اور اگر کوئی لفظ یا تحریر موجود ہے مگر واضح نہیں ہو رہا ہے کہ کیا ہے تو ایسی صورت میں

کو من و عن اسی طرح نقل کر کے وہاں پر قوسین میں (کذا) لکھ دینا مناسب ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ جو لفظ تھا اسی طرح لکھ دیا
معلوم نہیں کیا ہے۔ تاکہ ممکن ہے کوئی دوسرا محقق اسے پڑھنے میں کامیاب ہو جائے
متن میں صرف نادانستہ طور پر غلطیاں سرزد ہوتی ہیں بلکہ دانستہ طور پر بھی عمل میں آتی ہیں ۔

زبان و املا کی حالت ہمیشہ یکساں نہیں رہتی ۔ چونکہ زبان ایک زندہ شے ہے لہذا اس کے اندر ارتقائی قوت پوری طور پر موجود ہے
لفظ و املا کے اعتبار سے اقتضائے حال، علاقائی اثرات کے مطابق ہمیشہ بدلتی رہتی ہے ۔ خصوصاً اردو زبان و املا کی حالت ایک مدت
کی کیفیت میں رہی ہے ۔ اس لئے مدون کو الفاظ و املا کے جدید و قدیم املائی تغیرات کا علم ہونا چاہیئے ۔ اور یہ بھی معلوم ہونا
جس شخص کا متن مرتب کر رہا ہے اس کا طرزِ عمل کیا تھا ۔ یا اس کے عہد کے دوسرے اشخاص کے ہاں اس کی کیا صورت پائی جاتی تھی۔
املا کی مثال غالب کے ہاں "ذ" کے سلسلے میں ملتی ہے ۔ وہ فارسی اصول و قواعد کے تحت "ذ" کی بہ نسبت ہر جگہ "ز" کا استعمال زیادہ
کرتے ہیں ۔ اس لئے اگر وہ کوئی لفظ "ذ" کی بجائے "ز" سے لکھتے ہیں تو ہم اس کی تصحیح کر کے "ذ" نہیں کر سکتے کیونکہ یہ اُن
انفرادی خصوصیت ہے جسے بہر حال محفوظ رکھنے کی کوشش کرنی چاہیئے ۔ متنی تنقید کے اصول سے ناواقف کاتب اکثر اسے تصحیح کر نے
دیتے ہیں جس پر مدون کو توجہ کرنے کی ضرورت ہے ۔

قدیم نسخہ کو نقل کرتے وقت کاتب قدیم الفاظ کی جگہ جدید اور مروج لفظ شامل کر دیتے ہیں ۔ مثلاً پہلے "رنڈی" کا لفظ بمعنی عورت
لیکن اب چونکہ "رنڈی" کا مفہوم بمعنی طوائف لیا جاتا ہے اس لئے ممکن ہے کاتب رنڈی کو حذف کر کے اس کی جگہ "عورت"
ہے ۔

کسی پرانے مخطوطے میں بعض الفاظ ایسے بھی ہیں جو زمانۂ حال کے خلاف قدیم عہد میں مذکر کی صورت میں استعمال ہوئے ہیں ۔
وہ مونث کی صورت میں استعمال ہوتے ہیں ۔ اکثر کاتب اسے رائج الوقت کے مطابق مونث میں بدل دیتے ہیں ۔ "کربل تھا"
جان، سوگند، اور غرض وغیرہ مذکر کے طور پر استعمال ہوئے ہیں اگر کاتب اسے بدل کر مونث کر دے تو اس سے لسانیاتی
متاثر ہوتی ہے لہذا متنی نقاد کا کام ہے کہ اس کے متعلق چھان بین کر کے پتہ چلائے ۔
اسی طرح کسی قدیم مخطوطے کی نقل کرتے وقت ایسے بہت سے الفاظ جو اب متروک قرار پا چکے ہیں اس کی جگہ کاتب رائج
پیش کر دیتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ متن کی صورت بگڑنے کے ساتھ ساتھ اس کی شعری خوبیاں بھی مسخ ہو جاتی ہیں ۔ مثلاً
، سوں وغیرہ جس کی جدید مروج صورت "سے" ہے ۔ انسان کا ایک شعر ہے ؎

سودا خیالِ خام کا سرسوں گذر گیا تل باندھتے تھے جس میں وہ کھلی نہیں رہی

لفظ "سرسوں" جو ایہام کے طور پر بہ رعایت "تل" کے بھی استعمال ہوا ہے لیکن اگر اسے "سر سے" لکھ دیا جائے تو اس کی
بھی مسخ ہو سکتی ہے ۔ انسان کے اسی شعر کو دیوانِ انسان کے مطبع دو لکم میں مرتب نے اس طرح لکھ دیا تھا کہ ؎

سودا خیالِ خام کا سر سے گذر گیا تل باندھتے تھے جس میں وہ کھلی نہیں رہی

انسان کے دور میں ایہام گوئی کا بہت رواج تھا ۔ لہذا قاضی عبدالودود صاحب نے اس کی تصحیح کر کے "سرسوں" کر دیا اور "سر سے"
کی غلطی مانا ۔ اس کے علاوہ پہلے اعراب کی جگہ واؤ معدولہ اور ی استعمال کیا جاتا تھا ۔ مثلاً اُوس، اُون وغیرہ جو اب متروک

، یہ تمام غلطیاں ایسے کاتب سے سرزد ہوتی ہیں جو کم پڑھے لکھے ہوتے ہیں، ظاہر ہے ایسی غلطیاں وہ پڑھنے والے کی سہولت
ہے جس میں کوئی بے ایمانی کی نیت نہیں ہوتی ۔ کبھی کاتب جان بوجھ کر کلمات حذف کر جاتا ہے جس سے عبارت ناتمام
اگر محذوف کلمہ کی جگہ نقطے پڑے ہوں تو متنی نقاد سیاق و سباق کے حوالے سے اصل متن تک پہونچ سکتا ہے ۔ مگر جب اس میں کاتب
۔ لاکر اسے متوازن کر دے تو یہ مسئلہ متنی نقاد کے لئے بہت کٹھن اور مشکل ثابت ہوتا ہے ۔

بھی کبھی کوئی کاتب یا مرتب جان بوجھ کر کسی مصلحت کے سبب کلام میں اپنی طرف سے اضافہ کر دیتا ہے جسے الحاقی کلام کہتے ہیں ۔
یہ سلسلے میں متنی نقاد غلطی کا شکار ہو سکتا ہے ۔ لہٰذا اسے بہت ہی محتاط رہنے کی ضرورت ہے صحیح بات اور الحاقی کلام کا پتہ
اسے فراہمیِ مواد کے سلسلے میں جو تیاری ہوئی تھی اس کے پس منظر میں جانچنا ہوگا ۔

بہت سی غلطیاں ایسی ہوتی ہیں جو صرف رسم خط سے وابستہ ہیں ۔ اردو میں رسم خط کی غلطیاں کچھ زیادہ ہی ملتی ہیں جو
نقاد کو سخت الجھن میں ڈال دیتی ہیں ۔ اردو رسم خط میں نقطوں اور شوشوں کی بڑی اہمیت ہے، بہت سے حروف کی
پہچان سے متعین ہوتی ہے ۔ قدیم رسم خط میں کاتب اکثر ایسی غلطی کر جاتے ہیں کہ نقطوں کا خیال نہیں رکھتے ۔ بعض جگہ یا تو نقطے
ب یا پھر بڑھا دیتے اور بعض جگہ تمام نقطے ایک ہی جگہ اکٹھے کر کے لکھ دیتے تھے جس سے متن پڑھنے میں خاصی دشواری
ہے ۔ بہت سے لفظ نقطوں کے غلط جگہ ڈالنے سے بھی اصل مفہوم سے دور ہو جاتے ہیں ۔

جیسے حروف جیسے ب، پ، ت، ج، خ، ذ، ز، ض، ظ وغیرہ کی شناخت صرف نقطے سے ہی ہوتی ہے ۔ اگر 'بات' کی
ب 'سے لکھ دیا جائے تو غلط ہو جائے گا ۔ اگر لفظِ 'جُدا' کا نقطہ اوپر چلا جائے تو یہ "خدا" بھی بن سکتا ہے ۔ کسی لفظ میں ایک
نقطے کی گڑبڑی سے لفظ بدل سکتا ہے ۔ یہ غلطیاں نہ صرف متن کو متاثر کرتی ہیں بلکہ بعض وقت پوری ادبی تاریخ متاثر

رسم خط کے سلسلے میں تشدید کا مسئلہ نہایت اہم ہے ۔ اگر کوئی لفظ مشدّد ہو اور اس پر تشدید نہ دی جائے تو مطلب و مفہوم
بدل جاتا ہے ۔ مثلاً اگر "کرّدوبیان" کی تشدید کو حذف کر لیا جائے تو یہ "کردو بیان" ہو جائے گا جس کا مطلب ہی کچھ اور ہے ۔
اردو میں بعض ایسے الفاظ بھی ہیں جو صورتوں میں ایک ہیں لیکن مفہوم کے اعتبار سے جدا ہیں ۔ مگر صورتوں کی پہچان کے
لئے کوئی حرف نہیں بلکہ زیر، زبر، اور پیش سے کام لیا جاتا ہے ۔ لیکن یہ اعراب اکثر و بیشتر نہیں بھی لگائے جاتے ہیں جس
سے کہ تلفظ کے تعین میں بیں گڑبڑی ہو جاتی ہے ۔ مثلاً سِحر، سَحر، خِرد، خُرد، سرقَد، سُرود، سَر، سِر وغیرہ ــــ اگر ان
پر زیر و زبر نہ ہو تو یہ کہنا مشکل ہو جاتا ہے کہ مصنف نے اصل میں کیا لکھا تھا ۔ ویسے سیاق و سباق کے حوالے سے
جا سکتا ہے ۔ یہ ایسی غلطیاں ہیں جن پر متن کی تصحیح کرتے وقت دھیان ضروری ہے ۔

■■

ــــــ ایوانِ اردو میں آکر بڑی مسرّت ہوئی، بڑی خوشی ہے کہ حیدرآباد میں
اردو ادب کا یہ مرکز قائم ہے امید ہے کہ اس شاندار ادارہ سے شاندار تخلیقی اور ادبی کام
ہوگا ۔ ــــــــ خواجہ احمد عباس
(۱۳ / اکتوبر ۱۹۶۲ء)

ڈاکٹر افغان اللہ خاں

ملک محمد جائسی

اختلافات کے آئینے میں

ملک محمد جائسی ہندی کے مشہور اور معروف شاعر ہیں ۔ ہندی نقاد انھیں مہاکوی (شاعرِ اعظم) کے نام سے یاد کرتے ہیں ۔ ہندی میں جائسی پر اتنا کچھ لکھا جاچکا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اب کچھ مزید لکھنے کی گنجائش نہیں باقی رہ گئی ہے ۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ جائسی پر جتنا زیادہ لکھا جاتا رہا ان کی شخصیت اتنی ہی زیادہ متنازعہ ہوتی گئی ۔ ہندی نقاد جائسی کے سلسلے میں بنیادی باتوں پر بھی اتفاق نہیں کرتے ۔ سوائے اس کے کہ ان کا نام "محمد" تھا اور ملک کا خطاب ان کے خاندان کے کسی بزرگ کو خلجی خاندان کے سلطانوں نے عطا کیا تھا ۔

جائسی کے سلسلے میں سب سے پہلا اور بڑا اختلافی مسئلہ یہ ہے کہ "جائسی" جائس کے رہنے والے نہیں تھے ۔ کہیں اور سے آکر جائس میں بس گئے تھے حالانکہ جائسی لفظ خود اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ شاعر جائس کا رہنے والا تھا ۔ پنڈت رام چندر شکل نے ان کی جائے پیدائش جائس ہی کو قرار دیا ہے ۔ دراصل یہ جھگڑا "آخری کلام" کے ان دو مصرعوں کو بنیاد بنا کر کھڑا کیا گیا ہے ۔

جائس نگر دھرم استھانوں   تہاں کوئی آئے کیو بکھانوں

مندرجہ بالا مصرعوں کی بنیاد پر رام چندر شکل ان کی جائے پیدائش جائس کو قرار دیتے ہیں ۔ جب کہ دوسرے ہندی نقاد رام چندر شکل سے اختلاف کرتے ہوئے ایک نئی بحث کا آغاز کرتے ہیں ۔ ان کا کہنا ہے کہ جائس کوئی دھرم استھان نہیں ہے اور نہ کوئی (شاعر) وہاں کا رہنے والا تھا ۔ شاعر نے خود ہی "تہاں کوئی آئے" کہہ کر اس معاملے کو صاف کر دیا ہے کہ وہ کہیں اور کا رہنے والا تھا ۔ جائس میں آکر بس گیا تھا ۔ ورنہ شاعر "تہاں کوئی آئے" کے بجائے دوسرے لفظوں کا استعمال کرتا ۔ ثبوت کے طور پر نقاد آخری کلام کے ان دو مصرعوں کو ثبوت کے طور پر پیش کرتے ہیں ۔

تہاں دوس دس پاہن آیوں   بھا بیراگ بہت سکھ پایوں

مگر میرا تو خیال یہ ہے کہ یہ بحث بلا وجہ کی بحث ہے۔ جہاں تک جائس کے پاک اور متبرک اور دھرم استھان کہنے کا سوال ہے، اس کی دو وجہیں ہوسکتی ہیں جس کی بنا پر جائسی نے اسے پاک اور متبرک قرار دیا ہوگا۔ پہلی تو یہ ہے کہ ہندی شاعری کی روایت رہی ہے کہ (خاص کر صدیوں کے بعد کی تخلیقات میں) کہ شاعر اپنی جنم بھومی (جائے پیدائش) کو پاک اور متبرک سمجھتے اور کہتے ہیں۔ یہ ہوسکتا ہے جائسی نے انھیں کی پیروی کی ہو۔ دوسرے یہ کہ جائسی سے قبل اس شہر میں سید اشرف جہانگیر جیسے مشہور اور معروف بزرگ بھی آچکے تھے۔ جن سے ہزاروں لوگ مُرید بھی ہوئے تھے۔ انھیں مریدین میں غلام الدین اور شیخ کمال جیسے بزرگ بھی تھے۔

غلام سرور لاہوری نے اپنی کتاب میں اس سلسلے میں بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ ہوسکتا ہے جائسی نے انھیں بزرگوں کی نسبت جائس کو پاک، متبرک اور دھرم استھان کہا ہو۔ دوسرے یہ کہ امر بہادر سنگھ کے پاس پدماوت کا جو نسخہ ہے اس کا متن "دھرم استھانوں" کی جگہ "آدی استھانوں" ہے۔ آخری کلام میں بھی جائسی نے جائس کو دھرم استھانوں نہیں بلکہ "آدی پد پانوں" کہا ہے۔ ڈاکٹر ماتا پرساد گپت بھی اس متن کو صحیح قرار دیتے ہیں۔ بہرحال یہ بات قطعی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ ملک محمد جائسی کی جائے پیدائش جائس ہی ہے۔ ورنہ شاعر اپنی کسی نہ کسی تخلیق میں اس بات کا اقرار ضرور کرتا۔ کیونکہ شاعر نے اپنی زندگی کے چھوٹے چھوٹے سے واقعہ کا بھی ذکر ضرور کیا ہے۔

"جائس نگر دھرم استھانوں" تہاں دوس دس پاہن آیوں" ایک شاعرانہ ندرت ہے اور کچھ نہیں۔ اور نہ اس کے معنی یہ نکلتے ہیں کہ جائسی کہیں اور کے رہنے والے تھے۔ اور جائس میں وہ دس دن کے مہمان کی حیثیت سے آئے تھے۔ دراصل دس دن کا پاہن (مہمان) آنا، انسانی جسم اختیار کرکے دنیا میں آنا اور اک مختصر عمر گذار کر فنا ہوجانا کی طرف اشارہ ہے۔ جن ہندی نقادوں نے ان مصرعوں کو بنیاد بنا کر یہ بات کہی ہے ان سے ایک غلطی اور ہوگئی ہے وہ یہ کہ ان مصرعوں کے الگ سے جو معنی ہوں تو ہوں مگر ان کا تعلق بعد کے آنے والے مصرعوں سے ہے۔ بغیر ان مصرعوں کو ایک ساتھ پڑھے ہوئے اس کے معنی نہیں نکالے جاسکتے اور نہ نکالا جانا چاہیئے۔ ان مصرعوں کے بعد جو مصرعے آئے ہیں ان میں شاعر نے صاف طور پر کہا ہے" انسان دس دن کی زندگی لے کر دنیا میں آتا ہے مگر یہ دس دن بھی وہ سکون چین سے گذار نہیں پاتا۔ اسے کتنی مصیبتوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ جائسی خود اپنی مثال پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ وہ دس دن کے مہمان کی حیثیت سے اس دنیا میں آئے۔ اور انھیں بیراگ ہوگیا۔ اس بیراگ نے انھیں سکھ بھی دیا دکھ بھی۔ سکھ اس لئے کہ ان کے محبوب کا درس پرس انھیں ملا۔ دکھ اس لئے کہ ان کا محبوب ان سے جدا ہوگیا۔

جائسی کی نہ صرف جائے پیدائش بلکہ سن پیدائش کے سلسلے میں بھی اختلاف خاصے گہرے ہیں۔ "آخری کلام" میں جائسی نے اپنی سن پیدائش کی طرف ہلکا اشارہ ضرور کیا ہے۔ فرماتے ہیں

بھا اوتار مور نو صدی   تیس برس اوپر کوی بدی

انھیں مصرعوں کو بنیاد بنا کر پنڈت رام چندر شکل، سید کلب مصطفیٰ اور ڈاکٹر جے دیو ان کی پیدائش ۹۰۰ ہجری مانتے ہیں۔ ڈاکٹر کمل کلشریشٹھ اسے ۹۰۶ ہجری بتاتے ہیں اور ثبوت کے طور پر آخری کلام کے ان مصرعوں کو پیش کرتے ہیں۔

نو سو برس چھتیس[۳۶] جب بھئے   تب یہ کام کتھا کر کہے

ڈاکٹر کمل کلشریشٹھ ۹۳۶ ہجری میں سے تیس کم کرکے ۹۰۶ ہجری ان کی سن پیدائش طے کرتے ہیں۔ لیکن یہ تیس سال انھوں نے کیوں کم کئے اس سلسلے میں کوئی دلیل نہیں دیتے ہیں۔ کیونکہ اگر شاعر نے اپنی عمر چھتیس سال بڑھا کر رکھا تو نو سو چھتیس[۹۳۶] میں سے چھتیس سال

کم کر دینے سے ان کی سن پیدائش ۹۰۰ ہجری ہوتی ہے نہ کہ ۹۰۶ ہجری، ڈاکٹر رام لوچن تیواری کا خیال ہے کہ جائسی کی پیدائش تک بھگ ۸۷۰ ہجری میں ہوئی ہوگی اور جائسی نے چھتیس سال بڑھا کر سمجھا ہے ۔ اس طرح ان کی پیدائش ۸۷۴ ہجری ہی مانی جائے گی ۔ راقم السطور کا خیال ہے کہ ڈاکٹر رام لوچن تیواری کا ہی خیال بڑی حد تک صحیح ہے ۔ یہ تو قطعی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ جائسی ۸۷۴ ہجری میں پیدا ہوئے ہوں گے ۔ مگر یہ بات ضرور کہی جاسکتی ہے کہ ان کی پیدائش ۸۷۴ اور ۸۷۰ کے درمیان ہی ہوئی ہوگی ۔
اس دعویٰ کی تصدیق کے لئے پروفیسر سید حسن عسکری کی دریافت "پدماوت" اور "اکھراوٹ" سے (جو انھیں منیر شریف سے دستیاب ہوئیں) ہوتی ہے ۔ اکھراوٹ کی پوتھی (نسخہ) میں سن تخلیق جمعہ ذوالعقد ۹۱۱ ہجری درج ہے ۔ اسی کو بنیاد بنا کر اگروال اور ڈاکٹر گوپال رائے وغیرہ یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ "اکھراوٹ ۹۱۱ ہجری کے پہلے کی تخلیق ہے ۔ اور ظاہر ہے کہ اگر جائسی ۹۰۶ ہجری میں پیدا ہوئے ہوتے تو وہ ۹۱۱ ہجری میں" اکھراوٹ" جیسی تصنیف نہیں کرسکتے تھے ۔ اسی لئے گمان ہوتا ہے کہ ان کی سن پیدائش ۸۷۴ ہجری کے آس پاس ہی ہوگی ۔ پدماوت میں بھی شاعر نے اپنی جو تصویر کشی کی ہے وہ کمزور، ناتواں، ضعیف اور عمر رسیدہ آدمی کی تصویر ہے ۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر نے جب پدماوت مکمل کی ہوگی تو اس کی عمر تقریباً سولہ سال رہی ہوگی ۔ ویسے پدماوت کے سن تخلیق یا یوں کہا جائے کہ پدماوت کی تخلیق کی ابتدا کی، وہ ۹۴۷ ہجری تھی ۔ شاعر خود کہتا ہے

سن نو سو سینتالیس اہے (۹۴۷)　　　کتھا ادبھ بین کوئی کہے

پنڈت رام چندر شکل، واسدیو سرن اگروال وغیرہ ۹۴۷ ہجری کی جگہ ۹۲۷ متن کو صحیح مانتے ہیں ۔ لیکن پنڈت رام چندر شکل اور واسدیو سرن اگروال کا خیال اس سلسلے میں غلط ہے ۔ کیونکہ پدماوت میں جائسی دہلی کے سلطان شیر شاہ کا ذکر بھی کرتے ہیں ۔ شیر شاہ ۹۴۷ھ ہی میں قنوج کی جنگ میں ہمایوں کو شکست دیتا ہے ۔ اور یہیں سے اس کی دلی سلطنت کی ابتدا ہوتی ہے ۔ جائسی جیسے شاعر سے ایسی تاریخی غلطی منسوب نہیں کی جاسکتی ۔ یہ خیال ہے کہ چونکہ نسخہ فارسی رسم خط میں ہے اس لئے ۹۴۷ کی جگہ ۹۲۷ پڑھ لیا جانا ممکن ہے ۔
جائسی کے سن وفات کے سلسلے میں بھی اختلاف رائے ہے ۔ اس سلسلے میں کوئی بات قطعی طور پر نہیں کہی جاسکتی ۔ پنڈت رام چندر شکل ان کا سن وفات کے سلسلے میں فرماتے ہیں کہ قاضی نصیر الدین جائسی جنھیں اودھ کے نواب شجاع الدولہ سے سند ملی تھی، اپنی یادداشت میں جائسی کی تاریخ وفات ۱۴/ رجب ۹۴۷ ہجری سمجھا ہے ۔ لیکن یہ تاریخ یوں غلط ہو جاتی ہے کہ جائسی نے اسی سن میں "پدماوت" کی ابتدا کی تھی (جیسا کہ خود جائسی نے کہا ہے) دوسرے یہ کہ جائسی کی سن پیدائش ۸۷۰ کے آس پاس مانی جاتی ہے تو کیا جائسی صرف ساٹھ سال زندہ رہے ۔ دوسرے یہ کہ اگر ان کا سن پیدائش وہی مان لیا جائے جو ڈاکٹر کلشریشٹھ وغیرہ نے تسلیم کیا ہے تو ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ماننا ہوگا کہ جائسی اس دنیا میں صرف ۴۰ سال زندہ رہے ۔ اس طرح ثابت ہوتا ہے کہ جائسی کی سن وفات ۹۴۷ کے بجائے کچھ اور ہوگا ۔ سید کلب مصطفیٰ، غلام سرور لاہوری اور عبدالقادر وغیرہ نے جائسی کا سن وفات ۱۰۴۹ ہجری مانا ہے ۔ لیکن اس تاریخ کو صحیح مان لینے کے بعد یہ بات بھی مان لینا ہوگی کہ پدماوت کی تخلیق کے بعد بھی جائسی سو سال تک زندہ رہے جب کہ پدماوت کی تخلیق کے درمیان ہی جائسی کافی ضعیف اور بزرگ ہو چکے تھے جس کا اظہار بھی جائسی نے پدماوت میں کھلے لفظوں میں کیا ہے ۔
پدماوت میں جائسی نے اپنے پیر پرمپرا (سلسلے) کا ذکر بھی بڑی تفصیل سے کیا ہے ۔ اس سلسلے میں وہ سید اشرف جہانگیر کا نام بڑے عزت و احترام سے لیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ "چشتی سید اشرف جہانگیر چاند کی طرح نرمل اور کومل ہیں ۔ وہ خلق خدا کے مخدوم ہیں اور

ن کے در کا غلام ہوں ۔ (سید اشرف بڑے پائے کے بزرگ تھے ان کے مریدین میں شیخ کمال اور شیخ مبارک جیسے باکمال بزرگ بھی تھے۔) مگر جائسی کے اس بیان نے ہندی کے بعض محققوں کو غلط راستے پر ڈال دیا اور لوگ انھیں بھی جائسی کا مرشد پیر ماننے لگے۔ لیکن جائسی نے تو شیخ کمال اور مبارک کا ذکر بھی اتنے ہی عزت و احترام سے کیا ہے تو کیوں نہ انھیں حضرات کو جائسی کا مرشد اور پیر ن لیا جائے۔ جائسی ان لوگوں کے بارے میں تو یہاں تک کہتے ہیں کہ ان کا درس پرس مجھے نصیب ہوا جس کی وجہ سے میرے گناہ دھل ، اور جسم پاک ہوا۔

سید اشرف کا انتقال ۲۷ محرم ۸۰۸ ہجری میں ہوا اور جائسی کی پیدائش سید اشرف کے انتقال کے بعد ہوئی۔ اس لئے یہ تو ممکن ہی ہیں ہے کہ جائسی اور سید اشرف کا کوئی براہ راست تعلق رہا ہو۔ ہاں شیخ مبارک اور شیخ کمال سے ان کے تعلقات ضرور رہے ہوں گے۔ ید اشرف جائس ضرور تشریف لائے تھے اور انہوں نے وہاں قیام بھی کیا تھا۔ کافی تعداد میں لوگ ان سے مرید بھی ہوئے تھے (جن میں کمال و مبارک صاحب بھی تھے) کچھ دنوں جائس میں قیام کرنے کے بعد سید اشرف کچھوچھہ تشریف لے گئے اور وہیں ان کا انتقال بھی ۔ جائس کے لوگ سید اشرف کے ساتھ ساتھ شیخ مبارک اور شیخ کمال کو بھی جائسی کا پیر مانتے ہیں۔ شاہ مبارک بودلے کی وفات ۹ ہجری اور شیخ کمال کی ۹۹۴ ہجری مانی جاتی ہے۔ پدماوت کی تخلیق ۹۴۷ ہجری میں شروع ہوئی۔ اس لئے یہ بات قطعی طور پر کہی سکتی ہے کہ جائسی کے ہم عصر شیخ مبارک اور شیخ کمال تھے نہ کہ سید اشرف جہانگیر۔ شیخ کمال اور شیخ مبارک کے سلسلے میں خود جائسی کہا ہے کہ ان کا "درس پرس" مجھے ملا۔ اور میں ان کی صحبتوں سے فیض یاب ہوا۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ شیخ مبارک اور کمال ان کے پیر تھے۔ جائسی نے ان حضرات کو کبھی بھی پیر و مرشد کہہ کر مخاطب نہیں کیا۔ ہاں ان کا عزت و احترام ضرور کرتے تھے۔ پیر و مرشد کہہ کر کسی اور ہی کو مخاطب کرتے ہیں۔

محمد تہاں نچنت بتھ جہنہ سنگ مرشد پیر
جہہ لے ناد کاریا ۔ اور سیوک بگ باد سو تیر
گرو مہدی سیوک میں سیوا چلے اتاپل جنہہ کر کھیوا
اگوا بھے شیخ برہانوں پتھ لائی جنہہ دینوں گیا نوں

"اگوا بھے" یہاں صاف لفظوں میں جائسی نے شیخ برہان کو رہنما قرار دیا ہے۔ شیخ برہان کے سلسلے میں محمدی (محی ایدین) ے آزاد شخصیت جان کر گریسن نے شید حسن عسکری نے منیر شریف سے دستیاب پدماوت کے ایک نسخے کی بنیاد پر یہ رائے قائم کی کہ ی کی جگہ مہدوی ہونا چاہیئے چونکہ نسخہ فارسی میں ہے اس لئے یہ فرق واضح ہو جاتا ہے (ہندی میں نہیں ہو پاتا۔) حسن عسکری کے مطابق رہان سید محمد کے شاگرد تھے۔ چونکہ سید محمد نے اپنے کو مہدی کہا تھا غالباً اسی وجہ سے شیخ برہان کو بھی مہدی کہا گیا۔ "آئین اکبری" شیخ برہان کے سلسلے میں کہا گیا ہے کہ وہ مہدوی تھے۔ کالپی کے رہنے والے تھے۔ سو برس زندہ رہنے کے بعد ان کا انتقال ہوا ۔ ا۔ "چترریکھا" میں تو جائسی نے صاف لفظوں میں انھیں اپنا گرد (پیر) قرار دیا ہے۔

مہدی گرد شیخ برہانوں کالپی نگر تہنہ کے استھانوں

باقی صفحہ (۳۱) پر

قندِ مکرّر

پروفیسر سیّد محمّد

جامعہ عثمانیہ کا پہلا دور

اگرچہ جامعہ عثمانیہ کے قیام کے لئے اعلیٰ حضرت کا فرمان ۲۶ اپریل ۱۹۱۷ء ہی کو صادر ہوچکا تھا اور اس کا نام عثمانیہ یونیورسٹی اور ذریعۂ تعلیم اردو زبان کو (انگریزی کی لازمی تعلیم کے ساتھ) قرار پا چکا تھا۔ لیکن منشورِ خسروی (رائل چارٹر) جس کے ذریعہ اس کا باقاعدہ قیام ہوا اور اس کا دستور اور ذیلی قواعد بنائے گئے۔ ۲۲ ستمبر ۱۹۱۸ء کو نافذ ہوا۔ قیام جامعہ کے مختلف مراحل کی تکمیل ہوکر عثمانیہ یونیورسٹی کالج کا افتتاح یکم ذی الحجہ ۱۳۳۷ھ م ۲۸ اگست ۱۹۱۹ء کو بروز پنجشنبہ عمل میں آیا۔ صدر اعظم (وزیر اعظم ریاست) بلحاظ عہدہ اس کے چانسلر قرار پائے۔ نواب صدر یار جنگ علامہ حبیب الرحمان خان شروانی صدر الصدور امور مذہبی (جن کا درجہ وزیر ریاست کے برابر تھا) اس کے پہلے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ رجسٹرار کے فرائض ابتداً سید محی الدین بہار؟ (مددگار ناظم تعلیمات) اور کالج کی پرنسپلی کی خدمت سر راس مسعود ناظم تعلیمات نے عارضی طور پر انجام دی۔ ایک سال بعد ہی حمید احمد انصاری مستقل طور پر رجسٹرار بنا دیئے گئے اور پرنسپلی کی خدمت پر ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کا تقرر عمل میں آیا۔ افتتاحی جلسے کی صدارت نواب صدر یار جنگ نے کی۔ یہ جلسہ موجودہ اسٹیٹ بنک کے مرکزی دفتری عمارت میں ہوا۔ جس کو آغا منزل کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اس جلسے میں ریاست کے تمام عمائدین شریک تھے۔ سب سے پہلے قرأتِ کلام پاک کی گئی۔ اس کے بعد سر اکبر حیدری نواب حیدر نواز جنگ نے قیام جامعہ کا فرمان پڑھ کر سنایا۔ جس کو تمام حاضرین نے کھڑے ہوکر سماعت کیا۔ اس کے بعد صدر جلسہ نے اردو تقریر کی۔ پھر مسٹر ین۔ جی ولنکر نے جو انگریزی کے پہلے پروفیسر بنائے گئے تھے، انگریزی میں تقریر کی۔ اگلے دن سے انٹرمیڈیٹ سالِ اول کے درس شروع ہوگئے۔

ابتداً صرف دو شعبے (فیاکلٹیز) قائم کئے گئے۔ ایک شعبۂ فنون اور دوسرا شعبۂ دینیات، دارالعلوم کالج، جہاں فارسی اور عربی کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی تھی۔ اور جہاں سے منشی فاضل، مولوی فاضل، مولوی کامل کی ڈگریاں ملتی تھیں۔ اس کو عثمانیہ یونیورسٹی کالج میں ضم کر کے شعبۂ دینیات قائم کیا گیا۔ دارالعلوم کے نہ صرف اساتذہ اس شعبہ میں منتقل ہوگئے۔ بلکہ دارالعلوم کا سارا کتب خانہ جو عربی، فارسی، اردو اور انگریزی کتابوں پر مشتمل تھا۔ عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری کی اساس بنایا گیا۔ سائنس اور دونوں شعبوں کو اولاً شعبۂ فنون ہی کے تحت رکھا گیا اور ابتدائی دور کے گریجویٹوں کو بجائے بی ایس سی کے بی اے ہی کی ڈگری دی گئی۔ ابتداً آرٹس کے تحت السنہ میں اردو، فارسی، عربی، تلنگی، مرہٹی، کنڑی، ہندی اور سنسکرت کا آغاز کیا گیا اور مضامین میں تاریخِ ہند، تاریخ اسلام،

تاریخ یونان وروما، تاریخ انگلستان، منطق، معاشیات کی تعلیم کو شریک نصاب کیا گیا۔ سائنس کے شعبے میں صرف ریاضی، طبعیات اور کیمیا کے مضامین شروع کئے گئے۔ کئی سال کے بعد سائنس کے تحت حیوانیات اور نباتیات کی تعلیم کا آغاز ہوا اور آرٹس میں سماجیات، پھر کامرس اور جغرافیہ کے مضامین بھی شریک نصاب کئے گئے۔

بی اے میں سائنس اور آرٹس کے مشترکہ شعبے کی تعلیم چار گروہوں میں تقسیم کی گئی۔ پہلا گروپ زبانوں کا تھا، جس میں امیدوار کو ایک قدیم زبان عربی، فارسی، سنسکرت اور ایک جدید زبان اردو، تلنگی، مرہٹی، کنڑی لینی تھی۔ دوسرا گروپ تاریخ کا تھا جس میں ایک پرچہ سیاسیات کا، دو پرچے معاشیات (ایک عام معاشیات اور ایک معاشیات ہند) ایک پرچہ تاریخ ہند۔ کے کسی ایک دور کا، ایک پرچہ تاریخ انگلستان دستوری کا، اور ایک پرچہ تاریخ یورپ یا تاریخ اسلام یا تاریخ یونان یا تاریخ روما کا۔ اس طرح چھ پرچوں میں امتحان دینا ضروری تھا۔ تیسرا گروپ فلسفے کا تھا۔ جس کے چھ پرچوں میں علاوہ عام مسائل فلسفہ کے، اسلامی فلسفہ یا ہندو فلسفہ کا اختیاری مضمون اور نفسیات و اخلاقیات کے دو پرچے شامل تھے۔ انٹرمیڈیٹ میں انگریزی کے دو پرچوں کا امتحان دینا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ دینیات یا عام اخلاقیات کی تعلیم دونوں درجوں میں لازمی تھی۔

عثمانیہ یونیورسٹی کالج ابتداء میں اس بنگلہ میں قائم کیا گیا۔ جس میں اس وقت اسٹیٹ بنک کا صدر دفتر ہے۔ بنک کی عمارت بنگلے کے صحن میں تعمیر ہوئی تھی۔ اصل بنگلہ جس میں کالج قائم تھا اب بھی جوں کا توں موجود ہے۔ اور اس میں بنک کے مختلف شعبے قائم ہیں۔ کتب خانہ کے لئے پہلے آغا منزل کے روبرو والا بنگلہ لیا گیا جس میں اس وقت عثمان شاہی ملز کے دفتر ہیں دارالعلوم کا قدیم مکان یونیورسٹی کے پہلے بورڈنگ ہاؤس میں بدل گیا۔ اور کالج کے قریب ایک اور عمارت موسومہ عشرت منزل بھی لی گئی تھی۔ اس لئے دارالعلوم والے مکان کو اقامت خانہ قدیم کا نام دیا گیا۔ آج کل اس میں سوپر بازار شامل ہے۔ قیام کالج کے تیسرے سال آغا منزل سے متصل لیاقت جنگ کا بنگلہ حاصل کرکے اس کو "لیاقت منزل" کے نام سے موسوم کیا گیا۔ پھر کتب خانہ سے متصلہ مکان بھی لے لیا گیا۔ جب یہ بھی کافی نہیں ہوا تو آل سینٹس اسکول سے متصل مکان میں کچھ کلاسیس منتقل کر دی گئیں۔ ۱۹۲۳ء میں ال ال بی کی کلاس قائم کی گئی تو کنگ کوٹھی روڈ پر نظامت جنگ کا بنگلہ لے کر اس میں قانون کی جماعتیں اور ایک حصہ میں گریجویٹ طلباء کا اقامت خانہ قائم کیا گیا۔ پھر چند سال بعد بورڈنگ کے لئے عثمان باغ کے قریب ایک مکان کوچہ چراغ علی میں حاصل کیا گیا۔ اور کتب خانے کو مصائب جنگ کے بنگلہ میں جس میں اس وقت ... اور بابا کلاس ورکس ہے، منتقل کر دیا گیا۔ اس طرح جامعہ عثمانیہ محسن الملک کی کوٹھی سے لے کر نظام کالج کے رقبہ میں مختلف کرایوں کے بنگلے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اور ہر سال ایک کثیر رقم بطور کرایہ ادا کرنی پڑتی تھی۔ جس کی روزافزوں نے آخرکار، کارپردازان جامعہ کو مستقل عمارت کی تعمیر پر مجبور کر دیا۔ اور یونیورسٹی کے موجودہ کیمپس میں عجلت کے ساتھ عارضی عمارات تعمیر کر کے جامعہ کو وہاں منتقل کر دیا گیا۔

جامعہ عثمانیہ کا یہ پہلا دور، کیا بلحاظ تعلیم، اور کیا اسپورٹس اور گیمس میں اور کیا علمی مباحث میں، کیا تصنیف و تالیف کے اعتبار سے ہر حیثیت سے نہایت ممتاز رہا ہے۔ ۱۹۲۲ء میں بی اے کا پہلا امتحان ہوا۔ جس میں ۱۸ طلباء نے کامیابی حاصل کی۔ ان میں حسب ذیل آٹھ طلباء درجہ اول پاس ہوئے۔ ڈاکٹر سید حسین مرحوم، پروفیسر ولی الدین، پروفیسر صلاح الدین

احمد بن عبداللہ لکچرر سٹی کالج، ڈاکٹر میر سیادت علی وظیفہ یاب جج ہائیکورٹ، پروفیسر ضیاء الدین انصاری، پروفیسر ڈی مرچی لوڈ، ڈاکٹر سید عبدالعلیم، پروفیسر مشرقی پاکستان، ۱۹۲۵ء میں ال ال بی کا پہلا امتحان ہوا۔ جس میں ۲۲، طلب شریک ہوئے اور سب کے سب اوّل درجہ میں کامیاب ہوئے۔ اس نتیجے نے سب کو حیرت میں ڈال دیا۔ اور بعض گوشوں سے بدگمانی بھی ظاہر کی جانے لگی۔ لیکن اس امتحان کے ممتحنوں میں سر تیج بہادر سپرو، جسٹس سر سلیمان، سر اقبال جیسی شخصیتیں تھیں جنھوں نے امیدواروں کی دل کھول کر داد دی تھی۔ اس سے قطع نظر عملی میدان میں ان طیلسانیین قانون کی کارکردگی نے بہت جلد بدگمانوں کو اپنی رائے بدلنے پر مجبور کر دیا۔ ۱۹۲۴ء میں ہی اردو، عربی، تاریخ، ریاضی اور دینیات کے مضامین میں ایم اے کی تعلیم کا آغاز ہوا۔ فلسفہ اور سائنس کی اعلیٰ تعلیم کے لئے وظیفے دے کر طلبار کو علی گڑھ اور ڈھاکہ یونیورسٹیوں میں شریک کرایا گیا۔ کیوں کہ اس وقت تک ہندوستان کی صرف ان ہی دو یونیورسٹیوں نے جامعہ عثمانیہ کی ڈگریوں کو تسلیم کیا تھا۔ اور دوسری ہندوستانی یونیورسٹیاں اپنی قدامت پسندی سے اس جامعہ کے اعلیٰ معیار کو ماننے تیار نہیں تھیں۔ البتہ انگلستان کی یونیورسٹیوں نے ہمارے گریجویٹ طلبار کو اعلیٰ تعلیم کیلئے عثمانیہ کی ڈگریوں کی بنا پر داخلہ دیدیا۔ ورہاں ان طلبار کی شاندار کامیابیوں نے ہندوستان کی دوسری یونیورسٹیوں کو عثمانیہ کو بھی تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا۔ چند سال کے بعد بمبئی اور مدراس کی قدیم یونیورسٹیوں نے بھی انفرادی طور پر عثمانیہ کے کئی طلبار کو اپنے ہاں اعلیٰ تعلیم کے لئے قبول کر لیا۔ قانون کی تعلیم کے آغاز کے تین سال بعد یم بی بی یس اور سیول انجنیری کی تعلیم بھی جامعہ میں شروع کی گئی۔ اور ان مضامین کی بھی اردو میں تعلیم ہونے لگی۔ ایک سال کے بعد اساتذہ کی ٹرینگ کے سلسلے میں فن تعلیم و تدریس اور میکانیکل اور الکٹریکل.. انجنیری کے شعبے بھی قائم ہو گئے۔

جامعہ عثمانیہ کو ملک کی خوش قسمتی سے شروع میں بڑے اچھے اور ہندوستان گیر شہرت کے اساتذہ ملے۔ جن کی تعلیم نے حیدرآباد کے نوجوانوں میں علم و ادب کی سچی لگن پیدا کی۔ ان کے جوش عمل اور اپنے مضمون کے ساتھ دلچسپی نے طلبا میں تحصیل علم و تحقیق و تجسس اور تصنیف و تالیف کے شوق کو ابھارا۔

انگریزی تعلیم کے لئے مسٹر جی ین ولنکر، جو پہلے نائب ناظم تھے۔ بحیثیت پروفیسر تقرر ہوا۔ یہ اگرچہ بمبئی کے صرف ایم اے یل یل بی تھے۔ لیکن انگریزی کے بڑے ماہر تھے اور بڑے اعلیٰ درجہ کے پروفیسر تھے۔ دوسرے استاد ڈاکٹر سید عبداللطیف ہیں (خدا انھیں دیرگاہ سلامت رکھے) جن کی اعلیٰ انگریزی کا سارا ہندوستان معترف ہے۔ جن کی مفکرانہ تصانیف علمیہ، سارے شرق وسطیٰ میں غیر معمولی منزلت کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں۔ انھوں نے حال ہی میں قرآن پاک کا انگریزی ترجمہ مکمل کر دیا ہے۔ جو اس وقت زیر طبع ہے۔ ان کی صدارت میں انڈو مڈل ایسٹ کلچرل اسٹڈیز کا ادارہ آج بھی ملک کی گراں قدر علمی اور تہذیبی خدمت انجام دے رہا ہے۔ تیسرے استاد انگریزی پروفیسر رحیم الدین صاحب اور پروفیسر حسین علی خاں صاحب تھے۔ جو بعد کو صدر شعبہ ہو گئے تھے۔ نیز ایک انگریز استاد پروفیسر اسپیٹ بھی تھے۔ یہ سب اساتذۂ انگریزی، اپنے مضمون کے نہایت ممتاز اساتذہ تھے۔ ان کی اعلیٰ قابلیت ان کے کارناموں سے ظاہر ہے۔ اردو کی پروفیسری پر سید وحیدالدین سلیم فائز تھے۔ یہ ہندوستان میں اردو کے پہلے پروفیسر تھے۔ کیونکہ ان ہی کو سب سے پہلے پروفیسری کا گریڈ دیا گیا

تھا۔ سلیم صاحب بہت زندہ دل، خوش مزاج پروفیسر تھے۔ تدریس میں ان کا جواب نہیں تھا۔ ان کے درس اس قدر مقبول ہوتے تھے کہ دوسرے شعبوں کے طلبا، حتیٰ کہ سائنس کے طالب علم بھی ان سے استفادہ کے لیے ان کی کلاس میں آکر بیٹھ جاتے تھے۔ سلیم صاحب سرسید اور حالیؔ کی صحبتوں میں تربیت پائے ہوئے تھے۔ وضع اصطلاحات اور نئے لفظ بنانے میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ انہیں صحافت کا بھی بڑا تجربہ تھا اور "زمیندار" اور "مسلم گزٹ" کی ادارت بھی کر چکے تھے۔ جامعہ عثمانیہ کی خوش قسمتی تھی کہ اُسے سلیم جیسا اُستادِ اُردو اور ماہرِ وضع اصطلاحات ملا۔ جس کی وجہ سے اس جامعہ کے کارنامے بہت زیادہ شاندار ہوئے۔ فارسی شعبہ کے صدر علامہ شمسی تھے۔ جو ایک بے بدل عالم اور زبردست فاضل تھے۔ عربی کے اساتذہ میں مولانا سید غلام نبی، جامعہ پنجاب کے فرسٹ ان فرسٹ مولوی فاضل، مولانا سید ابراہیم صاحب، دونوں اپنے وقت کے بڑے عالم ادب عربی تھے۔ تاریخ یورپ، یونان و روما کے استاد پروفیسر ہارون خان تھے (خدا انہیں دیرگاہ سلامت رکھے) فنِ تاریخ کے اُس وقت سب سے بڑے ماہر تھے۔ ان کے علاوہ تاریخ اسلام کے استاد پروفیسر جمیل الرحمٰن، تاریخ ہند کے استاد پروفیسر ابن حسن اپنے اپنے مضمون کے بے بدل ماہر اور مسلم الثبوت عالم تھے۔ فلسفہ کے شعبہ میں خلیفہ عبدالحکیم بھی اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ وہ فلسفہ جیسے خشک مضمون کے اُستاد تھے لیکن بڑے شگفتہ مزاج آدمی تھے اور باغ و بہار طبیعت کے مالک تھے۔ شاعر بھی تھے اور مقرر بھی۔ ریاضی کے استاد قاضی محمد حسین اپنے فن کے بڑے ماہر تھے۔ طبعیات میں پروفیسر وحید الرحمان گو یورپ کی ڈگری سے محروم رہے مگر بلند پایہ استاد تھے۔ ان کے علاوہ عبدالرحمٰن خان صاحب جو طبعیات کے پروفیسر اور سٹی کالج کے پرنسپل تھے۔ اپنے مضمون میں عالم گیر شہرت رکھنے والے استاد تھے۔ کیمیا کے شعبے میں چودھری برکت علی جو بہت جلد انتقال کر گئے۔ بڑے اونچے پایہ کے کیمیا داں تھے۔ ان کے مددگار پروفیسر محمود احمد خان صاحب، جو اس وقت پاکستان میں ہیں اور طبعیات کے پروفیسر نصیر احمد عثمانی دونوں اپنے اپنے مضمون کے بلند پایہ اُستاد اور صاحب تصنیف و تالیف ہیں۔ شعبہ ریاضی میں پروفیسر کشن چند بھی بڑے ماہر اور اونچے درجہ کے استاد تھے۔ معاشیات میں پروفیسر الیاس برنی اس مضمون کے اولین استاد تھے۔ اس مضمون پر سب سے پہلے انہوں نے اقتصاد کے بارے اردو میں کتابیں لکھیں۔

علامہ عبدالقدیر صاحب حسرتؔ، جو صدر شعبہ تھے، جامع الکمالات شخصیت کے حامل تھے۔ وہ قرآن، حدیث، فقہ، تفسیر اور کلام میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ ان کے علاوہ مولانا عبدالواسع، مولانا سید شبیر علی، مولانا سید احمد حسین، مفتی عبداللطیف اور مولانا مناظر احسن گیلانی بھی جید عالم تھے۔

عثمانیہ یونیورسٹی کالج کی پرنسپلی کے فرائض ابتدا چند روز کے لیے سر راس مسعود، نواب مہدی یار جنگ نے انجام دیے۔ ۱۹۲۰ء میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی پرنسپل بنائے گئے۔ یہ عربی کے اچھے عالم اور محقق تھے۔ یہ تین سال سے زیادہ نہیں رہے۔ ۱۹۲۴ء میں پروفیسر عبدالرحمٰن خان صاحب نظام کالج سے بحیثیت پرنسپل منتقل ہوئے۔ خان صاحب نے دس سال پرنسپلی کے فرائض انجام دیے اور ان کی صدارت میں کالج نے غیر معمولی ترقی کی۔ اور یونیورسٹی کے مختلف شعبوں میں توسیع ہوئی۔ ان ہی کے دور میں جامعہ کے فارغ التحصیل طلبا کو جو اعلیٰ اسناد کے حامل تھے، یونیورسٹی میں پروفیسری اور لکچراری کی خدمات پر مامور کیا گیا۔

خان صاحب کا دورِ صدارت ۱۹۳۴ء میں ختم ہوا۔ ان کے ساتھ پرنسپلی کا عہدہ بھی برخواست کر دیا گیا اور جامعہ بھی اڈیکمیٹ منتقل ہوگئی۔ جہاں بجائے کالج کے اس کو صرف یونیورسٹی سے موسوم کیا گیا۔ اور بجائے پرنسپل کے پرو وائس چانسلر اور پھر وائس چانسلر کو اس کا اعلیٰ انتظامی افسر بنایا گیا۔

اس پر جامعہ عثمانیہ کا پہلا دور ختم ہو جاتا ہے۔ اور یہاں سے نئے عہد کا آغاز ہوتا ہے۔ جو نئے حالات اور نئے مسائل سے دوچار رہا ہے۔ اس کے پہلے پندرہ سالہ دور میں جو فضا تھی' وہ رفتہ رفتہ بدل گئی۔ اگرچہ اس کا دائرۂ عمل بہت وسیع ہو گیا ہے اور زمانے کے تقاضے کے مطابق اس میں مزید توسیع ہو رہی ہے۔ لیکن وہ خالص علمی فضا اور وہ مخلصانہ رنگ اس نئے دور میں بہت کم نظر آتا ہے ــ ••

(روزنامہ سیاست حیدرآباد۔ ۵ر اکتوبر ۱۹۶۸ء)

بقیہ: اردو نامہ

صہ ۳۸ سے آگے

جناب آصف پاشاہ' ڈائرکٹر جناب بھارت چند کھنہ نے جناب عبدالستار کا خیر مقدم کیا۔ جناب اظہر حسن شریک معتمد اکیڈیمی نے اپنی مطبوعات کا سیٹ نذر کیا۔ ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے صدر جناب میر اکبر علی خاں نے انسٹی ٹیوٹ کا معائنہ کرایا۔

۲۵ر نومبر: ایچ ای ایچ دی نظامس اردو ٹرسٹ کے زیر اہتمام "آندھرا پردیش میں اردو کے بائیس سال" کے موضوع پر سیمنار کا افتتاح کرتے ہوئے ریاستی وزیر پنچایت راج جناب ایم باگا ریڈی نے کہا کہ "اردو کا مسئلہ کل ہند نوعیت کا مسئلہ ہے" اس کے تحفظ اور ترقی کا سوال دراصل ہندوستان کے مشترکہ کلچر کی صیانت اور بقا ہے۔ موصوف نے ریاست میں اردو زبان وادب کی ترقی پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے چیف منسٹر ڈاکٹر ایم چنا ریڈی کے اردو زبان سے متعلق بہتر پالیسی کی ستائش کی نظامس اردو ٹرسٹ کے ڈائرکٹر جناب عبدالمحمود نے رپورٹ سنائی۔ اور عہد آصفی میں اردو کی ہمہ جہتی ترقی پر روشنی ڈالتے ہوئے آصفجاہ ثامن اور نواب معظم جاہ کی خدمات کو زبردست خراج تحسین ادا کیا۔ جناب میر اکبر علی خاں سابق گورنر یوپی نے صدارتی تقریر.. کرتے ہوئے اردو والوں سے اپیل کی کہ وہ مادری زبان میں تعلیم کو فروغ دیں اور تلگو کے ساتھ ساتھ ہندی بھی سیکھیں۔ موصوف نے اردو تعلیمی ٹرسٹ اور حیدرآباد کے ادبی اداروں' انجمن ترقی اردو اور ادارۂ ادبیات اردو کی دیرینہ خدمات کو خراج ادا کیا۔ ڈاکٹر مغنی تبسم نے معتمدی کے فرائض انجام دیئے۔

۲۶ر نومبر: جناب ایم باگا ریڈی .. ریاستی وزیر پنچایت راج نے ساؤتھ انڈیا اردو اکیڈیمی کے زیر اہتمام جناب اکرام جاوید کی مرتبہ کتاب "آندھرا پردیش کے مجاہدین آزادی" کی رسم اجرا انجام دی۔ شری کے پربھاکر ریڈی ڈپٹی اسپیکر و نائب صدر اکیڈیمی نے جلسہ کی صدارت کی۔

۲۸ر نومبر: ریاستی محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ کے اردو ماہنامہ "آندھرا پردیش" کی ادارت پر جناب ملک محمد علی خاں کا تقرر عمل میں آیا۔

۲۹ر زندہ دلانِ حیدرآباد کا گیارہواں سالانہ اجتماع جناب فکر تونسوی آف ملاپ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ریاستی وزیر آبکاری جناب پی گنگا ریڈی نے بہ حیثیت مہمان خصوصی شرکت کی اور اپنے زعفران زار تخاطب سے محفل کو گرمایا۔ اس موقع پر طنز و مزاح کی چند کتابوں کی رسم اجرا انجام دی گئی جناب رشید قریشی نے جلسہ کی کارروائی کو کامیابی کے درجوں تک اٹھایا ••

پسِ عمرِ ہجر

عزیز قیسی

برسوں میں ملے ہو، یہ مدت کیسے گذری .... کچھ بھی نہ کہو
یہ بھی نہ کہو
جب ہم بچھڑے تھے اس سے پہلے کیا تم نے کیا، کیا میں نے کیا
شاید میں نے دامن چھوڑا
شاید تم نے پیماں توڑا
مجرم ہیں دونوں یا معصوم ہیں یہ بھی مت سوچو
یہ بھی مت یاد کرو
تم نے اس دن یہ سوچا تھا
اب یہ جینا بے کار ہے پر بے کار نہ تھا
میں نے بھی کہا تھا یہ اس دن
مرجاؤں گا لیکن مر نہ سکا

ہم لوگ جیئے ہیں جن کے لئے
ان کو یہ خبر ہو جائے اگر ہم نے خود کو قربان کیا
ہم نے ان پر احسان کیا
تو ان کی نظر جھک جائے گی
ان سے بس اتنا کہنا ہے
ہم یونہی ملے، ہم یونہی رہے ہیں ساتھ .... یہی اک رشتہ ہے
ہم دونوں میں

اب میں بھی شرافت پیشہ ہوں
اور تم بھی تمدن بستہ ہو
اب تم بھی ہستہ ہو اور میں بھی
انسانوں کے کیا لینا ہے
جو ہم سے ہمارا مانگتے ہیں
اب ہم کو دنیا دینا ہے

غزلیں

ممتاز راشد

اکیلی شام ہے اس کو پکار آئے کوئی
جو بوجھ دل پہ ہے راشد اس کو اُتار آئے کوئی
مرے لئے تو رفاقت ہی تیری سب کچھ ہے
تو چاہتا ہے شجر سایہ دار آئے کوئی
سمیٹ لیتا ہوں میں بھی بساطِ تنہائی
وفا کی آخری بازی بھی ہار آئے کوئی
ہواؤں میں بھی چراغوں کی لَو بڑھا دوں گا
مگر یہ شرط ہے دریا کے پار آئے کوئی
نظر نہ آئے گا پھر غم چٹان کی صورت
جو شکل اس میں چھپی ہے اُبھار آئے کوئی

کسی کی ڈھال بنے کب کسی میں یارا ہے
ہر ایک جسم ہواؤں سے پارا پارا ہے
جہاں جہاں بھی گرا خاکِ شب چمک اُٹھی
مرا لہو بھی سُلگتا ہوا شرارہ ہے
مری صدی کا نشاں ہیں بجھی ہوئی شمعیں
کہ آندھیوں میں بجھے دیر تک پکارا ہے
تری وفائیں بھی بے رنگ ہیں خلا کی طرح
مرا وجود بھی ٹوٹا ہوا ستارا ہے
بکھرتے بجھتے ہوئے رنگ دیکھ لو راشد
زوالِ شام کا یہ آخری نظارا ہے

عوض سعید

کوہِ ندا

غالباً دو جسموں کی خواہش نے اسے جنم دیا تھا تب ہی تو وہ ایک ایسا پتھر تھا جسے کبھی بھی دیوار میں فٹ نہیں کیا گیا۔ وہ ملبے میں پڑی ہوئی ٹیڑھی میڑھی اینٹوں کو اپنے ہاتھ میں لے کر بڑی دیر تک سونگھتا رہا۔ اچانک اس کے کانوں نے ایک کریہہ آواز سنی "ابے او مردود کیا اپنے ساتھ اینٹ اور پتھر بھی لے جائے گا"

لیکن آج تک اس نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ اسے یہاں سے کیا لے جانا چاہیئے وہ بغیر کسی ردِ عمل کے آگے بڑھ گیا۔ وہ اپنے گھر سے کب بھاگا تھا۔ اس کا دراصل گھر تھا بھی یا نہیں اُسے کچھ یاد نہیں تھا۔ اُسے یہ بھی یاد نہیں تھا کہ اس کا باپ کون ہے اور اس کی ماں کون اگر وہ کسی کا بیٹا ہے تو وہ پھر باپ کیوں نہیں ہو سکتا ہے سوچ کے اس پُرپیچ زینے پر پہنچ کر وہ چپ ہو گیا سامنے ایک مریل کتے کو گزرتے ہوئے اس نے دیکھا۔ اس نے جب پیار سے سیٹی بجائی تو وہ دم ہلاتا ہوا اس کے پاؤں کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ اسے لگا جیسے وہی اس کا بیٹا ہو لیکن وہ تو دھوبی کا کتا تھا، گھر کا نہ گھاٹ کا۔ اور اسے غالباً ایسے ہی کتے کی تلاش تھی۔ قبل اس کے کہ وہ آگے بڑھ کر اسے پچکارتا میونسپلٹی کے جوانوں نے دیکھتے ہی دیکھتے اس کے گلے میں پھندا لگا دیا اور ایک بے دم احتجاج کے ساتھ ان کے ساتھ ہو لیا وہ ایک ثانیہ کے لئے مسکرایا اور دھیرے دھیرے قدم ناپتا بازار کے ہنگاموں میں کھو گیا۔

سڑک پر گزرنے والے ہر دوسرے آدمی کو روک کر اس نے پوچھا

"باباجی ایسی بھی کیا جلدی ــــ ماں جی کہاں جا رہی ہیں آپ ــــ بہن جی" لیکن کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی ان کے ہونٹ سلے ہوئے تھے۔ لیکن منجمد آنکھوں کے گونگے اشاروں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ زمین پر اس لئے نہیں پھینکے گئے کہ مسئلوں میں الجھیں، وہ مایوس ہو کر ایک بُک اسٹال پر آکر کھڑا ہو گیا جہاں لوگ کافی تعداد میں کھڑے اخبار پڑھ رہے تھے۔ ان میں کثیر تعداد ان نوجوانوں کی تھی جو بڑی شتابی سے صرف اخبار کی سرخیاں پڑھ رہے تھے جیسے وہ شب و روز کی زندہ تصویر رہے ہوں۔

سرخیاں ــــ
اخبار کی پڑھ لو۔
آج
اتنا ہی کافی ہے
کون متن کا زہر پیئے گا
کس کو اتنی فرصت ہے
یہ تو روز کا رونا ٹھہرا

اس نے سوچا کتاب اور اخبار کی پیشانیوں پر وہی کچھ لکھا ہو گا جو ان چہروں پر پہلے ہی سے ثبت ہے۔

پھر یہ لوگ اخبار کیوں پڑھ رہے ہیں؟ کیا وہ بھی ان ہی میں سے ایک ہے اس خیال کے آتے ہی وہ اپنے چہرے کو ہاتھوں سے نوچنے لگا۔ اسے ایسا کرتے ہوئے کسی قسم کی لذت محسوس نہیں ہوئی۔ اس لئے کہ اب وہ خود اذیتی کی لذت آشنائی سے کوسوں دُور تھا۔

چلتے چلتے اُسے سامنے ایک ہوٹل دکھائی دیا۔ اس کا جی چاہا کیوں نہ یہاں چائے پی لی جائے چنانچہ وہ ہوٹل میں داخل ہوا۔ بیرے نے چائے کے ساتھ اس کے سامنے اخبار بھی لاکر رکھا۔

"مجھے اخبار نہیں چاہئے" اس نے بیزار لہجے میں بیرے سے کہا۔
اخبار پڑھنے ہی کے لئے تو لوگ ہوٹل آتے ہیں"
بیرے نے اس طرح کہا جیسے چائے کے ساتھ اخبار پڑھوانا بھی اس کے فرائض میں داخل ہو۔
"میں اخبار نہیں پڑھتا۔"

بیرے کی سمجھ میں شاید بات آگئی۔ اس لئے وہ دوسرے گاہکوں کی طرف متوجہ ہوگیا چائے پی کر جب وہ ہوٹل سے باہر آیا تو سڑک پر لوگوں کا اژدحام تھا۔ آج سے کوئی پندرہ بیس برس پہلے جب وہ اس سڑک سے گزرتا تھا تو اسے بڑی ویرانی کا احساس ہوتا تھا اب جگہ جگہ اسے نئی عمارتیں دکھائی دے رہی تھیں وہ چھوٹی چھوٹی دکانیں۔ پتہ نہیں کہاں گم ہوگئی تھیں، ہوسکتا ہے ان ہی چھوٹی چھوٹی دکانوں نے اب بڑی دکانوں کا روپ دھار لیا ہو —— ارے بھئی یہاں اتنی بھیڑ کیوں جمع ہوگئی ؟"

اس ہجوم میں گھرے ہوئے ایک آدمی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔
اماں دیکھ نہیں رہے ہو یار۔ دو بچوں میں زوردار ٹکے بازی ہورہی ہے، میں نے بھی شرط لگادی ہے کہ گڈ وہی کامیاب ہوگا اور وہ کالا لونڈا پسپا ہوکر بھاگ کھڑا ہوگا تمہارا کیا خیال ہے ؟"

مگر وہ اپنا خیال ظاہر کئے بغیر آگے بڑھ گیا شہر کی لمبی چوڑی سڑکیں دیر گئے تک اس کا تعاقب کرتی رہیں۔
پھر اس نے ایک اور ہجوم کو دیکھا اس ہجوم میں بچے بوڑھے، جوان سب ہی شامل تھے اس نے سوچا کیا بات ہے، آج ہر جگہ، ہجوم اور اژدحام کیوں ہے ؟ اب وہ بھی اس ہجوم میں شامل ہوگیا۔ "پھر کیا ہوگیا بھائی ؟"
اس نے ایک نوجوان سے پوچھا۔ پتہ نہیں سنا ہے ایک نوجوان نے کسی سے ماچس طلب کی تو اس نے کہا۔
سگریٹ پینے کا اتنا ہی شوق ہے تو ماچس کیوں نہیں رکھتے"، ماچس مانگنے والے نے اس کے سوال کا جواب دینے کی بجائے اسے گالی دے دی اور تکرار کے بعد ماچس نہ ملنے پر اس آدمی نے نوجوان کے پیٹ میں چاقو گھونپ دیا۔ خون دیکھو رہے ہو کتنا بہہ گیا ہے۔ شاید وہ ہسپتال میں اب تک مر بھی گیا ہو اگر اس نے ماچس دے دی ہوتی تو یوں جاں تو نہ جاتی۔"

وہ اچانک ہجوم سے نکل کر باہر آگیا اس کا جی چاہا کہ یہ شہر بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ دے مگر وہ اس طرح کتنے شہر چھوڑتا رہے گا ؟ ذرا سی بات کا بتنگڑ بنا کر یہ لوگ کیوں فساد بپا کرتے ہیں اس سوال کا جواب خود اس کے پاس نہیں تھا۔ مگر سب لوگ ایسے تھوڑا ہی ہوتے ہیں یہ طمانیت اس کے لئے کافی تھی اور وہ اسی طمانیت کے سہارے جی رہا تھا۔ وہ سڑک سے گزرتا ہوا جب چوراہے پر آیا تو اس کے کانوں میں ایک آواز گونجی۔
یہ بچہ کس کا ہے ؟ اس بچے کا رونا مجھ سے دیکھا نہیں جاتا"۔ بوڑھا مسلسل کہے جارہا تھا بچہ واقعی پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا اور لوگ بوڑھے کی آواز سن کر بھی اپنی لاتعلقی کا اظہار کر رہے تھے۔
اب بچے کو پولیس ٹاون لے جانا ہی پڑے گا۔ بوڑھے نے بڑی مایوسی سے کہا۔ اس نے سوچا اس کا باپ بھی اسے اسی طرح سڑک پر پھینک کر آگے بڑھ گیا ہوگا

ایک آدمی جب اپنے بچے کو سڑک پر پھینک کر غائب ہوجاتا ہے تو دوسرا آدمی اسی بچے کو پیار سے اٹھا لیتا آدمی بھی عجیب شئے ہے شاید اسی لئے اسے آسمان کی بلندی سے نیچے پھینکا گیا۔ وہ یوں ہی چلتا رہا۔
کوئی تو اسے آواز دے کر پکارے، وہ کون ہے؟ اس کا باپ کون ہے؟ اس کی ماں اسے جنم دے کر اچانک کہاں غائب ہوگئی کیا شخصیت اور ذات کی پہچان کے لئے باپ کا نام ضروری ہے۔ اگر ضروری نہیں ہے تو وہ اس قدر بے چین اور افسردہ کیوں ہے ؟ کیا وہ اندر سے بالکل ٹوٹا ہوا ہے ؟ وہ مسلسل چلتا رہا۔ چلتا رہا۔ اب بے پناہ تھکن سے راستے سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔ شہر نے اپنے چہرے پر خاموشی کی ایک دبیز چادر تان رکھی تھی۔
آدمی جب جاگتا ہے تو شہر نیند کی وادیوں میں چلا جاتا ہے اور جب شہر جاگتا ہے تو آدمی سوجاتا ہے۔ اسے یوں لگا جیسے وہ صدیوں پرانی کہانی کا وہ مسافر ہے جو شہر شہر، قریہ قریہ گھومتا ہوا ایک ایسے شہر میں داخل ہوا تھا جہاں سب چیزیں تو تھیں سوائے آدمی کے۔

(سلسلہ صفحہ ۲۴ پر دیکھئے)

کاش

ڈاکٹر احسن رضوی

گھر پہونچا۔ کمرہ کھولا
سناٹے نے بڑھ کر استقبال کیا
بستر پہ بکھری ہوئی کتابوں اور رسالوں نے گھورا
اِدھر اُدھر پھیلی چیزوں نے بھی تاکا
دھیان بٹایا فرنیچر پہ جمی گرد نے
روشندان پہ بیٹھی چڑیا نے ٹوکا

پھر میں کرسی پہ بیٹھا یہ سوچ رہا ہوں
کاش ایسے میں
ہونٹوں پہ مسکان لیے کوئی آتا۔ اور یہ کہتا
یہ لیجیے پانی پیجیے
بہت تھکے ہیں
ابھی میں چائے لاتی ہوں

فرار

مظہر محی الدین

یہی سوچ کر بھاگ آیا تھا گھر سے
کہ ان وادیوں
سبزہ زاروں میں
رنگین فضاؤں میں
کچھ تو سکوں مل سکے گا
مگر یہ حسین اور سرسبز
شاداب و رنگیں فضائیں
مرے رنجِ تنہائی کو پھر ہوا دے رہی ہیں
مرے عہدِ مرحوم کو پھر جِلا دے رہی ہیں
ہر اک پل یہ احساسِ تنہائی کو ڈس رہی ہیں
نہیں ـــ یہ میرے رنجِ تنہائی کا مداوا نہیں ہے
نہیں ـــ اب یہاں ایک پل کے لئے بھی نہیں
مجھے پھر وہیں شہر کی بھیڑ میں لے چلو
میں کچھ دن ابھی اور جی تو سکوں گا !!

پرانے تاریخی قلعے سے لگا ہوا وہ مہیب پہاڑ آسمے اب صاف دکھائی دے رہا تھا سیاحوں کے گلے میں کیمرے لٹکے ہوئے تھے۔ لوگ حال سے نکل کر ماضی کی درخشاں تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے اپنے آبا و اجداد کے کارناموں کو سراہ رہے تھے۔ یہاں بھی کافی ہجوم تھا۔ لڑکیاں، بچے، بوڑھے، نوجوان، سب ہی تھے۔ اُسے گمان گزرا کہ یہی وہ پہاڑ ہے اور اسی پل صراط پر سے اسے گزرنا ہے بس کوہ ندا سے بلاوا آنے کی دیر ہے اب وہ اپنے شب و روز کا حساب چکاتے چکاتے تھک سا گیا تھا۔ آگے بڑھ کر وہ بھی اس ہجوم میں شامل ہو گیا۔

پھر اچانک اس نے ایک زوردار دھماکے کی آواز سنی۔ کوہ ندا ـــ اس نے سرپٹ بھاگنا شروع کر دیا لیکن تھوڑی دور جانے کے بعد وہ نڈھال ہو کر گر پڑا۔

صلاح الدین نیر

حُسن کی کب تک پردہ داری، عشق ہی اپنا رسوا کیوں
تم کو جس نے دل سے چاہا اس سے رشتہ ٹوٹا کیوں
پروانہ تو پروانہ ہے جلنے کیا انجامِ وفا
عشق کی لَو پر جلنے والا اپنی آگ میں جلتا کیوں
پاؤں تو میرے زخمی ہی تھے تم کو کیا معلوم نہیں
جانا اگر تھا چھوڑ کے مجھ کو تم نے مُڑ کے دیکھا کیوں
اب کے برس ان فرزانوں نے پھولوں کی تعریف بہت کی
پھر بھی کسی نے یہ نہیں پوچھا زخم ہیں دل کے تازہ کیوں
مجھ کو اور بھٹکنے دیتے منزل پر تو رُکنا تھا
راہِ وفا دشوار اگر تھی تم نے رستہ روکا کیوں
لوگوں نے جب آپ کو پوچھا میں نے بتایا اپنا نام
بات تھی اتنی معمولی سی اس پر اتنا غصّہ کیوں
چرچے تھے بے لوث وفا کے پھولوں سے بھی رشتہ تھا
راہِ وفا پر خار اگر تھی آپ کا دامن اُلجھا کیوں
جو کچھ بھی حالات تھے نیّر تم نے کبھی یہ غور کیا
شیشۂ دِل نازک تو بہت تھا اتنی جلدی ٹوٹا کیوں

نصیر احمد نصیر گلبرگوی

خون کا عکس تو خنجر میں نہ تھا
مجھ سا گھائل کسی لشکر میں نہ تھا
پیاس صحرا نے بجھائی ہوگی
ایک قطرہ بھی سمندر میں نہ تھا
سو گئے رات کی چادر میں سبھی
خواب نیندوں کے مقدر میں نہ تھا
ہاتھ مہندی کے شفق تک نہ گئے
رنگ موسم کا گُلِ تر میں نہ تھا
عکس آئینے کا جانچا نہ گیا
ضبطِ احساس کے پتھر میں نہ تھا
سب تھے خونخوار درندوں کی طرح
ایک انساں بھی مرے گھر میں نہ تھا
راکھ ہونے کا ہُنر بھی لے نصیر
شعلۂ غم کے مقدر میں نہ تھا

محمد علی اثر

ستارے بجھ رہے ہیں، زندگی تقسیم ہوتی ہے
سرِ مژگاں کوئی شئے شبنمی تقسیم ہوتی ہے
بنامِ ہوش یاں دیوانگی تقسیم ہوتی ہے
تمہارے شہر میں بے چہرگی تقسیم ہوتی ہے
شعورِ حُریّت جب ڈوب جائے گا اندھیرے میں
تو دیکھیں کس اُفق پر بندگی تقسیم ہوتی ہے
دکن کی سرزمیں ہے اب بھی روشن نورِ دانش سے
دیارِ علم و فن میں آگہی تقسیم ہوتی ہے
اثر دل کے اُفق پر پھر نیا سورج اُبھر آیا
نفس کی آگ غم کی روشنی تقسیم ہوتی ہے

غزل

بادۂ کہن

سید علی منظور

سید علی منظور ولد سید شہاب الدین ۱۹ ستمبر ۱۸۹۶ء کو حیدرآباد کے مہدوی سادات گھرانے میں پیدا ہوئے، اس درویش خدامست نے وضعدارانہ زندگی بسر کی۔ افلاس و تنگ دستی میں بھی باوقار زندگی گذاری۔ گوشہ نشین اور قناعت پسند سخنور تھے۔ مدراس یونیورسٹی سے منشی فاضل کیا۔ محکمہ طبابت و صحت عامہ حکومت حیدرآباد سے وظیفۂ حسن خدمت لیا۔ ۱۱ر نومبر ۱۹۵۵ء کو رحلت ہوئی۔

"ادارۂ ادبیات اردو" سے دو شعری مجموعے "نمودِ زندگی" ۱۹۴۰ء اور "ترجمانِ زندگی" ۱۹۵۴ء شائع ہوئے

نظم کے باکمال سخنور تھے۔ غزل اور دیگر شعری اصناف میں خاصا درک رکھتے تھے۔ ڈاکٹر زورؔ نے لکھا ہے کہ۔

"علی منظورؔ عہدِ حاضر کے اُن چند کامیاب شاعروں میں سے ہیں، جنھوں نے اپنے کلام میں زندگی کی ترجمانی کو منصبِ اوّل قرار دیا۔ وہ جذبات کو اپنے قابو میں رکھ کر پختہ گام سالک کی طرح، آگے بڑھ رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی شاعری "نوجوانوں کے کلام کی طرح" مجذوب کی بڑ" نہیں معلوم ہوتی اور عہدِ حاضر کا کوئی شاعر اس آن بان میں ان کا حصہ دار نہیں۔"

علی منظورؔ کا کلام، "ہمایوں" لاہور، "ساقی" دہلی اور "ادبی دنیا" لاہور کے علاوہ "سب رس" اور کئی معیاری علمی رسائل و جرائد میں بکثرت شائع ہوتا رہا ہے۔ امجدؔ اور صفیؔ کی طرح، علی منظورؔ بھی دکن کے مقبول اساتذۂ سخن سے ایک تھے۔ جن کی شہرت بوئے گل کی طرح دُور، دُور تک پھیل گئی۔ (و۔ خ)

وہ معاملہ وہ عالم، وہ ہنسی مذاق باہم — کبھی تو نے کہہ دیا "ہم" کبھی ہم نے کہہ دیا "میں"
مری زندگی کا نقشا، تری بندگی سے بدلا — ترا نام اگر نہ جپتا، تو کیسے پکارتا میں!
خوشی نہیں، غمگیں نہیں، منعم نہیں، سائل نہیں — کچھ برائے نام بن جانے کا میں قائل نہیں
یہ بھی قابل، وہ بھی قابل، سب ہیں قابل بزم میں — ذکر یاں منظورؔ کا! منظور اس قابل نہیں
اچھا بُرے بھلے کا، نہیں ہم کو امتیاز! — دیکھیں اب اپنے دل کو بھی تیری نظر سے ہم
سُلجھا رہے ہیں کاکُلِ شامِ فراق کو! — اُلجھیں گے کیا ہجومِ شعاعِ سحر سے ہم
قہقہے ہیں، غرورِ حسن کی ضد — مُسکرانے میں کیا قباحت ہے

دردِ دل میں سناؤں، وہ پوچھیں — یہ فسانہ ہے یا حقیقت ہے
قدرِ صبحِ وطن کی آج ہوئی!! — کیا بھیانک یہ شامِ غربت ہے
بت بھی اپنی زباں میں کہتے ہیں — حُسن کی جان آدمیت ہے
جاں نثاروں کے لئے، ساغرِ زہراب ہے، ستم — بے وفاؤں کو ملے جامِ مےِ ناب، یہ کیا
رنج سہنے کے لئے ربط بڑھایا تو نہ تھا! — ہے مری جان کا دشمن غمِ احباب، یہ کیا
لبِ دریا کو ابھی چوم رہی ہے کشتی — دھمکیاں دینے لگا ہے مجھے گرداب، یہ کیا
رات بھر جاگ کے سو جاتے ہیں تارے دن بھر — رات دن میں رہوں بیتاب ہی بیتاب، یہ کیا
کائناتِ دلِ خوں گشتہ بہی جاتی ہے — میری آنکھوں سے تو جاری نہیں سیلاب، یہ کیا
نہر کے اس طرف احباب کئی جا پہنچے — میں جب آیا نہ رہی نہر بھی پایاب، یہ کیا
کم نگاہی مری، کس کس کا تعاقب کرتی! — کیا خبر مجھ پہ کن احباب نے کب وار کیا!
ماجرائے زرِ گل اور یہ حاتم سیرت — کیا کیا..... کیا کسی نادار کو زردار کیا
دید یا دلِ سبزہ، جان نہ دی منزل پہ — شرم کی بات ہے، یہ بھی کوئی ایثار کیا
سو نہ جائے کہیں یہ سوئی ہوئی سی پُرفن — میں نے دُنیا کو اسی خوف سے بیدار کیا
یہ غزل دیکھ کے منظور احسن منہ نہ بنائیں — تم نے باندھا ہے کسی شعر میں بھی پیار کیا؟
جس کی تھی دل کو تمنا، وہی صورت دیکھی — جس کی نظروں کو طلب تھی، وہی منظر دیکھا
جم گیا دھیان اُنھیں کا، وہی انصاف کریں — سرسری دیکھ لیا ہے کہ سمجھ کر دیکھا
کبھی کردار کو جانچا، کبھی تیور دیکھے — کبھی ملبوس کو پرکھا، کبھی زیور دیکھا
انگلیاں دیکھ کے نازک سی کلائی دیکھی — لے کے زُلفوں کی بلائیں، رُخِ انور دیکھا
حُورِ فردوس تو فردوس میں آئے گی نظر — رُوکش حُور کو پاس اپنے زمیں پر دیکھا
یاد ان کی بے نتیجہ ہو نہیں سکتی کبھی! — یاد اُن کی بے نتیجہ ہو تو پھر فریاد کر
اس سہی قد کا تصور دل میں جم جانے تو دے — بعد اس کے شوق سے نظارۂ شمشاد کر
حُور و غلماں بھی حسیں ہیں، عشق کا منکر نہ بن — لیکن انساں ہے تو قدرِ حُسنِ آدم زاد کر
دل میں عنبر آ جائے تو موجودہ ویرانی بھلی — اپنے ویرانے کو اپنے دوست سے آباد کر
ہاں! کہہ تو دیا تھا نکہتِ دوست کو مینوش — کس وجہ سے کس دن یہ کہا تھا نہیں اب ہوش
کھلتا نظر آتا ہے مرا غنچۂ خاطر! — ہنستے نظر آتے ہیں سمن پاش، سمن پوش
چلتے ہوئے نعرے ہیں محبت کے تقاضے — میں کر نہ سکوں گا ترے فقروں کو فراموش
اچھا..... یہ صلائے کرم و رندنوازی! — بہتر..... یہ جہانِ طرب، وبادۂ سرجوش

••

حیدرآباد کے شاعر
(۲۲)
مصحف اقبال توصیفی

۱۹۶۲ء میں ریاستی ساہتیہ اکیڈمی کے مطبوعہ دو تذکروں کا توسیعی سلسلہ

عبد المغنی، مصحف اقبال توصیفی کا پیدائشی نام ہے۔ ۸ر ڈسمبر ۳۹ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے۔ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے ایم ایس سی ہیں اور آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا میں جیالوجسٹ ہیں اور ملازمتی مصروفیات میں ملک کے کئی صوبوں کی سیاحت کر چکے ہیں۔

مصحف اقبال توصیفی، صاحب طرز سخنور ہیں، ان کی شعری تخلیقات ہند و پاک کے معیاری جرائد میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے ان کے پہلے مجموعۂ کلام "فائزہ" کے فلیپ پر لکھا تھا کہ مصحف اقبال توصیفی کا مشاہدہ بہت تیز ہے، اس قدر کہ اگر وہ شاعر نہ ہوتا تو سائنس داں ہوتا۔ اس مشاہدے نے ان کے ہاں معروضی انداز نظر کو تحریک دی ہے جو شاعری کے لئے بیک وقت سنگ گراں بھی ہے اور نعمت غیر مترقبہ بھی۔ پل صراط پر چلنے کا یہ عمل توصیفی کی نظموں سے پوری طرح مترشح ہے مختصراً یہ کہ توصیفی نے اسلوب کی شکل زمین میں لفظوں کے سیل رواں کا خوبصورت منظر دکھایا ہے جو دل اور دماغ دونوں کو ٹھنڈک پہنچاتا ہے۔

مصحف اقبال نظم اور غزل خوب کہتے ہیں۔ شخصیت اور فطرت دونوں میں شائستگی اور انکسار روشن نظر آتا ہے۔ بجز سے الگ رہتے ہوئے تخلیقی کام کو خوش اسلوبی سے سر انجام دینا کوئی ان سے سیکھے مجموعہ کلام فائزہ ڈسمبر ۷۷ء میں شائع ہوا۔ (و۔غ)

خشک پتوں پہ اپنا نام لکھیں بین کرتی ہوا کے ساتھ چلیں
جس سے لی تھیں اسی کو لوٹا دیں یہ رہیں صبحیں، یہ تری شامیں
غم کو لے جائیں اک پہاڑ پہ آج اور اس بے حیا کو دھکا دیں
دیکھیں کیا کر رہی ہے تنہائی آج اپنے ہی گھر پہ دستک دیں
کیا بھروسہ زمیں کی گردش کا شام ہو جائے اور نہ ہم لوٹیں

دل میں جلتا ہے اک چراغ جلے
اب اگر تیرا نام بھی ہم لیں

جزیرے ہات ملتے رہے گنگناتے ہوئے قدم رکھانے ساحل پہ میں لے ڈستے ہوئے
فلک پہ چاند ستارے زمیں پہ پھول چراغ وہ میرا ہو گیا سب کو گواہ کرتے ہوئے
جو مجھے ساتھ گذارے نہ ان کی چیخ سنی نہ اس نے دیکھا میرے جسم کو بکھرتے ہوئے
نہ کوئی سمجھے گا تیری وفا کا یہ انداز نہ مجھ کو دیکھے گا اب مجھ سے بات کرتے ہوئے

نہ جانے کیوں مجھے اپنی زمیں کی یاد آئی
اک آنسو پونچھ لیا چاند پہ اُترتے ہوئے

بے چہرہ آرزو تھی، خوشی بے لباس تھی شاید وہی گھڑی مرے غم کی اساس تھی
میرے بدن پہ ہو گی ہزاروں برس کی گرد آنکھوں ہی میں چھپی ہوئی صدیوں کی پیاس تھی
وہ کاغذی سہی، مگر اچھے لگے مجھے ہر چند ان گلوں میں نہ بو تھی نہ باس تھی
کیا بات تھی نہ جانے جو دل ہی میں رہ گئی کیوں اُن دنوں بہت تری ملنے کی آس تھی

وہ آنکھیں کہہ رہی تھیں ہمیں جام لے کے آئی
وہ میرے پاس آئی تو کتنی اداس تھی

اپنی باہوں میں سمٹ کر مجھے مر جانے دو میرے دل پہ ہے بہت بوجھ اُٹھا جانے دو
وقت کی دھوپ میں اب سایۂ دیوار نہ ہو راستہ چھوڑ دو مجھ کو [illegible] جانے دو
اشک آنکھوں میں کہیں آئے تو منہ پھیر لیا اب میں جاؤں گی؟ مجھ کو [illegible] جانے دو
آگیا میں کسی تتلی کے تعاقب میں کہاں مجھ کو ماضی کی صدا بن کے بکھر جانے دو

آخری بار [illegible] ترے زہر کا یہ جام پی لوں
اپنی الفت سے مجھے آج گزر جانے دو

رشید الدین

بخت کی یاوری

جس طرح ہندوستان میں بنارس کو مندروں کا شہر کہا جا سکتا ہے اسی طرح پاکستان میں لاہور بلاشبہ مسجدوں کا شہر ہے۔ وہ شہر ہے جہاں سب سے پہلے مسلمانوں نے سکونت اختیار کی اور یہاں اپنی تہذیب و تمدن کی نشانیاں قائم کیں۔ لاہور میں ہر دور کی ایک سے ایک عالی شان اور فنِ تعمیر کے نقطۂ نظر سے نادر مساجد موجود ہیں۔ ان ہی مساجد میں ایک مسجد وزیر خاں ہے جو جہانگیر کے شاہی طبیب وزیر خاں کی تعمیر کردہ ہے اور اسی کے نام سے مشہور ہے۔

ایک زمانہ تھا جب وزیر خاں اپنے متعلقین کی ضروریات کا کفیل تک نہیں ہو سکتا تھا اور معمولی دیہاتی حکیم تھا۔ اور ایک زمانہ آیا کہ اس نے ایسی عالی شان مسجد تعمیر کرائی۔ اس کی زندگی کا جائزہ ایک دلچسپ مطالعہ اور اس بات کی جیتی جاگتی مثال ہے کہ س طرح قسمت انسان کا ساتھ دیتی ہے اور بخت اس کی یاوری کرتا ہے۔

وزیر خاں کا اصلی نام علیم الدین انصاری تھا۔ وہ پنجاب میں چنیوٹ نامی ایک مقام پر ایک معالج کی حیثیت سے اپنی زندگی ے دن گزار رہے تھے۔ وہ اہلِ انصار میں سے تھے۔ ان کے اجداد پھرتے پھراتے ہندوستان پہنچ گئے اور پنجاب میں بس گئے۔ بم الدین انصاری نے اس زمانے کے شرفا کی طرح پہلے عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی اور پھر طب کا نصاب مکمل کیا۔ انہوں نے صرف ے طالب علم کی حیثیت سے ہی طب نہیں پڑھی بلکہ انہیں اس علم سے دلچسپی بھی تھی۔ اور چند ہی دن میں انہوں نے تشخیص مرض و تجویز دویات میں اچھی خاصی مہارت حاصل کر لی اور اپنا مطب قائم کر لیا۔

لیکن بدقسمتی سے ان کا مطب چلا چلایا نہیں۔ عام طور پر قصبہ میں یہ مشہور تھا کہ حکیم انصاری قابل تو ضرور ہیں لیکن ان کے ہاتھ میں شفا قطعی نہیں۔ لوگ ان کی قابلیت سے استفادہ کرتے ہوئے مرض کے بارے میں ان سے مشورہ ضرور کرتے لیکن دوا وہ قصبہ کے یلے حکیم علی نقی سے لیتے تھے جو حکیم نقن کے نام سے مشہور تھے۔

ظاہر ہے کہ لائق و فائق علیم الدین انصاری کو یہ بات بے حد ناگوار گزرتی تھی لیکن وہ پھر بھی اس پر صبر کر لیتے۔ لیکن ان کے صبر کا پیمانہ اس وقت لبریز ہو جاتا جب ان کی بیوی انہیں طعنے دیتی۔ اچھی خاصی کمائی کرنے والے اور معقول آمدنی کے حامل اشخاص بھی اپنی بیویوں کے طعنوں سے نہیں بچ سکتے۔ پھر یہاں تو معاملہ واقعی گڑبڑ کا تھا۔ ایک دن تو نوبت فاقے تک پہونچ گئی اور رات کو کھانے کے لئے کچھ میسر نہ آسکا۔ خود دار حکیم نے کسی سے ادھار لینا یا کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرنا بھی مناسب نہیں سمجھا۔ بیوی کے طعنوں کی انتہا نہ رہی۔ "تف ہے تمہاری اس زندگی پر اور لعنت ہے تمہاری اس قابلیت پر۔ حکیم نقن اگر تمہارے نزدیک نااہل ہیں تو ان کی جہالت تمہاری اس قابلیت پر قربان"۔ حکیم علیم الدین نے انتہائی خاموشی کے ساتھ سب کچھ سُنا اور عشار کی نماز کا وقت آیا تو وضو کر کے مصلیٰ پر پہنچ گئے۔ نماز ختم کی اور خدا سے دعا مانگی کہ وہ انہیں اس صورتِ حال سے نجات دلائے اور انہیں معاشی آسودگی عطا کرے۔

نماز سے فارغ ہوئے تو کسی نے دروازے پر دستک دی۔ حکیم صاحب چراغ لے کر گھر سے باہر نکلے تو دیکھا کہ قصبہ کا چوکیدار چند اجنبی لوگوں کے ساتھ موجود ہے۔ ان لوگوں نے انہیں بتایا کہ ان کا قافلہ کابل سے چلا ہے اور آگرہ جا رہا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ان کے قافلے کے سردار مظفر خاں کے پیٹ میں شدید درد اٹھا ہے اور وہ مچھلی کی طرح تڑپ رہے ہیں۔ ان کا پڑاؤ یہاں قریب ہی ہے کسی زود اثر دوا کی ضرورت ہے۔ حکیم صاحب نے ان سے چند ضروری باتیں دریافت کیں اور اپنی سمجھ کے مطابق دوائیں لے کر ان کے ساتھ ہو لئے۔

وہاں پہنچے تو انہیں اس نتیجہ پر پہنچنے میں دیر نہیں لگی کہ سردار مرض قولنج سے بے تاب ہے۔ دو دن سے اجابت بھی نہ ہوئی تھی اور پیٹ انتہائی سخت ہو کر اکڑ گیا تھا۔ انہوں نے کھانے کے لئے کچھ دوا دی اور پیٹ کو اوپر سے سینکنے کے لئے کہا۔ تھوڑی دیر میں ریح کا اخراج ہوا تو سردار کی تکلیف کم ہونے لگی۔ حکیم صاحب کچھ دیر تک اس کے پاس بیٹھے رہے اور جب دیکھا کہ مریض کو سکون ہو رہا ہے تو چلنے کی اجازت چاہی۔ جاتے وقت سردار نے حکیم صاحب کو دس دینار دیے۔ اور کہا کہ اگر زحمت نہ ہو تو کل بھی آکر دیکھ جائیے ــــ وہ خوشی خوشی گھر پہنچے۔ اور دس دینار بے صبر بیوی کے حوالے کر دیئے اور کہا۔ "یہ حقیر رقم ہے۔ مگر تمہارے طعنوں کے مقابلہ میں یہ بہت کم ہے۔ لیکن اگر بخت نے یاوری کی تو آئندہ اس کی تلافی کی پوری پوری کوشش کروں گا۔"

دوسرے دن فجر کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد حکیم صاحب پھر سردار کے پاس پہنچے تو اس نے بتایا کہ صبح اجابت بھی صاف ہوئی اور اب وہ بالکل اچھا ہے۔ اس نے ان سے مزید کہا کہ ہمارا قافلہ تھوڑی ہی دیر میں آگرہ کے لئے روانہ ہونے والا ہے۔ میری یہ خواہش ہے کہ آپ اس چھوٹے سے قصبے کو چھوڑیئے اور آگرہ کو اپنا مرکز بنا لیجئے۔ اگر آپ بہتر سمجھیں تو ہمارے ہم سفر بن جائیے۔ سفر کے تمام اخراجات میں برداشت کروں گا۔ شہنشاہ جہانگیر بڑا ہی علم دوست ہے۔ اگر اس کی نظر آپ پر پڑ جائے تو وارے نیارے ہو جائیں گے"۔

حکیم صاحب خود چینوٹ میں اپنی ناقدری اور گھریلو حالات سے پریشان تھے۔ اس موقع کو غنیمت جانا اور اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔ تاہم انہوں نے سردار سے کچھ وقت طلب کیا تاکہ گھر جا کر اس کی اطلاع کر سکیں۔ جاتے وقت سردار نے انہیں مزید بیس دینار دیئے تاکہ وہ گھر والوں کو اپنے غیاب میں خرچ کے لئے دے سکیں۔ گھر پہنچ کر انہوں نے بیوی سے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ بچوں کو

ل رکھنے کو کہا اور قافلہ میں شامل ہوگئے۔

راستہ میں قافلہ میں جو بھی بیمار ہوتا حکیم علیم الدین اس کا بہت توجہ سے علاج کرتے۔ اور اچھا ہونے پر وہ حسب استطاعت انھیں عام و اکرام سے نوازتا۔ کھانے پینے اور سواری وغیرہ کا انتظام تو سردار کی جانب تھا۔ اس طرح آگرہ پہنچنے تک ان کے پاس فی رقم جمع ہوگئی۔ اور وہ اس قابل ہوگئے کہ کسی کی مالی اعانت کے بغیر اپنا مطب کھول سکیں۔ آگرہ میں ایک جگہ انہوں نے اپنا مطب م کردیا اور جلد ہی وہ چل نکلا۔

قسمت حکیم علیم الدین پر ایک بار چینوٹ میں مہربان ہوئی تھی اور دوسری بار آگرہ میں ہونے والی تھی۔ اسی اثنار میں ہوا یہ کہ ہ نورجہاں کو عرق النساء کی شکایت ہوگئی۔ شاہی طبیبوں اور حکیموں سے بہترا علاج کرایا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اس پر اسی قافلہ سردار جس کے ساتھ وہ آگرہ آئے تھے' کی سفارش پر جہانگیر نے اپنی چہیتی ملکہ کے لئے حکیم علیم الدین کا علاج کرانے کا فیصلہ کیا۔

حکیم صاحب شاہی بلاوے پر بادشاہ کے محل پہنچے۔ ملکہ کی نبض دیکھی اور یہ معلوم کیا کہ ایام کی خرابی کی وجہ سے تکلیف ہے۔ ر یہ رائے ظاہر کی کہ جسم میں فاسد خون جمع ہوگیا ہے بغیر فصد کھولے کے یہ مرض دور نہ ہوگا۔ نورجہاں اس کے لئے تیار ہوگئی۔ ر چند ہی دنوں میں اس کی مہینوں کی تکلیف جاتی رہی۔ ادھر ملکہ کی تکلیف ختم ہوئی اور ادھر حکیم علیم الدین کے دن پھر گئے۔ ملکہ نے یں کافی انعام و اکرام سے نوازا۔ اور جہانگیر نے اپنا شاہی حکیم مقرر کرکے خلعت فاخرہ عطا کی اور نواب وزیر خاں کا خطاب دیا۔

حکیم علیم الدین نے منت مانی تھی کہ جب بھی اللہ تعالیٰ انھیں عزت و دولت سے نوازے گا وہ ایک اچھی سی مسجد تعمیر کریںگے۔ منت کے پوری کرنے کا وقت اب آچکا تھا۔ حکیم صاحب نے مسجد کی تعمیر کے لئے اپنے آبائی علاقہ پنجاب کے سب سے بڑے شہر لاہور کا ب کیا اور جہانگیر سے بھی اس کا ذکر کیا۔ جہانگیر ان کے خیال سے بہت خوش ہوا اور اس نے انھیں پنجاب کا گورنر بنا دیا تاکہ وہاں اطمینان سے رہ کر مسجد کی تعمیر اپنی راست اور ذاتی نگرانی میں کراسکیں۔ اور انھیں بار بار آگرہ اور لاہور کے چکر نہ کاٹنے پڑیں۔ ا طرح لاہور کی یہ عالی شان مسجد تعمیر ہوئی۔ جو اپنے بنانے والے کے نام پر ہی مسجد وزیر خاں کے نام سے مشہور ہوئی۔ اور آج بھی مشہور ۔ اس طرح بخت کی یاوری سے پنجاب کے ایک چھوٹے سے قصبہ کا ایک معمولی حکیم جو اپنی بیوی بچوں کی ضروریات کا کفیل نہیں سکتا تھا پنجاب کا گورنر بن گیا اور لاہور میں ایک مسجد تعمیر کرکے ہمیشہ کے لئے اپنا نام جریدۂ عالم پر ثبت کرگیا۔

بقیہ ملک محمد جائسی صفحہ ۱۵ سے آگے

صرف یہی نہیں جائسی نے شیخ برہان کے پیر پیر ہ سلسلے کا بھی ذکر کیا ہے ان کے پیر اللہ داد اور اللہ داد کے پیر سید محمد' سید محمد کے پیر دانیال ر دانیال کے پیر سید راجے کا ذکر بھی کیا ہے۔ دانیال کو سید راجے تک پہنچنے میں خواجہ خضر نے رہنمائی فرمائی تھی۔ خواجہ خضر ذکر اکثر ہندی کے صوفی شعراء نے منجھن اور مدھومالتی اس کی بہترین مثالیں ہیں صوفی شعراء کا خیال ہے کہ اگر خواجہ خضر خوش ہوجائیں تو دشواریاں آسانیوں میں تبدیل ہوجائیں۔ چنانچہ جائسی نے بھی اس سلسلے کا ذکر خواجہ خضر سے شروع کیا ہے اور شیخ ہان پہ ختم کیا ہے۔ بہرحال! جائسی کے سلسلہ میں اختلافات کافی گہرے ہیں اور ان پہ مزید کام کی گنجائش ہے۔ ان کی سن پیدائش ور سن وفات کا مسئلہ ابھی تحقیق طلب ہے ••

محمد عظمت اللہ قریشی

پرندوں کی ہجرت

انسان دیدۂ حیرت لئے آسمان کی طرف پرندوں کے اُڑتے ہوئے بادلوں کو دیکھتا رہتا ہے کہ یہ جھنڈ کے جھنڈ نامعلوم منزلوں کی طرف کیوں پرواز کئے جاتے ہیں ۔ پرندوں کی زندگی کا ایک تحیر خیز امر ان کا اسی طرح ایک مقام سے دوسرے مقام کو پرواز کرجانا بھی ہے ۔ جسے پرندوں کا نقل مقام یا MIGRATION کہتے ہیں ۔ ان کی اس عجیب وغریب عادت نے صدیوں سے انسانی دماغ کو محو حیرت کر رکھا ہے ۔ آیئے دیکھیں کہ پرندے کس طرح اور کن وجوہات کی بنا پر نقل مقام کرتے ہیں ۔

پرندوں کا نقل مقام کرنا ایک دورخی سفر ہے ۔ جو موسم کی تبدیلی کے ساتھ ایک مقام سے شروع ہوتا ہے اور پھر موسم کے بدلنے تک اسی مقام پر ختم ہوتا ہے ۔ یہ سفر ایک معینہ وقت پر گرمائی مقام سے سرمائی مقام کی جانب سفر ہے ۔ ابتدا میں MIGRATION کے تعلق سے لوگوں نے غلط قسم کے نظریے قائم کر لئے تھے ۔ خود ارسطو نے جسے "بابائے حیوانیات" تصور کیا جاتا ہے یہ نظریہ قائم کیا تھا کہ سوائے سارس کے یا CRANES دوسرے تمام پرندے محض اپنے بچاؤ کی خاطر کسی جگہ جاکر چھپ جاتے ہیں ۔ ایک اور سائنس داں گلبرٹ کا خیال تھا کہ SWALLOW یا ابابیل سرما خوابی کے لئے کیچڑ میں چلا جاتا ہے لیکن اب ان نظریوں کو سائنسی تحقیق نے رد کر دیا ہے ۔

موجودہ درجہ بندی کے لحاظ سے پرندے دو قسم کے ہوتے ہیں ۔ ایک نقل مقام کرنے والے پرندے یا MIGRATORY BIRDS ہیں جو تمام پرندوں کے ایک تہائی حصے سے بھی زیادہ ہیں ۔ اور دوسرے سکونتی پرندے RESIDENTIAL BIRDS ہیں جو کبھی بھی نقل مقام نہیں کرتے ۔ جیسے BOB WHITE اور SAND GROUSE وغیرہ ۔

پرندے اپنے خوب صورت پروں کا بڑی دلیری سے استعمال کرتے ہوئے دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پہنچ جاتے

ہیں۔ ان میں سے ایک نقلِ مقام شمال اور جنوب کے درمیان ہی ہوتا ہے۔ شمالی نصف کرّے میں زمینی علاقے کی نباتات اور سرما میں برف کی موجودگی کی وجہ سے پرندے نسبتاً معتدل علاقوں کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں۔ جہاں انہیں رہائش اور غذا آسانی سے فراہم ہو جاتی ہے۔ اور پھر سرما سے محفوظ رہنے کے لئے جنوب کی طرف چلے جاتے ہیں۔ کئی شمالی امریکہ، یورپ، اور ایشیا کے پرندے سرما کی سختی سے محفوظ رہنے کے لئے خطِ استوا پر سے گزر کر جنوب کے علاقے یعنی جنوبی امریکہ اور افریقہ کے گرم خطوں کی طرف چلے جاتے ہیں۔ جیسے ایک پرندہ AMERICAN GOLDEN PLOVER سرما کے نو مہینے آٹھ ہزار میل دور ارجنٹائین کے گھاس کے خطوں میں گزارتا ہے۔ یعنی وہ بغیر سرما کو جانے ہوئے، ہر سال دو موسم گرما کا لطف اٹھاتا ہے۔ سرما میں سائبیریا کے بعض پرندے ہمالیہ کے میدانوں میں چلے آتے ہیں۔

جنوبی نصف کرّے میں پرندوں کا نقلِ مقام نسبتاً کم ہوتا ہے۔ جہاں کے موسم بالکل برعکس ہیں۔ بعض معتدل خطوں کے پرندے افزائشِ نسل کے لئے بارش کے موسم میں دور دراز کے شمالی معتدل خطوں میں چلے جاتے ہیں اور پھر خشک موسم میں وسطی خطوں کی طرف لوٹ آتے ہیں۔

بعض پرندے جیسے HERONS یا بگلے وغیرہ افزائشِ نسل کے بعد اپنے بچوں کو ساتھ لئے ایک تو دشمنوں کے خطرے سے محفوظ رہنے اور دوسرے غذا کی تلاش کے لئے کسی بھی سمت میں سیکڑوں میل دور نکل جاتے ہیں۔ اور بعض کمزور پرندے جیسے کوئل، WARBLERS اور THRUSHES وغیرہ طوفانی ہواؤں کے جھکڑ میں پھنس کر ہزاروں میل دور مغرب سے مشرق کی طرف بہتے ہوئے چلے آتے ہیں۔ کبھی کبھی سمندری پرندے سمندری طوفانوں کی وجہ سے دو ہزار میل دور تک بھی نامانوس ساحلوں پر تھکے ماندے یا مردہ پڑے ہوئے ملتے ہیں۔ بہرحال پرندوں کا نقلِ مقام ایک تو خود ان کی طبیعت کی اڑان اور دوسرے حالات پر منحصر ہوتا ہے۔

پرندوں کے نقلِ مقام کے طریقوں پر نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ بعض پرندے جیسے کوّے، چڑیا، عقاب، JAYS، GEESE، PELICANS، ROBINS، BLACK BIRDS، BLUE BIRDS اور بعض ساحلی پرندے صرف دن کے اوقات میں ہی سفر کرتے ہیں۔ یہ پرندے ایک منظم جھنڈ بنا کر اُڑنے کے عادی ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ عموماً ان کی جسامت اور غذا تلاش کرنے کے طریقے کی یکسانیت ہے۔ نر اور مادہ علحدہ علحدہ جھنڈ میں پرواز کرتے ہیں۔ نر مادہ سے پہلے پہنچتے ہیں تاکہ وہ گھونسلے تیار کر سکیں۔ لیکن پرندوں کی ایک بڑی تعداد راتوں میں ہی نقلِ مقام کرتی ہے۔ ان میں چھوٹے قسم کے پرندے جیسے چڑیا، طوطا، اور مینا وغیرہ شامل ہیں۔ راتوں میں پرواز کرنے کا ان کا عین مقصد تاریکی میں، اپنے آپ کو دشمنوں سے محفوظ رکھنا ہے۔ اگر وہ دن کے اوقات میں پرواز کریں تو رات آنے تک تھک جائیں اور پھر رات میں غذا نہ ملنے کی وجہ سے انہیں دوسری صبح تک انتظار کرنا پڑے، جو ان کے لئے موت کا پیغام بھی لا سکتی ہے۔ اسی لئے وہ راتوں میں ہی سفر کرتے ہیں تاکہ دن نکلتے نکلتے وہ محفوظ مقامات پر پہنچ جائیں اور پھر غذا حاصل کر کے آرام لینے کے بعد دوبارہ اپنی منزلِ مقصود کی طرف پرواز کریں۔

دیکھا گیا ہے کہ بعض پرندے زمین سے بہت نیچی اڑان لگاتے ہیں۔ اور بعض ۳۰ ہزار فٹ کی بلندی تک بھی پرواز کرتے ہیں۔ راڈار RADAR کے ذریعہ پتہ چلایا گیا ہے کہ بعض چھوٹے زمینی پرندے راتوں میں پانچ ہزار تا ۱۴ ہزار فٹ کی بلندی سے پرواز کرتے ہیں۔ بعض پرندے تو ۲۰ ہزار فٹ کی بلندی سے ہمالیہ کی اونچی چوٹیوں پر سے پرواز کر جاتے ہیں۔ پرواز کے دوران

ان کی رفتار مختلف پرندوں میں مختلف ہوتی ہے۔ جیسے عقاب ۳۰ تا ۴۰ میل فی گھنٹہ، ساحلی پرندے ۴۰ تا ۵۰ میل فی گھنٹہ اور بطخیں ۵۰ تا ۶۰ میل فی گھنٹے کی رفتار سے اڑتی ہیں۔ ایک سائنس داں اسٹوارٹ نے ہندوستان میں SWIFTS نامی پرندوں میں سب سے تیز رفتار ریکارڈ کی ہے جو ۱۷۱ تا ۲۰۰ میل فی گھنٹہ ہے۔ اسی طرح ایک دن اور ایک رات میں پرندے تقریباً ۵۰۰ میل کا سفر طے کرلیتے ہیں۔ اس قدر طویل اڑانوں کے لئے ان میں پہلے سے جمع شدہ چربیاں توانائی فراہم کرتی ہیں۔ یہ توانائی چربیوں کی تکسید سے حاصل ہوتی چربیوں کی تکسید کے لئے پھیپھڑوں کے علاوہ ہوائی تھیلیاں (AIR SACS) بھی ہوتی ہیں جو انہیں آکسیجن وافر مقدار میں پہنچاتی رہتی ہیں۔

پرندے عموماً پانچ تا چھ گھنٹے سفر کرتے ہیں۔ اور ان کی رفتار کا انحصار عموماً موسمی حالات پر ہوتا ہے۔ بارش، اولے پڑنا: ہواؤں کے تیز جھکڑ ان کی رفتار پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

پرندوں کے نقل مقام کے سلسلے میں ایک دلچسپ مشاہدہ یہ ہے کہ ان کی کئی اقسام اوقات کے بڑے پابند ہوتے ہیں۔ یعنی یہ بار بار نقل مقام کرکے ایک مقررہ تاریخ پر ایک خاص مقام پر پہنچ جاتے ہیں۔ باوجود راستے کی مشکلات اور ناسازگار موسم کے ٹھیک وقت پر آمد یا روانگی ان کا شعار رہا ہے۔ سال ہا سال سے اس بات کا مشاہدہ کیا گیا ہے کہ BARN SWALLOW نامی ایک پرندہ واشنگٹن میں ہر سال اپریل کی ۱۲ تاریخ کو اور CHIPPING SPARROW نامی پرندہ اپریل کی ۲۲ تاریخ کو ایک مخصوص مقام پر پہنچ جاتا ہے۔

یہ بات بھی تعجب خیز ہے کہ پرندے دور دراز کے مقامات سے ہر سال اپنے ہی آشیانوں کو لوٹ آتے ہیں۔ SPARROW نامی ایک پرندے کے پیروں میں چھلے پہنا کر اس بات کی تصدیق کی گئی کہ یہ پرندہ جنوبی افریقہ میں سرما گزار کر ہنگری کے ایک گاؤں میں مسلسل چھ سال تک اسی گھونسلے میں واپس آتا رہا۔ ہندوستان کے مشہور ماہر علم طیور (ORNITHOLOGIST) ڈاکٹر سالم علی نے WAG TAIL نامی ایک پرندے کے پیر میں ایلومینیم کا چھلا پہنا کر اس بات کا مشاہدہ کیا کہ کئی برسوں سے یہ پرندہ بمبئی میں ان کے باغ میں ہر سال مقررہ وقت پر آجاتا ہے۔

سوائے قطب شمالی اور قطب جنوبی کے سروں کے کرۂ ارض پر کوئی ایسی جگہ نہیں جس پر یہ پرندے نہ اڑتے ہوں۔ ان کی آمد و رفت کے راستے متعین ہوتے ہیں۔ نقل مقام ان کی زندگی کا ایک بہت بڑا معرکہ ہوتا ہے۔ نقل مقام کے دوران وہ اکثر خطروں سے دوچار ہوتے ہیں۔ بے کراں سمندروں پر طوفانی ہواؤں کی وجہ سے بعض پرندے پانی میں گر کر ڈوب جاتے ہیں اور کبھی کہرآلود راتوں میں وہ روشنی کی طرف متوجہ ہو کر اکثر روشنی کے میناروں لائٹ ہاؤز، اونچی اونچی عمارتوں، ٹیلی ویژن ٹاورس، اور طیران گاہوں کے سگنلنگ ٹاورس سے ٹکرا کر مرجاتے ہیں۔ اس کے علاوہ خود موسم کی سختیاں جیسے طوفان باد و باراں و شدید برف باری ان کے لئے جان لیوا ثابت ہوتی ہے اور بڑے پرندے جیسے عقاب اور خود انسان ان پرندوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنا شکار بنا لیتے ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان شدید خطرات کے باوجود پرندے کیوں نقل مقام کرتے ہیں؟ ان کی یہ طاقت پرواز بقدر لذت آزار بھی نہیں۔ اس کا جواب بالکل عیاں اور منطقی ہے۔ منطقہ بارده جہاں پرندوں کی کثرت سے افزائش ہوتی ہے صرف گرما کے تین ہی مہینوں میں قابل رہائش ہوتا ہے۔ سرما کے برفیلے طوفان اور دن کی مختصر سی مدت ان کی غذا کے لئے ایک بڑا مسئلہ بن جاتے ہیں۔ لہٰذا ان کے لئے ہجرت کرنا ناگزیر ہوجاتا ہے۔ گرما کی آمد پر ان کی واپسی، گھونسلوں کی باز آبادکاری، دن کی طوالت، غذا کی وافر مقدار بیک وقت یہاں ان کی عین ضرورت کے مطابق ہوتی ہے۔ لہٰذا پرندے دو نصف کروں پر موجودہ غذا سے استفادہ کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی نسل

جانے کے لئے ہجرت کرتے ہیں ۔ نقلِ مقام کا ایک اور سبب ان کی ایک ایسی حِس ہے جو وقتِ مقررہ پر جاگ اٹھتی ہے اور ایک طویل سفر کے لئے آمادہ کرتی ہے ۔ یہ تحریک دماغ میں موجود ایک غدود PITUTORY GLAND سے پیدا ہوتی ہے ۔ موسم بہار میں روشنی کی زیادتی یا موسم خزاں میں روشنی کی کمی اس غدود پر اثر انداز ہوتی ہے ۔ اور یہ اثر جنسی غدودوں میں ایک … پیدا کرتا ہے جو سارے عصبی نظام کو متاثر کرتا ہے جس کے نتیجہ میں پرندوں میں نقلِ مقام کرنے کی شدید خواہش ابھر کر ہوتی … پھر بھی پرندوں کے نقلِ مقام کی کوئی ایک یقینی وجہ نہیں بتلائی جاسکتی ۔ پرندوں کی اس عجیب و غریب عادات نے ماقبل تاریخ سے … کو حیرت کے سمندر میں غوطے کھانے کے لئے چھوڑ دیا ہے ۔ اور آج بھی انسان اسی سائنسی دور کے جدید تکنیکی آلات کو ہاتھوں … لئے نقلِ مقام کی ماہیئت کو جاننے کے لئے سرگرداں نظر آتا ہے ۔

■■

اختر شیرانی رومانوی شاعری میں اہمیت کے حامل ہیں ۔ ان کے یہاں پرندوں کی علامتیں انتہائی لطیف پیرائے میں استعمال کی گئی ہیں ۔ وہ فطرت اور فطرت کے حسن سے بہت متاثر ہیں علامت کی فضاء مانوس سی دکھائی دیتی ہے ۔ ہندوستانی فضاء میں یہ علامتیں خوب صورت مرقعے معلوم ہوتے ہیں ۔ اختر کے یہاں بلبل، مرغ، طاؤس، پپیہے، طوطی، قمری، عقاب، اور کوئل کا ذکر بار بار کیا گیا ہے ؎

بلبلِ مست نوا، دشت میں کیوں رہنے لگی
نغمۂ تر کی جگہ مرثیہ کیوں کہنے لگی!

بلبلِ زار ہے، فریاد و فغاں پہ مجبور!
گرچہ مستقبل فریاد و فغاں کچھ بھی نہیں

بظاہر ہم ہیں بلبل کی طرح مشہور ہرجائی
مگر دل میں گدازِ فطرتِ پروانہ رکھتے ہیں

رنگینی و نزہت پہ نہ مغرور ہو بلبل!
ہے رنگِ بہارِ چمنستاں کوئی دن اور!

فصلِ گل جانے کو ہے دورِ خزاں آنے کو ہے
یہ چمن یہ بلبلیں یہ نغمہ خوانی پھر کہاں

نغموں میں رنگ نالۂ غم ناک آچلا
کیف نوائے مرغِ خوش الحان کیا ہوا

کہہ دے نہ مرغِ چمن حوصلہ تو کس کا قصور
قفس سے دور نہیں ہے مقامِ آزادی

اس دام گاہِ دہر میں کیوں ہو گیا اسیر
میں شاخسارِ خلد کا مرغِ پریدہ ہوں

لالہ زار و سنبلستاں کی نمو کے رنگ میں!
سبزہ زاروں میں پرِ طاؤس پھیلاتی ہوئی

مور گونجے کوئلیں کوکیں پپیہے بول اٹھے
کتنے کمسن مطرب اپنے ساتھ لائی ہے گھٹا

کوئلیں کوکیں پپیہے پی کہاں کہنے لگے
نغموں سے لبریز ہے رنگیں فضا برسات کی

یہ کوئلوں کی کوکو، یہ مور کی صدائیں؟
یہ نازنین گائیں! اور یہ غریب گائیں

چمن زارِ جہاں میں طوطیِ رنگیں نوا ہے تو
ہے زندہ لطفِ عیشِ زندگی کی داستاں تجھ سے

وہ کوئلوں کے ترانے، وہ قمریوں کی پکار!
وہ صبح اور وہ صبا تم کو یاد کرتی ہے

طاؤس ناچتے ہیں، یوں بے قرار ہو کر؟؟
گو ہر ایک پَر میں بجلی سمار ہی ہے

—— "رومانی شاعری میں پرندے" (عمر دراز احمد ماہلی) —— آج کل دہلی نومبر ۱۹۷۸ء

اُردو نامہ

علمی، ادبی اور تہذیبی اُردو خبر نامہ

یکم نومبر: یوم تاسیس آندھرا پردیش کے سلسلے میں محفل شعر ریاستی وزیر آبکاری جناب پی گنگا ریڈی کی صدارت میں.. منعقد ہوئی وزیر موصوف نے ریاستی ترقیاتی پراجکٹوں کا ذکر کرتے ہوئے دکنی کلچر کی صحت مند روایات کو ملک کے اتحاد اور یک جہتی کے لئے مشعل راہ قرار دیا اور کہا کہ فرقہ وارانہ یک جہتی اور جذباتی اتحاد آندھرائی تہذیب کی روح ہے۔ ریاستی وزیر آبکاری نے ریاست کے ۱۱۶ اردو شعراء کو فی کس (۱۱۶) روپیے کی تھیلی نذر کی۔ ابتداء میں جناب اختر حسن جوائنٹ سکریٹری اردو اکیڈیمی نے خیر مقدمی تقریر کرتے ہوئے ریاست کی چار سو سالہ تاریخی.. روایات کو آئینہ دکھایا اور تلگو، اردو لسانی اتحاد پر اپنے خیالات ظاہر کئے۔ محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ کے ڈائرکٹر جنرل جناب ڈاکٹر لسے آر یا بیگ نے شعراء کا خیر مقدم کیا۔ اور ایسی شعری محفلوں کی.. افادیت پر روشنی ڈالی۔ اس مشاعرہ میں مسرز اختر حسن، شاذ تمکنت، اوج یعقوبی امیر احمد خسرو، کنول پرشاد کنول، ڈاکٹر رفعت صدیقی، خیرات ندیم، صلاح الدین نیر، وقار خلیل، ناصر کرنولی، رئیس اختر اور عزیز النساء صبا نے نظمیں اور غزلیں سنائیں

● ادارہ ترقی ادب کے سالانہ انتخابات میں مسرز کے یم خان (صدر) اور سید مسعود علی ایڈوکیٹ، ابراھیم خلیل ایڈوکیٹ، تہنیت علی جنیدی، (نائب صدور) میر کمال الدین علی خان، (معتمد عمومی) یوسف غوری (معتمد ادبی امور) محمد علی خان ادریس اسافر.. (معتمدین) اور یوسف خوندمیری (خازن) منتخب ہوئے۔

۳ر نومبر: بزم اُردو عثمانیہ یونیورسٹی کے زیر اہتمام "جلسہ یاد خطیب" کا اہتمام کیا گیا۔ ڈاکٹر ہاشم علی ریڈر شعبہ اُردو، مجید اللہ صدیقی، قمر سلطانہ اور صدر جلسہ پروفیسر رفیعہ سلطانہ صدر شعبہ اُردو.. نے دکنی کے عوامی شاعر سلیمان خطیب کی شخصیت اور شاعری کو خراج عقیدت ادا کیا۔

● ریاست میں اردو کے تعلیمی... مسائل پر گزشتہ دنوں منعقدہ سمینار کی قرار دادوں پر عمل آوری کا جائزہ لینے کی غرض سے ایک اجلاس جناب جلیل پاشاہ صدر نیشنل اسٹوڈنٹس یونین کی صدارت میں منعقد ہوا۔

۳ر نومبر: اُردو تعلیمی ٹرسٹ (ریاستی انجمن ترقی اُردو) کو امریکہ میں مقیم ہندوستانی اُردو دوست ڈاکٹر و مسز انیس الرحمٰن کی طرف سے دوہزار پچیس روپیے کا عطیہ وصول ہوا۔

۴ر نومبر: ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ صدر شعبۂ اُردو جامعہ عثمانیہ نے بزم اُردو کے افتتاحی افسانوی اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے بزم سے اچھی توقعات وابستہ کیں۔ صدر بزم مجید اللہ صدیقی نے بزم اُردو کا دستور اور نائب صدر ساجدہ سلطانہ نے بزم کے اغراض و مقاصد پیش کئے۔ معتمد بزم فاروق قریشی نے کلیدی نوٹ سنایا اور بتایا کہ "مجلہ عثمانیہ" کی... اشاعت بھی بزم اُردو کے دائرہ کار میں شامل ہے۔ زاہدہ خاتون اور میمونہ وحید نے کہانیاں سنائیں۔

● دلی کی بیگماتی زبان کے نمائندہ ادیب پروفیسر آغا حیدر حسن دہلوی کی دوسری برسی کے موقع پر ان کی صاحبزادی اور داماد جناب معظم حسین نے نظام کالج میں تعلیم پانے والے اُردو کے بہترین طالب علم کو ہر سال آغا صاحب

سے موسومہ "گولڈ میڈل" دیئے جانے کا اعلان کیا۔ معلوم ہوا ہے کہ آغا صاحب کی نایاب تصنیف "پس پردہ" کا نیا ایڈیشن "ہمدرد ٹرسٹ دلی" کی طرف سے اشاعتی مراحل میں ہے۔ جس کا مقدمہ ڈاکٹر یوسف حسین خان نے تحریر کیا ہے۔

۵ر نومبر: اقبال اکیڈمی کے زیر اہتمام "جلسہ یاد خطیب" جناب سید خلیل اللہ حسینی پرنسپل انوار العلوم کالج کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر عالم خوندمیری، جناب عابد علی خان، ایڈیٹر "سیاست"، ڈاکٹر غیاث صدیقی، جناب عاتق شاہ، جناب مصطفیٰ کمال، جناب رشید قریشی، جناب پریم کشور نگم اور جناب سید تمیم نے سلیمان خطیب کے فن پر مخاطب کیا۔ روحی قادری، برق یوسفی، اور طالب خوندمیری نے منظوم نذرانہ سخن ادا کیا۔ جناب کریم رضا، معتمد اقبال اکیڈمی نے شکریہ ادا کیا۔

۸ر نومبر: ریاستی ترقی اردو کے ایک وفد نے جس میں نواب میر احمد علی خان، پروفیسر حبیب الرحمٰن، غلام یزدانی اور مسز مواس لاہوتی شامل تھے۔ قلعہ گولکنڈہ میں اردو ذریعہ تعلیم کے ماڈل اسکول کا معائنہ کیا۔ اور اس کی کارکردگی کو مثالی قرار دیا۔ صدر معلمہ محترمہ فوزیہ صادق الدین نے اسٹاف کے ساتھ وفد کا خیر مقدم کیا۔

۱۰ر نومبر: آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی کی مجلس عاملہ کے اجلاس میں دکنی شاعر سلیمان خطیب کے سانحۂ ارتحال پر تعزیتی قرارداد منظور کی گئی۔ جس میں خطیب مرحوم کی عوامی شاعری کو بھرپور خراج عقیدت ادا کیا گیا ہے۔

۱۲ر نومبر: نیشنل بک ڈپو کی اطلاع کے مطابق معروف سخنور جناب صلاح الدین نیر کا تیسرا شعری مجموعہ "صنم تراش" شائع ہوا ہے۔ اس مجموعہ میں نیر کی شاعری پر ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اور ڈاکٹر مغنی تبسم کے مضامین شامل ہیں۔

۱۳ر نومبر: وزیر اعظم جناب مرارجی دیسائی نے "مولانا محمد علی جوہر صد سالہ تقاریب" کے سلسلے کے ایک اجلاس کو مخاطب کرتے ہوئے علی برادران اور گاندھی جی کے دور کے فرقہ وارانہ اتحاد کی بحالی کی کوششوں کو زبردست خراج تحسین ادا کیا۔ اور علامہ اقبال کے اشعار سنا کر اپنی اردو دانی کا ثبوت دیا۔ ریاست میں ان تقاریب کے صدر نشین جناب میر اکبر علی خان سابق گورنر یوپی نے بھی جلسہ سے خطاب کیا۔ اور جامعہ عثمانیہ کے شعبہ صحافت میں "محمد علی چیئر" کے قیام کا مطالبہ کیا۔ ریاستی چیف منسٹر نے جلسہ کی صدارت کی اور مولانا محمد علی جوہر کی قومی اور صحافتی خدمات کو خراج عقیدت پیش کیا۔ اور نئی نسلوں کو مشورہ دیا کہ وہ آزادیٔ ہند کے ان برگزیدہ قائدین کی حیات سے سبق لیں۔ نواب میر طاہر علی خاں نے شکریہ ادا کیا۔

۱۴ر سویت یونین کے دانشور اور ماہر ادبیات ہند مسٹر والڈ یمر دولتی کھوکھولیف نے اخباری نمائندوں کو بتایا کہ روس میں اردو اور ہندی زبانوں کی تعلیم کے مدارس کارکرد ہیں۔ روسی عوام ہندوستانی زبانوں کے ادب اور یہاں کے کلچر سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ موصوف نے بتایا کہ سویت یونین میں اردو کی کتابیں ایک تا دو لاکھ کی تعداد میں چھپتی اور تیزی سے فروخت ہوتی ہیں۔

۱۶ر نومبر: گیارہویں سالانہ ہفتہ کتب خانہ جات کے سلسلے میں کتابوں کی ایک نمائش "حیدرآبادی ادب و ثقافت" کے نام سے "بھارت گن وردھک لائبریری" میں منعقد ہوئی۔ جناب عابد علی خان ایڈیٹر "سیاست" نے جلسہ کی صدارت کی۔ کتب خانے اور صحافت کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے "حیدرآبادیات" کے موضوع پر ترتیب دی گئی اس نمائش کو مفید خدمت قرار دیا۔ شعبۂ صحافت جامعہ عثمانیہ کے جناب عبدالرحیم اور

راسے محبوب نارائن ڈپٹی ڈائرکٹر متعلقہ نے بھی مخاطب کیا

● گونکنڈہ سوسائٹی کی طرف سے نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ ششم کی زندگی اور عہد حکومت پر۔ جناب رشید قریشی کا تاریخی ڈرامہ "محبوب" اسٹیج کیا گیا۔ جسے عوام نے شوق اور اشتیاق سے دیکھا

۱۸ر نومبر: حیدرآباد لٹریری فورم (حلقہ) کا ادبی اجلاس ڈاکٹر عالم خوند میری ہیڈ شعبہ فلسفہ جامعہ عثمانیہ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ممتاز نقاد ڈاکٹر مغنی تبسم ریڈر شعبہ اُردو جامعہ عثمانیہ نے "اردو تنقید کے پچیس سال" کے موضوع پر۔۔ مقالہ سنایا۔ جناب علی ظہیر نے اپنا کلام پیش کیا۔ وقار اعظمی سکریٹری حلقہ نے شکریہ ادا کیا۔

۱۹ر نومبر: ادارۂ ادبیاتِ اُردو کے زیر اہتمام بانیٔ ادارہ، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ کی برسی کے موقع پر "دکنی ادب اور ثقافت" کے موضوع پر ایک نمائندہ سمینار ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، صدر شعبہ اُردو عثمانیہ یونیورسٹی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مسرز پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی، ڈاکٹر ضیاء الدین، احمد شکیب، ڈاکٹر محمد ہاشم علی اور ڈاکٹر شریف اسعد انصاری نے مقالے سنائے۔ مباحث میں مسرز محمد علی اثرؔ، علاؤ الدین، بانو طاہرہ سعید، ڈاکٹر ہاشم علی نے حصہ لیا۔ جناب مظہر کامل نے ڈاکٹر زورؔ کو منظوم نذرانۂ سخن پیش کیا۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے ڈاکٹر زورؔ کو اُردو کے ایک عظیم معمار کا نام دیا۔ اور اس امر کا انکشاف کیا کہ ہند و پاک کی مختلف جامعات میں ڈاکٹر زور کی شخصیت اور اُن کے تحقیقی کارناموں پر ایک درجن اسکالر ریسرچ کا کام کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر مغنی تبسم نے سیمینار کی کارروائی خوش اسلوبی سے انجام دی۔

● اقلیم ادب کا ماہانہ ادبی و شعری۔۔۔ اجلاس جناب مصلح الدین سعدی جوائنٹ ایڈیٹر سہ ماہی "اقبال ریویو" کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اقبالیات کے مترجم سخنور جناب مضطر مجاز نے "میں اور میرا فن" کے موضوع پر۔۔ مخاطب کیا۔ ڈاکٹر یوسف کمال نے ٹی وی کے مددگار ناظم جناب منیر احمد خاں سے انٹرویو لیا۔ "آج کا شاعر" کے زیر عنوان جناب صادق نقوی نے کلام سنایا۔ شعری نشست میں مسرز رحمٰن جامی، حامد مجاز، رؤف خیر، سلمان عشرت، مضطر مجاز، یوسف کمال، قدیر انصاری، حسام الدین سلیم، برق یوسفی، اور طاہر گلشن آبادی نے کلام پڑھا۔ جناب جمیل شیدائی معتمد اقلیم ادب نے شکریہ ادا کیا۔

۲۰ر نومبر: "مرکز ادب" کا ماہانہ ادبی و شعری اجلاس جناب ٹھاکر بجرنگ سنگھ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جناب ریاست علی تاج کریم نگری مہمانِ خصوصی تھے۔ شعر و ادب کے مختلف موضوعات پر مسرز مالک پال عظیم دہلوی اور عبدالکریم ماہر نے مخاطب کیا۔ محفلِ شعر (۲۵) شعراء نے کلام سنایا۔

۲۴ر نومبر: پاکستانی سفیر مقیم ہند جناب عبدالستار نے اپنے دورۂ حیدرآباد میں مختلف علمی و ادبی اداروں کا معائنہ کیا اور آندھرا پردیش میں اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی کی کوششوں پر خوشنودی کا اظہار کرتے ہوئے بتایا کہ اُردو زبان ہند و پاک کی ناقابلِ تقسیم مشترکہ میراث ہے اور اس زبان کی ترقی سے دونوں ملکوں کے دوستانہ تعلقات مستحکم ہوں گے۔ جناب عبدالستار نے اس بات پر مسرت کا اظہار کیا کہ حیدرآباد میں اُردو زبان کی ترقی اور تحفظ میں مسلمان اور ہندو بھائی برابر کے شریک اور سرگرم عمل ہیں۔

اُردو ہال میں انجمن ترقی اُردو اور تعلیمی ٹرسٹ کمیٹی کی طرف سے جناب عبدالستار کو ایک استقبالیہ دیا گیا۔ پروفیسر حبیب الرحمٰن و جناب حامد علی خاں نے انجمن کے زیر انتظام تعلیمی اداروں سے واقف کرایا۔ ریاستی اُردو اکیڈیمی کے صدر اکیڈیمی

(بقیہ صفحہ ۴۹ پر)

کرشنا اور گوداوری

ہماری دو عظیم ندیاں کرشنا اور گوداوری آندھرا پردیش کی معاشیات کو بڑے پیمانے پر مالا مال کرتی ہیں۔ ہندوستان کے بڑے ہمہ مقصدی پراجکٹوں میں سے ایک دریائی پراجکٹ ناگرجوناساگر ہے جس سے ملک کی پیداوار کو بڑھانے کے لئے دریائے کرشنا کے پانی کو روکا گیا ہے۔ اس پراجکٹ کی دونوں کنالوں سے ۲۱٫۵۴ لاکھ ایکر زمین سیراب کرنے کے لئے پانی دستیاب ہوگا۔ کنالوں کی پوری لانبائی تک تعمیر کے لئے کھدوائی کا کام جاری ہے۔ موجودہ صورت حال میں تقریباً ۱۲٫۷۰ لاکھ ایکر زمین کو سیراب کرنے کے لئے آبپاشی کی سہولتیں دی جارہی ہیں۔

ناگرجوناساگر ہائیڈرو الکٹرک اسکیم کے تحت بجلی پیدا کرنے کی مکمل تنصیبی صلاحیت ۸۱۰ میگاواٹ ہے۔ صدر جمہوریہ ہند نے ۱۰ جولائی ۱۹۷۸ء کو اس اسکیم کا افتتاح کیا۔ سری سیلم ہائیڈل پراجکٹ جو عنقریب کام کرنا شروع کردے گا تو اس وقت ریاست میں بجلی پیدا کرنے کی تنصیبی صلاحیت میں مزید اضافہ ہوگا۔

۳۰۸ کروڑ روپے کی لاگت سے گوداوری پر تعمیر کئے جانے والے پوچم پاڈ پراجکٹ پر کام تیزی سے جاری ہے۔ اس پراجکٹ سے تلنگانہ کے بیشتر علاقے کو فائدہ پہنچے گا۔

ڈائرکٹر جنرل محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ
آندھرا پردیش، حیدرآباد

Ad. 2666/ADVT/24/78/25

غریبوں کے ساتھ نیا سلوک

آندھرا پردیش میں قانون تحدید اراضی بابت ۱۹۷۳ کو جدید نوعیت کا بڑھاوا حاصل ہوا ہے۔ اب تک ۲۹۵۲۲۱ ایکڑ سے زائد اراضی حاصل کی جا چکی ہے۔ یکم جون ۱۹۷۸ سے قبضہ اراضیات کا پندرواڑہ منایا گیا۔ تاکہ کمزور طبقات سے تعلق رکھنے والے افراد کو اراضیات کے حقیقی قبضے دلانے کے پروگرام میں مزید تیزی پیدا کی جائے۔

تقریباً ۱۳۲۴۴۶ ایکڑ اراضیات کاشت کاری کے اغراض کے تحت ۷۸۴۷۳ پٹے داروں کو تفویض کی جا چکی ہیں اور ۶۵۱۸۳ مستحقین کو رہائشی اغراض کے لئے ۴۸۲۷ ایکڑ اراضی تقسیم کی گئی۔

سماج کے کمزور طبقات ریاستی آبادی کے ۵۲ فی صد پر مشتمل ہیں۔ ۷۹-۱۹۷۸ کے موازنے میں ناداروں کی بہبود و بھلائی کے لئے ۲۵ کروڑ روپے مختص کئے گئے ہیں اور مزید ۳۲ کروڑ روپیوں کی حد تک ادارہ جاتی مالیے کی فراہمی کی گنجائش مہیا کی گئی ہے۔

آندھرا پردیش شیڈولڈ کاسٹس کواپریٹو فینانس کارپوریشن اور آندھرا پردیش بیک ورڈ کلاسس کواپریٹیو فینانس کارپوریشن کی جانب سے ۴۳ کروڑ روپے مالیت کی اسکیمات آغاز کی گئی ہیں جن سے ۴۳ لاکھ سے زائد کمزور طبقات کے افراد کو فائدہ پہنچا ہے۔

ڈائرکٹر جنرل محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ
آندھرا پردیش حیدرآباد

2666/AVVT/C4/78/29